سہ ماہی
ادب ساز
دہلی

ادب ساز

اردو ادب کا عالمی جریدہ

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

مشمولات میں بیان کی گئی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

سہ ماہی ادب ساز دہلی

جلدا	شمارہ2، اکتوبر۔دسمبر 2006
مدیر	نصرت ظہیر
انتظامی مدیر	مودود صدیقی
معاون مدیر	شبنم پروین
	ثمینہ پروین
قانونی مشیر	عنبر قمر الدین، بی اے آنرز، ایل ایل۔ ایم، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا
کمپوزنگ	شاہینہ عباسی، دریا گنج، دہلی
مطبع	شوبی آفسیٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی۔2
قیمت فی شمارہ	پیپر بیک:300 روپے، مجلد:350 روپے (ہندوستان)
	پیپر بیک:400 روپے (پاکستان)
	پیپر بیک:US$20 ڈالر/15 یورو (دیگر ممالک)
ترسیل زر	
چیک/ڈرافٹ بنام	ادب ساز پبلیکیشن دہلی (Adabsaaz Publication Delhi)
ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ	4/15 کھجوری پور دہلی۔110091 (انڈیا)
ای میل	nusratzaheer@gmail.com، adabsaaz@gmail.com
	تخلیقات و مضامین ان پیج یا دوسرے فارمیٹ میں ای میل کیے جا سکتے ہیں
فون	011-22723031, 22772709
سیل فون	9312033695
پرنٹر، پبلشر	نصرت ظہیر احمد

سرورق تصاویر: مظہر امام (دائیں) اور مشتاق یاد

بنام

احمد ندیم قاسمی

ترتیب

رونقِ محفل

آداب

ادب ساز کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں اس لئے ہے کہ آپ میں سے بیش تر نے پہلا شمارہ خرید کر پڑھا تھا۔ حتیٰ کہ قلمی معاونین نے بھی۔ یہ نہ ہوتا تو دوسرا شمارہ نہیں چھپ سکتا تھا۔ ویسے یہ تعاون ہمارے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ اپنی محنت اور ادب کے سنجیدہ قارئین پر ہمیں پہلے بھی اعتماد تھا، اب بھی ہے۔ غیر متوقع دراصل اس شمارے کی اشاعت میں ہونے والی غیر معمولی تاخیر ہے جس کا سبب، بلکہ اسباب زیادہ تر ذاتی نوعیت کے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ یہ بھی کہ ادب ساز کا جو تصور ہمارے ذہن میں ہے اس کے مطابق جریدے کا سانچہ بنانے میں کئی کھانچے رہ گئے تھے جنہیں درست کرنا ضروری تھا۔ اب بیش تر بنیادی کام نمٹ گیا ہے اور امید ہے کہ آئندہ شمارے وقت پر شائع ہوتے رہیں گے۔

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ جب اتنے سارے ادبی رسالے پہلے سے موجود ہیں تو ادب ساز کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اس میں ایسا کیا دینے جا رہے ہیں جو دوسرے رسالوں میں نہیں ہے۔ جواب میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن ہم سوچتے ہیں کیوں نہ فی الحال خاموش رہا جائے۔ دو تین شمارے اور نکل جائیں گے تو ادب ساز خود بتا دے گا کہ اس کی اشاعت کیوں ضروری ہے یا کیوں ضروری نہیں ہے۔

یہ بھی پوچھا گیا کہ آپ کی پالیسی کیا ہے؟ جواب میں ہم خود سے پوچھ رہے ہیں۔ کیا ہماری کوئی پالیسی ہونی چاہئے؟ کیا پالیسی کے بغیر ادب نہیں ہو سکتا؟ کیا اکیسویں صدی کا اردو ادب بیسویں صدی کا پنجابی اردو اخبار ہے جس کی کوئی نہ کوئی پالیسی ضرور ہوتی تھی کہ ایک آریہ سماجی ہے، دوسرا کانگریسی اور تیسرا لیگی۔ خیر، اس پر فلسفیانہ بحث کا حق مفتیانِ ادب کو ہے۔ ہمیں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ فی الحال ہم کسی پالیسی کے بغیر زیادہ بہتر محسوس کر رہے ہیں۔

ایک بات اور واضح ہو کہ ادب ساز کسی مدیر کا جریدہ نہیں ہے۔ مدیر خود اس جریدے کا ایک قاری ہے اور صرف اپنی پسند یا ناپسند دوسروں پر لادنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ یہ بات اس لئے کہنی پڑ رہی ہے کہ پتہ نہیں کیوں ادب ساز کا موازنہ شب خون سے کیا جانے لگا ہے۔ شب خون نے، جیسا کہ شمارۂ اول کے انتساب میں کہا گیا تھا اردو کی ادبی صحافت کے روشن ترین باب رقم کئے ہیں۔ معیار میں ادب ساز کہیں اس کے آس پاس بھی پہونچ جائے تو یہ بڑی بات ہوگی۔ پھر بھی ہم یہ قطعی نہیں چاہیں گے کہ ادب ساز شب خون جیسا بنے۔ یا پھر اوراق یا فنون یا شعر و حکمت یا استعارہ نظر آئے۔ اور یہ بھی نہیں کہ صرف ترتیب، ضخامت اور پیش کش کی بنیاد پر زبردستی اس کی کوئی الگ شناخت قائم رکھی جائے۔ ہم چاہیں گے کہ یہ جمہوری انداز کا ایک آزاد ادبی جریدہ بنے جس میں سب کچھ صاف شفاف transparent ہو۔ یہی ہمارا نصب العین ہے یہی ہماری پالیسی ہے۔

خصوصی مطالعے میں اس مرتبہ ہندوستانی شاعر اور پاکستانی نثر نگار کی باری ہے۔ امید ہے مظہر امام اور منشا یاد کے فن اور شخصیت پر مضامین اور تخلیقات کا انتخاب آپ کو پسند آئے گا۔ کچھ تخلیقات بقول شخصے recycle ہوئی ہیں۔ مثلاً ساگر سرحدی کا ڈرامہ، احمد ندیم قاسمی پر شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون، گیان چند جین کی کتاب پر ساجد رشید کا تبصرہ اور خاص گوشوں کے بعض مشمولات۔ لیکن یہ مکرر اشاعت ان بہت سے قارئین کے لئے یقیناً سود مند رہے گی جو ان نگارشات کے مطالعے سے محروم رہے ہیں۔ خاص طور سے طالب علموں کے لئے، جن کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کی پوری کوشش اس شمارے میں بھی کی گئی ہے۔ باقی سب کچھ شمارے میں نیا ہے۔ ادیبوں کے نام خطوط کے علاوہ ایک نیا سلسلہ جلسے کا شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ ہو سکے تو اسی طرز پر اہم تقریبات کی ریکارڈنگ لکھ کر یا آڈیو/ویڈیو سی ڈی کی شکل میں ارسال فرمائیں تاکہ تحلیل ہو جانے والے یادگار لمحوں کو دستاویز بنایا جا سکے...

سیمینار

اردو تعلیم اور اردو سیاست

ای ٹی وی کے بعد دوردرشن سے بھی اردو چینل شروع ہو گئی ہے ۔ حیدراباد دکن میں دنیا کی پہلی اردو یونی ورسٹی کا دائرۂ ہر سال پھیلتا جا رہا ہے۔ کئی ریاستوں میں اردو کو دوسری زبان کا سرکاری درجہ مل چکا ہے۔ بڑے شہروں سے نت نئے خوب صورت اردو روزنامے جاری ہو رہے ہیں۔انٹر نیٹ پراردو کی سینکڑوں ویب سائٹ موجود ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ 'ادب ساز' کی صورت میں پہلی بار ملک میں پاکستان کے 'نقوش' اور 'فنون' جتنے ضخیم ادبی جریدے کا جرأت مندانہ آغاز محض ایک انفرادی کوشش سے ہو ا ہے،اور اس کی پذیرائی سرکاری اردو اداروں نے نہیں بلکہ سنجیدہ قارئین نے کی ہے۔

یہ خوش نما منظرہندستان میں اردو کے روشن حال اور سنہرے مستقبل کی دلیل ہے۔

لیکن یہ آدھا ، بلکہ آدھے سے بھی کچھ کم سچ ہے!حقائق اور بھی ہیں...

ہندستان میں اسکولوں کے نظام سے اردو تعلیم کا صفایا بہت تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ شمالی ہند کی ریاستوں میں اردو ذریعۂ تعلیم کا شیرازہ پوری طرح بکھر چکا ہے اور ایک اختیاری مضمون کے طور پر بھی اردو تعلیم کی سہولتیں اسکولوں میں اب شاذ ہی دستیاب ہیں۔

اتر پردیش میں،جو اردو آبادی کے لحاظ سے اہم ترین صوبہ ہے اردو ذریعۂ تعلیم کا ایک پرائمری اسکول تک موجود نہیں ہے۔ جونیر ہائی اسکول، ہائر سکنڈری اسکول اور انٹر کالج کی تو بات ہی جانے دیجئے! علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے دو اسکول اردو میڈیم سے تعلیم کی سہولت فراہم ضرور کرتے ہیں مگر وہاں بھی اردو کے ساتھ انگریزی میڈیم کا**option** موجود ہے اس لیے زیادہ تر طلبہ انگریزی میڈیم کو ترجیح دیتے ہیں.....

......بہار میں اردو کی صورتِ حال قدرے بہتر ہے مگر اس کی وجہ وہاں دینی مدارس کے متبادل نظام کی موجودگی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دینی مدارس کا ذریعۂ تعلیم عملاً صرف اور صرف اردو میڈیم ہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی، مہاراشٹر اور کرناٹک میں اردو میڈیم کے اسکول موجود ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کا نیٹ ورک خاصہ مضبوط بھی ہے مگر اس سے کچھ زیادہ فرق اس لیے نہیں پڑے گا کیوں کہ شمالی ہند میں جہاں اردو تعلیم کا نظم پوری طرح فنا ہو چکا ہے وہاں اردو آبادی کا 65 فی صد سے زیادہ حصہ رہتا ہے۔ پھر مہاراشٹر کرناٹک یا دلی میں اردو تعلیم کی سہولت موجود ہونے سے اس گناہ کا کفارہ کیوں کر ممکن ہے جو شمالی ہند میں اسکول جانے والے ان بچوں کے ساتھ کیا گیا، اردو جن کی مادری زبان ہے اور وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے اس حق سے محروم کر دیے گئے ہے جو ملک کے آئین نے ہر بچے کو دیا ہے۔

اردو تعلیم اور دینی مدرسوں کا رشتہ بہت ہی پیچیدہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد دینی مدارس نے اردو کا اس وقت تحفظ کیا جب حکومت اس زبان کو فنا کرنے کے درپے تھی۔ اردو پر تقسیم ملک کا الزام لگ چکا تھا اور ہندستان میں رہ جانے والے مسلمان مجرم ضمیری میں اس درجہ مبتلا تھے کہ انھوں نے اردو کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کیا۔ تقسیم کے خوف کی نفسیات میں جی رہی مسلم لیڈرشپ بھی اردو کے محاذ پر خاموش ہی رہی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دینی مدارس کی تعداد 5 لاکھ سے کچھ زیادہ ہی ہے اور ان میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد پانچ کروڑ سے بھی متجاوز ہے۔ یہ اعداد و شمار حیرت ناک ہیں مگر حقیقت سے فرار ممکن نہیں۔ دینی مدارس کے ذریعے اردو کے تحفظ کی بات کرنے والے لوگ یہ بات بالکل ہی بھول جاتے ہیں کہ دینی مدارس صرف مذہب کی تعلیم کے سوال سے جڑے ہیں اور اردو زبان و ادب کے بقا سے ان کا کوئی کمٹمنٹ نہیں ہے۔ ان کا کمٹمنٹ صرف مذہب اور اپنے اپنے مسلک سے ہے۔ دینی مدارس کی پروردہ اردو سے جس سماجی منظرنامے اور ادبی فضا کی تشکیل ہوگی، اس کا تصور کرنا مشکل نہیں۔ یہ بھی طے ہے کہ سماجی منظرنامے پر مذہبی اردو کی اجارہ داری ہونے کے بعد ادب اور ادبی اقدار حاشیے پر چلی جائیں گی اور اردو آہستہ آہستہ مذہبی زبان کے طور پر عبرانی کی سی شکل اختیار کرلے گی اور اس کا فنکشنل لینگویج کا کردار ختم ہو جائے گا۔

فنکشنل لینگویج Functional Language کے طور پر اردو کی موت ہندستان کی ثقافت ہی نہیں بلکہ سول سوسائٹی کے لیے بھی اب تک کا سب سے بڑا المیہ ہوگی۔ اردو اخبارات کی تعداد میں اضافے کے باوجود ان کی سرکولیشن میں زوال، اردو کے تقریباً تمام علمی اور ادبی رسائل کے قارئین کا تیزی سے محدود ہوتا ہوا حلقۂ قارئین، ہر تھوڑے سے وقفے کے بعد کسی نہ کسی اہم رسالے کے بند ہونے کا سانحہ اب روز کا معمول بنتے جارہے ہیں۔ ایسا صرف اور صرف اردو کے ہمہ جہتی فروغ کے رک جانے کی وجہ سے ہوتا رہا ہے۔

ہندستان میں دینی مدارس میں اردو کے فروغ پانے کی وجہ سے اردو کے ثقافتی کردار میں بھی تبدیلی آئی اور اس کی سیاست میں بھی فیصلہ کن تغیر ہوا جس کے بعد اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے جو اس کے فروغ اور نشو و نما کے لیے کسی بھی طرح مبارک نہیں ہے۔ لیکن حقیقتوں سے بہر حال منھ نہیں موڑا جاسکتا۔ دینی مدارس کسی بھی طرح مسلمانوں کی جدید تعلیمی ترقی میں معاون نہیں ہیں۔ مدارس سے اس کی توقع کرنا بھی نہیں چاہیے۔ مدارس کا جو کام ہے وہ اسے مکمل انہماک سے انجام دے رہے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کی عمومی تعلیمی ترقی کا سوال ہے تو اس کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ زبان کے طور پر اردو کا فروغ نہ صرف اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہو بلکہ مدرسے بھی اس کام میں اپنے مذہبی جذبے کے ساتھ لگے رہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی صرف ان خطوط پر ہو سکتی ہے، جن پر ہندستان کے دیگر طبقات گامزن ہیں۔

اس سیمینار کے شرکا نے کھل کر ان اہم موضوعات پر بحث کی ہے، جس سے مزید بحث کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس تحریری سیمینار کے انعقاد میں تعاون کے لئے ہم ماہر تعلیم ڈاکٹر اطہر فاروقی کے خاص طور پر شکر گزار ہیں جن کی ایک بے حد اہم کتاب Redifining Urdu Politics in India حال ہی میں اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس سے انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور اردو زبان و تعلیم کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ (کتاب پر ریویو 'باب الکتاب' کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

زمینی حقیقتیں

ہندستان میں اردو تعلیم کا موجودہ منظر نامہ

ڈاکٹر اطہر فاروقی

اس مضمون کا مرکزی خیال موجودہ تناظر میں اردو کی صورت حال کا اس طرح جائزہ لینا ہے کہ ماضی کے ان سیاسی اور سماجی محرکات کا تجزیہ کیا جا سکے جنھوں نے اردو کے سیاق وسباق میں اہم رول ادا کرتے ہوئے اُس پس منظر کی تشکیل کی جو سماجی منظر نامے پر اردو کے فروغ یا زوال کا آئینہ دار ہے۔ اس مضمون کے دائرۂ مباحث سے ادب اور تاریخ زبان کے موضوعات پوری طرح خارج ہیں۔ اس مضمون کے مندرجات کی حد تک میری تمام تر دل چسپی زمانۂ حال اور ماضی قریب میں زبان کے طور پر اردو سے متعلق اُن تمام اجزا کی تشکیل کے تجزیے میں ہے جو معاشرے میں کسی زبان کے غالب رول کا مطالعہ کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ زبانیں معاشرے میں مختلف رول ادا کرتی ہیں۔ ہندستان کے مخصوص سماجی تناظر میں اردو کا رول گذشتہ دو صدیوں میں بہت اہم مگر متنازع رہا ہے۔ تقسیم کے بعد خصوصاً اردو کا سیاسی زاویہ چوں کہ مسلم حسیت کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا اس لئے مسلم دشمن یا مسلم مخالف سیاسی جماعتوں اور ان سے وابستہ تنظیموں، خصوصاً آر ایس ایس کی متعدد بغل بچہ سماجی وثقافتی کردار ادا کرنے کی دعوے دار مگر اپنے خلقیے کے اعتبار سے فسطائی تنظیموں کی سیاست بھی اردو ہی کے گرد طواف کرتی رہی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی عرصے میں زندگی کے مختلف زاویوں کو محیط زبان کے طور پر اردو کا رول سیاسی وجوہ سے مسلمانوں کی دل چسپی کا مرکز نہیں رہا۔ اردو سے اتنی زیادہ سیاست وابستہ ہوئی کہ مسلمانوں نے زندگی کے کثیر الجہات زاویوں کا احاطہ کرنے والی زبان کے طور پر اردو کے زندہ رہنے کا لائحہ عمل یہ متعین کیا کہ اس کا تحفظ حکومت کرے اور وہ خود اردو کے تاریخی کردار کے اس زاویے کی قصیدہ خوانی کرتے رہیں گے جس میں اس کے گنگا جمنی عناصر کی تشہیر پر زور ہو، اردو کے غیر مسلم اہل قلم کے اسمائے گرامی کی گردان کی جائے، ان کے ادبی کارناموں کا سیاسی وظیفہ پڑھا جائے، یا پھر اردو کو مذہبی تعلیم کا ذریعہ بنا کر دینی مدارس تک محدود کر دیا جائے۔

ان حالات کے نتیجے میں زبان کے طور پر اردو کا تمام تر فروغ ادب تک محدود ہوا اور زبان کے مسائل پر غور وفکر کا سلسلہ بھی معدوم ہو کر رہ گیا۔ اردو تعلیم بھی اعلا تعلیم تک محدود کر دی گئی۔ گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں میں ریسرچ کرنے والے طلبہ میں اکثریت ان کی ہو گئی جنھوں نے پرائمری درجات، ہائر سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری کی سطح پر اس زبان اور اس کے ادب کا بالکل مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اسکولوں کی سطح پر اردو تعلیم کا شیرازہ بکھرنے کے بعد ایک طرف تو اردو دینی مدرسوں میں پناہ گزیں ہوئی اور دوسری طرف مسلم سیاست کے زیر اثر خصوصاً شمالی ہند میں دینی مدارس کی ڈگریوں کو 'اورینٹل امتحانات کی ڈگریاں' قرار دے کر ہیومینٹیز Humanities میں یونی ورسٹی کی ڈگریوں کے مساوی تسلیم کر لیا گیا۔ مدرسے کے طلبہ اس طرح کسی بھی یونی ورسٹی میں ایم اے اردو (ادب) میں داخلہ لینے کے مجاز ٹھہرے۔ ان طلبہ کی اکثریت اردو ادب کی طرف مڑ تو گئی مگر ان طلبہ کے لئے اردو صرف مذہب اسلام کے مطالعے کی زبان تھی۔ اکثر صورتوں میں ان کی ذہنی اور علمی تربیت میں اردو ادب کا چوں کہ کوئی رول نہ تھا یوں اردو ادب ان کے لئے کفریات کے ہم معنی بھی تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان طلبہ نے مختلف علوم کے اس نصاب کا بالکل مطالعہ نہیں کیا تھا جن کی فہم یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کے خواہاں طالب علموں میں ہونا ضروری ہے۔ یونی ورسٹیوں کے شعبوں میں اس طرح کے طلبہ کی بھیڑ جمع ہوتی گئی کہ اُن کی شخصیت کی بوالعجبی اور علم کا اکہرا پن دور سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد سے تا حال اردو زبان اور تعلیم کی تدریس کے مسائل پر جو تحریریں بھی سپرد قلم کی گئیں، ان میں اور اردو کی علامتی شاعری میں کچھ

زیادہ فرق نہیں۔ ہمارے پاس اس زمانے میں لکھی گئی ایسی کوئی تحریر بھی نہیں ہے جو اردو ادب کے سیاسی وسماجی محرکات کے مطالعے کو محیط ہو۔

1947 سے 1995 تک اردو کی صورت حال کا جائزہ برطانوی اسکالر رالف رسل نے اپنے ایک مضمون Urdu in India Since Independence میں کوئی دس برس پہلے لیا تھا۔ رالف رسل نظریاتی طور پر کمیونسٹ ہیں اور اردو سیاست کے محرکات کی انھیں خوب سمجھ ہے۔ رالف رسل نے تقریباً چالیس برسوں تک لندن یونیورسٹی کے مشہور زمانہ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں ہیں۔ وہاں وہ اردو ہی پڑھاتے تھے۔ ان کا اپنا علمی کام بھی اردو ادب سے متعلق ہے۔ غالب اور عہد غالب ان کی خصوصی دل چسپی کے موضوعات ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی کے بعد سے آج کی تاریخ تک، اردو زبان کی سیاسی وسماجی صورت حال اور اردو تعلیم کے کسی پہلو پر اردو میں کوئی علمی کام نہیں ہوا۔ مغرب کی علمی دنیا میں ہندستان کی سیاست اور مسلمانوں پر بعض ایسے کام البتہ ہوئے ہیں جن میں اردو کو بھی مسلم حیثیت کی زبان کے طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے مگر ایسے بیش تر کاموں کی حیثیت (اردو کے حوالے سے) میری نظر میں خاصی مشکوک ہے۔ اول تو ان تحریروں کے مصنفین کو اردو نہیں آتی تھی دوم ان میں سے اکثر کام اس زعم کے ساتھ کئے گئے کہ مصنف مغربی دانش ور ہے۔ یونی ورسٹی آف واشنگٹن (سیاٹل) کے شعبۂ سیاسیات کے استاد پول آر براس نے Language, Religion and Politics in North India پر اپنی علمی فتوحات کو کتابی شکل میں اور اسی کے زیر عنوان Cambridge University Press سے 1974 میں شائع کیا تھا۔ مغرب ہی نہیں بلکہ ہندستان کی انگریزی داں علمی دنیا میں بھی اس کام کی بڑی شہرت ہے مگر جہاں تک اس کے اردو سے متعلق حصے کا تعلق ہے تو واقعتاً یہ بڑی معمولی حیثیت کا کام ہے کیوں کہ اردو کی حد تک اس کام کی علمی بنیاد سرکاری دستاویزوں پر ہے۔ بعد میں اپنی دوسری کتاب The New Cambridge History of India میں بھی، جسے کیمبرج یونیورسٹی پریس ہی نے 1990 میں شائع کیا، پول براس نے اس موضوع پر دوبارہ خامہ فرسائی کی۔ علمی موضوع کے طور پر انھیں اُس وقت بھی اردو کے مسئلے کی اتنی ہی سمجھ تھی جتنی 15 برس پہلے رہی ہوگی۔ دوسری کتاب کے اس حصے میں جو اردو سے متعلق ہے، فکر کو مہمیز کرنے والی کوئی بات نہیں۔ اردو زبان و تعلیم سے متعلق خود ہندستان میں سپرد قلم کی گئیں وہ انگریزی تحریریں بھی بس تازیانۂ عبرت کا درجہ رکھتی ہیں جن کی اساس سوشل سائنس کے کاموں کے طرز پر ہے۔ چوں کہ ادب اور لسانیات اور اردو زبان کی تاریخ نویسی بھی میرے اس مضمون کے دائرے سے باہر ہیں اس لئے میں نے کرسٹوفر کنگ کی کتاب One Language, Two Scripts: The Hindi movement in nineteenth century north India پر بھی اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ کنگ کی یہ مشہور کتاب Oxford University Press سے 1994 میں شائع ہوئی۔ اس ذیل میں آنے والی دیگر کتابوں پر بھی میں نے اس مضمون میں کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی میں سیاسیات کی پروفیسر زویا حسن کی کتاب Quest for Power: Oppositional movements and post congress politics in Uttar Pradesh, Delhi, Oxford Univeristy Press, 1998 میں بھی اردو کے موضوع کو بھی تختۂ مشق تو بنایا گیا ہے مگر اس بے دلی کے ساتھ کہ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب کتاب کی جگہ ان کے معاونین نے بہت بے دلی سے اردو سے متعلق جو کچھ ملا اس کا الٹا سیدھا تجزیہ کر کے اپنے آقا کی خدمت میں پیش کر دیا جسے پروفیسر زویا حسن نے کسی علمی مہارت کا استعمال کیے بغیر، اغلب ہے کہ معمولی ترمیمات کے ساتھ شامل کتاب کرلیا۔ اگر اس قبیل کی کتابوں اور مضامین کی فہرست سازی کی جائے تو بس عبرت کے مزید نمونے ہی سامنے آئیں گے، اس لئے موجودہ تجزیے میں اس قسم کی تحریروں پر رائے زنی سے بھی اغماز کیا گیا ہے۔

رالف رسل کا مذکورہ مضمون ان معنوں میں نہایت اہم تھا کہ آج بھی اس کی گونج علمی حلقوں میں سنائی دیتی ہے، اسی لئے، اس کے ان مختلف حصوں کا تجزیہ جن کی افادیت اب بھی برقرار ہے، اس مضمون میں شامل ہے۔

رالف رسل کے مضمون کی اولین اشاعت 1997 میں ان کی کتاب How Not to Write the History of Urdu Literature and Other Essays میں ہوئی جسے آکسفوڈ یونی ورسٹی پریس، نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر ارجمند آرا نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ہندو پاکستان کے متعدد اخبارات ورسائل میں شائع ہوا[1]۔ انگریزی متن بھی کئی اخبارات وجرائد میں شائع ہوا۔ بمبئی سے شائع ہونے والے مقتدر علمی مجلے Economic and Political Weekly میں مضمون کی اشاعت[2] کے بعد قارئین کے کئی اہم خطوط شائع ہوئے[3] ان میں مضمون کے بعض اہم نکات پر بحث کی گئی تھی۔ خصوصاً سید شہاب الدین نے اپنے تفصیلی خط میں بہ شمول دیگر اہم امور، اس بات پر بھی زور دیا کہ اردو تعلیم کے فروغ

کے لئے رضا کارانہ کوششیں بڑی مبارک بات ہیں مگر ہندستان جیسی ترقی پذیر معیشت developing economy میں عام اردو آبادی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی غرض سے ایسا مساوی نظام تعلیم مہیا کرا سکے جس میں اردو تعلیم کا بھی نظم ہو۔ علی گڑھ کے علی عمران زیدی نے اپنے طویل خط کے ذریعے بڑی اہم نظریاتی بحث شروع کی اور ایسے کئی اہم واقعات کی یاد دلائی جس میں اردو کے کئی اہم اہلِ قلم حضرات (مثلاً علی سردار جعفری) سے متعلق ان واقعات کا ذکر تھا جو ہمیں یاد دلاتے تھے کہ کس طرح اردو اہلِ قلم خود کو حکومت کے ہاتھوں فروخت کرتے رہے، حکومت کے تلوے چاٹتے رہے۔ زیدی صاحب نے اردو اداروں کی اس سماجیات پر بھی روشنی ڈالی تھی جو ان اداروں کو حکومت کا ہم نوا بناتی تھی۔ یہ سلسلہ اب بھی اور اسی طرح جاری ہے۔ علی عمران زیدی نے ہمیں ایسے کئی واقعات کی بھی یاد دلائی جب اردو اداروں سے وابستہ افراد اقتدار سے قریب ہو گئے اور حکومت کی اردو کُش پالیسیوں کے خلاف انھوں نے اردو عوام کو خبردار نہیں کیا۔

زیدی صاحب اور دوسرے لوگوں نے گجرال کمیٹی رپورٹ کا معاملہ بھی اپنے خطوط میں اٹھایا اور کہا کہ اول تو رپورٹ میں کوئی کام کی بات ہے ہی نہیں کیوں کہ رپورٹ ایک populist قسم کی دستاویز ہے۔ دوسرے جب اندر کمار گجرال خود وزیر اعظم بنے تو انھیں اس رپورٹ کی یاد نہیں آئی۔ گجرال کمیٹی کے سلسلے میں یہی بات سلمان خورشید اور دانیال لطیفی نے بھی اپنے خطوط میں کہی۔ گجرال کمیٹی سے متعلق مجھے ان خیالات سے مکمل اتفاق تھا اور ہے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ شمالی ہند خصوصاً اتر پردیش کے اردو والے تقسیم کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس امید پر بیٹھے رہے کہ اردو کا تحفظ حکومت یا سیکولر ذہن کے وہ ہندو کریں گے جن میں سے کچھ کو اردو بھی آتی ہے۔ دانیال لطیفی نے اپنے خط میں ہندستان کے مسلم دانش وروں کے منافقانہ رویے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہندستان میں اعلا سرکاری عہدوں پر مامور مسلم افسروں کا رویہ بھی پوری طرح منافقانہ رہا۔ ایک طرف ان افسروں نے اپنے دورانِ ملازمت حکومت کو غلط اور مسلم کُش مشورے دیے تو دوسری طرف ان میں سے اکثر نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد مسلم قوم کی رہنمائی کا خواب دیکھنے لگے۔ دانیال لطیفی کے خیال میں ان مسلم افسروں کی اکثریت لیڈرشپ رول کے لئے قطعی موزوں نہیں تھی کیوں کہ وہ کسی بھی طرح اس کے اہل نہیں تھے۔ دانیال لطیفی کا تعلق ہندستان کے ایک بے حد ممتاز گھرانے سے تھا۔ ان کے نانا بدرالدین طیب جی انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے صدر تھے[4]۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں دانیال لطیفی قانون کے طالب علم تھے اور وہیں وہ کمیونسٹ بن گئے۔ ہندستان میں اپنی وکالت کے دوران وہ عمر بھر بائیں بازو کے نظریات کی تبلیغ کرتے رہے اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کے بڑے علم بردار کہلائے۔ شاہ بانو کے مشہور زمانہ مقدمے میں دانیال لطیفی سپریم کورٹ میں شاہ بانو کے وکیل تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک اردو رسم خط کو رومن میں لکھنے کے بھی حامی رہے تھے اور انھوں نے رومن میں دیوان غالب بھی شائع کیا تھا۔ بعد میں اپنے ایک مضمون میں[5] دانیال لطیفی نے اس امر کا بھی عندیہ دیا کہ رومن میں اردو لکھنے کی وکالت انھوں نے صرف اس لئے کی تھی کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کم پڑھے لکھے کاتبوں کے ہاتھوں بھی اردو تباہ ہو۔ دانیال نے اس سلسلے میں مزید کہا کہ اب جب کہ کمپیوٹر کے ذریعے اردو کمپوزنگ ممکن ہے، اردو رسم خط بدلنے کی کوئی وجہ نہیں مگر اردو والوں کو دوسرے علوم خصوصاً سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو رسم خط میں اشاعت کی طرف توجہ دینی چاہئے۔

1996 کا سال ہندستان کی سیاست میں واحد بڑی سیاسی جماعت کے طور پر کانگریس کے زوال اور اتحاد کی سیاست کی ابتدا کا علامیہ تھا۔ 1996 میں کانگریس کی سیاسی شکست آئندہ 10 برسوں تک اسے اقتدار میں نہ لا سکی اور 2004 میں کانگریس کی اقتدار میں واپسی تو ہوئی مگر اتحاد کی سیاست کے ذریعے۔ 1996 میں کانگریس کا زوال اردو اور مسلمانوں سے متعلق اس کی پالیسیوں کے ازکار رفتہ ہونے کا علامیہ بھی تھا۔ 1989 میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے منڈل کمیشن کے ذریعے ہندوؤں میں ریزرویشن کی سیاست کو ایک نیا اور فیصلہ کن موڑ دیا جس نے ہندستان کی سیاست کا خلقیہ ہی بدل دیا۔ 1991 میں اقتصادی کھلے پن کی پالیسوں کے آغاز کے ساتھ ہی، زبان کے نام پر سیاست کرنے کے امکانات بھی خود بہ خود معدوم ہوتے گئے۔ اردو کے احیا کی تحریک میں بھی ایک نیا موڑ آیا اور اردو کے احیا کا ایجنڈا ماضی سے قطعی مختلف خطوط پر متعین ہوا۔ تبدیل شدہ حالات میں اردو کے احیا کی تحریک چلانے والے بھی، فطری طور پر، ماضی سے مختلف تھے۔ دانیال لطیفی کے ساتھ راقم الحروف نے Linguistic Minorities' Guild نام کے ایک نئے محاذ سے اردو کے احیا کے لئے کوششیں شروع کیں[6]۔ ابتدا میں علی گڑھ کا ادارہ جامعۂ اردو بھی اس محاذ میں معاون تھا مگر بعد میں جامعۂ اردو اس درجہ تنازعات میں گھرا اور اس کے رجسٹرار انور سعید پر ہر طرح کی بدعنوانیوں کے اتنے زیادہ الزامات لگے کہ جلد ہی جامعۂ اردو کو احیائے اردو کی اس تحریک سے الگ کر دیا گیا۔ جامعۂ اردو کے زوال اور وہاں ہو رہی بدعنوانیوں

کی کہانی الگ ہے اور میں سر دست اس کی تفصیل سے درگزر کرتا ہوں۔
Linguistic Minorities' Guild نے اگر ایک طرف یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا معاملہ اٹھایا[7] تو دوسری طرف ملک کی مقتدر ہستیوں کو بھی اردو کے احیا کی تحریک سے وابستہ کیا۔ اس تحریک کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اسکولوں میں اردو تعلیم کے سوال کو بہت زور سے اور تمام تر قوت کے ساتھ اٹھایا اور اردو کے احیا کا ایک نکاتی ایجنڈا اسکولوں خصوصاً سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم کے مطالبے تک محدود رکھا۔ 1999 میں جب Commission to Review the Working of the Constitution بنا تو میں نے اسے ایک میمورینڈم پیش کیا جس میں آئین کی دفعہ 347 میں، جو ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے سے متعلق ہے، اس طرح ترمیم کی درخواست کی گئی تھی کہ ہر صوبے میں اس زبان کو دوسرے سرکاری زبان کا درجہ مل جائے جسے کل آبادی کا 10 فی صد حصہ بھی اپنی مادری زبان قرار دیتا ہو۔ لسانی اقلیتوں کے کمیشن کو مزید اختیارات دینے کا معاملہ بھی اس عرض داشت کا حصہ تھا۔ کمیشن نے یہ مطالبات منظور کر لئے۔ اس میمورنڈم کا متن ضمیمہ نمبر 2 میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

1989 میں شمالی ہند کے صوبۂ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا تھا مگر دوسری سرکاری زبان کا یہ درجہ کسی طرح بھی اردو تعلیم کے فروغ میں معاون نہ ہوسکا تھا۔ حکومت کی بدنیتی کے سبب اس قانون کا نفاذ بھی نہ ہوسکا۔ برسر اقتدار ہر حکومت نے دلیل دی کہ معاملہ چوں کہ عدالت میں ہے یوں اس قانون کا نفاذ ممکن نہیں۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ معاملہ عدالت میں تو تھا اور ہے مگر چوں کہ عدالت نے قانونِ اردو کے نفاذ پر روک نہیں لگائی تھی یوں دوسری سرکاری زبان کے اس قانون کا بآسانی نفاذ ہوسکتا تھا جو حکومت کی اس مسئلے سے عدم دل چسپی کے سبب نہ ہوسکا۔ یہ مقدمہ ہنوز سپریم کورٹ میں زیر التوا ہے مگر اب چوں کہ ہندستان کی سیاست میں زبانوں اور خود مسلم سیاست میں اردو کا مسئلہ حاشیے پر چلا گیا ہے تو اس موضوع پر کوئی بات کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ گذشتہ 16 برسوں کے دوران جب اولاً یہ مقدمہ یوپی ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ میں زیر غور رہا اور پھر اپیل کے طور پر سپریم کورٹ میں آ گیا، تب بھی اردو کی کسی تنظیم یا کسی مسلم جماعت نے عدالت میں زیر غور اس کیس میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔ یہ مقدمہ مدعی یوپی ہندی ساہتیہ سمیلن بنام اتر پردیش حکومت کے طور پر یوپی ہائی کورٹ میں 1990 سے 1996 تک زیر غور رہا اور اس کے بعد اب سپریم کورٹ کے فیصلے کا منتظر ہے۔ 1998 تک اردو دنیا اور مسلم سیاست اس مقدمے کے وجود سے مکمل طور پر بے خبر رہے۔ 1998 میں راقم الحروف نے پہلی بار اس مقدمے کی تفصیلات حاصل کرکے انھیں عام کیا۔ ویسے یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ UP Official Languages Act 1951 میں ترمیم کرکے دیا گیا تھا۔ UP Official Languages Act 1951 کے مطابق صوبے میں صرف ہندی ہی سرکاری کام کاج کی زبان ہوسکتی تھی۔ اتر پردیش کے وزیر اعلا کے طور پر چودھری چرن سنگھ نے کہا بھی تھا کہ آزاد ہندستان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہم نے اتر پردیش کی ریاست کو یک لسانی ہندی ریاست بنا دیا ہے۔ ہندی کے نام پر کی جانے والی فیصلہ کن سیاست کے سب سے بڑے مرکز یعنی اتر پردیش میں قانونِ اردو کا نفاذ اگر ہو بھی جاتا تو بھی وہ صرف سرکاری دفاتر میں اردو کے استعمال کی راہ ہموار کرسکتا تھا مگر سوال یہ تھا اور ہے کہ جب یوپی میں اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام سرے سے ہے ہی نہیں اور اسی لئے وہاں سماجی منظر نامے پر اردو جاننے والے ہی مفقود تھے تو پھر سرکاری دفاتر میں اردو کا استعمال کیوں کر ممکن تھا؟ اس سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ہندستان کے سیاسی طور پر سب سے طاقت ور صوبۂ اتر پردیش میں جہاں مسلمان سیاست میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مقصد اردو کا استعمال محض ایک کھلونے کے طور پر کرنا تھا۔ 2003 میں ریاستی انتخابات سے ذرا قبل دہلی میں بھی اردو کو پنجابی کے ساتھ دوسری سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ نتیجہ یہاں بھی صفر ہی رہا کیوں کہ دہلی میں بھی سماجی منظر نامے پر اردو کے موجود نہ ہونے سے اردو کی ترقی کی منطق موجود نہیں تھی۔

1998 میں Linguistic Minorities' Guild کی تحریک کے نتیجے میں ہندستان کے نامور ماہرین قانون نے اردو کے احیا کی وکالت کی۔ اُس وقت کے حقوق انسانی کے کمیشن کے چیرمین جسٹس ایم این وینکٹ چلیا کے ساتھ متعدد دوسرے لوگ بھی اس تحریک کے ساتھ ہوگئے[8]۔ اس تحریک کو ایک طرح سے بائیں بازو کے نظریات کی تحریک کہا جاسکتا ہے جس نے اس وقت حزب مخالف کی لیڈر سونیا گاندھی کو 8 مارچ 1999 کو ایک اہم میمورینڈم پیش کیا[9] جو 2002 میں سونیا گاندھی کے بین الاقوامی اردو کانفرنس میں وہ اہم الوداعی خطبہ دینے کا سبب بنا جس میں سونیا گاندھی نے بھی اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کے احیا کی دلیل کی حمایت کی۔[10] یہ کانفرنس ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل نے 8-11 فروری 2002 کو نئی دہلی میں

منعقد کی تھی۔ 2004 میں کانگریس کے مرکز میں زیر اقتدار آنے کے بعد ترقی پسند محاذ حکومت نے اردو کے فروغ کا ایجنڈا Common Minimum Programme میں شامل رکھا۔ سونیا گاندھی کی غالباً اس تقریر کے سبب ہی حکومت نے 6-2005 کے بجٹ میں اسکولوں کی سطح کے تعلیمی نظام میں اردو تعلیم کے لئے 800 کروڑ روپے مختص کیے جو اردو کے لئے آزادی کے بعد مختص کی گئی مجموعی رقم سے بھی زیادہ تھے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس رقم کا کوئی فائدہ اس لئے نہ اٹھایا جاسکا کیوں کہ نہ اردو تعلیم کا وہ نظام پہلے سے موجود ہی نہ تھا جہاں اس رقم کو خرچ کیا جاسکے۔ نہ ہی حکومت کے پاس اردو تعلیم کے نظام کے احیا کا کوئی منصوبہ تھا۔ یوں نتیجہ یہ ہوا کہ مالی سال کے آخر میں مختص کی گئی رقم Lapse ہو گئی اور آئندہ مالی سال میں حکومت نے اس رقم کو دوبارہ مختص کرنے کی زحمت اس لئے نہیں کی کیوں کہ اردو والوں کی طرف سے ایسا کوئی مطالبہ ہی نہیں کیا گیا۔ 2002 میں ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کے ذریعے منعقد کی گئی کانفرنس کا اردو کے سیاق وسباق میں آزادی کے بعد یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس کانفرنس میں دنیا بھر کے وہ تمام مقتدر ماہرین تعلیم اور مستشرقین شامل ہوئے جنھوں نے اردو کے کسی بھی زاویے پر علمی کام کیا ہے۔ ان علما میں غیر ملکی دانش گاہوں سے وابستہ تعلیم، تاریخ، ثقافت اور سیاسیات کے ماہرین کے ساتھ ساتھ ہندستان کے بھی بہت سے صفِ اول کے ماہرین تعلیم اور دانش وروں نے شرکت کی۔ پہلی بار اردو سے متعلق کسی کانفرنس میں ہندستان کے تمام صوبوں سے ایجوکیشن سکریٹریز شریک ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے اپنے صوبوں میں اردو تعلیم کی صورت حال کا تجزیہ سرکاری پالیسیوں کے تناظر میں کیا۔ اس کے علاوہ متعدد صفِ اول کے پبلک اور کونونٹ اسکولوں کے پرنسپل حضرات نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی۔ اُن صوبائی بورڈوں کے چیرمین (بہ شمول CBSE اور ICSE) بھی اس کانفرنس کے شرکا میں تھے جو ریاستی سطح پر دسویں اور بارہویں درجات کے امتحان لیتے ہیں۔

کانفرنس میں پڑھے جانے والے بعض مقالات کا اردو ترجمہ دہلی اردو اکادمی کے ترجمان ماہ نامہ 'ایوانِ اردو' نے دسمبر 2002 کے خصوصی شمارے میں شائع کیا[11]۔ یہ ایک خصوصی شمارہ تھا جس کا مقصد ہی ان مقالات کو شائع کرنا تھا۔ اسی قسم کا خصوصی شمارہ انگریزی سہ ماہی Social Scientist نئی دہلی نے بھی شائع کیا[12]۔ سوشل سائنٹسٹ کے بعض مضامین کے تراجم اردو ماہ نامہ 'شب خون' الہ آباد میں بھی شائع ہوئے۔ متعدد دیگر رسائل وجرائد نے بھی کانفرنس میں پڑھے گئے بعض مضامین یا ان کے تراجم شائع کیے۔ قدر شناسی کے بعد بعض مضامین حذف کرکے بقیہ مضامین آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس نئی دہلی نے جون 2006 میں Redifining Urdu Politics in India کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کیے۔ اس کتاب کا ایڈیٹر راقم الحروف ہی ہے۔ 300 صفحات کو محیط اس کتاب میں مندرجۂ ذیل مقتدر علماء کے مضامین شامل ہیں:

1۔ حسن عبداللہ 2۔ (ڈاکٹر) ارجمند آرا 3۔ (ڈاکٹر) ڈیبلا بریڈی 4۔ (پروفیسر) جے۔ ایس۔ گاندھی 5۔ سلمان خورشید 6۔ (پروفیسر) پرتاپ بھانو مہتا 7۔ (پروفیسر) بابراڈی مینکاف 8۔ فالی ایس۔ ناریمن 9۔ (ڈاکٹر) کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ 10۔ (ڈاکٹر) کیلی پیمبرٹن 11۔ (ڈاکٹر) کیرن گرافن 12۔ سید شہاب الدین 13۔ (پروفیسر) یوگیندر سنگھ 14۔ سولی جے۔ سوراب جی 15۔ (پروفیسر) یوگیش تیاگی 16۔ (پروفیسر) تھوڈر پی۔ رائٹ جونیر 17۔ (ڈاکٹر) آمنہ یقین۔

اولاً جب رالف رسل کا مضمون (Urdu in India since Independence) اشاعت کے لئے مکمل ہوا تو انھوں نے اردو کے ذیل میں لکھی گئی راقم الحروف کی تحریروں کے حوالے سے اس پر سخت تنقید کی تھی۔ رالف رسل نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان میں اردو زبان کے مسائل سے متعلق علمی کاموں کے ذیل میں آنے والا کام صرف راقم الحروف ہی کا ہے مگر راقم الحروف سے رالف رسل کو شکایت یہ تھی کہ اس نے (رالف رسل کے بہ قول) اردو کے ماضی کا تجزیہ اور مستقبل میں اس کے احیا کے خطوط پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کے ساتھ اردو کے رشتوں پر اتنا زیادہ زور دیا تھا کہ اردو اور مسلمان نہ صرف ایک ہی سکے کے دو رخ بن کر رہ گئے تھے بلکہ آئندہ بھی اردو کا تحفظ صرف مسلمانوں ہی کو کرنا تھا۔ رالف رسل کا یہ خیال بھی تھا کہ راقم الحروف نے مسلمانوں کے سیاسی رویوں اور ان کے جذباتی طرزِ عمل کا جس طرح دفاع کیا تھا اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کا ایسا وکیل معلوم ہوتا تھا جسے مسلمانوں میں تو کوئی خرابی ہی نظر نہیں آتی تھی۔ رسل کے اس تجزیے پر میں نے متعدد بار گفتگو میں اور خطوط کے ذریعے بھی یہ بات کہی کہ ان کا یہ بیان ایک نہایت ہی پیچیدہ صورتِ حال کا بے حد سطحی تجزیہ ہے۔

موجودہ فرقہ وارانہ دور سیاست میں اردو اور مسلمانوں کا ایک ہی سکے کے دو رخ ہو جانا کوئی مبارک بات نہیں کیوں کہ مسلم سیاست کے کئی چہرے ہیں جو شدت پسندانہ طور پر مسلم شناخت کے اس سوال سے جڑے ہوئے ہیں، اس کا استحصال کرتے ہیں جو Pan Islamic Identity کا سوال

ہے۔ 9/11 کے بعد تو Pan Islamic Identity کا سوال مسلم سیاست میں مرکزی حیثیت کا حامل ہو کر مسلم دہشت گردی کا جزو لاینفک بنتا جارہا ہے۔ تمام شہریوں کی زبانوں کی حفاظت جمہوری دور میں ہر ریاست کا فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں ناکامی پر ریاست پر بلا شبہ تنقید کی جانی چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ہندستان میں اردو کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی مگر آزاد ہندستان میں اردو کا سوال بہت پیچیدہ ہے اور اردو کے مایوس کن حالات کی بہت کچھ ذمے داری خود اردو والوں اور مسلم سیاست پر ہے۔ ہندستان کے موجودہ نظام میں جہاں پہلے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہیں، اردو کا تحفظ مسلمانوں کے ذریعے ان خطوط پر جو مذہب کے تحفظ کے لئے مخصوص ہیں، نہ تو اردو کے لئے مبارک ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے مناسب۔ اردو کے خلاف ریاست کے مایوس کن رویے کے حوالے سے میرے پی ایچ ڈی کے مقالے پر بھی رائے دیتے ہوئے رالف رسل نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اطہر فاروقی جو صحیح اور معروضی نتائج اخذ کرنے کے پوری طرح اہل ہیں، ان کے ذریعے اس قسم کے نتائج کا اخذ کیا جانا افسوس ناک ہے۔ رالف رسل نے اپنے مذکورہ مضمون میں میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کی اس زاویے سے بہت تعریف کی تھی کہ ہندستان میں آزادی کے بعد اردو کے موضوع پر وہ بہت محنت اور سیاسی فہم کے ساتھ لکھی گئی دستاویز تھی۔ میں نے کبھی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کو شائع نہیں کرایا۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد اور اردو کے محاذ پر دانیال لطیفی کے انتقال تک ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے بھی راقم الحروف کے وہ خیالات جن کا اظہار اس نے اپنی تحریروں میں کیا[13] وہ رالف رسل کی توجہ کا مرکز اس لئے نہ بن سکے کیوں کہ اس ایک مقالے کے بعد رسل کی دل چسپی ہندستان میں اردو زبان اور تعلیم کے موضوع سے ختم ہو گئی تھی۔ رالف رسل نے اپنے مضمون میں اس امر پر بھی زور دیا تھا کہ اردو ادب کے ان ہندی داں شائقین کے لئے جو اردو رسم خط سے ناواقف ہیں مگر اردو ادب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اردو کے ادبی شہ پارے دیوناگری لپی میں بھی دستیاب ہونے چاہئیں۔ میں اردو کے رسم خط کی تبدیلی اور اس کی جگہ دیوناگری لپی اختیار کرنے کا حامی کبھی نہیں رہا مگر اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے ہندی داں قارئین کے لئے میں نے اختر الایمان کے ضخیم کلیات 'سر و ساماں' کو دیوناگری لپی میں شائع کیا تھا۔ ان کی خود نوشت 'اس آباد خرابے میں' کو بھی اردو رسم خط سے دیوناگری لپی میں منتقل کیا تھا جو بعد میں بہ وجوہ شائع نہ ہو سکی۔ میری تمام تعلیم ہندی میڈیم سے ہوئی تھی اور ابتدا میں نے ہندی صحافی کے طور پر کام بھی کیا تھا۔ رالف رسل کے مضمون کی اشاعت کے بعد میں نے انھیں لکھا بھی تھا کہ مجھے ان کے اس نظریے سے اصولاً اتفاق ہے کہ اردو کے عظیم فن پاروں کا ان کے ہندی داں شائقین تک پہنچنا ضروری ہے مگر اس عمل کو اُس سیاست سے دور ہی رکھا جانا چاہئے جو کسی بھی طرح اردو رسم خط کو ختم کر کے اس کی جگہ دیوناگری لپی کو مسلط کر کے اردو کے ادبی سرمایے کو فنا کر دینا چاہتی ہے۔ رسل کی چوں کہ اس موضوع سے دل چسپی ختم ہو چکی تھی اس لئے انھوں نے کبھی اپنے اُس مضمون پر نظرِ ثانی نہیں کی۔ یوں میرے متعلق انھوں نے اولاً جو لکھا تھا وہ اب تک اسی طرح شائع ہو رہا ہے۔

اپنی تمام تحریروں میں اس بات پر میں نے بار بار زور دیا ہے کہ جب تک ہر سطح پر اردو تعلیم کا نظم اسکولوں میں نہ ہوگا، مسلم بچوں کے سامنے دینی مدارس کی تعلیم کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے۔ مسلمانوں سے متعلق چوں کہ ہندستان کی ہر سیاسی جماعت کی پالیسی populist قسم کی ہے اور یہی رویہ مسلم دانش وروں کا ہے۔ اس لئے میرے علاوہ آج بھی کوئی اس بات کو نہیں کہتا جسے میں نے بار بار زور دے کر کہا کہ دینی مدارس سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ ہندستان میں پہلی بار بھی یہ بات صرف میں نے ہی کہی تھی کہ دینی مدارس کی جدید کاری کی حکومتِ ہند کی اسکیم (جسے بعض صوبوں نے بھی نافذ کرنے کی ناکام کوشش کی) مکمل طور پر غیر آئینی ہے اور اسے فوراً ختم کر دیا جانا چاہیے۔ میرا آج بھی یہی خیال ہے کہ سرکاری اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم خواہ کتنی ہی غیر معیاری کیوں نہ ہو وہ بہر حال دنیوی علوم کی تعلیم ہے اور اس تعلیم کے اجزا کو دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دینی مدارس کے نصاب کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں اُن مضامین کی شمولیت کا سوال ہی نہیں۔ بنیادی طور پر دینی مدارس کا مقصد صرف مذہب کی تعلیم ہے اس لئے ان سے ایک ایسی زبان کے طور پر اردو کے احیا کی توقع کرنا اصولاً بھی غلط ہے جس میں ادب کے دل نشیں اجزا شامل ہوں۔ مسلم اساس پرستی کے فروغ اور دینی مدارس کے رول کے زیر بحث آنے کے بعد حکومتِ ہند نے دینی مدارس میں سوشل سائنس اور حساب اور سائنس کے مضامین کو شامل کر کے مدارس کے نظام پر قابو کرنے کی کوشش کی جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اول تو مدارس کی اکثریت ہی نے اس اسکیم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جن چند مدارس نے اس اسکیم کو نافذ کیا، انھوں نے بھی اس اسکیم کے نفاذ کے نام پر حکومت سے رقم وصول کی اور کھا گئے۔ اول تو آئینِ ہند ہی ہر طرح کے مذہبی اداروں پر ٹیکس دہندہ کی

کمائی خرچ کرنے کے خلاف ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مدارس میں ایک دفعہ سرکاری امداد کا دیا جانا دوسرے مذہبی اداروں میں بھی حکومت کی معاونت کا راستہ کھول دے گا اور آر ایس ایس جیسی تنظیمیں اپنے اداروں، جن میں دھارمک پاٹھ شالائیں اور ششو مندر لاکھوں کی تعداد میں ہیں، کے لئے حکومت کے خزانے کے دروازے کھول کر ان اداروں کا استعمال ہندو فرقہ واریت کے فروغ اور اپنے فسطائی عزائم کے لئے کریں گی۔

گذشتہ دس برسوں میں بین الاقوامی حالات کے زیر اثر ہندستان کے مسلمان بھی شناخت کے پیچیدہ سوال میں بری طرح الجھے رہے ہیں۔ دینی مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ اور اس ذیل میں مسلمانوں کی رضاکارانہ کوششیں ہندی مسلمانوں میں شناخت کے سوال میں آئے شدت پسندی کے محرکات کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ہندستان میں اس وقت ایسے دینی مدارس کی تعداد 5 لاکھ ہے جو ہمہ وقتی مدارس کے طور پر کام کر رہے ہیں اور وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے طلبہ چوں کہ کوئی دنیوی علم نہیں جانتے اسی لئے وہ یا تو دیگر مدارس میں معلم ہو جاتے ہیں یا پھر ایک نیا مدرسہ کھول لیتے ہیں۔ گویا دینی مدارس کی تعداد آئندہ اور زیادہ ترقی کرے گی اور ہندی مسلمانوں کی نئی نسل کا بڑا حصہ آئندہ ان دینی مدارس ہی سے فارغ التحصیل ہوگا۔ حکومت کے پاس دستیاب اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ہندستان کے دینی مدارس میں پڑھنے والے ہمہ وقتی طلبہ کی تعداد 5 کروڑ ہے گویا مسلمانوں کے 20-5 برس کی اوسط عمر کے 5 کروڑ بچے صرف دینی مدارس میں پڑھتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ان طلبہ میں وہ بچے شامل نہیں ہیں جو کسی بھی طرح کے سرکاری اسکول میں پڑھتے ہیں اور جز وقتی طالب علم کے طور پر صرف قرآن اور دینیات کی ضروری تعلیم کے لئے شبینہ یا جز وقتی دینی مدارس و مکاتب میں جاتے ہیں۔ دینی مدارس میں ذریعۂ تعلیم صرف اور صرف اردو ہے اور ہندستان میں اب دینی تعلیم کے نصاب کی تقریباً تمام تر کتب اردو ہی میں شائع ہوتی ہیں۔ گویا اب ہندستان کی مسلم آبادی میں پانچ کروڑ سے زیادہ طلبہ نہ صرف اردو رسم خط سے واقف ہیں بلکہ اردو پڑھنے اور لکھنے کی خوب صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ان طلبہ کے ذہن کی تربیت میں اردو ادب کا کوئی رول نہیں ہوتا اور ان کے ذہن پوری دنیا پر صرف مذہب اسلام کی بالادستی، اور وہ بھی ان کے مسلک کے مطابق، کے نظریے تک مرکوز ہوتے ہیں۔ یعنی ہندستان میں اب اردو کا احیا معجزاتی طور پر ہو چکا ہے مگر یہ احیا اسکولوں کے ذریعے نہیں ہوا کیوں کہ وہاں تو اردو تعلیم کا نظم آج بھی ویسا ہی ہے جیسا بیس برس پہلے تھا۔ شمالی ہند کے اسکولوں میں اردو کی صورتِ حال اب بھی اتنی ہی بدتر ہے جتنی تقسیم کے بعد ہوگئی تھی۔ ہندو مسلمانوں میں کشیدگی میں بے پناہ اضافے اور اردو کا احیا مدارس کے ذریعے ہونے کی وجہ سے اردو کے خلاف غیر مسلم حضرات خصوصاً ہندوؤں کے ذہن اب اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں جتنے تقسیم کے وقت تھے۔ غیر مسلم حضرات کے ذہن میں اب اردو مفروضہ طور پر بین الاقوامی دہشت گردی کی بھی زبان ہے اور یہ صورتِ حال تقسیم کے بعد کی صورتِ حال سے بالکل مختلف ہے۔ اردو کا موجودہ احیا اس عام آدمی کی زبان کے طور پر ہوا ہے جو اپنی مذہبی شناخت کے لئے فکرمند ہے۔

زبان کے اس احیا سے اردو ادب کی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی اس لئے واقع نہیں ہوگی کیوں کہ ادب اس عام آدمی کی زندگی میں کسی قدر کے طور پر موجود ہی نہیں جس نے اردو کا مطالعہ مذہبی ضرورتوں کے تحت کیا ہے۔ ہندستان میں اردو داں آبادی کے بچوں میں بہ مشکل تمام 10 فی صد بچے اسکول جاتے ہیں۔ اردو داں آبادی کے اسکول جانے والے بچوں میں بھی 90 فی صد بچے ڈراپ آؤٹ کا شکار ہو کر بارہویں درجے تک کسی نہ کسی سطح پر اسکول کی تعلیم کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اسکول جانے والے ان دس فی صد مسلم بچوں میں بھی اچھے اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کا تناسب کسی بھی طرح ایک فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ ان اچھے اسکولوں کی اکثریت پرائیویٹ اسکولوں پر مشتمل ہے جنھیں عرفِ عام میں پبلک یا پھر کونونٹ اسکول کہا جاتا ہے۔

ہندستان میں اردو کی اشراف لیڈر شپ جسے زمینی حقائق اور تعلیم کے متعلقات کی نہ تو کوئی خبر ہے اور نہ ہی ان معاملات سے اسے کوئی دل چسپی ہے، کے اردو سے متعلق تمام تر مطالبات کا زور ان اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم پر ہوتا ہے جہاں اردو مادری زبان والے بچے شاذ و نادر ہی جاتے ہیں۔ ان اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم کی عدم دستیابی اردو اشراف کے اس اخلاقی جرم کے ارتکاب کا جواز فراہم کراتی ہے کہ اسکول میں اردو تعلیم کا نظم نہیں اس لئے اشراف کا بچہ اردو نہیں پڑھتا۔ اور چوں کہ ان کا بچہ اردو نہیں پڑھتا یوں انھوں نے فرض کر لیا کہ ہندستان میں اردو مر رہی ہے یا مر چکی ہے۔ جب کہ زمینی صورتِ حال یوں مختلف ہے کہ دینی مدارس کی وجہ سے اردو کا احیا اس طرح ہوا ہے کہ اب تقریباً ہر اس مسلمان کو اردو آتی ہے جس نے کسی انگریزی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہمیں ہندستان میں اردو کے اس تبدیل شدہ منظر نامے کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی طرف توجہ

کرنی چاہیے۔ تقسیم کے وقت کے تصورات کی بنیاد پر اردو کی معاصر صورت حال کا تجزیہ کرنے کا وقت کب کا گزر چکا۔

مگر یہ اہم سوال جواب کا متقاضی ہے کہ وہ کیا محرک ہے جس نے مسلمانوں کو دینی مدارس کا اتنا وسیع اور منظم نظام تیار کرنے اور اسے رضا کارانہ طور پر زندہ رکھنے اور کامیابی سے چلانے کی طرف راغب کیا؟ جب مسلمان دینی مدارس کا اتنا بڑا انظام خود قائم کر سکتے ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ انھیں کس نے روکا تھا جو وہ خود اردو تعلیم کا انتظام اسکولوں میں نہ کر سکے۔ انھوں نے کبھی سنجیدگی سے حکومت سے اس کا مطالبہ نہیں کیا اور سب سے اہم یہ کہ خود اپنے اسکولوں میں بھی اردو تعلیم کے نظم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ اردو تعلیم کے مجموعی منظر نامے میں یہ اہم ترین سوال ہے، جس کا جواب سنجیدگی سے اور تمام محرکات کا باریک بینی سے تجزیہ کر کے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دینی مدارس کے اتنے بڑے نظام کا مسلمانوں کے ذریعے قیام سید شہاب الدین کی اس دلیل کو رد کر دیتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے اقتصادی حالات اس قابل نہیں کہ وہ سیکولر تعلیم کا نظام قائم کر سکیں۔

مسلمان اگر پانچ لاکھ مدرسے قائم کر سکتے ہیں اور انھیں کامیابی سے چلا بھی سکتے ہیں تو وہ بلاشبہ سیکولر تعلیم کے ادارے بھی قائم کر سکتے ہیں اور انھیں بھی کامیابی سے چلا سکتے ہیں، ان میں اردو تعلیم کا انتظام بھی کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن کی اس ساخت کو سمجھنے کی ہے جو سیکولر تعلیم کی ذمے داری تو حکومت پر ڈالنا چاہتی ہے، اسکولوں میں اردو تعلیم کی عدم موجودگی پر لمبی چوڑی بحثیں کرتی ہے، حکومت سے اردو تعلیم کے انتظام کا مطالبہ کرتی ہے، مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے لئے ریاست کو ذمے دار ٹھہراتی ہے مگر خود دینی مدارس کے اتنے بڑے نیٹ ورک کا قیام خاموشی سے کر کے کامیابی کے ساتھ ان کا انتظام کرتی ہے، انھیں چلاتی ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ میں مسلم بچوں کے لئے عام اسکولوں کے قیام یا اسکولوں کے نظام میں اردو کی عدم دستیابی پر حکومت کا دفاع کر رہا ہوں یا مسلمانوں کے ذریعے قائم کیے گئے دینی مدارس میں مسلم بچوں کے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے خلاف ہوں۔ میں تو اس سوال کے مختلف زاویوں پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو براہ راست یا بالواسطہ اردو کی تعلیم کے فقدان اور اس کے احیا سے جڑے ہوئے ہیں۔

ہندستان میں اردو کے حالات کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ زبان سیاست سے بہت زیادہ جڑی ہوئی ہے اور اس کا شاید ہی کوئی ایسا زاویہ ہے جو سیاسی نہ ہو۔ اردو کے نام پر سب سے زیادہ سیاست مسلم اشراف نے کی اور ہر شہری مسلمان لفظِ اردو سنتے ہی جو گفتگو شروع کرتا ہے اس کے خلقیے میں صرف سیاست کار فرما ہوتی ہے۔ ہندستان خصوصاً شمالی ہند کے مسلم اور اردو اشراف نہ صرف یہ کہ بہت زیادہ زیرک ہیں بلکہ حد درجہ کاہل بھی واقع ہوئے ہیں۔ وہ اردو کے احیا کے لئے اول تو خود کوئی عملی قدم اپنی کاہلی کی وجہ سے نہیں اٹھانا چاہتے دوم ان کے ذہن میں ہمیشہ یہ خیال بھی جاگزیں رہتا ہے کہ اردو کے نام پر کسی عملی قدم سے حکومت ناراض نہ ہو جائے اور اردو کے محاذ پر اس کا متحرک کردار انھیں کسی سرکاری فائدے سے محروم نہ کردے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے موضوع پر تمام گفتگو نہ صرف سیاسی نوعیت کی ہوتی ہے بلکہ اردو اشراف اردو کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ہمیشہ حکومتِ وقت کی پالیسی کا اچھی طرح خیال رکھتے ہیں۔ میں صرف ایک مثال کے ساتھ اپنی بات ختم کروں گا۔

جامعۂ اردو علی گڑھ ہندستان میں اردو کا ان معنوں میں اہم ادارہ تھا کہ اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کا نظام نہ ہونے کی صورت میں جامعۂ اردو کے امتحانات پرائیویٹ طالب علم کے طور پر دیے جا سکتے تھے جو بعض صوبائی حکومتوں کے ذریعے نوکریوں کے لئے اور متعدد یونی ورسٹیوں کے ذریعے بعض مخصوص کورسوں میں داخلے کے لئے منظور شدہ تھے۔ ہندستان میں اس قسم کے امتحانات کو Oriental Examinations کہا جاتا ہے۔ یعنی اگر کسی طالب علم نے انٹرمیڈیٹ میں اردو نہیں پڑھی اور اس نے جامعۂ اردو کا وہ امتحان پاس کیا ہے جو اردو کی حد تک انٹرمیڈیٹ کے مساوی ہے تو ڈگری کے وقت اس امیدوار کی جامعۂ اردو سے حاصل شدہ اردو کی ڈگری کو بھی تسلیم کیا جائے گا۔ تقسیم کے بعد خصوصاً اتر پردیش میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ (سینئر سکنڈری) کالج کی سطح سے اردو تعلیم کا مکمل صفایا ہو گیا تھا۔ ایسے میں حکومت نے جب بھی اردو کے لئے کچھ نمائشی قسم کے کام کیے تو جامعۂ اردو کی ڈگریاں بہت کام آئیں۔ یہ بات الگ ہے کہ جامعۂ اردو کے ڈگری یافتہ طالب علموں میں اردو کی استعداد بہت معمولی اس لئے ہوتی تھی کیوں کہ کسی سطح پر اردو پڑھے بغیر وہ امتحان نقل کر کے پاس کرتے تھے۔ جامعۂ اردو کے مراکز ہمیشہ سے Mass Copying کے لئے مشہور تھے۔ تقسیم کے بعد یہ ادارہ اردو دانش وروں کی چراگاہ بھی بنا رہا کیوں کہ اسے حکومت کی بالواسطہ حمایت حاصل تھی اور یہ مسلم سیاست کے مرکز علی گڑھ میں واقع تھا۔ 1997 میں علی گڑھ کے مقامی غنڈوں کی مدد سے انور سعید نام کا آدمی وہاں رجسٹرار بن گیا اور اس نے منتخب کمیٹی کو نکال باہر کیا۔ اردو اشرافیہ کے مزاج کے مطابق باہر نکلنے والی کمیٹی کے سربراہ کے طور پر ڈاکٹر رفیق زکریا

(چانسلر جامعۂ اردو علی گڑھ) نے کوئی عدالتی چارہ جوئی نہیں کی کیوں کہ عمل تو اردو اشراف کے طلقیے میں ہے ہی نہیں۔ وہ اگر کہیں تحرک کا مظاہرہ کرتا بھی ہے تو صرف حکومت کے اشارے پر، حکومت کے کسی مفاد کے لئے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کانگریس کی سیاست سے نصف صدی تک وابستہ رہے اور وہ تقریباً پچیس برس تک جامعۂ اردو کے چانسلر تھے۔ انھوں نے جامعۂ اردو کا استحصال جی بھر کر کیا۔ مکروہ و مردود ایمرجنسی کی حمایت میں قرارداد پاس کرنے والا جامعۂ اردو ہندستان کا وہ واحد تعلیمی ادارہ تھا جس نے اندرا گاندھی کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی دی۔ بعد میں جامعۂ اردو کے اقتدار پر قبضے کے خواہاں متعدد گروہ باہمی طور پر علی گڑھ میں متصادم ہو گئے۔ کبھی غنڈوں کا ایک گروہ جامعۂ اردو پر قابض ہو جاتا تو کبھی دوسرا۔ مگر ہندستان کے کسی اہم اردو والے نے جامعۂ اردو کے سلسلے میں عدالت کی مدد حاصل کرنے کی طرف کبھی کوئی پہل نہیں کی۔ اردو کے کسی ادارے، مسلمانوں کی کسی تنظیم نے کوئی عدالتی چارہ جوئی آج کی تاریخ تک نہیں کی ہے۔ غنڈوں کے درمیان یہ محاذ آرائی اب بھی جاری ہے۔ انور سعید کو اب باہر نکال دیا گیا ہے اور ان پر کوئی دس کروڑ روپے کے غبن کا مقدمہ مقامی انکم ٹیکس کا دفتر چلا رہا ہے۔ جامعۂ اردو کی ڈگریوں کو ریاستی حکومتوں نے نوکریوں کے لئے اور مختلف یونی ورسٹیوں نے (اردو کی اضافی قابلیت کے طور پر) داخلے کے لئے نامنظور de-recognise کر دیا ہے اور جامعۂ اردو اپنی موت خود مر گئی ہے۔ OO

حواشی:

1۔ بہ شمول دیگر اخبارات و جرائد کے سہ ماہی ادیب، جامعۂ اردو علی گڑھ شمارہ نمبر 1 تا 4 جلد 22 بابت جنوری تا دسمبر 1998 ص ص 59-1 میں بھی یہ ترجمہ شائع ہوا۔

2۔ اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی، ممبئی 8-2 اور 15-9 جنوری 1999 (مشترک) شمارہ نمبر 1 اور 2 ص ص 44-48

3۔ اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی، ممبئی میں شائع شدہ مباحثی خطوط کی تفصیل: Urdu and Its Future in India، مکتوب از سید شہاب الدین، مارچ 13-6، 1999 ص 566؛ Urdu and Its Future in India جواب از رالف رسل، اپریل 24-17، 1999، ص 930؛ Urdu Language and Education، از علی عمران زیدی، 10 اپریل 1999، ص 858؛ The State and Urdu Language جواب از رالف رسل، جون 5، 1999، ص 1382؛ Future of Urdu از دانیال لطیفی، مئی 15، 1999، ص 1150؛ Urdu in India از سلمان خورشید جنوری 8، 2000، ص 2 دانیال لطیفی اور سلمان خورشید کے خطوط کے جواب میں رالف رسل نے کوئی وضاحت شائع نہیں کرائی۔

4۔ دانیال کے سوانحی کوائف کو مجیا نذرانۂ عقیدت کے طور پر اکنومک اور پولیٹکل ویکلی ممبئی نے یکم جولائی، 2000 کے شمارے میں ص 2368 پر Danial Latifi 1917-2000 کے عنوان سے ایک تفصیلی تعزیتی نوٹ شائع کیا تھا، اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

5۔ دانیال لطیفی، Preserving Urdu Through Self Help، اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی مئی 29، 1999، ص ص 22-1321

6۔ Linguistic Minorities' Guild کی طرف سے جاری کردہ پہلی پریس ریلیز پر دانیال لطیفی، میر اختر حسین، اطہر فاروقی اور رجحنہ آرا کے دستخط ہیں۔ یہ پریس ریلیز 16 جنوری 1999 کو جاری کی گئی اور اس میں Guild کے قیام کی تاریخ 11 جنوری 1999 اور مقام 61 لائرس چیمبرز سپریم کورٹ آف انڈیا درج ہے۔ یہ دانیال لطیفی کا چیمبر تھا۔ پریس ریلیز کے مطابق LMG کا خاص مقصد ہندستانی آئین کی دفعہ 29 کے تحت ان طبقات کے حقوق کا تحفظ ہے جو ہندستان میں رہتے ہیں اور جن کی مخصوص زبان، رسم خط اور کلچر ہیں۔ ان طبقات کا آئینی حق ہے کہ وہ اپنی زبان، رسم خط اور کلچر کا تحفظ کریں۔ اس مختصر پریس ریلیز کا متن بھی مضمون کے آخر میں ضمیمہ نمبر 1 میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

7۔ اس موضوع پر دانیال لطیفی کا بے حد عمدہ اور معلوماتی مضمون ان کے انتقال کے بعد Urdu in UP اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی ممبئی فروری 17، 2001، ص ص 35-533 اور سید شہاب الدین کا رد عمل Urdu in UP اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی ممبئی اپریل 14، 2001، ص ص 51-1150 ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ دانیال کے انتقال کے بعد ہی ان کا یہ مضمون Bar Association of India کے مجلے انڈین ایڈووکیٹ میں بھی بہ عنوان The struggle for Urdu in UP شائع ہوا۔ حوالے کے لئے دیکھیے جلد XXIX، شمارہ نمبر 1999-2000، ص ص 50-44

8۔ Linguistic Minorities' Guild کے جلسے مورخہ 16 اپریل 1999 میں جسٹس ایم این وینکٹ چلیا کی تقریر کا متن اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی ممبئی کے 26 جون، 1999 کے شمارے میں بہ عنوان Language and Politics: Status of Urdu in India، ص ص 60-1659 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

9۔ میمورنڈم کا متن مضمون کے آخر میں ضمیمہ نمبر 2 کی شکل میں ملاحظہ کیجیے۔

10۔ کانفرنس کی قراردادیں اردو کے احیا کی تحریک کی ایک اہم دستاویز ہیں۔ سونیا گاندھی کے افتتاحی خطبے کے ساتھ جو ضمیمہ 4 کے طور پر شامل ہے، قراردادوں کا متن ضمیمہ نمبر 5 کے طور پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ کانفرنس کے مضامین کتابی شکل میں Oxford University Press نئی دہلی نے Redefining Urdu Politics in India کے عنوان سے مئی 2006 میں شائع کیے ہیں۔ کتاب کا ایڈیٹر راقم الحروف ہے۔

11۔ جلد 16، شمارہ نمبر 8

12۔ جلد 31 شمارہ 5، جلد 31 شمارہ 6-5 بابت مئی، جون 2003

13۔ بین الاقوامی اردو کانفرنس کے دعوت نامے کے ساتھ جاری کیا گیا Theme Paper جو راقم الحروف کا تحریر کردہ تھا، بعد میں اکنومک اینڈ پولیٹکل ویکلی ممبئی کے 22 جون 2002 کے شمارے میں Urdu Language and Education: Need for Political will and strategy کے عنوان سے ص ص 7-2406 پر شائع ہوا۔

سیاسی سماجی پس منظر

برصغیر کی اردو سیاست

ڈاکٹر محمد کاظم

بیس ویں صدی میں برصغیر کی تاریخ ہی نہیں بلکہ جدید ہندستان کی سیاسی تاریخ میں بھی اردو کئی معنوں میں مرکزی اہمیت کی حامل زبان ہے۔ یہ زبان اُس سیاسی فلسفے میں بھی، منفی ہی سہی مگر فیصلہ کن عنصر بن گئی، جس کی تشکیل شمالی ہند میں برہمن وادنے کی تھی۔

زبان کے طور پر اردو کی تاریخ کا یہ اہم باب ہے کہ اس زبان کا استعمال برصغیر میں ان تمام سیاسی قوتوں نے کیا جو انیس ویں اور بیس ویں صدی میں نفرت کی سیاست کرتی رہی تھیں۔ اگر ایک طرف اردو کی مخالفت کی سیاست انیس ویں صدی میں ہندو شناخت کے نام پر کی گئی تو دوسری طرف سرسید کا وہ مشہور بیان بھی اردو۔ ہندی تنازعے ہی کے ذیل میں وجود میں آیا جس میں انھوں نے بنارس میں 1869 میں کلکٹر شیکسپیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب (سرسید کے خیال میں) ہندو اور مسلمانوں کا ساتھ ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ علی گڑھ تحریک کے ایک اسکالر کے بہ قول:

''اردو کے خلاف اس تحریک (ناگری لپی میں ہندی کو رائج کرنے کی تحریک) نے سرسید کو اس درجہ متاثر اور خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ کسی قومی کام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد اب ممکن نہیں بلکہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علاحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں تو (اس سے) مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔'' مظہر حسین علی گڑھ تحریک۔ سماجی اور سیاسی مطالعہ، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، 1993۔ ص ص 67-266

پاکستانی مورخین سرسید کے اس بیان کو ہی دو قومی نظریے کی فلسفیانہ اساس قرار دیتے ہیں۔ پاکستان کے قیام میں بھی اردو سیاست نے اہم رول ادا کیا اور پاکستان بن جانے کے بعد وہاں علاقائی زبانوں کی ترقی کی راہیں بھی اردو ہی کی وجہ سے مسدود ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے تسلط کے خلاف پاکستان کے قیام کے فوراً بعد ہی اس وقت زبردست ردِ عمل ہوا جب 1948 میں ڈھاکہ یونی ورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں گورنر جنرل محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ اردو اور صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔

پاکستان میں اردو کراچی کے ان مہاجروں کے سوا کسی کی زبان کبھی نہیں تھی جو شمالی ہند کے شہروں سے ہجرت کر کے گئے تھے۔ پاکستان میں شامل ہونے والے تمام علاقوں کی مضبوط لسانی شناخت تھی مثلاً پنجاب میں پنجابی اور سرائیکی، مشرقی پاکستان میں بنگلہ، سندھ میں سندھی، صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں پشتو وغیرہ ان علاقوں کے لسانی تشخص کا مرکز تھیں۔ مشرقی پاکستان پر اردو کے تسلط کی قیمت پاکستان کو 1971 میں ادا کرنی پڑی جب بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ قیام بنگلہ دیش کی تحریک میں اردو مخالف جذبات نے مغربی پاکستان کے سیاسی تسلط کو ختم کر دیا۔ 1948 سے 1971 تک اردو مخالف تحریک مشرقی پاکستان میں مسلسل چلتی رہی اور بنگلہ لسانی تشخص نے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سید سلیمان ندوی کی اُس پین اسلامک Pan Islamic منطق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کا (عربی) رسم الخط ہی اردو کا رسم خط بھی ہے۔ اس تحریک کو حروف القرآن کی تحریک کہا جاتا ہے جسے طاقت ور بنگلہ تشخص نے پوری قوت سے ناکام کیا۔

ہندستان میں آزادی کے بعد اردو کو فنا کرنے کی تشہیر کانگریس کی سیاست کا محور تھی۔ خصوصاً شمالی ہند میں اسکولوں کے نظام سے اردو کو خارج کر کے اس کی جگہ سنسکرت اور ہندی کو کانگریس کے ذریعے اس طرح مسلط کیا گیا کہ اردو اور ہندی سیاست کے شعلوں کی تپش بیس ویں صدی کے آخر تک ہلکی نہ ہونے پائی اور ایک Centrist سیاسی جماعت کے طور پر کانگریس ہندو اور مسلمان دونوں کے ووٹ کی سیاست نفرت کی بنیاد پر کرتی رہی۔ ایک طرف اگر اسکولوں میں زیر تعلیم اردو مادری زبان والے بچے اس امر پر افسوس کرتے رہے کہ انھیں ایک اختیاری مضمون کے طور پر بھی اردو پڑھنے کے مواقع دست یاب نہیں تو ان کے والدین کو اس بات کا شدید جذباتی صدمہ رہا کہ ان کی نئی نسلیں اپنے تہذیبی ورثے سے ناواقف ہیں اور اس صورت حال کا مسلم سیاست خصوصاً اردو اشراف نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اردو مخالفت کے نام پر شمال کی ریاستوں میں ہندی کا تسلط ہندی نیشنلزم کی سیاست کو خوب بھایا اور

ہندوؤں خصوصاً برہمنوں کا روایتی برسرِ اقتدار طبقہ اپنے بچوں کو تو انگریزی پڑھاتا رہا مگر عام ہندو عوام کو اسکولوں کے نصاب میں فرقہ واریت کا زہر ہندی کے ذریعے تقسیم کے بعد سے اب تک مسلسل دیا جا رہا ہے۔

برہمنوں کے طرز پر ہندی کی سیاست دوسرے طبقات نے بھی بڑی کامیابی کے ساتھ کی۔ مشہور جاٹ لیڈر اور یوپی کے وزیر اعلا کے طور پر چودھری چرن سنگھ نے (جو بعد میں وزیر اعظم بھی بنے) کہا تھا کہ آزاد ہندستان کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اتر پردیش کو یک لسانی (ہندی) ریاست بنا دیا گیا۔ لوہیاوادی نام نہاد سوشلسٹ ملائم سنگھ یادو نے بھی ہندی کی سیاست خوب کی اور بالکل اسی طرح نفرت کی سیاست کے طرز پر کی جس طرح ماضی میں آر ایس ایس اور ہندو مہا سبھا کرتی رہی تھیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مذکورہ بالا دونوں رہنماؤں کے بچے اعلا انگریزی اسکولوں اور غیر ملکی یونی ورسٹیوں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہندی کی حمایت ہندستان کے سیاسی حالات کے سبب تقسیم کے بعد فسطائیت کی حدوں میں داخل ہو گئی۔ اس فسطائی ہندی سیاست کی کوششوں کے نتیجے میں ہی شمالی ہند کے صوبوں کا نصاب ہندو فرقہ واریت کے بوجھ سے اس درجہ دبا ہوا ہے کہ جب تک ان صوبوں میں ہندی ذریعۂ تعلیم موجود ہے تب تک آر ایس ایس کو اپنی کسی تنظیم کی قطعی کوئی ضرورت ان علاقوں میں نہیں کیوں کہ ہندی کا یہ نصاب آر ایس ایس کا کام بڑی خوبی سے کر رہا ہے۔

یہ بات افسوس ناک ہے کہ ہمارے نام نہاد سیکولر تعلیمی اشراف ذہنی طور پر اس درجہ انگریزی زدہ ہیں کہ ہندی ذریعۂ تعلیم کا مکمل طور پر زہر آلود نصاب کبھی ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن سکا۔ شمالی ہند کی ریاستوں خصوصاً اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ میں 90 فی صد سے زیادہ بچے اسی زہریلے نصاب کو پڑھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ شمالی ہند میں فرقہ واریت کی کھیتی اسی لیے خوب پھل پھول رہی ہے۔ حکومت کی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے تمام نمائشی کوششیں اس طرح کی گئیں کہ اردو کا فروغ اردو ادب کا فروغ بن کر رہ گیا اور اردو کے فروغ کے سرکاری ادارے اردو ادب کے فروغ تک محدود کر دیے گئے۔ سرکاری سرپرستی میں اردو کا ایک نیا اشراف پیدا ہوا جس کی اکثریت یونی ورسٹیوں کے اساتذہ پر مشتمل ہے۔ اردو تعلیم کے نام پر بھی حکومت نے جو نمائشی اقدام کیے وہ اردو کی اعلا تعلیم تک ہی محدود رہے۔ پرائمری اور سکنڈری سطح پر اردو تعلیم کی غیر موجودگی میں اعلا درجات میں اردو کی تدریس بے جڑ کا پودا اور اردو کے یہ اساتذہ حکومت کی پالیسی کے نتیجے میں معاشرے میں مذاق کا موضوع بن گئے۔ سرکاری اشراف کا تو کردار ہی منافق اور مفاد پرست کا ہوتا ہے سو اردو اشراف بھی قابلِ تضحیک ٹھہرے۔ یونی ورسٹیوں میں برسرِ کار اردو اساتذہ کو اردو معاشرے میں نت نئی دشنام طرازیوں سے نوازا گیا۔ کوئی یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں کو 'سفید ہاتھی' کہتا ہے تو کوئی برسرِ کار اساتذہ کو 'جہلا کی چوتھی نسل'۔

اردو سیاست کے محاذ پر سیکولر خصوصاً بائیں بازو کی سیاست بھی پوری طرح ناکام ہو گئی۔ ترقی پسند سیاست بھی اردو کے باب میں پنہاں لسانی اور سیاسی تحریک کو نہیں سمجھ سکی اور انجمن ترقی پسند مصنفین بھی ادب تک محدود رہی۔ زبان کے طور پر اردو کا فروغ چوں کہ رک گیا اس لئے آہستہ آہستہ اردو میں تخلیق ہونے والا ادب بھی اپنا معیار کھوتا گیا چنانچہ آج کا اردو ادب دیگر ہندستانی زبانوں کے مقابلے قطعی کم مایہ ادب ہے۔ اکیسویں صدی کے ہندستان میں اردو کا منظر نامہ لسانی اور فکری خلط مبحث کا آئینہ دار ہے۔ اسکولوں کے نصاب سے خارج ہونے کے بعد اردو کی پناہ گاہ دینی مدرسے بنے جو 9/11 کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ ایک طرف نئی اقتصادی پالیسیاں انگریزی کا ایک نیا سامراج تیار کر رہی ہیں تو دوسری طرف بین الاقوامی سیاست نے ہندستان میں بھی اردو کو مسلم اساس پرستی کی نئی آماج گاہ بنا دیا ہے۔

ہندستان میں جو اردو تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی تھی اب وہ پورے برِ صغیر میں اسلامیات کی زبان میں اس طرح تبدیل ہوئی ہے کہ غیر مسلموں کے ذہنوں میں اب اس کا عام تصور دہشت گردوں کی زبان کا ہے۔ آزادی کے بعد ہندستان میں ایسا کوئی علمی کام ہوا ہی نہیں جو اردو کے کثیر الجہات لسانی پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا۔ پاکستان میں بھی یہی صورت حال رہی۔ پاکستان میں اردو سرکاری سرپرستی میں اور زیادہ اسلامی زبان بنا دی گئی اور وہاں بھی فنکشنل لینگویج کے طور پر انگریزی کا ہی فروغ ہوا۔ سرکاری کام کاج سے لے کر ذریعۂ تعلیم تک پاکستان میں سب جگہ انگریزی ہی کی اجارہ داری ہے۔

ہندستان کی دانش گاہوں میں اردو سے متعلق کچھ علمی کام لسانیات کے شعبوں میں ہوئے ضرور مگر ان تحریروں میں یا تو اردو کو ہندی کی شیلی ثابت کیا گیا یا پھر نری لفاظی، لسانی اور شاعری اس موضوع پر کام کرنے والے ان لوگوں نے کی جنھیں موضوع کی کوئی سمجھ ہی نہیں تھی۔ انگریزی کے ماہرین لسانیات نے اردو کی لسانی ساخت پر جو بھی کام کیے انھیں اردو کے ساتھ زنا کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ چوں کہ ہندستان اور پاکستان میں جو کہ اردو کے مراکز تھے کوئی سنجیدہ علمی کام اردو زبان کے تعلق سے نہیں ہوا اس لیے مغربی دانش گاہوں میں ہونے والے کام بھی اردو ادب اور مسلم ثقافت تک محدود رہے یعنی زبان کے فروغ کے وہ تمام علمی اصول جن پر لسانیات کا ترقی پسند دبستانِ فکر زور دیتا ہے، اردو کے ذیل میں اب کہیں منطبق نہیں

ہوتے۔ اردو کے ساتھ جو علمی بددیانتی لسانیات کے شعبوں سے وابستہ استادوں نے کی اس کی کوئی نظیر علمی تاریخ میں ڈھونڈ کر لانا مشکل ہوگا۔ علمی طور پر بددیانت اور حد درجہ کاہل ان استادوں نے اردو کا رسم خط نہ سیکھنے مگر اردو پر نام نہاد علمی کام کرنے کا جواز یہ دیا کہ لسانیات کے ایک اصول کے مطابق زبان سیکھے بغیر بھی اس کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ بے ایمانوں کے اس قبیلے میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ بے ایمانوں کے ایسے ہی ایک پورے ٹولے نے جس میں لسانیات کے چار استاد (پروفیسر انویتا ابی، پروفیسر آر ایس گپتا، ڈاکٹر عائشہ قدوائی اور ڈاکٹر امتیاز حسنین، اول الذکر تین استاد جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں استاد ہیں اور چوتھے امتیاز حسنین اس شعبے کے سابق طالب علم اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں برسر کار) شامل تھے اردو کے ساتھ زنا کرنے کے لیے حکومتِ ہند کے ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے ایک پروجیکٹ لیا جس کا اولین بجٹ تقریباً 20 لاکھ روپے تھا۔

اس پروجیکٹ کے تحت ان ماہرین لسانیات کو بہ شمول دیگر علمی امور کے آزادی کے بعد اردو کی لسانی ساخت میں تبدیلیوں کا مطالعہ کرنا تھا۔ اردو ادب کی ہر صنف مثلاً شاعری، افسانہ، انشائیہ اور صحافت کے ہر پہلو کا لسانیاتی تجزیہ بھی پروجیکٹ کے اعلان کردہ مقاصد میں شامل تھا۔ ان ماہرین کی دلیل یہ تھی کہ زبان ہی نہیں بلکہ ادب کے تمام زاویوں کا مطالعہ کرنے کے لیے بھی زبان کا جاننا قطعی ضروری نہیں۔ ایسی جہالت کی بات صرف اردو جیسی مظلوم زبان ہی کے سیاق و سباق میں کی جا سکتی تھی۔ بہر حال ان ماہرین لسانیات کی تمام تر لسانی اور مغربی دانش گاہوں میں سیکھی گئی انگریزی لفاظی کے باوجود چھے سات برسوں میں پروجیکٹ کا وہ حصہ بھی مکمل نہ ہو سکا جس میں بول چال کی اردو کے نمونوں کو ٹیپ ریکارڈ کر کے ان کا لسانیاتی تجزیہ کیا جانا تھا۔ اطہر فاروقی نے اس پروجیکٹ پر اپنا مشہور زمانہ مضمون The Great Urdu Fraud لکھا جس کے بعد علم کے نام پر مالی بد عنوانیوں کا ایسا پنارہ کھلا کہ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کو سی بی آئی نے جیل بھیج دیا۔

میں نے صرف اس ایک واقعے کا ذکر یہ بتانے کی غرض سے کیا ہے کہ اردو کے نام پر کیسی کیسی بددیانتی انگریزی داں علما کے اس طبقے نے کی جو کسی طرح بھی اردو کو ایک سنجیدہ علمی موضوع کے طور پر اختیار کرنے کو تو تیار نہ تھا مگر اردو رسم خط کی غیر افادیت پر مہینوں بحث کر سکتا تھا۔ اس طبقے کو اردو رسم خط سیکھنے کی کوئی خواہش نہ تھی جس کے لیے محض چند روز درکار ہوتے ہے۔ تقسیم کے بعد ہندستان میں زبان کے طور پر اردو کے مسئلے کے اس درجہ انتشار کا شکار ہونے کی وجہ سے اس موضوع کا علمی زاویہ پس پشت چلا گیا۔ اردو کے ساتھ سب سے زیادہ زیادتی خود مسلمانوں نے کی۔

تقسیم کے بعد اردو مسلم سیاست اور مسلم شناخت کا جزو لاینفک تو بنا دی گئی مگر تقسیمِ ہند کے سبب مسلمان چوں کہ ایک ایسے خوف میں مبتلا تھے جس نے ان کی مجموعی نفسیات کو منافقت کا علامیہ بنا دیا تھا اس لیے اردو سے متعلق ان کے رویے کی منافقت بوالعجبی میں تبدیل ہو گئی۔ ہندستان سے ہجرت نہ کرنے کا فیصلہ کچھ مسلمانوں نے مجبوری میں اور کچھ نے کانگریس کی وطن پرست اس مسلم لیڈرشپ کے زیر اثر کیا تھا جسے تقسیم کے بعد کانگریس میں کنارے کر دیا گیا۔

آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد ہندستان میں مسلمانوں کے سب سے قدآور لیڈر رہے مگر تقسیم کے سبب ان کی حالت بھی بے یار و مددگار کی ہو گئی تھی اور مولانا کی اس بے بسی کا سب سے زیادہ نقصان اردو کو ہوا۔ مولانا آزاد بڑے کامیاب وزیر تعلیم تھے اور کانگریس کی بے حد قابلِ احترام شخصیت۔ تقسیم کے بعد اردو کے باب میں مولانا آزاد کے عجیب و غریب بیانات اُس مجموعی صورت حال کی عکاسی کرتے ہیں جو مسلمانوں کے حوالے سے اس ہندو اکثریت نے پیدا کی تھی جسے تقریباً ہزار برسوں کی مسلمانوں اور انگریزوں کی غلامی کے بعد آزادی ملی تھی۔

رجعت پسند ہندو اردو کو مسلمانوں کی اس وراثت سے تعبیر کرتے تھے، جس کا فارسی اور عربی کے ذریعے تسلسل ہندستان کے مسلمانوں کی بین اسلامک شناخت میں نہ صرف فیصلہ کن تھا بلکہ انھیں دنیا کے دوسرے مسلمانوں سے منفرد بھی کرتا تھا۔ ہندستان کے مسلمانوں کی یہ برتری ہندوؤں کے ایک طبقے کو اپنی تاریخ کے اس مقام پر بالکل گوارا نہ تھی جہاں انھیں ہر طرح کی غلامی سے پاک اپنی مفروضہ ہندو شناخت قائم کرنی تھی۔ شناخت میں چوں کہ لسانی عنصر سب سے اہم ہوتا ہے جو تہذیب کے واسطے سے مجموعی شناخت میں فیصلہ کن رول ادا کرتا ہے اسی لیے ہندوؤں کو آزادی کے بعد جس شناخت کی تلاش تھی اس میں نظریاتی طور پر اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کم سے کم ہندوؤں کی شمالی ہند میں موجود لیڈرشپ کا یہی خیال تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بڑا ہی شدت پسندانہ خیال تھا۔

شمالی ہند کی حد تک ہندو اور مسلم تہذیب الگ الگ ثقافتی اکائیاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں۔ مگر اس زاویے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستان کی بنیاد اور ہندستان کی تقسیم مسلم لیگ کے اس نعرے کا ہی نتیجہ تھی جس میں سارا زور اس پر تھا کہ ہندو اور مسلمان تہذیبی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ وہ ساتھ ساتھ رہ ہی نہیں سکتے۔ دو قومی نظریے کے نفاذ کی اصل قوت شمالی ہند

ہی کے مسلمانوں میں منتشر تھی۔ یعنی جب شمالی ہند کے مسلمان مفروضہ طور پر خود کو شمالی ہند کی تہذیب کا حصہ نہیں سمجھتے تھے تو فسطائی سیاسی قوتوں کے لیے عام ہندو کو یہ سمجھانا آسان تھا کہ وہ اپنے لیے جس تہذیبی شناخت کی تشکیل کریں اس میں اردو کا کوئی رول نہ ہو۔

تقسیم کے بعد خوف کی ہذیانی کیفیت میں مسلم اشراف نے ایک بڑا ہی بے وقوفانہ نعرہ اردو کے ہندو اہل قلم کا لگایا۔ انھیں امید تھی کہ ہندو اکثریت والے ملک میں اردو کے ہندو اہل قلم ہی اردو کی حفاظت کریں گے، اس کے درخشاں مستقبل کے ضامن ہوں گے۔ یہ نعرہ اردو اشراف کی انتہا درجہ فرقہ وارانہ ذہنیت کا غماز تھا۔ زبانوں کا فطری ارتقا جس طرح ہوتا ہے اسی طرح اردو کا بھی ہوا اور سیاسی عوامل کے زیر اثر ہندو اشراف بھی مسلم اشراف کے شانہ بہ شانہ اسی طرح اردو کے ارتقا میں شریک تھا جس طرح ہندو عوام مسلم عوام کے ساتھ مل کر وہ زبان بولتے تھے جسے بعد میں اردو کہا گیا۔ فارسی کے متبادل کے طور پر یہ زبان اردو مسلمانوں کے اقتدار کے زوال کے ساتھ ہی مسلم شناخت کا جزو لازم بنتی گئی۔ مورخین ایک مستقل بالذات زبان کے طور پر اردو کے فروغ کا زمانہ بہ اتفاق اورنگ زیب کی وفات (1707) کو قرار دیتے ہیں۔ مسلمہ طور پر اردو کی مسلم شناخت اور اردو رسم خط کو مذہبی حیثیت دینے کا معاملہ انگریزوں کے اقتدار پر قابض رہنے کے لائحہ عمل کا نتیجہ تھا جسے بعد میں ان تمام قوتوں نے جلا بخشی، جن کے لیے اقتدار کی خاطر پورے برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مسلسل تقسیم رکھنا ضروری تھا۔

اردو کے ہندو اہل قلم کی بہت سیدھی سماجیات یہ ہے کہ مسلمانوں سے اقتدار اس جمہوریت میں منتقل ہوتے ہی جہاں ہندو اکثریت تھی، ہندوؤں نے اردو کی اس تعلیم کا حصول ترک کر دیا جو ایک طرف مسلم تہذیب کی آئینہ دار تھی، اسلام کے مذہبی لوازم سے بھرپور تھی تو دوسری طرف وہی اردو زبان اب اقتدار کی منتقلی کے ساتھ، اقتدار سے قربت رکھنے والے ہندوؤں کے کسی مفاد کے حصول میں مزید معاون نہ ہو سکتی تھی۔

اقتدار سے محرومی کے ساتھ وہ مسلم اشراف خود ہی دست نگر ہو گئے تھے جو اردو تہذیب کے آئینہ دار کہلاتے تھے۔ تقسیم کے نتیجے میں مسلم تعلیم یافتہ طبقے کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد یہاں رہ جانے والے صرف وہی مسلم اشراف نئے اقتدار کا حصہ بن پائے جو انگریزوں کی موجودگی میں ہی انگریزی پڑھ کر نئے نظام میں شامل ہو گئے تھے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے یہ مسلم اشراف تعداد کے اعتبار سے مٹھی بھر تھے اور ان کی اکثریت اقتدار کے نئے سرچشمے کانگریس کے وفادار خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی۔ انگریزی سے واقف مسلم اشراف کے اس طبقے نے بھی بالکل اسی طرح اپنی نئی نسلوں کو اردو نہیں پڑھائی جس طرح نئے نظام میں ہندو اشراف اردو سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ تقسیم کے بعد اردو ایک سیاسی بیان political statement بن کر رہ گئی اور ہر مسلمان کسی نہ کسی طرح اردو کی سیاست میں شامل رہا۔ یہ شمولیت خواہ علاماتی و استعاراتی سطح پر ہو یا پھر تہذیبی علامیے کے ذریعے مگر عملاً اردو سے متعلق ہندوستانی مسلمان کے کسی غیر سیاسی بیان کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اسی طرح ان تمام مسلمانوں کے لیے جو اپنے لیے مسلمانوں میں لیڈر شپ کا رول تلاش کرتے ہیں، ہمیشہ ہی سب سے Soft Option ثابت ہوتی ہے۔ اردو کے ساتھ سیاست کی اس درجہ کارفرمائی نے اردو میں مسلمانوں کے ذریعے Social Act کی گنجائشوں کو معدوم کر دیا۔ مکمل طور پر Political Act کی زبان ہونے کی وجہ سے اردو میں وہ علمی تحریریں بھی مفقود ہو گئیں جو زبان کے ان زاویوں کا احاطہ کرتیں جن کا تعلق زندگی کے عملی شعبوں سے ہے۔

مکمل طور پر سیاسی زبان بن جانے کے بعد جب اردو ادب تک محدود ہوئی اور زبان کا دخل زندگی کے تمام عملی شعبوں میں ختم ہوا تو پھر زبان کے فروغ کے امکانات کا معدوم ہو جانا خود ادب کے لیے بھی خطرے کی بات تو تھا مگر تقسیم کے بعد کے ان حالات کا منطقی اور لازمی نتیجہ بھی تھا جن میں اردو کی سیاست کی جا رہی تھی۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں نے اردو تعلیم کے فنا ہونے اور اسکولوں کے نظام میں اس کی عدم فراہمی پر شور تو بہت مچایا مگر نہ تو اردو تعلیم کا نظم رضاکارانہ طور پر قائم کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اردو تعلیم کی عدم فراہمی کے محرکات کا علمی طور پر جائزہ لیا۔ نتیجتاً اردو تعلیم کا نظام برباد ہی نہیں ہوا، بلکہ اس بربادی کے محرکات سے اردو معاشرہ پوری طرح بے خبر بھی رہا۔ اردو کے احیا کی عملی کوششوں اور زبان کے زوال کا عمرانیاتی جائزہ نہ لینے کے پس پردہ سب سے بڑا سبب تو اردو اشراف کا خوف کی نفسیات کے تابع وہ ذہنی رویہ تھا جس کے تحت وہ حکومت کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چوں کہ اسے معلوم تھا کہ اردو تعلیم کے نظم کو حکومت نے فنا کیا ہے اس لیے وہ اس موضوع پر ایسا کچھ بھی نہیں لکھنا چاہتا تھا جو حکومت کے لیے واقعتاً رسوائی یا کم سے کم پریشانی ہی کا سبب بنے۔ اس لیے اردو تعلیم اور غزل کی تعلیم ہم معنی بن کر رہ گئے اور اردو تعلیم سے متعلق اپنی تحریروں میں اردو اشراف نے جی بھر کر شاعری کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں اردو زبان کے مکمل طور پر حاشیے پر چلے جانے کے بعد اردو ادب بھی اپنی وسیع تر معنویت کھو بیٹھا۔ OO

مسلم اشراف کا رویّہ

انگریزی ذریعۂ تعلیم اور اردو

محمد اقرار حسین

بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ملک میں اردو کے لیے جو مجموعی اور عمومی فضا ہموار ہوئی ہے وہ اردو والوں کے ان تبدیل شدہ حالات کا ثمرہ ہے جن میں اردو معاشرے میں اقتصادی طور پر نمایاں ہونے والے طبقات نے سیاسی حالات کے زیر اثر اپنی تہذیبی شناخت کو سخت خطرات سے دوچار پایا۔

سیاسی حالات کی حدت اتنی زیادہ تھی کہ شناخت کے اس بحران سے وہ اشرافیہ بھی نہ بچ سکا جو آزادی کے بعد خوف کی نفسیات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اردو تعلیم کے متعلق عجیب وغریب باتیں کر کے عام لوگوں اور حکومت دونوں کو گم راہ کرتا رہا تھا۔ توقع ہے کہ حالات کی مار کے سبب ہی سہی مگر اردو اشرافیہ کا یہ رویہ عام لوگوں کے دلوں میں بھی جاگزیں کئی طرح کے وسوسوں کو نکال کر ان کی آئندہ نسلوں کے لیے اردو تعلیم کے حصول کی راہ ہموار کرے گا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر اردو والا اردو سے بے حد محبت کرتا ہے۔ یہ حالات کی بے مہری تھی جس نے روایتی اردو اشرافیہ اور اردو عوام دونوں کو اردو تعلیم سے دور رکھا۔ اپنے بچوں کو اردو نہ پڑھانے کے لیے اشرافیہ طبقے نے جو بودے دلائل دیے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اردو کے مسائل پر اردو والوں کی نظروں میں نہ صرف حکومت کو بلکہ اردو داں آبادی بھی گم راہ کرنے کا مورد الزام ٹھہرا۔ ایسا نہیں کہ اردو کے تئیں اپنے عجیب وغریب اور متضاد رویوں کی بے وقعتی کا اردو اشراف کو اندازہ نہ تھا، مگر آزادی کے بعد اس کے سوا ان کے سامنے شاید اور کوئی راستہ ہی نہ بچا تھا۔

تقسیم کے بعد کے سیاسی حالات میں انھیں کرنا یہ چاہیے تھا کہ اردو کو عمدگی یعنی Excellence کے تصور کے ساتھ وابستہ کرنے کی تحریک دیتے۔ اس سے اردو والوں کو اپنے تشخص کے سب سے طاقت ور عنصر یعنی زبان کو اپنی شناخت بنانے میں مدد ملتی۔ تعلیمی نظام میں اردو کی شمولیت اگر عمل میں آجائے تو یہ امر زبان کے طور پر اردو کی حیثیت کو نئی جہات ہی عطا نہیں کرے گا بلکہ نظام تعلیم میں اردو کے لیے تکنیکی اور عملی دونوں سطحوں پر بہتر امکانات کے نئے باب بھی ہو جائیں گے۔

وجوہ بھی ہوں، مگر انگریزی ذریعۂ تعلیم یا انگریزی کی اچھی استعداد کا ہونا معاصر زندگی کی ایسی ضرورتیں ہیں جن سے مفر ممکن نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ عملی طور پر انگریزی ذریعۂ تعلیم سب کو میسر نہیں آسکتا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ جن لوگوں کو انگریزی کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا پھر وہ کسی اور ہندوستانی زبان کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار نہیں کریں گے۔ اردو ہی کیا کسی بھی ہندوستانی زبان کے بولنے والے اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ اردو اشرافیہ نے تعلیم کی اس سماجیات کو سمجھنے کے بجائے انگریزی ذریعۂ تعلیم کے معاملے کو اس طرح پیش کیا گویا انگریزی ذریعۂ تعلیم کا ارمغاں ہر اردو والے کے دروازے پر از خود دستک دے رہا ہے اور اردو والے اس سے گریزاں ہیں۔

اردو اشراف نے اس سراسر غلط بات کو بھی مسلسل دہرایا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم میں اردو کے لیے کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم میں، جو مکمل طور پر نجی زمرے Private Sector کے پاس ہے، کسی بھی زبان یا کسی بھی مضمون کی تعلیم کے لیے گنجائش نکالنا سب سے آسان کام ہے۔

مگر یہ کام صرف والدین کے مطالبے پر ہوتا ہے، جس کے لیے انھیں بعض اوقات کچھ زیادہ خرچ بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ پبلک اسکولوں کی حد تک انگریزی ذریعۂ تعلیم میں پہلی زبان کے طور پر اردو کی تعلیم کے لیے گنجائش نکالنا بے حد سہل کام تو ہے مگر جب والدین خود ہی اس کے خواہاں نہ ہوں تو اسکول کی طرف سے اس معاملے میں پیش رفت کی امید کرنا فضول ہے۔

تعلیم کے بازار میں آج کچھ بھی خریدا جا سکتا ہے۔ والدین جس طرح کی تعلیم کا مطالبہ کریں گے، اسکولوں کو اس طرح کی تعلیم کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ اردو تعلیم کے سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب پرائمری کے بعد اور سیکنڈری سطح تک ہر بچے کو تین زبانوں کا مطالعہ کرنا ہی ہے تو ان تین زبانوں کی اسکیم میں ایک زبان اردو کیوں نہیں ہو سکتی؟ تعلیم کے ماہر جانتے ہیں کہ عمومی حالات میں جو زبان بچے کا ذریعۂ تعلیم ہوتی ہے، اس پر اس کی گرفت سب سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے، اور جو زبان ذریعۂ تعلیم ہو اسے اگر علاحدہ سے زبانِ اول کے طور پر نہ بھی پڑھایا جائے تو کچھ قباحت نہیں۔ یعنی انگریزی میڈیم میں اردو داں بچہ اردو کو زبانِ اول کے طور پر پڑھ سکتا ہے، انگریزی زبانِ دوم کے طور پر اور ہندی یا سنسکرت کا مشترکہ کورس زبانِ سوم کے طور پر۔ مگر یہ کام مشکل اس لیے ہے کیوں کہ اردو کی حد تک انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں کو اس فارمولے کے نفاذ کا کوئی تجربہ نہیں۔ اردو والوں نے کبھی اس کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔

میں گذشتہ آٹھ برسوں سے دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ نئی دہلی کا پرنسپل ہوں اور بیس برس سے زیادہ عرصے سے میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوں۔ دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ سے پہلے بھی میں نے ایک سے زیادہ دہلی پبلک اسکولس کی شاخوں میں پرنسپل کے فرائض انجام دیے ہیں۔ مگر آج تک کبھی اردو داں والدین میرے پاس اس مقصد سے نہیں آئے کہ ان کے بچوں کے لیے اردو تعلیم کا نظم کیا جائے۔

ڈی پی ایس متھرا روڈ میں آنے کے بعد مجھے کسی والدین کی کبھی ایسی کوئی درخواست موصول نہیں ہوئی جس میں انھوں نے اردو کو زبانِ اول کے طور پر اپنے بچے کو پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا ہو یا زبانِ اول کی تعلیم سے متعلق کوئی استفسار ہی کیا ہو۔

اردو تعلیم کے تئیں اردو داں والدین کے اس مایوس کن رویے کے سبب ہی تعلیمی پالیسی سازوں کا جب اردو تعلیم کے نظم کے سوال سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کے رویے کی بوالعجبی اس لیے دیدنی ہوتی ہے کیوں کہ انھیں اس سوال پر غور کرنے کے لیے کبھی مجبور ہی نہیں کیا گیا۔

اسی لیے میرا یہ خیال ہے کہ انگریزی میڈیم نظامِ تعلیم میں اردو کی تعلیم و تدریس کے ذیل میں اصل مشکل جو درپیش ہے وہ یہ کہ ابھی خود اردو والوں نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ اردو کی حیثیت ان کے لیے کیا ہو؟ اور جب تک خود اردو والے یہ فیصلہ نہ کریں، اس آسان کام کا انجام پانا بھی ممکن نہیں۔

OO

اکیسویں صدی کا تناظر

ہندستانی جمہوریت میں اردو کا مستقبل

سلمان خورشید

موجودہ دور میں افراد کی زندگی کے تمام اہم عناصر مثلاً مذہب، تہذیب، زبان اور ادب سیاست سے فیصلہ کن انداز میں متاثر ہورہے ہیں مگر اکثر صورتوں میں سیاست کی کارفرمائی منفی نوعیت کی ہے۔ دیگر امور کے علاوہ آج کسی فرد کی مکمل شناخت کا تعین یا تو سیاست از خود کررہی ہے یا پھر اس شخص کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر ان امور پر بھی حکم لگایا جارہا ہے، جو سیاست کے دائرے سے باہر ہیں۔

مگر ابھی تک یہ صورت حال بہت کچھ شہری تہذیب تک محدود ہے۔ سرمایہ دارانہ اقتصادی پالیسیوں کی کارفرمائی کے سبب جو تمدنی رجحانات شہری زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں، بدقسمتی سے سرمایہ دارانہ قوتیں انھیں ہی ہماری مجموعی قومی زندگی سے تعبیر کررہی ہیں، جب کہ ہندستان کی سماجی حقیقتیں بہت پیچیدہ ہیں۔ جہاں تک ہمارے معاشرتی ڈھانچے کی مجموعی ساخت کا سوال ہے تو اعلا متوسط طبقہ (اشراف) متوسط اور نچلا متوسط طبقہ یہ تینوں مل کر بھی ملک کی مجموعی آبادی کا دس فی صد سے زیادہ نہیں ہیں۔ ہماری تہذیب اور بنیادی شناخت کے نمائندے آج بھی ہمارے گاؤں اور قصبے ہیں اور ان کی مجموعی معاشرتی فضا کو ذہن میں رکھ کر ہی ہم شناخت اور تہذیب کے سوال پر گفتگو کرسکتے ہیں۔

میں نے انڈین نیشنل کانگریس کی اترپردیش شاخ کے سربراہ کے طور پر ہندستان کے اس سب سے بڑے اور اہم صوبے کی آبادی کے 90 فی صد لوگوں کی زندگی کی تمام پیچیدگیوں کا قریب سے مشاہدہ کیا جن کا تصور ہمارے ان اکثر سماجیاتی عالموں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا جو بند کمروں میں بیٹھ کر انگریزی میں اصطلاحوں کی اپنی عمارت بنانے اور دوسروں کی منہدم کرنے کے کھیل کو ہی سماج کے عمرانی مطالعے کا نام دیتے ہیں اور جن کی اکثریت کو اس ملک کی زمینی حقیقتوں کا کچھ علم نہیں۔ یوپی کے عام شہری سے بات کرنے کے بعد اردو تعلیم کے مسائل کے حل کی ضرورت میں نے شدت سے محسوس کی۔ اردو داں آبادی کے تعلق سے خصوصاً اترپردیش میں اردو تعلیم کا مسئلہ سرِ فہرست ہے اور اردو بولنے والے لوگوں نے مجھ سے اردو میں تعلیم کے حصول کی راہ میں حائل مشکلات سے متعلق شکایتیں کیں اور تشویش ظاہر کی۔ ان لوگوں سے مل کر مجھے اردو کے متعلق جن حقائق کا عرفان ہوا اردو تعلیم کے ان ہی مسائل کو سنجیدگی سے بحث کا موضوع بنانے اور اردو تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے ایک قابلِ عمل لائحۂ عمل متعین کرنے کے لیے اس بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا (8 فروری 2002 کو گیان بھون میں منعقدہ چار روزہ بین الاقوامی کانفرنس بعنوان اکیسویں صدی کی ہندستانی جمہوریت میں اقلیتوں کی تعلیم اور ان کی زبان کا مطالعہ: اردو کے خصوصی حوالے سے، جس کے افتتاحی اجلاس میں یہ تحریر خطبۂ استقبالیہ کے طور پر پڑھی گئی)

بعض لوگ میری اس کوشش کو سیاست سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ مجھے اس میں کچھ اعتراض نہیں۔ ہندستان میں اردو لسانی اقلیت فیصلہ کن سیاسی قوت کی حامل ہے اور اس کے تہذیبی اور ثقافتی مسائل اگر اس کی سیاسی قوت سے حل ہوں تو اس میں برا کیا ہے؟ اردو زبان جو ہماری مشترکہ تہذیب کی بہترین عکاس اور سیکولرازم کا ایک اہم ستون ہے، اسے ان فسطائی قوتوں نے جو اپنے فاشسٹ مقاصد کے حصول کے لیے آزادی کے بعد کانگریس میں بھی گھس آئی تھیں، شمالی ہند سے، جو اردو کا قلعہ تھا، اردو کا نام و نشان مٹانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

اردو آبادی کی اکثریت والے اور سیاسی اعتبار سے ہندستان کے سب سے اہم صوبے اترپردیش میں 1951 میں قلم کی ایک جنبش کے ذریعے اردو تعلیم کے پورے نظام کو درہم برہم کردیا گیا۔ اترپردیش کے Official Languages act 1951 میں ہندی کو انتظامیہ کی واحد زبان قرار دے کر پرائمری سے انٹرمیڈیٹ (سینئر سیکنڈری سطح) تک کی تعلیم کا واحد ذریعہ بھی ہندی ہی قرار پائی جس نے اترپردیش کو یک لسانی ہندی ریاست

میں تبدیل کردیا گیا۔ اتر پردیش میں اردو کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی اسی لیے کی گئی کیوں کہ اس کے بغیر ہندی کے نام پر فسطائی قوتوں کے لیے اپنے ان سیاسی مقاصد کا حصول ناممکن تھا جو آج برسرِ اقتدار ہیں۔

سیاست سے قطع نظر میں نے ہندستانی سیاسیات اور ہندستانی آئین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی اس پوری صورت حال کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اردو تعلیم کی بات کرتے ہوئے مسلمانوں کی بات کرنا اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ فسطائی قوتوں کی سازش کے نتیجے میں اتر پردیش کیا پورے ہی شمالی ہند میں ہندوؤں نے اردو کو اس طرح خیر باد کہہ دیا جس طرح آر ایس ایس کی منظم تحریک کے نتیجے میں پنجاب کے ہندو پنجابی سے دست بردار ہو گئے تھے۔ اسی لیے آج بدقسمتی سے اردو اور مسلمان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، لیکن اردو ہندستان کے تمام مسلمانوں کی زبان نہیں مگر اردو کو مادری زبان لکھانے اور اپنے بچوں کو اردو پڑھانے والے اب صرف مسلمان ہیں۔ اردو تعلیم کے نظام کے فنا ہو جانے کے بعد مسلمانوں میں حرف شناس آبادی کا تناسب اور کم ہو گیا۔ اردو کے روایتی ادارے یا تو ختم ہو گئے یا پھر حکومت کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر سرکاری اردو دانش ور تراشنے کے کام میں مشغول ہو گئے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی ہندستان میں مسلمان تعلیمی طور پر سب سے زیادہ پس ماندہ طبقہ ہیں مگر اس پس ماندگی کے اسباب پر بھی سنجیدگی سے اس لیے غور نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی فسطائی قوتوں کے لیے سیاسی طور پر نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔

جہاں تک تعلیمی نظام میں اردو بہ نام انگریزی کا سوال ہے تو عام مسلمانوں کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم دلوا سکیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ہر اعتبار سے برتری اور تجارتی قدر و قیمت کے باوجود حکومتِ ہند اپنے محدود وسائل کے سبب اس بات کے لیے مجبور ہے کہ وہ اپنے اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہندستانی زبانوں کو ہی بنائے۔

پرائمری تا ثانوی سطح تک تعلیم چونکہ ریاستوں کے کلی اختیار کا معاملہ ہے اس لیے بالعموم ریاستی زبانوں ہی میں صوبے تعلیم کا نظم کرتے ہیں۔ اس لیے قومی ضابطے کے مطابق جہاں ایک محلے یا ایک سے زیادہ محلوں کی مجموعی آبادی تین سو ایسے گھروں پر مشتمل ہوتی ہو جو اردو بولتے ہیں وہاں آئین کی دفعہ 350A کے مطابق ریاستی حکومت کو اردو لسانی اقلیت کے بچوں کے لیے اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول کھولنے چاہئیں۔ ایسا نہ کرنا آئین کی خلاف ورزی ہے۔

تہذیبی ورثے کے طور پر بھی اردو مسلمانوں کی حسیت کا اہم ترین عنصر ہے اسی لیے یہ مذہبی تعلیم کا ذریعہ بھی ہے۔ عربی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی ادب اردو ہی میں موجود ہے اور ہندستان میں بنگلہ کے علاوہ اور کسی زبان میں اس قدر اسلامی ادب کے ذخائر موجود نہیں کہ وہ ہندی مسلمانوں کی مذہبی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔

شمالی ہند کی ریاستوں کے تعلیمی نظام سے اردو کے غائب ہو جانے کے بعد حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے یا تو جز وقتی اساتذہ part time tutor کا انتظام کریں یا پھر خالص مذہبی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے دینی مدارس میں اپنے بچوں کو داخلہ دلائیں۔ عام اردو داں کے لیے اردو تعلیم کا جز وقتی مگر اضافی انتظام قابلِ عمل حل نہیں ہے کیوں کہ ایک اوسط آمدنی والے اردو مادری زبان والے شخص کی معاشی حالت علاحدہ سے اردو کے ٹیوٹر کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ بہر حال 93ویں آئینی ترمیم جو 14 سال تک کی عمر کے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے بنیادی حق کو آئینی طور پر تسلیم کرتی ہے، کے عمل میں آنے کے بعد یہ امید ہے کہ اس سے شاید اردو والوں کو بھی کچھ فائدہ ہو کیوں کہ تبدیل شدہ سیاسی منظر نامے میں اردو والے اس قدر اہمیت ضرور حاصل کر گئے ہیں کہ اگر ان کی لیڈر شپ صحیح لائحۂ عمل مرتب کر کے حکومت پر دباؤ ڈالے تو 93ویں ترمیم کے سبب کھلنے والے اسکولوں میں شاید کچھ اسکول اردو کے بھی ہوں۔ مگر سرِ دست 93ویں ترمیم نعرہ زیادہ معلوم ہو رہی ہے کیوں کہ بہ ظاہر قومی وسائل GDP میں تعلیم پر کیے جانے والے خرچ کی شرح میں اضافے کی کوئی امید نہیں۔

جہاں تک دینی مدارس کا سوال ہے تو ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مدارس صرف اور صرف مذہبی سوال سے وابستہ ہیں اور ان کا واحد مقصد مذہبی تعلیم کا فروغ ہے اور اردو زبان اس مذہبی تعلیم کا محض ذریعہ ہے۔ دینی مدارس کو اردو ادب کی اعلا اقدار یا اردو زبان کے فروغ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ مدرسے ابتداً اردو کے ذریعے مذہب کی تعلیم دیتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کے طلبہ عربی اور فارسی میں اتنی دست گاہ بہم پہنچا لیتے ہیں کہ انھیں اردو کی ضرورت نہیں رہتی۔

مدارس کے طلبہ میں ایک بڑی تعداد ایسے طلبہ کی ہوتی ہے جو بے حد پس ماندہ معاشی طبقات سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشی مجبوریوں کی وجہ سے کسی اور ادارے میں تعلیم حاصل کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ چوں کہ

مدرسوں کا انحصار پوری طرح سے مسلمانوں کے عطیات پر ہوتا ہے اس لیے والدین کو یہاں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ غور طلب ہے کہ مذہب ان طلبہ کی زندگی کا اہم حصہ ضرور ہے لیکن مدرسے کی تعلیم لازمی طور پر ان کی شعوری اور آزادانہ پسند نہیں ہے بلکہ وہ معاشی مجبوری کے سبب مدرسے میں آتے ہیں۔ مدرسوں میں زیرِ تعلیم بہت کم طلبا ایسے ہوتے ہیں جو مدارس کی تعلیم کو کسی سطح پر اپنی اعلا تعلیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مدارس کے فارغین کی اکثریت موذن و ائمہ کے طور پر مساجد سے وابستہ ہو جاتی ہے اور بس۔ لیکن یہ طے ہے کہ اگر مسلمان پس ماندہ نہ ہوتے اور وہ اپنے بچوں کو کل وقتی تعلیم کے لیے دینی مدارس میں بھیجنے کے لیے مجبور نہ ہوئے ہوتے تو آج اردو کی حیثیت ہمارے لیے لاطینی کی سی ہو جاتی۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ آزادی کے بعد اردو کا تحفظ صرف اور صرف دینی مدارس نے کیا۔ اس صورتِ حال کو خوش گوار تو نہیں کہا جاسکتا مگر اس حقیقت سے انکار ہمیں مستقبل کے لیے صحیح لائحۂ عمل بھی مرتب نہیں کرنے دے گا۔ اس لیے حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے۔ مدارس کی جدید کاری عرصہ دراز سے موضوعِ بحث ہے مگر اس کے لیے عصری علوم کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم کو بھی مدارس کے نظامِ تعلیم کا ایک لازمی حصہ بنانا ہوگا جو عملاً کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

مسلمانوں کے اقتصادی حالات اتنے اچھے نہیں کہ ان کے مدرسے وقت سے ہم آہنگ تکنیکی یا جدید تعلیم دے سکیں اور مدرسوں کے موجودہ ضخیم نصاب میں دنیاوی مضامین کی تعلیم کے لیے گنجائش نکل ہی نہیں سکتی ہے۔ مدارس کی جدید کاری کے لیے سب سے پہلے تو مدارس کے ذمے داران اور مجموعی طور پر مسلمانوں کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ اصولی طور پر کسی بھی قسم کی اور کسی بھی مذہب کی تعلیم میں حکومت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ مجھے اس میں بہت شک ہے کہ حکومت واقعتاً مدرسوں کی جدید کاری کی خواہاں ہے۔ جس حکومت کو عام شہری کے طور پر مسلمانوں کی عام تعلیم سے ذرہ برابر دل چسپی نہ ہو وہ اگر ان کی مذہبی تعلیم میں دل چسپی لے رہی ہے اور مدارس کی جدید کاری کے لیے پُر جوش اقدام کرنے پر آمادہ ہے تو یقیناً دال میں کچھ کالا ہے۔

مسلمانوں پر مسلسل یہ الزام ہے کہ وہ قومی دھارے سے کٹے ہوئے ہیں مگر انھیں قومی دھارے میں لانے یعنی تعلیم یافتہ بنانے کی کوئی کوشش بھی نہیں ہوئی۔ اب اگر حکومت اور وہ بھی بی جے پی کی فاشسٹ حکومت دینی مدارس کی جدید کاری میں دل چسپی لے رہی ہے تو حکومت کی نیت پر شک کرنے کے تمام مواقع موجود ہیں اور بی جے پی کی حد تک تو یہ صاف ہی ہے کہ وہ پہلے چند مدارس کو معمولی سی رقم جدید کاری کے نام پر دے کر بعد میں عسکری ہندو تنظیموں اور ان کے دیگر اداروں پر مال و زر کی بارش کردے گی۔ بطور قومی زبان آئینِ ہند کی توثیق کے باوجود ماضی میں اردو کو سماجی منظر نامے سے مٹا دینے کی سازش مختلف رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر کے ذریعے مسلسل ہوتی رہی ہے۔

پہلے ہم انھیں نظر انداز کر دیتے تھے لیکن آج یہ نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اردو مخالف بی جے پی جیسی فسطائی قوتیں ہی برسرِ اقتدار ہیں اور آج وہ اردو کے فروغ کی دعوے داری اور مدارس کی جدید کاری کی بات کر رہی ہیں۔ اردو کی ترقی کے لیے اردو والوں کی طرف سے سنجیدہ اور موثر کوششیں مفقود ہیں۔ گذشتہ صدی کے آخری برسوں میں بائیں بازو کے ان دانش وروں کی موثر کوششیں اردو کے فروغ کے سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں جو اردو کے ادیب نہیں تھے بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی پسند رجحانات کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

معروف قانون داں دانیال لطیفی کی قیادت میں ایسی ہی ترقی پسند کوششوں کا نتیجہ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ملنا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد مسلمانوں کو از خود اس بات کا احساس ہوا ہے کہ ایک سیکولر نصاب کے زیرِ سایہ اردو تعلیم کے احیا کی پیش رفت وقت کی اولین ضرورت ہے کیوں کہ دینی مدارس کی تعلیم سماجی رتبے کے تعین اور معاشی ترقی میں کوئی رول ادا نہیں کرتی۔

جب سے بی جے پی کی سیاسی طاقت میں اضافے کے ساتھ اردو کے غیر مسلم اہلِ قلم حضرات نے کھل کر اس بات کو کہنا شروع کیا ہے کہ اردو ان کی تہذیبی زبان نہیں اسی لیے انھوں نے اپنے بچوں کو بھی اردو نہیں پڑھائی تب سے کچھ مسلم اسکالرز نے بھی اس امر پر اصرار شروع کر دیا ہے کہ ہمیں بھی اس تذبذب سے نکل آنا چاہیے کہ اب غیر مسلم اس زبان کی حفاظت کریں گے۔ اگر مسلمان اردو کی حفاظت کرتے بھی ہیں تب بھی وہ سیکولرزم کی بڑی خدمت کریں گے کیوں کہ اردو کے بغیر ہندستان کے سیکولرزم کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے اور مسلمانوں کو اب سیکولرزم کے تحفظ کے لیے مسلسل جنگ کرنا ہوگی۔ سیکولرزم کا تحفظ ہی ہندستانی معاشرے کی تکثیریت کا تحفظ کرسکتا ہے۔

ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر سیکولرزم تباہ ہو گیا تو ہندستان میں مسلمانوں کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ یوں تو سیکولرزم کے تحفظ کی لڑائی اور اس کے فروغ کا جذبہ یہ دونوں ایسے امور ہیں

جن پر مسلمانوں کو مسلسل توجہ دینا چاہیے۔ اردو زبان کی بقا کی جدوجہد اب ایک سیاسی جنگ ہے۔ جو مشاعروں اور غزل خوانی کی محفلوں اور اردو کی شیرینی کے قصیدوں کے ذریعے ممکن نہیں۔ اردو والوں کو اس ملک کے روشن خیال لوگوں کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بنانا ہوگا جو ان تمام ہندستانی زبانوں کے فروغ کی بات کرے جنھیں اردو کی طرح خطرات درپیش ہیں۔ اردو کے ساتھ ہندستانی زبانوں کا یہ محاذ ہندستان کے سیکولرزم کا سب سے بڑا منارہ ہوگا۔

1991 کی مردم شماری کے مطابق ہندستان میں 4.3 کروڑ اردو داں آبادی ہے اور یہ تعداد اس حقیقت کے باوجود ہے جب بڑی تعداد میں دانستہ یا نادانستہ اردو والوں کی مادری زبان کے خانے میں ہندی کا اندراج کردیا جاتا ہے۔ سیاست جس ڈھرے پر آگے بڑھ رہی ہے اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ 43.3 ملین (4.3 کروڑ) لوگوں کی سیاسی طاقت سیاسی منظرنامے پر فیصلہ کن ہوگی۔ ہمارے ملک میں آبادی کے اضافے کی جو شرح ہے اس کے مدِنظر 2001 کی مردم شماری میں اردو لسانی اقلیت کی تعداد کم از کم چھ کروڑ ہوچکی ہوگی۔

شمالی ہند کے اس علاقے کے مسلمانوں کا، جسے ہندی کے نام پر سیاست کرنے والوں نے ہندی علاقہ کہنا شروع کردیا ہے، اردو کو اپنی مذہبی اور تہذیبی شناخت کے طور پر تسلیم کرنا فطری ہے۔ اردو شاعری اپنی غالب مسلم شناخت کی وجہ سے ہی ہمیشہ ہندو فرقہ پرستوں کے غیظ و غضب کا شکار ہوتی رہی ہے۔

دوسری طرف سیکولر سیاسی جماعتیں اور اردو والے اردو کے غیر مسلم اہلِ قلم حضرات کے ذریعے اردو کے تحفظ کی امید پر بیٹھے رہے بالکل ایسے ہی جیسے وہ یہ سمجھتے ہیں اور بالکل غلط سمجھتے ہیں کہ سیکولرزم کے تحفظ کی ذمّے داری صرف سیکولر ہندوؤں کی ہے۔

اردو زبان کے متعلق کسی بھی موضوع پر اچھی تحریریں پیش کرنے والے اسکالرز کا تقسیم کے بعد اکال پڑ گیا۔ صرف ادب کے نقاد کے طور پر وہ سب لوگ اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں کے ایک چھوٹے سے حلقے میں پہچانے گئے جنھیں اردو کی وجہ سے یونی ورسٹیوں میں پہلے طالب علم کے طور پر داخلہ مل گیا اور بعد کو یہ لوگ اردو کے استاد ہوگئے اور ان کی اکثریت اپنی منصبی ضرورتوں کے تحت جو تحریریں سپردِ قلم کرتی رہی انھیں اردو تنقید کا نام دیا اور ایسی اکثر تحریروں کے قاری آج کل 6 کروڑ اردو لسانی اقلیت میں 60 عدد بھی نہیں ہوں گے۔ اس صورتِ حال کی بہترین ترجمانی اس شعر میں ہوتی ہے:

جو کچھ بن نہ پائے تو نقاد بن جا
کسی اردو شعبے میں استاد بن جا

یونی ورسٹیوں میں بر سرکار اردو اساتذہ نے سب سے زیادہ زیادتی اردو نصاب کے ساتھ کی۔ انھیں نصاب سازی سے کچھ تعلق ہی نہ تھا اور حکومت کو بھی اس سلسلے میں صرف فرض کفایہ ادا کرنا تھا۔ اس لئے اردو نصاب کی تشکیل یا تو اردو ادب کے نقادوں نے کی، یا پھر ان شاعروں اور ادیبوں نے جن کی سیاست کے ایوانوں میں شناسائی تھی۔

اردو تعلیم کا مجموعی منظرنامہ ایسا نہیں کہ ذی شعور والدین اپنے بچوں کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر بھی اردو پڑھانے کے لیے تیار ہوں۔ اردو میں این سی ای آر ٹی کی تیار کردہ کتابیں اول جلول تھیں پھر جو کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں وہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم ہوگئیں۔ ویسے اب جب این سی ای آر ٹی آر ایس ایس کا نصابی شعبہ بن گئی ہے، اردو کی نئی کتابیں تیار کرانے والی سرکاری اردو والوں کی ٹیم میں اہلِ فہم کے لیے بس یہی دل چسپی کا موضوع ہے کون لوگ اس میں شامل ہیں، کیوں کہ انگریزی میں تو سوشل سائنس کی کتابیں آر ایس ایس کی مرضی کے مطابق لکھنے والے لگتا ہے ناپید ہوگئے ہیں۔ اردو میں چوں کہ سرکاری پشت پناہی حاصل کرنے کے لیے 'ہوڑ' سی لگی رہتی ہے لہٰذا امید ہے کہ آر ایس ایس کو اردو میں بہ رضا و رغبت کتابیں لکھنے والے بہ کثرت مل جائیں گے۔

ویسے اردو والوں نے نصابی کتابوں کے بھگوا کرن کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اٹھائی اور تعلیم کے بھگوا کرن کے معاملے میں ایسا منفعل رویہ اختیار کرنے والے کسی ہندستانی زبان کے بولنے والوں میں صرف اردو کے اہلِ قلم تھے جو اس وقت بھی خاموش رہے جب تمام ملک تعلیم کے بھگوا کرن کے خلاف صف آرا اور متحد ہو رہا تھا۔

البتہ نصابی بھگوا کرن کے خلاف مسلمانوں نے کامیاب اور متحدہ محاذ بنایا۔ یہاں مسلمان ایک مذہبی اقلیت کے طور پر تعلیم کے بھگوا کرن کے خلاف دوسری سیکولر قوتوں کے ساتھ صف آرا تھے۔ لیکن اس بھگوا کرن کے خلاف اردو دانشور اور سرکاری مسلمان بولنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

شمالی ہند کے ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ انگریزی یا کسی مقامی زبان کے میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی بہ مشکل اردو پڑھ سکتے ہیں۔ 14 سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے پرائمری سطح پر اردو ذریعۂ تعلیم کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد طلبہ اپنی سہولت کے اعتبار سے اسے پہلی، دوسری یا تیسری زبان کے طور پر بارہویں

درجے تک پڑھ سکتے ہیں۔

میں ان مشاہدات کی روشنی میں چند امور پر زور دینا چاہوں گا:

1۔ 14 سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے تمام سرکاری اور ریاستی حکومتوں اور بورڈوں سے ملحقہ اسکولوں کے سیکولر نصاب میں پرائمری سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر شامل کیا جائے۔ وہ لوگ جو اپنی مادری زبان اردو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کسی علاقے میں ان کی تعداد تین سو یا اس سے زیادہ ہے، ان کے لیے سرکار جو اسکول کھولے ان کا میڈیم اردو ہو۔

2۔ اردو بولنے والے طلبہ خصوصاً جن کی مادری زبان اردو ہے کے لیے درجہ ششم سے بارہویں کلاس تک سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو لازمی مضمون اور زبان اول کے طور پر پڑھایا جائے۔

3۔ ہندی کو شمالی ہند کی ریاستوں میں چوتھی جماعت سے خصوصی (لازمی) زبان اور انگریزی کو چھٹی سے بارہویں جماعت تک تیسری لازمی زبان کے طور پر پڑھایا جاسکتا ہے۔

4۔ چوتھی جماعت کے بعد شمالی ہند کے سرکاری اسکولوں اور ریاستی حکومتوں سے امداد حاصل کرنے والے اسکولوں میں جہاں ذریعہ تعلیم ہندی ہو، اردو مادری زبان والے طلبہ کے لیے اردو کو زبان اوّل کے طور پر، ہندی کو دوسری زبان کے خانے میں اور انگریزی تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاسکتی ہے۔ آٹھویں درجے سے ہندی اور سنسکرت کا ایک مشترکہ کورس ہندی مادری زبان والے طلبہ کے لیے ہونا چاہیے۔

جب تک اردو کو اسکول کے نصاب میں شامل نہیں کیا جائے گا اس کے احیا کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ ان حالات سے نبرد آزما ہونے اور اپنی عظیم اقدار کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کو دیگر مذہبی و لسانی اقلیتوں اور سیکولر و جمہوری طاقتوں کے ساتھ متحد ہونا چاہیے۔

میں اردو لسانی اقلیت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے دوسروں کی طرف دیکھنے کی پرانی روش ترک کردیں۔ اردو والے جب تک اپنی لڑائی خود نہیں لڑیں گے، ہمیشہ حاشیے پر رہیں گے۔ انھیں یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ سیکولر ہندو تنہا ان کے حقوق کے لیے لڑتا رہے گا۔ اردو والوں کو سیکولر اور جمہوری حقوق اور اپنے سماجی اور تعلیمی حقوق کے لیے اس لڑائی میں خود کو اب مکمل طور پر شریک کرنا ہی ہوگا۔ اگر وہ چاہتے ہیں کہ سیاسی پارٹیوں کے ذریعے انھیں محض ووٹ بینک نہ سمجھا جائے تو اس کے لیے انھیں عملی کوشش کرنا ہوگی۔ سیکولر تعلیم کا حصول ان کا آئینی حق ہے جس کے لیے انھیں بجا طور پر اپنی مادری زبان میں اسکول کی تعلیم اور دیگر متعلقہ سہولیات کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ ہم بلا امتیاز سیاسی الحاق یا وفاداری پورے ہندستانی سماج سے اس تحریک میں تعاون کرنے کی اپیل کرتے ہیں اور اردو لسانی اقلیت سے درخواست گزار ہیں کہ وہ تمام ہندستانی زبانوں کے حقوق کی لڑائی کو اردو کے حقوق کی لڑائی کے ہم معنی بنا کر ایک نئی جدوجہد کا آغاز کرے۔ OO

e-mail : sk_tipu@yahoo.com

خراجِ عقیدت

احمد ندیم قاسمی

1916 سے 2006

کہاں گئی ہیں وہ صبحیں، کدھر گئیں شامیں؟
کہاں گئے وہ طلوع و غروب کے منظر؟
نہ ظلمتیں، نہ اجالے، نہ رات اور نہ دن
یہاں سے حدِ نظر تک ہے ملگجی سی فضا
بچھا ہوا ہے زمیں پر بسیط سناٹا
صدا کہیں سے بھی آتی نظر نہیں آتی
سماعتوں پہ گھنی خامشی کے پہرے ہیں

سفر زندگی کا

مرتبہ: ادارہ

پیدائش: 20 نومبر 1916، انگہ تحصیل و ضلع خوشاب، پنجاب پاکستان

حقیقی نام: احمد شاہ   ادبی نام: احمد ندیم قاسمی

والد: پیر غلام نبی، آٹھ سال کا چھوڑ کر 1924 میں چل بسے، والدہ نے پرورش کی جن کا انتقال 1956 میں ہوا

بہن: صرف ایک جو بڑی تھیں، 1960 میں وفات پائی

بھائی: بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش جو ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے

شادی: 1948 میں خاندان کے قریبی عزیزوں میں ہوئی جو وادیٔ سون کے گاؤں سورکی میں آباد ہیں

اولاد: بڑی بیٹی۔ ناہید (ندیم) قاسمی شاعرہ ہیں۔ چھوٹی بیٹی نشاط ندیم شعر بھی کہتی تھیں، جن کا 1995 میں انتقال ہوا۔ ایک بیٹا: نعمان ندیم

تعلیم: 1920 میں انگہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس، تفسیر چچا پیرزادہ حیدر بخش نے پڑھائی 1921-25 میں گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل اسکول کیمبل پور (اٹک) میں ابتدائی تعلیم، 1930-31 میں گورنمنٹ ہائی اسکول شیخو پورہ میں میٹرک۔ 1931 میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخلہ، 1935 میں بی اے۔

ملازمت: 1936 میں ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں بیس روپے ماہوار پر بطور محرر ملازم رہے 1937 تک۔ 1939 میں ملتان کے ایکسائز آفس میں سب انسپکٹر مقرر ہوئے مگر 1942 میں استعفیٰ دے دیا اور دارالاشاعت پنجاب (لاہور) سے وابستہ ہوگئے۔

پہلا شعر: 1926 میں کہا جب صرف دس برس کے تھے۔

پہلی طباعت: پہلی نظم 1931 میں مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر کہی جو روزنامہ 'سیاست' لاہور میں چھپی۔

پہلی کتاب: پہلا افسانوی مجموعہ 'چوپال' 1939 میں اور پہلا شعری مجموعہ 'دھڑکنیں' 1942 میں شائع ہوا۔

کُل تخلیقات: 9 شعری اور 16 افسانوی مجموعے

تحقیق و تنقید: تہذیب و فن، ادب اور تعلیمی رشتے، علامہ محمد اقبال کے عنوانات سے تین کتابیں

ترتیب و تدوین: انگڑائیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب) نقوشِ لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب) اور منٹو کے خطوط

صحافت: 1942 میں ہفت روزہ 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' کی ادارت سنبھالی اور اس دوران ماہنامہ 'ادب لطیف' کے مدیر بھی رہے جس میں 1944 میں منٹو کا افسانہ 'بُو' چھاپنے پر مقدمہ چلا مگر بری ہوگئے۔ 1946 میں 'ادب لطیف' کی ادارت چھوڑ کر اپنے ضلع کی مسلم لیگ کے تحت قیام پاکستان کی تحریک میں شامل ہوگئے۔ 1947-48 میں ماہنامہ سویرا (چار شماروں) 1950 میں ماہنامہ 'سحر' لاہور (ایک شمارہ) اور 1953-59 میں روزنامہ 'امروز' لاہور کے مدیر رہے۔ اس بیچ 1948 اور 1949 میں ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر 'نقوش' کے پہلے دس شمارے بھی ترتیب دیے۔ 1963 میں اپنا جریدہ 'فنون' جاری کیا اور تا وفات اس کے مدیر رہے۔

کالم نگاری: 1952 میں روزنامہ 'امروز' لاہور میں کالم 'حرف و حکایت' پھر اس اخبار کے ایڈیٹر بن جانے پر کالم 'بیچ دریا' بھی لکھتے رہے۔ 1959 میں امروز سے الگ ہونے پر روزنامہ 'ہلالِ پاکستان' میں 'موج در موج' اور 'بیچ دریا' کے نام سے فکاہیہ کالم نویسی کی۔ 1964 میں روزنامہ 'امروز' لاہور میں کالم 'حرف و حکایت' کی شروعات کی مگر نام 'عنقا' رکھ لیا جو در اصل احمد ندیم قاسمی کے تخلّص 'انقا' کا عکس تھا اور یہ 1970 تک جاری رہا۔ اسی دوران روزنامہ 'جنگ' کراچی میں کالم 'لاہور... لاہور ہے' لکھا۔ 'جنگ' چھوڑ کر روزنامہ 'حریت' کراچی میں فکاہیہ کالم 'موج در موج' اور ہفتہ وار کالم 'لاہوریات' پیش کرتے رہے۔ اپریل 1972 میں دوبارہ 'امروز' میں وہی کالم لکھنے لگے۔ اور یہ سلسلہ تا حیات جاری رہا۔

خصوصی امتیاز: 1949 میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے پہلے سیکریٹری جنرل منتخب ہوئے۔ 1974 سے وفات تک مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر تھے۔

اعزازات و انعامات: تین مرتبہ آدم جی ادبی ایوارڈ برائے شاعری۔ پہلا 'دشتِ وفا' پر (1963) دوسرا 'محیط' کے لئے (1976) تیسرا 'دوام' کو (1979) حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ سول اعزازات 'پرائیڈ آف پرفارمنس' 1968 اور 'ستارۂ امتیاز' 1980 میں۔ نیز عالمی فروغ اردو ادب، دوحہ قطر کے علاوہ 1998 میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے 'نشانِ سپاس' کا اعزاز دیا گیا۔

وفات: 10 جولائی 2006، لاہور (پاکستان)

تعزیتی قرارداد

احمد ندیم قاسمی کی یاد میں

منشا یاد

احمد ندیم قاسمی موجودہ دور میں دنیائے ادب کی ممتاز ترین شخصیت اور ادب برائے زندگی کے سب سے بڑے نمائندے تھے۔ فیض صاحب کے بعد وہ فکری اور نظریاتی حوالے سے اہل قلم کے لئے ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ قدرت نے انہیں اس قدر زرخیز دماغ اور تخلیقی توانائی سے نوازا تھا کہ ان کے خیالات و افکار کا دریا کسی ایک صنفِ ادب میں سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی لئے وہ ادب کی مختلف اصناف میں اپنے فن اور افکار کا اظہار کرتے رہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں خواہ شاعری ہو، افسانہ نگاری ہو، مکالمہ نویسی ہو یا کالم نگاری اپنی الگ اور منفرد پہچان رکھتے تھے۔

انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انسانی عظمت، محنت اور رواداری کی اقدار کو فروغ دیا اور ترقی پسندی اور مقصدیت کے باوجود شاعری کو شعری اور جمالیاتی اوصاف سے کبھی محروم نہ ہونے دیا۔ اور بے شک وہ خود بھی افسانہ نگار کی بجائے ایک شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے کو ترجیح دیتے تھے مگر وہ افسانے کے اس دور کے جسے سنہری دور کہا جاتا ہے آخری اور اہم ترین افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کی رحلت اور تعصبات کی دھند چھٹنے کے بعد جب ان کے افسانوں کا بے لاگ تجزیہ ہوگا تو میرا اندازہ ہے کہ وہ اردو افسانے میں اس سے بھی بڑا مقام حاصل کریں گے جو انہیں اب تک حاصل رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعادت حسن منٹو بہت بڑے افسانہ نگار تھے اور ان جیسی شہرت اور مقبولیت کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی اور بے شک انتظار حسین میرے پسندیدہ اور ایک بڑے افسانہ نگار ہیں مگر ان سب کے افسانوں کے ذائقے مختلف ہیں۔

بہ حیثیت افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی پریم چند کی روایت کے افسانہ نگار ہیں اور ان کے موضوعات اور کردار ہماری دیہی زندگی اور معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں بے حد تنوع، گہرائی، سچائی اور تاثیر ہے۔ ان کے افسانوں میں پھیلی ٹکڑے ٹکڑے زندگی کو اگر ایک خاص ترتیب اور تسلسل کے ساتھ جوڑا جائے تو کسی طویل ناول کی طرح پورے عہد کی سماجی تاریخ بن جائے۔ ایسی تاریخ جس میں ہمارے دیہات اور شہروں کی ثقافت، تہذیب اور زندگی کی سچی اور حقیقی تصویریں دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے افسانے اگر ایک طرف دیہی معاشرت اور عوام سے جڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف انسانی اقدار اور عالمی معاملات اور موضوعات کو چھوتے ہیں جیسے 'پرمیشر سنگھ' اور 'ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد' وغیرہ۔ اردو افسانے کی دنیا میں رئیس خانہ، گنڈاسا، لارنس آف تھیلیبیا، گھر سے گھر تک، وحشی، جوتا، نیلا پتھر، بین اور الحمدللہ جیسے ناقابل فراموش افسانے انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ انہوں نے افسانے محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے نہیں لکھے بلکہ اردو افسانے میں پندرہ مجموعوں کا گراں قدر اضافہ کیا جن کے نام سناٹا، بگولے، آنچل، برگِ حنا، در و دیوار، سیلاب و گرداب، آس پاس، کپاس کا پھول، بازارِ حیات، آبلے، چوپال، گھر سے گھر تک، طلوع و غروب، کوہ پیما اور نیلا پتھر ہیں۔ آخری مجموعہ کے بعد بھی انہوں نے بہت سے افسانے لکھے اور اب ایک طویل، اہم اور سلسلہ وار افسانہ 'ایک ریوڑ ایک انبوہ' لکھ رہے تھے جس کی چوتھی قسط فنون کے گزشتہ شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے خود منتخب کردہ چالیس افسانوں کا ایک انتخاب 'افسانے' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان چالیس افسانوں میں کوئی ایک بھی کم زور افسانہ شامل ہو۔ اس طرح میرے خیال میں ان کے ہاں اچھے افسانوں کی تعداد اپنے دور کے دیگر افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ ہے۔

ہمارے زیادہ تر ادیبوں کی طرح وہ صرف خواص کے ادیب ہی نہیں تھے انہوں نے عام لوگوں کی ذہنی سطح کو سامنے رکھ کر بھی بہت کچھ لکھا یہاں تک کہ بچوں کے لئے بھی۔ شاید اسی لئے بعض کامیاب فلموں کے مکالمے لکھے اور ان کے افسانوں پر کرتار سنگھ اور مولا جٹ (بلکہ جٹ سیریز کی

ایم قمرالدین

احمد ندیم قاسمی

سایہ دار اور فلک بوس شجر

آپ کے فن کی بلندی کیا خوب
فرش سے عرش پہ ہے جس کا گزر
پھر دلوں میں جو اُتر جاتی ہے
نور کر دیتی ہے ہر ایک نظر
آپ کے ہیں جو زباں اور قلم
ہیں ادب کے وہی شام اور سحر
'بڑی نعمت'[1] ہے جو ہر اک تخلیق
'فن کا اجر'[2] آپ کا اپنا ہی ہنر
ہے وجود آپ کا سب کے لیے ایک
سایہ دار اور فلک بوس شجر
ہے مرے لب پہ یہی ایک دعا
ہو مبارک نئے عشرے کا سفر
بخشیں آپ اور بھی حرفوں کے گلاب
دیں ہمیں اور بھی لفظوں کے گہر

قطعہ

احمد ندیم قاسمی ہے ایک شخص کب؟
وہ چاند ہے، گلاب ہے، نغمہ ہے شہد ہے
یعنی وہ ایک عہد ہے اپنے مقام پر
جو ایک عہد، اصل میں ہر ایک عہد ہے

یہ نظم اور قطعہ دونوں ہی میں نے 20 مئی 2006 کو مکمل کر لئے تھے۔ ارادہ تھا کہ موصوف کی 90ویں سالگرہ (20 نومبر 2006) کے مبارک موقعہ پر ان کی خدمت میں پیش کروں۔ اے کاش اللہ کی مرضی سے میرے اس ارمان کی تکمیل ہو جاتی۔ ان سے مجھے بے پایاں عقیدت تھی، ہے اور رہے گی۔

—ایم قمرالدین

---

1 و 2: احمد ندیم قاسمی کے دو اشعار کی جانب اشارہ

فن بڑی چیز ہے تخلیق بڑی نعمت ہے
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

ندیم کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں

بہت سی) کامیاب اور مقبول ترین پنجابی فلمیں بنیں۔ اسی طرح قاسمی کہانی کے عنوان سے ٹی وی کی ایک سیریز عوام وخواص میں بہت مقبول ہوئی۔ اب وہ زیادہ تر قومی اور تعلیمی مسائل پر سنجیدہ کالم لکھتے تھے مگر امروز کے حرف وحکایت کے زمانے میں ان کے کالم بہت شگفتہ، ظریفانہ شوخیوں اور چھیڑ چھاڑ سے لبریز ہوتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب ایک محبت کرنے والے خوش مزاج، نیک دل اور شریف انسان تھے۔ جس ماحول اور معاشرے میں ہمارے بعض بے درو سینئر ادیب اور شاعر خط اور کتاب کی رسید تک بھجوانے کے روادار نہ ہوں۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جو مشہور اور نامور بھی ہوں اور دوستوں عزیزوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں میں شرکت کریں یا خط لکھ کر احوال پرسی کریں۔ مگر قاسمی صاحب یہ وضع داری خوب نبھاتے تھے۔

جناب احمد ندیم قاسمی نے بھرپور ادبی زندگی گزاری اور اپنے پیچھے محبتوں کا جو سرمایہ چھوڑ گئے وہ کبھی دلوں سے محو نہ ہوگا۔ فنون کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے کئی نئی نسلوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ وہ بظاہر ہم سے بچھڑ گئے ہیں مگر اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ شعر و ادب کا ایک عظیم دریا تھے جو ان گنت اشجار کو سینچ کر اور بہت سے کھیتوں کھلیانوں اور صحراؤں کو سیراب کرنے کے بعد ابدیت کے سمندر میں اتر گیا ہے۔

(14 جولائی 2006) حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں پڑھا گیا

گلہائے عقیدت

قاسمی صاحب

شمس الرحمٰن فاروقی

کئی سال کی بات ہے، 1948 کا سال رہا ہوگا، یا شاید 1949 ہو۔ بہر حال پچاس سے بہت اوپر برس گذر گئے ہیں۔ میں نے ایک رسالے میں احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم پڑھی۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کے چرچے ہر طرف تھے، اس لیے میں بھی ان کے نام سے آشنا تھا۔ لیکن ان کی شاعری کے توسط سے نہیں، بلکہ ان کے افسانوں کے توسط سے۔ نظم کا آخری بند میرے دل پر کچھ ایسا نقش ہوا کہ آج تک دھندلایا نہیں ہے۔

زندگی کو سنوارنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

زمین کے لیے خلا کی رقاصہ کا لقب، یا استعارہ، مجھے بہت اچھا لگا۔ زمین کا حسن، اس کی وسعت، سیارے یا ستارے کی حیثیت سے محفل آفاق میں اس کا وجود، مسلسل رقص میں محو لیکن خلائے بسیط میں بالکل تنہا، گویا وہ سچے فن کاروں کی طرح سامع یا تماشائی سے بے نیاز ہو، حتیٰ کہ وقت سے بھی بے نیاز ہو، کہ خلا میں لامکانی ہے اور جہاں لامکانی ہے وہاں وقت بھی نہیں۔ یہ سب باتیں کچھ مبہم، کچھ بہت روشن میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔ آج بھی جب وہ شعر یاد آجاتے ہیں تو اسی طرح کی محویت اور مصروفیت، اسی طرح کی لگن اور زمان و مکان کے اسی تسلسل کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے جس نے اس دن میرے نوآموز تخیل کو زندگی کی سی حرارت اور سرور عطا کیا تھا۔ پھر یہ خود اعتمادی، کہ زندگی کو بنانے اور سدھارنے کے لیے ہم تقدیر پر نہیں بلکہ تدبیر اور عمل پر بھروسا کرتے ہیں۔ ''کب مقدر کے اختیار میں ہے'' کا آہنگ اور استفہام وجود انسانی کی افضلیت اور اشرفیت کے اعلان کی طرح تھا۔ اور وہ 'آدم نو' جس کے انتظار میں خلا کی رقاصہ نے اپنی محفل تنہا آباد کی تھی کہانیوں کے پر اسرار شہزادے، یا ققنس کی طرح اپنی خاکستر میں سے جی اٹھنے والے کسی مرد تقدیر کی طرح تھا جس کے نمودار ہوتے ہی ہماری زمین خود کو اس کے سپرد کردے گی۔

یہ سب از حد رومانی تو تھا، بلکہ بڑی حد تک تعمیمی اور آسان حل کی طرح کا تھا، ایسا حل جسے چادر کی طرح اوڑھا اڑھا کر بڑے اور پیچیدہ مسائل اور خوف اور خون سے بھری ہوئی حقیقتوں کو ڈھانکنے کا کام لیا گیا تھا۔ لیکن یہ دلکش پھر بھی تھا، کہ انسان کا ذہن، اور خاص کر انسانوں کے بچوں کا ذہن فریب کھانے کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔ اسے 'واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں' کی ایک صورت کہیے، یا قول سے زیادہ عمل کو معتبر جاننے کی امید کا اظہار کہیے، لیکن ہے یہ انسانی زندگی کی حقیقت، اور احمد ندیم قاسمی کے یہ مصرعے اسی حقیقت کا دوسرا نام ہیں۔

''زندگی کو سنوارنے'' کا فقرہ اس وقت تو نہیں، لیکن بعد میں مجھے کچھ کم زور لگنے لگا تھا۔ 'سنوارنا' تو شاید کسی اچھی چیز کو اور بہتر بنانے کو کہتے ہیں؟ شاید 'سدھارنا' بہتر ہوتا؟ لیکن شاید اس زمانے میں یہی محاورہ مقبول تھا۔ نشور واحدی صاحب کا مصرع بھی ان دنوں بہت مشہور ہوا تھا:

جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

یہ سب سہی، لیکن ''زندگی کو سنوارنا'' مجھے اب کچھ بہت اچھا نہیں لگتا۔ مگر یہ بات اس وقت میرے لیے کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے زور و شباب کا تھا۔ اس وقت ہم لوگوں کو ترقی پسند ادیبوں کے حالات جاننے، ان کی کتابیں اور رسالے پڑھنے، ان کے بارے میں باتیں کرنے کا شوق تھا۔ زبان و بیان کی اہمیت اگر تھی تو ثانوی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں یہ معلومات میرے لیے زیادہ بامعنی تھی کہ وہ ذات کے سید اور ایک صوفی خاندان کے فرد ہیں اور ان کا نام احمد شاہ ہے اور پنجاب میں تمام سیدوں کی بڑی آؤ بھگت ہے، لوگ انھیں ''شاہ صاحب'' کہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے سرکاری نوکری چھوڑ کر شعر و شاعری اور صحافت اور

سیاسی کاموں کا مشغلہ اختیار کر لیا ہے اگر چہ اس میں فائدہ کچھ نہیں، بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔ ہم جو گلشنِ ادب کے نوآموز اور نوپر تھے، ہمیں یہ سب باتیں بڑی دل کش، رومانی، اور شاعر کے منصب کے عین مناسب معلوم ہوتی تھیں۔ ترقی پسند ادب نے ادیب کو ہیرو کے طور پر پیش کرنا آغاز کیا تھا اور ہم سب کسی نہ کسی نہج سے اس بات کو درست سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کا یہ قول ہم میں سے اکثر کو بالکل بجا اور قابل یقین معلوم ہوتا تھا کہ ہر اشخص اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔

یہ انجمن ترقی اردو کے لیے بڑی تحسین اور افتخار کی بات ہے کہ نئے ادب کا دور شروع ہوتے ہی انجمن نے نئی شاعری کا ایک انتخاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 'انتخاب جدید' کے نام سے یہ گل دستہ آل احمد سرور اور عزیز احمد نے مرتب کیا اور انجمن نے اسے 1943 میں شائع کیا۔ اس انتخاب میں اکثر ترقی پسند شعرا نظر آتے ہیں لیکن احمد ندیم قاسمی ان میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس وقت تک قاسمی صاحب کا نام بطور افسانہ نگار زیادہ مشہور تھا۔ اس وقت ترقی پسند شاعری کے دو رنگ رائج تھے، اور شاید ہمیشہ رائج رہے۔ ایک تو فیض صاحب کا رومانی، کیفیت سے بھر پور، شائستہ، تھوڑی سی محزونیت لیے ہوئے، استعارہ و تشبیہ اور نئے نئے الفاظ و تراکیب سے جگمگاتا ہوا اسلوب، اور دوسرا سردار جعفری کا بلند آہنگ، خطیبانہ، براہ راست گفتگو کا انداز، جس کی انتہائی شکل سید مطلبی فرید آبادی کی نظم میں نظر آتی تھی۔ بعد میں مجروح صاحب نے کچھ غزلوں میں اور نیاز حیدر نے اپنی تمام نظموں میں یہی اسلوب اختیار کیا۔ 'انتخاب جدید' میں دونوں رنگوں کے محتاط نمونے ملتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا اسلوب شعر ان دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر لگی۔

اگر چہ احمد ندیم قاسمی کے اصل شاعرانہ جوہر ان کی نظم میں نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے غزل میں بھی کئی شعر ایسے کہے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ کم و بیش ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے :

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

یکساں ہیں فراق و وصال دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

جہاں تک نظم کا معاملہ ہے، ندیم صاحب کی بڑی صفت یہ تھی کہ ان کے تخیل میں کچھ اس طرح کی آسمان گیری ہے جو اقبال کی یاد دلاتی ہے اور اقبال ہی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اقبال جس آسانی اور بے تکلفی سے فلک، چاند تاروں، سورج، خلائے بسیط اور زمان و مکان پر مبنی استعارے اور پیکر اپنی نظم اور غزل میں استعمال کرتے ہیں، کچھ اسی طرح کی آسماں گیری قاسمی صاحب کے یہاں بھی ہے، اگر چہ قاسمی صاحب کے یہاں اقبال جیسی تعقلاتی کیفیت اور ڈرامائی رنگا رنگی نہیں۔ قاسمی صاحب کی جس نظم کے دو شعر میں نے شروع میں درج کیے ہیں ان میں بھی یہی آسمان گیری نمایاں ہے۔ یہاں زمین صرف زمین نہیں ہے بلکہ کائنات میں گھومتا ہوا، رقص کرتا ہوا ایک ماورائے انسانی، خلائی وجود ہے۔ اب ایک اور نظم کے یہ مصرعے دیکھیے :

اگر وقت سورج کی زر کار بجلی کو صرف ایک پل کے لیے روک سکتا
اگر یہ جہاں دیدہ کاہن کبھی انقلابات کا راستہ ٹوک سکتا
لپکتا مگر اس کی تقدیر میں ہے پلٹنا بھی دشوار تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں ستا سکے گا ازل اس کی نگری ابد اس کی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں، یہ شام یہ شب یہ پو یہ سویرا
تو دکھے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھریرا
(ناگزیر)

پہلے یہ بات واضح کر دوں کہ "سرخ پہیوں" سے مراد اشتراکی انقلاب وغیرہ کی سرخی نہیں، بلکہ سورج کی "زر نگار بجلی" یعنی وقت کا سفر ہے۔ وقت وہ انقلابی آگ ہے جو اجنبی طاقت کے پھریرے کو جلا کر خاک کر دے گی۔ نظم کو ہم مارکسی نقطۂ نظر سے تاریخ کی ناگزیریت کے نظریے پر مبنی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ تاریخ کی ناگزیریت کو بیان کرنے کے لیے احمد ندیم قاسمی نے آسمان، سورج، وقت کی شاہراہ، ابد، ازل جیسے الفاظ پر مبنی پیکر اور تصورات کا انتخاب کیا ہے۔ بعض الفاظ تو بالکل ہی اقبال کی تخلیقی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے قاسمی صاحب کے بہت سے افسانے اپنے زمانہ نوجوانی میں پڑھے۔ بعض مجھے اچھے لگے، بعض نے مجھے اس لیے متاثر کیا کہ وہ اس روایتی خوبی سے معرا تھے جو احمد ندیم قاسمی کی خاص صفت بتائی جاتی ہے، یعنی پنجاب کے دیہات کی تصویر کشی۔ ویسے مجھے یہ بات ہمیشہ کچھ نامناسب لگی

کہ افسانہ نگاروں کو اس طرح علاقوں میں بانٹ دیا جائے، کیونکہ پھر ان کی شخصیت ان ہی علاقوں کے حوالے سے متعارف اور مذکور ہوتی ہے۔ بیدی صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار تو اس علاقائی پھندے سے بچ نکلتے ہیں، اور بیدی صاحب یوں بھی اس قدر متنوع ہیں اور ان کے تنوع کا ہر رنگ اس قدر توجہ انگیز ہے کہ ان پر کوئی لیبل فٹ نہیں آتا۔ لیکن بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی جیسے عمدہ لیکن نسبتہً محدود افسانہ نگار نقصان میں رہتے ہیں۔

بہر حال، وقت گزرنے کے ساتھ قاسمی صاحب کا تصور میرے ذہن میں ایک روشن خیال بزرگ اور وسیع الاخلاق مدیر کی صورت میں روشن ہوتا گیا۔ سنہ ساٹھ کی دہائی میں، جب ترقی پسند تحریک اپنے معنی کھو چکی تھی (پاکستان میں اس کا حال ہندوستان سے بھی زیادہ ابتر تھا) اور ترقی پسند ادب صفحۂ ادب کے مرکز سے ہٹ کر حاشیے پر آگیا تھا اور فیض صاحب کے سوا تمام ترقی پسند ادیبوں کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگنے کی نوبت آرہی تھی، قاسمی صاحب نے 1963 میں 'فنون' نکالا اور وہ بہت جلد اردو کی ادبی دنیا میں ایک اہم شخصیت کے طور پر واپس آگئے۔ 'فنون' ترقی پسند رسالہ نہ تھا۔ لیکن یہ جدید، یا قدامت پسند رسالہ بھی نہیں تھا۔ 'فنون' کے اوراق ہر طرح کے ادب کے لیے کھلے ہوئے تھے، بس معیار کی بلندی اور انداز کی تازگی شرط تھی۔ قاسمی صاحب نے کوئی ترقی پسند گوشوارۂ عمل جاری کرنے کے بجائے تمام ترقی پسند ادب کو زمانے کا ہم قدم ہونے اور پھر بھی ترقی پسند رہنے کی ترغیب دی۔ ہر مکتب فکر اور اسلوب فن کے لکھنے والوں کو 'فنون' کے صفحات پر جگہ دے کر انھوں نے اس اصول کی تصدیق و توثیق کی کہ اچھا ادب لازمی طور پر کسی جھنڈے یا لیبل کا محتاج نہیں ہوتا۔

سنہ 1969 میں 'فنون' کا جدید غزل نمبر نکلا۔ اس میں کئی خواص ایسے تھے جو اسے ضخیم نمبروں کی عام ڈگر سے الگ راہ پر قائم کرتے تھے۔ لیکن اس میں ایک خوبی ایسی تھی جو اس طرح کے کسی نمبر کو نصیب نہ ہوئی، نہ پہلے نہ بعد میں۔ اور وہ خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر مکتب و منہاج کے اچھے شاعر شامل کیے گئے تھے اور ان شعرا کو بطور خاص جگہ دی گئی تھی جنھیں اس وقت کے 'فیشن' کے مطابق 'جدید غزل' کے کسی انتخاب میں شامل ہونے کا استحقاق نہ تھا۔ فہرست سے چند نام حسب ذیل ہیں:

آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، احتشام حسین، احسان دانش، اقبال عظیم، حفیظ جالندھری، شفقت مرزا، شیر افضل جعفری، صوفی تبسم، عابد علی عابد، ماجد الباقری، محمد نبی خاں جمال سویدا، منظور حسین شور اور بہت سے دوسرے، جن میں سے بعض کا کلام اس لیے محفوظ رہ گیا ہے کہ وہ 'فنون' کے جدید غزل نمبر میں ہے۔ اور بہت سے شعرا ایسے ہیں آج جن کے بارے میں توصیفاً کہا جاتا ہے کہ وہ 'فنون' کے جدید غزل نمبر میں شامل تھے۔ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کم ہی پرچے ایسے ہوں گے جن کا کوئی خاص نمبر تقریباً چالیس سال گذرنے کے باوجود تازہ اور قابل مطالعہ معلوم ہو۔ وجہ ظاہر ہے۔ قاسمی صاحب کا معیار انتخاب ذاتی یا نظریاتی تعصبات سے بالاتر تھا۔ 'فنون' کے علاوہ اور بھی پرچے تھے (مثلاً 'سویرا') جو نئے ادب کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن 'فنون' جیسی وسعت نظر کسی میں نہ تھی۔

ایڈیٹر کی حیثیت سے قاسمی صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی جس پر میں نے ہمیشہ رشک کیا۔ قلمی معاونین کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ اخیر عمر تک ان کا سواد خط بہت پاکیزہ اور حروف کی نشست بہت پختہ تھی۔ خط میں از راہ انکسار اپنا نام وہ ہمیشہ 'ندیم' لکھتے تھے اور جو تحریر انھیں پسند آتی اس کی تعریف کرتے تھے، خواہ وہ ان کے ادبی موقف کی حمایت میں ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بہترین دنوں میں 'فنون' سے زیادہ تازہ کار، فکر انگیز مضامین اور عمدہ شعر و افسانہ چھاپنے والا کوئی رسالہ پاکستان میں نہ تھا۔ کراچی کے رسالے نئی تحریروں کے بارے میں بہت محتاط، بلکہ قدامت پرست تھے لیکن قاسمی صاحب ہمیشہ نئی اور متنازعہ فیہ ہو جانے والی تخلیقات کے جویا رہتے تھے۔ انھوں نے محمد حسن عسکری پر محمد ارشاد، اور امیر خسرو، اور وزیر آغا پر رشید ملک کے طول طویل مضامین کئی قسطوں میں شائع کیے۔ ہر شخص ان کی ہر بات سے مطمئن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن ہر شخص متفق تھا کہ ساری قسطیں بہت خیال افروز اور اعلیٰ علمی سطح کی مثال پیش کرتی تھیں۔

قاسمی صاحب نے کالم اور تنقیدیں بھی لکھیں۔ پاکستان میں کالم کے نام پر جس طرح لوگوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور جس طرح کالم نگاری کو ادبی سیاست کے موثر اور مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، سب اس سے واقف ہیں۔ قاسمی صاحب نے کالم نگاری کے پردے میں ذاتی حملے کرنے کا مشغلہ اختیار کرنے سے عموماً گریز کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاسمی صاحب کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی، اپنے تعصبات نہیں تھے۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے اختلافات، فیض صاحب کے بارے میں قاسمی صاحب کی رائے زنی، یہ سب جدید ادب کے جھگڑوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں قاسمی صاحب نے اپنے قلم یا زبان کو تکلیف دہ مذمتوں سے محفوظ رکھا۔ کئی سال ہوئے فراق صاحب پر میری کچھ

تحریروں پر، اور خاص کر ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کو فراق صاحب پر تفوق دینے کی بات پر آشفتہ ہو کر قاسمی صاحب نے ایک کالم لکھا تھا جس میں منجملہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ فراق صاحب کی زندگی میں تو فاروقی صاحب کچھ بولے نہیں، جب فراق صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں تو وہ انھیں اپنا ہدف بنا رہے ہیں۔ میں نے وہ کالم دیکھا لیکن خاموش رہا کیونکہ ایسے معاملات میں کچھ کہنا بے اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس کالم کی اشاعت کے کئی سال بعد جب ایک معزز معاصر رسالے نے قاسمی صاحب کا وہ کالم بڑے اہتمام سے یوں چھاپا گویا وہ کوئی تازہ تحریر ہو تو میں نے قاسمی صاحب کو لکھا کہ میں نے فراق صاحب کے بارے میں جو لکھا وہ ان کی زندگی میں لکھا تھا۔ لیکن آج آپ کا وہ پرانا کالم یوں شائع کیا جا رہا ہے گویا وہ آپ کی تازہ تحریر ہو۔

قاسمی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کالم کس نے چھاپا ہے، میری اجازت تو کیا، اشارہ بھی اس میں نہ تھا۔ اور فراق صاحب کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی تحریریں ان کی عین حیات میں شائع ہوئی تھیں، ورنہ میں ایسا کچھ بھی نہ لکھتا جو میں نے لکھا تھا۔ میں نے اس معاملے کو وہیں رفت گذشت کیا کیونکہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔

میں پچھلی بار جب لاہور گیا تو میں نے قاسمی صاحب سے ملاقات کا خاص اہتمام کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گذشتہ سے ایک سال پہلے میں لاہور میں اپنے بہت مختصر اور مصروف پروگرام کے باعث ان سے نہ مل سکا تھا، اگرچہ کوشش میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں واپس آیا تو قاسمی صاحب کا شکایت نامہ ملا کہ آپ مجھ سے بے ملے چلے گئے۔ اگر آپ کو فرصت نہ تھی تو کہلا دیتے، میں ہی آ جاتا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں نے فوراً معذرت نامہ لکھا۔ اس آخری ملاقات نے مجھے رنجیدہ کیا، کیونکہ قاسمی صاحب پر عمر رسیدگی کا اضمحلال نمایاں تھا، اگرچہ گفتگو میں پہلے ہی جیسی شگفتگی تھی۔ واپس آ کر میں نے انھیں کچھ رباعیاں ان کے نام معنون کر کے بھیجیں۔ وہ انھوں نے شائع کر دیں لیکن جواب میں خط کے بجائے ایک دوست کے ذریعہ شکریہ کہلا بھیجا۔

اب لاہور میں میرا کوئی بزرگ ایسا نہیں رہ گیا جس سے میں لاہور جا کر نہ ملوں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شکایت نامہ لکھے کہ آپ مل کر نہیں گئے۔

یاران رفتہ آہ بڑی دور جا بسے
(مصحفی)

'اردو دنیا' سے

احمد ندیم قاسمی: مطبوعات کے آئینے میں

نند کشور وکرم

افسانوی مجموعے: 17

چوپال (1939) بگولے (1941) طلوع و غروب (1942) گرداب (1943) سیلاب (1943) آنچل (1944) آبلے (1946) آس پاس (1948) در و دیوار (1948) سناٹا (1952) بازارِ حیات (1959) برگِ حنا (1959) سیلاب و گرداب (1961) گھر سے گھر تک (1963) کپاس کا پھول (1973) نیلا پتھر (1980) کوہ پیما (1995)

شعری مجموعے: 9

دھڑکنیں (قطعات 1942) رِم جھم (قطعات و رباعیات 1944) جلال و جمال (1946) شعلۂ گل (1953) دشتِ وفا (1963) محیط (1976) دوام (1979) لوحِ خاک (1988) بسیط

تحقیق و تنقید:

تہذیب و فن (1975) ادب اور تعلیم کے رشتے (1974) علامہ محمد اقبال

ترتیب و ترجمہ:

انگڑائیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب 1944) نقوشِ لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب 1944) پاکستان کی لوک کہانیاں (از میریلین سرچ) کیسر کیاری (مضامین، ڈرامے، تراجم 1944) منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی (1966) نذیر حمید احمد خاں (1977) میرے ہم سفر

بچوں کا ادب:

تین ناٹک (1944) دوستوں کی کہانیاں (1944) نئی نویلی کہانیاں (1944) تینوں کتابیں پنجاب بک ایجنسی، لاہور سے طبع

متعلقہ کتابیں اور خصوصی نمبر:

*ندیم کی شاعری اور شخصیت (تحقیق) جمیل ملک *احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے، مرتبہ مظفر علی سید *ندیم نامہ مرتب محمد طفیل، بشیر موجد 1974) *مٹی کا سمندر مرتب ضیا ساجد (1991) *احمد ندیم قاسمی... ایک لیجنڈ از شکیل الرحمن اساطیر لاہور *ندیم نمبر مرتب صہبا لکھنوی ماہنامہ افکار کراچی (1976) *احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن مرتب: نند کشور وکرم، عالمی اردو ادب دہلی (1996)

ہندی میں:

اردو کہانی کار احمد ندیم قاسمی مرتب نند کشور وکرم اندر پرستھ پرکاشن دہلی۔ اس کے علاوہ انگریزی، روسی، چینی، جاپانی، ہندی، پنجابی، بنگلہ، سندھی، گجراتی مراٹھی اور فارسی وغیرہ متعدد زبانوں میں کہانیوں اور شاعری کے تراجم۔ OO

گریۂ دوستاں
اشک نامے
مشاہیر ادب

گوپی چند نارنگ

اردو ادب کے معروف وممتاز شاعر، افسانہ نگار، صحافی احمد ندیم قاسمی آج بروز پیر 10 جولائی 2006 کو ہندستانی وقت کے مطابق تقریباً پونے دس بجے صبح لاہور میں اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ انتقال کے وقت ان کی عمر نوے (90) سال کے لگ بھگ تھی۔

احمد ندیم قاسمی کو ایک عرصہ سے سانس کی تکلیف تھی۔ مجھے جو اطلاعات دوستوں سے بذریعہ ٹیلی فون یا دوسرے رابطوں سے مسلسل ملتی رہیں ان کے مطابق انھیں 8 جولائی کو لاہور کے ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ 9 جولائی کو معلوم ہوا ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ لیکن آج صبح پانچ بجے کے قریب ان کی حالت بگڑنے لگی اور انھیں ICU میں لے جایا گیا۔ تاہم بروقت طبی امداد فراہم کیے جانے کے باوجود قاسمی صاحب وفات پاگئے۔ احمد ندیم قاسمی کے صاحبزادہ نعمان قاسمی، ان کی صاحبزادی ناہید قاسمی اور ان کی منہ بولی بیٹی اور فنون میں ان کی شریک مدیرہ منصورہ احمد سب اس موقع پر ہسپتال میں موجود تھے۔ ان کی میت ان کے گھر لے جائی گئی اور ان کی تدفین آج لاہور ہی میں ہوگی۔

احمد ندیم قاسمی اس وقت پاکستان کے سب سے سینئر اور سربرآوردہ ادیب تھے اور سب ان کا احترام کرتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں وہ اس کے جنرل سکریٹری رہے۔ بحیثیت شاعر، بحیثیت افسانہ نگار اور بحیثیت مدیر اردو ادب کی تاریخ میں ان کا مقام محفوظ ہے۔ ان کے بیسیوں شعری مجموعے، افسانوی مجموعے اور دیگر نگارشات پر مبنی کتابیں شائع ہوئیں۔ ادب لطیف، نقوش اور فنون کے مدیر کی حیثیت سے ان کی ادبی خدمات بہت وقیع ہیں اور انھوں نے کئی نسلوں کی ذہنی تربیت میں نہایت فعال کردار ادا کیا۔ ان کے انتقال سے اردو ادب کا ایک ستون گر گیا اور ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

وزیر آغا

احمد ندیم قاسمی صاحب کی وفات اردو دنیا کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ انہوں نے 75 برس تک اردو ادب اور زبان کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ ادب کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی وفات کی خبر سن کر بے حد دکھ ہوا ہے۔

انتظار حسین

قاسمی صاحب ہمارے آخری بزرگ تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا اور لکھنا شروع کیا۔ ان کے بعد سے بزرگوں کی ایک پوری نسل اختتام کو پہنچ گئی۔ قاسمی صاحب آخری بزرگ نظر آتے تھے وہ بھی جدا ہو گئے۔ اب اردگرد سناٹا نظر آتا ہے کچھ ادیب ایسے ہوتے ہیں جو شخصیت بن جاتے ہیں ہمارے درمیان سے شخصیت غائب ہو گئی ہیں اور آخری شخصیت قاسمی صاحب کی تھی وہ بھی نہیں رہی۔

خلیق انجم

احمد ندیم قاسمی بیسویں صدی کے اہم ترین اردو ادیبوں میں سے ایک تھے۔ ساری زندگی اردو ادب کی گراں قدر خدمت انجام دینے میں مصروف رہے۔ وہ صفِ اوّل کے افسانہ نگار اور مشہور ممتاز شاعر تھے۔ قاسمی صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ لیکن وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اگرچہ ان کی بہت سی نظموں کی پذیرائی کی گئی لیکن ان کی غزلوں کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

صحافت میں بھی وہ اتنے سنجیدہ رہے جیسے شاعری اور افسانہ نگاری میں تھے۔ کوئی بھی نقاد اور ادبی مورخ تاریخ ادب اردو لکھتے ہوئے احمد ندیم قاسمی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ OO

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا

نوائے ندیم

غزلیں اور نظمیں

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا
تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا
اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا
تیرا پیغامِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا
چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا
اب تو خورشید کو ڈوبے ہوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے میں تا بہ سحر جاؤں گا
زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

اب تک تو نور و نکہت و رنگ و صدا کہوں
میں تجھ کو چھو سکوں تو خدا جانے کیا کہوں
لفظوں سے ان کو پیار ہے مفہوم سے مجھے
وہ گل کہیں جسے میں ترا نقشِ پا کہوں
اب جستجو ہے تیری جفا کے جواز کی
جی چاہتا ہے تجھ کو وفا آشنا کہوں
صرف اس لئے کہ عشق اسی کا ظہور ہے
میں تیرے حسن کو بھی ثبوتِ وفا کہوں
تو چل دیا تو کتنے حقائق بدل گئے
نجمِ سحر کو مرقدِ شب کا دیا کہوں
کیا جبر ہے کہ بت کو بھی کہنا پڑے خدا
وہ ہے خدا تو میرے خدا تجھ کو کیا کہوں
جب میرے منہ میں میری زباں ہے تو کیوں نہ میں
جو کچھ کہوں یقیں سے کہوں برملا کہوں
کیا جانے کس سفر پہ رواں ہوں ازل سے میں
ہر انتہا کو ایک نئی ابتدا کہوں
ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاقِ سخن پہ ناز
غالب کو کائناتِ سخن کا خدا کہوں

لبِ خاموش سے افشا ہو گا
راز ہر رنگ میں رسوا ہو گا
دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہو گا
تم نہیں تھے تو سرِ بامِ خیال
یاد کا کوئی ستارا ہو گا
کس توقع پہ کسی کو دیکھوں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہو گا
زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہو گا
ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
درد چمکے گا تو پھر کیا ہو گا
جس بھی فن کار کا شہ کار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہو گا
کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گل کوئی ٹوٹا ہو گا
عمر بھر روئے فقط اس دھن میں
رات بھیگی تو اجالا ہو گا
ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہو گا

احمد ندیم قاسمی

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیم کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبت یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اذن ہو تو تیری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود مری روح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پہ
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں کدھر کدھر جاؤں

یہ سوچتا ہوں کہ میں بت پرست کیوں نہ ہوا
تجھے قریب جو پاؤں تو خود سے ڈر جاؤں

کسی چمن میں بس اس خوف سے گزر نہ ہوا
کسی کلی پہ نہ بھولے سے پاؤں دھر جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں
کہ خون بن کے رگِ سنگ میں اتر جاؤں

ذہنوں میں خیال جل رہے ہیں
سوچوں کے الاؤ سے لگے ہیں

دنیا کی گرفت میں ہیں سائے
ہم اپنا وجود ڈھونڈتے ہیں

اب بھوک سے کوئی کیا مرے گا
منڈی میں ضمیر بک رہے ہیں

ماضی میں تو صرف دل دکھتے تھے
اس دور میں ذہن بھی دکھے ہیں

سر کاٹتے تھے کبھی شہنشاہ
اب لوگ زبان کاٹتے ہیں

ہم کیسے چھڑائیں شب سے دامن
دن نکلا تو سائے چل پڑے ہیں

لاشوں کے ہجوم میں بھی ہنس دیں
اب ایسے بھی حوصلے کسے ہیں

وہ کوئی اور نہ تھا چند خشک پتے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گل پہ روئے تھے

ابھی ابھی تمہیں سوچا تھا کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اک دوسرے سے بچھڑے تھے

تمہارے بعد چمن پر جب اک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے

تمام عمر وفا کے گناہ گار رہے
یہ اور بات کہ ہم آدمی تو اچھے تھے

شبِ خموش کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گونجتے تھے دشت سنسناتے تھے

وہ ایک بار مرے جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے روز مرتے تھے

نئے خیال اب آتے ہیں ڈھل کے ذہنوں میں
ہمارے دل میں کبھی کھیت لہلہاتے تھے

یہ ارتقا کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیم جو بھی ملاقات تھی ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

احمد ندیم قاسمی

کس کو قاتل میں کہوں کس کو مسیحا سمجھوں
سب یہاں دوست ہی بیٹھے ہیں کسے کیا سمجھوں
وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر وہم یقیں ہوتا تھا
اب حقیقت نظر آئے تو اسے کیا سمجھوں
دل جو ٹوٹا تو کئی ہاتھ دعا کو اٹھے
ایسے ماحول میں اب کس کو پرایا سمجھوں
ظلم یہ ہے کہ ہے یکتا تری بے گانہ روی
لطف یہ ہے کہ میں اب تک تجھے اپنا سمجھوں

شام کو صبح چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی
جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی
یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی
چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی
دن شعاعوں سے الجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

جب ترا حکم ملا ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی
تجھ سے کس طرح میں اظہار تمنا کرتا
لفظ سوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی
میں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تو نے جا کر تو جدائی مری قسمت کر دی
مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری الفت نے محبت مری عادت کر دی
پوچھ بیٹھا ہوں میں تجھ سے ترے کوچے کا پتہ
تیری حالت نے یہ کیسی تری صورت کر دی

لبوں پہ نرم تبسم رچا کے دھل جائیں
خدا کرے مرے آنسو کسی کے کام آئیں
جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھے
وہ بد نصیب کسی کا سراغ کیا پائیں
تلاشِ حسن کہاں لے چلی خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں
بلا رہے ہیں افق پر جو زرد رو ٹیلے
کہو تو ہم بھی فسانے کے راز ہو جائیں
نہ کر خدا کے لئے بار بار ذکرِ بہشت
ہم آسماں کا مکرر فریب کیوں کھائیں
تمام مے کدہ سنسان مے گسار اداس
لبوں کو کھول کے کچھ سوچتی ہیں مینائیں

زیست آزار ہوئی جاتی ہے
سانس تلوار ہوئی جاتی ہے
جسم بے کار ہوا جاتا ہے
روح بیدار ہوئی جاتی ہے
کان سے دل میں اترتی نہیں بات
اور گفتار ہوئی جاتی ہے
ڈھل کے نکلی ہے حقیقت جب سے
کچھ پر اسرار ہوئی جاتی ہے
اب تو ہر زخم کی منہ بند کلی
لب اظہار ہوئی جاتی ہے
پھول ہی پھول ہیں ہر سمت ندیم
راہ دشوار ہوئی جاتی ہے

گل ترا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاروں میں
مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا
دل کی لو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں
حسن بے گانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں
ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بہ عنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں
زخم چھپ سکتے ہیں لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں
مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبت کے گنہگاروں میں

پتھر

ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر میں تجھے پتھر لا دوں

میں ترے سامنے انبار لگا دوں لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا

سرخ پتھر جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں سے تحیر کے پڑے ہیں ڈورے
یا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہو گی
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے
اک وہ پتھر ہے جسے کہتے ہیں تہذیبِ سفید
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے
ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے

جتنے معیار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
شعر بھی حسن بھی تصویر و غنا بھی پتھر
میرا الہام ترا ذہنِ رسا بھی پتھر

اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے میری زباں پتھر ہے
ریت سے بت نہ بنا اے مرے اچھے فن کار

منفیت کا منشور

چلو کچھ اور سوچیں
ہم نے اب تک جو بھی سوچا ہے
وہ صدیوں کی پرانی سوچ ہے
اب عہد جو بھر ہے
یہ وہ لمحہ ہے
جس کے شہپروں پر بیٹھ کر
ہم کوزمیں سے اپنا ناتا توڑنا
اور آسماں سے جوڑ لینا ہے
چلو کچھ اور سوچیں
اب یہ دنیا
اور انساں
اور اس کے دُکھ
پرانے، کرم خوردہ، بھربھرے، بدرنگ
بے لذت فسانے ہیں
چلو کچھ اور سوچیں
اور محبت کی بساطیں تہہ کریں
اور حسن کی قدریں بدل ڈالیں
چمکتی دھوپ پر
اور چاندنی راتوں پہ لعنت بھیج کر
پھولوں پہ تھوکیں
ندیوں کو پتھروں سے پاٹ دیں
رشتوں کو کاٹیں
رابطوں کو روند ڈالیں
سولیاں گاڑیں
چلو کچھ اور سوچیں
لفظ سے مفہوم کی دولت اچک لیں
اور اسے پتھر بنا ڈالیں
زبانیں نوکِ خنجر کی طرح سینوں میں گاڑیں
نغمگی کو چیخ میں بدلیں
سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں
وادیوں میں دلدلیں بھر دیں
چلو کچھ اور سوچیں
اب یہی سوچیں
کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے
وہ سب کفر ہے
اور حق فقط یہ ہے
کہ جو کچھ ہے
نہیں ہے
کچھ نہیں ہے
واہمہ ہے، خواب ہے
اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں!

'دوام' جنوری 1976

پابندی

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں تیری سیاست فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
میں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو

جب جھیل کے آئنے میں گھل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہوا ہو تصویر
ہر پھول سوال ہو گیا ہو

جب خاک سے رفعتِ نما تک
ابھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

اس وقت مرے سلگتے دل پر
شبنم سی اتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریم بے نشاں سے
انساں کو پکارتا ہے کوئی

'دشت وفا' دسمبر 1953

خواب

چاندنی نے رنگِ شب جب زرد کر ڈالا تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے!

'دوام' جنوری 1976

انسان

خدا عظیم، زمانہ عظیم، وقت عظیم
اگر حقیر ہے کوئی یہاں تو صرف ندیم
وہی ندیم، وہی لاڈلا بہشتوں کا
وہی ندیم، جو مسجود تھا فرشتوں کا
وہ جس نے جبر سے وجدان کو بلند کیا
وہ جس نے وسعتِ عالم کو اک زقند کیا
وہ جس نے جرمِ محبت کی جب سزا پائی
تو کائنات کے صحراؤں میں بہار آئی
وہ جس نے فرش کو بھی عرش کا جمال دیا
وہ جس نے تند عناصر کو ہنس کے ٹال دیا
بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے، جھکا تو پھول کھلائے
وہ جس کے نام سے عظمت قسم اٹھاتی ہے
اسی کی آج خدائی ہنسی اڑاتی ہے
نہیں — کسی سے بگڑنا مرا سبھاؤ نہیں
مری سرشت میں گلزار ہیں، الاؤ نہیں
ہزار بار شکستوں پہ مسکرایا ہوں
مصیبتوں کی گرج میں بھی گنگنایا ہوں
اگر حریم بقا سے فنا ملی ہے مجھے
اسی فنا میں بقا کی ادا ملی ہے مجھے
خدا شناس بھی ہوں اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دور بھی ہوں اور خدا کے پاس بھی ہوں
یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا
زمیں مری ہے، فضا بھی مری، خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیم ماورا بھی مری
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولھا ہوں میں، ندیم ہوں میں

("شعلۂ گل") اپریل 1947

عنفوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب
ایک معصوم کلی
شاخساروں سے ہمک کر نکلی
آئینہ دیکھ کے شرمائی لجائی، کانپی
جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا
لیکن احساسِ جمال
ایک کوندا ہے جو پہلے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے
اور معصوم کلی
کپکپاہٹ کے تسلسل سے
چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی
چور ہوئی
غنچہ تخلیق ہوا
آئینہ چونک اٹھا

بہار

اتنی خوش بو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار

آگ جلتی ہے کہ کھلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روشوں پر ہے قیامت کا نکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے چٹکتی ہے کلی
کونپلیں پھوٹ کے لو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں صبا یوں بھی چلی

OO

خطاب: ایک مزار کا مرثیہ

ولی دکنی: شاعرِ انسانیت، محبت، تصوف

پروفیسر گوپی چند نارنگ

محبت

کے شاعر کو نفرت کا نشانہ بنانا غلط ہے، لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ نفرت کا نشانہ اسی کو بنایا جاتا ہے جو محبت کا مظہر ہو!

حضرات! ادھر ہماری تاریخ اور ہماری تہذیب کچھ ایسے موڑ پر آگئی ہے کچھ ایسے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان جیسے ملک میں، جس کی روایت، جس کا Ethos، جس کا Genius امن، محبت، شانتی، اہنسا سے عبارت ہے، پچھلے پچاس پچپن برس سے نفرت کا کاروبار زوروں پر ہے اور نفرت کا یہ کاروبار دہشت کا، قتل وخون کا، معصوموں کے خون اور ان کی عزت سے ہاتھ رنگنے کا، ہر طرح کے تشدد کا کاروبار بنا ہوا ہے۔ یہ شروع ہوا نفرت کی سیاست سے، الگاؤواد کی سیاست سے جس میں سامراجی طاقتوں کا ہاتھ تھا لیکن اس کو بڑھاوا دیا خود ہم نے۔ ہماری تاریخ آج سے سو برس بعد دو سو برس بعد جب ان افسوس ناک واقعات کے چہرے میں اپنا آئینہ دیکھے گی تو خود سے کتنی شرم سار ہوگی کہ ہماری روایت تو وہ ہے جو گوتم بدھ کی ہے، اور اس وقت تاریخ جس راہ پر مڑ گئی ہے، یہ کہنا اچھا نہیں لگتا لیکن ایک ملک ایک قوم ایک پورے ملے جلے معاشرے کی جو اپنے تکثیری یعنی Pluralistic ہونے پر، اپنی رنگا رنگی پر، اپنے تنوع پر، اپنے تہذیبی تمول پر، اس کی گنگا جمنی روایت پر ناز کرتا ہو، اس معاشرے کے ہاتھ تہذیبی معاملوں میں خون سے رنگے ہوئے ہوں۔ ان حالات میں ہمارا فرض کیا ہو جاتا ہے؟ ہم لوگ جو حرف کی حرمت اور قلم کے تقدس کے امین ہیں، کیا ہم کو خاموش رہنا چاہئے؟ ادب کی اور شاعری کی روایت حق گوئی کی روایت ہے اور سماجی انصاف کا ساتھ دینے کی روایت ہے۔ ادب، شاعری، آرٹ ہمیشہ ضمیر کی آواز کو سامنے لاتے ہیں، سمجھوتوں سے کام نہیں لیتے۔ شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ضمیر کی آواز کو اظہار دینا اور حق کے لئے یا بے انصافی یا ظلم واستبداد کے خلاف ادبی طور پر آواز اٹھانا ہے۔ چاہے وہ آواز کتنی بالواسطہ کیوں نہ ہو، کوئی سنے یا نہ سنے، لیکن ادیب اور شاعر کا کام سچائی کی آواز کو سامنے لاتے رہنا ہے۔

جب گجرات میں یہ واقعات ہوئے، کچھ تنظیمیں بنیں، کچھ لوگ سامنے آئے، کچھ نظمیں لکھی گئیں، میڈیا نے بھی بہت ساتھ دیا۔ لیکن جیسا ہندوستان میں ایسے تمام واقعات کے بعد ہوتا ہے، وقت کی گرد جیسے جیسے بیٹھ جاتی ہے لوگ بھول جاتے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا کام ہے کہ ہم حرف کی آگہی کو عام کرتے رہیں، ولی کی انسانی، تہذیبی اور شعری اہمیت کے بارے میں بتاتے رہیں۔ طاقت ادیب یا شاعر کے پاس نہیں ہوتی، طاقت سیاست کے پاس ہوتی ہے۔ البتہ انسانی Values اور اقدار ادیب کے ساتھ ہوتی ہیں۔

سیاسی طاقت قدروں پر سمجھوتہ کرتی ہے مفاہمت کرتی ہے۔ سیاست نام ہی سمجھوتے بازی کا ہے۔ لیکن ہمارا کام یہ ہے کہ ہم بے خوفی سے اہل سیاست کو متوجہ کرتے رہیں، متنبہ کرتے رہیں اور محبت اور انسانیت کی آواز اٹھاتے رہیں۔

چنانچہ میں نے اس سیمینار کے سلسلے میں بعض مقتدر شخصیات کی مدد لینے کی کوشش کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک تعلیمی ادارہ ہے وہ ہمارے ساتھ ہے، سچائی، حق اور انصاف کی آواز اٹھانے کے لئے اور ولی کے پیغام کو عام کرنے کے لئے، یہاں سے وہاں تک ہمارے ساتھ سب اردو والے ہیں۔ ہم اب ایک لسانی اقلیت ہیں۔ روز بروز یہ اقلیت سکڑ رہی ہے۔ یہاں سے وہاں تک لیڈری کا دعویٰ کرنے والے تو بہت ہیں لیکن تدبر، دانش سے کام لے کر مسائل کو حل کرنے والے بہت کم ہیں۔ زیادہ تر لوگ جذبات کی فصل کاٹتے ہیں، اکساتے ہیں، جوش دلاتے ہیں، بھڑکاتے ہیں اور طاقت کا اپنا کھیل کھیلتے ہیں۔ ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے تہذیب سے، کوئی دلچسپی ادب سے نہیں، شاعری سے نہیں، ولی سے نہیں، کسی سے نہیں۔ نام ضرور لیں گے، کیوں کہ جس چیز میں فائدہ ہوتا ہے اس کا نام ضرور لیں گے۔ ولی کے مزار کو نشانہ بنایا جاتا ہے، دنگا ہوتا ہے، فساد ہوتا ہے لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں، اور

سرپھرے بے وقوف لوگ نقصان پہنچاتے ہیں لیکن معاشرے کا فرض ہے کہ گمرہی کو دور کرے، سچائی کو سامنے لائے۔ ہمارے بڑے شاعروں کی تربتوں کا نشان مٹ جائے۔ مگر یہ پہلی بار نہیں ہوا۔

میر کا شعر ہے:

مت تربتِ میر کو مٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

میر کی آواز میں ولی بھی یہی کہتا ہے۔ لکھنؤ میں میر کی قبر کا کیا ہوا؟ آپ کو معلوم ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں [illegible] بھیم سے جب ریل گذری تو میر کی قبر کے اوپر سے پٹری گذر گئی۔ وہ جو محبت، انسانیت، بھائی چارے، یگانگت اور انسانیت کی صلاح وفلاح کی بڑی شخصیات ہوتی ہیں ایسا سلوک ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہم نے منصور کو نہیں چھوڑا ہم نے سرمد کو نہیں بخشا ہم نے گاندھی جی کو نہیں بخشا۔ پاس داری ہم عظیم روایت کی کرتے ہیں نام ہم عظیم شخصیتوں کا لیتے ہیں، لیکن ہمارے اعمال جو ہیں وہ یہی ہیں۔

ولی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ گجرات میں گزارا اور گجرات سے ان کو جو جذباتی لگاؤ تھا اس کی شہادتیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہیں اور ان کے ادلتے بدلتے جن اسالیب کی طرف اشارہ کیا گیا، یہ حقیقت ہے کہ جب اورنگ زیب نے دکن کی بہت سی سلطنتوں کو فتح کیا ہے اور دکن شمالی سلطنت کا حصہ بنا تو آمد ورفت کے راستے نئے سرے سے کھل گئے۔ ولی کا کم از کم دو بار آنا اور مہینوں دہلی میں قیام کرنا معلوم ہے۔ میر تقی میر جیسا ثقہ راوی جب یہ لکھتا ہے اور دوسرے تذکرے بھی اس روایت کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک صوفی مرشد شاہ سعداللہ گلشن نے ان کو یہ سوچ کر مشورہ دیا کہ فارسی آہستہ آہستہ معدوم ہورہی ہے اور ریختہ یا ہندستانی میں لوگ گفتگو کررہے ہیں اور اس میں شعروشاعری بھی ہونے لگی ہے، لیکن فارسی کے مقابلے پر اردو کو وہ عزت وآبرو حاصل نہیں تھی، تو سعداللہ گلشن ایک صوفی مرشد کا یہ کہنا کہ اتنے سارے مضامین اور معیارات جو فارسی میں بے کار پڑے ہوئے ہیں تم ان کو صرف میں لاؤ۔ یہ حقیقت ہے کہ ولی کی شاعری کا ایک حصہ خاصا دکنی ہے اور ایک حصہ فارسی آمیز ہے۔ لیکن ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں ہندستانی زبان کا رنگ وآہنگ یعنی سرل سلیس اردو، سادہ، سہولت سے بولی جانے والی ہندستانی زبان کا گنگا جمنی خوبصورت ادبی آہنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے محمد حسین آزاد نے ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم کہا تھا، اور یہ بھی کہا تھا کہ جو درجہ بنیاد گذار چاسر کا انگریزی میں ہے وہی درجہ ولی کا اردو میں ہے اور یہ خطاب بہت ہی مناسب ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ولی کی آمدِ دہلی ایک طرح سے Turning Point ہے۔ جب ولی کا کلام دہلی پہنچا اور گایا گیا، اور اُسی زمانے سے شمالی ہندوستان میں باقاعدہ اردو غزل کا آغاز ہوتا ہے، تو ولی کے اندر ایسی کچھ خوبی ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امیر خسرو اور کبیر سے جو روایت چلی آتی تھی اور خواجہ فریدالدین گنج شکر یا نظام الدین اولیا اور جتنے صوفیا تھے اس وقت، جو رواداری اور اتحاد پسندی، محبت، یگانگت اور بھائی چارے کی فضا تھی اس سب کا اثر ولی کی شاعری نے قبول کیا۔ ولی کا شعر ہے:

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا

اس میں 'آزادگی' کا لفظ بہت اہم ہے یعنی دھرم یا مذہب کے ٹھیکے دار لوگ جس طرح مذہبوں کی دیواریں الگ الگ بناتے ہیں، جن کو ذات پات، نفرت، یا تفرقے کے نام پر استوار کرتے ہیں ان دیواروں کو کبیر اور ان کے ساتھیوں نے ڈھانے کی کوشش کی تھی۔ ولی کی پوری شاعری اسی کٹرپنتھی اور عصبیت کے خلاف محبت کی آواز ہے۔

ولی کے کلام میں ایک بڑی خوبی ہے اس زمانے کے شعرا کی طرح، کہ وہ مناسبت لفظی ومعنوی پر بہت توجہ صرف کرتے ہیں۔ رام کلی بھی جہاں آیا ہے یا ہندستانی اساطیر یا پرانوں کے حوالے جہاں جہاں آئے ہیں، ان میں بھی کوئی نہ کوئی مناسبت لفظی ومعنوی کا نکتہ ہے، کسی نہ کسی دوسرے لفظ کی وجہ سے وہ لفظ استعمال ہوا ہے جو ان کے ذہن میں حاضر ہے۔ 'بند مت ہو سبحہ وزنار کا' تسبیح میں بھی گرہ ہے، زنار میں بھی گرہ ہے، 'بند' میں بھی گرہ ہے، 'مت' ان سب کی نفی ہے، اور شاعر زور دے رہا ہے آزادگی پر، وارستگی پر، Liberalism پر، Humanity پر، اسی طرح سے ایک اور شعر ہے۔ یہ بالکل وہی ہے جو وحدت الوجود یا ویدانت کا مسلک ہے، کوئی ویدانتی بھی اس سے بڑھ کر کیا کہے گا کہ حقیقت ہر جگہ جلوہ گر ہے اور خدا کی ذات یا برہمہ (قادرِ مطلق) کی ذات ذرے ذرے میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ صفات پر ذات کا اطلاق ہے:

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ایسے اشعار سے ولی کی شاعری معمور ہے۔ اس طرح کے لفظ یا علامتیں یا تلمیحیں بہت واضح ہیں جیسے رام یا لکشمن یا ارجن یا بھیم یا دوسرے اعلام:

تب کا مشتاق جی ہے لکشمن سوں
کشن سوں جب سے رام راجی ہے

اب رام رامی میں بھی رعایت ہے اور کشن کا لفظ رام اور لکشمن کی رعایت سے آیا ہے، اور کرشن اور رام میں وہی نسبت ہے جو نسبت رام اور لکشمن میں ہے۔مزید دیکھیے:

گرچہ لکشمن تیرا ہے رام ولے
اے صنم تو کسی کا رام نہیں

یہاں رام ذو معنین ہی نہیں کئی معنی میں ہے۔یعنی رام رام کرنا، رام رامی، نیز رام کرنا یا رام ہونا، یا پھر رام کا نام۔

تو یہ ایسے گہرے اشارے ہیں جو ملی جلی تہذیب سے آتے ہیں۔اسی طرح ولی کا جو نظریہ جمال ہے وہ ہندستانی نظریہ جمال ہے۔یہ ولی کے لفظ لفظ میں رچا بسا ہوا ہے۔اگر آپ اشعار کے Deep Structure میں جائیں لفظوں کے پیچھے کے جو معنیاتی سُر ہیں اُن کو دیکھیں اور یہ سوال پوچھیں کہ اس شاعر کا جینیس کیا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے؟ کیا یہ ایرانی ہے؟ جواب ملے گا نہیں۔کیا یہ ہندستانی، فارسی والا ہے؟ جواب ملے گا نہیں۔پھر آپ پوچھیں دوسرے شاعروں کو دیکھتے ہوئے، تکارام ہیں، کبیر ہیں، راما نند ہیں جو ہندستانی Ethos کے شاعر ہیں۔ولی ان سے بھی الگ ہے۔ولی نہ ایرانی ہے نہ فارسی گو نہ ہندی گو۔وہ امتزاجی یعنی گنگا جمنی آہنگ کا شاعر ہے جو دھرتی کی بوباس رکھتا ہے۔ولی کی ایک مشہور غزل کا شعر ہے:

ہزاروں لاکھ خوباں میں صنم میرا چلے یوں کر

ہزاروں لاکھ خوباں میں محبوب جو ہے وہ یکتا ہے۔وہ ہجوم کی چیز ہے ہی نہیں، وہ تو سورج مکھی ہے۔اس سے نہ تو کسی کو ملانا، نہ اس کو ہجوم میں دکھانا مقصود ہے۔یہ ہجوم کی روایت کس کی ہے؟ دوبارہ غور کریں:

ہزاروں لاکھ خوباں میں صنم میرا چلے یوں کر
ستاروں میں چلے جوں ماہتاب آہستہ آہستہ

یہ ہزاروں لاکھ خوباں میں، بھیڑ میں چلنے کا جو تصور ہے یہ گوپیوں میں رادھا کا ہے یا پنگھٹ کو جانے والی سکھیوں کا ہے۔ہجوم میں حسنِ یکتا کو نشان زد کرنا یہ ہندستانی ذہن کا کرشمہ ہے۔اس طرح کے signs نشانات ولی کے یہاں عام ہیں:

مت غصہ کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھاتی جا

ولی کے کلام کو جہاں سے دیکھیے ایسی کوئی نہ کوئی چیز ضرور سامنے آئے گی:

تجھا سوادِ ہند میں شہرت نہیں صنم
تجھ زلفِ مشک بو کی خبر تا ختن گئی

تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے
تیری نگاہِ گرم سوں گل گل پگھل گئے

پہلے شعر میں نافہ کی رعایت سے ولی نے سوادِ ہند کی زلفِ مشک بو کی شہرت کو ختن پہنچا دیا ہے۔دوسرے شعر میں کہا ہے 'تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے' کنول جَل میں ہوتا ہے، جَل اور جل (جلنا) میں رعایت ہے۔'گل' گلنا سے ہے اور گال کا مخفف بھی۔سنسکرت شاعری سے یہ روایت چلی آتی ہے کہ محبوب کے رخ کو رنگت اور خوشنمائی کے اعتبار سے کنول سے تشبیہ کرتے ہیں۔ولی کے یہاں کنول کا رنگ گلاب سے کچھ چوکھا ہی ہے۔

ایک اشارہ مزید کرنا چاہوں گا آخر میں، نہ صرف یہ کہ ولی ہمیں پیغام دیتے ہیں محبت کا، انسانیت کا یگانگت کا اور وطن دوستی کا، بلکہ ان کے شاگردوں میں سے بھی بعض نے خاصی معنی خیز باتیں کی ہیں۔اشرف گجراتی ولی کا شاگرد ہے۔ولی کے زمانے میں نادر شاہ نے دہلی پر چڑھائی کی اور اتنے لوگوں کا قتل ہوا کہ خون کے دریا بہہ گئے۔دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔

اسی نادر شاہ کے بارے میں اشرف گجراتی کا شعر ہے:

یا الٰہی دفع کر اس ظالمِ بدبخت کوں
جس کی بے مہری وبختی سے فسادِ ہند ہے

ولی کا ایک اور شاگرد دولت سورتی ہے، اس کی طویل 'مثنوی راگ مالا' مشہور ہے جو ہندستانی سنگیت پر ہے۔وہ شخص سنگیت کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔یہ ہے ہندستانی مزاج میں رچ بس جانا۔ولی کے ایک اور شاگرد شاہ تراب نے 'مثنوی من سمجھاون' لکھی جو بھگتی رس میں ڈوبی ہوئی ہے۔

گجرات سے ولی کو جو محبت ہے، متعدد اشعار میں اس کا ذکر ہے۔ایک بھرپور قطعہ گجرات کے فراق میں کہا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بے تاب ہے سینے منیں آتش بہار دل
مرہم نہیں ہے زخم کا اس کے جہاں منیں
شمشیرِ ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اس شہر کے نشے سوں اول تو دماغ تھا
آخر کوں اس فراق میں کھینچا خمار دل
میرے سینے میں آکے چمن دیکھ عشق کا
ہے جوشِ خوں سوں تن میں مرے لالہ زار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کوں کیا تار تار دل

ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں
ہر دم میں بے قرار ہے مثلِ شرار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کوں دوستاں
اس میکدے سوں اٹھ کے چلا شدھ بسار دل لیکن
ہزار شکر ولی حق کے فیض سوں
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

سورت کی تعریف میں ولی کی مثنوی لاجواب ہے:

عجب شہراں میں ہے پُرنور یک شہر
بلا شک وہ ہے جگ میں مقصدِ دہر
اہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سوں کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور
اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب
ملاحت کی وہ گویا کھان ہے سب

اس کے بعد دریائے تاپتی اور اس کے کنارے ہندوؤں کے جپ تپ اور اشنان کا ذکر ہے۔ قلعہ اور باڑا گھاٹ کے بعد گل رخوں کا ذکر ہے جن کے رخسار کے پھول ہر طرف کھلے ہوئے ہیں:

کنارے اس کے اک دریائے تپتی
کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے تپتی
کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں عرق
ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق
کہ آب خضر کی ہے اس میں تاثیر
ہوا دیتی ہے اس کی یادِ کشمیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم
صبح اور شام جپ کرتا ہے عالم
عجب قلعہ ہے واں اک باقرینہ
کہ جیوں انگشتری اوپر نگینہ
نزک قلعہ کے باڑا گھاٹ ہے واں
کہ دائم گلرخاں کا ہاٹ ہے واں
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل
ہر اک گل کے نزک واں پر ہے سنبل

ولی نے گجرات کے شہر سورت کو ہندوستان کا مکہ کہا ہے اور شام و تبریز کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہندوستان کا یہ شہر شام و تبریز سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سورت میں مذہبوں کی کثرت کا اس زمانے میں بھی یہ عالم تھا:

شرافت میں یہ ہے جیوں بابِ مکہ
تو ہے سب ملک پر اُس کا جو سکہ
اگر دیکھے ہیں لوگاں شام و تبریز
نہ دیکھا کوئی ایسا ملک زرخیز
کہ اس بھیتر کتے ایسے ہیں تجار
کہ قاروں کوں نہیں ان کے نزک بار
وہاں ساکن اتے ہیں اہلِ مذہب
کہ گنتی میں نہ آویں اُن کے مشرب
اگرچہ سب ہیں وہ ابنائے آدم
ولے بینش میں رنگارنگ عالم

ولی کہتے ہیں کہ سورت میں ہر صورت انمول مورت ہے۔ اندر سبھا کی پریاں اور کرشن کی گوپیاں بھلے ہی مشہور ہوں، مگر بقول ولی وہ سب تو نقل ہے جبکہ سورت میں جو گوپیاں اور پریاں دکھائی دیتی ہیں وہ اصل ہیں:

بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت
ہر اک صورت ہے یاں اَن مول مورت
سبھا اندر کی ہے ہر اک قدم میں
چھپا اندر، سبھا کوں لے عدم میں
کشن کی گوپیاں کی نہیں ہے یہ نسل
رہیں سب گوپیاں وہ نقل، یہ اصل
نظر بھر کر دکھو ہر گل بدن کوں
کہ بے پردے سوں بے پرواہ ان کوں
اہے واں عاشقاں کوں عام آواز
کہ نہیں پردہ بغیر از پردۂ ناز
کسی کوں نہیں نظربازی بنا چین
کھلے ہیں رات دن سب غرفۂ نین

آخر میں نہان اشنان کے ثواب کا ذکر کرتے ہوئے مثنوی کے انجام کو تصوف اور روحانیت کی طرف موڑ دیا ہے:

ہر اک لب ہے سو جیوں یاقوت انمول
کرے وہ بات جب میٹھے لباں کھول

شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن
ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
ہر اک جانب دکھوں میں فوج در فوج
تجلی کے سمندر کی اُٹھے موج
نین کی بیٹھ کشتی پر تو اے پاک
یہ طے کر سبھی میں موج خطرناک

جس وقت ولی کے مزار کے انہدام کی خبر میں نے سنی عجیب اتفاق کہ میری کتاب ”اردو غزل اور ہندستانی ذہن وتہذیب“ پریس میں جارہی تھی، فقط آخری صفحہ خالی تھا۔اس پر میں نے ولی کی اس غزل کا اندراج کیا:

کوچۂ یار عین کاشی ہے
جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی اداسی سوں
دل پہ میرے سدا اداسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی
تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال
ہندوئے ہر دوار باسی ہے

آخر میں میں نے لکھا: ”وفات احمد آباد 1707 (ولی کا سنہ انتقال اور اورنگ زیب عالم گیر کا سنہ انتقال ایک ہے) سانحۂ انہدام مزار 2 مارچ 2002“۔اور اس کے بعد فارسی کا یہ مصرع لکھا اس المیہ پر اپنے دکھ کے اظہار کے لئے:

”تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو“

میں آپ حضرات کا بہت شکر گذار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سیمنار کی گونج ہر جگہ پہنچے گی۔

برنوال صاحب نے اپنے ہندی انتخاب میں مخدوم کی اس نظم کو بھی شامل کیا ہے جس میں مخدوم نے ولی کو 'پہلا ناخدا ہندوستانی کے سفینے کا' کہا ہے۔اگرچہ ہندوستانی زبان کے سفینے کا پہلا ناخدا میری نظر میں امیر خسرو ہے۔اس کے بعد کبیر ہے،ہاں اردو شاعری کا باوا آدم ولی دکنی ہے۔ یہاں ہندستانی زبانوں کے دوسرے ادیب بھی ہیں۔

میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کام میں ہمیں سب کا تعاون ملے گا۔

ولی دکنی پر ساہتیہ اکادمی کے سیمنار میں خطبۂ صدارت

OO

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

M/o HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

اہلِ وطن کو 60 واں یومِ آزادی مبارک

قومی اردو کونسل کی کارگزاریوں کی ایک جھلک

قومی اردو کونسل اپنے قیام کے بعد سے ہی اردو زبان و ادب اور تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہی ہے اور اس کے لیے مختلف پروگراموں اور اسکیموں پر عمل درآمد جاری ہے۔ ان کوششوں کے اثرات ملک بھر میں دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ رواں مالی سال میں کونسل کی جانب سے فروغ اردو کے لیے کی جانے والی سرگرمیوں کی ایک جھلک۔

پیشہ ورانہ کورس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ: بدلتے ہوئے سائنسی اور تکنیکی منظرنامے میں یہ ضروری ہے کہ اردو بھی عہد حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو میں ٹیکنالوجیکل اور پیشہ ورانہ علوم پر بھی کتابیں دستیاب ہوں۔ اسی مقصد کے تحت کونسل نے پیشہ ورانہ کورسز کی اٹھارہ کتابوں کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں حسب ذیل ہیں: الیکٹرانکس ٹیکنالوجی، گھریلو وائرنگ کا تعارف، گھریلو برقی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، بجلی سازی کا تعارف، اسکوٹر اور موٹر سائیکل (مرمت اور دیکھ بھال)، پاور ٹرانسفارمر کی دیکھ بھال اور مرمت، فوٹو گرافی، پود حفاظتی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، لکڑی کی دستکاری، رنگ، بنیادی کھاد تکنیک، گھریلو اشیا کی دیکھ ریکھ، دودھ اور دودھ سے بنی اشیا، دودھ کی پیداوار اور دیکھ بھال، عام باغبانی، بانس دستکاری، کھلونے اور شہد کی مکھیاں پالنا۔ ان کے علاوہ تقریباً 50 آئی ٹی آئی اور ڈپلوما ان انجینئرنگ کی کتابوں کے ترجمے کروائے جا رہے ہیں۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی: ایک سالہ "ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول (ڈی۔ ٹی۔ پی۔)" کورس 1999 سے ملک گیر سطح پر جاری ہے۔ جس کے 184 مراکز 22 صوبوں کے 107 ضلعوں میں ہیں۔ رواں سال کے تقریباً 13820 طالب علموں (5707 لڑکے اور 8123 لڑکیاں) کو سالانہ تربیت فراہم کر رہے ہیں۔ اب تک 22905 طالب علموں (12469 لڑکے اور 10436 لڑکیاں) کو ڈپلوما دیا جا چکا ہے جن میں سے تقریباً 60 فیصد سے زیادہ طلبہ برسر روزگار ہیں۔ اس کورس کا مقصد اردو داں طبقے کو نئے ٹیکنالوجیکل منظرنامے کا حصہ بنانا اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

اردو مراسلاتی کورس: قومی اردو کونسل نے ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو رسم خط سکھانے کے لیے یک سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج شروع کیا ہے۔ اس کورس کو ملک گیر سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ رواں مالی سال کے دوران کونسل نے اردو کے 150 اسٹڈی سینٹر 22 صوبوں کے 100 ضلعوں میں قائم کیے ہیں جن میں کنٹیکٹ کلاسز کی سہولت موجود ہے۔ اردو ڈپلوما کورس میں تقریباً 19 ہزار طلبہ (12327 لڑکوں اور 6673 لڑکیوں) نے داخلہ لیا ہے۔ جن میں 5410 ہندی میڈیم اور 13590 انگریزی میڈیم کے ہیں۔ اب تک 32564 طالب علموں (18872 لڑکے اور 13692 لڑکیاں) کو ڈپلوما دیا جا چکا ہے۔

اشاعتی سرگرمیاں: قومی اردو کونسل حکومت ہند کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جو صرف اردو کتابیں شائع کرتا ہے۔ کونسل کی اشاعتی سرگرمیوں کے تحت بچوں کے ادب اور اردو ذریعہ تعلیم کی نصابی کتابوں پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ اشاعتی منصوبوں میں اردو زبان کے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے علاوہ لغات، انسائیکلوپیڈیا، حوالہ جاتی کتابیں اور دنیا کی کلاسک اور ٹیکنالوجی اور انسانی علوم کی تمام شاخوں سے متعلق کتابیں منظر عام پر لائی جا رہی ہیں۔ مالی سال 06-2005 میں 44 نئی کتابیں شائع ہوئیں۔

کلاسیکی ادب کی اشاعت: قومی اردو کونسل اردو کی ان کلاسیکی کتابوں کی از سر نو اشاعت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب آہستہ آہستہ نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل نے 24 جلدوں میں کلیات پریم چند شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کلیات میر (جلد اول)، کلیات آغا حشر کاشمیری (سات جلدیں)، کلیات سراج، کلیات قلی قطب شاہ، دیوان فغاں، دیوان درد، دیوان حسرت، کلیات مصحفی، کلیات ذوق، کلیات جوش، کلیات اکبر الہ آبادی، کلیات فانی اور کلیات سردار جعفری (جلد اول) بھی کونسل شائع کر چکی ہے۔ کونسل ترقی اردو بیورو کی شائع کردہ کتب بھی شائع کر رہی ہے جو اب کمیاب ہیں۔

رسائل و جرائد: قومی اردو کونسل اردو خبروں اور نظریات و خیالات پر مشتمل ماہنامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی علمی مجلہ "فکر و تحقیق" گزشتہ سات سال سے مسلسل شائع کر رہی ہے۔ اردو خبروں، حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں معلومات، تجزیاتی اور معلوماتی مضامین کی وجہ سے "اردو دنیا" کی اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہو رہی ہے۔ "فکر و تحقیق" اپنے اعلیٰ تحقیقی مضامین کی بنا پر پسند کیا جاتا ہے۔

کل ہند اردو کتاب میلے اور کتابوں کی فروخت: قومی اردو کونسل نے اب تک سات کل ہند اردو کتاب میلے منعقد کیے ہیں جن میں ہندوستان بھر کے اردو ناشرین نے شرکت کی۔ رواں مالی سال کے دوران کلکتہ میں قومی اور گوہاٹی میں علاقائی اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ اپنی مطبوعات کو وسیع تر عوامی حلقوں تک پہنچانے کے لیے کونسل نے رواں مالی سال میں ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے سات قومی کتاب میلوں میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سمینار / ورکشاپ: قومی اردو کونسل نے پچھلے مالی سال میں سجاد ظہیر کے صد سالہ یوم ولادت کے موقع پر "ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی تعمیر: سجاد ظہیر اور دوسرے ترقی پسند ادیبوں کی خدمات" کے زیر عنوان غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں تین روزہ سمینار منعقد کیا جس میں متعدد شہروں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ منشی پریم چند کے 125ویں یوم ولادت کے موقع پر 31 جولائی تا 02 اگست 2005 لکھنؤ میں سہ روزہ جشن پریم چند منعقد کیا گیا۔ جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ محبان پریم چند نے شرکت کی اور ان کی سماجی و ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ نیز "فروغ اردو کے لیے نئی حکمت عملی" کے تحت سہ روزہ قومی اردو کانفرنس 19 تا 21 فروری 2006 ملت کالج، دربھنگہ میں منعقد کی گئی۔ اس کے علاوہ مختلف رضاکار تنظیموں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کو سمینار اور ورکشاپ وغیرہ کے انعقاد کے لیے 4,94,440 روپے جاری کیے گئے۔

کتابوں کی خریداری اور اردو کتب خانوں کی مدد: اس اسکیم کے تحت پچھلے مالی سال میں 167 (154 اردو مصنفین، 11 عربی/فارسی مصنفین) کی کتابیں اور 36 رسائل و جرائد خرید کر ہندوستان کے 400 کتب خانوں میں مفت تقسیم کی گئیں۔

اردو پریس پروموشن: جدوجہد آزادی، قومی یکجہتی، لسانی و مذہبی اکائیوں کی ذہنی تربیت اور تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ میں اردو صحافت کے نمایاں رول کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اردو صحافت کے فروغ کے لیے مناسب قدم اٹھائے ہیں۔ کونسل چھوٹے اور درمیانی درجے کے اردو اخبارات کو مالی اعانت فراہم کرتی ہے تاکہ وہ یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس سے مستفید ہو سکیں۔ اس اسکیم نے اردو اخبارات کے لیے خبروں اور دیگر مواد کی فراہمی کو آسان کر دیا ہے۔ فی الوقت 51 اردو اخبارات یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

رضاکار تنظیموں کے ساتھ تعاون: اردو زبان کی ترویج و ترقی میں رضاکار تنظیموں کا نمایاں رول رہا ہے۔ تنظیموں کے عوام سے براہ راست رابطے کی وجہ سے تنظیموں کے نقطہ نظر اور ان کے دائرہ اثر میں وسعت آئی ہے۔ کتابوں کی طباعت نیز اردو کے فروغ کی دیگر سرگرمیوں مثلاً سیمینار، ورکشاپ اور تکمیل مدتی پروجیکٹ کے لیے بھی کونسل رضاکار تنظیموں کو مالی مدد فراہم کرتی ہے۔

عربی اور فارسی زبانوں کی ترویج و ترقی: ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں عربی اور فارسی کے تاریخی رول کو صحیح تناظر میں دیکھتے ہوئے کونسل ان زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ کونسل مختلف مکاتب و مدارس کو جز وقتی اساتذہ کی تنخواہ اور علمی و ادبی کاموں کے لیے لاکھوں روپے کی مالی اعانت فراہم کرتی ہے۔ کونسل کی طرف سے فنکشنل عربی کا دو سالہ ڈپلوما کورس بھی اپریل 2002 میں شروع کیا گیا۔ سیشن 06-2004 اور 07-2005 میں بالترتیب 6370 اور 7833 طالب علموں نے داخلہ لیا۔ اس طرح 14,203 طلبہ یہ کورس کر رہے ہیں۔ اس کورس کے طلبہ کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ کونسل نے طالب علموں کی سہولت کے پیش نظر ملک کے طول و عرض میں 189 عربی اسٹڈی سینٹرز قائم کیے ہیں۔ ان اسٹڈی سینٹروں میں کنٹیکٹ کلاسز کی سہولت موجود ہے۔

●●●

بابِ تنقید و تحقیق

پروفیسر محمد حسن

کے نام

اردو ادب میں جن شخصیتوں نے تنقید و تحقیق کے عمل کو سائنسی استدلال، سماجی شعور اور فلسفیانہ طرزِ فکر کی نئی راہیں دکھائیں ان میں پروفیسر محمد حسن کا نام ہمیشہ جلی حروف میں تحریر کیا جائے گا۔ خاص طور سے ان تخلیقی نقادوں میں آپکا ذکر ہمیشہ ہو گا جنہوں نے جیتے جی کئی نسلوں کے ادیبوں پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے!

تہذیب و ادب

فکشن کا عقبی دیار

ڈاکٹر وزیر آغا

جس طرح مذہبُ الارواح کا دور قبائلی زندگی کے اُس دور کا عکس تھا جس میں انسان نے رہن سہن کے اشتراکی عمل کے اندر شخصی جائیداد کے تصور کو تقویت عطا کر دی تھی اور یوں ایک منضبط اور متحدہ معاشرے کے اندر بکھراؤ کی صورت پیدا ہو گئی تھی، بالکل اُسی طرح اساطیر کا دور زرعی معاشرے کے اُس دور کا عکس تھا جس میں سماجی سطح کے اشتراکِ باہم کی فضا اُبھر آئی تھی۔ زراعت محض ایک آدمی کا کام نہیں۔ اِس میں اشتراکِ باہم کے بغیر، کارکردگی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں زراعت کا نظام کارخانے کی سی باقاعدگی کا بھی حامل نہیں، یہ موسم کے مدّ و جزر کے تابع ہے۔ مثلاً فصل بونے یا کاٹنے کے ایام میں پورا معاشرہ مل جل کر کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انسان کی تاریخ تہذیب میں زرعی معاشروں کی ابتدا کا یہی دور، بادشاہت کے ادارے کی ابتدا اور فروغ کا دور بھی تھا۔ اب گویا چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے سرغنوں کی بکھری ہوئی قوت مجتمع ہو کر ایک ہی شخص (بادشاہ) میں مرتکز ہونے لگی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا معاشرہ مجتمع ہو رہا تھا۔ پھر جس طرح فرد اپنی شخصی حیثیت میں خواب دیکھتا ہے، بالکل اُسی طرح پورا معاشرہ بھی خواب دیکھتا ہے اور یہ خواب اسطوری نظام کی صورت میں آئیڈیل ریاست (یوٹوپیا) کی شکل میں یا جنتِ گم شدہ کے پیکر میں، اُس کے درِ دل پر ہمیشہ دستک دیتا رہتا ہے۔ زرعی معاشروں کے ابتدائی ایام میں یہ خواب، اسطوری کہانیوں کے ایک پورے سلسلے کی صورت میں اُبھرا اور اِس میں موجود معاشرے کے متوازی اور اس سے ملتا جلتا ایک ویسا ہی نظام اُبھر آیا جس میں دیوتا، انسانوں کی طرح، ایک خاندان سا بنا کر رہتے تھے یا ایک وزارتی کونسل کی صورت میں پوری کائنات پر حکمران تھے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ جس طرح سماجی زندگی میں انسان نے خود کو مجتمع کیا، خواب کی دُنیا میں بھی خود کو مجتمع کر لیا (اور خواب حقیقی زندگی کی قاشوں ہی سے تو مرتب ہوتے ہیں)۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خواب کی صورتیں، حقیقت کی دُنیا اور اُس کے مسائل اور واقعات میں بھی شرکت کرتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ یہ گویا 'موجود' اور 'ماورا' زمین اور آسمان کے ملاپ کی وہ صورت تھی جس کے نتیجے میں ساری کائنات مرتب ہو کر ایک 'کل' کے رُوپ میں دکھائی دینے لگی۔

اسطوری کہانیوں کی دُنیا میں انسانی معاشرہ جو زرعی نظام پر اُستوار تھا، ایک لطیف سی دُھند میں لپٹا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ مثلاً جب انسان نے خانہ بدوشی کی زندگی کو ترک کیا تو گویا خود کو سماجی سطح کے بکھراؤ کی مستقل حالت سے نجات دلائی۔ پھر جب اِس نے جنگلوں کو صاف اور ہموار کر کے، زراعت کے قابل بنایا تو اِس کا مطلب یہ تھا کہ اِس نے معاشی بے ترتیبی میں ایک ترتیب پیدا کر لی۔ اِسی طرح جب اِس نے بکھرے ہوئے قبائل کی قوتوں کو ایک ہی ادارے (بادشاہت) میں مرتکز کیا تو سیاسی زندگی کے بکھراؤ اور بے ترتیبی میں نظم و ضبط پیدا کر لیا۔ لازم تھا کہ معاشرتی سطح کی اِس کارکردگی اور حسنِ تنظیم کا عکس، ایسی اساطیر میں ظاہر ہوتا جو انتشار Chaos میں سے تنظیم کے جنم لینے کی تمثیل کو بیان کرتیں۔ اِس سلسلے کی اساطیر مصر، بابل، نینوا، یونان، ہندوستان اور بہت سے دوسرے ممالک میں بڑے التزام کے ساتھ اُبھری ہیں۔ مثلاً مصر ہی کو لیجیے: ہر چند مصر کی دیومالا میں تخلیقِ کائنات کے واقعے کو متعدد کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے، تاہم ان سب میں بنیادی بات یہی ہے کہ خود رع، جس کے ہاتھوں کائنات کی تخلیق ہوئی، پانیوں (یعنی انتشار) میں سے نمودار ہوا اور پھر اُس نے انتشار کو تنظیم میں تبدیل کر دیا۔ یہ قدیم انتشار، چار سانپوں اور چار مینڈکوں پر مشتمل تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ قدیم جنگلی زندگی کے بطون سے زراعت کا ایک مرتب اور منظم پیکر اُبھرا جس نے گویا انتشار یعنی سانپوں اور مینڈکوں کی بالادستی کو ختم کر دیا۔ ایک اور کہانی میں رع کے بارے میں یہ نظریہ پیش ہوا ہے کہ اُس نے خود ہی اپنے آپ کو ثمر دار کیا اور اِس عمل سے زمین اور آسمان کے جملہ دیوتاؤں کو جنم دے ڈالا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جس طرح مصر کے پہلے بادشاہ کا نام مینیز

Menes اور ہندو دیو مالا کے پہلے انسان کا نام منو ہے (مینیز اور منو کے ناموں کی صوتی مماثلت قابلِ غور ہے)، اور جس طرح مصر کے آتم رع اور ہندوستان کے لفظ آتما کی مماثلت واضح ہے، بالکل اسی طرح آتم رع کا خود کو ثمر دار کرنا، ہندو دیو مالا کی اُس کہانی کے مطابق ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ پرجاپتی ایک کائناتی انڈا ہے جسے وہ خود ہی سیتا، خود ہی زرخیز کرتا اور پھر خود ہی ایک عالمِ رنگ و بو کا روپ دھار کر اس میں سے برآمد ہو جاتا ہے۔ ان تمام مماثلتوں سے یہ قیاس کرنا غلط نہیں کہ قبل از تاریخ کے کسی دور میں مصر اور ہندوستان کے درمیان ثقافتی لین دین کی کوئی صورت ضرور موجود ہوگی۔

مصر میں تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں ایک دل چسپ نظریہ یہ بھی ملتا ہے کہ انتشار (یعنی وہ بحرِ بے کنار جس کا نام Ptah تھا) کے ہونٹوں پر لفظ تحرک اُٹھا اور کائنات وجود میں آ گئی۔ گویا خود انتشار نے لفظ کے ذریعے اپنے آپ کو تنظیم اور ترتیب میں تبدیل کر لیا۔ ایس ایچ ہک لکھتا ہے، مصری دیو مالا میں یہ کہانی ملتی ہے کہ جب Ptah نے سب کچھ بنا لیا تو اُس نے آرام کیا..... یہ بات عہد نامۂ قدیم ہی کی طرف ذہن کو منتقل کرتی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ اضافہ کرنا ہے کہ 'لفظ' کے ذریعے کائنات کو وجود میں لانے کا تصور انجیل مقدس میں بھی ملتا ہے۔ بہر حال مصری اساطیر میں تخلیقِ کائنات کا واقعہ انتشار سے تنظیم کو وجود میں لانے ہی کا واقعہ ہے۔ اس میں انسان کی تخلیق کو کوئی خاص اہمیت نہیں ملی، بس ایک یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ انسان، کوزہ گر کے چاک پر گھڑا گیا۔ تاہم ان اساطیر میں دیوتا اور انسان کے باہمی فرق پر زور نہیں دیا گیا۔ حتیٰ کہ مصری معاشرے میں خود بادشاہ ہی دیوتا متصور ہوتا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مصری دیو مالا نیز مصری معاشرے میں اصل اہمیت دیوتا ہی کو حاصل تھی، انسان تو محض ایک ثانوی چیز تھا۔ پھر چوں کہ بادشاہ خود دیوتا تھا اور اُس کا فرمان ہی سب کچھ تھا، اس لیے مصری دیو مالا میں کائنات کی تخلیق بھی لفظ (فرمان) ہی کے ذریعے ہوئی۔

انتشار اور بے ہیئتی سے تنظیم و ترتیب کا جنم مصری دیو مالا کے علاوہ سمیریا، یونان اور ہندوستان کی دیو مالاؤں کا بھی خاص موضوع ہے۔ مصر میں تو صورت یہ تھی کہ جب دریائے نیل کا سیلاب اپنے ارد گرد کے علاقے کے واضح نشانات کو مٹا دیتا تو گویا مکمل انتشار اور بے ہیئتی کا عالم قائم ہو جاتا۔ پھر جب سیلاب کا پانی اُتر جاتا تو تنظیم کی وہ صورت دوبارہ وجود میں آ جاتی، جس میں بادشاہ کا فرمان سب سے بڑا کردار ادا کرتا۔ وجہ یہ کہ سیلاب، زمین کی حد بندیوں کو توڑ دیتا اور ضرورت پڑتی کہ پانی کے اُتر جانے کے بعد زمین کو دوبارہ قطعوں میں تقسیم کیا جائے اور نئی حد بندیاں قائم کی جائیں تا کہ معاشرہ از سر نو مرتب ہو سکے۔ یہ کام شاہی حکم ہی سے بطریقِ احسن انجام پا سکتا تھا۔ چنانچہ مصر میں 'لفظ' یا 'فرمان' کو بہت زیادہ اہمیت ملی۔ دوسری طرف سمیریا، بارانی طوفانوں کی زد پر تھا اور اس کے دریا، اس قدر تند اور اس حد تک ناقابلِ اعتبار تھے کہ جب سیلاب آتا تو محسوس ہوتا کہ ساری کائنات انتشار کی زد پر آ گئی ہے جسے خود بادشاہ بھی دوبارہ مرتب اور منظم نہیں کر سکتا۔ یعنی سمیریا میں زمینی اور آسمانی آفات، اتنی زبردست تھیں کہ بادشاہ سے بھی بڑی ہستیوں کی مدد ہمہ وقت درکار ہوتی تھی۔ خود بادشاہ بھی دیوتاؤں کا خادم تھا یا پھر اُسے دیوتاؤں کے ایسے کارندے کی حیثیت حاصل تھی جس کے ذریعے آسمانی دیوتا، اپنی خواہشوں کا اظہار یا اُن کی تکمیل چاہتے تھے۔ ویسے بھی سمیریا کی تہذیب کے ابتدائی ایام میں کوئی ایسی مملکت وجود میں نہیں آئی تھی جس میں صرف ایک ہی شخص حکمران ہوتا؛ وہاں ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے جنم لیا تھا جو ضرورت کے وقت ایک دوسرے کا ساتھ دیتی تھیں۔ سمیریا کے معاشرے کے اندر بھی اشتراکِ باہم کی یہ روایت موجود تھی۔ بعد ازاں جب بادشاہت کا ادارہ وجود میں آ گیا تب بھی بادشاہ مطلق العنان نہیں تھا؛ اُسے ایک حد تک معاشرتی حقوق کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً ہربرٹ جے مُلر نے لکھا ہے کہ تقریباً 2400 ق م میں سمیریا کے ایک بادشاہ یورو کا جن Urukagina نے یہ فرمان جاری کیا کہ اہلِ سمیریا کو چوں کہ اپنی سابقہ آزادیوں کے چھن جانے کا احساس ہے، اس لیے اب اُن کے حقوق بحال کیے جا رہے ہیں۔ اور حقوق کی بحالی کی صورت یہ تھی کہ عوام کو کاہنوں، لگان وصول کرنے والوں اور پادریوں سے بچایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سمیریا کی تہذیب میں انسانی حقوق کا مسئلہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود تھا جب کہ مصر کے معاشرے میں فرد کا وجود عنقا اور اُس کے حقوق کا مسئلہ قطعاً غائب تھا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ سمیریا کے موسمی تغیرات اتنے شدید تھے کہ انسان کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ چوں کہ یہ سب کچھ دیوتاؤں کو پوجنے کے باوصف ہو جاتا تھا، اس لیے قدرتی طور پر اہلِ سمیریا کو اپنے دیوتاؤں پر پورا اعتبار نہیں تھا۔ وجہ یہ کہ وہی دیوتا جو ایک روز اُن پر دھوپ اور کھلیان اور بیٹے اور شہد نچھاور کرتے، دوسرے ہی روز آبی طوفان، زلزلوں اور ژالوں سے اُن کا سب کچھ تباہ کر دیتے۔ ایسی غیر محفوظ فضا میں خود سمیریا والوں کے اخلاقی ضوابط میں دراڑیں ضرور پڑی ہوں گی۔ اور وہ جن کے سپرد اُن کے جان و مال کی حفاظت کا فریضہ تھا، وقت آنے پر یقیناً نا اہل، خود غرض یا بے پروا ثابت ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ یہ قدرتی بات تھی کہ سمیریا والوں نے اپنے معاشرتی نظام کے سارے مد و جزر کے متوازی ایک ایسا کائناتی نظام تخلیق کر لیا جس

میں تحفظات عقائد تھے، اخلاقیات کی عمارت کم زور تھی، نیز دیوتاؤں کی قوت بھی لامحدود نہیں تھی اور وہ خود بھی جذباتی، غیر محفوظ اور نا قابل اعتبار تھے۔ ایسی صورتِ حال میں سُمیریا والوں کی دیو مالا میں کائنات کی تخلیق کسی فرمان کا نتیجہ کیسے ہو سکتی تھی جیسا کہ مصر میں ہوا، جہاں کا فرعون بیک وقت بادشاہ بھی تھا اور دیوتا بھی۔ سُمیریا میں تخلیق کائنات کسی بڑے دیوتا کا کارنامہ نہیں تھا، کائنات اِنتشار اور بے ہیئتی کے عالم میں آسمانی تشدّد کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سُمیریا کی دیو مالا میں تخلیق کائنات، ناموNammu دیوی کی کوکھ سے ہوئی اور ناموسے مراد سمندر تھا۔ بعض دوسری کہانیوں کے مطابق، ابتدا ایک پہاڑ تھا جس کی بنیاد، زمین اور چوٹی، آسمان تھا، اور ان دونوں کے اِتصال سے ان لِل Enlil نے جنم لیا جو ہوا کا دیوتا تھا۔ پھر یہ دیوتا، زمین اور آسمان کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ تاہم سُمیریا کی دیو مالا میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ خود نامو، یعنی سمندر کا جنم کیسے ہوا!

ایس ایچ ہک لکھتا ہے کہ جب ان لِل نے زمین اور آسمان میں حدِ فاصل قائم کر دی اور آسمان کو ننماNinmah (یعنی چاند) وغیرہ کی مدد سے روشن کر دیا تو اُس نے زمین کی تزئین و آرائش کا آغاز کیا۔ چنانچہ نباتات و حیوانات، زرعی اَوزار اور دیگر تہذیبی عوامل ان لِل ہی کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئے۔ اسطور کے مطابق ان لِل نے حیوانوں کے دیوتا لاہار اور اناج کی دیوی اشنان کو تخلیق کیا اور اُن دونوں نے دیوتاؤں کے لیے غذا اور لباس کے ڈھیر لگا دیے۔ اور دیوتاؤں کا حال دیکھیے کہ جب انھیں ہر شے کی فراوانی نظر آئی تو انھوں نے ڈٹ کر شراب پی اور آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ آخر میں انسان کو تخلیق کیا گیا جس کی تخلیق کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک غلام کی طرح دیوتاؤں کی خدمت بجا لائے، اُن کے لیے زمینیں کاشت کرے تا کہ وہ خود فراغت سے زندگی بسر کریں (دیکھیے، استحصال کی روایت کا آغاز کیسے ہوا)۔ اسطور کہتی ہے کہ نامو اور ننما نے دوسرے دیوتاؤں کی مدد سے چکنی مٹی کو گوندھ کر اُس سے انسان کا پتلا بنایا اور پھر ننما نے کھیل ہی کھیل میں چکنی مٹی سے مختلف اقسام کے چھ انسان بنائے جن میں ایک بانجھ عورت اور ایک ہیجڑا بھی تھا۔ غور کیجیے کہ تخلیق کائنات کی اس کہانی میں، اِنتشار کے تنظیم میں تبدیل ہونے کا عمل، محض بے جان اَشیا تک ہی محدود نہیں، اِس میں دیوتا، انسان، چرند پرند اور پودے سبھی شامل ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے درمیان میل ملاپ کی صورت بھی پیدا ہوئی ہے۔ ان لِل، دیوتاؤں کو تخلیق کرنے کے بعد، کوئی نہ کوئی شعبہ ہر دیوتا کے سپرد کر دیتا ہے، مثلاً ہوا، اناج، نباتات وغیرہ؛ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ، اپنے مختلف صوبوں کے لیے گورنر مقرر کر دے، اس کے بعد اُن میں سے بیشتر شعبے، انسان کے سپرد کر دیے جاتے ہیں اور ایک ایسی منظم اور مرتب کائنات کا تصور اُبھر آتا ہے جس میں نامو (یعنی وہ سمندر جس سے کائنات کی ابتدا ہوئی) سے لے کر انسان تک ایک ہی معاشرتی نظام اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یوں دیکھیے تو اسطور سازی کے رجحان نے زندگی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا (جیسا کہ مذہبُ الارواح یعنی Animism کے زمانے میں کثرت پرستی کی روش کے تحت ہوا تھا)۔ اِس رجحان نے دیوتا سے انسان تک ساری ذی رُوح مخلوق کو ایک ہی وسیع اور عالمی برادری کی صورت عطا کر دی، اِس قدر کہ دیوتا، انسانوں کے مقدر میں دل چسپی لینے لگے اور اِنسان، دیوتاؤں کے اعمال کا محاسبہ کرنے لگے۔ آخر آخر میں تو ان دونوں طبقوں میں اِزدواجی رشتے تک قائم ہونے لگے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسطور سازی، بنیادی طور پر، ایک وہبی عمل تھا جو کائنات کو مجتمع کر رہا تھا نہ کہ منتشر!

تخلیق کائنات کے بارے میں سُمیریا کی اسطوری کہانی نسبتاً قدیم ہے جس نے بابل کی اسی وضع کی اسطور پر گہرے اَثرات مرتب کیے۔ تاہم بابل کی اسطور کے کچھ اپنے منفرد اَوصاف بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ سُمیریا کی اسطور میں تخلیق کائنات کا واقعہ کسی ایک ہستی کا فعل نہیں، اِس میں ایک طرف نامو اور دوسری طرف ان لِل اور ان کی Enki برابر کے حصے دار ہیں۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ سُمیریا کی یہ اسطور جس زمانے میں خلق ہوئی، وہ قبائلی نظام کے تابع تھا جس میں قوت مختلف سرغنوں میں بٹی ہوئی تھی اور وہ مل جل کر کام کرتے تھے۔ مگر بابل کے زمانے تک آتے آتے، بادشاہت کا دائرہ زیادہ مضبوط ہو گیا تھا، اس لیے اَب تخلیق کائنات کے سلسلے میں ایک خاص دیوتا، مارڈک کا کردار صاف دکھائی دیتا ہے جو تیامت Tiamat کو شکست دیتا اور مقدر کی تختیاں جمع کر کے متعدد تخلیقی اَفعال کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سُمیریا کی دیو مالا میں تخلیق کائنات کا واقعہ کسی مربوط صورت میں نہیں ملتا، یہ قاشوں اور ٹکڑوں کی صورت میں، کہیں کہیں بے ربط اور بے نظم بھی دکھائی دیتا ہے جب کہ بابل کی اسطور کی ساری کڑیاں سلامت ہیں۔ اِس اسطور کے مطابق ابتدا دو سمندر تھے: میٹھے پانی کا سمندر جس کا نام اپسو Apsu اور کھاری پانی کا سمندر جس کا نام تیامت تھا۔ اِن دونوں کے اِتصال سے دیوتاؤں نے جنم لیا۔ پہلا جوڑا لاہمو اور لاہامو تھا جس سے انشار Anshar اور کشار Kishar یعنی آسمانی اُفق اور زمینی اُفق پیدا ہوئے۔ پھر ان دونوں نے آنو Anu یعنی آسمان کے دیوتا اور ای آ Ea یعنی زمین کی دیوی کو جنم دیا۔ ای آ کے ہاں مارڈک پیدا ہوا جو بابل کی دیو مالا کا ہیرو ہے۔ مارڈک نے تیامت کو قتل کیا اور اُس کے جسم کو دو حصوں میں کاٹ کر،

ایک سے آسمان بنایا اور پھر ایسا انتظام کیا کہ اُس کا پانی نیچے گرنے نہ پائے۔ اس کے بعد مارڈک نے پوری کائنات کی تنظیم کی۔ سال کو مہینوں میں تقسیم کیا۔ پھر اُس نے دیوتاؤں کی خدمت کے لیے انسانوں کو اپنے حریف کنگو کے خون سے بنایا اور یوں اِنتشار سے تنظیم نے جنم لیا۔

یونانی دیو مالا میں تخلیقِ کائنات کا واقعہ کچھ اَور بھی منضبط انداز میں ملتا ہے۔ کہانی کے مطابق ابتدا اُخلا تھا جس میں ہر شے کے بیج بے نام اور بے صورت انداز میں گردش کر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ صورتیں بننے لگیں، بوجھل اَجزا، زمین بن گئے اور ہلکے اَجزا، اُوپر اُٹھ کر آسمان میں متشکل ہو گئے۔ آسمان پر سُورج، چاند اَور ستارے چمکنے لگے۔ صفحۂ خاک پر اَرض، سمندر سے الگ ہوئی اور دریا بہنے لگے۔ پھر خلا سے کچھ عجیب و غریب ہستیوں نے جنم لیا۔ سب سے پہلے Eros یعنی محبت پیدا ہوئی۔ واضح رہے کہ یونانی دیو مالا کے مطابق اِنتشار کی وہ صورت، جس میں اَشیا لخت لخت حالت میں تھیں اور عناصر ایک دوسرے سے کٹے ہوئے تھے، سب سے پہلے محبت کی خوش بو سے متاثر ہوئی اور چوں کہ محبت کا اہم ترین وصف مجتمع کرنا ہے، اس لیے محبت کے وسیلے ہی سے کائنات ایک منضبط اکائی میں ڈھل گئی۔ اس کے بعد خلا ہی سے کالی رات اور روشن دن نے جنم لیا۔ آخر آخر میں یورانوس Uranos یعنی باپ، پوسٹاس Postas یعنی سمندر اور دھرتی ماتا، یہ سب پیدا ہوئے۔ زمین اور آسمان کے اتصال سے پہلی کھیپ Titans کی پیدا ہوئی جو دیو صفت تھے: ان ہی میں وہ سائیکلوپ شامل تھے جن کے ماتھے پر فقط ایک آنکھ اُبھری ہوئی تھی۔ یورانوس کو بچوں سے نفرت تھی، اُس نے اُنھیں خفیہ مقامات پر چھپانا شروع کیا تو دھرتی ماتا نے بچوں کو باپ کے خلاف کر دیا۔ جنگ ہوئی، جس میں یورانوس زخمی ہوا۔ اُس کے بدن سے لہو کے جو قطرے سمندر پر گرے، اُن سے افرودائتی پیدا ہوئی جو حسن اور محبت کی دیوی ہے۔ لہو کی دیگر بوندوں سے دیو اور Furies پیدا ہوئیں۔ گویا یورانوس کے لہو سے خیر اور شر، دونوں نے جنم لیا۔

اس کے بعد کرونوس Cronos آسمان کا بادشاہ بنا۔ اُس کے خاندان میں سب سے اہم شخص پرومیتھیس تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ آسمان سے اتر کر زمین پر آیا۔ یہاں اُس نے چکنی مٹی سے اَشیا بنانے کا شغل اختیار کیا۔ غور کیجیے کہ آسمان اور زمین کو آپس میں مربوط کرنے اور آسمانی کرداروں کو زمینی کرداروں سے ہم آہنگ کرنے میں پرومیتھیس ہی نے سب سے اہم کردار ادا کیا اور وہ کائنات کے اِنتشار کو ترتیب اور تنظیم میں بدلتا چلا گیا۔ زمین پر پہلے اُس نے حشرات الارض کو خلق کیا، پھر حیوانات کو اور آخر میں انسان کو بنایا۔ پھر اُس نے فلک کی بات زمین کے محرم کو بتا دی یعنی اُسے آگ اور تہذیب اور فنون سے آشنا کیا اور وہ اُس کا سب سے بڑا محسن قرار پایا۔

اُدھر کرونوس کو یہ فکر دامن گیر ہوئی، کہیں اُس کے بچے اُس کے خلاف علمِ بغاوت بلند نہ کر دیں۔ سو جیسے ہی اُس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا، وہ اُسے نگل جاتا۔ جب زیوس Zeus پیدا ہوا تو کرونوس کی بیوی نے اُسے بچانے کی ٹھانی اور بچے کے بجائے کپڑے میں ایک پتھر لپیٹ کر کرونوس کو دے دیا جسے وہ نگل گیا۔ جب زیوس بڑا ہوا تو ماں بیٹے نے مل کر کرونوس کو کوئی ایسی دوا پلا دی جس سے سارے بچے، جو اَب بڑے ہو گئے تھے، اُس کے اندر سے باہر آ گئے: انھیں میں ڈیمیٹر Demeter، ہیرا Heral، ہیڈز Hades اور پوسیڈون Poseidon شامل تھے۔ ان سب نے کرونوس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ پرومیتھیس نے پہلے تو کرونوس کا ساتھ دیا مگر پھر وہ اُس کی حماقتوں سے برگشتہ ہو کر زیوس سے آملا اور اُسے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنے لگا۔ اس جنگ میں پرومیتھیس ویسا ہی کردار ادا کرتا ہے جیسا کرشن مہاراج نے کورو پانڈو کی جنگ میں ادا کیا تھا مگر فرق یہ تھا کہ پرومیتھیس کے مشوروں میں تفکر کا وہ عنصر نہیں تھا جس سے کرشن دیوتا کے اُپدیش عبارت تھے۔ پرومیتھیس کی مدد سے زیوس کامیاب تو ہوا مگر اس کے بعد زیوس اور اُس کے بھائیوں میں جنگ چھڑ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا جسے پرومیتھیس نے اپنی دانش اور حکمت سے دُور کر دیا۔ چنانچہ بھائیوں نے کائنات کو آپس میں تقسیم کر لیا: زیوس آسمان کا بادشاہ بنا، پوسیڈون کو سمندر عطا ہوا اور ہیڈز نے کالے گہراؤ پر قبضہ جما لیا جب کہ زمین ان تینوں کی مشترکہ ملکیت متصور ہوئی۔

اس دیو مالا میں معاشرے کا پورا عکس دکھائی دیتا ہے۔ نفرت اور محبت کے وہ سارے رشتے جن سے یونانی معاشرہ عبارت تھا، یونانی دیو مالا میں اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر جس طرح یونان نے قبائلی طوائف الملوکی سے اُوپر اُٹھ کر ریاستی خود مختاری کی سطح تک رسائی حاصل کی، اور پھر وہاں کے معاشرے میں اشتراکِ باہم کی مضبوط روایت وجود میں آ گئی، بالکل اسی طرح یونانی دیو مالا میں منتشر اَجزا، جنگ و جدال سے گزر کر، بالآخر اشتراک اور بھائی چارے کی فضا پر منتج ہوئے اور کائنات میں نہ صرف اَرض و سما کا ایک مضبوط رشتہ اُبھر آیا بلکہ دیوتا اور انسان بھی ایک دوسرے کے قریب آ کر ایک ہی برادری میں تبدیل ہو گئے۔ مصری دیو مالا میں دیوتا اور انسان، ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں، بعینہٖ جیسے مصری معاشرے میں بادشاہ عوام سے فاصلے پر ہے۔ سمیریا اور بابل کی دیو مالاؤں میں اُن کا رشتہ، آقا اور خادم کا ہے۔ مگر یونانی دیو مالا میں پہلی بار انسان اور دیوتا کی برابری کا تصور اُبھرتا ہے۔ مثلاً پنڈار Pindar کی چھٹی نظم میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ انسان اور دیوتا ایک ہی نسل سے ہیں، اور ہو

مرتک آتے آتے تو صورت یہ ہوئی کہ دیوتا، عناصر فطرت کے اَوصاف سے لیس نہ رہے، وہ انسانی اَوصاف کے حامل بن گئے۔ پھر چوں کہ ہومر نے اُنھیں یونانی انسان کے اَوصاف ودیعت کیے، اِس لیے اُن کے ہاں جذباتیت کے ساتھ ساتھ دریا دلی اَور متوازن اندازِ نظر بھی دِکھائی دیتا ہے۔ ساری کائنات کو اُس کی جملہ سطحوں پر مربوط اَور منظم کرنے کا یہ دیومالائی اِقدام، انسان کی اُس ذہنی سوچ ہی کا نتیجہ تھا جو مشاہدات کے غدر میں یک جہتی اَور اتحاد کی فضا قائم کرنے میں ایک اہم کردار اَدا کر رہی تھی۔

ہندو دیومالا کے مطابق ابتدا گہرا تاریک خلا تھا جس میں پانی کے سوا اَور کوئی شے نہیں تھی: اُس پانی پر سنہری بیضہ تیر رہا تھا۔ ایک اُس بیضے میں داخل ہوا اور برہم کی صورت میں باہر آ گیا۔ برہم سے مراد رُوحِ کائنات تھی۔ برہم ہر جگہ موجود تھا، اُس کی کوئی ایک صورت یا عنصر نہیں تھا، وہ حاضر بھی تھا اَور غائب بھی اَور لافانی بھی، اَور اُس نے ساری کائنات کو خلق کیا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے پرجاپتی کو پیدا کیا جس نے مادّے کی کائنات اَور اُس میں سُر اَور اَسُر، مرد و زن، حیوانات و نباتات، سب کو جنم دیا۔ بعد ازاں برہم کے اَوصاف کی تخصیص ہوئی اَور ترِمورتی کا تصور اُبھر آیا جس کے تین چہرے تھے: درمیانی چہرہ برہم کا تھا جس کے دائیں اور بائیں وشنو اَور شیو تھے۔ وشنو کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ اپنی جگہ قائم رہے، زمین کو انسان کے رہن سہن کے قابل بنائے اَور تمام اَشیا کو اپنی نظر کی زد پر رکھے۔ حقیقتاً وشنو، سورج کی آنکھ کا دوسرا نام تھا..... جس طرح سورج کی شعاعیں دُنیا کو منور کرتی ہیں اور اُس کے دیدۂ بےخواب کی رسائی دُور دُور تک ہے، بالکل اُسی طرح وشنو کی نظروں سے کوئی شے چھپی ہوئی نہیں۔ اُس کے ہاں برہم کی سی ماورائیت یا بےصورتی نہیں، وہ زمین اَور زمین کے معاملات کو سنوارنے اَور تہذیب کو پھیلانے پر مامور دِکھائی دیتا ہے اَور یوں آدمی کے تصور کی گرفت میں بآسانی آ سکتا ہے۔ برہم کا دوسرا چہرہ شیو کا ہے۔ شیو میں جنگل کی ساری خوں خواری اَور تخلیقی رعنائی موجود تھی ..... جنگل جس نے قدیم ہندوستان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پھر جس طرح جنگل اَور اُس کا معاشرہ، سال بھر میں موت اَور زندگی کے دائرے سے گزرتا تھا، بالکل اُسی طرح شیو بھی پہلے توڑتا، پھر جوڑتا تھا؛ پہلے ہر شے کو تباہ و برباد کرتا، پھر راکھ میں سے نئی زندگی کو جنم دیتا۔ یہ گویا عام زندگی کے مشاہدے ہی کا عکس تھا کہ خزاں اَور سردی میں بیش تر درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں اور گھاس جل جاتی ہے، مگر موسمِ بہار کے آتے ہی شاخیں اور پتے پھر نمودار ہو جاتے ہیں۔ غالباً اسی تخلیقی عمل کے باعث شیو کے نام کے ساتھ فنونِ لطیفہ، علم و فضل اَور درویشی ایسے مسالک وابستہ ہیں جو انسان کی مادّی اور میکانکی زندگی کے بجائے اس کی رُوحانی اور تخلیقی زندگی کے اَثمار ہیں۔

شیو کے اَوصاف میں تخریب اَور تعمیر، دونوں شامل ہیں۔ تخریب کی قوت کالی دیوی میں اَور تعمیر کی قوت اناپورنا اَور دوسری دیویوں میں متشکل ہو کر سامنے آتی ہے۔ دوسری طرف وشنو کا صرف ایک ہی وصف ہے اَور ہر زمانے میں اُس نے اسی وصف کا مظاہرہ کیا ہے: وہ ہر دور میں اپنا کوئی نہ کوئی اَوتار بھیجتا ہے جو تہذیب کو ایک بلند سطح پر لے آتا ہے: کرشن، اُس کا ایک ایسا ہی اَوتار ہے۔ وشنو کی بیوی کا نام لکشمی ہے جو خوش بختی اَور حسن کی دیوی ہے اَور جس نے سمندری جھاگ سے جنم لیا تھا۔ ہندو دیومالا میں ایک بھرے پرے خاندان کی مکمل تصویر دِکھائی دیتی ہے: جس طرح ہندو سماج، مشترکہ خاندان کی روایت پر اُستوار تھا، بالکل اُسی طرح ہندو دیومالا میں خاندانوں کے سلسلے ملتے ہیں، حتیٰ کہ برہم بھی، جو نام رُوپ سے بےنیاز ہے، اپنی بیوی سرسوتی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ہندو دیومالا میں انسانی شکل کے دیوتاؤں کے علاوہ، جانور کے رُوپ میں پیدا ہونے والے دیوتاؤں کی بھی کمی نہیں۔ اِس سلسلے میں گنیش اَور ہنومان کا ذِکر کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہندو دیومالا ایک ایسا مربوط اَور منظم سسٹم ہے جس میں برہم کی تجریدیت سے لے کر حیوان کی شکل کے دیوتاؤں کی اَرضیت تک، کائنات کے سارے پرت سمٹ آئے ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ ہو سکتا ہے کہ ہندو دیومالا نے کائنات کا اَیسا تصور پیش کیا جس میں ہر شے اپنے صحیح مقام پر تھی اَور کہیں بھی غدر کی کیفیت موجود نہیں تھی: یہ ایک مرتب اَور منظم کائنات تھی جس میں تخریب سے لے کر تعمیر تک کے سارے مراحل کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اساطیر کا ایک سلسلہ تو تخلیقِ کائنات کے واقعے سے متعلق ہے مگر ایک اَور سلسلہ، زمین اَور اس کے باسیوں کی تباہی اور بربادی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھیں تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ تخریب اور تباہی کا ہر واقعہ، دراصل ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے بیج کا سخت چھلکا جب تک ٹوٹ پھوٹ نہیں جائے گا، اُس میں سے پودا باہر نہیں آ سکے گا۔ یوں کہہ لیجیے کہ کچھ عرصے کے بعد ہر شے پر زنگ سا لگ جاتا ہے اَور ارتقا کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تند و تیز تخریبی عمل ناگزیر ہو جاتا ہے جس سے شے کی پرانی چمک لوٹ آتی ہے اَور وہ اَز سرِ نو تخلیقی طور پر فعال ہو جاتی ہے۔ اساطیر میں پرانے، زنگ آلود جہان کو پانی کے علاوہ آگ وغیرہ کی مدد سے تباہ کرنے کی کہانیاں بھی ملتی ہیں۔ تاہم پانی سے تباہ کرنے والی کہانی زیادہ مشہور ہے۔ پانی کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہر شے کو پاک صاف کر دیتا ہے یعنی شے یا فرد پر سے زنگ، کہنگی، فرسودگی اَور گناہ کی غلاظت کو دھو ڈالتا ہے تا کہ زندگی اَز سرِ نو اپنا آغاز کر سکے۔ مذاہب میں یاترا کا ایک اہم مقصد بھی یہی ہے کہ رُوح کو پاک

صاف کیا جائے تا کہ وہ رفعت آشنا ہو سکے۔ عیسائیت میں بپتسمہ کی روایت بھی جسم کو پاک صاف کرنے کے عمل ہی سے متعلق ہے۔ اسی طرح گنگا اشنان کا مقصد بھی یہی ہے کہ پاپ دُھل جائیں اور فرد، دوبارہ تخلیقی طور پر فعال ہو جائے۔ لہٰذا طوفان کی اسطور بہ ظاہر تو تباہی اور بربادی کا منظر پیش کرتی ہے لیکن بہ باطن حیاتِ نو کی خوش خبری سناتی ہے۔ پانی سے تباہی کی اوّلیں اسطور سمیریا میں ملی ہے: نینوا کی اسطور نے اس سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ یونانی اساطیر میں بھی طوفان کی کہانی، سمیریا ہی کی کہانی سے متاثر لگتی ہے۔

سمیریا کی اسطور کے مطابق دیوتاؤں نے فیصلہ کیا کہ بنی نوع انساں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے پانی کا استعمال کیا جائے۔ مگر اُن میں سے ایک دیوتا، جس کا نام ان کی Enke تھا، انسان کی تباہی پر راضی نہ ہوا۔ اُس نے سپار Sippar کے بادشاہ، زایوسودرا Ziusudra کو ہدایت کی کہ وہ ایک کشتی بنا لے۔ طوفان سات دن اور سات راتیں جاری رہا۔ زایوسودرا کی کشتی بچ گئی۔ آخر میں اُس نے آنو اور ان لِل کے آگے سجدہ کیا، انھوں نے اُسے دیوتا کا مرتبہ بخش دیا اور یوں وہ نباتات کا رکھوالا اور بنی نوع انسان کا 'بیج' قرار پایا۔ سمیریا کی اس اسطور میں زیادہ تفاصیل نہیں ملتیں مگر مرکزی خیال سلامت ہے کہ آبی طوفانوں نے زایوسودرا کو تخلیقی طور پر فعال کر دیا جس سے نسل انسانی کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔

سمیریا کی اسطور کے مقابلے میں نینوا کی اسطور زیادہ مفصل ہے جو طوفان اور اُس کے کرداروں کے سارے تناظر کو پیش کرتی ہے۔ اس اسطور کے مطابق ایک بار، جل جامیش نے اپنے ایک بزرگ، اتناپشتم سے پوچھا کہ قدیم زمانے میں آبی طوفان کیسے آیا تھا اور اُس میں کیا ہوا تھا! اتناپشتم نے بتایا: جب شہر شوری پک، بہت پرانا ہو گیا تو دیوتاؤں نے فیصلہ کیا کہ ایک آبی طوفان لایا جائے تا کہ یہ شہر تباہ ہو (واضح رہے کہ اسطور میں تباہی کے لیے کہنگی اور فرسودگی کو وجہ جواز قرار دیا گیا ہے اور یہ بات بے حد خیال انگیز ہے)۔ مگر دیوتا یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ زندگی، کلیتہً فنا ہو جائے، وہ تو محض ارتقا کی رفتار کو تیز تر کرنے کے خواہاں تھے۔ چنانچہ اتناپشتم سے کہا گیا کہ وہ ایک کشتی تیار کرے، اُس میں ہر شے کا بیج محفوظ کرے اور جب طوفان آئے تو کشتی کے کواڑ بند کر لے یعنی خود ایک 'بیج' میں منتقل ہو جائے جسے طوفان چھاتا پھٹکتا پھرے تا آنکہ اُس پر سے کہنگی، فرسودگی اور زنگ کا غلیظ چھلکا اُتر جائے اور وہ پھر سے پھلنے پھولنے کے قابل ہو سکے۔

اسطور کے مطابق یہ طوفان سات دن اور سات راتیں جاری رہا۔ جب تباہی رُک گئی تو اتناپشتم نے کھڑکی کھولی اور دیکھا کہ تمام انسان گیلی مٹی میں تبدیل ہو گئے تھے۔ آخر میں ای آ، کشتی میں سوار ہوا۔ اُس نے اتناپشتم اور اُس کی بیوی کو اپنے سامنے دوزانو ہونے کو کہا۔ تب اُس نے، انھیں اشیر بادی اور کہا کہ وہ دونوں دیوتا ہو جائیں۔ نینوا کی اس اسطور کا لبِ لباب بھی یہی ہے کہ تخریب، تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ تاہم یہ تعمیر، تخلیقِ کائنات کا واقعہ نہیں تھا، یہ زندگی کی تجدید تھی جو ارتقا کے لیے ناگزیر ہے[1]۔

1۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے زندگی کی تجدید کے سلسلے میں اساطیر کے جن حوالوں سے اپنی بات کی عالمانہ وضاحت فرمائی ہے انھیں نوح Noah کے عہد کے طوفان سے تو جوڑا ہی جا سکتا ہے لیکن کمپیوٹر کو درست کرنے کے لیے عمل میں لائی جانے والی Formatting سے بھی ان کی مماثلت کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ کمپیوٹر جب سست ہو جاتا ہے یا بار بار hang ہونے لگتا ہے تو اس میں محفوظ تمام ضروری ڈاٹا data کسی دوسری ہارڈ ڈسک پر محفوظ کر کے کمپیوٹر کے تمام پروگرام Formatting کے عمل سے ختم (حذف/erase) کر دیے جاتے ہیں، بعد ازاں انھیں محفوظ کی گئی ہارڈ ڈسک سے دوبارہ کمپیوٹر کے سسٹم میں داخل/Install کر دیتے ہیں، جس کے بعد کمپیوٹر نئی توانائی اور تیز رفتار سے کام کرنے لگتا ہے۔ اس میں اساطیر اور کمپیوٹر کے زمانوں کا بعد بھی قابلِ غور ہے۔ ن ط۔

یونان میں صورتِ حال یہ تھی کہ دیوتاؤں اور انسانوں کا درمیانی فاصلہ، بڑی تیزی سے گھٹ رہا تھا۔ ایک طرف دیوتاؤں کا خاندان، اولمپس کی چوٹی پر رہتا تھا اور دوسری طرف انسانی خاندان تھا جو زمین پر گزر اوقات کرتا تھا۔ اوّل اوّل اِن دونوں خاندانوں کو ایک دُوسرے کے قریب لانے کا اہم کام پرومیتھیس نے انجام دیا جو دُوسرے دیوتاؤں کی طرح سنگ دل اور مغرور نہیں تھا، اُسے انسان کا محسن اور محافظ قرار دینا چاہیے۔ بعدازاں زیوس بھی انسان میں دل چسپی لینے لگا اور یوں دیوتا، بلندیوں سے اُتر کر، انسان کے معاملات میں بڑی باقاعدگی سے دخل اندازی کرنے لگے۔ شروع شروع میں دیوتا اور انسان (آسمان اور زمین)، میں خاصا بعد تھا: اُن میں مخاصمت کے شواہد بھی ملتے ہیں: مثلاً زیوس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نسلِ انسانی سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھا، اِس لیے ایک بار اُس نے فیصلہ کیا کہ اس بدبخت نسل کو صفحۂ ہستی ہی سے مٹا دیا جائے اور اس کی جگہ، ایک بہتر اور خوب تر نسل کو وجود میں لایا جائے!

راوٗس نے تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انسان، چار اَدوار میں سے گزر چکا ہے۔ پہلا دور، سنہری زمانہ (ست جگ) تھا جب سارے دُکھ ایک مرتبان (یعنی پنڈورا صندوق) میں بند پڑے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عورت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی (یہ مرتبان کہیں عورت ہی کا علامتی رُوپ تو نہیں تھا!)۔ اسے باغِ بہشت کا دور بھی کہا جا سکتا ہے جس میں آدمی 'ایک' کی صورت میں موجود تھا۔ اُس وقت یہ خوش باش اور دُکھوں سے نا آشنا تھا۔ اس کے بعد دُوسرا دور آیا جس میں اِنسان، بچوں کی طرح شرارتیں اور حرکتیں کرنے لگا (یہ دور حقیقتاً تجسس کا دور تھا اور انسان کی فاضل قوت کے چھلک جانے کا منظر پیش کر رہا تھا)۔ تیسرے دور میں انسان، ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے اور اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہونے لگے۔ پھر ایک ایسا دور آیا جس میں سارے رشتے ناتے تیزی سے ٹوٹنے لگے: باپ اور بیٹے میں ناقابلِ عبور خلیج پیدا ہو گئی،

وعدے کانچ کی چوڑیوں کی طرح کرچ کرچ ہو گئے اور مجرموں کی عزت افزائی ہونے لگی، مزدوروں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور کھیت ویران ہو گئے۔ نفسانفسی کے اس زمانے میں زیوس، آسمان سے اُتر کر زمین پر آیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان کس حال میں ہے! وہ اسے دیکھ کر پہلے مایوس ہوا، پھر برہم! تب اُس نے فیصلہ کیا کہ نسلِ انسانی کو غارت کر دے جس نے فتنہ فساد پھیلا کر گناہ کی غلاظت سے ہر شے کو داغ دار کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس نے دیوتاؤں کی کونسل طلب کی اور بتایا کہ اُس نے انسان کو غارت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دیوتاؤں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی کہ اُن میں سے ہر کسی کو اپنا منصب عزیز تھا: اُن کی شخصیتیں زیوس کی تابع مہمل بن چکی تھیں۔

تب ہواؤں کو حکم ملا کہ وہ بادلوں کو جمع کریں۔ آسمان سے برکھا اُتری اور سارا یونان اُس کی زد پر آ گیا۔ پرومیتھیس کو زیوس کے ارادے کا علم تھا، وہ انسان کی مکمل تباہی ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ ایک صندوق بنالے، اُس میں خورد و نوش کی اشیا جمع کرے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اُس میں چھپ جائے۔ طوفان، نو دن اور نو راتیں جاری رہا، صندوق بہتے بہتے، پرناسس پہاڑ کی اُس چوٹی پر جا پہنچا جو طوفان میں سلامت رہی اور یوں زندگی کی ابتدا ازسرِ نو ممکن ہوئی۔ آبی طوفان کی یہ کہانی سمیریا اور نینوا کی کہانیوں ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے کہ اِس میں بھی آبی طوفان نے نسلِ انسانی کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے بجائے محض اِس پر سے گندگی اور غلاظت اُتاری تاکہ وہ دوبارہ پھل پھول سکے۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ طوفان نے انسان کو دوبارہ 'ایک' میں تبدیل کر دیا اور 'ایک' کسی نئی شکتی سے لیس ہو کر خود کو دوبارہ منقسم کرنے کے قابل ہو گیا۔

واضح رہے کہ سمیریا کی داستاں میں آنو اور ان لِل نے، نینوا کی داستاں میں ای آ نے، یونان کی داستان میں پرومیتھیس نے اور ہندو دیو مالا میں وشنو نے آبی طوفان سے زندہ بچ نکلنے والے جوڑے کو آشیرباد دی۔ دیوتا کے ہاتھ کا یہ لمس، دراصل انسان کے بطون میں سوئے ہوئے تخلیقی جذبے کے بیدار ہونے کی بشارت تھی۔ چنانچہ اِس لمس نے انسان کو بکھراؤ کی حالت سے باہر نکال کر مجتمع کیا اور انسان ایک نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

اساطیر کا تیسرا بڑا سلسلہ، زرعی معاشرے کے دو اہم مشاہدات کا نتیجہ تھا۔ مثلاً قدیم انسان دیکھتا کہ بہار میں شگوفے کھلتے، گرمی میں پھل تیار ہوتا اور خزاں میں پتے پیلے پڑ جاتے اور روئیدگی عنقا ہو جاتی۔ پھر بہار دوبارہ آتی اور نئے شگوفے پھوٹتے اور درختوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑنے لگتی۔ دوسرا مشاہدہ یہ تھا کہ جب کاشت کا موسم آتا تو کسان زمین کو تیار کر کے بیج کو اُس کے نیچے دبا دیتا اور کچھ ہی دنوں کے بعد یہ بیج ایک پودے کی صورت میں زمین سے برآمد ہو جاتا۔ اِن مشاہدات نے زرعی معاشرے کے انسان کو یہ احساس دلایا کہ موت تو محض ماندگی کا وقفہ ہے، اِس لیے موت کے بعد خود انسان بھی ازسرِ نو زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ گویا قدیم انسان، ہر شے کی وجہ جواز تلاش کرنے پر مائل تھا: اُس کا یہ عمل منطقی یا سائنسی نہیں، بو جہی تھا۔ لہٰذا انسان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ ہر سال موسمِ سرما میں روئیدگی کا دیوتا زیرِ زمیں چلا جاتا ہے (یعنی مر جاتا ہے) مگر موسمِ بہار میں دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ مر جاتا ہے تو سارے عالم پر مردنی چھا جاتی ہے: چرند، پرند، پودے اور انسان، سب مضمحل ہو جاتے ہیں، مگر جب دیوتا دوبارہ زندہ ہوتا ہے تو زمین کی ہر شے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے۔ گویا زندگی اور موت نیز خزاں اور بہار کا سارا زمنی ڈراما، بیک وقت آسمانی بھی ہے اور زمنی بھی، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ زمنی ڈراما دراصل آسمانی ڈرامے ہی کا عکس ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو قدیم انسان نے، تغیرات اور حادثات کے عقب میں ایک تنظیم اور ترتیب دریافت کر کے، کائنات کو اِس کی وہ یک جہتی اور اکائی لوٹا دی جو موت اور خزاں سے پیدا ہونے والے انتشار کی کیفیت نے اِس سے چھین لی تھی۔

سمیریا کی اسطور میں دیموزی، روئیدگی کا دیوتا تھا جو فصل کے کٹ جانے کے بعد (یعنی بیج میں منتقل ہو کر) زمین کے نیچے چلا جاتا۔ جب زمین سے اگلی فصل برآمد ہوتی تو وہ بھی طلوع ہو جاتا۔ اسطور کے مطابق دیموزی کو زمین کے نیچے قید کر دیا جاتا اور عنانا دیوی (جو تخلیقی قوت کی علامت تھی)، زمین کے اندر اُتر کر دیموزی کو حیات عطا کرتی۔ سمیریا کی قدیم ترین اساطیر پر کریمر Kramer نے جو کام کیا ہے، اُس کے مطابق، کُلی تحقیق میں، عنانا کے زیرِ زمیں جانے کی وجہ بیان نہیں ہوئی، فقط یہ کہا گیا ہے کہ جب وہ زمین کے نیچے اُتری تو سات دروازوں کے دربان، نیتی Neti نے اُسے روکا۔ پھر یوں ہوا کہ عنانا دیوی کو گزرتے ہوئے، ہر دروازے پر، اپنے لباس کا کوئی نہ کوئی حصہ اُتارنا پڑا حتیٰ کہ ساتویں دروازے میں سے گزرنے کے بعد وہ بالکل برہنہ ہو گئی (غور کیجیے کہ اسٹرپ ٹیز کی روایت کتنی پرانی ہے!)، اور جب وہ زمین کے اندر اُتر آئی تو سات ججوں نے اُس پر موت کی آنکھ مرکوز کر دی اور وہ ایک لاش میں تبدیل ہو گئی مگر ان کی دیوتا نے اُسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ بعد ازاں وہ زمین سے باہر آئی تو قاعدے کے مطابق اُسے کسی اور کو اپنی قربانی کے لیے پیش کرنا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اُس نے اپنے شوہر، دیموزی کو اِس نیک کام کے لیے چنا اور اپنی جگہ اُسے زیرِ زمیں بھیج دیا۔ بابل کی اسطور میں دیموزی کی جگہ تموز لے لیتا ہے اور عنانا کی جگہ اشطار دیوی! اب کہانی یوں بنتی ہے کہ تموز، زمین کے نیچے قید ہو جاتا ہے تو زمین کے اوپر بربادی پھیل جاتی ہے، زرخیزی ختم ہو جاتی ہے اور نسل کشی کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ اشطار دیوی، تموز کو لانے کے لیے زیرِ زمیں جاتی ہے مگر وہ اسٹرپ ٹیز کے عمل سے نہیں گزرتی (جو ایک اعتبار

سے اپنی شخصیت کی نفی کرنے کے مترادف ہے)، وہ ایک جارحانہ رویے کا مظاہرہ کرتی ہے جو بابل کے باشندوں کی روایتی جارحیت کا کھلا ثبوت ہے۔ چنانچہ بابل کی وہ نظم جس میں اس کہانی کو بیان کیا گیا ہے، واقعے کو کچھ یوں پیش کرتی ہے کہ دروازے کے سامنے پہنچ کر اعشطار دیوی نے کڑک کر کہا:

اے دربان، دروازہ کھول دے
کھول دے دروازہ تا کہ میں داخل ہو سکوں!
اور تو نے دروازہ نہ کھولا تو میں اسے توڑ دوں گی
میں اس کی کنڈی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی
میں دروازے کو اکھاڑ پھینکوں گی
مُردوں کو جگا دوں گی اور وہ زندوں کو کھا جائیں گے!

اعشطار دیوی کے اس جارحانہ رویے سے خیال معاً کالی دیوی کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ کالی بھی دراصل تخریب اور جارحیت کی دیوی ہے۔

تموز اور اعشطار کی یہی کہانی فریجیا میں آتیس Atis اور سب ایلی Cybele کی صورت میں ملتی ہے۔ اس کہانی میں آتیس، زمین کے اثمار پر حکومت کرتا ہے بلکہ وہ خود ثمر یا اناج ہے۔ اُسے 'کٹا ہوا گندم کا خوشہ' کے لقب سے بھی پکارا گیا ہے۔ فریزر کے خیال کے مطابق آتیس کی پر آلام زندگی، موت اور واپسی، گندم کے اُس پودے کے مماثل تھی جسے درانتی زخمی کر دیتی، گودام نگل جاتا مگر وہ کاشت کے وقت پھر باہر آ جاتا۔

روئیدگی کے دیوتا کی موت اور حیاتِ نو کا قصہ، مصر کی دیومالا میں اوسیرس اور آئسس کی کہانی میں ملتا ہے۔ اوسیرس کی کہانی کے کئی پہلو قابلِ غور ہیں۔ مثلاً اپنے ظالم بھائی سیتھ Seth پر اوسیرس کی فتح اس بات کا اعلان تھا کہ مصر کے دونوں حصے ایک طویل تصادم کے بعد بالآخر یک جاں ہو گئے تھے، گویا کثرت نے وحدت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ تموز کی طرح اوسیرس بھی ایک ایسا دیوتا تھا جو نباتات کی موت کے ساتھ خود بھی مر جاتا اور جب نباتات کا دوبارہ ظہور ہوتا تو وہ بھی دوبارہ پیدا ہو جاتا۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ اوسیرس، زمین کے نیچے کے تاریک جہاں کا بے تاج بادشاہ تھا اور مُردوں پر حکومت کرتا تھا۔ یوں وہ انسان کی اُس زندگی سے بھی متعلق تھا جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے۔

یونان میں زیرِ زمین جانے والے دیوتا کی کہانی میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے۔ باقی کہانیوں میں تو دیوتا زمین کے نیچے قید ہو جاتا ہے اور دیوی (یعنی اُس کی شکتی) اُسے رہائی دلاتی ہے مگر یونانی دیومالا میں ڈائیونائسس کی ماں کو زمین کے نیچے قید کیا جاتا ہے اور ڈائیونائسس اُسے بچانے کے لیے پاتال میں اُترتا ہے۔ وہ ماں کو واپس لاتا ہے اور پھر اولمپس کی چوٹی پر چلا جاتا ہے۔ گویا فریجیا، بابل، اور مصر وغیرہ کی اساطیر میں 'شکتی' خود فعال ہے اور فرد کو بچاتی ہے یعنی لاشعور کی وہی قوت اُسے راستہ دکھاتی ہے جب کہ یونان میں فرد خود اپنی 'شکتی' کو تلاش کرتا ہے اور جب اُسے حاصل کر لیتا ہے تو اولمپس کی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ فرق معمولی نوعیت کا نہیں۔ باقی ممالک کی تہذیبوں میں فرد، تابع مہمل تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہاں فرد ابھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا لیکن یونان میں فرد کا اپنی 'شکتی' کو تلاش کرنا، اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ وہاں کی دیومالائی دُھند کے اندر انفرادیت کا ایک چھوٹا سا دیا ٹمٹمانے لگا تھا۔ اس چراغ نے آگے چل کر سارے یونان میں آگہی کی روشنی کو تیز تر کرنا تھا جس میں تضادات دکھائی دینے لگتے ہیں، تعقلات قائم ہوتے ہیں، اور تجزیے اور منطق کی مدد سے، وجود کو پہچاننے کی سعی کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اساطیر کے پورے نظام کا جائزہ لیا جائے تو اس میں کئی سطحوں پر کائنات کو 'اکائی' کے طور پر محسوس کرنے کے شواہد ملیں گے۔ مثلاً مذہب الارواح کے دور میں قوت، کرچ کرچ ہو کر، جانوروں، پتھروں، درختوں، دریاؤں، پہاڑوں اور اُن سے وابستہ جنوں، بھوتوں اور ڈائنوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اور وحدت کے بجائے کثرت کا مظاہرہ کر رہی تھی (اس دور میں انسان، قوت کی ان قاشوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی پوجا کرتا یا انھیں رشوت دیتا تھا۔ ٹوٹم کی ساری روایت بھی اسی دور میں پروان چڑھی تھی)، مگر اساطیر کے دور میں یہ تمام متفرق قوتیں یا قوت کی قاشیں نہ صرف ایک ہی دھاگے میں پرو دی گئیں بلکہ یہ دھاگا (ایک ہار کی صورت میں) ایک بڑی قوت کے گلے میں پڑا ہوا بھی دکھائی دینے لگا۔ گویا اساطیر میں ایک کائناتی ریاست کا تصور اُبھرا جس کا سربراہ ایک بڑا دیوتا تھا۔ پھر اس دیوتا کے زیرِ نگیں مختلف دیوتا اور دیویاں تھیں اور ہر ایک کے سپرد، فطرت کا کوئی نہ کوئی عنصر تھا بلکہ اُن میں سے بعض کو تو زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے اس طرح بخش دیے گئے تھے جیسے بادشاہ خوش ہو کر اپنے درباریوں کو جاگیریں عطا کر دیتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اساطیر میں قوت کی تقسیم کچھ اس طور ہوئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی قوتیں (مثلاً علاقائی دیویاں اور بدروحیں وغیرہ) بھی بڑی قوت کے ساتھ منسلک ہو گئی ہیں اور اُن کی آزاد حیثیت باقی نہیں رہی۔ اساطیر میں سب سے بڑی قوت آسمان پر متمکن ہے۔ اُسے آسمانی قوت کہہ لیجیے۔ مصر میں اُس نے خود کو سورج کی آنکھ سے منسلک کیا اور دیوتا رع میں مرتکز ہو گئی۔ ہندوستان میں برہم، آسمان کی بے نام اور بے صورت قوت کا مظہر تھا اور سریا کے ذریعے سورج کی آنکھ بن کر زمین اور اہلِ زمین پر حکم رانی کرتا تھا۔ سمیریا میں آسمان کی حکومت آنو کے سپرد تھی جو آسمان کے بدلتے ہوئے مزاج کا مظہر تھا یعنی کبھی تو آسمان کی طرح مہرباں اور کبھی نامہرباں ہو جاتا۔ یونان میں

زیوس آسمانی قوت کا مالک تھا بلکہ خود آسمانی قوت تھا۔ گویا اساطیر میں، آسمان سے Authority کا تصور وابستہ تھا اور زمین پر بھی جس کسی کو Authority حاصل ہوتی (مثلاً باپ، کاہن یا بادشاہ وغیرہ)، اُس کے رویے میں بڑے دیوتا کے وجود کو فوراً پہچان لیا جاتا۔ یہ بات مصر میں بطور خاص نمایاں تھی جہاں فرعون کو دیوتا قرار دیا گیا تھا۔ یوں قوت کے حوالے سے زمین اور آسمان میں ربط پیدا ہوا۔ آسمان پر دیوتا کی قوت تھی جس کے آگے سر تسلیم خم کرنا ضروری تھا اور زمین پر بادشاہ کی قوت تھی جس کے تابع ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ یہ خیال کہ بادشاہ زمین پر خدا کا نمائندہ ہے، اساطیر کے زمانے کے بعد بھی ایک طویل مدت تک خاصا مضبوط رہا۔

قوت کا دُوسرا رُوپ، بارانی طوفانوں میں متشکل ہو کر سامنے آیا۔ سمیریا میں بارانی طوفان کے دیوتا کا نام ان لل تھا جس کے بارے میں ہنری فریک فورٹ وغیرہ نے لکھا ہے کہ طوفان میں جو قوت اور شدت پنہاں تھی، وہی تو ان لل دیوتا تھا۔ گویا حکومت آنو کی تھی مگر جس قوت سے وہ حکم رانی کرتا تھا، اُس کا نام ان لل تھا۔ اسی طرح ہندوستان کی دیومالا میں حکومت برہم کی تھی اور اسی کے نام کا سکہ ساری کائنات میں چلتا تھا مگر جن قوتوں کی مدد سے وہ حکومت کرتا تھا، اُن میں سے ایک کا نام وشنو تھا جو بنیادی طور پر بارانی طوفان کا دیوتا تھا کہ وہ اپنے کوندوں سے زمین کو بار بار مس کرتا تھا اور اس کے باسیوں کو برہم کی قوت کا احساس دلاتا تھا۔ یونان میں آسمانی دیوتا زیوس تھا جس کی حکم رانی ساری کائنات پر تھی لیکن اُس کی شکتی بھی زیادہ تر تائیفون (یعنی طوفان کے دیوتا) کے ذریعے خود کو ظاہر کرتی تھی۔ عام حالات میں طوفان کی یہ قوت، خیر کا اعلامیہ تھی لیکن اس کے بطون میں ایک انوکھی وحشت اور تشدد تھا جو کبھی کبھی خیر کے لبادوں کو پھاڑ کر رونُما ہوتا اور پھر زندگی کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔

قوت کا تیسرا رُوپ پانی تھا جو زمین پر تھا مگر خود اس کے بھی دو رُوپ تھے یعنی میٹھا پانی اور کھاری پانی۔ چوں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے نیز فصلیں اگانے کے لیے، میٹھا پانی درکار تھا، اس لیے اس نے میٹھے پانی اور اس سے وابستہ دیوتا (یا دیوی) کو، خیر کا نمائندہ قرار دیا، مگر کھاری پانی سے وابستہ دیوی کو شر سے متعلق کر دیا۔ سمیریا میں پانی کے دیوتا کا نام ان کی تھا مگر درحقیقت وہ میٹھے پانی کا دیوتا تھا جب کہ کھاری پانی کے ساتھ سمندری بلا، تیامت کا نام وابستہ تھا جسے مردک نے تہ تیغ کیا۔ پانی میں جو گہرائی اور سوئی سوئی سی کیفیت ہے، اُس کے باعث پانی اور پانی سے وابستہ دیوتا یا دیوی بھی عقل اور دانش کا نمائندہ قرار پائی۔ پانی کا اصل منصب تخلیق کاری ہے جس کے بغیر فصلیں اور پودے اور جان دار، زندہ نہیں رہ سکتے، اور پانی ہی سے زندگی نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ تخلیق کائنات کے بارے میں جو کہانیاں ہم تک پہنچی ہیں، اُن سب میں یہ بات بڑے التزام کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ شروع شروع میں پانی تھا، پھر پانی سے زندگی نے جنم لیا۔

اب تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ اُوپر آسمانی دیوتا ہے، جس کی کونسل میں ایک وزیر، بارانی طوفان کا بھی ہے جو زمین کو آسمان کی قوت سے آشنا کرتا ہے یعنی فلک کی بات زمین کو بتا دیتا ہے۔ پھر اُس وزیر کا ایک ایجنٹ بھی ہے جو پانی کا دیوتا ہے اور پانی کی مدد سے زمین کی روئیدگی کو برقرار رکھتا ہے۔ یہ ساری کہانی مزید سمٹ کر یہ صورت اختیار کرتی ہے کہ قحط سالی کے دوران میں، زمین کے باسی، آسمان کی وسیع و بے کنار، لامحدود و لازوال قوت کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتے، اُس کے آگے دست بہ دُعا ہوتے کہ کوئی چھینٹا پڑے۔ پھر اُن کی قسمت اگر یاوری کرتی (یعنی آسمان کا دیوتا اگر مہرباں ہو جاتا) تو برکھا کے تیر، زمین میں پیوست ہو جاتے اور تشنہ لب زمین، میٹھے پانی سے سیراب ہو جاتی اور اس سیرابی کے ساتھ ہی زمین کے باسی بھی جی اُٹھتے۔ یوں دیکھیے تو اساطیر نے زندگی یا رُوئیدگی کے سارے ڈرامے کو زمینی اور آسمانی قوتوں کی ایک چھوٹی سی تمثیل کے ذریعے دریافت کر کے کائنات کو نہ صرف ایک خاندان بلکہ ایک ریاست میں تبدیل کر دیا جس میں آسمان (یعنی بادشاہ) ہی زمین (یعنی رعایا) کے لیے اَن داتا تھا اور جس کی ذرا سی بے نیازی بھی زمین اور اہل زمین کو بآسانی تباہ کر سکتی تھی۔

تاہم اساطیری نظام نے معاشرتی اکائی کے تصور ہی کو پیش نہیں کیا، اس نے کائنات کے جملہ مظاہر کو بھی ایک تمثیل میں منکشف کر دیا۔ آج کے انسان کی طرح، قدیم انسان کے سامنے بھی کائنات ایک 'اسرار' کی طرح ہمہ وقت موجود تھی اور وہ اس اسرار کی تہ تک پہنچنے کا متمنی تھا، مگر وہ آج کے سائنسی، تجزیاتی اور منطقی رویے کے بجائے کشف ذات کے تخلیقی عمل سے استفادہ کرنے پر زیادہ مائل تھا۔ سو کشف ذات کا یہ عمل ہی اساطیر کی تخلیق پر منتج ہوا۔ جس طرح فرد خواب دیکھتا ہے، بالکل اسی طرح معاشرہ بھی خواب دیکھتا ہے۔ یہ خواب کبھی مثبت ہوتا ہے اور کبھی منفی یعنی کبھی ایک مثالی معاشرے کا اور کبھی ایک برتر نسل کی حکومت کا، اور کبھی یہ خواب جنت گم گشتہ کا بھی ہوتا ہے۔ تاہم قدیم زمانے میں اس خواب نے خود کو اساطیر ہی میں منکشف کیا اور دیوتاؤں کی کہانیوں میں کائنات کے اسرار پر سے پردہ اُٹھایا..... بنیادی طور پر، سوچ کا یہ انداز وہی تھا، نیز یہ فکشن کے عقبی دیار کی حیثیت رکھتا تھا۔

حوالہ جات

1. S. H. Hook, Middle Eastern Mythology, p.23
2. Herbert J. Muller, Freedom in the Ancient World, p.40
3. W. H. D. Rouse, Gods, Heroes and Men
4. W. H. D. Rouse, Gods, Heroes and Men, p.5
5. Kramer, From the Tablets of Sumer Colorado, 1956
6. Henri Frank Fort etc., Before Philosophy, p.153

تفتیش

اردو ادب کی جعلی تحریریں

ڈاکٹر خلیق انجم

جعلی اور الحاقی تحریروں میں بہت کم فرق ہے۔ اگر کسی وجہ سے کسی مصنف کی کوئی تحریر کسی اور کے نام سے مشہور ہو جائے تو اسے الحاق کہا جائے گا اور اگر جان بوجھ کر کسی خاص مقصد سے کسی اور کے نام سے کوئی تحریر لکھی جائے تو اسے جعل سازی کہا جائے گا۔ دنیا کی ہر زبان میں الحاق اور جعل سازی کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں۔ جو آگے بیان کی جائیں گی۔ امریکہ کی نیویارک پبلک لائبریری میں جعلی تحریروں کا باقاعدہ سیکشن ہے۔ لیکن میرے علم کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کی کسی لائبریری میں اس طرح کا کوئی شعبہ قائم نہیں کیا گیا۔ اب اردو اور فارسی میں ادبی جعل سازی کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی نے 'نادر خطوطِ غالب' کے نام سے اپنے جدِّ اعلیٰ کرامت حسین کرامت کے نام غالب کے 23 خطوط کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ یہ مجموعہ 1939 میں کاشانۂ ادب، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں 23 خطوط غالب کے، شاہ کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام تھے۔ بقول رسا ہمدانی، کرامت ہمدانی اُن کے جدّ اعلا تھے۔ جن کے صاحبزادے تھے عالی مرحوم، جو رسا کے دادا تھے۔ رسا کے بیان کے مطابق غالب نے عالی کے والد کرامت ہمدانی کے نام جو خطوط لکھے تھے، انھیں عالی ہمدانی نے 1912 میں ایک خوش خط کاتب سے صاف کرا کے کتابی صورت میں مرتب کر دیا تھا۔

عالی ہمدانی یہ خطوط شائع کرنا چاہتے تھے لیکن بقول اُن کے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ 1918 میں عالی ہمدانی کا انتقال ہو گیا اور خطوط کا غیر مطبوعہ مجموعہ ایک صندوق میں بند پڑا رہا۔ 1939 میں رسا نے یہ مجموعہ شائع کر دیا۔

کُل 27 خطوط ہیں جن میں 23 خطوط کرامت ہمدانی کے نام ہیں۔ ایک صوفی منیری کے نام اور تین صفیر بلگرامی کے نام۔ رسا نے غالب کے خطوط کے مختلف حصے اور 'یادگارِ غالب' کی کچھ عبارتیں نکال کر جعلی خطوط بنا دیے ہیں۔

خطوط کے اس مجموعے پر پہلا مقالہ مالک رام صاحب نے لکھا تھا جو جامعہ، دہلی مارچ 1942) میں شائع ہوا۔ دوسرا مقالہ قاضی عبدالودود کا تھا جو 'معاصر' (پٹنہ جنوری 1943) میں چھپا۔ متنی تنقید کے میدان میں کام کرنے والوں کے لئے ان دونوں مقالوں کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ انھیں یہ معلوم ہو سکے کہ ادبی جعل کس طرح پکڑا جاتا ہے۔

مالک رام صاحب نے نادر خطوطِ غالب اور غالب کے اصل خطوط کی عبارتیں اس طرح ایک دوسرے کے سامنے پیش کی ہیں کہ حقیقت کا پتا چل جاتا ہے۔ کرامت علی کرامت کے نام غالب کا ایک جعلی خط اور عبدالرزاق شاکر اور چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب کے وہ دو جعلی خطوط ملاحظہ ہوں، جن سے عبارتیں لے کر یہ جعلی خط بنایا گیا ہے۔

خط نمبر-1 **(جعلی خط)**

دہلی یکم جنوری ۱۸۵۱ء

"شاہ صاحب کو غالب ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے، جو میں تمھیں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

میرے آم کھانے کا حال نہ پوچھو۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں جو کہوں بین الطعامین، ہاں آخرِ روز بعد ہضم معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں، مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت

عمدہ اور میٹھے آموں کا پارسل اگر آئے گا، تو میں خوش ضرور ہوں گا اور اگر نہ آئے گا تو میں طلب بھی نہ کروں گا۔"

اب غالب کے وہ اصل خطوط ملاحظہ ہوں۔ جن سے رسا نے عبارتیں لے کر غالب کا جعلی خط بنایا ہے۔

اصلی خط 1-**بنام عبدالرزاق شاکر**

"بندہ نواز، زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی وجگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی، حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب!
وہ عناصر میں اعتدال کہاں"

اصلی خط 2-**بنام چودھری عبدالغفور سرور**

"خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں! طاقت کہاں سے پاؤں! نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منہ آم نہ کھاتا تھا، کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں تھا، جو کہوں، بین الطعامین۔ ہاں آخرِ روز بعد ہضمِ معدہ آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں، مگر دس بارہ، اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت"

غالب نے منشی لال کی تصنیف 'سراج المعرفت' کا دیباچہ لکھا تھا۔ 'نادر خطوطِ غالب' میں کرامت ہمدانی کے نام غالب کے اس (جعلی) خط میں 'سراج المعرفت' کے دیباچے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 'نادر خطوطِ غالب' میں اس خط پر یکم جنوری 1851 کی تاریخ ہے۔ جب کہ 'سراج المعرفت' اس خط کے تین سال بعد یعنی 2 فروری 1854 کو مطبع سلطانی، دلّی سے شائع ہوئی تھی۔

اس خط میں رسا ہمدانی نے ابتدائی عبارت عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے خط سے اور باقی عبارت چودھری عبدالغفور سرور کے نام خط سے لی ہے۔ شاکر کے نام کے خط میں خاصی ترمیم ہے۔ لیکن چودھری عبدالغفور کے نام کے خط کی عبارت لے کر جو غالب کے نام خط بنایا گیا ہے اس میں بہت کم الفاظ بدلے گئے ہیں۔ اس خط میں یہ عبارت بھی ہے کہ "عمدہ اور میٹھے آموں کا پارسل اگر آئے گا تو میں خوش ضرور ہوں گا۔" رسا صاحب کو یہ خیال نہیں رہا کہ انھوں نے اس خط پر تاریخ یکم جنوری لکھی ہے اور جنوری میں شمالی ہند میں آم نہیں ہوتے۔ نیز یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا ہے جب پٹنہ اور دہلی کے درمیان ٹرین نہیں چلی تھی۔ اس لئے آموں کا پارسل بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

'نادر خطوطِ غالب' میں ایک خط ہے جس پر 17 اکتوبر 1853 کی تاریخ ہے۔ رسا ہمدانی صاحب نے جنون خطوط کی عبارتیں نکال کر جعلی خط بنایا ہے۔ 'نادر خطوطِ غالب' کے ایک خط کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

جعلی خط

جانِ غالب، مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعہ میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ میں بھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جابریلوی اور میر مہدی مجروح کے نام غالب کے تا۔

برسات کا حال کیا پوچھتے ہو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں قلم دان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا ہے کہیں چلمچی دھری ہوئی ہے۔ خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔ ایسی حالت میں اگر خط کے جواب میں دیر ہوا کرے تو خیال نہ کیا کرو۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آخر اس مطلع میں کیا ہے جو تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جو ہے وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ 'کاغذی پیرہن' سے مراد 'فریاد کرون' ہے۔ مطلب یہ کہ ہستی موجب ملال و آزار ہے۔ اس لئے تصویر بھی بزبانِ حال فریاد کرتی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا۔ کہو اب بھی سمجھے یا نہیں۔ اگر اس پر بھی نہ سمجھو تو تمھاری سمجھ کا قصور ہے۔

زیادہ و الدعا

نجات کا طالب غالب

غالب نے اس شعر کا مطلب عبدالرزاق شاکر کے نام خط مورخہ

اکتوبر، دسمبر 1865 میں بیان کیا ہے۔ رسا ہمدانی نے پوری عبارت بدل دی ہے۔ اس کا ایک فقرہ مشترک ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس خط سے مفہوم لے کر اپنی زبان میں بیان کر دیا گیا ہے۔ وہ مشترک فقرہ ہے۔ ''موجب رنج و ملال و آزار ہے''

جنون بریلوی کے نام غالب کے اصل خط کی عبارت:

''مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع کو کیا کھینچے گا اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھے گا۔ میں کبھی اُس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔''

میر مہدی مجروح کے نام غالب کے اصل خط کی عبارت:

''برسات کا حال نہ پوچھو، خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں کے کٹرے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جاتے ہوئے، جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کو بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھتیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے۔ کتابیں، قلم دان سب توشہ خانے میں۔ فرش پر کہیں لگن رکھا ہوا، کہیں چلمچی دھری ہوئی، خط کہاں بیٹھ کر لکھوں۔''

رسا ہمدانی نے غالب کے جعلی خط 16 (ص 46) میں غالب کے درج ذیل شعر کی تشریح کی ہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ عبارت بالکل وہی ہے جو حالی نے 'یادگارِ غالب' میں لکھی ہے۔ اس طرح غالب کے کچھ اور اشعار اور دو رباعیوں کے مطالب 'یادگارِ غالب' سے اس طرح اخذ کیے گئے ہیں کہ شاید ہی کوئی ترمیم کی ہو۔ اب غالب کے وہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ رسا نے کچھ خطوط میں ان الفاظ کی تشریح کی ہے۔ پوری عبارت وہی ہے جو انھوں نے مولانا حالی کی 'یادگارِ غالب' میں دی ہے۔

اشعار حسبِ ذیل ہیں:

تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست خط 18

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی خط 22

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے خط 22

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں خط 23

ہم گر چہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے خط 23

طوالت کے خوف سے یہاں تمام خطوط کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجموعے میں غالب کے نام 23 خطوط ہیں اور سب جعلی ہیں۔

'غالب کے خطوط' (جلد 4، ص ص 1576-1582) میں صفیر بلگرامی کے نام غالب کے پانچ خطوط شامل ہیں۔ غالب نے صفیر کے نام یہی پانچ خط لکھے تھے۔ صفیر کے انتقال کے بعد اُن کے پوتے سیّد وصی احمد بلگرامی نے ندیم گیا 1925 کے بہار نمبر میں ایک مقالہ لکھا جس میں انھوں نے غالب کے نام صفیر بلگرامی کا ایک خط اور اس خط کے جواب میں غالب کا خط شائع کیا ہے۔ ان خطوط میں صفیر اور غالب کے قلم سے ایسی باتیں لکھوائی گئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ فخرالدین سخن صفیر کے شاگرد تھے اور 'سروشِ سخن' سخن کی نہیں صفیر بلگرامی کی تصنیف ہے۔ سخن نے غالب کی زندگی میں یہ دعوا کیا تھا کہ وہ غالب کے نواسے اور ان کے شاگرد ہیں۔ ان دونوں ہی باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

یقینی امر ہے کہ یہ دونوں خطوط جعلی ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ ماڈل اسکول بھوپال کے رسالے 'گوہرِ تعلیم' (اپریل 1937) میں غالب کی نو اشعار کی ایک غزل شائع ہوئی تھی اس کا مطلع اور مقطع ہے:

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو، جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو
پیرانہ سال غالبِ مے کش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

اس شمارے میں غزل پر اپریل فول کا عنوان دے کر حاشیہ لکھا گیا تھا۔ 'ماخوذ از کتب خانہ نواب یار محمد خاں- بوسیدہ اوراق میں غالب کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے، جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔'' 'گوہرِ تعلیم' سے یہ غزل کئی رسالوں میں نقل کی گئی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور مالک رام نے اپنے اپنے مرتبہ 'دیوانِ غالب' میں یہ غزل شامل کر لی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس غزل کا غالب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اپریل فول کے طور پر یہ غزل کہہ کر شائع کرائی تھی۔

غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی تحریر

اردو میں ایسے واقعات تو بہت ہوئے ہیں کہ شاگرد استاد کی زندگی میں رشتۂ تلمذ سے منکر ہو گیا ہو۔ ایسے بھی کچھ واقعات ہیں کہ کسی مشہور شاعر

کی وفات کے بعد بعض شاعروں نے اس سے تلمذ کا دعویٰ کیا لیکن شاید ایسی مثال کوئی نہ ہو کہ بڑے شاعر کی زندگی ہی میں کچھ لوگ اس سے تلمذ کا دعویٰ کریں۔ لیکن سید محمد فخرالدین حسین خاں سخن دہلوی اور شاہ باقر علی باقر بہاری نے ایسی مثال بھی قائم کی ہے۔

ان دونوں کو غالب سے تلمذ نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے غالب کی زندگی ہی میں تلمذ کا دعویٰ کیا بلکہ سخن تو اور آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ غالب ان کے 'نانا' تھے۔ ہوا یوں کہ غالب کی 'قاطع برہان' کے جواب میں کلکتے کے ایک مدرس آغا احمد علی نے 'موید برہان' لکھی۔ ابھی یہ کتاب غالب تک نہیں پہنچی تھی کہ کچھ احباب نے غالب کو اس کتاب کے بارے میں لکھا اور اس کے کچھ مندرجات سے آگاہ کیا۔ غالب نے جواباً ایک قطعہ لکھا جس کا مطلع تھا:

مولوی احمد علی، احمد تخلّص ، نسخۂ

درخصوصِ گفتگوئے پارسی انشا کردہ است

اس کے جواب میں مولوی احمد علی کے ایک شاگرد عبدالصمد فدا نے ایک قطعہ لکھا۔ اس قطعے کے بارے میں 'ہنگامۂ دل آشوب' کی پہلی جلد میں لکھا گیا ہے کہ یہ خود مولوی احمد علی ہی کی تصنیف ہے۔ مولوی باقر علی باقر اور سخن نے اس قطعہ کا جواب لکھا اور یہ تمام قطعے 'ہنگامۂ دل آشوب' جلد اول کے نام سے 5 ذی الحجہ 1283ھ مطابق 10 اپریل 1867 کو شائع ہوئے۔ اس میں سخن کے نام کے ساتھ تلمیذ و نبیرۂ غالب لکھا گیا ہے۔ 'ہنگامۂ دل آشوب' کی دوسری جلد 2 جمادی الاول 1284ھ مطابق یکم ستمبر 1867 کو شائع ہوئی۔ اس میں منشی جواہر سنگھ جوہر کا قطعہ، اس کے جواب میں باقر اور سخن کے قطعے، سخن اور باقر کے قطعوں کے جواب میں عبدالصمد فدا کا قطعہ پھر اس قطعے کے جواب میں باقر اور سخن کے قطعے، منشی محمد امیر احمد امیر کا قطعہ شامل تھا۔ اس کے علاوہ سخن کی ایک اور نثر بھی تھی جو میر آغا علی شمس لکھنوی کی ایک تحریر مطبوعہ اودھ اخبار مورخہ 25 جون 1868 کے جواب میں تھی۔ اس میں سخن نے لکھا ہے:

''حضرت غالب مدظلہ العالی کا نواسہ اور شاگرد ہوں۔ میں نے بھی علم عربی حافظ عبدالرحمٰن مغفور اور مولوی محمد علی صاحب دہلوی سے حاصل کیا۔''

غالب کے سوانح نگار ذرا غور سے سخن کے خاندان اور ان کے بزرگوں کا حال پڑھیں تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کا ہرگز کوئی رشتہ نہیں تھا اور سخن نے صریحاً غلط لکھا ہے کہ وہ غالب کے نواسے ہیں۔ جو شخص اتنا بڑا جھوٹ اور اس دلیری سے بول سکتا ہے، اس کے لئے یہ کہنا تو کچھ مشکل ہی نہیں کہ وہ شاگردِ غالب ہے۔ دراصل 'قاطع برہان' کے سلسلے میں غالب پر بہت لے دے ہو رہی تھی۔ سخن کٹر متعصب دلی والے تھے۔ انھیں اصل بحث کا قطعی علم نہیں تھا۔ انھوں نے سرے سے 'موید برہان' نہیں دیکھی تھی۔

انھوں نے تو غالب کا قطعہ اور اس سلسلے میں دوسرے قطعات دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا کہ ایک دہلی والے پر بعض لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ چنانچہ 'ہنگامۂ شہر آشوب' میں انھوں نے غالب کی طرف داری کم اور اہلِ دہلی کی زیادہ کی ہے۔ بلکہ اہلِ لکھنؤ کو بے وجہ برا بھلا کہا ہے۔ مثلاً 'قاطع برہان' کی بحث میں یہ لکھنا قطعی بے موقع بات ہے:

''آپ اگر لکھنؤ میں خوش باش ہیں تو میں وکیل ہوں۔ آپ کو اگر اپنی زبان دانی کا دعویٰ ہے تو ایسی زبان دہلی کے عوام الناس بولتے ہیں، لکھنؤ کے فصیحوں کا دم بند کرتے ہیں۔ وہاں کے شعرا پر از راہ اعتراض زبان کھولتے ہیں۔ لکھنؤ کے افصح الفصحا مرزا رجب علی بیگ سرور تخلص نے کتاب 'فسانۂ عجائب' تالیف کی۔ میں نے 'سروشِ سخن' ان کے جواب میں تصنیف کی۔''

سخن کے لئے یہ موقع بہت اچھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ چوں کہ وہ غالب کی طرف داری کر رہے ہیں اس لئے اگر خود کو ''تلمیذ و نبیرۂ غالب'' لکھیں تو غالب تردید نہیں کریں گے۔ انھوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے دوست باقر کو بھی تلمیذ غالب لکھ دیا۔ مجھے یہ شبہ ہے کہ غالب کو 'ہنگامۂ دل آشوب' کے شائع ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کتاب کی پہلی جلد 10 اپریل 1867 کو چھپی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں شامل قطعات کچھ مہینے پہلے ہی لکھے گئے ہوں گے۔ اس کتاب میں غالب کا جو قطعہ شامل ہے اس کے بارے میں وہ 24 دسمبر 1866 کو یعنی 'ہنگامۂ دل آشوب' کی اشاعت سے تین مہینے پہلے میر حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں:

''...پس بھائی میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا۔''

'ہنگامۂ دل آشوب' کی جلد اول کے شائع ہونے سے چند روز پہلے یعنی 14 مارچ 1867 کو غالب 'موید برہان' کے بارے میں ذکا کو لکھتے ہیں:

''موید برہان میرے پاس بھی آ گئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بقید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں۔ وہ تمھارے پاس بھیجوں گا، بشرط مودت، بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب لکھو، میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب جانو درج کر دو۔''

اگر سخن اور باقر کو غالب سے تلمذ ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ چھپنے سے پہلے یہ قطعات غالب کو نہ بھیجتے، اور ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ غالب ذکا کے نام اس خط میں قطعات اور 'ہنگامۂ دل آشوب' کی اشاعت کا ذکر نہ کرتے۔ غالب کو طرف داروں کی ضرورت تھی۔ نوبت یہاں تک تھی کہ وہ خود جواب لکھ لکھ کر شاگردوں کے نام سے چھاپ رہے تھے، اور بعض شاگردوں کو مواد فراہم کر رہے تھے۔ ہم اگر یہ مان بھی لیں کہ سخن اور باقر نے قطعات چھپنے سے پہلے غالب کو کسی مجبوری سے نہیں دکھائے تو چھپنے کے بعد تو

کتاب بھیجی ہوگی۔ پھر غالب کے خطوط میں اس کتاب کا ذکر کیوں نہیں ملتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ 'ہنگامۂ دل آشوب' کی دوسری جلد یکم ستمبر 1867 کو شائع ہوئی۔ اگر غالب کو ہنگامۂ دل آشوب کی پہلی جلد موصول ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ دوسری جلد میں غالب کے مشورے شامل نہ ہوتے۔ دوسری جلد میں انتہائی سطحی باتیں ہیں، جن کا اصل موضوع یعنی غالب کی 'قاطع برہان' اور مولوی احمد علی کی 'موید برہان' سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ 'ہنگامۂ دل آشوب' کی پہلی جلد غالب کو بھیجی ہی نہیں گئی۔

سخن کا سنہ ولادت کسی کو معلوم نہیں۔ مالک رام نے بغیر کسی حوالے یا بحث کے 'تلامذۂ غالب' (ص 147) میں 1942 اور تذکرۂ ماہ و سال (ص 190) میں 1939 لکھا ہے۔ خلیل الرحمن داؤدی نے بعض شواہد کی روشنی میں قیاساً 1840 بتایا ہے۔ خود سخن کا بیان ہے کہ 1853 میں انھوں نے دہلی کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پہلی صورت میں ان کی عمر گیارہ برس اور دوسری صورت میں تیرہ برس قرار پاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ ناممکن ہے کہ سخن نے گیارہ یا تیرہ سال کی عمر میں شاعری میں ایسی مشق بہم پہنچائی ہو کہ استاد کی اصلاح سے بے نیاز ہو گئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ 1863 (سخن کے ترک وطن) اور 1869 (وفات غالب) کے درمیانی سولہ برس میں سخن نے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح لی ہوگی۔

سخن نے غالب کی ایک تقریظ کو تو چھپنے سے پہلے سترہ سال تک محفوظ رکھا (اس تقریظ پر بعد میں بحث ہوگی) لیکن اپنے استاد جن کے ادبی مرتبے سے وہ بخوبی واقف تھے اور جنھیں وہ "حضرت جناب تقدس مآب، گردوں رکاب سردفتر محققان سخن، افسر شاعران زمن...... سرآمد شاعران حال و گزشتگان" لکھتے ہیں، ان کا ایک خط بھی محفوظ نہیں رکھ سکے۔ خطوطِ غالب کے کسی مجموعے میں سخن یا باقر کے نام ایک بھی خط نہیں جب کہ سخن نے 'سروش سخن' اور 'دیوان سخن' دونوں میں یہی دعویٰ کیا ہے کہ وہ شاگردِ غالب ہیں۔

'سروش سخن' کا پہلا ایڈیشن 1281ھ مطابق 1864 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن کوشش کے باوجود مجھے نہیں ملا۔ اس لئے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں دعویٰ تلمذ کیا گیا تھا یا نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ اس ایڈیشن میں نہ ہوگا۔ دوسرے ایڈیشن میں وہ لکھتے ہیں:

"مرزا نوشہ... جو جدۂ فاسد محرر داستان ہیں، سرآمد شاعرانِ حال گزشتگان ہیں عرصہ دراز تک کم ترین کو معظم الیہ سے درس و تدریس میں استفادہ رہا۔ تحریر نظم و نثر پارسی اور اردو کے مزاولت پر دل آمادہ رہا۔"

سخن اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"چندے درک صحبت ایشاں نمودہ ام این ہمہ سخن گستری فیض تجلیات ہماں مہر سپہر سخنور پست۔"

ان دونوں اقتباسوں میں صرف "عرصہ دراز" اور "چندے درک صحبت ایشاں نمودہ ام" کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے۔

اب بعض تذکرہ نگاروں کو لیجیے۔ علی نجف نے 'تذکرہ غنچۂ ارم' میں سخن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"منظور نظر عاطفت بندگان حضرت مولوی سید خواجہ فخر الدین حسین، دہلی مولد، لکھنؤ و آرہ مسکن، مصنف 'سروش سخن' و متخلص بہ 'سخن' خلف الصدق جناب جلال الدین احمد المدعو بہ حضرت صاحب دام مجدہم، برادر زادہ و پسر خواندہ خواجہ صاحب مغفور مصنف پورینہ مامور بودہ، بہ حصول رخصت وارد آں جا شدہ بودند و بعد از اتمام رخصت عزیمت مقام مذکور داشتند، گردیدم و برحسب ارشاد ممدوح الیہ ہم رکاب آں جناب فائز پورینہ گشتہ مورد ہزاران عنایت و کرم شدم تا دو سال خدمت سامی مفتخر بودم۔"

نجف کے اس بیان سے لگتا ہے کہ وہ سخن کی بہت عزت کرتے ہیں اور ان کے خاندان کے بہت ممنون ہیں۔ یہ کتاب 1299ھ مطابق 1881ء میں تالیف ہوئی تھی اور 1301ھ مطابق 1883 میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت تک 'ہنگامۂ دل آشوب' اور 'سروش سخن' شائع ہو چکی تھیں جن پر سخن کو شاگرد و نبیرۂ غالب لکھا گیا تھا۔ نجف نے سخن کے بارے میں دونوں میں سے کوئی بات نہیں لکھی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اصل راز سے واقف تھے۔

عبدالغفور نساخ نے لکھا ہے کہ:

"شاگرد مرزا نوشہ غالب، سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ان کو اپنا شاگرد بتلاتے ہیں۔ کلام ان کا لکھنویوں کے انداز کا ہے۔ کوئی شعر یا کوئی فقرۂ نثر دہلویوں کے انداز کا ان کے کلام میں نظر نہیں آتا۔"

نساخ کے اس بیان میں دو باتیں اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، سخن کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ نساخ کا یہ بیان کہ "کوئی فقرۂ نثر دہلویوں کے انداز کا ان کے کلام میں نہیں" اس بات کا ثبوت ہے کہ نساخ کو اگر یقین نہیں تو شبہ ضرور تھا کہ سخن کو غالب سے تلمذ نہیں، ورنہ نساخ کے یہ الفاظ بے معنی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ صفیر مدعی تھے کہ سخن اُن کے شاگرد ہیں۔

مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعے میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے۔ اس میں سخن کا بھی نام شامل ہے اور شعر متعلقہ یہ ہے:

فیض یاب از صفیر با تمکین
سخن، احمد امیر، سلطاں شاد

نواب سید تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی نے ایک کتاب 'مرقع

فیض' لکھی تھی جو شاگردانِ صغیر کا تذکرہ تھا۔ اس میں شاد عظیم آبادی اور سخن کا بھی ذکر تھا۔

اس کتاب کے جواب میں 'تنبیہ صغیر بلگرامی' مصنفہ سردار مرزا شائع ہوئی۔ بقول سید وصی احمد بلگرامی اس کے اصل مصنف خود سخن تھے۔ میں اس کے مصنف کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر سید وصی احمد بلگرامی کا بیان غلط ہے تو یہ یقینی امر ہے کہ اس کے لکھے جانے میں سخن کا ہاتھ تھا۔ کیوں کہ 'تنبیہ صغیر بلگرامی' کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

سخن نے (یہ شعر) دہلی ہی میں کہا تھا اور غالب نے اسے سن کر انھیں گلے لگایا تھا اور آب دیدہ ہو کر کہا تھا 'میری جان ایسے شعر نہ کہا کرو۔ ابھی تو تم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا۔ دنیا میں کیا دیکھا بھالا۔ دیکھو عارف ایسے ہی لختِ جگر اگل کر دنیا سے ناشاد گیا۔ تم بھی زندگی سے بے زار ہو۔' الغرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ خبردار اب جو سنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سیّد تیری جان اور اپنے ایمان کی قسم صورت سے بے زار ہو جاؤں گا۔''

لطف یہ ہے کہ صغیر دعویٰ کرتے تھے کہ سخن ان کے شاگرد ہیں۔ جواباً سخن نے یہ دعویٰ کیا کہ صغیر کو ان سے تلمذ ہے۔ اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صغیر مدعی تھے کہ سخن کو ان سے تلمذ ہے اور وہ اس حقیقت سے منکر ہیں کہ سخن کو غالب سے تلمذ ہے ورنہ وہ یہ ضرور لکھتے کہ سخن پہلے غالب کے اور اب اُن کے شاگرد ہیں۔ اس کے برعکس سخن کا یہ دعویٰ کہ صغیر اُن کے شاگرد ہیں، صریحاً بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ اول تو صغیر، سخن سے عمر میں لگ بھگ دس سال بڑے تھے اور دوسرے سروش سخن میں سخن نے لکھا تھا کہ:

''سیّد فرزند احمد صاحب صغیر بلگرامی جو صاحبِ دیوان ہیں تحریر اُن کی چست، روزمرہ درست، نہایت خوش بیان ہیں۔ ہر شہر و دیار میں اُن کی علوِ خاندانی کی شہرت ہے، ہر جگہ اُن کی قدر و منزلت ہے۔''

اگر صغیر کو اُن سے تلمذ تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ یہاں اُس کا ذکر نہ کیا جاتا۔

لالہ سری رام کے تذکرۂ 'خم خانۂ جاوید' کی چوتھی جلد 1926 میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت تک سخن کی تمام تصنیفات شائع ہو چکی تھیں۔ اُن تصنیفات میں سخن کا دیوان بھی شامل ہے۔ جس میں غالب کی ایک تقریظ ہے اور تقریظ میں غالب نے لکھا ہے کہ میں سخن کا ''جدّ فاسد'' یعنی نانا ہوں۔ لالہ سری رام کے پیشِ نظر وہ ادبی معرکے بھی رہے ہوں گے جو سخن اور صغیر میں رہے تھے۔ اب ان کا بیان ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''ان (سخن) کو جس طرح فنِ سخن میں مرزا غالب سے عقیدت تھی، اسی طرح مرزا صاحب سے کچھ قرابت بھی ظاہر فرماتے۔ مگر یہ بات سخن آرائی کے تحت میں رہی، پایہ ثبوت کو نہ پہنچی۔''

اس سلسلے میں اب کچھ اور شواہد ملاحظہ ہوں۔

''سروشِ سخن'' میں سخن نے غالب کا نام اس طرح لکھا ہے:

''نجم الدولہ، دبیر الملک، نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ عرف مرزا نوشہ۔''

جو لوگ غالب کی شخصیت اور اُن کی انا سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ غالب کا شاگرد اور کم از کم نواسا اُن کا نام لکھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ سخن دیوانِ غالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دیوانِ اردو جب تصنیف فرمایا معنی رس اور سخن دان لوگوں نے ایک ایک شعر میں سو سو طرح کا مزہ پایا۔ لیکن بعضے شاعر جو بڑے مشاق تھے، اپنے فن میں طاق، شہرہ آفاق تھے، اکثر اشعار نہ سمجھے اور ہر ایک مصرع پر الجھے، یہاں تک کہ اصلاع اور امصار سے خطوط آنے لگے۔ لوگ نواب صاحب کی خدمت میں مطلب دریافت کرنے جانے لگے۔ آسان اشعار کہنے کی فرمائش ہوئی۔ دوسرا دیوان مرتب کرنے کی خواہش ہوئی۔ آپ نے اس دیوان کو دریا برد کیا اور دوسرا دیوان موافق فہم ابنائے روزگار کے ترتیب دیا۔ پھر یہ رباعی لکھ کر لوگوں کو سنا دی اور دیوان کے آخر میں لگا دی۔ غالب مدظلہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخن ورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل!

غالب نے اردو میں پہلا دیوان (نسخۂ بھوپال) 1237ھ (1821) میں مرتب کیا تھا۔ اس کے شائع ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ جو اصلاع و امصار سے خطوط آئے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس نسخے کی بہت نقلیں کی گئی تھیں۔ اس نسخے کی ایک نقل 'نسخۂ شیرانی' ہے جس میں غالب نے کچھ ترمیم کی تھی۔ کچھ غزلیں نکالی تھیں اور کچھ اضافہ کی تھیں۔ لیکن بنیادی طور پر یہ پہلے ہی دیوان کی نقل تھی اور اس کے قلمی نسخے بھی اصلاع اور امصار میں نہیں پہنچے۔ متداول دیوان البتہ کلامِ غالب کا انتخاب ہے جو غالب نے خود 1248ھ میں کیا تھا۔ یہی دیوان اکتوبر 1841 میں شائع ہوا تھا اور اصلاع و امصار میں پہنچا تھا۔ اس کا دوسرا اڈیشن 1847 میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیں حذف نہیں کی گئی تھیں بلکہ پندرہ غزلوں کا اضافہ کیا گیا تھا۔ رباعی کے متعلق جو کچھ سخن نے کہا ہے وہ محض افسانہ ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لئے کہی گئی تھی جو غالب پر مشکل گوئی کا اعتراض کرتے تھے، لیکن

یہ اس دیوان (نسخۂ بھوپال) میں شامل تھی جو غالب نے سب سے پہلے مرتب کیا تھا۔ سخن 53"" میں دہلی سے آئے ہیں۔ اس وقت تک اُن کے نانا اور استاد کے دیوان اردو کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور وہ اس کی روداد سے ناواقف ہیں۔ اور 'سروشِ سخن' کے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ 1877) تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر ہیں۔

اب غالب کی فارسی تصنیفات کے بارے میں سخن کا بیان ملاحظہ ہو:

''تواریخ مہر نیم روز'' اور ''ماہ نیم ماہ'' حسب الحکم شاہ ثریا جاہ از آغاز پیدائش حضرت آدم تا زمان صاحب قرآن ثانی امیر گورگانی اور دوسری جلد میں وہاں سے عہد بہادر شاہ تک ایک مہینے کے عرصے میں اس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ لکھی کہ سب استادوں نے آپ کے آگے قلم رکھ دیا..... اتنی بڑی تاریخ کو دو جلدوں میں اور دو جلدوں کو اٹھارہ جزو میں تمام کیا۔''

حیرت ہے کہ غالب کے نواسے کو یہ بھی علم نہیں کہ اس تاریخ کا دوسرا حصہ یعنی 'ماہ نیم ماہ' شائع ہونا تو کجا لکھا ہی نہیں گیا۔ غالب کو 4 جولائی 1850 کو خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر بہادر شاہ ظفر نے مقرر کیا تھا اور اگست 1854 میں 'مہر نیم روز' مکمل ہوئی تھی۔ گویا پورے چار سال میں یہ وہ زمانہ ہے جب بقول خود سخن کے وہ غالب سے درس و تدریس لے رہے ہیں اور شاعری میں اصلاح لے رہے ہیں۔ لیکن انھیں اس کا علم نہیں کہ غالب کو یہ پہلا حصہ لکھنے میں کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اور انھیں یہ بھی نہیں پتا کہ اس تاریخ میں امیر تیمور تک نہیں، ہمایوں تک کے حالات ہیں۔ یہ کتاب 1271ھ (1854-1855) میں شائع ہو گئی تھی۔ سخن کو یہ توفیق بھی نہیں ہوئی کہ اپنے استاد کی اس کتاب پر ایک نظر ڈال لیتے۔

اب 'پنج آہنگ' کے بارے میں اُن کا بیان ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

''انشائے پنج آہنگ کو کہ جس میں صدہا مکتوب ہیں، تین روز میں تصنیف کیا۔''

'پنج آہنگ' کے بارے میں یہ بیان صرف وہ شخص دے سکتا ہے جس نے کبھی یہ کتاب نہ دیکھی ہو اور جس کا غالب سے قریبی تعلق نہ رہا ہو۔ اس کا پہلا اڈیشن 4 اگست 1849 کو شائع ہو چکا تھا۔ جب 1853 میں سخن نے دہلی کو خیر باد کہا ہے تو اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود سخن کو اس کے مندرجات کا علم نہیں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کتاب میں غالب کی جو تحریریں ہیں وہ تین روز میں نہیں لکھی جا سکتی تھیں۔ بلکہ اُن کا زمانہ تصنیف 1825 سے 1849 تک ہے اور خطوط صرف آہنگِ پنجم میں ہیں اور ان کی تعداد صدہا نہیں بلکہ صرف 158 ہے۔

'سروشِ سخن' کا سنہ تصنیف 1281ھ مطابق 1864 بتایا جاتا ہے۔ اس سے قبل غالب کا کلیاتِ نظم فارسی 1845 میں اور قاطع برہان 1862 میں شائع ہو چکے تھے اور سخن کو ان کی اطلاع نہیں۔ مثنوی بادِ مخالف کے بارے میں لکھا ہے:

''مثنوی بادِ مخالف جو کلکتہ میں رقم فرمائی اسے ایک دن میں تالیف کیا۔''

میرے علم میں نہیں کہ غالب نے کہیں لکھا ہو کہ یہ مثنوی ایک دن میں لکھی گئی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ مثنوی بھی سخن کی نظر سے نہیں گزری تھی، انھوں نے صرف اس کا نام سنا تھا۔ ممکن ہے کہ انھوں نے اس مثنوی کے بارے میں حالی کی 'یادگارِ غالب' میں پڑھا ہو۔

غرض یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سخن کا غالب سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ نہ غالب کے شاگرد تھے اور نہ نواسے۔ انھوں نے 'قاطعِ برہان' کے جھگڑے سے فائدہ اُٹھا کر خود کو تلمیذِ غالب لکھا اور اس سلسلے میں اپنے دوست باقر علی باقر کو بھی تلمیذِ غالب لکھ دیا۔ اب مسئلہ اس تقریظ کا رہ جاتا ہے جو دیوانِ سخن میں غالب کے نام سے ہے۔ پہلے تقریظ ملاحظہ ہو:

''نامِ خدا سلطانِ قلمرو سخن دیوانِ خاص میں رونق افزا ہوا ہے۔ اور نگاہ روبرو بادشاہ سلامت کا شور ہر طرف برپا ہوا ہے۔ اہلِ نظر بادشاہ کا حسن و جمال اور بارگاہ کی عز و شان دیکھیں۔ سخنوروں کے ہزاروں دیوان دیکھے ہوں گے، اب سخن کا خاص دیوان دیکھیں۔ رہے شاعر یکتا و نامی کہ جس کا پیارا نام سخن ہے یعنی ہمہ تن سخن اور تمام سخن ہے۔ قرۃ العین خواجہ سید محمد فخر الدین حسین کو اگر سخن ور بے عدیل کہوں تو بجا ہے کیوں کہ اس کا حسنِ کلام میرے دعوے پر دلیل اقوی ہے۔ اس سحر کار جادو نگار نے پری زادانِ معنی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اتارا ہے جیسے آبگینۂ مے سے رنگِ مے نظر آئے، لفظ سے جلوۂ معنی آشکارا ہے۔ میں مغلوبِ دہر غالب نام جو بازارِ ہستی میں متاعِ کاسد ہوں، بحسب اصلاحِ فقہا اس سید زادہ قدسی نہاد کا جدِ فاسد ہوں۔ چشم بددور ہنوز آغازِ جوانی اور نو بہارِ باغِ زندگانی ہے۔ عمر کے لئے دفترِ قضا و قدر میں حکمِ دوام لکھا گیا ہے۔ پس اگر یہی جودتِ فکر اور طبیعت کی روانی ہے، اغلب کہ ذوقِ شعر اور شغلِ تحریر ہمیشہ چلا جائے گا۔ پھر تو یہ دیوان اوراقِ افلاک میں نہ سمائے گا۔''

غالب کی وفات 1869 میں ہوئی اور یہ دیوان ستمبر 1886 میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا۔ اس دیوان میں شاہ محمد عزیز الدین عزیز کا کہا ہوا 'قطعۂ تاریخ ترتیب دیوانِ سخن دہلوی' شامل ہے جس سے 1302ھ مطابق 1884 برآمد ہوتا ہے۔ گویا یہ دیوان 1884 میں مرتب ہوا۔ پھر غالب نے سترہ سال پہلے کس طرح اس کی تقریظ لکھ دی۔ کہا جا سکتا ہے کہ عزیز کا قطعہ غلط ہے۔ یہ دیوان غالب کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا، چھپا

بہت بعد میں ہے۔

سخن خود بگلہ ٔ شہر آشوب میں لکھ چکے ہیں:

''آپ نے چند غزلیں کہی ہوں گی، میں صاحب دیوان ہوں۔''

پھر سخن اپنے دیوان میں لکھتے ہیں:

نظم پریشاں مری جب کہ ہوئی مجتمع
شانہ کش طرۂ زلف شکن در شکن
لوگوں کا اصرار پھر مجھ سے ہوا بہر طبع
اور نہ دی رخصت یک مژہ برہم زدن
چھپ گئے جو کچھ کہ تھے شعر برے یا بھلے
ہو گئے المختصر ہدیۂ ارباب فن

سخن کا پہلا بیان 1867 کا ہے اور دوسرا 1886 کا۔ ظاہر ہے کہ پہلے بیان میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ فرض کیجیے ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ غالب کی زندگی میں دیوان مرتب ہو چکا تھا اور غالب ہی نے یہ تقریظ لکھی تھی، تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ جب 27 اکتوبر 1868 کو عود ہندی، شائع ہوئی تو اُس میں غالب کی تقریظ شامل نہیں ہوئی۔ ہم یہ بھی مان لیں کہ سخن کی کوتاہی سے یہ تقریظ 'عود ہندی' میں شامل نہیں ہو سکی تو 1899 میں حالی نے جب اردوئے معلی کے حصہ دوم کے لئے مواد فراہم کیا تھا، جس میں غالب کی تقریظیں، دیباچے اور کچھ خطوط شامل تھے، اس وقت 'دیوانِ سخن' کو شائع ہوئے چودہ پندرہ برس گزر چکے تھے۔ 'سروش سخن' کی وجہ سے سخن کو اچھی خاصی شہرت مل چکی تھی۔ پھر حالی نے یہ تقریظ 'اردوئے معلیٰ' میں کیوں شامل نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ حالی اصل راز سے واقف تھے۔ غلام رسول مہر صاحب نے خطوط غالب میں یہ تقریظ شامل کی ہے۔ معلوم نہیں اُن کا ماخذ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سخن اور باقر دونوں غالب کے جعلی شاگرد ہیں۔ انھوں نے غالب کی مقبولیت اور شہرت کا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور اس تقریظ کا بھی غالب سے کوئی تعلق نہیں، یہ سخن کی اپنی تخلیق ہے۔

خطوط کی طباعت میں کئی طرح کے جعل ممکن ہیں:

(1) بعض اوقات خطوط کا مرتب مکتوب نگار کی طرف سے کچھ ایسے خطوط وضع کر دیتا ہے جن کا مکتوب نگار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے ایسے خطوط کو ہم وضعی خطوط کہہ سکتے ہیں۔

(2) کچھ خطوط میں تحریف کر دی جاتی ہے یعنی اپنی طرف سے کچھ لفظوں، فقروں اور بعض اوقات پوری پوری عبارتوں کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور کبھی بعض عبارتیں حذف کر دی جاتی ہیں۔

(3) ایسا بھی ہوتا ہے کہ خطوط کا مرتب مکتوب نگار کے بعض ایسے خطوط اپنے نام کر لیتا ہے جن کا مکتوب الیہ کوئی اور ہوتا ہے۔

اردو میں بھی بعض خطوط کی طباعت کے وقت اس طرح کی تحریفیں کی گئی ہے۔ 'نادر خطوط غالب' کی طرح کی ایک اور مثال عباس علی خاں لمعہ کے نام علامہ اقبال کے وہ خطوط ہیں جو شیخ عطا اللہ کے مرتب کئے ہوئے اقبال نامے کی پہلی جلد میں شامل ہیں۔ ان خطوط کا پس منظر یہ ہے کہ علامہ اقبال کے لمعہ سے مراسم تھے اور ان دونوں کے درمیان کچھ خط کتابت بھی رہی تھی۔ ماہرینِ اقبال کا خیال ہے کہ علامہ نے لمعہ کے نام کچھ خطوط ضرور لکھے تھے۔ جب سر عبدالقادر کی سرپرستی میں اقبال کے خطوط مرتب کر کے شائع کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم ہوا تو لمعہ کو اُس کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ لمعہ کے پاس بقول اُن کے علامہ کے ساٹھ خطوط تھے۔ انھوں نے انتیس خطوط نقل کر کے شیخ عطا اللہ کو دے دئے۔ شیخ صاحب نے بغیر کسی تحقیق یا تصدیق کے وہ خطوط 'اقبال نامے' میں شامل کر لئے۔

بعد میں محققین نے ثابت کر دیا کہ ان میں سے بیش تر خطوط وضعی ہیں۔ یعنی لمعہ نے پورے کے پورے خطوط علامہ کی طرف سے اپنے نام لکھ لئے ہیں اور چند خطوط ایسے ہیں جو واقعی علامہ اقبال نے لمعہ کو لکھے تھے لیکن لمعہ نے اُن کی کچھ عبارت بدل دی اور کچھ خطوط ایسے ہیں جو دوسروں کے نام تھے۔ انھیں لمعہ نے اپنے نام کر لیا۔

ایک ماہر اقبالیات عبدالواحد معینی نے ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اتنا بڑا جعل اردو ادب کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی سرزد ہوا ہوگا۔''

ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ان خطوط کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''میری رائے میں خطوط بیش تر وضعی ہیں۔ عبارت پکار پکار کر کہہ رہی ہے مثلاً 'استفادہ حاصل کرنا' یہ اقبال کا لفظ نہیں ہے۔ مؤلف (مرتب اقبال نامہ) شیخ عطا اللہ نے تفحص سے کام نہیں لیا۔''

اس جعل کی بنیاد یہ ہوئی کہ شیخ عطا اللہ نے لمعہ کی دی ہوئی خطوط کی نقلوں پر بھروسہ کر لیا اور اصل خطوط نہیں دیکھے۔ ان خطوط کی جعل سازی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن ماسٹر اختر نے اس موضوع پر 'اقبال کے کرم فرما' کے نام سے پوری کتاب لکھی ہے۔ جس میں تمام خطوط کا بہت محققانہ انداز میں جائزہ لے کر ثابت کیا ہے کہ ان میں بیش تر خطوط وہ ہیں جو وضع کئے گئے ہیں اور چند خطوط ایسے ہیں جو ممکن ہے کہ لمعہ کے نام لکھے گئے ہوں گے لیکن ان میں تحریف کی گئی ہے۔ ان خطوط کے جعل کو ثابت کرنے کے لئے ماسٹر اختر نے بہت معقول دلائل پیش کئے ہیں اُن میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

(1) لمعہ کے نام علامہ اقبال کے ایک خط میں یہ عبارت ملتی ہے

"آپ کے ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لئے لاہور آئے تھے مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔"

ماسٹر اختر نے بہت صحیح لکھا ہے کہ علامہ اقبال اور ٹیگور اتنے بڑے آدمی تھے کہ اُن کی زندگی کے بیش تر ایام کے پروگرام کا ہمیں علم ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ ٹیگور اُن دنوں میں لاہور میں نہیں تھے نیز جن دنوں کا ذکر ہے اُن میں علامہ ایک دن کے لئے بھی لاہور سے باہر نہیں گئے۔

(2) ایک خط کی تاریخ تحریر 21 جون 1904 دی گئی ہے۔جو بقول ماسٹر اختر لمعہ کی ولادت سے سات سال پہلے کی ہے۔

(3) 10 اپریل 1934 کے ایک خط میں علامہ اقبال سے منسوب یہ عبارت ملتی ہے "آپ کے جواہر پارے 'گنج سخن' میں محفوظ ہیں اور میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔"

یکم نومبر 1935 کے خط میں یہ عبارت لفظ بہ لفظ پھر دُہرائی گئی ہے۔ ماسٹر اختر کی اس دلیل میں وزن ہے کہ اگر 'گنج سخن' 1934 میں بھیجی گئی تھی اور علامہ اقبال 10 اپریل 1934 کو اس کا شکریہ ادا کر چکے تھے تو پھر یکم نومبر 1935 کو اس کا شکریہ دوبارہ کیوں ادا کرتے ہیں اور پھر بالکل وہی الفاظ کیوں استعمال کئے گئے جو اپریل 1934 میں کئے تھے۔چوں کہ یہ دونوں خطوط لمعہ نے دو چار دن کے آگے پیچھے لکھے ہیں اس لئے یہ عبارت دوبارہ آگئی۔

(4) 19 مارچ 1933 کے خط میں لکھا گیا ہے: "عید الفطر کی پیشگی مبارک باد بھیجتا ہوں یا شاید وقت پر ہی پہنچ جائے۔"

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ عید الفطر 19 مارچ کے دو چار دن بعد ہی تھی حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ 1933 اور 1934 میں عید الفطر جنوری کے مہینے میں تھی۔اس خط پر لاہور لکھا گیا ہے جب کہ علامہ اقبال اس وقت لاہور میں تھے ہی نہیں۔وہ 18 مارچ 1933 کو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں رؤف بے کے دو خطبوں کی صدارت کے لئے دہلی میں تھے۔یعنی وہ لاہور میں نہیں تھے۔

اس طرح کے بہت سے متضاد بیانات ان خطوط میں ملتے ہیں۔

ماسٹر اختر نے علامہ اقبال کی خطوط نگاری کے اسلوب کا گہرا مطالعہ کر کے بعض ایسے حقائق پیش کئے ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں یا ان میں بہت زیادہ تحریف کی گئی ہے۔

(5) علامہ اقبال خط کے آخر میں "خدا حافظ" لکھنے کے عادی نہیں تھے۔ان کے تمام خطوط میں "خدا حافظ" نہیں ملتا لیکن لمعہ کے نام چھ "خطوط کے آخر میں 'خدا حافظ' لکھا گیا ہے۔

(6) علامہ اقبال "الحمد للہ" لکھتے تھے۔انھوں نے کبھی "بحمد اللہ" نہیں لکھا۔لمعہ کے نام تین خطوط میں بحمد اللہ لکھا گیا ہے۔

(7) علامہ اقبال نے اختتامیہ جملے میں ہمیشہ "اُمید کہ... بخیر ہوگا" لکھا ہے، "اُمید ہے کہ" کبھی نہیں لکھتے تھے۔

ماسٹر اختر نے اس طرح کی بہت سی مثالیں دے کر ثابت کر دیا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لمعہ کو اس جعل سازی کی ضرورت کیوں پڑی۔ان خطوط کے سرسری مطالعے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ لمعہ نے علامہ اقبال کے خطوط کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔اردو کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ لمعہ اردو کے غیر معروف شاعر تھے۔انھیں اردو شاعروں کی تیسری صف میں بھی شامل نہیں کیا جا سکتا۔اگر اقبال نامے میں اُن کے نام کے خطوط نہ ہوتے تو اُن کے نام سے بھی شاید کوئی واقف بھی نہ ہوتا۔لمعہ نے علامہ اقبال کے قلم سے جو اپنی تعریف و توصیف کرائی ہے۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"آپ کی طبیعت شاعری کے لئے مناسب ہے، اور آپ کی نظموں میں مجھ کو لطف آتا ہے، چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی نثر میں لکھئے۔آپ کی نثر بھی دل چسپ ہوتی ہے۔" (21 جون 1904)

"آپ بھی جوان اور آپ کی شاعری بھی جوان، مجھے تو آپ کی نظموں میں ایک خاص جذبہ نظر آتا ہے اور زبان کی سلاست سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ جاتے ہیں بلا قصد کہہ جاتے ہیں، اسی کا نام آمد ہے یہ کیفیت منجانب اللہ ہے۔" (19 مارچ 1933)

"میں نے آپ کا تازہ کلام دیکھا ہے اور تازہ تر نظمیں بھی۔ مجھے شعریت سے زیادہ معنویت نظر آئی اور میں بے حد متاثر ہوا۔میری یہ خواہش ہے کہ اس قدرتی عطیے کو آپ بہترین طریقے سے استعمال کریں۔آپ کے شعر وجدان کے حامل ہیں۔" (یکم دسمبر 1932)

'ہماری زبان' میں لمعہ حیدر آبادی کے نام علامہ اقبال کے خط کا عکس شائع ہوا تھا۔ماسٹر اختر کا دعویٰ یہ تھا کہ خط تو اقبال کا ہے لیکن اس میں القاب لکھنے میں فوٹو اسٹیٹ سے بدلی گئی ہے۔جب اس مسئلے پر بہت زیادہ بحث ہوئی تو ماسٹر اختر نے مجھے علامہ اقبال کے نام غالب کے خط کا عکس بھیجا جو میں نے 'ہماری زبان' 8 اگست 1989 کے شمارے میں شائع کر دیا۔غالب کے خط کا عکس اور ماسٹر اختر کی تحریر کا اقتباس دونوں ملاحظہ ہوں۔

اس خط کا عکس پیش کرتے ہوئے ماسٹر اختر نے لکھا ہے:

"چونکہ نہیں یہ خط اصل نہیں ہے، گھڑا ہوا ہے۔لیکن ایک ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ اس خط کا ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ بدست غالب اور بخطِ غالب ہے۔میں نے یہ خط 'غالب کے خطوط' مرتبہ خلیق انجم

کے بیں خطوط سے نقطے، حروف، اعداد اور الفاظ و جملے لے کر وضع کیا ہے۔ اس خط میں جو قابل توجہ اور خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ میں نے اس میں اپنی جانب سے یا اپنے قلم سے ایک نقطہ بھی گھٹایا، بڑھایا یا تحریر نہیں کیا ہے۔ اس لئے یہ صدفی صد غالب کی تحریر ہے اور ماہرین غالبیات کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے کہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ اس تحریر کا کوئی ایک نقطہ بھی خط غالب نہیں ہے۔" (ہماری زبان، 8 اگست 1989)

ماسٹر اختر کے تیار کیے ہوئے اس خط سے ثابت ہو جاتا ہے کہ زیرو کسنگ مشین اور کمپیوٹر کے ذریعے جعل سازی کے کتنے زبردست امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

سولھویں صدی میں آذر کیوانی فرقے کے لوگوں نے 'دساتیر' نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ یہ سولہ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ ہر کتاب اس فرقے کے ایک ایک پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس طرح دساتیر سولہ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر نذیر احمد اور قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب جعلی ہے۔ غالب اسے جعلی کتاب نہیں سمجھتے۔ انھوں نے اپنی تصنیف 'دستنبو' میں اس جعلی کتاب کے بہت سے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو دساتیر کے مصنفین کی ایجاد ہیں۔

تمنا عمادی مجیبی پھلواروی نے 'صراط مستقیم معروف بہ سید هادراستہ' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر عماد الدین قلندر پھلواری سے منسوب کر دی۔ قاضی عبدالودود نے 'معاصر' میں اس کتاب پر تفصیلی بحث کر کے اسے جعلی کتابوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

عبدالباری آسی نے غالب کے نام سے 26 غزلیں کہی تھیں۔ ان میں کچھ غزلیں پہلے نگار، لکھنؤ میں شائع کرائیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کسی نے ان غزلوں پر اعتراض نہیں کیا تو انھوں نے اپنی تصنیف 'مکمل شرح کلام غالب' میں یہ تمام غزلیں شامل کر دیں۔

1956 میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے 'مرقع شعرا' کے نام سے دس قدیم شاعروں کا ایک البم شائع کیا تھا۔ جن شاعروں کی تصویریں اس مرقع میں شامل ہیں اُن کے نام ہیں پروانہ لکھنوی، تسلی لکھنوی، حسرت دہلوی، ضیا دہلوی، فدوی لاہوری، قتیل فرید آبادی، مصحفی امروہوی، مضطر لکھنوی، مرزا جان جاناں مظہر اور میر تقی میر۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے صاحب نظر بھی دھوکا کھا گئے۔ انھوں نے مرقع کا مقدمہ لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی جعل ساز نے تصویروں کا یہ مرقع تیار کر کے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے ہاتھ اچھے داموں میں فروخت کر دیا۔

عوام کے مذہبی عقائد کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لئے بعض مذہبی بزرگوں کے نام سے کچھ جعلی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ چشتیہ سلسلے کے صوفیائے کرام کے نام سے منسوب کچھ جعلی کتابیں لکھی گئی تھیں۔ جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر اب جعلی تحریروں کے تحت ان کتابوں کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

چشتیہ سلسلے کی صرف ایک کتاب 'فوائد الفواد' ہے جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ شیخ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں جو اُن کے ایک مرید امیر حسن سنجری نے 707ھ اور 721ھ کے درمیان لکھے ہیں۔ امیر حسن لکھتے ہیں کہ شیخ نظام الدین اولیا نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ ایک صحبت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ "ایک دوست تشریف رکھتے تھے انھوں نے کہا کہ اودھ میں ایک صاحب نے مجھے ایک کتاب دکھائی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا اس کے مصنف آپ ہیں۔ شیخ صاحب نے جواب دیا۔ وہ شخص غلط کہتا تھا۔ میں نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ آگے چل کر امیر حسن لکھتے ہیں کہ شیخ نظام الدین نے کہا۔ "نہ میں نے کوئی کتاب لکھی، نہ شیخ الاسلام فریدالدین نے، نہ شیخ الاسلام قطب الدین نے، نہ خواجگان میں سے کسی نے اور نہ میرے سلسلے کے پہلے کسی بزرگ نے۔"

ان اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چشتیہ سلسلے کے کسی بزرگ نے کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن اس سلسلے سے متعلق مندرجہ ذیل کتابیں ملتی ہیں۔

1۔ انیس الارواح: اس کا مصنف شیخ معین الدین اجمیری کو بتایا گیا ہے۔ جس میں شیخ صاحب نے اپنے مرشد شیخ عثمان ہارونی کی زندگی کے حالات بیان کئے ہیں۔

2۔ دلیل العارفین: یہ کتاب شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے منسوب ہے۔ جس میں شیخ صاحب نے اپنے پیر و مرشد معین الدین اجمیری کے ملفوظات قلم بند کئے ہیں۔

3۔ فوائد السالکین: اس کے مصنف شیخ فریدالدین مسعود بتائے گئے ہیں۔ اس میں شیخ قطب الدین بختیار کاکی کے ملفوظات لکھے گئے ہیں۔

4۔ اسرار الاولیا: مولانا بدر اسحٰق سے منسوب ہے اور شیخ فرید گنج شکر کے ملفوظات بتائے گئے ہیں۔

5۔ راحت القلوب: اس کے مصنف شیخ نظام الدین اولیا بتائے جاتے ہیں۔ اور اس میں شیخ فرید گنج شکر کے ملفوظات قلم بند ہیں۔

6۔ افضل الفوائد: حضرت امیر خسرو سے منسوب ہے اور اس میں حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات تحریر کئے گئے ہیں۔

7۔ مفتاح العاشقین: شیخ محب اللہ کو اس کا مصنف بتایا گیا ہے۔ یہ شیخ نصیر الدین محمود کے ملفوظات ہیں۔

8۔ دیوان قطب الدین بختیار کاکی۔

9۔تذکرۃ الاولیا: شیخ فریدالدین عطار سے منسوب ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں جعلی ہیں۔ان میں سے کسی کتاب کا چشتیہ سلسلے کے بزرگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ان کتابوں کے لکھنے کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہیں۔غالباً کتابوں کا کاروبار کرنے والوں نے معمولی صلاحیتوں کے لوگوں سے یہ کتابیں لکھوائی ہیں۔

ایسی ہی جعل سازی کا ایک انتہائی دل چسپ واقعہ لندن میں ہوا تھا۔

کتابیں جمع کرنے والوں کو ایک شوق یہ بھی ہوتا ہے کہ اہم کتابوں کے تمام پہلے اڈیشن اُن کی لائبریری میں ہوں۔اس لئے پہلے اڈیشن کی خاص طور پر بہت زیادہ قیمت ہوتی ہے۔1932 کا واقعہ ہے۔لندن میں دو نوجوان جان کارٹر اور گراہم پولرڈ پرانی کتابوں کا کاروبار کرتے تھے۔پولرڈ کو کیمبرج ببلیو گرافی آف انگلش لٹریچر کے لئے رسکن پر ایک باب لکھنا تھا۔اس سلسلے میں انھیں رسکن کے کنگ اینڈ ویڈربرن اڈیشن کو بار بار دیکھنا پڑتا تھا۔اس اڈیشن میں ان کی نظر اڈیٹر کے اس حاشیے پر پڑی، کہ رسکن کے نام سے جو بعض پمفلٹ پہلے اڈیشن کے طور پر شائع ہوئے ہیں، وہ قطعی جعلی ہیں۔ صرف یہ ایک معمولی سی اطلاع تھی جو یورپ کی کتابی دُنیا کے سب سے بڑے ادبی فراڈ کے انکشاف کا ذریعہ بنی۔یہیں سے پولرڈ اور کارٹر نے ساتھ مل کر کام کرنا شروع کیا۔

سب سے پہلا انکشاف یہ تھا کہ عہد وکٹوریہ کے بعض مشہور مصنفین کے نام سے جو پمفلٹ ملتے ہیں۔اُن سب کی فروخت 1890 کے بعد ہوئی ہے۔اوران تمام پمفلٹوں کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔جب کہ عام طور پر نایاب کتابیں ایک دو سے زیادہ نہیں ملتیں۔ان پمفلٹوں کے ساتھ دل چسپ لطیفہ یہ تھا کہ جب کوئی پمفلٹ مارکٹ میں آتا۔تو اس کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ان پمفلٹوں کے بارے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ یہ اس طرح چھاپے گئے تھے جیسے مصنفین مثلاً براؤننگ، ٹینی سن، رسکن اور کپلنگ وغیرہ نے یہ پمفلٹ بہت کم تعداد میں صرف اپنے دوستوں وغیرہ کو تحفۃً دینے کے لئے چھپوائے تھے۔جب کہ یہ حقیقت نہیں تھی۔

اگر کوئی مصنف اپنے کسی دوست کو کوئی تصنیف پیش کرتا ہے۔تو اس پر دستخط ضرور کرتا ہے۔لیکن ان میں سے کسی پر بھی مصنف کے دستخط تھے اور نہ کسی قسم کا کوئی اور نشان۔1890 سے قبل ان مصنفین کی جتنی بھی ببلیو گرافیاں شایع ہوئی تھیں، ان میں سے کسی میں بھی ان پمفلٹوں کا ذکر نہیں تھا۔جب کہ ان پر قدیم ترین سنہ اشاعت 1840 تھا۔مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ کتاب کے شوقینوں کو فریب دیا گیا۔بلکہ ان کا اثر انگریزی کی ادبی تاریخ اور سوانح نگاری پر اس طرح پڑا کہ 1890 کے بعد یہ پمفلٹ معیاری ببلیو گرافیوں میں جگہ پا گئے۔سب سے زیادہ قیمت پر جو پمفلٹ بکا وہ مسز براؤننگ کا سونیٹس فروم دی پورچوگیز Sonnets From The Portuguese تھا۔جس کے سرورق پر اطلاع دی گئی تھی کہ یہ 1847 میں صرف دوستوں وغیرہ میں تقسیم کرنے کے لئے ریڈنگ میں چھاپا گیا۔کھلے بازار میں پمفلٹ بارہ سو پچاس پاؤنڈ تک بکا تھا۔

پولرڈ اور کارٹر نے اسی پمفلٹ پر کام کرنا شروع کیا۔اس سونیٹ کے بارے میں ایڈمنڈ گوس نے جو بہت مشہور نقاد تھا، 1894 میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں یہ دل چسپ واقعہ بیان کیا تھا کہ ابھی براؤننگ کی شادی ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک صبح جب مسز براؤننگ ناشتہ پر آئیں تو انھوں نے بہت شرماتے ہوئے کچھ کاغذ براؤننگ کی جیب میں ڈال دئے اور واپس اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔

ان کاغذوں پر یہی سونیٹ لکھا ہوا تھا۔جس کے بارے میں براؤننگ نے کہا تھا کہ شیکسپیئر کے بعد سب سے عمدہ سونیٹ تھا۔گوس نے لکھا تھا کہ براؤننگ اسے چھپوانا چاہتے تھے لیکن مسز براؤننگ کا خیال تھا کہ سونیٹ اتنا ذاتی اور مقدس ہے کہ اسے چھپوانا مناسب نہیں۔لیکن شوہر کے بے حد اصرار پر مسز براؤننگ نے مسودہ اپنی ایک سہیلی میری رسل مٹ فورڈ کو بھیج دیا، جنھوں نے ریڈنگ میں اس کی کچھ کاپیاں چھپوا کر اٹلی بھیج دیں، جہاں براؤننگ اوران کی بیوی کا قیام تھا۔

لیکن یہاں ایک دو باتیں ایسی تھیں جنھوں نے کارٹر اور پولرڈ کو چونکا دیا۔گوس کا بیان تھا کہ ناشتے والا واقعہ 1847 میں پیسا Pisa میں ہوا۔ لیکن خود براؤننگ اوراس کے دوسرے دوستوں کا بیان تھا کہ یہ واقعہ بنی دی لوشا Bagni di lucca میں 1849 میں ہوا۔اس کا مطلب ہے گوس نے سنہ اور مقام دونوں غلط دئے تھے۔لطف یہ ہے کہ پمفلٹ پر بھی 1847 دیا گیا تھا۔یعنی اصل واقعہ سے دو سال قبل کی تاریخ۔تھومس جے وائز عہد وکٹوریہ کا سب سے بڑا ببلیو گرافر سمجھا جاتا تھا۔اس نے براؤننگ کی ببلیو گرافی تیار کی تھی۔کارٹر اور پولرڈ نے اس ببلیو گرافی کا مطالعہ کیا۔اس میں وائز نے گوس کی بتائی ہوئی کہانی دہرائی تھی اور یہ اضافہ کیا تھا کہ مسز براؤننگ کی سہیلی مس فورڈ نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ڈبلیو۔سی۔بینیٹ Dr. W.C. Bennett کو 1885 میں اس پمفلٹ کی کچھ کاپیاں دی تھیں۔ بینیٹ ہی سے وائز نے بھی پچیس پاؤنڈ میں ایک پمفلٹ خریدا تھا۔بینیٹ کے پاس دس بارہ کاپیاں اور تھیں جو اس نے دوسرے لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیں۔کارٹر اور پولرڈ کے لئے وائز جیسے معتبر اسکالر کا بیان کافی تھا۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہوئے کیوں کہ ان کے ذہن میں کئی سوال تھے۔

1۔ گوس نے اپنے ایک دوست کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا تھا لیکن دوست کا نام کیوں نہیں بتایا۔

2۔ یہ واقعہ بقول گوس اٹلی میں ہوا۔ اٹلی میں پریس ہوتے ہوئے مسز براؤننگ نے چھپنے کے لئے یہ پمفلٹ اتنی دور انگلینڈ (ریڈنگ) کیوں بھیجا۔

3۔ مس ہٹ فورڈ کے خطوط چھپ چکے تھے۔ لیکن انھوں نے کسی خط میں اس واقعے کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

4۔ مس فورڈ نے اس پمفلٹ کی جتنی کاپیاں چھپوائی تھیں۔ وہ سب مسز براؤننگ کو کیوں نہیں بھیجیں اور دس بارہ کاپیاں ڈاکٹر ہیلیٹ کو کیوں دیں۔

5۔ براؤننگ اور مسز براؤننگ کے خطوط چھپ چکے ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے کسی خط میں اس واقعہ کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

6۔ براؤننگ کی لائبریری 1913 میں فروخت ہوئی تھی۔ لائبریری میں اس پمفلٹ کی کوئی کاپی کیوں نہیں تھی۔

7۔ کسی نے اب تک ایسا پمفلٹ کیوں نہیں دیکھا تھا۔ جس پر مسز براؤننگ کے دستخط ہوں۔ یا جس کا تعلق مسز براؤننگ کے قریب ترین دوستوں سے رہا ہو۔

8۔ پمفلٹ کی اشاعت کی یہ دل چسپ کہانی پہلی بار گوس نے بیان کی۔ اس سے پہلے کسی اور اسکالر نے کیوں نہیں کی۔

9۔ وائز کا بیان تھا کہ ڈاکٹر ہیلیٹ کے پاس دس بارہ پمفلٹ تھے جب کہ کارٹر اور پولرڈ کم سے کم سترہ پمفلٹوں کا پتا چلا چکے تھے۔

11۔ مسز براؤننگ کے سوانح نگار اور ببلیو گرافر اس پر متفق تھے کہ Sonnets From The Portuguese پہلی بار اس کتاب میں شائع ہوئی جس میں مسز براؤننگ کی تمام نظمیں تھیں۔ کارٹر اور پولرڈ کے سامنے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ پمفلٹ کو ہر طرح سے آزمائیں۔

انھوں نے پمفلٹ کے کاغذ کا کیمیائی تجزیہ کرایا تو معلوم ہوا کہ یہ مخصوص کاغذ 1880 کے بعد ایجاد ہوا تھا۔ جب کہ پمفلٹ پر تاریخ اشاعت 1847 تھی۔ پھر انھوں نے اس ٹائپ کی طرف توجہ کی جو پمفلٹ چھاپنے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ 1880 کے بعد کا ٹائپ استعمال ہوا ہے۔ گویا یہ طے ہو گیا کہ یہ پمفلٹ جعلی ہے اور 1847 میں نہیں بلکہ 1880 کے بعد چھپا ہے اب اس مسئلے کا سب سے مشکل سوال اُن کے سامنے تھا۔ جعل ساز کون ہے؟ اس پر پریس کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ انھوں نے مختلف پریسوں کی کتابوں سے اس کا موازنہ کیا، لیکن سوائے اس کے کوئی اور نتیجہ نہیں نکلا کہ جعل ساز نے ایک نہیں بلکہ دو کمپنیوں کے ٹائپ استعمال کئے ہیں۔ اس کے بعد کارٹر اور پولرڈ کو کوئی اور اطلاع نہیں ملی۔ ان کی پوری کوششوں کے باوجود معاملہ یہیں ختم ہو گیا۔

انگریزی ادب کی خوش نصیبی تھی کہ ایک دن اُن کے ہاتھ ایک ایسی کتاب لگی۔ جو بالکل اسی ٹائپ میں چھپی تھی اور اس پر پرنٹر کے طور پر تھومس، جے وائز کا نام تھا اور پریس کا بھی نام تھا۔ ان دونوں نے پریس سے انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ یہ ٹائپ 1880 کے بعد ابتدائی کچھ برسوں میں استعمال ہوا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے 1911 سے قبل کا پریس کا تمام ریکارڈ ضائع کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ پمفلٹ کس نے چھپوایا تھا اور معاملہ پھر یہاں آکر ختم ہو گیا۔ اس دوران ان دونوں نے اُن تقریباً پچاس پمفلٹوں کا بھی جائزہ لیا، جن پر وہ تمام شبہات تھے جو اس پمفلٹ پر تھے۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ سب جعلی ہیں۔ لیکن سوال پھر وہی تھا کہ جعل ساز کون ہے؟ ان دونوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جعل ساز۔۔

1. کوئی بہت ماہر ببلیو گرافر ہے۔

2. وہ کسی مشہور مصنف کے کلیات سے ایک نظم نکال کر بطور پمفلٹ اس طرح چھاپتا ہے جیسے مصنف نے خود چھپوایا ہو۔ اس میں وہ حالات بیان کرتا ہے جن میں یہ پمفلٹ چھپا اور پہلی بار نظم چھپنے کا جو سن عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اس سے کچھ قبل کا سن پمفلٹ پر دیتا ہے۔

3. جو حالات وہ بیان کرتا ہے وہ عام طور پر مصنف کی زندگی سے مطابقت رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام پہلے اڈیشن وجود میں آئے ہیں۔

4. جو حالات پمفلٹوں میں بیان کئے گئے ہیں، اُن کا علم صرف اسکالر ہی کو ہو سکتا ہے۔

یہ تمام خصوصیات صرف تین آدمیوں میں ممکن تھیں:

ہرن شیفرڈ Herne Shepherd جان کیمڈن ہاٹن John Camdan Hotten اور تھومس جے وائز Thomas J Wise۔

ان میں تیسرے آدمی یعنی وائز پر شک کی گنجائش نہیں تھی۔ کیوں کہ ببلیو گرافی کی دنیا میں اس کا کہا مستند مانا جاتا تھا۔ ببلیو گرافی کے معاملے میں جب بھی کوئی قضیہ ہوتا وائز کا فیصلہ آخری مانا جاتا تھا۔ کارٹر اور پولرڈ نے پہلے شیفرڈ اور پھر ہاٹن کے متعلق تمام معلومات فراہم کیں جن سے یہ ثابت ہو گیا کہ ان دونوں کا اس جعل سازی میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اب انھیں مجبوراً وائز پر شبہ کرنا پڑا۔ اس راستے پر وہ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ انھیں معلوم ہو گیا کہ وائز ہی اتنے بڑے جعل کا ذمہ دار ہے۔ اس نے اپنی معلومات، علم اور مہارت کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر تقریباً پچاس پمفلٹ شائع کئے تھے۔ جن سے اسے لاکھوں پاؤنڈ کی آمدنی ہوئی تھی۔

OO

ادبی تفہیم

استعارہ کیا ہے؟

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

استعارہ کیا ہے؟ شعر (بشمولیت نظم، غزل و دیگر اصناف) کی کثیر المعنیاتی تخم ریزی Dissemintaion میں یہ کس طرح در آتا ہے۔ اس کی مشابہت یا مماثلت اس ذہنی کیفیت سے کیا ہے، یا کس قدر ہے، جو شاعر اس کے خلق ہونے کے لمحے میں اپنے اندر سموئے ہوئے تھا؟ تلازمِ خیال Association of Ideas میں یہ کس طرح تخلیق کے دیگر عناصر سے منسلک ہوتا ہے۔ کیا اس کے زاویے یا قوسوں کو بڑھا کر اسے 'توسیعی استعارہ' یعنی Extended Metaphor بنانے میں اس کے 'اصل اصول' یعنی First Order System پر کوئی اثر پڑتا ہے؟ یہ سب سوال آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور ان کے جواب کو سمجھنے کے لئے ہمیں پھر لوٹ کر پہلے سوال کی جانب آنا پڑے گا۔ یعنی استعارہ کیا ہے؟

'استعارہ' کے معنیاتی سانچے Matrix کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس کے اندر پوشیدہ 'امیج'[1] Image پر توجہ مرکوز کرنا پڑے گی۔ امیج کی امیج کے پروسس کو کئی سطحوں پر کیا جاسکتا ہے (Marks,Dvid,1983) لیکن دو سطحیں ہماری بحث کے لئے موزوں ہیں۔ ایک تھیوری کو computation کی تھیوری کہا گیا۔ اور دوسری کو algorithms کی تھیوری کا نام دیا گیا۔ پہلی تھیوری میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں پہلے سے موجود مختلف النوع حصص کو جمع کر کے ذی حس انسان (اس تنازعہ میں شاعر) Picture Processing Module تیار کرتا ہے۔ یہ حصص آپس میں گتھم گتھا پیوست ہوتے ہوئے ایک تصویر کی شکل بن جاتے ہیں۔ دوسرے Module میں مختلف حصص کو ایک ایک کر کے ان کے صرف ان عناصر کو پورے امیج میں مدغم کیا جاتا ہے، جو مکمل طور پر اس سے مطابقت رکھتے ہوں (دیکھیں David E Marks 1986) ''پھول توڑتی ہوئی لڑکی'' پہلی قماش کے امیج میں شمار ہوگا۔ ''پھول توڑتی ہوئی لڑکی کے گال پر تل اور ایک تتلی'' دوسری قسم کے امیج میں شمار ہوگا۔ مغرب میں نفسیات کے ماہرین نے مندرجہ ذیل امور کی نشاندہی کی ہے۔

(1) حصص کو جوڑنے کا پروسس (2) امیج کی نامیاتی Organic وحدت اور اس کا اسٹرکچر (3) حصص کے جڑنے میں اور نامیاتی وحدت کے بننے میں زبان و بیان کی کارکردگی (4) حصص کی مطابقت وار موافقت کا Structure پر بوجھ (کہیں ایسا نہ ہو کہ حصص کی کھینچا تانی میں اسٹرکچر کمزور پڑ جائے یا ٹوٹ جائے)۔

قاری یا سامع کی اپنی ذہنی کیفیت جس میں اس کا تجربہ اور تربیت، زبان فہمی اور (اگر شاعر بنفس نفیس شعر پڑھ رہا ہے، تو شاعر کی حرکات و سکنات اس کی 'باڈی لینگویج') وغیرہ وہ عناصر ہیں جو امیج کی ترسیل میں معاون بھی ہوتے ہیں اور رکاوٹ بھی کھڑی کر سکتے ہیں۔ یعنی ''پھول توڑتی ہوئی لڑکی'' میں یہ ظاہر نہیں ہے کہ لڑکی کہاں ہے۔ باغ میں؟ گھر کے باغیچے میں؟ سڑک کے کنارے یا دریا کے کنارے، اگے ہوئے پودے سے؟ وقت کیا ہے؟ صبح، دوپہر یا شام؟ پس منظر میں کیا ہے؟ کھیلتے ہوئے بچے یا بھاگتا ہوا پالتو کیا؟ یہ سب عناصر قاری اپنی یادداشت، تربیت، تجربے کی پوٹلی کو کھول کر، چشم زدن میں اس امیج کے سارے سوال اور پھر ان کے بعد کچھ اور سوال ابھرتے ہیں۔ لڑکی کے دائیں رخسار پر تل ہے، یا بائیں رخسار پر، تل کالا ہے یا بھوری رنگت کا ہے؟ اس کا سائز کیا ہے؟ کیا یہ تل اس کے چہرے کو زیادہ دل کش بناتا ہے یا ایک بھدے نشان کی طرح لگتا ہے۔ تتلی کس رنگ کی ہے؟ کس سائز کی ہے؟ کیا یہ تتلی زندہ اڑتی ہوئی تتلی ہے، یا اس کے رخسار پر Tattoo ہے۔ کیا تتلی

1۔ بدقسمتی سے ہمارے پاس اردو میں image کا صحیح نعم البدل نہیں ہے۔ ہم ''پیکر'' یا ''تمثال'' استعمال کرتے ہیں۔ لیکن دونوں اصطلاحیں اس کی روح مطلق تک نہیں پہونچ پاتیں۔ اس لئے میں نے اس مضمون میں لفظ ''امیج'' برقرار رکھا ہے۔ یہی حالت symbol کی ہے۔ میری رائے میں ''علامت'' ''اشارہ'' دونوں غیر واضح اصطلاحیں ہیں۔ اس لئے میں نے ''سمبل'' ہی استعمال کیا ہے۔

اڑتے ہوئے اس کے داہنے گال پر بیٹھ گئی ہے، یا بائیں پر؟

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امیج کی فہم cognition اور recognition دونوں پر منحصر ہے۔ دونوں میں یہ قاری کی فہم و فراست، اس کی تربیت، اس کے تجربے اور اس زبان پر اس کی قدرت جس میں یہ امیج خلق کیا گیا ہے، کی بنا پر شامل ہے۔ اس بات کے علاوہ امیج چونکہ حواس خمسہ کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے (اور کبھی حواس کو بیک وقت کرتا ہے)، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارے حواس خمسہ میں کچھ اپنی کارکردگی میں تیز رفتار ہیں اور کچھ ذرا سست واقع ہوئے ہیں۔ پہلے امیج میں اگر سامع کو جوڑ دیں، تو امیج کچھ اس طرح ہو جائے گا "پھول توڑتی اور گیت گاتی ہوئی ایک لڑکی، جس کے گال پر ایک تل ہے اور ایک تتلی" صرف "پھول" کی جگہ اگر ہم گلاب کا پھول، کہتے تو سونگھنے کی حس بھی شامل ہو جاتی۔ گویا قاری کا 'رول' اس پروسس میں کم اہمیت کا نہیں ہے۔ زبان کی فہم بھی ایک ضروری عنصر ہے۔ مندرجہ بالا امیج آٹھ برس کے، گھر میں اردو یا ہندی بولنے والے، بچے کی فہم سے بالاتر نہیں ہے، لیکن اگر ہم تل کی جگہ 'خال' 'گال' کی جگہ 'رخسار' لڑکی کی جگہ 'حسینہ' اور گلاب کے پھول کی جگہ 'گل سوسن' رکھ دیں تو اس بچے کے ذہن میں امیج پیدا ہوگا، وہ یا تو نامکمل ہوگا یا تڑا مڑا ہوا، اس کی اپنی فہم و فراست اور زبان دانی پر استوار ایک کمزور اسٹرکچر والا خاکہ ہوگا۔

یہ مختصر مضمون اس بات کا اہل نہیں ہے کہ ہم امیج کے ذہن میں وارد ہونے اور قاری یا سامع تک اس کی ترسیل کو زیر بحث لاتے رہیں۔ اس لئے اب ہم امیج سے Metaphor کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کچھ Mental reservations کے باوجود مجھے اس کے اردو نعم البدل 'استعارہ' پر کچھ اعتراض نہیں ہے۔ ماہر نفسیات Piaget (1896-1980) اس بات پر مصر ہے کہ ایک استعارے کا زبان کے میڈیم میں موجود ہونا ایک ایسا اسٹرکچر ہے، جس کی Egocentric fixity اسے ایک Fixed اور مستقل جسامت دیتی ہے۔ لیکن اس کا اطلاق آرٹ اور ادب پر نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک عام قسم کی تصویری جسامت استعاراتی نہیں ہے۔ اختر احسن اپنی کتاب Trojan Horse, Imagery in Psychology, Art Literature & Politics میں کہتا ہے۔

"Metaphor is when you say that something is another thing and simile is when you say that something is like another thing." (page-11)

وہ مزید لکھتا ہے کہ دنیا بھر میں تشبیہ کو اکثر استعارہ سمجھ کر نقاد حضرات خود کو دھوکہ دیتے رہے ہیں۔ پیاجٹ اور اختر احسن میں بنیادی فرق یہی ہے۔ تشبیہ دو+دو=چار کی بات کرتی ہے۔ جب کہ استعارہ اس منطق سے پرے ہے۔ اسی فرق کو درجنوں مثالوں سے جوزف فرینک نے اپنے مضمون Spatial Forms in Modern literature میں واضح کیا۔ جہاں اس نے Ezra Pound اور James Joyce کے استعاروں میں Spatial element تلاش کر کے انہیں "نصف استعارہ" قرار دیا۔

اختر احسن نے اپنی ایک درجن سے زائد کتب میں اس بات کو دہرایا ہے کہ استعارہ خود بخود معرض وجود میں نہیں آتا۔ It is not self born or begotten بلکہ امیج کی مختلف کڑیوں کو جوڑ کر جس کثیر تعداد میں تصویری مفاہم کو جوڑ کر یہ بنتا ہے، اس میں مقابلے یا موازنے کا عنصر میکانکی ہے بھی، اور نہیں بھی ہے۔ اس لئے بالمقابلہ امیج، استعارے کی Intellectical Properties کو ہم درگزر نہیں کر سکتے۔ جوں ہی استعارے میں تاریخ سے 'اسطورہ سے یا مذہب سے کوئی بھولی بسری ہوئی بات ایک حوالہ بن کر استعارے کی بنت میں ایک الگ تاگہ لے کر وارد ہوگی، یہ انٹلیکچو ئل پراپرٹی اس کی بیخ و بن میں اپنا مقام بناتی چلی جائے گی۔ کچھ اصطلاحیں جیسے صبر ایوبی، عدل نوشیرواں، لچھمن ریکھا، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد، کثرت استعمال سے اپنا تصویری مفہوم کھو چکنے کے باوجود کسی نہ کسی سطح پر قاری یا سامع کی ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ اور یہ وہ بغیر تردد کے استعارے کی بیخ و بن میں ان رنگین تاگوں کو پہچان لیتا ہے۔ میکانکی عنصر کی موجودگی ان ہی زاویوں، قوسوں اور گولائیوں پر انحصار رکھتی ہے، جو استعارے کی جیومیٹری کو متاثر کرتے ہیں۔

آیئے! اب کچھ مثالوں سے اس بات کو واضح کریں۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات کو سمجھنا ضروری ہے۔ استعارہ کسی ایک شے یا کانسپٹ کو ایک متبادل شے یا 'لیبل' سے بیان کرنے کا گر ہے۔ میں نے لیبل، کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے، کہ بوتل میں بند عرق یا سنوف کی طرح، جب تک اس پر لیبل چسپاں نہ ہو، یہ جاننے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے کہ بوتل کے اندر جو عرق یا سنوف ہے اس کے کیمیائی اجزا کیا ہیں۔ کیونکہ عرق یا سنوف تو عام صفات ہیں اور ان سے کیمیائی اجزا کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی بحث براہ راست لیبل سے شروع کریں گے۔

شیکسپیئر کے ڈرامے 'میک بتھ' کی شہرہ آفاق سطریں حسب ذیل ہیں یہ ایکٹ (5) سین (5) سے اخذ کی گئی ہیں۔ جب میک بتھ کو یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی بیوی، لیڈی میک بتھ کی موت ہو گئی، تو وہ یہ مکالمہ ادا کرتا ہے۔

...... Out, out, brief candle!

Life's but a walking shadow, a poor player

That struts and frets his hour upon the stage

And then is heard no more: it is a tale

Told by an idiot, full of sound and fury
Signifying nothing

اس اقتباس میں زندگی کا رشتہ براہ راست کم از کم چار اشیا، کانسیپٹ یا مناظر سے استوار کیا گیا ہے، جو 'مصور بیانیہ' کی تکنیک سے قاری یا سامع کے سامنے آتے ہیں۔ کچھ وقت تک جلنے والی موم بتی، چلتا پھرتا ہوا سایہ، ایک ناقص اداکار جو بہت تھوڑے وقفے کے لئے اسٹیج پر آتا ہے، اور ایک ایسا قصہ جو ایک فاتر العقل شخص سناتا ہے۔ جس میں بلند آہنگ آوازیں اور غیض وغضب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مطلب کچھ عیاں نہیں ہوتا۔ ٹمٹماتی ہوئی موم بتی کو بجھ جانے کی تلقین سے شروع ہوتا ہوا یہ مکالمہ موم بتی کے حوالے سے ذو معنی ہے۔ موم بتی (یا اردو کی کلاسیکی غزلیہ شاعری میں 'شمع') کا کانسیپٹ تو زندگی کے عارضی ہونے کی علامت ہے ہی، لیکن اس قلیل المدتی کو اس کے بعد کے الفاظ 'چلتا پھرتا ہوا سایہ' سے جوڑ کر، اور چلنے پھرنے کو اس کے بعد کے امیج ناقص اداکار سے جوڑ کر استعارہ سازی کا ایک مربوط عمل پیش کیا گیا ہے۔

موم بتی کا ٹمٹمانا اور بجھنا... سائے کا چلنا پھرنا... ناقص اداکار کا تھوڑی دیر کے لئے اسٹیج پر وارد ہونا۔ یہ اس مربوط استعارہ سازی کے یکے بعد دیگر وارد ہونے والے امیج ہیں۔ آخری امیج Struts and frets his hour میں Struts and frets یعنی ہکلانے اور تتلانے کو موم بتی کے ٹمٹمانے اور his hour (قلیل المدتی) کو Out out brief candle موم بتی کے بجھ جانے یا زندگی کے ختم ہو جانے سے مماثل کر کے ایک چہار جہتی سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ (بین المتونیت کی سطح پر دیکھیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ شیکسپیئر نے بارہا زندگی کو تھیٹر کے اسٹیج سے مشابہ کیا ہے) جوں ہی ڈرامے کی بات ختم ہوتی ہے، ایک پاگل آدمی کے قصہ بیان کرنے کی اہلیت کی مشابہت زندگی کے شور و غوغا سے کرنے کے بعد یہ استعارہ ختم ہو جاتا ہے۔

نظم کی صنف، خصوصی طور پر آزاد نظم کی صنف اردو میں بہت دیر کے بعد وارد ہوئی۔ لیکن غزل کے سنہرے دور میں بھی، جب کہ تشبیہ، استعارہ، امثال، تمثال، اشارہ، بالکل تو نہیں، لیکن لگ بھگ ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے تھے، عموماً اس بات کو صحیح سمجھا گیا تھا کہ مترادف، مساوی، مماثل، الفاظ جو معانی میں بھی ہم جلیس یا ہم شعار ہوں، تشبیہ یا استعارہ کی بنیاد ہیں۔ مثلاً غالب کے اس شعر میں 'بسان کاغذ آتش زدہ' (Object) کو ایک ذہنی کیفیت کا 'انکار' بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

بسان کاغذ آتش زدہ، نیرنگ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

لیکن وہ شرط یعنی دونوں فریقین میں سے ایک کو جادو کی چھڑی سے غائب کر دیا جائے اور صرف اس کی صفات کو رہنے دیا جائے، پوری نہیں ہوتی۔ جوں ہی لفظ 'بسان' (بمعنی 'مانند') وارد ہوتا ہے، قاری سمجھ جاتا ہے کہ اب مقابلہ یا موازنہ پیش ہوتا ہے۔ یہ غالب کی استادانہ Enlargement کا فن ہے، کہ اس نے دوسرے مصرعے میں 'غلو' کو بروئے کار لا کر اشتباہ کو 'قیاس' سے ہم کنار کر کے ایک ایسی ذہنی کیفیت پیش کر دی، جو جلتے ہوئے یا جلے ہوئے کاغذ کے امیج سے زیادہ وسیع ہے۔ لیکن یہ استعارہ نہیں ہے۔ 'تلبیسی سکہ' ہے۔

غالب کے موازنے میں اقبال عام فہم شاعر ہے اور بغیر کسی تردد کے مقابلے یا موازنے کے لئے امیج مساوی کانسیپٹ یا امیج مساوی امیج مہیا کرتا چلا جاتا ہے۔

مثال پر توِ ئے طوف جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

ایک لفظ 'مثال' کے استعمال سے ایک خوب صورت امیج 'پر توِ ئے' صرف ایک تشبیہ بن کر رہ گیا، اور ''صبح و شام نماز کا ادا کرنا'' بالمقابل 'طوف جام'' کرنا۔ اپنی انگلیکچوئل پراپرٹی کی وجہ سے یہ شعر ایک استعارہ بنتے بنتے رہ گیا۔

زندگی انساں کی اس دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں

ردیف ''کے سوا کچھ بھی نہیں'' اپنے اندر ہی ایک موازنہ سموئے بیٹھی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اقبال نے اندرون مصرع بھی موازنے اور مقابلے کا پہلو روا رکھا ہے۔ ''زندگی'' مساوی ''دم'' ''دم'' مساوی ''ہوا کی موج'' اور ''ہوا کی موج'' مساوی ''رم''۔ اقبال نے اپنا مطلب تو منبر سے بولنے والے کی طرح بآسانی سامعین تک پہنچا دیا، لیکن اس پروسس میں اس فنی ابہام کی خوبصورتی کی قربانی دے دی، جو استعارے کی جان ہے۔

جدید اردو شاعری کے ابتدائی سفر میں ہمیں ایک اہم پڑاؤ ملتا ہے، جس پر ن م راشد کے نام کی تختی آویزاں ہے۔ اگر ہم پل بھر کو یہاں رکیں تو ہمیں آگے چلنے میں آسانی ہوگی۔ راشد کے ''انسان'' کے شروع میں لفظ ''لا'' کو ''انسان'' سے مساوی (=) کرنے کا جواز پیش کیا ہے۔ ''زندگی کی مساوات میں انسان ایک گم شدہ ہندسہ ہے، جس کی قیمت معلوم نہیں اور شعر ہو یا فن گویا سب اس قیمت کو دریافت کرنے کی کوششیں ہیں۔ لا کی اصل قیمت تو شاید کبھی معلوم نہ ہو سکے گی... لیکن یہ مشق اپنا اجر آپ ہے۔'' وزیر آغا صاحب نے ایک مختلف تناظر میں ان سطروں کو سمجھنے کے لئے 'لا=انسان' سے ہی لفظ ''تمنا'' کا انتخاب کیا (دیکھئے، راشد کا نیا شعری مجموعہ۔ لا= انسان'' مطبوعہ 'شعر و حکمت' ن۔م۔ راشد نمبر صفحہ 133) اور اس لفظ یا اس کے نعم البدل الفاظ آرزو، سعی مسلسل وغیرہ کو راشد کی نظموں میں، ان کے تناظر اور فنی پس منظر کے ساتھ تلاش کرنے کے بعد، یہ نتیجہ نکالا کہ ''تمنا'' کی

''یہ سیال کیفیت برگساں کے Elan Vital سے مشابہ ہے'' لیکن پہلا قدم اگر یہ ہے تو شاید غالب کا دوسرا قدم بھی ابھی ''لا'' کے مساوی ہے، کیونکہ غالب اپنے سوال کا خود جواب دیتا بھی ہے تو مایوسی اور ناکامی کے عالم میں۔ ''دشت امکان'' تو صرف ''ایک نقش پا'' ہے اس لئے ''تمنا کا دوسرا قدم'' تو ''امکاں'' کی ممکنات سے بھی کہیں آگے ہے۔ وزیر آغا تیسرے قدم کو ہندو دیوتا وشنو سے مماثل کرتے ہیں کیونکہ اس کے لئے زمان ومکان دونوں کی حدیں ناکافی ہیں۔ جس تناظر میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے لفظ ''تمنا'' یا ''آرزو'' کا Frequency Count کیا ہے؟ وہ اپنی جگہ درست ہے۔ ریسرچ کا یہ ایک بارہا آزمودہ طریق کار ہے، جس کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس مضمون میں، بہر حال ہمارا مقصد الگ ہے اور اپنی آسانی کے لئے یہی سطریں ان کے مضمون سے مستعار لے کر ہم کوشش کریں گے کہ آیا ن م راشد کی یہ سطریں استعارہ سازی کے بہترین نمونے ہیں یا نہیں۔ ہم نے اس مفروضے سے آغاز کیا تھا کہ اصلی استعارہ وہ سمبل ہے، جس میں ایک Object یا Concept کو منہا کر کے اس کی معنی آفرینی صرف اس لفظ یا الفاظ کے مجموعے پر چھوڑ دی جاتی ہے، جس سے مماثلت قاری خود دریافت کر سکے۔ ''تمنا'' کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

1۔ شاد باد اپنی تمناؤں کا بے پایاں الاؤ

2۔ آرزو راہبہ ہے بے کس و تنہا و حزیں

3۔ گرہ در گرہ میں تمنا کے ژولیدہ تار

4۔ یاد ایک وہم سی، یاد تمناؤں کی فریاد سہی

5۔ اور تمناؤں کے واماندہ شجر/ حیرت آسا خامشی میں تن دہی سے اشک ریز

6۔ عہد رفتہ کے بہت خواب تمنا میں ہیں/ اور کچھ وا ہے آئندہ کے

7۔ تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن...

ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ سطور، اور ان میں ''تمنا'' یا ''آرزو'' کی مماثلت جن Object یا Concept سے کی گئی ہے۔ وہ مغرب میں مستعمل استعارہ سازی کے چلن کے مطابق ہے یا نہیں۔ ان سات سطروں میں ''تمنا'' یا ''آرزو'' = مساوی Object یا Concept کس طرح وارد ہوئی ہے؟ آیئے دیکھیں۔ (1) تمناؤں کا بے پایان الاؤ۔ تمنا = الاؤ۔ یعنی دونوں فریقین آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ''تمنا'' بھی ہے اور ''الاؤ'' بھی۔ الاؤ کی صفات البتہ قاری کے تجربے پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ بھڑ کتا ہوا، دھواں دیتا ہوا، بے پایاں یعنی لامحدود آگ کا الاؤ۔ ''تمناؤں'' چونکہ صیغہ جمع ہے، اس لئے الاؤ کا بے پایاں ہونا لازمی ہے۔ یہ ایک بہت خوب صورت امیج پیٹرن Image Pattern ہے، لیکن اس کی خوب صورتی اس میں ہے کہ ''تمنا'' ایک Concept ہے، جبکہ ''الاؤ'' ایک منظر ہے جو Object کے ذیل میں آتا ہے۔ لیکن یہ استعارہ سازی کے ترازو میں پورا نہیں تولا جا سکتا، کیونکہ اس میں ''دونوں'' موجود ہیں۔ اگر ایک کی نفی کر دی جاتی اور صرف اس کی صفات کو پیش کیا جاتا۔ تو یہ صحیح معنی میں استعارہ کہلائے جانے کا حق دار تھا۔ اب ایک دوسرا مصرع لیں اور دیکھیں کہ اس تصویری کا اطلاق اس پر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ''آرزو راہبہ ہے، بے کس و تنہا و حزیں!'' بے حد چابک دستی سے یہ موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ ''راہبہ'' ایک تارک الدنیا خاتون ہے جو عیسائی، یہودی یا ہندو مذاہب میں ایک خاص قسم کی پوشاک میں ملبوس پیش کی جاتی ہے۔ اس راہبہ کی تصویر کشی کے تین پہلو ہیں۔ ''بے کس'' یعنی بے یارو مددگار، جو کہ ایک Concept ہے۔ ''تنہا'' یعنی اکیلی جو تصویر سازی یا فوٹو گرافی میں ایک منظر ہے اور ایک دوسری سطح پر کانسپٹ بھی ہے۔ ''حزیں'' یقیناً اس کے چہرے سے مترشح اداسی کی جھلک بھی پیش کرتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار بھی ہے۔ اب یہ ''راہبہ'' جو ''تارک الدنیا'' ہے، اپنی ان تین کیفیات کے ساتھ مماثل کی گئی ہے، ''آرزو'' کے ساتھ۔ راشد اس مماثلت میں امثال اور تمثال دونوں کو خاطر میں لاتا ہے۔ لیکن چونکہ لفظ ''آرزو'' اپنے متنی تناظر کے ساتھ موجود ہے، اس لئے یہ ''الشاذ کالمعدوم'' کے ذیل میں آ کر راہبہ کے ساتھ اپنی مماثلت کو استمراری بنا دیا ہے۔

راشد کے ہاں ہمیں لاتعداد امیج پیٹرن ایسے بھی ملتے ہیں۔ جن میں ایک لفظ ہی کلید کل ہے اور وہ کنجی پا کر ہی ہم نظم کے صندوق کو کھول سکتے ہیں۔

سمندر کی تہ میں/ سمندر کی سنگین تہ میں/ ہے صندوق/ صندوق میں ایک ڈبیا میں ڈبیا/ میں کتنے معانی کی ٹھمیں/ وہ ٹھمیں کہ جن پر رسالت کے در بند/ اپنی شعاؤں میں جکڑی ہوئی، کتنی سہمی ہوئی!

یہ نظم بعنوان ''سمندر کی تہ میں'' میں نے انگریزی میں ترجمہ کر کے اپنے ایک کورس میں شامل کی۔ اس کی ایک خوب صورتی اور Acceptance اس امر میں تھی کہ اس کی ساری امیجری سمندر سے متعلق ہے اور امریکی طلبا اگر اردو کے کلاسیکی استعاروں ''دشت تنہائی'' (فیض) کو نہیں سمجھ سکتے، تو وہ سمندر سے متعلق امیجری کو سمجھ سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل سطروں کو استعارہ سازی کی سطح پر بے حد سراہا گیا۔

اور اب تک ہے صندوق کے گرد لفظوں کی راتوں کا پہرہ/ وہ لفظوں کی راتیں/ جو دیووں کے، پانی کے لسد ار دیوروں کے مانند/ لفظوں کی راہیں، سمندر کی تہ میں/ تو بستی نہیں ہیں/ اگر اپنے لاریب پہرے کی خاطر/ وہیں رینگتی ہیں/ شب و روز صندوق کے چار سو رینگتی ہیں سمندر کی تہ میں/ بہت سوچتا ہوں/ کبھی یہ معانی کی پاکیزہ صحبوں کی پریاں/ رہائی کے خواہں

جادوگروں کی صدائیں سنیں گی۔

کچھ طلبا نے تھوڑے سے تردد کے بعد نظم کو بخوبی کھنگال کر رکھ دیا۔ ایک طالبہ نے لکھا، "سمندر تو شاعر کی کاوش، یعنی یہ نظم ہے اور اس نظم کے معانی، جادوگروں کی پرانی لوک کہانیوں کی طرح وہ موتی ہے، جو ایک ڈبیا کے اندر دوسری ڈبیا اور اس کے اندر تیسری ڈبیا میں بند ہیں۔ یہ ڈبیا ایک مقفل صندوق کے اندر رکھ کر اسے سمندر میں ڈبو دیا گیا ہے۔ معانی کی صبحیں طلوع ہوتی ہیں، لیکن سورج کی کرنیں سمندر کی تہ تک نہیں پہنچ پاتیں۔ موتیوں کی اپنی شعائیں ہیں یعنی معانی آشکارہ ہیں۔ لیکن صندوق میں ڈبیا اور ڈبیا میں موتیوں کی طرح بند ہیں۔" "چنانکہ وہ صبحیں کہ جن پر رسالت کی در بند" ایک یا دو طالب علموں کو ایک دوسرے تناظر میں ایک مذہبی استعارے کی طرح معلوم ہوئیں (میرا انگریزی ترجمہ شاید خود میں خام تھا؟ The morns on which prophethood had shut its doors[1] عام طور پر سبھی طلبا سمندر کی تہ کے اندر "لفظوں کی راتیں"، ان کا سمندر کی تہ میں "اپنے لاریب پہرے کی خاطر" رینگنا (کیکڑوں کی مانند Unsaid ہے اور استعارے کا ایک خوب صورت پہلو ہے) بخوبی سمجھ پائے اور جوں ہی ان لفظوں کی راتوں کو "معانی کی پاکیزہ پریاں" کہا گیا اور پری کہانیوں کی طرح سمندر کی تہ میں مقید ایک پری کی رہائی کے لئے کسی غواص جادوگر کا اشارہ دیا گیا، پوری نظم کا منشا و مطلب عیاں ہو گیا۔ غالب کو شکایت تھی "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" اور بھلا کر یہ کہنا بھی غالب کی شان قلندرانہ تھی "گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی!" لیکن راشد کو یقین تھا کہ کوئی غواص جادوگر اس کی نظموں میں استعارہ سازی کے سمندر کو کھنگالتا ہوا وہاں تک ضرور پہنچے گا جہاں معنی کی پریاں مقید ہیں۔ تب تک معنی کی پریوں کا مقید رہنا ان کا نصیب ہے۔

اس مضمون کا آغاز شیکسپیئر کے "میک بیتھ" سے ہوا تھا اور میک بیتھ کی Soliloquy (خود کلامی) میں مندرجہ Object اور Concept سے، جن کا موازنہ اور مقابلہ زندگی سے کیا جاتا ہے، ہم نے یہ اخذ کیا تھا کہ استعارے کی صحیح حالت وہ ہے، جب اس موازنے یا مقابلے میں سے ایک فریق کے اصلی نام کو خارج کر دیا جائے اور حتے الوسع صرف اس کی وہ صفات ہی رہ جائیں، جو دوسرے فریق کے مد مقابل رکھی جا سکتی ہیں۔ مبادا کہ اس سے یہ فرض کر لیا جائے کہ استعارہ سازی ایک میکانکی عمل ہے اور یہ ایک تیر بہدف فارمولہ ہے؟ جو میں بیان کر رہا ہوں۔ شاعر کی ذہنی سطح پر تغیر و تبدل کے عمل میں ہچکولے کھاتے ہوئے دونوں امیج (کانسپٹ یا آبجیکٹ) ایک ساتھ وارد ہوتے ہیں اور خلق ہونے کے پراسس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا، چپٹے ہوئے، چمٹے ہوئے، اس طرح نظم میں گتھے، بندھے جاتے ہیں کہ اپنی جڑواں اشکال میں الگ الگ نہیں، ایک جیسے بھی نہیں بلکہ Two-in-one سے نظر آتے ہیں۔ اور ایسے اضافی الفاظ جیسے "جس طرح" وغیرہ خارج از امکان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہر شاعر کے ہاں طریق کار اس کی اپنی انفرادیت کے مطابق ہوتا ہے، اور ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ اگر ایک کو ایک سے جوڑ کر دو بنیں، اور دو + دو ہمیشہ چار ہی بن پائیں، تو یہ حساب کا قاعدہ ٹھہرے گا۔ استعارہ سازی کا عمل نہیں۔ راشد کے ہم عصر شعرا میں میرا جی ایک بڑا نام ہے اور اس کی کچھ نظمیں استعارے کو اسی طرح بروئے کار لاتی ہیں، جیسے ن م راشد، لیکن میرا جی مشاہدے کا شاعر ہے، مطالعے کا نہیں۔ کچھ شاعر جو ترقی پسند تحریک میں رومان پروری سے آگے نہیں بڑھے۔ خال خال ہی استعارہ سازی کی اس سطح تک پہنچتے ہیں، جس تک راشد بہت پہلے پہنچ چکا تھا۔ (تاریک راہوں میں مارا جانا اور دار کی خشک ٹہنی پر وارا جانا اچھے امیج ہیں اور قرون وسطےٰ کی یاد دلاتے ہیں، لیکن یہ استعارہ سازی کا بہترین نمونہ نہیں ہیں) جن لوگوں نے راشد کے اس چلن کو اپنایا، ان میں مجید امجد، قیوم نظر اور کسی حد تک اختر الایمان کے نام ہیں۔

فی زمانہ جو سب سے بڑا نام ہمیں ملتا ہے، وہ وزیر آغا کا ہے۔ بلراج کومل ایک اہم شاعر ہیں۔ راقم الحروف بھی کسی مقام کا اہل ہے، یا نہیں، یہ تاریخ بتائے گی۔ گلزار، علی محمد فرشی اور رفیق سندیلوی کچھ اور نام ہیں، جو اپنی کارکردگی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

وزیر آغا کا طریق کار منفرد ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں نسبتاً مختصر ہیں اور چھوٹی چھوٹی سطروں کی تراش سے بھانت بھانت آپس میں پیوستہ ہوتی ہوئی، آگے بڑھتی ہیں۔ ایک مرکزی استعارہ پوری نظم کا احاطہ کرتا ہے یا پوری نظم کے دل کی صورت میں وسط میں بیٹھا ہوا دھڑکتا ہے۔ جیسے سائیکل کا رواں دواں پہیہ ہو اور بیچ کی دھری سے درجنوں Spokes یعنی تاریں اس سے نکل کر امیجز کی شکل میں اسے قائم بھی رکھے ہوئے ہوں اور اس عمل میں اسے تقویت بھی دے رہی ہوں۔ وزیر آغا اس حقیقت کو پہنچانتے ہیں کہ امیج پیٹرن خود میں 'کل' نہیں ہے، وہ صرف بنیادی استعارے کو کچھ مبہم کچھ واضح کرنے کا، اس کی نوک پلک سنوارنے کا یا اس میں رنگ بھرنے کا عمل ہے۔ 'اک بھاری آواز' اس طرح ہے۔

اک بھاری آواز بجھی ہے/ پہلے دن سے آخری دن تک/ اک بھاری آواز/ بجھی ہے/ جس کا کوئی انگ نہیں ہے/ جس کا کوئی انت نہیں ہے/ عمریں گزریں/ اس بھاری آواز کے تن سے/ چھوٹی چھوٹی نرم صبائیں/ انکھوؤں کی صورت پھوٹی تھیں/ انگاروں پر ثبت ہوئی تھیں/ کتنی شکلوں، کتنی لہروں/ کتنے شیریں ہونٹوں کی چہکار بنی تھیں/ کسے خبر تھی، ایسا بھی اک دن

آئے گا/ یہ بھاری آواز ہمیں جب/ پھر سے ابد کی آخری حد تک
بجھی ملے گی

(میں نے اس نظم کی آخری چار سطریں بحث کی سہولت کے لئے چھوڑ دی ہیں)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ "کن فکاں" کہے بغیر کیسے شاعر نے تخلیق کائنات یا دنیا کی ابتدا کے پہلے لمحے کو شعر کی صورت باندھ لیا ہے۔ "ایک بھاری آواز" ہے، جو "بجھی" ہوئی ہے۔ شاعر یہ کہنے کے بعد پھر دہراتا ہے، "ایک بھاری آواز بجھی ہے" لیکن سب سے اہم سطر "پہلے دن سے آخر دن تک" ہے۔ "کن فکاں" کی ہمیشگی اور ہمہ تسلسل اس سطر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ "کن" کی آفاقی صدا صرف ایک بار معرض وجود میں آکر خاموش نہیں ہوئی، اس کی اصوات پے بہ پے، سلسلہ در سلسلہ ہیں۔ سورج پیدا ہوتے ہیں، سورج مرتے ہیں۔ آفاق جاری وساری رہتا ہے۔ اب اس مرکزی استعارے سے زندگی کے وہ امیج (سائیکل کے پہیے کی تاروں کی طرح) پھوٹتے ہیں۔ جو اس زندگی سے متعلق ہیں، جسے ہم جانتے ہیں۔ پودوں میں انکھوؤں کا پھوٹنا، پرندوں کی چونچوں سے نرم صدائیں نکلنا، انسانوں کی شکلوں، ہونٹوں کی چہکار بنناسب امیج ہیں، کانسیپٹ نہیں ہیں، اور پھر آخری سطریں جو ایک لمحہ فکریہ دیتی ہیں۔ "کسے خبر تھی" اس کی شروعات ہے اور لمحہ فکریہ یہ ہے کہ یہ بھاری آواز جو کبھی جاگی تھی۔ اب ابد کی آخری حد تک بجھی ہوئی ملے ہوئی۔ کیا یہ بجھی ہوئی صدائے شروع ہستی پھر ایک بار جاگے گی، یہ قاری کی فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

گلزار کی ایک نظم "شاعر" اس طرح شروع ہوتی ہے۔

وہ پل کی ساتویں سیڑھی پہ بیٹھا کہتا رہتا تھا/ کسی تھیلے میں بھر
کے گر خیال اپنے/ میں دروازے پہ ہر کارے کی صورت جاکے
پہنچاتا/ چمکتی بوندیں بارش کی کسی کی جیب میں بھر کے/ گلے میں
بادلوں کا ایک مظر ڈال کر آتا/ وہ بھیگا بھیگا سا رہتا/ کسی کے کان میں
وہ بالیوں سے چاند پہناتا/ مچھیروں کی کوئی لڑکی اگر ملتی/ گرجتے
بادلوں کو باندھ کے بالوں کے جوڑے میں/ دھنک کی "بینی" دے
آتا.../ مجھے گر کہکشاں کو بانٹنے کا حق دیا ہوتا خدا نے، تو

نظم کا عنوان "شاعر" ہے، اس طرح گلزار نے قارئین کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ یعنی "وہ" کون ہے، اس سوال کا جواب قاری عنوان پڑھتے ہی دے سکتا ہے۔ "وہ" کا مسئلہ حل ہونے کے بعد "پل کے ساتویں منزل" کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ بمبئی میں اور کچھ دیگر بڑے شہروں میں بے گھر یا بھکاری لوگ ریلوے پلوں پر بیٹھتے ہیں۔ ساتویں سیڑھی میں ساتویں (یعنی کوئی اور نہیں، بلکہ ساتویں) سیڑھی سے اس کی جائے نشست کے مستقل ہونے کی گواہی دی گئی ہے۔ "کہتا رہتا تھا" سائیکل کے پہیے کی پہلی Spoke کی طرح ہے جو ہمیں مرکزی استعارے، یعنی پہیے کی دھری تک لے جائے گی۔ شعر کہا جاتا ہے، غزل کہی جاتی ہے، اس لئے کہتا رہتا تھا، ایک ذو معنی فعل ہو گیا۔ اب استعارے کے پہیے کی دوسری Spokes پھوٹتی ہیں۔ اپنے خیالوں کو تھیلے میں بھرنا اور ڈاکیے کی طرح گھر گھر پہنچانا۔ اس سطر میں لفظ "خط" یا "چٹھی" نہیں ہے، اس لئے مماثلت میں سے بخوبی ایک Object کو منہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد امیجز کی ایک قطار ہے، جو یکے بعد دیگر وارد ہوتے ہیں۔ "چمکتی بوندیں بارش کی کسی کی جیب میں بھر کے" کون سی چمکتی ہوئی شے حفاظت سے جیب میں رکھی جاتی ہے؟ جواب ملے گا، سکے! چاندی کے یا سونے کے! بارش اپنے آپ میں اللہ کا کرم ہے، اس لئے مرکزی استعارے کو تقویت دیتا ہوا یہ امیج بھی مماثلت کی سطح پر لفظ "سکے" یا "دولت" کو بیچ میں نہ لاتا ہوا اپنا فرض منصبی ادا کر گیا اسی طرح "گلے میں بادلوں کا منظر" "کان میں بالیوں سے چاند پہنانا" "مچھیروں کی کسی لڑکی کے بالوں کے لئے گرجتے بادلوں میں سے دھنک کو نکال کے بینی دے آنا۔ یہ سبھی وہ امیجز ہیں، جو آسمان سے (بارش، بادل، چاند، دھنک) رشتہ رکھتے ہیں۔ مرکزی استعارے کے لئے ہمیں اب نظم کی اس سطر کو دیکھنا پڑے گا، جو Punch line کی طرح کھٹاک سے وارد ہوتی ہے۔ "مجھے گر کہکشاں کو بانٹنے کا حق دیا ہوتا خدا نے، تو..." اب یہ بات قاری کی فہم پر چھوڑ دی گئی ہے کہ شاعر یہ حق خدا سے ملنے کی صرف تمنا کر سکتا ہے، اپنے جیسے دوسرے بے گھر لوگوں کو دو روٹیاں اور سالن کی ایک کٹوری مہیا نہیں کر سکتا۔ لیکن "کہکشاں" کی چمک دمک، دوبارہ، بغیر کہے ہوئے سونے چاندی کے سکوں یعنی دولت کی طرف قاری کی توجہ کا رخ پھیر دیتی ہے۔ اس طرح مرکزی استعارے کا پہیہ اپنی رواں دواں Spokes کے بل پر چلتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ گلزار کی لگ بھگ سبھی نظمیں اس طریق کار کی شاہد ہیں۔ ان کے شعری مجموعہ "رات پشمینے کی" میں مشمولہ "خالی سمندر" "سبز لمحے" "توبہ ٹیک سنگھ" "بدھ" اور کئی دیگر نظمیں امیجز کو ایک لڑی کی طرح پروتی جاتی ہیں۔ یہ امیجز حواس خمسہ کی کئی قوتوں اور قدرتوں کو یک جا کرتے ہوئے مرکزی استعارے میں گھلتے چلے جاتے ہیں۔

بلراج کومل وزیر آغا کے بعد کے شاعروں کی پود میں ایک بلند قامت شاعر ہیں، اور وہ بے حد چابک دستی سے امیجز کو استعمال میں لاتے ہوئے ایک مرکزی استعارے کی صورت گری کرتے ہیں۔ میں نے ان کی لگ بھگ یک صد نظمیں دیکھنے کے بعد ایک دلچسپ امر کو دریافت کیا۔ وہ مرکزی استعارے کو اپنی بیش تر نظموں کے شروع میں ہی ایک خام خاکے کی شکل میں ابھارتے ہیں اور پھر چلتے، آگے بڑھتے ہوئے، سطر بہ سطر اس میں

نئی لکیریں کشید کرتے ہیں اور رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی ایک تازہ ترین نظم "گریزاں روشنی کی ہم سفر آنکھیں" (مطبوعہ "اوراق" نومبر دسمبر 2005) میں یہ طریق کار بہت نمایاں ہے۔ شروع کی سطریں جو ایک بند کی صورت میں ہیں یہ ہیں۔

سفر ہے دور کا، لیکن/ سنا ہے رہ گزر اونچے، گھنے، سرسبز، سایہ دار پیڑوں کی/ حسیں سرگوشیوں کے درمیان سے عالمِ وارفتگی میں/ رقص کے انداز میں اٹھلا کے مستی سے نکلتی ہے/ سنا ہے، انتہائے گام پر ہر راہرو کی منتظر ہے/ اک شگفتہ منزلِ روشن!

مرکزی استعارہ تو زندگی کے سفر کا ہے، اور یہ سچائی ہر اس قاری پر عیاں ہونے میں دیر نہیں لگتی، جس نے اس کو اردو شاعری میں (خصوصی طور پر صنفِ غزل میں) دیکھا ہے اور پہچانا ہے۔ زاویے اور قوسیں جوڑتے جاتے ہیں اور رنگ بھرتے چلے جاتے ہیں۔ سفر دور کا ہے۔ "دور" سے کچھ شبہات جو ابھرتے ہیں، ان کا سدِ باب "لیکن" فوری طور پر کر دیتا ہے۔ "سفر" کے ساتھ "رہ گزر" کا ذکر آنا تو ناگزیر ہے۔ سنا ہے سے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی یا یقین اور گمان کا ملا جلا تاثر ابھرتا ہے کیونکہ ہر سنی ہوئی بات سچ نہیں ہوتی۔ رہ گزر کے بارے میں تین سطریں اس کو Personify کر دیتی ہیں۔ یہ "عالمِ وارفتگی میں" "رقص کے انداز میں" "اٹھلا کے" "مستی" سے نکلتی ہے۔ قاری کے ذہن میں فوری طور پر ایک الہڑ حسینہ کا تصور آتا ہے۔ (واضح رہے کہ لفظ "حسینہ" موجود نہیں ہے) اب رہ گزر کے دائیں بائیں دیکھیں۔ پیڑ "اونچے" ہیں، "گھنے" ہیں، "سرسبز ہیں" "سایہ دار" ہیں۔ چار رنگ تو اسی سطر میں ہیں جو اس امیج میں بھرے گئے۔ یہ پیڑ بھی Personified ہیں، کیونکہ یہ رہ گزر کے ساتھ "حسیں سرگوشیاں" کرتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہیں۔ یہیں رک جاؤ۔ ہمارے سائے میں آرام کرو۔ "حسیں سرگوشیاں" خود میں ایک مخلوط خاکہ ہے۔ "حسیں" قوتِ باصرہ کو متوجہ کرتا ہے، "سرگوشیاں" قوتِ سامعہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اس نظم کے باقی ماندہ حصے کی تفصیل اس طرح ہے۔ دوسرے بند میں نظم کا شعری کردار جو یہاں 'میں' کی صورت میں واحد متکلم ہے، کہتا ہے کہ جب میں سفر پر نکلا تھا تو میری رہ گزر بھی ایسی ہی تھی، جیسے کہ "اجنبی راوی نے اپنے پُرکشش انداز میں مجھ کو بتایا تھا" (یاد کیجیے، پہلے بند میں "سنا ہے") میں اس پر چلتا ہوا" آ پہنچا ہوں ایسے موڑ پر" جہاں" اک عجب ان دیکھا منظر ہے۔" یہ منظر کیا ہے؟ "گڑے ہیں رہ گزر پہ دھڑ ہزاروں اور لاکھوں" "مرد و زن" پیر و جواں، طفلان غنچہ رو"۔ رہ گزر پر ہی اس خلقت کا گڑا ہونا جو نظم کے شعری کردار کی طرح اس سے پہلے سفر پر گامزن ہوئی تھی، مرکزی استعارے میں دوسری ہمہ جہت کڑی جوڑتا ہے، جو زمان و مکان کے بدلنے سے معرضِ وجود میں آئی ہے۔ آغازِ سفر میں رہرو کا لڑکپن تھا شروعِ جوانی کی اٹھان تھی، ولولے تھے، ہمت مردانہ تھی۔ رہ گزر بھی اس کی ذہنی کیفیت کے بیرونی ثانوی امیج کی طرح تھی۔ اب زوالِ عمر میں نہ تو رہ گزر رہی وہی ہے اور نہ ہی وہ مسافر جو اس سے پہلے سفر پر نکلے تھے۔ ان ہی پیش رو رہروؤں کی طرح واحد متکلم بھی محسوس کرتا ہے کہ "میں دھنستا جا رہا ہوں رفتہ رفتہ رہ گزر کی خاک میں/ اب صرف میرے جسم کا اوپر کا دھڑ باقی ہے/ اور آنکھیں/ گریزاں روشنی کی ہم سفر آنکھیں" ظاہر یہ ہوا ہے کہ جہاں پہلے" اک شگفتہ منزلِ روشن تھی" جو "انتہائے گام پر ہر رہرو کی منتظر تھی" اب "گریزاں" ہے۔ پسپا ہو گئی ہے۔ جو باقی رہا ہے، وہ واحد متکلم کی آنکھیں ہیں، جو روشنی کی ہم سفر تھیں، اور اوپر والے دھڑ کے دھنسنے کے ساتھ خود بھی دھنس جائیں گی۔ اس طرح نظم کا عنوان بھی مرکزی استعارے سے ہی مستعار ہے۔

گزشتہ صدی کی ستر کی دہائی میں استعارے امیج اور سمبل کا زادِ راہ لے کر اردو شاعری کے قافلے میں شامل ہونے والا ایک نسبتاً نیا شاعر علی محمد فرشی ہے۔ فرشی کا انداز سب سے جداگانہ ہے۔ 1991 کے لگ بھگ جب میں نے فرشی، نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی، اقتدار جاوید اور کچھ دیگر شعرا کی نظمیں پڑھیں تو ایک مضمون میں ان کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ "امیجسٹ اسکول آف اردو پوئٹری" ہے۔ بعد میں وضاحت کے طور پر میں نے یہ بھی کہا کہ انگریزی میں ایذرا پاؤنڈ اور لوئی میک نیس کی طرح اردو میں یہ امیجسٹ اسکول کی پہلی قطار ہے۔ انگریزی ادب میں بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں وارد ہونے والے شاعر بھی یہی زادِ راہ لے کر چلے تھے۔ لیکن ان کے ہاں قطار اندر قطار امیجز کی ایک فوج چلتے ہوئے بھی وہ کسی مرکزی استعارے سے پیوست نہیں ہوتے تھے (یہ کمی بعد میں ٹی ایس ایلیٹ کے آنے کے بعد پوری ہوئی) میرا دیا ہوا نام اس نسل اور اس عمر کے شاعروں کے ساتھ اب کچھ ایسا چپک گیا ہے کہ انہیں "راولپنڈی اسکول آف امیجسٹ پوئٹری" کہا جانے لگا ہے۔ خیر، یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ علی محمد فرشی کی نظموں میں شیرینی گھلی ہوئی ہے۔ کڑوے، زہریلے، بدصورت امیج بھی لہجے کی شیرینی سے ترتیب پاتے ہیں۔ آیئے۔ فرشی کی ایک نظم کو لیں اور دیکھیں کہ اس کا طریق کار کیا ہے۔ بلراج کومل کی نظم میں مرکزی استعارہ سفر کا تھا، اور یہ شروع میں ہی ظہور پذیر ہو گیا تھا۔ فرشی کا ڈھنگ جداگانہ اس طرح ہے کہ وہ معصومیت اور سادگی سے اپنے امیج ابھارتا ہے، اور پھر جب Punch Line تک پہنچتا ہے، تو ان امیجز کی ایک لمبی قطار ہاتھوں میں ہاتھ دیئے "پنچ لائن" کے پیچھے چلتی نظر آتی ہے۔ مغرب میں اس تکنیک کو Sting in the tail کہا گیا ہے، جیسے بچھو کا ڈنک اس کی دم میں ہوتا ہے،

اور سر سے لے کر دم تک اس کا جسم بے ضرر ہوتا ہے۔ آیئے نظم دیکھیں۔

تماشا گروں نے/ کبوتر نکالے تھے/ شیشے کے خالی کنستر سے/ ماچس کی تیلی سے بجلی کا کھمبا بنایا تھا/ رسی پہ چلتی ہوئی ایک لڑکی/ ہوا میں اڑائی تھی/ بندر کے اندر سے/ انسانی بچہ نکالا تھا/ سب لوگ حیران تھے/ کیسے جادوگروں نے/ پرندے کو راکٹ بنایا/ پتنگے کی دم سے ستمگر نکالا/ طلسماتی ہاتھوں سے/ گیندوں کی مانند ایٹم بموں کو اچھالا/ تماشائی حیران تھے/ کیسے جادوگروں نے/ زمیں/ راکھ کی ایک مٹھی میں تبدیل کر دی!

دو الفاظ اہم ترین ہیں۔ ایک پہلے بند میں ہے۔ "تماشا گر" اور ایک آخری بند میں ہے "تماشائی"۔ استعارے کی روح ان دونوں میں مضمر ہوئی ہے۔ مداری یعنی تماشا گر (جنہیں مغرب میں، خصوصی طور پر امریکا میں Illusionist نے کہا جاتا ہے) اپنے کھیل دکھا رہے ہیں۔ توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ "تماشا گروں" صیغۂ جمع ہے، یعنی مداری ایک نہیں ہے، کئی ہیں۔ "سب لوگ حیران تھے" تین امیجز کے بعد آتا ہے۔ یہ تین امیج "شیشے کے کنستر سے کبوتر نکالنا، ماچس کی تیلی سے بجلی کا کھمبا بنانا، رسی پہ چلتی ہوئی لڑکی کو ہوا میں اڑانا، اور بندر کے اندر سے انسانی بچہ نکالنا ہیں۔ یہ سب امیج عام مداری کے ہیں۔ لیکن استعارے کی سطح پر یہ سائنس کے وہ کرشمے جو نصف صدی پہلے تک خواب و خیال تھے۔ اب امیجز زمین سے ہوا، خلا یعنی آسمان کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ "تماشا گروں" کی جگہ اب "جادوگروں" نے لے لی ہے، جو طلسمات کے ماہر ہیں، صرف مداری نہیں ہیں۔ "پرندے کو راکٹ بنایا" پتنگے کی دم سے اس کا ڈنک نکالا، اور پھر ایٹم بموں کو گیندوں کی مانند اچھالا۔ یہ ہیں وہ امیج جو درجہ بدرجہ اپنی ہیئت اور کارکردگی میں ایک معصوم تماشے کو بے حد پر خطر تباہی کی طرف لے جانے کا اعلامیہ ہیں۔ آخری بند اس "پنچ لائن" کو پیش کرتا ہے "کیسے جادوگروں نے/ زمیں/ راکھ کی ایک مٹھی میں تبدیل کر دی" شاعر کی قدرت اس میں ہے کہ اس نے سائنس داں یا سیاست داں استعمال کیے بغیر ان سب امیجز کی مدد سے مرکزی استعارے کی صورت گری مکمل کر لی۔ "تماشائی" کون ہیں۔ اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہے اور جواز بھی نہیں ہے۔ زمیں تو راکھ کی مٹھی میں تبدیل ہو گئی۔ لوگ تو سب مر گئے، زمین پر زندگی ختم ہو گئی تو کیا یہ تماشائی دوسری دنیاؤں پر رہنے والی وہ مخلوق ہے، جو ہمیں اور ہماری بد کرداریوں کو اندیشے کی نظر سے دیکھ رہی ہے؟ لیکن یہ مطلب اخذ کرنے میں نظم کا قاری بھی اتنا ہی شریک ہے۔ جتنا کہ شاعر ہے۔

The image acts an consciousness and also makes consciousness react the image is in the eye of the beholder, meant for beholding the universe, and the beholder is not an investigator, but a participator. Hebb, 1968

Hebb کے فرمودات کا اطلاق، Beholder یعنی "دیکھنے والا شخص" کہنے کے باوجود، قاری پر جس قدر ہوتا ہے، اتنا سامع پر نہیں ہوتا۔ مغرب میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شاعری کتاب یا رسالے میں پڑھی جاتی ہے، محفل یا مشاعرے میں سنی نہیں جاتی اور اگر مشرق کے تناظر میں یہ روا رکھا جائے تو قاری اور سامع میں تمیز کرنا ضروری ہو جائے گا۔ اس حالت میں سامع سے کہیں زیادہ قاری کی شرکت ضروری ہے۔

OO

اپنے طور پر بجنسہٖ انگریزی روپ میں اس مضمون کا پہلا حصہ، انگریزی (خصوصی طور پر امریکی شاعری) سے ماخوذ مثالوں کے ساتھ، راقم الحروف نے ایک پوئٹری ورکشاپ میں استعمال کیا۔ یہ ورکشاپ نیویارک اسٹیٹ کی کلچرل کونسل کی سرپرستی میں شہر ولنگٹن میں منعقد ہوئی۔ شرکا میں انگریزی شاعر، کالجوں کے اساتذہ اور کچھ دیگر سند یافتہ بھی تھے۔ راقم الحروف کی پذیرائی بطور Resource Person اعلیٰ ترین سطح پر کی گئی۔ شہر ولنگٹن کے Mayor کی جانب سے سپاس نامے کے علاوہ شہر کی چابی Key of the town سونپی گئی اور معقول معاوضہ پیش کیا گیا۔ (س پ ا)

Select Bibliography

1. Ahsen, Akhtar, *Image Therapy*. Journal of Mental Imagery. 1980
2. Ahsen, Akhtar, *Odysseus and Oedipus Rex: An Essay on Current Image Psychology and the Literary Techniques of Consciousness*. Keynote Address. 5th American Conference. New York City. Nov.1987.
3. Ahesn, Akhtar. *Principles of Imagery in Psychology, Art and Literature*. Brandon House. New York.1987.
5. Hebb. D.O. *Concerning Imagery*. Psychological Review. 1968.
6. Frank, Joseph. *Spatial Forms* in Modern Literature, Sewanee Review. 1945. p.53.
7. Marks. David F. *Signal Detection Theory Applied to Imagery and State of Consciousness*. International Imagery Bulletin. 1983
8. Marks. David F. ed. *Theories of Image Formation*. Brandon House N.Y. 1986
9. Piaget, J., & Inhelder, B. *Mental Imagery in the child*. London: Routlege & Kegan Paul 1971

اردو کنایات میں ان شعرائے کرام کے شعری مجموعے شامل ہیں، جن کی منظومات بحث کا حصہ ہیں۔ اس لیے ان کی تفصیل ضروری نہیں سمجھی گئی۔ (س پ ا)

محاکمۂ نسائیات

تانیثیت اور جدید اردو نظم

ناصر عباس نیّر

تانیثیت محض ادبی متون ہی نہیں، پوری انسانی تاریخ اور جملہ ثقافتی مظاہر کے مطالعے کا نیا تناظر فراہم کرتی ہے۔ یہ نیا تناظر دراصل وہ نئے سوالات ہیں، جنھیں حقوقِ نسواں، آزادیٔ نسواں کی تحریکوں اور تانیثی تھیوری نے گزشتہ صدی میں تشکیل دیا ہے۔ گویا تانیثیت محض ایک ادبی تھیوری نہیں ہے۔ اُس کی نہج اور دائرہ کار دونوں عورتوں کی آزادی اور حقوق کی سیاسی وسماجی تحریکوں سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ چناں چہ یہ سوال بھی اُٹھایا گیا ہے کہ تانیثیت کو ادبی تھیوری کے طور پر لینا کہاں تک صائب ہے؟ تانیثیت ادبی متون کی جمالیاتی قدر سے کوئی سروکار نہیں رکھتی۔ یہ متن کے موضوع کا مطالعہ اپنے مخصوص تناظر میں کرتی ہے۔ مذکورہ سوال کے عقب میں یہ مفروضہ موجود ہے کہ ادبی تھیوری موضوع کے بجائے ہیئت کو معرضِ تجزیہ میں لاتی ہے اور ہیئت (اپنے مکمل اصطلاحی مفہوم میں) ہی متن کی جمالیاتی تشکیل کی ضامن ہے۔ اگر ادبی تھیوری کے استناد وعدم استناد کی بنیاد یہی مفروضہ بنایا جائے تو پھر نفسیاتی، عمرانیاتی، مارکسی، ساختیاتی اور نئی تاریخیت کے مکاتب، سب کالعدم ہو جائیں گے۔

اصل یہ ہے کہ ہر تھیوری کا ایک نظری فریم ورک ہوتا ہے، جس کے اندر وہ تھیوری متن سے اعتنا کرتی ہے اور یہ فریم ورک متن کے بعض گوشوں کے مخصوص انداز میں تجزیے کی اجازت دیتا ہے اور بعض پہلوؤں تک رسائی سے قاصر ہوتا ہے۔ کسی تھیوری کی اہمیت کا مدار فقط اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ متن کے جن گوشوں کا تجزیہ کر رہی ہے، وہ متن کے کلی تناظر میں کتنے اہم اور بامعنی ہیں اور ان کا تجزیہ اس متن کے سلسلے میں بالخصوص اور پورے ادبی نظام سے متعلق بالعموم کسی نئی دریافت کو سامنے لا رہا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی تھیوری ان دو حوالوں سے کارگر ہے تو پھر اس سے متن کی جمالیاتی قدر سے بے اعتنائی کا گلہ بے جا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جمالیاتی قدر تنقیدی تجزیے میں غیر اہم ہے۔ وہ بے شبہ اہم ہے، مگر اسے ہر ادبی تھیوری میں ڈھونڈنا مناسب نہیں۔ اس کا تقاضا نقاد سے ہونا چاہیے کہ وہ جب کسی متن کو تجزیے کی غرض سے منتخب کرتا ہے تو اس کے انتخاب کی بنیاد جمالیاتی قدر ہو۔

یہ بات بہ ہر حال طے ہے کہ تانیثی تنقیدی تھیوری نسائیت کی سیاسی و سماجی تحریکوں سے منسلک و متاثر ہے۔ ہر چند ادبی متون کے مطالعے کے بعض طریقے اس نے معاصر تھیوری (تحلیل نفسی، ڈی کنسٹرکشن، نومارکسیت) سے مستعار لیے ہیں، مگر وہ خود کو تھیوری کا حصہ گرداننے سے انکار کرتی ہے اور اپنی 'نسائی انفرادیت' کو تسلیم کرانے پر مُصر نظر آتی ہے۔ نیز وہ دعویٰ کرتی ہے کہ اُس نے ادبی تاریخ اور ادبی متون کا مطالعہ نئے سوالات کی روشنی میں کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نئے سوالات کیا ہیں؟

تانیثیت کے مطابق نئے سوالات میں دو اہم ہیں:

(الف) کیا غائب ہے؟

(ب) جو موجود ہے، اس کی نوعیت، مفہوم اور مقصد کیا ہے؟

پہلے سوال کی رُو سے تانیثیت جب تاریخ، ثقافت اور پرانے متون کا مطالعہ کرتی ہے تو اُسے عورت غائب معلوم ہوتی ہے۔ عورت غائب کیوں ہے؟ کیا اس لیے کہ اس نے تاریخ وثقافت کی تشکیل میں حصہ نہیں لیا؟ تانیثی مفکرین یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ان کا موقف ہے کہ عورت مرد کے ساتھ ازل سے موجود ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ:

"انسان کی اتنی لمبی تاریخ میں عورت تخلیق کرنے کی اہل نہیں رہی"[1]

اگر عورت تخلیق کی اہل ہے اور اس نے تاریخی وثقافتی تشکیلات میں حصہ بھی لیا ہے تو اس کے باوجود وہ تاریخی بیانیوں میں کیوں غائب ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اُسے دانستہ تاریخ سے باہر رکھا گیا ہے۔ مگر کیوں؟ کیا اس لیے کہ تاریخی عمل میں اس کا حصہ معمولی تھا، یا اس لیے کہ وہ مرد کے حصے سے مختلف تھا؟ نسائی مفکروں کا خیال ہے کہ جب عورت کو تاریخی عمل میں مساوی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں تھی تو اس نے اپنی

تخلیقیت کا اظہار مختلف پیرائے میں کیا۔ سلیمہ ہاشمی اور سمیہ درانی عورت کے تخلیقی اظہار کے پیرائے کو محسوسات سے عبارت قرار دیتی ہیں[2]۔ یہ پیرایہ دست کاری اور دوسرے روایتی (؟) فنون میں ظاہر ہوا ہے۔ گویا عورت نے مرد کے متوازی فنون ایجاد و اختیار کیے اور اس طرح ثقافت کی تشکیل و ترقی میں اپنا حصہ ڈالا۔ عورت کے تخلیقی پیرائے کو محسوسات سے مشخص کرنے کا جواز؟ ڈی ایچ لارنس نے مرد کی کارکردگی کو عقل اور عورت کے تمام اعمال کو جذبے سے منسوب کیا تھا۔

تانیثی مفکرین کا اس تفریق کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے تسلیم کرلیا ہے کہ فلسفہ و سائنس پر مرد کی اجارہ داری ہے اور عورت ان کی فطرتاً اہل نہیں۔ عورت فقط شاعری اور دست کاری کے فنون کی طبعاً اہل ہے۔ یہ نقطہ نظر تو تانیثیت کے مرکزی دا عیے (کہ انسانی پیمانے پر دونوں مساوی ہیں) کے خلاف ہے۔ اصل یہ ہے کہ عقل اور جذبے پر ہر دو اصناف کی اجارہ داری کا تصور ایک تاریخی تشکیل ہے۔ اوّل اس کا تعلق مرد کے تفوق کو عورت پر قایم رکھنے کی حکمت عملی سے ہے۔ دوم اگر ایک تاریخی دور میں عورت کے اظہار پر جذباتی عناصر کا غلبہ ہوا ہے تو اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ تب عورت کی ذات کے فقط جذباتی پہلو کے اظہار کی اجازت اور گنجایش تھی۔ اسے ثقافتی نظام میں جو کردار سونپا گیا اور جسے نباہے جانے پر اسے برابر مجبور رکھا گیا، وہ 'خانگی' تھا 'سماجی' نہیں تھا۔ اس حقیقت کے بیان میں میری اپنے فرگوسن نے کہا ہے کہ:

''مرد کو تو پوری دُنیا فطرت، سماج حتیٰ کہ خدا کے ساتھ رشتے کی رُو سے پیش کیا گیا ہے، مگر عورت کا تصور مرد کے ساتھ تعلق کی رُو سے کیا گیا ہے''[3]۔

اور جب عورت کی دُنیا فقط مرد تک اور اس کے ساتھ جذباتی و جنسی تعلق تک محدود ہو تو وہ جذبات کا اظہار نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی!

تانیثیت اپنے مطالعے کی بنیاد جس دوسرے سوال پر رکھتی ہے، وہ ہے: تاریخی بیانیوں اور ادبی متون میں عورت کی کیا تصویر پیش کی گئی ہے؟ یعنی تاریخ و ادب میں عورت موجود ہے، مگر اصل سوال یہ ہے کہ اسے کس طور پیش کیا گیا ہے؟ تانیثی مطالعات کے نتائج بتاتے ہیں کہ تاریخی بیانیوں اور ادبی متون میں عورت کو مرکزی نہیں ضمنی اور معاون کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ کردار بھی اسٹیریو ٹائپ ہے۔ اس طور جہاں کہیں عورت کا ذکر ہوا، یا وہ ظاہر ہوئی ہے، وہاں وہ ایک مکمل انسانی وجود نہیں۔ وہ ارسطو کے اس مشہور زمانہ قول کی تفسیر ہے کہ عورت اس لیے عورت ہے کہ وہ بعض اہم خصوصیات سے محروم ہے۔ اور اہم خصوصیات سے مراد، مردانہ خصوصیات (شجاعت، جنگ بندی، مہم جوئی، تفکر پسندی، قایدانہ کردار ادا کرنے کی لگن وغیرہ) ہیں۔ تانیثیت اس قول سے مراد یہ لیتی ہے کہ عورت کا تصور ایک ایسی آئیڈیالوجی کی رُو سے کیا گیا ہے، جو پدر شاہی نظام کی زائیدہ ہے، جس میں مرد اور مردانہ اوصاف عمومی انسانی قدر norm کا پیمانہ ہیں۔ اور اس پیمانے کی رُو سے عورت 'اہم انسانی اوصاف' سے تہی، کم تر مخلوق ہے۔ تانیثیت اس صورت حال کے خلاف شدید احتجاج کرتی ہے اور ان تمام صورتوں اور حکمت عملیوں کو طشت از بام کرتی ہے جو پدر شاہی نظام نے عورت کو محکوم بنانے کی خاطر اختیار کیں۔ جن کی بنا پر عورت کو حاشیے پر رکھا گیا یا اس کی امیج کو مسخ کر کے پیش کیا گیا۔

اب تک پیش کیے گئے تانیثی تناظر کی روشنی میں جدید اردو نظم کا مطالعہ کریں تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ جدید اردو نظم میں عورت غائب نہیں ہے، نہ جدید اردو نظم کی تاریخ میں اور نہ جدید نظم کے تخلیقی بیانیوں میں۔ جدید اردو نظم کی تاریخ کا تانیثی مطالعہ اس مقالے کے حدود سے باہر ہے۔ لہٰذا یہ واضح کرنا مشکل ہے کہ آیا جدید نظم کی تاریخ میں خواتین شعرا سے انصاف کیا گیا ہے یا نہیں؟ اُن کے تذکرے میں ڈنڈی تو نہیں ماری گئی یا جدید نظم کے ہیئتی اور موضوعاتی پہلوؤں کی وضاحت میں مرد شعرا کے تجربات کو مستند و معیار بنا کر پیش کیا گیا ہے یا شاعرات کے تجربوں کو بھی اس ضمن میں ملحوظ رکھا گیا ہے؟ زیر نظر مقالے کا موضوع جدید اردو نظم کے مرد شعرا کے یہاں نسوانی امیج ہے۔ شاعرات کے یہاں نسوانی امیج کا مطالعہ آیندہ کسی موقعے پر کیا جائے گا۔

جدید اردو نظم[4] میں عورت کی 'روایتی' اور 'جدید' امیج بیک وقت ظاہر ہوئی ہے۔ (کم از کم اس حوالے سے جدید اردو نظم یک سر جدید نہیں ہے) روایتی اور جدید نسائی تمثال میں کم و بیش وہی فرق ہے، جو روایت اور جدیدیت میں ہے۔ روایت اجتماعی، رواجی اور مسلسل ہوتی ہے جب کہ جدیدیت، انفرادیت پسندی، تجربہ پسندی، تغیر پسندی اور عدم تسلسل کی قایل ہے۔ اسی اعتبار سے عورت کی روایتی امیج وہ ہے، جو ثقافتی سطح پر رائج ہوگئی اور آگے برابر منتقل ہوتی چلی گئی۔ یہ امیج دراصل ذات یا سیلف سے محروم ہے۔ ادھر جدید امیج کا وصف خاص ہی ذات ہے۔ گویا روایتی امیج سلبی اور جدید امیج اثباتی ہے۔ روایت میں فردیت کی گنجایش نہیں ہوتی، فرد کو روایت کی قربان گاہ پر اپنی انفرادیت کو قربان کرنا پڑتا ہے، تاکہ روایت کے تسلسل میں رخنہ پیدا نہ ہو۔ فرد کا ظہور روایت کے تسلسل کو توڑتا ہے، اس لیے روایت فرد کو اپنے لیے خطرہ سمجھتی ہے اور غالباً اس خطرے سے سدّ باب کی خاطر ہی فرد کو روایت میں گم ہو کر اپنا 'اثبات' کرنے کا آدرش دیتی ہے۔ اور

جدیدیت کا وصفِ امتیاز فرد کا ظہور ہے۔ اور فرد ذات کا حامل اور ذات کا شعور رکھنے والا ہے۔ خود آگاہی اور خود شعوریت فرد کی پہچان ہے۔

اب آئیں دیکھیں کہ جدید اردو نظم میں روایتی اور جدید نسائی امیج کن کن صورتوں میں ظاہر ہوئی ہے۔ پہلے روایتی امیج کو لیجیے۔

اقبال کا یہ شعر عورت کی روایتی امیج کو عمدگی سے پیش کرتا ہے:

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

گویا روایتی امیج کی رُو سے عورت آزاد، خود مختار اور خود مکتفی ہستی نہیں ہے۔ وہ مکمل طور پر مرد پر منحصر ہے، جو حقیقتاً اس کے لیے غیر The other کا درجہ رکھتا ہے۔ چوں کہ وہ خود مکتفی نہیں اور طفیلی وجود رکھتی ہے، اس لیے وہ ذات سے بھی محروم ہے۔ وہ خود سوچنے، محسوس کرنے اور اپنے وجود سے متعلق اور اپنے اور دنیا سے تعلق کے بارے میں خود فیصلے کرنے اور ان فیصلوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے بھی قاصر ہے۔ عورت کے روایتی امیج میں سوچنے اور محسوس کرنے کا بیان ہوتا ہے، مگر عورت خود نہیں سوچتی یا محسوس کرتی، بلکہ یہ ساری ذمہ داری ایک 'غیر' ادا کرتا ہے۔ واضح رہے کہ 'غیر' کا تصور تنقیدی تھیوری میں بھی موجود ہے۔

مثلاً ژاک لاکان نے بچے کی ذہنی نشو و نما کے دو اہم مراحل کی نشان دہی کی ہے: مراۃ کی منزل The mirror stage اور لسانی آموزش کی منزل۔ دونوں مراحل میں بچہ 'غیر' سے دوچار ہوتا ہے۔ پہلے مرحلے میں بچہ جب آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہے تو عکس سے اپنا تماثل کا رشتہ قایم کرتا ہے۔ عکس غیر حقیقی اور اس کے لیے غیر ہے مگر وہ اسی کے ذریعے خود کو پہچانتا ہے۔ لاکان اسے پہچانتا نہیں اپنی پہچان کو مسخ کرنا Misrecognition بتاتا ہے۔[5] اسی طرح بچہ جب زبان سیکھتا ہے تو وہ اپنی پہچان ایک ایسے لسانی نشانیاتی نظام کے تحت کرتا ہے، جسے اُس نے وضع نہیں کیا۔ زبان اُس کے لیے 'غیر' ہے۔ نئی تھیوری کے 'غیر' اور روایتی نسائی امیج کے 'غیر' میں کچھ مماثلت اور خاصا فرق ہے۔ مراۃ اور لسانی آموزش کی منزل سے عورت اور مرد دونوں گزرتے ہیں۔ اس اعتبار سے دونوں اپنا امیج 'غیر' کے حوالے سے قایم کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر روایتی نسائی امیج کا 'غیر' مرد ہے۔ تاہم اس 'غیر' کا رول نسائی امیج کے لیے وہی ہے جس کی وضاحت لاکان نے اپنے نظریے میں کی ہے۔ یعنی 'غیر' کے ذریعے اپنی شناخت قایم کی جاتی، اپنی ایگو ego کی تشکیل کی جاتی اور 'غیر' کے ساتھ مثالی تخیلی اتحاد کی آرزو اور کوشش کی جاتی ہے۔

اور اب روایتی امیج کا مطالعہ!

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" (فیض احمد فیض) اردو کی جدید نظموں میں اہم شمار ہوتی ہے۔ اپنے اس سادہ مگر پُر اثر غنائی اسلوب کی وجہ سے، جو فیض کی طرزِ خاص ہے اور اپنے موضوع کی بنا پر اس نظم کے موضوع کو جدید قرار دیا گیا ہے۔[6] محبت پر دوسرے غموں کو ترجیح دی گئی ہے۔ ایک فرد سے محبت اور اسی محبت میں اپنا سب کچھ نثار کر دینے کے روایتی تصور کی نفی کی گئی ہے۔ محبت کا مستحق اور مرکز نوعِ انسانی کے اس طبقے کو قرار دیا گیا ہے، جو پامال اور پس ماندہ ہے۔ اس طور پر یہ نظم محبت کے جدید اور ترقی پسندانہ تصور کی علم بردار ثابت کی گئی ہے۔ بلاشبہ محبت کے تناظر میں تو یہ نظم اہم اور جدید ہے مگر تانیثی تناظر میں یہ روایتی ہے۔ کیسے؟ عرض ہے کہ نظم کا متکلم مرد ہے۔ نہ صرف اس کے تخاطب میں مردانہ تمکنت اور اعتماد ہے، بلکہ خود فیصلہ کرنے والا بھی ہے۔ نظم کی مخاطب عورت (محبوب) ہے۔ نظم کی کہانی میں اس کا کردار منفعل ہے۔ اُس کی (محبت کی) تقدیر کا فیصلہ مرد کر رہا ہے۔ عورت مرد سے محبت طلب کرتی ہے اور مرد جواب میں معذرت کرتا ہے کہ اب اُس کے لیے پہلی سی محبت عطا کرنا ممکن نہیں رہا۔ نظم کے متکلم کو اگر عاشق کا پروٹوٹائپ قرار دیا جائے تو اس کی معذرت کا مطلب یہ بنتا ہے کہ وہ ایک عرصے تک اپنی محبوبہ پر محبت کی نوازشات کرتا رہا ہے، جو یقیناً محبوبہ کی طلب کے جواب میں تھیں، مگر اب اُس کا وژن وسیع ہو گیا ہے۔ اس وژن نے عاشق کو (محبوبہ کی) محبت کی (وصل کی) راحتوں اور (ہجر کے) غموں کے علاوہ راحتوں اور غموں کا شعور دے دیا ہے۔ وہ محبوبہ کا دل رکھنے کے لیے کہتا ضرور ہے کہ "اب بھی دل کش ہے ترا حُسن..." مگر اس کا وژن اُسے دوسری طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے، جہاں ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ ستم ہیں، خاک سے لتھڑے ہوئے، خون میں نہلائے ہوئے بدن ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کو یہ باور بھی کراتا ہے کہ وہ دل کش حسن کو چھوڑ کر خون میں نہلائے جسموں کی طرف توجہ کر رہا ہے۔ گویا قربانی دے رہا ہے اور شاید معذرت بھی کر رہا ہے کہ محبوبہ کے حسین جسم کو وہ اب خراج محبت پیش نہیں کر سکتا۔ محبت کے اس وژن کی اہمیت، نئی انسانی ذمہ داریوں کے تناظر میں یقیناً ہے، مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ آخر محبوبہ اور عورت کو اس وژن سے محروم کیوں دکھایا گیا ہے؟ وژن نظم کے متکلم پر منکشف ہوا ہے، وہ اس میں عورت کو شریک ضرور کر رہا ہے، مگر شریک کرنے کے سارے عمل میں عورت منفعل ہستی کے طور پر ابھرتی ہے۔ یہ کہ عورت کے حسن پر، بدنی حسن پر فوکس کیا گیا ہے، جس کا صریح مطلب ہے کہ وہ ذات اور سیلف سے تہی ہے۔ چوں کہ عورت جسم ہے، لہٰذا وہ محبت کی طلب بھی کرتی ہے۔ محبت کی طلب میں بھی اس کا کوئی متحرک امیج نہیں اُبھرتا۔ عورت اپنی محبت کا خود فیصلہ

کرنے سے قاصر ہے۔ پوری نظم تانیثی تناظر میں میری اپنے فرگوسن کی اس رائے کی تائید کرتی ہے کہ مرد اپنا تصور فطرت، دنیا اور کائنات کے تناظر میں کرتا ہے، مگر عورت کا تصور فقط اپنے حوالے سے۔

روایتی امیج عورت کو محض جسم بنا کر پیش کرتی ہے۔ جدید اردو نظم میں نسائی بدن کو جگہ جگہ معرضِ اظہار میں لایا گیا ہے۔ عورت کے بدنی جمال کو معرضِ بیان میں لانے اور اسے سراہنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے کہ یہ شاعری اور آرٹ کے دیگر شعبے ہی ہیں جو جمال کا اظہار کرتے اور اس کی ستائش کرتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں حسن کا جو احساس اور ذوق موجود ہے، وہ بڑی حد تک آرٹ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ تانیثی مصنفوں کو بھی اس روش سے اختلاف نہیں۔ فہمیدہ ریاض کے بہ قول:

''نسوانی حُسن کی تعریف توہین نہیں۔''[8]

مگر اصل سوال یہ ہے کہ نسوانی حُسن کے اظہار اور ستائش کا کیا ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے؟ دو صورتوں میں نسوانی حُسن کی تعریف تانیثی تناظر میں قابلِ اعتراض ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ جب نسوانی جسم کا اظہار نمائش میں بدل جائے۔ یعنی جسم کے بیان میں یہ بات بھلا، یا دبا دی جائے کہ جسم روح اور شعور بھی رکھتا ہے۔ اس صورت میں جسم شے میں بدل دیا جاتا ہے، وہ محض ایک کموڈیٹی ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ جب بدنی جمال کا اظہار حُسن کا احساس پیدا کرنے کے بجائے جنسی جذبے کو مشتعل کرے[9]۔ یعنی مقصود بدن کے حُسن کی ستائش نہ ہو، لذت اندوزی ہو۔ اس مفروضے میں یہ بات پنہاں ہے کہ احساسِ جمال اور لذت پرستی مختلف ہی نہیں متبائن ہیں۔ احساسِ جمال 'قدر' ہے اور لذت پرستی عمل Practice ہے، جو ناپسندیدہ ہے۔ غور کریں تو قدر اور عمل کا فرق ادب اور نا ادب کا فرق ہے۔ ادب کی (کلاسیکی) جمالیاتی قدر کا تقاضا ہے کہ احساسِ حُسن پیدا کیا جائے۔ اور اگر کوئی متن اس قدر کا حامل نہیں تو وہ نا ادب ہے۔ اس اعتبار سے جس متن میں نسوانی جسم جنسی لذت کی تحریک دیتا ہے، اس کو ادبی متن کا درجہ دیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس متن میں عورت کے حُسن کی ہی نہیں، ادبی قدر کی بھی توہین ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نوع کے متن کو معرضِ تجزیہ میں لانے کا تکلف ہی نہیں کیا جانا چاہیے۔

جدید اردو نظم میں نسائی بدن کا فراواں ذکر موجود ہے۔ اور اس ذکر سے احساسِ حُسن بھی پیدا ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر نسائی بدن کا ذکر اور بیان براہ راست ہوا ہے اور کہیں اسے فطرت کے پس منظر اور فطرت سے مستعار استعاروں میں معرضِ اظہار میں لایا گیا ہے۔ آخر الذکر صورت میں حُسن کا جو احساس جنم لیتا ہے، وہ 'چیزے دیگر' ہے۔ یہاں حُسنِ بدن، حُسنِ فطرت سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ نتیجتاً نہ صرف بدن لطیف کیفیت میں ڈھل گیا ہے بلکہ حُسن کے ایک وسیع اور ارفع تصور کی نمود بھی ہوئی ہے۔ اس ضمن میں وزیر آغا کی نظم 'بو جھل خوش بو' بہ طور خاص قابلِ ذکر ہے۔

باغیچے کے نامحرم سے اک گوشے میں / شرمیلے پھولوں کا جُھرمٹ / پاگل بھنورے، مدھ مکھیاں / اور جھل مل کرتے رنگیں کپڑوں میں ملبوس / نازک پریاں / ہلکی گرم سی، دھوپ کی چادر / چادر، جس پر خوش بو / نٹ کھٹ، بانکی، تیز سی خوش بو / ناچ ناچ کر ہاری / پھر جب مست ہوئی / چت لیٹ گئی

جدید اردو نظم میں نسوانی جسم کو 'شے' کے طور پر پیش کرنے کی باقاعدہ روش موجود ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ روش ان شعرا کے یہاں زیادہ اُبھری ہے، جو زندگی، مذہب، اخلاق اور محبت و جنس کے بارے میں 'جدید زاویہ نگاہ' رکھنے کے مدعی ہیں۔ محبت کا روایتی تصور اپنی نوعیت میں افلاطونی اور روحانی ہے، مگر 'جدید شعرا' نے محبت کا جسمانی اور ارضی تصور اختیار کیا ہے۔ گویا یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے پورے آدمی کو اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس جدید تصور میں عورت کا امیج ایک شے اور کموڈیٹی کے طور پر ابھرتا ہے، جسے لمحاتی اور وقتی جنسی ضرورت کے تحت اپنی دست رس میں لایا جاتا اور پھر جنسی ضرورت کی تکمیل کے بعد اس سے دست کش ہونے میں عار محسوس نہیں کی جاتی۔ اختر الایمان کی نظم ''ترغیب اور اس کے بعد'' اس تقسیم کو خوبی سے پیش کرتی ہے۔

بھیگی رات کا نشہ ٹوٹا ، ڈوب گیا چڑھتا چاند
تھکے تھکے ہیں اعضا سارے اور ہوئیں پلکیں بوجھل
شبنم کا رس پی گئیں کرنیں ، دن کا رنگ چمک اُٹھا
گونج ہے بھنوروں کی کانوں میں پر آنکھوں سے اوجھل
حسن اور عشق کی اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ دیا
میں اپنے رستے جاتا ہوں تو بھی اپنی ڈگر پہ چل

یہ کہا جا سکتا ہے کہ حُسن اور عشق کی حقیقی دُنیا یہی ہے۔ جنسی وصال کے بعد اپنے اپنے رستوں پہ جانا 'عین فطری' ہے۔ اصل یہ نہیں کچھ اور ہے۔ جسے ہم فطری کہتے ہیں، ضروری نہیں کہ وہ فطری ہو، ہو سکتا ہے اُسے فطری سمجھا جا رہا ہو۔ ہر زمانے کی اپنی Episteme ہوتی ہے، جس کے تحت چیزوں کے بارے میں مخصوص تصورات رائج ہو جاتے ہیں۔ وہ تصورات چیزوں کی اصل کو بیان کرنے سے زیادہ اُس زمانے کی episteme کو 'بیان' کرتے ہیں۔ لہٰذا 'وقتی جنسی وصال' کا تصور فطری اور اصلی جنسی تجربے کی سچائی کو پیش کرنے سے زیادہ جدید 'اے پس ٹیمی' کا بیانیہ ہے، جو انسانی وجود کو بنیادی اور مستقل جوہر سے تہی قرار دیتا ہے۔ چوں کہ کوئی مستقل جوہر نہیں، اس لیے کسی تعلق میں استقرار بھی نہیں، اگر انسانی وجود اپنے باطن میں مستقل جوہر

کے علم بردار متصور کیے جائیں تو ان کا وصل اور اتحاد بھی مستقل ہوگا۔

علاوہ بریں مندرجہ صدر نظم میں متکلم مرد ہے۔ اس لیے نہیں کہ اسے ایک مرد شاعر نے لکھا ہے، بلکہ اس لیے کہ متکلم نے اپنی جنس 'مرد' ظاہر کی ہے، لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ جنسی وصال کا یہ بیانیہ مردانہ یا androcentric ہے۔ یعنی کیا خبر جنسی تجربے کو مرد ہی وقتی اور لمحاتی تجربہ خیال کرتا ہو اور وہ سیرابی کے بعد الگ راستہ پکڑنے کی خواہش کرتا ہو، تاکہ وہ مزید عورتوں کے ساتھ مزید جنسی تجربات سے گزر سکے۔ جنس میں تنوع کی تلاش کو بھی پدر شاہی اور مردانہ آئیڈیالوجی کا شاخسانہ قرار دیا گیا ہے۔ نظم میں عورت کو خاموش وجود کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ ممکن نہیں کہ عورت کا جنسی تجربہ بعینہ وہی ہے، جو مرد کا ہے۔ یعنی کیا عورت کو بھی جنس میں تنوع کی تلاش ہوتی ہے اور وہ بھی جنسی تجربے کو 'دو روحوں کا اتحاد' خیال نہیں کرتی؟ عورت کو خاموش رکھنا، اس کی روح میں سفر نہ کرنا، اُس کے تجربے کو زبان نہ دینا، مرد کے تجربے کو عورت کا تجربہ بنا کر پیش کرنا، اُس کے وجود کی انفرادیت کو دبانا، یہ سب کچھ عورت کی روایتی امیج میں ہوتا ہے۔

ادبی متون میں عورت کے روایتی یا جدید امیج کے مطالعے میں ان متون کے تناظر کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ یہ تناظر فکری، ثقافتی، سیاسی، تاریخی اور بعض اوقات شخصی بھی ہوسکتا ہے۔ بعض تانیثیت پسندوں نے بعض شعرا کی نظموں کو ان کے تناظر سے کاٹ کر دیکھا ہے اور مضحکہ خیز نتائج اخذ کیے ہیں۔ مثلاً انھوں نے نظم کے متکلم کو نظم کے خالق کے طور پر لیا ہے اور نظم میں ابھرنے والے نسائی امیج کو شاعر کا شخصی نسائی تصور قرار دیا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے راشد کو اس ضمن میں بہت بُرا بھلا کہا ہے۔ خاص طور پر راشد کی نظم 'انتقام' کو بنیاد بنا کر انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ راشد کے یہاں 'احساسِ ناطاقتی' موجود ہے[10] جس کا مظاہرہ جنسِ مخالف، سے خوش گوار جسمانی تعلقات کے بجائے نفرت، غصے اور Rape کی صورت میں ہوتا ہے۔ اور راشد کی اس نظم میں "ہمیں ایک ایسے ذہن کا عکس نظر آتا ہے، جو پوری دل جمعی کے ساتھ عورت کے جسم کو (خواہ دشمن یا مخالف قوم کی ہی کیوں نہ ہو) انتقام کا ذریعہ بنانا روا سمجھتا ہے۔ دشمن قوم سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام لینے کے لیے آخر وہ اس قوم کے کسی مرد کا انتخاب کیوں نہیں کرتا!"[11] یہ درست ہے کہ نظم میں عورت کے جسم سے اربابِ وطن کی بے بسی کا 'انتقام' لینے کا ذکر ہوا ہے اور عورت کے جسم کو روح سے خالی ایک جسم سمجھا گیا ہے، لہٰذا نظم میں عورت کی روایتی امیج ہی پیش ہوئی ہے۔ مگر کچھ باتیں توجہ طلب ہیں۔

پہلی بات یہ کہ نظم کا متکلم راشد نہیں، اور نہ متکلم ایک شاعر ہے۔ نظم یا کہانی کا متکلم اپنے لہجے اور اپنے عمل سے پہچانا جاتا ہے۔ اس نظم کے متکلم کا لہجہ اور عمل محکوم قوم کے ایک عام مرد کا ہے شاعر کا نہیں۔ اور حسین برہنہ جسم حاکم قوت کی عورت کا ہے۔ یعنی نظم میں مرد اور عورت کا رشتہ ان دونوں کے قومی اور معاشرتی پس منظر سے متشکل ہونے والے تناظر میں قایم ہورہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نظم میں مرد و عورت کا رشتہ آدم و حوا کا 'فطری رشتہ' نہیں، دو مخالف جنسوں کا 'ثقافتی رشتہ' ہے۔ محکوم قوم کا فرد (مرد) اپنے دل میں حاکم و غیر قوم کے لیے جو جذبات دل میں دبائے ہوئے ہے، ان کا انخلا اس نظم میں ہوا ہے۔ یہ اعتراض بہ ظاہر بجا محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کی یہ کیسی مردانگی ہے کہ وہ کسی مرد کے بجائے عورت سے انتقام لے رہا ہے؟ مگر غور کرنے سے یہ اعتراض بھی فسخ ہوجاتا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ انتقام ہے ہی نہیں۔ ہونٹوں سے بھلا انتقام لیا جاسکتا ہے! جنسی عمل میں لب پیوستگی سب سے 'شریفانہ عمل' ہے۔ دوم یہ کہ نظم میں کہیں مذکور نہیں کہ جنسی عمل عورت کی مرضی کے بغیر ہوا ہے۔ یہ باہمی رضامندی سے انجام پانے والا جنسی عمل ہے، ریپ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو یہ عورت کی تذلیل ہوتی۔ اگر ہم متکلم کے پورے کردار کو اس کے معاشرتی اور تاریخی پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو کردار قابلِ مذمت نہیں قابلِ فہم ہوگا۔ مثلاً ایک تو متکلم محکوم قوم کا فرد ہے، جسے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ بے بس ہے۔ وہ حاکم قوم کے ناجائز قبضے اور استحصالی رویوں کے خلاف کوئی راست اقدام کرنے سے قاصر ہے، مگر وہ حاکم قوم کو قبول کرنے پر بھی تیار نہیں۔ گویا وہ اپنی بے بسی کے ساتھ نفسیاتی مصالحت نہیں کرسکا۔ حاکم قوم کے خلاف نفرت اور اپنی بے بسی اُس کے لاشعور میں Repressed حالت میں ہے۔ چناں چہ یہ نظم راشد کی ذہنی حالت کی نہیں ایک محکوم فرد کے بے بسی کی حالت میں اختیار کیے گئے رویے کی عکاس ہے۔[12]

راشد کی یہ نظم 'پاور پالیٹکس' کو بھی پیش کرتی ہے۔

روایتی تصور کے اعتبار سے طاقت طبعی، جسمانی اور عسکری ہوتی ہے، اس لیے محض حاکم، با اختیار اور امیر طبقے کے پاس ہوتی ہے۔ مگر مابعد جدید تصور کی رُو سے طاقت 'حکمت عملی' (اسٹریٹجی) ہے،[13] جس پر روایتی مفہوم میں 'طاقت ور' اور 'کم زور' دونوں کا اجارہ ہوتا ہے۔ تاہم دونوں کے اجارے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اس نظم کے متکلم نے دراصل 'جنسی حکمت عملی' اختیار کر کے اپنی 'طاقت' کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر نظم کے پورے منظر نامے کو ملحوظ رکھیں تو نظم کا نقطہ ارتکاز Focalization جنسی عمل نہیں، 'ثقافتی علامت' ہے۔ غور کیجیے: متکلم کو اجنبی عورت کا چہرہ اور خدوخال یاد نہیں۔ اس لیے نہیں کہ واقعے کو عرصہ بیت گیا ہے اور چہرہ بھول گیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو باقی سب کچھ بھی ذہن سے محو ہو چکا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، جس کا صاف مطلب ہے کہ نظم میں جنسی عمل نقطہ ارتکاز نہیں ہے، برہنہ جسم کا: کر

ضرور ہوا ہے، مگر جسم کی محاکات نہیں کی گئی، اسی طرح فقط لب پیوستگی کا ذکر ہوا ہے اور جنسی عمل میں یہ وہ مرحلہ ہے، جس میں تشدد ہے نہ عریانیت۔ گویا نظم میں جنسی عمل اور اس سے ملنے والا حظ زوداشگاف نہیں ہے، البتہ 'ثقافتی علامت' پوری طرح اُجاگر ہے۔ فرش پر قالین، آتش دان، دھات اور پتھر کے بت، فرنگی حاکموں اور ان کی تلواروں کی بازآفرینی۔ یہ سب متکلم کے ذہن میں تازہ اور روشن ہے۔ جس کا صریح مطلب ہے کہ متکلم نے 'جنسی حکمت عملی' کے ذریعے مخالف اور قابض قوم کی پوری ثقافت کو نشانہ بنایا ہے یہ سوال بہ ہر حال رہ جاتا ہے کہ آخر طاقت اور جنس کا آپسی رشتہ کیا ہے؟ نہ صرف پُرتشدد طاقت بلکہ اسٹریٹجک طاقت بھی جنس کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ جنگ، تجارت، ثقافت، سیاست میں جنس ایک آلے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

میشل فوکو کے مطابق طاقت کے اظہار و عمل کا کوئی عالمی طریقہ نہیں۔ ہر ثقافت میں طاقت اپنے مظاہرے کی حکمت عملی مقامی طور پر تشکیل دیتی ہے۔[14] نظم کے متکلم نے بھی مقامی تاریخی تناظر اور ثقافتی رسومیات کی روشنی میں 'اپنی طاقت' کی حکمت عملی اپنائی ہے۔ متکلم کی ثقافت عورت کو انفرادی وجود سے زیادہ 'ثقافتی وجود' کے طور پر پیش ہوئی ہے۔ اور اسے عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے اور ہر مرد مرکز معاشرت میں عورت کا یہی اسٹیٹس ہے۔ چناں چہ عورت کی پامالی علامتی طور پر اس خاندان یا پوری معاشرت کی پامالی ہوتی ہے، جس سے عورت کا خونی اور نسلی تعلق ہوتا ہے۔ لہٰذا نظم میں ظاہر ہونے والی عورت عالم گیر ثقافت کی نہیں، مقامی ثقافتی شناخت کی حامل ہے اور نظم میں مذکور ہونے والا جنسی عمل عام جنسی عمل نہیں، تاریخی ثقافتی تناظر میں ظاہر ہونے والا اور تعبیر کیے جانے والا عمل ہے۔ نظم کے متکلم اور اجنبی عورت کے رشتے کو آدم وحوا کے آفاقی رشتے کے بجائے دونوں کے ثقافتی اور تاریخی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ آدم وحوا کے رشتے میں تو گہری اپنائیت ہوتی ہے، مگر اس نظم کے متکلم کو عورت اجنبی لگتی ہے۔ اور یہ اجنبیت جنسی نہیں ثقافتی ہے!

اب چند معروضات 'جدید نسائی امیج' کے باب میں!

جدید اردو نظم میں عورت کے روایتی امیج کے پہلو بہ پہلو 'جدید امیج' بھی ظاہر ہوا ہے۔ جدید نظم کی شعریات میں فرد کی فنی آزادی اور تجربے کی آزادی بہ طور اصول شامل ہیں۔ غالباً اسی اصول کے تحت جدید نظم میں 'جدید نسائی تمثال' کی نمود ممکن ہوئی ہے۔ تجربے کی آزادی جدید شاعر کو روایتی موضوعات کی جگہ نئے موضوعات کی طرف لائی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا، جدید نسائی تمثال کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ذات (سیلف) کی علم بردار ہے۔

سادہ لفظوں میں ذات اپنے ہونے کا شعور ہے۔ خود آگاہی کے نتیجے میں ہی ذات کی نمود اور پرداخت ہوئی ہے۔ گویا ذات آدمی کو از خود نہیں ملتی، اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کا حصول بھی ایک ہلّے کی صورت میں نہیں ہوتا، بہ تدریج اور مسلسل ہوتا ہے۔ ذات کا حصول مکالمے پر منحصر ہے۔ اور مکالمہ دوسروں سے ہوتا ہے۔ دوسروں میں خود آدمی کا باطن، سماج، لوگ، نوع انسانی، خدا، کائنات سب شامل ہے۔ خود سے مکالمے کا آغاز، خود کے دو میں بٹنے سے ہوتا ہے۔ اس طرح خود آگاہی دوئی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی: ایک وہ جو آگاہ ہو رہا ہے، دوسرا وہ جس سے آگاہ ہوا جا رہا ہے۔ آگاہ ہونے والی 'ذات' ہے، جو اپنا اور دوسروں کا شعور ہی نہیں رکھتی، مکالمے کے ذریعے اس شعور کو مسلسل ترقی اور وسعت بھی دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ذات مسلسل نمو پذیر شعور خود ہے۔

ذات کی مسلسل نمو کا مطلب یہ ہے کہ ذات مرکزیت کی حامل بھی ہے۔ مرکزیت مکالمے کے برابر جاری عمل کے ثمرات کو سمیٹتی اور خود، اپنی نوع، دنیا اور کائنات کے بارے میں ایک 'پوزیشن' یا موقف اختیار کرتی ہے۔ اور اسی موقف کی وجہ سے ذات آزادانہ سوچ سکتی، محسوس کر سکتی اور عمل کر سکتی ہے۔[15]

ذات کا یہ تصور (جس کا اطلاق مرد و زن دونوں پر ہوتا ہے) جدید اردو نظم کی نسائی امیج میں موجود ہے، مگر تین صورتوں میں۔ پہلی صورت وہ ہے جہاں نسائی امیج کو احتجاج کرتے دکھایا گیا ہے۔ احتجاج ہمیشہ خود آگاہ اور غیر آگاہ وجود کرتا ہے۔ عورت جب آگاہ ہوتی ہے کہ وہ کم تر ہے (خود آگاہی) اور مرد برتر ہے (غیر آگاہی) تو وہ سراپا احتجاج ہوتی ہے۔ احتجاج، مزاحمت اور بغاوت کے مضمون کو زیادہ تر شاعرات نے پیش کیا ہے کہ اُن کے لیے یہ مضمون شاعرانہ نہیں، حقیقی مسئلہ ہے، جو اُن کے نسائی وجود کو صدیوں سے لاحق ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنی شاعری میں یہ مضمون پیش کر کے گویا خود کو لکھا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ جہاں بغاوت کی لے تیز ہوگئی ہے، وہاں ان کے وجود کے بعض دیگر منطقے نادریافت رہ گئے ہیں۔) تاہم جدید اردو نظم کے بعض شعرا کے یہاں بھی عورت کا یہ امیج اُبھرا ہے۔ مثلاً میراجی کی نظم 'جوانی کے گھاؤ' میں آخری لائنیں یہ ملتی ہیں:

لیکن جنت کا پھل کھا کر

زخموں کی بیکار اذیت

قدرت نے عورت کی قسمت میں کیوں لکھی؟

پوری نظم عورت کی اُس بایولوجی کو موضوع بناتی ہے، جو فطرت نے عورت کو 'ودیعت' کی، مگر جس کی وجہ سے وہ اذیت سہتی ہے۔ یہ اذیت اس لیے بھی ہے کہ عورت جانتی ہے کہ مرد کی بایولوجی مختلف ہے۔ جنسی اور تولیدی عمل میں مرد آزادی اور سرشاری پاتا ہے، مگر عورت ''جیون کی اٹل محتاجی'' پاتی ہے۔ عورت کی بایولوجی تانیثیت کا ایک اہم سروکار ہے اور بعض خواتین مفکروں

نے نسائی انفرادیت کو نسائی بدن میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔اور بعض نے نسائی بدن کی فطری خصوصیات کے بجائے نسائی بدن سے متعلق ثقافتی تصورات کے مطالعے کو ترجیح دی ہے۔اور فرائیڈ کے مشہور زمانہ قول The anatomy is destiny کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ یہ ہر کیف، فطرت، اور ثقافت دونوں تانیثی مباحث کا اہم موضوع ہیں۔ میراجی نے مذکورہ بالا نظم میں فطرت کو عورت کی 'بدقسمتی' کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔(کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ مرد کو بری الذمہ قرار دیا ہے؟) اور عورت سے ہم دردی جتائی گئی ہے۔مرد شعرا کے یہاں عورت کا احتجاج جہاں بھی ظاہر ہوا ہے، ہم دردانہ انداز میں ہوا ہے۔نوعیت کے اعتبار سے یہ ہم دردی ویسی ہی ہے جیسی سوسائٹی کے پامال، پس ماندہ طبقے سے ہوتی ہے، جس کا اظہار ترقی پسندوں کے یہاں استحصال زدہ طبقے کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ ہم دردی کہیں حقیقی اور کہیں نمایشی ہے۔تاہم اس سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ عورت کو 'شے' سمجھنے کے بجائے ایک 'آگاہ وجود' گردانا گیا ہے۔

جدید نسائی امیج کے اظہار کی دوسری صورت وہ ہے جہاں عورت خود اظہار کرتی ہے۔وہ سماجی تصورات پر سوال قایم کرتی ہے، آزادانہ طور پر سماجی نظام کا مطالعہ کرتی اور اس کی کجیوں کو منظر عام پر لاتی ہے۔ ہر چند عورت یہاں بھی احتجاج کرتی ہے، مگر احتجاج کا طرز غیر شخصی ہے۔پہلی صورت میں احتجاج کی نوعیت شخصی اور صنفی ہے، وہاں جینڈر مسئلہ ہے، مگر یہاں وہ انسانی وجود کے طور پر سماج سے 'مکالمہ' کرتی ہے۔اسی ضمن میں مجید امجد کی نظم 'خدا (ایک اچھوت ماں کا تصور)' خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔

یہ نظم حقیقی معنوں میں عورت کو مکمل انسانی وجود کے طور پر پیش کرتی ہے۔لہٰذا نظم میں ظاہر ہونے والا ادراک اس کا اپنا ہے۔یہ ادراک مردانہ اقتدار اور مردانہ ورلڈ ویو سے کہیں ملوث نہیں ہے۔دوسرے لفظوں میں شاعر اپنے مردانہ سیلف کو نظم کے موضوع سے یک سر علاحدہ اور alienate کرنے میں پوری طرح کام یاب ہوا ہے۔

عورت مکمل انسانی وجود کے طور پر ایک ایسی ہستی ہے، جو اپنی صنف، اپنے سماجی طبقے اور اپنے باطن سے بہ یک وقت وابستہ ہوتی ہے۔ اس نظم کی متکلم 'عورت' ہے، اچھوت طبقے کی فرد اور ماں ہے۔اور متکلم تینوں حیثیتوں میں خدا کا تصور کرتی ہے۔

اچھوت ماں کا تصور خدا اپنی ابتدائی سطح پر طبقاتی ہے۔اُس نے خدا کو طبقاتی تناظر اور طبقاتی زندگی کے پے در پے تجربات کی روشنی میں دیکھا ہے۔خدا کو اس کی اصل میں ایک 'معروضی وجود' کی حیثیت میں نہیں، اپنے موضوعی طبقاتی شعور کی رُو سے پیش کیا ہے، لہٰذا اس نظم میں 'خدا' نہیں، اُچھوت طبقے کا تصور خدا ظاہر ہوا ہے۔یہ اور بات ہے کہ یہی تصور خدا ہے جو اس طبقے کے افراد کی زندگی میں عمل دخل رکھتا ہے اور ان کے لیے 'اصل خدا' یہی ہے۔(حقیقت سے زیادہ تصور حقیقت انسانوں کی زندگی میں اہم اور اثر آفریں ہوتا ہے) اصولاً یہ تصور خدا پورے اچھوت طبقے کے طبقاتی تجربات کی پیداوار ہے اور یہ طبقہ عورت اور مرد پر مشتمل ہے۔یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طبقے میں بھی تو عورت اور مرد کا تفاوت موجود ہے۔لہٰذا یہ تصور بھی اپنی جہت میں مردانہ تصور خدا ہے۔اس اعتراض کے ضمن میں عرض ہے کہ ایک سطح پر یہ تصور خدا پورے طبقے کا ہے اور اس طبقے کو مرد مرکز طبقہ بھی سمجھا جا سکتا ہے، مگر نظم میں کچھ ایسے اشارے موجود ہیں، جو اس تصور کو اچھوت ماں اور عورت کا تصور بھی بنا کر پیش کرتے ہیں۔مثلاً یہ مصرعے:

پہن کر نور کی پوشاک وہ من موہنا راجہ...
وہ اونچی ذات والا ہے اور اونچا اس کا ڈیرہ ہے
مرے بھولے! ہماری اور اس کی ایک لیکھا ہے

یہ مصرعے نہ صرف 'نسوانی زبان' کی نمایندگی کرتے ہیں، بلکہ ممتا کے لہجے کی بھی! نسوانی زبان بہ ہم ثقافتی تجربات کی بنا پر محکومیت و مغلوبیت ایسے عناصر سے مملو ہوتی ہے، جو ان مصرعوں سے عیاں ہیں۔اچھوت طبقے کی فرد ہونے کے ناتے وہ جس پستی اور حقارت کا سامنا کرتی ہے، وہ بھی نظم میں جابجا موجود ہیں، نیز ممتا سے منسوب دردمندی بھی نظم کی زیریں سطح پر موج زن ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ دردمندی اپنے بیٹے 'رلدو' تک محدود نہیں بلکہ اس خدا کے لیے بھی ہے جس کی لیکھا انھی جیسی ہے۔ "میٹھے بھوجنوں اور اُجلے آنچلوں والے" خدا اور اچھوت دونوں کو اپنے محلوں میں جگہ دینے سے ڈرتے ہیں۔

اس نظم کی متکلم ہر چند اچھوت عورت ہے اور اس کے ادراک پر اس سبب سے، سادہ لوحی، کا عنصر بھی غالب ہے (خدا ایک من موہنا راجہ ہے، سونے کا چھابا، لے کر تاروں کی پگ ڈنڈی پر جھاڑو دے کے جاتا ہے، میٹھے بھوجنوں والے اسے اپنی لاشیں اور مردے سونپ دیتے ہیں جنھیں وہ دوزخ کے شعلوں کی سیخوں پر بھونتا ہے) مگر اس کا سیلف پوری طرح بیدار ہے۔ اس کی دنیا مرد تک محدود ہے نہ وہ اپنی بایولوجی کی اسیر ہے۔وہ خدا کے سماجی تصور پر سوال قایم کرتے ہوئے خدا کے الٰہیاتی مبحث کو بھی مس کرتی ہے۔اس کا یہ سوال الٰہیاتی ہے: نہیں سمجھے کہ اتنا دور کیوں اس کا بسیرا ہے؟ عورت کے روایتی امیج سے اس نوع کے سوالات کوسوں دور ہیں۔

اردو نظم میں جدید نسوانی امیج کی تیسری صورت وہ ہے جس میں نہ احتجاج ہے نہ سوال۔احتجاج اور سوال سماج اور سماجی تصورات سے 'مکالمے' کی

صورت ہیں۔اور یہ مکالمہ بھی مجادلہ بن جاتا ہے۔تاہم عورت یہاں اپنے مستند وجود کا اظہار ضرور کرتی ہے۔نسائی وجود کی ایک اور سطح بھی ہے۔جہاں وہ سماجی وثقافتی دائرے کو عبور کرتی، شکایات وشبہات سے بالاتر ہوتی اور ایک نوع کی 'مسٹری' کے روبرو ہوتی ہے اور خود ایک مسٹری بنتی ہے!

گبریل مارسل نے لکھا ہے کہ انسان کا دوسرے اشخاص سے رشتہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک رشتے میں دوسروں کو صرف بہ طور شے لیا جاتا ہے، ان کو استعمال کیا جاتا اور ان کا استحصال کیا جاتا ہے (عورت کی روایتی امیج!) دوسرا رشتہ ہے I اور Thou کا (من وتو) جس میں دوسرا شخص بعینہ ویسا سمجھا جاتا ہے جیسا آدمی خود ہے۔یہ رشتہ موضوعی ہے۔[16] عورت کا جدید امیج من وتو کے رشتے کا تجربہ بھی کرتا ہے۔ابتدائی سطح پر یہ تجربہ عاشق اور محبوب کے وصل سے عبارت ہے، جس کا فراواں ذکر ہماری پرانی اور نئی شاعری میں موجود ہے۔مگر اپنے درجہ کمال میں یہ تجربہ تخلیق کی انسپریشن میں ڈھل گیا ہے۔نسائی سیلف "تخلیق کی دیوی" میں بدل گیا ہے۔عورت ایک 'شخص' نہیں رہ گئی، وہ ایک ایجنسی میں مبدل ہو گئی ہے۔تاہم یہ ایجنسی اپنی کارکردگی کے اعتبار سے 'ہائر سیلف' ہے: فعال، عمل آرا، دیالو اور خود آگاہ۔ گو کہ اس امیج پر قدیم یونانی اور پرانی انگریزی شاعری کے اثرات ہیں، جس میں دیویوں کو invoke کیا جاتا تھا اور یہ عقیدہ تھا کہ دیویاں تخلیق کا سرچشمہ ہیں، مگر اردو نظم میں اس امیج کے بعض منفرد اوصاف بھی ہیں۔مثلاً یہ کہ تخلیق کی قدیم دیویاں ایک طرح کا آرکی ٹائپ اور دوسرے تاریخ ہیں، مگر اردو نظم کی اسرار آمیز نسائی امیج تاریخ اوصاف کی حامل ہے۔انھیں عقیدے نے اور اسے علم اور تجربے نے جنم دیا ہے۔اس امیج کی جتنی عمدہ نمایندگی علی محمد فرشی کی طویل نظم علینہ میں ہوئی ہے۔کسی دوسرے نظم گو کے یہاں شاید ہی ہوئی ہو۔اس نظم کا فقط مختصر اقتباس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش ہے۔

علینہ/ مجھے بیلا ڈونا کے پھولوں سے/ مریم کی بانہوں کی بیلوں تلک/ (جن پر سول کا شہزادہ سوتا رہا)/ اکلوتی سچائی کی/ اس کی خوش بو میں بھیگی ہوئی قسم/ رابعہ کے مصلے کی/ سیتا کے پاؤں ماریا کے ہاتھوں/ تری انگلیوں کی قسم/ میں نے دیکھا ہے/ سب عورتوں کی محبت کے باغات میں/ درد کی رات میں/ نور بھرتے ہوئے، دل بھگوتے ہوئے، تجھ کو روتے ہوئے

OO

حواشی:

2،1۔سلیمہ ہاشمی، سمیہ درانی 'عورت اور تخلیقی آرٹ' 'نئے زاویے' (اثر گروپ)، لاہور: اثر پبلی کیشنز 1995۔ص 111

3-Mary Anne Fergusan, Images of women in Literature. Boston Miffin Company, 1985. p 5

4۔تانیثی تنقید کے دو مکتب ہیں۔پہلا مکتب تمثال نسواں (Image of women) کہلاتا ہے۔اسے 1970 کی دہائی میں فروغ ملا، مگر اس نے بنیادی تصورات سیمون دی بووا سے اخذ کیے۔بووا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ عورت کو مردوں نے ثانوی جنس کے طور پر پیش کیا ہے۔یہ مکتب مرد تخلیق کاروں کے یہاں عورت کی تمثال کا مطالعہ کرتا ہے۔جب کہ دوسرا مکتب انتقاد نسواں (Gynocritics) سے موسوم ہے۔یہ مکتب عورت کے منفرد شعور ذات کو مرتب کرتا ہے۔ہیلن سکوس، جولیا آسٹیوا، ایڈرین ریک وغیرہ اس کی اہم علم بردار ہیں۔

5۔ملحوظ خاطر رہے کہ جدید اردو نظم سے مراد بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں سامنے آنے والی نظم ہے۔یہاں اس سوال کو چھیڑنے کی گنجایش نہیں کہ اس کا خاتمہ ستر کی دہائی میں ہوا، اور اس کی جگہ مابعد جدید نظم نے لے لی یا ابھی تک جدید نظم منظر پر موجود ہے۔اس مضمون میں چند اہم جدید نظم گووں (مرد شعرا) کے یہاں عورت کے امیج کا جائزہ لیا جائے گا۔اس مضمون کو 'جدید نظم کی تانیثی تاریخ' کے طور پر نہیں، جدید اردو نظم میں چند قابل ذکر تانیثی رجحانات کے جائزے کے طور پر پڑھا جائے۔

6-Malcolm Bow, "Jacques Lacan" in structuralism & since (ed John sturrok)Oxforx, 1979. p 122

7۔یہ موضوع یک سر نیا بھی نہیں ہے۔مثلاً غالب، فیض سے بہت پہلے کہہ چکے ہیں:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

8۔فہمیدہ ریاض (مرتبہ)۔نسائی ادب کی رد تشکیل، کراچی: وعدہ کتاب گھر، 2006۔ص 13

9۔حسن اور جنس کا معاملہ بے حد پیچیدہ ہے۔دونوں کا تعلق بدن سے ہے۔انسانی جسم کا مشاہدہ احساس حسن یا جذبہ جنس میں سے کسی ایک کو یا دونوں کو بیک وقت تحریک دے سکتا ہے۔تاہم تحریک کا انحصار جسم کے بیان کے اسلوب پر ہوتا ہے۔

10۔فہمیدہ ریاض، ادب کی نسائی رد تشکیل، محولہ بالا، ص 37

11۔ایضاً، ص 36

12۔اگر راشد کی نظموں کو خود راشد کی ذہنی سوانح کے طور پر دیکھنے پر اصرار کیا جائے تو ان کی نظم 'داشتہ' بھی پڑھی جائے اس میں داشتہ سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے۔اسے اپنے وقتی جنسی جذبات کی تسکین کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے انسانی وجود تصور کیا گیا اور اس کی تکریم کی گئی ہے۔

14،13۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیے:

David Couzens Hoy(ed) Foucault, A Critical Reader, Basil Blackwell, 1989.pp 129 - 137

15۔مزید مطالعے کے لیے رجوع کیجیے۔

Ciaran Benson, The Absorbed Self, New York: Harvestor Wheatsheaf. 1993 pp 114 - 122.

16۔پروفیسر سی اے قادر، فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، 1981۔ص 135

خصوصی مطالعہ

مظہر امام

گزشتہ پچاس ساٹھ برسوں میں اردو شاعری نظریاتی کش مکش، مختلف النوع رجحانات، بدلتے ہوئے لہجوں، طریقِ اظہار و طرزِ بیان کے نت نئے تجربوں اور... سماج اور فرد کے تہہ در تہہ مسائل سے وابستہ موضوعات و مفاہیم کے پُر پیچ راستوں سے جس طرح گزری ہے، مظہر امام کی شاعری اس کا ایک بصیرت افروز سفر نامہ ہے۔ آج کسی بھی شاعر کے بارے میں یہ کہہ دینا کہ اُس کے ذکر کے بغیر جدید اردو شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ایک ایسا گھسا پٹا جملہ ہے جو کبھی کا اپنی معنویت کھو چکا ہے۔ لیکن مظہر امام کے تعلق سے یہ جملہ پوری طرح سچ اور بامعنی ہے، اور یہ خصوصی مطالعہ اس کے ثبوت فراہم کرتا ہے...

ہوائے نا آشنا سے کہنا

کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
کبھی کبھی میں اداس لمحوں میں سوچتا ہوں
یہ کیسی راہیں ہیں
جن پہ میرا کہیں کوئی نقش پا نہیں ہے
مری بیاض سفر کی تحریر مٹ چکی ہے
مرے خیالات منتشر کی طرح
ہوا میں
غبار ملبوں کا اڑ رہا ہے

مری نگاہوں کے سامنے ہے
وہ سیلِ خوں
جس میں سارے آدرش بہہ گئے ہیں
یہ کیسی انصاف کش فضا ہے
کہ سانس لینا بھی اک سزا ہے!

گلی کے نکڑ پہ لاش کب سے پڑی ہوئی ہے
کہ وارثوں میں ابھی وراثت کی جنگ جاری ہے
اور اب تک
کسی عدالت سے فیصلے کی خبر نہیں ہے

مگر میں کس سے کہوں کہ آؤ
مری نظر سے یہ حادثہ اک نظر تو دیکھو:
ہمارے دریا ہمارے صحرا سے دور بہتے ہیں
تشنگی ہونٹ پر جمی ہے
پرانے رستوں پہ ٹھوکریں ہیں
نئے خیالوں پہ سخت پہرے لگے ہوئے ہیں
ہمیں اجازت نہیں ہے اب خواب دیکھنے کی!
ہماری اپنی شناخت کیا ہے
کہ ہم تجارت کا مال ہیں
اور ہمیں سے بیوپار چل رہا ہے!

ہوا سے کہنا
ہوائے نا آشنا سے کہنا
کسی شناسا کو ساتھ لائے
جو آ کے شانوں پہ ہاتھ رکھے
کہے کہ تم سے بچھڑ کے خود سے بچھڑ گیا ہوں

کہیں سے جگنو کوئی تو چمکے
کہیں سے گھنگھرو کوئی تو چھنکے
کہ اب ہمارے تھکے قدم بھی
جنوں کا انعام چاہتے ہیں!

تمہید و تعارف

مظہر امام کی ہمہ جہتی

رفعت سروش

دنیا تھی آنسوؤں میں نہائی ہوئی کتاب
بھیگے ہوئے ورق کا ہم اک اقتباس تھے

یہ تعارف جس شخص کا ہو، اس پر کچھ لکھنے کے لئے قلم کو خونِ جگر میں ڈبونا ضروری ہے۔ غمِ دُنیا کے زہر کو تریاق کرنے کا فن اس شخص کو ودیعت کیا گیا ہے جسے اس پُرآشوب دور میں "سقراط بن کر جینا آتا ہے" اور اس شخص کا نام ہے: مظہر امام۔ شاعری زخم زخم پھولوں کی خوش بو سے مہکتی ہوئی، نثر دل لرزاں کی آنچ میں تپ کر کھرے لفظوں کا رواں دواں قافلہ، اور گفتگو برف کی چوٹیوں سے اُترتے ہوئے سبک خرام چشمے کا ترنم۔ اس شفاف شخصیت کو متشکل کرنے میں ایک عمر کی ریاضت درکار ہے۔ اور مظہر امام نے قدم قدم، لمحہ لمحہ، نفس نفس ریاضت کی ہے۔ ریاضتِ فن، ریاضتِ تہذیب اور ریاضتِ لفظ و بیاں:

میں ان ساعتوں کی گزرگاہ پر آبلہ پا رواں ہوں
جو دفتر کی
بیوی کی
بچوں کی
احباب کی ملکیت ہیں
میں اب وہ نہیں ہوں
جو میں تھا
اب اِک مردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی کثافت چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رُسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفون کرنے میں مصروف ہوں
میں شانوں پہ روزِ ازل سے اسی جھوٹ کا بوجھ ڈھوتا رہا ہوں
جو میں ہوں
جو تم ہو! — تمہارے لئے ایک نظم

مظہر امام کو کالی داس، تلسی، میرا، خسرو، ٹیگور، وِدّیا پتی، میر اور غالب و اقبال کی سرزمین بخشی گئی۔ وہ بہار کے دربھنگے جیسے شہر میں پیدا ہوئے جو ایک بڑے زمین دار (مہاراجہ) کے شکنجے میں کسا ہوا تھا اور جس کی زنجیریں توڑنے کے لئے وہاں کے کسانوں کو منظم جدوجہد کرنی پڑی۔

مارچ 1930 کی پانچویں تاریخ، ادب کی تاریخ میں ورقِ تازہ کا اضافہ کرنے والے شخص کی تاریخ ولادت ہے۔ خوش حال اور مذہبی گھرانے کی تربیت نے اخلاقِ حسنہ اس کی شخصیت میں جوہر کی طرح پیوست کر دیئے والد محترم سے محبت اور شفقت کے ساتھ علمی ذوق اور کتب بینی کا شوق ورثے میں پایا۔ سایۂ پدری تو کم عمری میں ہی اٹھ گیا، مگر آغوشِ مادر آسودگی فکر و نظر عطا کرتا رہا۔ نشست و برخاست میں ایک سلیقہ، گفتگو میں شائستگی، وقت کی پابندی، ہر بات میں ترتیب و تنظیم۔ یہ تمام "غیر شاعرانہ اوصاف" مظہر امام کے مزاج کا حصہ بن گئے مگر پھر بھی یہ شخص شاعر بن گیا اور اپنی روش کے برعکس ایسے اشعار کہے کہ اگر ان کی شاعری پر ایمان نہ لائیں تو قاضیِ ادب کفر کا فتویٰ صادر کر دے:

جانے کس سمت چلوں، کون سے رُخ مڑ جاؤں
مجھ سے مت مل کہ زمانے کی ہوا ہوں میں بھی
اپنی ہی خاک اُڑاتا پھروں ساحل ساحل
تیرے دریاؤں سے گزروں تو ہوا ہو جاؤں

تم ہوا ہو، تو بکھیرو مجھے ساحل ساحل
موج ہے ہو تو بہاؤ مجھے دریا کی طرح

وہ بے جہت کا سفر تھا، سوادِ شام نہ صبح
کہاں پہ رُکتے کہاں یادِ رفتگاں کرتے

چھوٹے شہروں میں عام طور پر تازہ کتب و رسائل دُشواری سے میسّر آتے ہیں، لیکن مظہر امام کو بچپن سے ہی ساقی، نیرنگِ خیال، شاہکار، ہمایوں، عالمگیر، ادبی دُنیا اور ادب لطیف وغیرہ اہم ادبی رسائل کے مطالعے کی سہولت حاصل ہوئی۔ یہ رسائل اپنے وقت کی بہترین ادبی تحریروں اور

تحریکوں اور نظریات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ اور اس حسنِ اتفاق میں ان کے ایک ماموں کے شوقِ ادب کی کارفرمائی تھی۔ وہ ڈاک خانے میں ملازم تھے اور ڈاک سے آنے والے مختلف رسائل کو اپنے گھر لے آتے تھے۔ باری باری مختلف خریداروں کو اپنے رسائل سے محروم ہونا پڑتا تھا۔ گویا اچھے اور معیاری ادب کے مطالعہ کا شوق بچپن سے ہی مظہر امام کو اسیر کر چکا تھا۔ 1944 میں ان کے ایک دوست منسوب حسن نے انہیں ترقی پسند ادب کی تحریک سے متعارف کرایا تو مظہر امام کو معلوم ہوا کہ جن ادیبوں اور شاعروں کا نام ترقی پسند تحریک سے منسوب ہے ان کو تو۔۔ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں اور یوں اس تحریک سے انہیں قربت ہوتی چلی گئی اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں سے بھی۔ کچھ بعد میں ان کے دستِ راست بنے مظہر شہاب، جو، اُن سے بھی ایک قدم آگے، کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ ہولڈر ہو گئے۔ ان دونوں نوجوانوں نے ترقی پسند نظریات پر مشتمل ایک رسالہ 'نئی کرن' جاری کیا جس کے طویل وقفوں کے بعد صرف تین شمارے نکلے۔ جنوری 1949 میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور نومبر 1950 میں آخری۔ اس رسالے کی ایڈیٹری اور ترقی پسند رجحانات کو فروغ دینے کے ''صلہ'' میں ان دونوں دوستوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا اور ان کے نامۂ اعمال میں 45 دن کے لئے ''اسیرِ زنداں'' ہونا بھی درج ہو گیا۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے انتہائی عروج اور ہندوستان گیر پیمانے پر اس کی مقبولیت کا دور ہے۔ اور مظہر شہاب اور مظہر امام کا نام بہار کے ترقی پسند نوجوانوں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

1951 میں تلاشِ معاش مظہر امام کو کلکتہ لے گئی اور کلکتہ میں ان کا سات آٹھ سال کا قیام ان کی شخصیت کے سنورنے، نکھرنے اور اپنے نظریات پر عمل پیرا ہونے کا دور ہے۔ کلکتہ ان کا میدانِ عمل ٹھہرا۔ دربھنگہ جیسے چھوٹے شہر کے بعد، ہندوستان کا سب سے بڑا شہر، علم و ادب کا گہوارہ، رقص و موسیقی اور جملہ فنونِ لطیفہ کا مرکز کلکتہ اب ان کے زیرِ قدم تھا۔ وہاں انہوں نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا اور روزنامہ 'کارواں' سے متعلق رہے۔ لیکن جلد ہی معلمی کے پیشے میں آگئے اور ان کی تاریخ دانی، انگریزی، فارسی اور اردو کی علمی استعداد کا فیض اب ان کے طالب علموں کو پہنچنے لگا۔ اور یہ سلسلۂ معلمی دسمبر 1958 تک جاری رہا۔ وہ سی ایم او ہائی اسکول میں ٹیچر تھے اور مشہور شاعر پرویز شاہدی ہیڈ ماسٹر۔ پرویز شاہدی کی صحبت نے مظہر امام کے ذوقِ ادب کو اور جلا بخشی اور جس ترقی پسندانہ مزاج کی نمود دربھنگہ میں ہوئی تھی اسے پروان چڑھنے کے لئے کلکتہ کی فضا راس آئی۔ کلکتہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اردو ہندی مشترکہ شاخ بہت فعال تھی۔ مظہر امام انجمن کے سرگرم ممبر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے اور اس وقت تک سکریٹری رہے جب تک کلکتہ میں ان کا قیام رہا، یعنی 20 دسمبر 1958 تک، حالاں کہ انجمن زوال پذیر ہونی شروع ہو گئی تھی اور بہت سے لوگ ترقی پسندوں کی صفوں سے اُٹھ کر کسی اور فورم کی تلاش میں تھے۔ ترقی پسندی کے ٹکے بندھے اصولوں سے انحراف کر کے نئے تجربے کر رہے تھے۔

22 دسمبر 1958 کو مظہر امام نے آل انڈیا ریڈیو کے کٹک اسٹیشن پر بحیثیت ٹرانس میشن ایگزیکیٹو کے ملازمت شروع کی اور ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے وہ دُوردرشن سری نگر سے بحیثیت سلیکشن گریڈ اسٹیشن ڈائریکٹر مارچ 1988 میں ریٹائر ہوئے۔ مظہر امام کی منصبی ذمہ داریوں کا یہ نقطۂ آخر ہے۔ اس کے بعد سے وہ ایک محتاط زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر قدم سنبھل سنبھل کر اٹھاتے ہیں اور ہر لفظ سوچ سوچ کر بولتے ہیں اور ہر حرف چھان پھٹک کر لکھتے ہیں اور ان کی مستحکم شہرت کا گراف بڑھتا جاتا ہے۔ وہ نہ شد و مد سے کسی تحریک یا رجحان کی مخالفت کرتے ہیں نہ موافقت میں کوئی بیان دیتے ہیں۔ البتہ ادبی منظرنامے کے ہر رنگ و آہنگ سے باخبر ہیں۔

میں نے ترقی پسند تحریک سے ان کے تعلق کو خاص طور پر اس لئے اُجاگر کیا کیوں کہ ان کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ وہ 'شب خون گروپ' کے آدمی ہیں۔ اور یہ بات واضح ہے کہ 'شب خون' رد ترقی پسندی کا دوسرا نام ہے۔ دراصل 1955 تک ترقی پسند مصنفین میں تنظیمی کمزوری آچکی تھی اور انجمن کی باگ ڈور سنبھالنے والوں نے اپنے گھوڑے دوسروں کو روندنے میں استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے۔ 'نیا ادب' (بمبئی) میں 'دار و رسن' قائم کرنے اور ایک ایک کر کے سب کو سولی پر چڑھا دینے کا کام اس وقت کے ادبی ڈکٹیٹر سردار جعفری نے کیا تھا اور سوائے دو چار ادیبوں اور شاعروں کے سب کی گردن میں رسّی کا پھندا ڈال دیا تھا۔ ماہ نامہ 'خیال' کے خلاف باقاعدہ محاذ بنایا تھا اور اس رسالے کو سانس لینے کا موقع نہ دیا جس کے ادارے میں اختر الایمان، میرا جی، ظ انصاری اور مدھوسودن جیسے لوگ تھے۔ فراق گورکھپوری کی وہ ٹانگ گھسیٹی کہ یہ تھکا فضیحتی کی حد تک پہنچ گئی۔ غرض بجائے اس کے کہ یہ بزعمِ خود 'تحریک ساز' بننے والے صاحب اگر ہر قیمت پر اپنی شہرت کا ایوان کھڑا کرنے کے بجائے، وقت کے تیور سمجھتے اور عالمی پیمانے پر رونما ہوتے والی تبدیلیوں کا متوقع اثر ادب پر محسوس کرتے تو شاید ہماری صفوں میں یہ انتشار پیدا نہ ہوتا۔ کیونکہ ترقی پسندی جمود کی دشمن ہے۔ مگر خود یہ جمود ان چند قلم کاروں کے قلم پر برف کی طرح جم گیا جو ناعاقبت اندیش اپنی ہی تحریروں کو حرفِ آخر سمجھ رہے تھے۔ اور نسبتاً نئی نسل کے لوگ پہلے تو کچھ

کسمسائے، پھر جھلائے اور پھر میدانِ عمل میں نکل آئے اور ترقی پسندوں کے قدموں سے ادب کی زمین کھسکنے لگی۔ مظہر امام نے اپنے مضمون 'ترقی پسندی سے جدیدیت تک' میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے اور واضح طور پر ان سب اہم ادیبوں اور شاعروں کے ادبی رویّوں کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے جو اگر سربراہانِ انجمن کے کٹر پن سے بے زار نہ ہوتے، تو ترقی پسند مصنّفین کی تحریک کو بہت آگے لے جاتے اور اسے وقت کا ہم نوا کرتے، کیوں کہ ان سب کا ذہن منجملہ مظہر امام ترقی پسندی کی بنیادی اقدار سے منحرف نہیں تھا اور زندگی کے مثبت رویّے ان کے مزاج کا حصّہ تھے جو آخر تک بھی نہ بدلے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی سلیم، وحید اختر، بلراج کومل، عمیق حنفی، محمد علوی، زبیر رضوی، شہاب جعفری، باقر مہدی، پرکاش فکری، فضیل جعفری، کس کس کے نام گنائے جائیں۔ سب ترقی پسند تھے اور جدیدیت کے سربراہوں میں بھی ان سب لوگوں کے ناموں کی کہکشاں چمک رہی ہے۔ مظہر امام نے اپنے مضمون میں ان اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں:

''یہ صحیح ہے کہ نئی نسل کے بہت سے شعرا ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اس تحریک سے ان کا انحراف تحریک کی سخت گیری، انتہا پسندی، ادعائیت اور سیاسی روش کے باعث تھا۔ ورنہ ترقی پسندی کی صحت مند روایت سے وہ برگشتہ نہ تھے۔ جب انھوں نے محسوس کیا کہ ایک مخصوص سیاسی نظریے کے تحت اجتماعیت کی قربان گاہ پر ذات کو بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے تو وہ ترقی پسندی سے دل برداشتہ ہو گئے۔'' (مجموعہ: آتی جاتی لہریں)

اپنے مضمون 'ترقی پسندی سے جدیدیت تک' میں مظہر امام نے ان سب لوگوں کے بارے میں جن کے نام اوپر کی چند سطروں میں آئے ہیں، ترقی پسندی سے شدید وابستگی کو حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے جن کو یہاں نقل کرنا میں طوالتِ مضمون کے باعث موقوف کر رہا ہوں۔ مظہر امام اس سے بھی آگے گئے ہیں اور ایک ''ادبی مورخ'' کی طرح ان کا اس نتیجے پر پہنچنا کتنا صحیح ہے:

''جدید شاعروں میں ترقی پسندوں ہی کی طرح، بلکہ ان سے بھی بڑھی ہوئی شدّت کے ساتھ گروہ بندی ہے اور توصیف باہمی کا جذبہ کارفرما ہے۔ نئی نسل کے مسائل سے گفتگو کرنے والے شعرا اور ناقدین بھی کٹر پن کا شکار ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے یہاں رواداری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کا فقدان نظر آتا ہے۔'' (مضمون: آتی جاتی لہریں، مطبوعہ شب خون ستمبر 1967)

میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ مظہر امام کی ہر بات میں ترتیب و تنظیم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بچپن سے ہی اپنے آپ کو جس سانچے میں ڈھال لیا تھا، وہ سانچہ آج تک ٹوٹا نہیں ہے (شاعری بھی اس سانچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکی)۔ وہ وسیع المطالعہ آدمی ہیں اور گزشتہ ساٹھ سال کا ادب تو ان کی انگلیوں پر ہے۔ میراجی اور راشد کے دور سے لے کر ترقی پسند تحریک، اس کا پھیلاؤ، پھر اس تحریک کا زوال اور اس کے اسباب، جدیدیت اور مابعد جدیدیت اور ان تحریکات سے متعلق جزئیات، ان کی نظر سے کچھ نہیں بچا ہے اور ہر موضوع پر نہایت اطمینان اور اعتماد سے باتیں کرتے ہیں۔ مظہر امام اس معاملے میں چلتا پھرتا ادبی انسائکلوپیڈیا ہیں۔ ہر دور کے رسائل ان کے پاس ترتیب وار موجود ہیں۔ اپنے مسودوں کو بھی وہ بہت ترتیب سے اپنے اسٹڈی روم میں اسی اہتمام سے رکھتے ہیں۔ اپنے بارے میں ایک ایک تحریر، جس تک رسائی ہو سکی، ان کے پاس موجود ہے۔ خطوط کو بہت احتیاط سے رکھتے ہیں بلکہ اب ان کے نام مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ 'نصف ملاقات' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دو تہائی عرصے میں ہمارا ادب بہت پُر پیچ راہوں سے گزرا ہے۔ مظہر امام چاہے دربھنگہ رہے ہوں یا کلکتہ، یا کٹک یا گوہاٹی یا پٹنہ، یا پھر کشمیر، سری نگر۔ وہ ذہنی طور پر اس منظر نامے سے ہر جگہ قریب رہے۔ ترقی پسند تحریک دور کے اہم رسائل و اخبارات نظام، سویرا، شاہراہ، نیا ادب، صبا، گفتگو، نیا دور، افکار اور نقوش وغیرہ سب پر ان کی گہری نظر ہے اور اس موضوع پر جب بھی ان سے گفتگو ہوتی ہے تو ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان سے زیادہ باخبر ادیب کوئی اور نہیں ہے جو تمام تحریکات سے واقف ہو۔ پرانے ترقی پسندوں کی صفوں میں سے تو ایک ایک آدمی اٹھ گیا۔ بمبئی گروپ کا جیسا بُرا بھلا ہوں، میں زندہ ہوں۔ حیدرآباد میں اب نہ مخدوم ہیں نہ سلیمان اریب اور نہ ابراہیم جلیس، نہ محبوب حسین جگر۔ دلّی میں اب نہ پروفیسر سلامت اللہ ہیں، نہ پرکاش پنڈت اور نہ غلام ربانی تاباں۔ الٰہ آباد سے احتشام حسین اور اعجاز حسین بھی رخصت ہوئے، وامق جونپوری بھی گئے۔ جدھر نظر ڈالئے اپنے ہم نفسوں کا قحط ہے۔ ایسے میں مظہر امام کی ذات ایک نعمت ہے جو ہر طرح کے تعصب سے پاک ہے اور بغیر لاگ لپیٹ کے بات کرتی ہے۔

مظہر امام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شخصیت کی تشکیل بچپن سے شروع ہو جاتی ہے۔ ان کا نامۂ اعمال کہیں سے اٹھا کر دیکھ لیجیے آپ کی ایک متوازن شخص سے ملاقات ہوگی۔ ایک بے حد ادبی دیانت داری کا حامل شخص، خوش اخلاق، خوش گفتار، خوش کردار، خوش مزاج، خوش خوراک اور خوش لباس۔ اور سب سے زیادہ اہم بات... خوش فکر شاعر...

ان کے ایوانِ شاعری میں قدم رکھنے سے پہلے ان کی نثر کے بارے

میں چند باتیں اور۔ ان کی بہت سی تحریروں کا محور مغربی بنگال اور بہار ہے۔ انہوں نے اس خطے کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب 'آتی جاتی لہریں' میں اٹھارہ میں سے چھ مضامین صرف بہار کے ادب اور ادیبوں کے بارے میں ہیں (1) شاد عظیم آبادی: نئی غزل کے پیش رو (2) داغ کا ایک غیر معروف شاگرد: سعادت پیغمبر پوری (3) ناقدوں کے مقتول: پرویز شاہدی (4) اختر اورینوی کا بہترین افسانہ (5) کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، اور (6) ادب اور بہاریت۔ اور ان کی کتاب 'اکثر یاد آتے ہیں' میں (1) ملیح آبادی، مولانا عبدالرزاق (2) اشک امرتسری (3) جمیل مظہری (4) پرویز شاہدی (5) اور اختر قادری اسی خطے کے رنگ و آہنگ اور تہذیبی اقدار کے امین ہیں۔ اس کتاب میں باقی تین مضامین جگر مراد آبادی، کرشن چندر اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی یادوں پر مشتمل ہیں۔ جمیل مظہری پر ان کا ایک مونوگراف الگ شائع ہوا اور ان کی کتاب 'ایک لہر آتی ہوئی' میں بھی خاص طور پر تین مضامین جو بہت اہم ہیں، اُن میں ایک مضمون شاد عظیم آبادی کے شاگرد نظر در بھنگوی پر ہے۔ ایک مضمون 'بہار میں اُردو افسانہ' اور تیسرا مضمون 'مغربی بنگال میں اُردو شاعری'۔ آخر الذکر دو مضامین میں تو مظہر امام نے معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ ایسے مستند کہ ان کی بنا پر تحقیقی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔

میں مظہر امام کے اس رویے کو علاقائی عصبیت نہیں کہوں گا بلکہ یہ اس ماحول کی عکاسی ہے جس میں انہوں نے آنکھ کھولی، تربیت پائی، سیکھا، سماجی اور تہذیبی شعور کا اکتساب کیا اور اپنے تخلیقی ذہن کو جلا بخشی۔ یہ ایک طرح سے اپنی دریافت اور خود شناسی کا عمل بھی ہے کیوں کہ ان مضامین میں مظہر امام محض راوی نہیں ہیں بلکہ خود بھی ایک کردار کی طرح ہر جگہ جلوہ گر ہیں اور یہی ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ جگہ جگہ ان کی ذات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں تو خود نوشت کا لطف آتا ہے اور جگر مراد آبادی، کرشن چندر اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی یادوں میں بھی وہ بہ نفس نفیس موجود ہیں اور ان کی شخصیت کی جگہ جگہ جلوہ آرائی ہے۔

مظہر امام کا تنقیدی شعور بہت بالیدہ ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے حوالے سے ان کے خیالات کا ذکر تو آ ہی چکا ہے۔ 'ایک لہر آتی ہوئی' کے ابتدائی تین مضامین 'ایک لہر آتی ہوئی'، 'ادبی تنقید گمراہی کا منشور' اور 'آج کا ادیب کتنا ادیب' میں ادب اور ادیب کے بنیادی مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ ان مضامین میں مظہر امام نے موجودہ معاشرے میں ادب کی صورت حال، تنقید و تحقیق کی ارزانی، اور تخلیقی فن کار کی زبوں حالی کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ صاف اور دو ٹوک لہجے میں کھری کھری باتیں کہی ہیں۔ اس کتاب کے دیگر مضامین کلاسیکی شعرا غالب، اقبال، جوش، حسرت اور فراق پر ایک خاص نوعیت کے حامل ہیں اور نہایت جرأت مندانہ ہیں۔ ان کا مضمون 'غالب بے رنگ' اس جملے سے شروع ہوتا ہے:

''غالب کے بارے میں جب میں سوچتا ہوں تو مجھے سرکس کے اس مسخرے کا خیال آتا ہے جو اپنا رنگ بدل بدل کر اور عجیب و غریب حرکتیں کر کے دوسروں کو ہنسانے اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہے۔''

مضمون 'حسرت کی غزل کا نشان امتیاز' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حسرت مجموعۂ اضداد تھے۔ ان کی ذات تین خانوں میں منقسم تھی: شاعری، سیاست اور تصوّف۔ ان تینوں کے تقاضے الگ الگ ہیں اور حسرت کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے تینوں کے مطالبات الگ الگ پورے کئے اور کسی کو ایک دوسرے سے ٹکرانے نہیں دیا۔ حسرت کی غزل مدھم رفتار سے بہتی ہوئی ندی کی طرح ہے۔ نہ پُر شور، نہ ٹھہری ہوئی۔''

'اقبال تیسری دنیا کے لئے' بھی بھرپور، قدرے تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ وہ اقبال کی شاعری اور نثر اور نظریات سے بحث کرتے ہوئے اس نقطے تک آتے ہیں:

''کیا اقبال کی شاعری جدو جہد، ثابت قدمی، استقامت، خود اعتمادی، اور بے خوفی کا استعارہ نہیں؟ آج تیسری دُنیا کو اور کیا چاہئے۔''

'جوش: جاہ و جلال کا شاعر' میں مظہر امام نے جوش کے عروج و زوال کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ایک وقت تھا جب انہیں اقبال کے بعد اُردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا تھا، پھر ان کی اقلیم میں فراق اور فیض کی خود مختار ریاستیں اُبھر آئیں اور جوش کی سلطنت پر حملہ آور ہو گئیں۔''

'فراق پر چند خیالات'، 'جدید نسل اور احتشام حسین'، 'فیض کی تنقیدیں'، 'مطالب الغالب' (سہا مجددی) جگن ناتھ آزاد کا سفر نامہ 'پشکن کے دیس میں' اور آخری مضمون 'حامدی کاشمیری: شاعر نقاد' جیسے مضامین مظہر امام کے تنقیدی شعور اور ناقدانہ خود اعتمادی کے آئینہ دار ہیں۔ 'آتی جاتی لہریں' کتاب میں ان کے مضامین 'شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو'، 'سلام مچھلی شہری: طوفان بہاراں کا شاعر'، 'آنکھ کا شاعر: محمد علوی'، 'نیا اردو افسانہ'، 'علی عباس حسینی کا اوّلین افسانہ'، 'مخمور جالندھری کی شاعری کا دور اوّلین'، 'عصمت چغتائی، زبان کی افسانہ نگار' اور کرشن چندر کی فلم 'سرائے کے

باہر بڑی محنت سے لکھے ہوئے مضامین ہیں اور ادب کی جملہ اصناف سے مظہر امام کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں۔ 'نگارشات آرزو جلیلی' مظہر امام کا تحقیقی کارنامہ ہے۔ آرزو، جن کا انتقال صرف 35 سال کی عمر میں 1941ء میں ہو گیا تھا، اپنے وقت کے مقبول مضمون نگار تھے۔ آج ساٹھ سال بعد اس گوہر نایاب کی مظہر امام نے بازیافت کی۔ ان کے مضامین کو مختلف رسالوں اور لائبریریوں سے چن کر اکٹھا کیا، ایک طویل اور مدلل مقدمہ سپرد قلم کیا اور 2001 میں یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی۔

مختصر یہ کہ مظہر امام کی نثری کائنات رنگا رنگ ہے۔ اس میں بہت سے موسم ہیں: کلاسیکی اور نیم کلاسیکی ادب کی نئی تفہیم، مشرقی ہندوستان کے ادبی ماحول کی نشان دہی اور بازیافت، تحریکوں اور رجحانات کی دھوپ میں جھلتے ہوئے معصوم تخلیقی فن کار کے لئے جائے پناہ کی تلاش۔

ہر چند کہ مظہر امام نے نثر میں وقیع کتابیں لکھیں، لیکن ان کی پہچان شاعر کی حیثیت سے ہی ہے۔ مظہر امام اپنی شاعری کے حوالے سے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری اُردو دنیا میں مقبول ہیں، لیکن ایک حیثیت قابلِ رشک ہے کہ جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کے بعد وہ بالخصوص مشرقی ہندوستان کے سب سے اہم، معتبر اور مقبول ترین شاعر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی مثال مخدوم محی الدین سے ملتی ہے کہ وہ اگرچہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے مگر دکن میں وہ اپنے دور میں لاثانی تھے۔ وہ سراج و ولی کے بعد دکن کی پہچان بن کر افقِ شاعری پر نمودار ہوئے۔

مظہر امام ترقی پسند تحریک سے متاثر ہی نہیں، وابستہ تھے۔ ان کی جس نظم نے مجھے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ ہے 'اشتراک'۔ ایک مختلف نظم، بکھرا اجتماعی شعور کو جلا دیتی ہوئی:

خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک غم کے سوا
چہرہ اُترا ہوا
بال بکھرے ہوئے
نیند اُچٹی ہوئی
خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آ ہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں

یہ نظم سپاٹ نظم نگاری کی روش سے الگ معاشرے میں فرد کی بدحالی کو انفرادیت کے تنگنائے سے نکال کر اجتماعیت کی کھلی فضا میں لائے اور اس مجروح معاشرے میں ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا استعارہ ہے۔ کتنی جدید ہے اس روایتی ترقی پسندی سے جس میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا گیا تھا:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

ان کی ایک اور نظم 'وہ دیکھو' نئی زندگی کے اس افق تازہ کا منظر پیش کرتی ہے، جس کی طرف پوری ترقی پسند شاعری نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ وہی صبح و شام ہیں اور وہی سراب۔ بہرحال مظہر امام کی نظم کا رنگ و آہنگ اپنے ہم عصروں سے مختلف ہے۔ ایک خوب صورت تمنا جو جمالیاتی پیکر بن گئی ہے:

مرے پردۂ ذہن پر مرتسم ہیں ترے خد و خال شگفتہ
وہ شب رنگ زلفیں، پریشان زلفیں،
جو دیتی ہیں تمکین کا درس اہلِ جنوں کو
وہ درخشاں جبیں، نور افشاں جبیں،
روکش بزم پروین و زہرہ
وہ سرشار آنکھیں، فسوں کار آنکھیں،
جو احساس مردہ میں بھی روح نو پھونکتی ہیں
وہ شاداب عارض، حیا کیش عارض،
کہ جن کا تصور بھی محزوں دلوں کو شفا بخشتا ہے
وہ لعل آفریں لب، گہر بار لب،
جن کی سرخی سے بنتے ہیں دامانِ ہستی پہ نقش و نگار تمنا
ان ہی کیف زا منزلوں تک پہنچنا مرا مقصد زندگی ہے
مگر طبع پر بے حسی کیوں ہے طاری
یہ کیوں میرے جذبات پر مردنی چھا رہی ہے

اس نظم کو اگر کسی حسینہ کی شان میں تصور کیا جائے تو نادانی ہوگی۔ یہ تمام حسین اشارے استعارے ہیں اس خوش آئند زندگی کے جو ابھی ہمارے خوابوں میں ہے۔ مظہر امام نے صرف ایک مصرع کہہ کر اس منزلِ آرزو کی طرف اشارہ کر دیا ہے:

ان ہی کیف زا منزلوں تک پہنچنا
مرا مقصد زندگی ہے

کیف زا منزلوں کی طرف سفر، مسلسل سفر مظہر امام کی شاعری سے عبارت ہے، اور ان کیف زا منزلوں کے سفر میں وہ ہر منزل کو ایک رہ گزر سمجھتے ہیں۔ اپنے خوب صورت اور جامع موضوع کے علاوہ یہ نظم آزاد نظم نگاری کا

بہترین نمونہ ہے۔ اپنی نظم 'شعاعِ فردا کے راز دانو!' میں مظہر امام اپنے ہم مشربوں سے کہتے ہیں:

شعاعِ فردا کے راز دانو!
جو تم زمان و مکاں کی پہنائیوں سے آگے
کوئی نئی رہ گزار پاؤ
تو کاروانِ حیاتِ خستہ کا نام لینا
شکستہ پا کا سلام لینا

اندھی قسم کی رجائیت کو مظہر امام کی عقلِ سلیم نے قبول نہیں کیا اور ایک تشکیک ان کے یقین کو متزلزل کرتی رہی۔ اور یہ بڑھتی ہوئی بے یقینی انہیں روایتی خیموں سے باہر کھینچ لائی۔ ان کی نظم 'اکھڑتے خیموں کا درد' اس کرب اور ذہن میں پلتے ہوئے اس طوفان کا پتہ دیتی ہے جو عقیدوں کو تہہ و بالا کرسکتا ہے۔ یہ نظم شدتِ تاثر اور کربِ نارسائی کی ایک مثال ہے۔ یہ نظم ترقی پسندی اور جدیدیت کے پل پر کھڑی ہے:

اکھڑتے خیموں کا درد
کہیں بھی جائے اماں نہیں ہے
نہ روشنی میں، نہ تیرگی میں
نہ زندگی میں، نہ خودکشی میں

عقیدے نیزوں کے زخم کھا کر سسک رہے ہیں
یقین کی سانس اکھڑ چلی ہے
نڈھال خوابوں کے ہونٹ سے خاک و خوں کے شعلے ابل رہے ہیں
عزیز قدروں پہ جاں کنی کی گرفت مضبوط ہوگئی ہے
پتنگ کی طرح کٹ چکے ہیں تمام رشتے
جو آدمی کے قریب کرتے تھے آدمی سے
دلوں میں جن سے شعاعیں قوسِ قزح کے آنچل کی پھوٹتی تھیں
نہ فرد کا سائباں سلامت
نہ انجمن کا مکاں سلامت
کوئی خدا ہے تو وہ کہاں ہے؟
کوئی خدا تھا تو وہ کہاں ہے؟

مہیب طوفاں مہیب تر ہے
پہاڑ تک ریت کی طرح اڑ رہے ہیں
بس ایک آواز گونجتی ہے
"مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ"
مگر کہیں بھی اماں نہیں ہے
جو اپنی کشتی پہ بچ رہے گا
وہی علیہ السلام ہوگا

آدمی آدمی سے دُور ہوتا چلا جارہا ہے۔ نہ فرد کا سائباں سلامت، نہ انجمن کا مکاں سلامت۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ کون کسے بچائے، سبھی مبتلائے عذاب ہیں۔ مظہر امام کی یہ نظم اس دور کا المیہ ہے جس میں آدمیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ بس ایک ان جانی تلوار ہے جو سبھوں کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ کیا زبان، کیا تکنیک اور کیا تاثر۔ یہ نظم مظہر امام کا شاہ کار ہے۔

مختصر اور سہلِ ممتنع نظم کہنا اور ایسی نظم جو زندگی کی حقیقتوں کا عکس ہو، بہت مشکل کام ہے۔ ایسی نظم کہنے کے لئے ریاضتِ فن درکار ہے۔ جس کے معانی اس کے الفاظ سے پرے ہوں اور جو سماعت کی گہرائیوں تک پہنچ کر روح میں جاں گزیں ہوجائے۔ ایسی ہی ایک نظم ہے 'وہ ایک بات':

میں نے اک بات محسوس کی
میں نے وہ بات تم سے کہی
تم نے اُس سے کہی
اُس نے اُن سے کہی
پھر مجھے بھی نہ اس کی خبر ہوسکی
کس نے کیا بات کس سے کہی

ایک اور نظم 'ٹھہرے ہوئے لمحے سے پرے':

آؤ
کچھ دیر یہاں بیٹھیں
کوئی بات کریں
جنگ کا ذکر سہی
باغ کے ہنستے ہوئے پھول کی تعریف سہی
رقص اور سنگ تراشی کے مسائل پہ کوئی بحث سہی
یہ ضروری تو نہیں ہے کہ بحث ہی کریں

ان دونوں خوب صورت نظموں پر تبصرہ کرکے میں ان کے کیف کو زائل نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تو فائن آرٹ کے نمونے ہیں۔ مظہر امام کی نظم نے اپنا سفر بہت سنبھل سنبھل کر اور سوچ سوچ کر طے کیا ہے۔ انہوں نے ایک مصور کی طرح اپنی نظموں کو تراشا ہے، ان کے فن کو نکھارا اور سنوارا ہے۔

غزل ایک پامال صنف ہے، مگراتنی سخت جاں کہ ہر پچاس سال بعد تازہ دم ہو اٹھتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے مجموعی طور پر غزل سے بے اعتنائی برتی۔ اگر چہ چند غزلیں مجاز اور جذبی اور پھر مجروح کی سنائی دیتی رہیں۔ فیض نے جب سلاخوں کے پیچھے اپنی نوا بدلی تو جیسے باسی کڑھی میں ابال آگیا۔ اور پھر غزل ہی غزل۔

مظہر امام نے غزل کو ایک نیا صوتی آہنگ دے کر اسے آزاد شاعری سے قریب کردیا۔ آزاد غزل ایک نئے تجربے کے طور پر سامنے آئی۔ یہ نئی صنف ایجادِ مظہر امام ٹھہری:

گونجتی ہے ریت پر اب بھی صدائے نقشِ پا
کون تھا وہ اے سمندر کی ہوا

دراصل نئی غزل نے نئی نظم سے لفظیات، تلازمے، تشبیہیں اور استعارے لئے اور اس طرح جدید غزل قدیم رنگِ سخن سے ممیز ہوگئی۔ نئے موضوعات، نئے مسائل، جن کے لئے اب تک غزل کے دروازے بند تھے، وہ غزل میں در آئے۔ اشاریت اور ابہام غزل کا اپنا مزاج ہے۔ سب چیزوں کے امتزاج سے غزل نے ایک خوب صورت رنگ و آہنگ اپنایا۔ اس تناظر میں مظہر امام کی غزل کے چند شعر:

اس نے اس طرح اُتاری مرے غم کی تصویر
رنگ محفوظ تو رہ جائیں پہ منظر نہ رہے

اِک تیغ اَنا تھی جسے سب چوم رہے تھے
اب کے سرِ مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا

اس نے کس ناز سے بخشی ہے مجھے جائے پناہ
یوں کہ دیوار سلامت ہو، مگر گھر نہ رہے

اب کیا یہ دھواں سا اُٹھ رہا ہے
وہ شہر تو کب کا جل چکا ہے

کشتیاں روشنی کی بلاتی رہیں
ساحلِ شب سے ہوکر گزر جاؤں گا

معنی کی دھنک بن کر الفاظ میں ڈھل جاؤ
تم موم ہو یا شعلہ، جو بھی ہو پگھل جاؤ

چھپی تھی موت کی باہوں میں روح تشنہ لبی
چمکتی ریت میں ڈوبا ہوا سفینہ تھا

جسم کی آگ پر پھول کھلتے ہوئے
ایک گھر تیز بارش میں جلتا ہو

بخت ہوتے ہوئے آبشاروں کے لب
برف کی طرح موسم پگھلتا ہوا

یہ کھیل بھول بھلیاں میں ہم نے کھیلا بھی
تری تلاش بھی کی اور خود کو ڈھونڈا بھی

یہ چند اشعار بغیر کسی ترتیب اور تبصرے کے مظہر امام کی کتابوں سے چن کر پیش کر رہا ہوں۔ نظم کی طرح صنفِ غزل پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ 'پچھلے موسم کا پھول' اور 'بند ہوتا ہوا بازار' ان کی غزلوں کے مجموعے ہیں۔ اوّل الذکر کو ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی مل چکا ہے۔ ان کے دوسرے شعری مجموعے ہیں 'زخمِ تمنا'، 'رشتہ گونگے سفر کا' اور 'بند ہوتا ہوا بازار'۔

مظہر امام نے مقبولیت کے بہت سے ریکارڈ قائم کئے ہیں اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ انہیں غالب ایوارڈ، حکومت بہار کا مولانا مظہر الحق ایوارڈ اور بہت سی اُردو اکیڈمیوں کے خصوصی انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کے فکر و فن اور شخصیت پر جموں، متھلا، رانچی، ہزاری باغ اور بہار یعنی پانچ یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے بھی لکھے جاچکے ہیں اور اُن پر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی جاچکی ہیں۔ رسالہ 'رابطہ' نے ان کا خصوصی نمبر نکالا اور تقریباً نصف درجن کتابیں ان کے کام پر شائع ہو چکی ہیں:

1۔ مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر امام اعظم
2۔ مظہر امام کی تنقید نگاری — ڈاکٹر محمد رضا کاظمی
3۔ مظہر امام: نئے منظر نامے میں — جمال اویسی
4۔ دستارِ طرح دار (منظوم جائزہ) — ڈاکٹر عبدالمنان طرزی
5۔ مظہر امام: نئی نسل کے پیش رو — ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

مظہر امام کی شخصیت اور شاعری کے متعلق بے شمار لوگوں نے اپنی رائے لکھی ہے۔ ظاہر ہے ان کی رائے دہرانا تو کجا، ان کے نام گنانا بھی مشکل ہے۔ میں آخر میں صرف کرشن چندر کی رائے پر اکتفا کرتا ہوں۔ (حوالہ 'رابطہ' مظہر امام نمبر، ص 97):

''مظہر امام کی شاعری میں آپ کبھی تو یقین سے ابہام کی طرف جاتے ہیں اور کبھی ابہام سے یقین کی طرف۔ یہ دوہری حرکت مظہر امام کی شاعری کی خصوصیت ہے اور انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اپنی ذات کے دائرے میں منفرد اور الگ ہیں، مگر سماجی حلقے میں پہنچ کر دوسروں سے جڑے ہوئے بھی ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت جزیرہ بھی ہیں اور جزیرہ نما بھی۔ وہ ایک معقول متوازن شعری مزاج کے مالک ہیں اور اس وجہ سے متضاد ادبی حلقوں میں بھی عزت اور وقار حاصل کر لیتے ہیں۔'' OO

غزلیہ شاعری

حسینۂ غزل کی حنابندی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

مظہر امام بنیادی طور پر 'زخم تمنا' اور ذات کی کرید کے شاعر ہیں۔ ذات کی کرید کا ذکر کرتے ہوئے میں اس دور میں انہیں وجودی فکر کے شاعروں میں نہیں گردانوں گا اس لئے کہ ابھی تک اس کرید نے کسی فلسفہ یا بنیادی تصور کی شکل اختیار نہیں کی ہے۔ یہ ابھرتی ہے ان کے دل کے نہاں خانوں سے اور ان کے ذاتی تجربات کے آنگن میں کھیلتی ہوئی شعر کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس میں درد بھی ہے، ملال بھی ہے، کسک بھی ہے، خوشیوں کی چہکتی چڑیاں بھی ہیں، نزاکت جذبات بھی ہے، اور لطافت خیالات بھی، تمنا بھی ہے اور زخم بھی۔ ذیل کے چند اشعار سے اس تنوع کا پتہ چلایا جا سکتا ہے:

جب آپ خود بھی اپنی ادائیں نہ گن سکے
میں داغ ہائے دل کا کروں کس طرح شمار

آپ مجھ پر نگاہ مت کیجئے
آپ کو دیکھنا نہ آجائے

اک گزارش ہے بس اتنا کیجئے
جب کبھی فرصت ہو آیا کیجئے

محو ہوتی ہی نہیں یاد تری
کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے

اور گہرے ہوئے جاتے ہیں جدائی کے یہ زخم
دست مہتاب میں شمشیر ہے معلوم نہ تھا

ان کی اس دور کی شعری واردات سہل ممتنع یا ہلکے پھلکے جذبات تک محدود نہیں۔ اس میں ایک انداز تفکر بھی ملتا ہے۔ یہ تفکر کسی نظام فلسفہ کا تابع نہیں بلکہ ذاتی مشاہدہ اور تجربات کا زائیدہ ہے:

درد ہر دل کا مرے دل میں سمٹ آیا ہے
مجھ کو احساس کی دولت بھی گراں گزری ہے

اب بھی پردے میں وہی پردہ دری تو دیکھو
عقل کا دعویٰ بالغ نظری تو دیکھو

زندگی خواب نہیں ایک حقیقت ہی سہی
لیکن اکثر یہ حقیقت بھی گراں گزری ہے

مظہر امام ابتدا سے 'تہذیب غزل' سے واقفیت کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی جیسے غزل کی آبرو کے پاسبان نقاد اس کی شہادت دیتے ہیں۔ "اس کم عمری میں زبان و بیان پر اتنی قدرت تعجب و تعریف کی بات ہے۔' ان کی 'شعری انفرادیت' کو تقریباً سب نے ابتدائے سخن سے محسوس کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مظہر امام کی بہترین شاعری ان کی شخصیت کے بہترین لمحات کی عکاسی کرتی ہے... مظہر امام کی اس دور کی شاعری کے بہترین حصوں کو پڑھتے وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے ایک سچا اور اچھا شاعر ہے۔ سچا خود اپنے سے اور اچھا باعتبار فن۔ مجھے ہمیشہ اس بات پر تعجب رہا کہ مظہر امام ابتدا سے اتنی پختہ شاعری کیوں کر کر سکے ہیں۔ کیا ناپختہ کلام کا بیش تر حصہ ضائع تو نہیں کر دیا گیا ہے؟

غزل میں مظہر امام کے مخصوص رنگ اور انفرادیت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا جا سکتا ہے: مدھم لہجہ، چبھتی ہوئی نزاکت خیال، واقعات و واردات کا اچھوتا تجربہ اور مشاہدہ روایت سے قریب تر لیکن اس میں جدت اظہار کا اس قدر بل کہ مانوسیت ختم نہ ہونے پائے۔ ان کی غزل پر کسی دوسرے کی غزل کا دھوکا کبھی نہیں ہوتا۔ قافیہ پیمائی سے زیادہ خود پیمائی کا ذوق، ہر شعر میں گرہ کا مال اور اپنا جان کا وبال۔ خود سے غلطاں و پیچاں اور اپنی ہی راکھ میں اپنے دل کی کرید۔ بعض اوقات تو واردات اس قدر تازہ ہوتی ہے کہ اس سے خون دل کی مہک تک آتی ہے۔

اب تو کچھ بھی یاد نہیں ہے
ہم نے تم کو چاہا ہوگا

کردیا آپ کی قربت نے بہت دور مجھے
آپ سے بُعد کا احساس نہ اتنا تھا کبھی
آداب وفا سے واقف تھے ہم جرأت بے جا کیوں کرتے
خاموشی لب ہی کافی تھی الفاظ کو رسوا کیوں کرتے
میرا فن میری غزل تیرا اشارہ تو نہیں
حسن تیرا اسی پردے میں خود آرا تو نہیں؟

مظہر امام کا ذہن ابتدا سے تجرباتی رہا ہے۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ اس کے تنگنائے میں دم گھٹنے لگا تو آزاد نظموں کی جانب توجہ کی۔ لیکن روایت اور غزل کے چسکے نے انہیں مجبور کیا کہ وہ غزل کی ہیئت میں بھی تجربہ کریں۔ انہوں نے اس تجربے کو 'آزاد غزل' کا نام دیا اور جب اس کے بارے میں لے دے ہوئی تو 'شب خون' (جولائی، اگست 81ء) میں اس کی حمایت میں ایک تفصیلی مضمون لکھا۔ مضمون کا انداز بہت مدلل، منطقی اور غیر مجادلانہ ہے، یہ خوشی کی بات ہے۔ آزاد غزل کی ہیئت ترکیبی مصرعوں میں بحر کے ارکان کم یا زیادہ کردینے سے قائم کی جاتی ہے ورنہ کیا باعتبار قافیہ وردیف اور کیا باعتبار بحر باقی تمام اجزا بدستور قائم رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی پہلی آزاد غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا آپ ہیں
عشق طوفاں ہے، سفینہ آپ ہیں
آرزوؤں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے افق پر جگمگایا جو ستارا آپ ہیں
کیوں نگاہوں نے کیا ہے آپ ہی کا انتخاب
کیا زمانے بھر میں یکتا آپ ہیں؟

جب کہ شعری تجربے کی حیثیت سے میں اس ہیئت کی قدر کرتا ہوں، مجھے کبھی کبھی اندیشہ ہوتا ہے کہ جو آزادی اس ہیئت میں حاصل کی گئی ہے اس میں کھویا زیادہ پایا کم ہے۔ بحر کے ارکان کے تکرار اور قافیہ کی جھنکار سے جو ترنم پیدا ہوتا ہے وہ اس میں مفقود ہے۔ شاعر کا قافیہ اس ہیئت میں بھی تنگ رہتا ہے اور رکن کی کمی بیشی سے اظہار کے وسائل میں آزاد نظم کی سی وسعت نہیں ملتی بلکہ یہ 'پابند نظم' کی ساری بندشوں کی حامل دکھائی دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی تک آزاد غزل مظہر امام کی شاعری میں بھی تجربے کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ ہمیں آزاد غزلوں کے ایک لائق اعتنا مختصر مجموعہ کا انتظار رہے گا۔

کشمیر آکر مظہر امام نے اپنی غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ 'سایوں' اور 'اندیشوں' سے رنگوں اور خوشبوؤں کی اس وادی میں مراجعت ان کی شاعری کے لئے نیک فال ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ رومان اور واردات دل ایک خاص عہد کے بعد زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ عظیم شعرا کے دل میں یہ آنچ آخر وقت تک رہتی ہے اور وہ جب چاہتے ہیں اسے انسانی، کائناتی اور مابعد الطبیعاتی سطح پر بھڑکا سکتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو اس دور کی غزلوں میں امام کے لہجے اور ان کی آواز کو بھی پہچاننے کی کوشش کیجیے:

تو ہے گر مجھ سے خفا خود سے خفا ہوں میں بھی
مجھ کو پہچان کہ تیری ہی ادا ہوں میں بھی
ثبت ہوں دست خموشی پہ حنا کی صورت
ناشنیدہ ہی سہی! تیرا کہا ہوں میں بھی
تو وہ دولت کہ جسے خرچ نہ ہونا آیا
میں ہوں اک قرض اگر تجھ سے ادا ہو جاؤں
اس نے ہمت جو بڑھائی بھی تو رکھا یہ لحاظ
کوئی بزدل نہ بنے، کوئی دلاور نہ رہے
اب یہ سازش ہے کہ لکھے نہ کوئی قصۂ دل
لفظ رہ جائیں، مگر کوئی سخن ور نہ رہے

یہ خوش آئند بات ہے کہ ان غزلوں پر کسی تحریک کا بھی ٹھپہ نہیں ملتا۔ صرف مظہر امام کے مخصوص رنگِ تغزل اور منفرد لہجہ کی چھاپ ملتی ہے۔ ان میں 'زخم تمنا' کی غزلوں کی تمام نزاکتوں کے ساتھ اسلوب اور اظہار کی پختگی کا احساس ملتا ہے اور اس کے ساتھ یہ اعتماد کہ غزل میں اب بھی جادو جگایا جاسکتا ہے اور فتنے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ زبان اظہار بھی ہے اور ایک صوتی و معنیاتی ساخت بھی۔ ہر شاعر کا فرض ہے کہ وہ اس اظہار کے لئے اپنے قلب کے بے پایاں سمندر میں غوطہ زن ہو اور اس سے زیادہ اس کی ذمہ داری ہے کہ ہر واقعہ یا واردات کو وہ اپنے خون میں محسوس کرے اور زبان کی ساخت کے ان گنت امکانات کو اس کے اظہار کے لئے بروئے کار لائے۔

مظہر امام کی زبانِ شعر پر قدرت ابتدا سے مسلم ہے۔ مجھے نہیں معلوم حسینۂ شاعری کی حنابندی کے لئے ان کے خون جگر میں کس قدر رنگ باقی ہے۔ شعری واردات میں 'جنس' زیادہ دور تک دست گیری نہیں کرتی۔ یہ صرف شاعر کو سلگا اور بھڑکا دیتی ہے۔ اس کے بعد 'بقا پسند' شاعر کو ترفع جذبات کی ایک مابعد الطبیعات کی ضرورت ہوتی ہے۔

مظہر امام اس فکری سطح کو بنانے میں کہاں تک کامیاب ہوسکیں گے، یہ صرف زمانہ بتائے گا۔

ضبط نظم

مظہر امام کی نظمیں: ایک مطالعہ

جمال اویسی

مظہر امام نے غزل کے مقابلے میں نظمیں کم لکھی ہیں اور ان نظموں پر ادوار کے فرق کے ساتھ کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کے اثرات ہیں۔ مگر ان تمام نظموں کا بنیادی محور جدیدیت ہے۔ اگر جدیدیت مظہر امام کی نظموں کی کلید ہے تو ان کی نظموں کے تناظر میں کلاسیکیت زبان کی سطح پر، ترقی پسندی خیال کی سطح پر اور جدیدیت بیان کی سطح پر نمودار ہوتی ہے۔ ان تین عناصر کے امتزاج سے کئی اور باتیں بھی سامنے آسکتی ہیں، مثلاً:

1۔ شاعر کے متعلقہ دور کی سماجی اور خانگی زندگی میں اتھل پتھل

2۔ سیاسی واقداری شکست وریخت

3۔ مراکز ومحور کا ٹوٹنا بکھرنا

4۔ 1940 کی جنگ عظیم کے بعد فرد کا معاشی سطح پر عدم استحکام اور

5۔ رومان کے قدیم تصورات پر کاری ضرب۔

مظہر امام کی نظم کے مسائل ارضی اور نفسیاتی ہیں۔ مظہر امام کی ابتدائی نظموں پر جابجا راشد کی 'ماورا' کی نظموں کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اثرات خیالات کی سطح پر تو نہیں تکنیک، ہیئت، پیش کش اور اسلوب کی سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ مظہر امام کی نظم 'ترائلے' کا مطالعہ اس کے لئے مفید ہوگا۔

مرا شباب غم و یاس سے عبارت ہے
نہیں ہے کوئی سہارا نہیں ہے کوئی امید
مرے وجود کی دنیا کو کیا ضرورت ہے
نہیں ہے کوئی سہارا نہیں ہے کوئی امید
یہ زندگی ہے کہ اک بوجھ ایک لعنت ہے
نہ کوئی لطف ساعت نہ کوئی لذت دید
مرا شباب غم و یاس سے عبارت ہے
نہیں ہے کوئی سہارا نہیں ہے کوئی امید

اس ترائلے میں تین الگ سے مصرعوں کو چھوڑ کر تمام مصرعے ایک جیسے ہیں اور ان کی جاں کاہ تکرار ہے، جو ترائلے کی ہیئت کا تقاضہ ہے۔ راشد کی 'ماورا' کے اوراق پلٹئے تو شروع میں کئی سانیٹ نظر آئیں گے۔ لیکن راشد کے یہاں تھکا دینے والی لفظیات نظر نہیں آئے گی۔ مظہر امام کی پوری نظم اعصاب کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ یہ نظم مظہر امام کی بالکل ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے جب ان کے شاعرانہ خیالات نے کوئی واضح جہت اختیار نہیں کی تھی۔ پژمردگی، موت کی خواہش اور دنیا بے زاری اس زمانے کی نظموں کے حاوی موضوعات ہیں۔ مظہر امام کی نہایت مختصر سی نظم ہے 'حیات آوارہ' جس میں موت کی شدید خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ نظم پیش خدمت ہے:

حیات آوارہ

جیسے کوئی شاعر ناکام تڑپے داد وتحسیں کے لئے
آرزوئیں جس طرح دل کی خلاؤں میں ہوں محو پیچ وتاب
دشت میں گرتا ہو کوئی تشنہ لب جس طرح پانی کی تلاش
ڈھونڈتا ہے سایہ جیسے گرمیوں کی دوپہر میں آفتاب
زندگی یوں ہی بھٹکتی پھر رہی ہے جستجوئے موت میں

مایوسی، محرومی اور خواہش مرگ سے بھری ہوئی نظموں کو سمجھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مظہر امام کے دیباچہ 'اعتراف' کے مندرجہ ذیل بیانات پر غور کیا جائے:

"جہاں اپنے قدامت پسند خاندان و ماحول کے چند اوصاف کو سینے سے چمٹائے رہنے کو جی چاہتا تھا وہیں اس ماحول کے تاریک پہلوؤں نے کچھ اتنی بے زاری پیدا کر دی تھی کہ اس فضا میں اپنا وجود ایک آزار مستقل، ایک حبس دوام بن گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جوش میرے افکار پر مسلط تھے۔ ان کے سحر سے چھوٹا تو پہلے راشد، فیض اور یوسف ظفر اور پھر فراق اور اختر الایمان سے نیاز حاصل ہوا۔ 1946 تک کی میری شاعری میں ان سب

کے ملے جلے اثرات کسی نہ کسی حد تک موجود ہیں۔" (اعتراف، زخمِ تمنا، ص 11-12)

'زخمِ تمنا' کی اشاعت 1962 میں ہوئی تھی۔ یہ مظہر امام کا پہلا شعری مجموعہ تھا جس میں اٹھارہ انیس سالہ شاعری کا انتخاب پیش کیا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں ابتدائی دور کی نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ اس لئے ابتدائی نظموں پر اگر راشد کے اثرات ہیں تو غلط نہیں ہیں۔ ہر شاعر اپنے تشکیلی دور میں کسی نہ کسی بڑے شاعر کا اثر قبول کرتا ہے۔ جیسے غالب نے بیدل کا اثر قبول کیا تھا، اور اقبال کی ابتدائی غزلوں پر داغ کا اثر نمایاں تھا۔ مظہر امام پر اگر ن م راشد کی نظم کا اثر تھا تو یہ اثر ہیئت اور تکنیک کی سطح پر تھا خیالات اور افکار کی سطح پر نہیں۔ راشد کے علاوہ فیض نے بھی مظہر امام کی نظموں کو متاثر کیا ہے اور یہ اثر لفظیات سے لے کر اسلوب تک ہے۔ جوش اور اختر الایمان کے مزاج کی تندی اور یاسیت دو الگ چیزیں ہیں۔ جوش روایت کے باغی ہیں۔ اس لحاظ سے ذہنی طور پر مظہر امام جوش کے دائرۂ اثر میں آتے ہیں۔ لیکن اختر الایمان کے خیالات و جذبات کا تلاطم اور نظموں کا کسیلا پن مظہر امام کے یہاں مثبت طور پر اپنا نقش مرتب کرتے ہیں۔ مگر یہ اثرات بہ لحاظ ترتیب اسی طرح مرتب ہوتے ہیں جس طرح مظہر امام نے دیباچہ میں ان شعرا کے نام لئے ہیں۔ فراق اور اختر الایمان سے انہوں نے آخر میں اثر قبول کیا۔ فراق کا اثر غزلوں پر ڈھونڈنا چاہئے اور اختر الایمان کا اثر نظموں پر۔

'زخمِ تمنا' کی نظموں کے تعلق سے انہوں نے لکھا ہے کہ ان میں ارتکاز نہیں ہے۔ انہیں ابتدا ہی میں اس بات کا احساس تھا کہ شاعری ریاضت، مطالعہ اور محنت چاہتی ہے لیکن 'زخمِ تمنا' کی شاعری تک یہ محنت اور ریاضت کم نظر آتی ہے۔ سائمن ویل کے حوالے سے مظہر امام نے لکھا ہے کہ ارتکاز کو وہ عبادت سمجھتا ہے اور فن جس عبادت کا متقاضی ہوتا ہے اس کے تصور ہی سے مظہر امام کے (بقول ان کے) پسینے چھوٹنے لگتے ہیں۔ کسی شاعر سے اس کے ابتدائی دور ہی میں فنی ریاضت اور پختگی کی امید کی جانے لگے تو دنیا کے ہر اچھے شاعر کا ابتدائی کلام معتبر ہو جائے گا۔ اردو کی حد تک اقبال، راشد، اختر الایمان، فیض، فراق وغیرہ کے ابتدائی مجموعوں میں بڑی شاعری کے امکانات تو نظر آتے ہیں، فنی ریاضت اور ارتکاز بعد کی شاعری میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

میں نے لکھا ہے کہ مظہر امام کی نظموں کی کائنات وجودی مسائل سے لبریز ہے اور یہ بری بات نہیں۔ ہمارے یہاں وجودی تناظر میں لکھی گئی نظموں کی خاصی تعداد ہے۔ لیکن ایسی نظمیں جدیدیت کے آغاز کے بعد ہی منظر عام پر آسکیں۔ اس سے قبل نہیں۔ مظہر امام کا تعلق جدیدیت کے خیمے سے ہے اور وہ جدیدیت کو اپنانے سے قبل ترقی پسند شاعری کے حامی رہ چکے تھے۔ جب انہوں نے ترقی پسندی کی ادعائیت کو تج کر جدیدیت کو اپنایا تو ان کی شاعری میں واضح فرق پیدا ہوا۔ یہ فرق تکنیک اور اسلوب کی سطح پر تو ہو سکتا ہے مگر خیالات کی سطح پر وہ پورے جدید نہ ہوئے۔ اس لئے میں نے شروع میں لکھا ہے کہ مظہر امام کے یہاں کلاسکیت زبان کی سطح پر، ترقی پسندی خیال کی سطح پر، اور جدیدیت بیان کی سطح پر نمودار ہوئی ہے۔ اس لئے جب مظہر امام کی شاعری میں ترقی پسندی کی جگہ جدیدیت آتی ہے تو یہ جدیدیت بیان کی سطح پر آتی ہے۔ خیال (بمعنی فکر) کی سطح پر مظہر امام ترقی پسند ہی رہتے ہیں۔ شاید لوگوں کو میری یہ بات اٹ پٹی لگے۔ ہمارے یہاں ترقی پسندی کی سکہ بند تعریف کی گئی ہے۔ اشتراکیت یعنی مارکسی خیالات کی تشہیر ہی کو ترقی پسندی مان لیا گیا ہے۔ میری نظر میں وہ ترقی پسندی کسی کام کی نہیں جس میں ترقی یافتہ زندگی کی تمام جہات نہ سمیٹ لی جائیں۔ سچی ترقی پسندی انسان کی مکمل آزادی کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ یعنی ایسی آزادی کہ ایک چھت کے نیچے سانس لینے والا ہر شخص اپنے معاملات خود طے کرے اور کسی طرف سے کوئی فرمان نازل نہ ہو۔ ہر شخص پڑھا لکھا اور زندہ افکار سے لیس ہو۔ اگر اقبال کا مرد کامل مذہبی و اخلاقی وسیلے سے ظہور میں آسکتا ہے تو جدید معاشرہ کا انسان کامل زندہ روایات اور افکار کے وسیلے سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی انسان مجھے مظہر امام کی شاعری میں نظر آتا ہے جو اپنی تفہیم کا آرزومند ہے۔ ذیل میں مظہر امام کی چند نظموں کے تجزیے سے میری بیان کردہ باتوں کو تقویت ملے گی۔

'زخمِ تمنا' کی ایک نظم 'شعاع فردا کے راز دانو!' پیش کی جاتی ہے:

حیات کا قافلہ بھٹک کر یہ کیسی منزل پہ آ گیا ہے
نہ کوئی رہبر، نہ کوئی ہمدم
بس ایک لا انتہا خموشی
جو تیرگی کی مہیب پلکوں پہ منجمد ہو کے رہ گئی ہے
شکستہ پا، خستہ حال راہی
اداس، گم سم
بس اپنی ہی سانس گن رہا ہے!
شعاع فردا کے راز دانو!
جو تم زمان و مکاں کی پہنائیوں سے آگے
کوئی نئی رہ گزار پاؤ
تو کاروانِ حیات خستہ کا نام لینا
شکستہ پا کا سلام لینا
جنوں ابھی دیدہ ور نہیں ہے

خرد بھی معتبر نہیں ہے
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے
ابھی تو ختم سفر نہیں ہے

یہ نظم 2 دسمبر 1957 کو لکھی گئی تھی۔ یہ زمانہ جدیدیت کے آغاز کا تھا۔ مظہر امام نے غیر شعوری طور پر جدیدیت کو اپنا لیا تھا۔ مندرجہ بالا نظم اس کی گواہی دیتی ہے۔ یہ نظم اپنے بیانیہ (Narrative)، لفظیات اور اسلوب بیان کی حد تک جدید ہے۔ فکری اعتبار سے یہ وجودیت کے قریب ہے۔ جہاں 'ترا کلے' اور 'حیات آوارہ' میں پست ہمتی، مایوسی و بیزاری اور موت کی خواہش کا اظہار ملتا ہے وہیں 'شعاع فردا کے راز دانو!' میں انسان کی بہتر منزل کی تلاش ایک رجائی اقدام ہے۔

50-55 کے بعد کے زمانوں میں مظہر امام کا فن جوں جوں بالیدہ ہوتا جاتا ہے ان کی نظموں میں ایک مثبت انداز فکر نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ گرچہ 'زخم تمنا' کی نظموں کا دائرہ پھیل نہیں پاتا اور کینوس نسبتاً چھوٹا ہی رہتا ہے لیکن نظم نگاری میں دھیرے دھیرے فنی پختگی، متانت اور شعور کی بالیدگی ظاہر ہونے لگتی ہے۔ 27 ستمبر 1960 میں لکھی گئی مختصر نظم 'اشتراک' کو دیکھیں:

اشتراک

خیر اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آہی گئے
اس قبیلے میں کوئی کسی کا نہیں
ایک غم کے سوا
چہرہ اترا ہوا
بال بکھرے ہوئے
نیند اچٹی ہوئی
خیر، اچھا ہوا تم بھی میرے قبیلے میں آہی گئے
آؤ ہم لوگ جینے کی کوشش کریں!

نظم میں جینے کی کوشش ایک مثبت جہت ہے۔ اگر خواہش مرگ کا اظہار ہوتا تو نظم بے جہت ہو جاتی۔ انسان کی ہستی کی معنویت تبھی ہے جب برے سے برے حالات میں بھی جینے کی کوشش کرے یا جینے کے لئے کوشش کرے۔ مظہر امام کی اس نظم کو بھی وجودی تناظر میں رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔

'رشتہ گونگے سفر کا' کی نظموں میں تصوریت اور تصویریت پائی جاتی ہے۔ تصویریت کی ترسیل کے لئے میں انگریزی لفظ Picturesqueness کا استعمال کرنا پسند کروں گا۔ یہ تکنیک مظہر امام اپنی بعض نظموں میں بڑی کامیابی کے ساتھ اپناتے ہیں اور اس کا سراغ ہمیں انگریزی ادب کے ماقبل رومانی دور (Pre-romantic age) میں ملتا ہے۔

تصویریت کو مصوری سے بھی قرب حاصل ہے۔ مگر انگریزی ادب میں پہلی مرتبہ جب لفظ Picturesqueness کا استعمال کیا گیا تو اس کے وسیلے سے پوپ اور ہومر کی نظموں کو سمجھنے میں مدد ملی جو اپنی ابتدا میں مصور شاعر تھے۔ تصویریت Picturesqueness کے لئے کیمرہ اور وژن ضروری ہیں۔ کیمرے کو ایک زاویہ پر مرکوز کیا جانا علاحدہ بات ہے۔ لیکن شاعر تصویریت میں جو زاویہ نگاہ بناتا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ اس طرح مصوری اور تصویریت دو مختلف تکنیک نظر آتی ہیں۔ مظہر امام کی ایک مختصر سی نظم ہے 'رات دن کا قصہ' یہ نظم تصویریت کی عمدہ مثال ہے:

رات دن کا قصہ

ایک پہچانا ہوا انجان شہر
رات کے کالے بدن پر برص کے اجلے چراغ
آدمی کی کھال میں چیتے کی روح
جسم کے مرگھٹ پہ سانسوں کی چتا جلتی ہوئی
نک چڑھی بیوی کی صورت
زندگی!

نظم میں الفاظ ایک دوسرے سے معنوی ربط پیدا کرتے ہیں۔ رنگوں کے ذریعہ تشبیہ پیدا کی جاتی ہے۔ ایک پہچانا ہوا انجان شہر جدید زندگی کا استعارہ ہے۔ رات کے کالے بدن پر برص (سفید کوڑھ) کے اجلے چراغ روشن ہیں۔ آدمی کی کھال میں چیتے کی روح نظر آتی ہے۔ چیتے کا جسم بھی کالے اجلے دھبوں سے مل کر تیار ہوتا ہے۔ چیتے کی کھال دور سے ٹھیک ایسی رات نظر آتی ہے جس میں اجلے دھبے چراغ کی طرح روشن ہیں اور کالے دھبے رات کی سیاہی سے عبارت ہیں۔ جدید زندگی میں یہ دونوں مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ برص کے اجلے چراغ کی مناسبت شاعر نے کوڑھ کے زخموں سے پیدا کی ہے۔ انسان کے جسم پر کوڑھ کے داغ دھبے اس طرح نمایاں نظر آتے ہیں جس طرح رات میں کسی جگمگاتے شہر کا منظر ہوتا ہے۔ مظہر امام نے پہچانے ہوئے انجان شہر کے استعارے سے جدید زندگی کی بدصورتی کو تصویر بند کرنا چاہا ہے۔ جدید زندگی نک چڑھی بیوی کا استعارہ ہے۔ پوری نظم میں استعارہ، علامت اور تشبیہہ کے میل جول سے جو معنویت پیدا کی گئی ہے اس کا دارومدار نظم کی اندرونی ساخت پر ہے۔ یہ نظم جدید اردو نظموں کے درمیان امتیازی شان رکھتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ مظہر امام نے نئے اسلوب کے ذریعہ اردو نظم کو ترقی دی ہے۔ (تلخیص)

OO

تاثرات

مظہر امام اور رشتۂ گویائی

کشور ناہید

گندے، شریف، ریاکار[1]
ہمارے معاشرے کے ہیرو، ہیروئن اور ولن
کہ ٹیلی فون کی گفتگو[2] بھی تو اب ٹیپ ہوتی ہے
لبادے[3] فیشن پریڈ میں استعمال ہوتے ہیں
اور اندھے کا وہ چراغ جو دوسروں کو راستہ دکھاتا تھا
اب گل ہوا چاہتا ہے

چیخنا مت، کہ غصے سے گلے کی رگیں اتنی تن چکی ہیں کہ چیخ کر کرچی کرچی ہو جائیں گی، یہی ہے تاثیرِ دعا[4] یہی ہے شکستِ وجود[5]

مظہر امام مجھ جیسا پیادہ پا شاعر ہے۔ خوش فہم ہے کہ اس گونگے سفر میں بھی لوگ اس کے ہم سفر[6] ہیں۔ حالاں کہ کوئی اگر ساتھ ہوتا ہے تو اپنی نامرادیوں کے خوف سے پیچھا چھڑانے کے لئے، آپ کی دل داری یا رفاقت کی خوش بو میں مگن رہنے کے لئے نہیں۔

غزل اور نظم کے لبادے یک جا ہو رہے ہیں۔ اکثر ایک ہی نشست کی لکھی ہوئی غزلیں ایک ہی موڈ اور موضوع کے تسلسل کی غماز ہوتی ہیں۔ مظہر امام کی غزلیں بھی تسلسل موضوع کی آئینہ دار ہیں۔

لے دے کے ایک وصل کی خیرات مانگ لی
اور بیچ کر خود کو یہ بازار خریدا ہوتا
یا خود کو اب توڑ کے باہر آؤں
یا شب کی ابھری خشک رگوں میں اب تو لہو تک سوکھ چکا ہے،

اُس رستے ہوئے دکھ کی لکیریں ہیں کہ جو ہم آنسوؤں کو ''آنکھ میں کچھ پڑ گیا'' کہہ کر چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''قیدِ حجابِ وقت''[7] مظہر امام کا بڑا بلیغ استعارہ ہے۔ ہم سب ''قیدِ حجابِ وقت'' سے نکلنے کی کوشش میں لہولہان ہیں۔ یہ قید، رسوم کے علاوہ شعری لہجے کی بھی ہے۔ نظم نے پیرایہ بدلا ہے اور decorative writings سے نہ صرف ناول اور افسانہ بلکہ نظم بھی اپنے آپ کو پاک کر رہی ہے۔ وہ عہد تو گیا کہ ''زینہ زینہ اتر رہی ہے رات'' شعری مفہوم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

میرے خیال میں یہ دور نظم کا دور ہے۔ غزل نے اپنا آپ اور اپنی چھب خوب دکھائی، نظم پڑھو تو شاعر سچ بولتا دکھائی دیتا ہے اور غزل تو اب رواداری کا بہروپ لگتی ہے۔

مظہر امام کو نظم کے سفر میں گویائی مل گئی ہے۔ OO

حواشی:

1۔3۔ میں نے اپنی روایت کے سارے لبادے اتارے
اپنے چہرے کو تہذیب کے رنگ و غازے سے نا آشنا کر دیا
اپنے آدرش کے چاند تارے بجھائے
اور تب لوگ......
گندے، شریف اور ریاکار
میری طرف پیار سے دیکھ کر مسکرانے لگے۔
(نظم ''وہ چپ میں ایک مشورہ'')

2۔ یوں ہی کب تک فون پر بات کرتے رہیں گے
یوں ہی فاصلہ جسم کا، لمس کا
ایک رشتہ فقط صوت و آواز کا
یہ رشتہ بھی حصہ ہے گونگے سفر کا
جو کب ٹوٹ جائے
کسے یہ پتہ ہے!
(نظم ''رشتہ گونگے سفر کا'')

4۔ مانگنے والے ذرا اپنی لکیریں بھی تو دیکھ
ساری تاثیرِ دعا دستِ دعا لے جائے گا

5۔ وہاں تھی تندی صہبا یہاں شکستِ وجود
یہ سنگ سچ ہے وہ شب کا آئینہ تھا

6۔ مجموعہ کلام ''رشتہ گونگے سفر کا'' کا انتساب:
''ان کے نام، جو ساتھ چل رہے ہیں''

7۔ قیدِ حجابِ وقت سے باہر نکل کے آ
ہر دو سرے دماغ سے اپنے نکال دے

صنفی تجربہ

مظہر امام: آزاد غزل کے بانی

انتظار حسین

ادب میں نقاد ایک فالتو مخلوق ہے۔ آزاد نظم ہو سکتی ہے تو آزاد غزل کیوں نہیں ہو سکتی؟

بس یہ خلاصہ ہے مظہر امام صاحب کی ساری گفتگو کا۔ مظہر امام ہندوستان سے آئے۔ لاہور ہوتے ہوئے کراچی گئے۔ چلتے چلتے ان سے چند باتیں ہوئیں۔

مظہر امام لکھنے والوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان میں تقسیم کے بعد پروان چڑھی ہے۔ بہار سے تعلق رکھتے ہیں۔ غزل کہتے ہیں، نظم کہتے ہیں۔ 'زخم تمنا' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1962 میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ 'رشتہ گونگے سفر کا' 1974 میں۔ مظہر امام غزل آزاد کے موجد ہیں۔ ٹھیک ہے خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ نظم میں اتنے تجربے ہو رہے ہیں۔ پابند نظم سے بغاوت کر کے نظم معریٰ لکھی، پھر نظم آزاد۔ اور اب بات نثری نظم تک پہنچی ہے۔ غزل پر بھی اس کے اثرات پڑنے ہی تھے۔ کتنی کوششیں ہو رہی ہیں کہ غزل کی ہیئت کو بھی کسی طرح توڑ پھوڑ کر کوئی نئی ہیئت دریافت کی جائے لیکن غزل کی روایتی ہیئت کچھ زیادہ ہی سخت جان ہے۔ اس کو توڑنے کی جو بھی کوشش ہوتی ہے وہ پتھر میں جونک ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال ایک کوشش مظہر امام نے بھی کی ہے۔

میں نے کہا کہ ذرا غزل آزاد کا کوئی نمونہ تو ہمیں دکھائیے۔

انہوں نے کہا مثال کے طور پر پہلے آپ کو غزل کا پابند شعر سناتا ہوں:

یوں بھی جی لیتے ہیں اس دہر میں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

"اس دہر میں" کو منہا کر دیجئے، اب سنئے:

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

اب یہ غزل آزاد کا شعر بن گیا۔ اس تکنیک میں مصرعوں کے ارکان کو کم زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس سے غزل آزاد بنتی ہے۔

میں نے کہا کہ اس ترکیب سے آپ ایسے شاعروں کے یہاں جو ضرورت شعری کے تحت فالتو الفاظ اور ٹکڑے لگانے کے عادی ہوتے ہیں آسانی سے پابند غزلوں کو آزاد غزلیں بنا سکتے ہیں لیکن غالب اور اقبال جیسے شاعر تو آپ کو اپنی غزل کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے۔

"ویسے مظہر امام صاحب! یہ آزاد غزل آپ ہی تک محدود ہے یا آپ کے کچھ پیرو بھی پیدا ہوئے؟"

بولے "پچاسی شاعر اب تک اس میدان میں اتر چکے ہیں۔"

میں بہت حیران ہوا کہ اُدھر ہندوستان میں ایک نہ دو پورے پچاسی شاعر آزاد غزل لکھ چکے ہیں اور یہاں پاکستان میں کسی کو خبر ہی نہیں کہ اُدھر غزل میں کیا گل کھل چکا ہے۔ مظہر امام نے میری حیرت کو رفع کرنے کی خاطر بتایا کہ پاکستان میں بھی ان کی تقلید میں آزاد غزل لکھی گئی ہے۔

"بھلا نام تو لیجئے یہاں کس نے آپ کی تقلید میں غزل آزاد کو اپنایا ہے؟"

"مثلاً قتیل شفائی اور ظفر اقبال۔"

میری حیرت کو کم کیا ہونا تھا ان دو ناموں کو سن کر اس میں اضافہ ہوا۔ ظفر اقبال کے متعلق مظہر امام نے بتایا کہ انہوں نے اپنی 'رطب و یابس' میں آزاد غزل شامل کی ہے۔ ظفر اقبال اور قتیل شفائی کے نام لینے کے بعد انہوں نے فیض صاحب کا بھی نام لیا کہ انہوں نے بھی آزاد غزل لکھی ہے۔

مظہر امام اردو تنقید سے کچھ خوش نظر نہیں آتے۔ کہتے ہیں کہ پچھلے برسوں میں جو تنقید لکھی گئی ہے اس سے ہمارے ادب کو کوئی فیض نہیں پہنچا۔ جو اس وقت تنقید لکھی جا رہی ہے اس کے بھی مطلق قائل نہیں۔

کہنے لگے! "مجھے افسوس اس کا نہیں کہ اچھی تنقید کیوں نہیں لکھی جا رہی ہے۔ زیادہ افسوس اس پر ہے کہ آخراتی تنقید کیوں لکھی جا رہی ہے۔"

OO(1983ء)

تیسری جہت

مظہر امام کا تنقیدی اسلوب

ڈاکٹر منصور عمر

مظہر امام کی ادبی شخصیت کا ایک پہلو ان کی ناقدانہ حیثیت بھی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ وہ وقتاً فوقتاً تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ 'آتی جاتی لہریں' کے نام سے 1981 میں شائع ہوا اور ادبی دنیا سے داد و تحسین بھی حاصل کر چکا ہے۔ یہی مجموعہ میرے پیش نظر ہے اور میں اسی کی روشنی میں مظہر امام کا تنقیدی اسلوب متعین کرنے جا رہا ہوں۔

تخلیقی فن پارے میں کسی فن کار کے اسلوب کی شناخت آسانی سے کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ صاحب اسلوب بھی ہو۔ اس کے برعکس تنقیدی نگارشات میں کسی ناقد کے اسلوب کی تلاش اور اس کا تعین ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مظہر امام بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ ایک بڑے شاعر۔ اور میری ناچیز رائے میں وہ ایک بڑے شاعر ہیں تو اس لئے کہ ناقدانہ بصیرت قدم قدم پہ ان کی رہ نمائی کرتی رہی ہے، اور ان کی فن کارانہ بصارت ناقدانہ بصیرت سے اکتساب فیض کرتی رہی ہے۔ گویا انہوں نے اپنی تخلیق اور تنقید کو ایک دوسرے کی مدد بہم پہنچائی ہے اور دونوں پر ایک دوسرے کا گہرا نقش مرتب کیا ہے۔

عام طور سے جب کسی ناقد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ ایک ناقد ہے اور اپنے تنقیدی رویئے کے بارے میں یا تو خود اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے یا پھر کسی تعلق کے ناقد سے اپنا تنقیدی قصیدہ لکھوا کر کتاب کی پیشانی پر یوں ٹانکتا ہے جیسے دُلہن کے ماتھے پر جھومر۔ لیکن مظہر امام نے بغیر کسی عنوان کے اپنے دو صفحے کے پیش لفظ کی شروعات ان جملوں سے کی ہے:

''میں اپنے آپ کو نقاد یا ناقد تو خیر، تختہ دار پر چڑھنے کے بعد ہی کہوں گا البتہ میں نے وقتاً فوقتاً کچھ ایسے مضامین یا تبصرے لکھے ہیں، جن کے ذریعہ بعض تاثرات یا تعصبات کے اظہار کا مجرم ہوا ہوں۔ یہ باقاعدہ تنقیدی مضامین نہیں ہیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ تنقیدی نوعیت کے مضامین کہنا درست ہوگا...''

مذکورہ جملوں کو مظہر امام کی انکساری پر محمول کیا جانا چاہئے۔ کیوں کہ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مضامین تنقیدی نوعیت کے نہیں بلکہ باقاعدہ تنقیدی مضامین ہیں جن میں تحقیق کا عمل بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تنقیدی مضامین انہوں نے ناقد بننے کے شوق میں نہیں لکھے ہیں بلکہ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے ناقدین تنقید کے بعض اہم اور ضروری میلانات کی طرف توجہ نہیں دے پا رہے ہیں یا ان سے غفلت برت رہے ہیں تو انہوں نے قلم سنبھال لیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''کفا ظ مفتیانِ تنقید ادب کے میدان میں دندناتے پھرتے ہیں، اور بے چارہ تخلیق کار ایک کونے میں کھڑا اپنی بے مائگی کا ماتم کرتا رہتا ہے۔''

مظہر امام خود بھی تخلیق کار ہیں۔ اس لئے تنقیدی مضامین یا 'تنقیدی نوعیت' کے مضامین لکھتے وقت بھی یہ بات فراموش نہیں کرتے کہ فن کار کا درجہ ناقد سے بلند ہے۔ نیز یہ کہ ناقد کا وجود فن کار سے وجود سے جڑا ہوا ہے:

''تنقید، تخلیق کی دستِ نگر ہے، تخلیق کے بغیر تنقید کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا...!''

تنقید کی زبان عام طور پر سادہ، سہل اور روکھی پھیکی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بالکل سپاٹ اور خشک ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر قاری کو ایک طرح کی اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اور پھر تنقید کے نام سے ہی اسے الرجی ہو جاتی ہے، اور وہ اسے کڑوی دوا سمجھ کر الگ کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مظہر امام کے 'تنقیدی نوعیت' کے مضامین کی زبان سادہ اور سہل ہوتے ہوئے بھی تخلیق کی چاشنی سے لب ریز ہے اور قاری کو بدحظ کرنے کے بجائے لطف و انبساط سے ہم کنار کرتی ہے۔ چند مثالیں:

1۔ داغ کی فکری سطح بھی بہت بلند نہیں ہے، لیکن کبھی کبھی ان کے کلام میں ایسی بجلیاں بھی نظر آتی ہیں جو پشتِ احساس پر تازیانے کا کام کرتی

ہیں۔ ص 98

2۔ شاید ان کی تشنگی روح کو وصال کی چھلکتی ہوئی گلابی نصیب نہیں ہوئی۔ حسن ان کی دسترس سے دور ہی رہا۔ ص 106

مذکورہ اقتباسات میں مظہر امام نے جن تراکیب کا استعمال کیا ہے (پشتِ احساس، تشنگی روح، بساط شاعری، اور محفل سخن) وہ ان کے اسلوب کی ایک جہت ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا تشبیہات کا استعمال کر کے بھی انہوں نے اپنے اسلوب کو نکھارا ہے، ملاحظہ ہو:

1۔ ان کے دور اوّل کے افسانوں میں حقیقت بہت جھجکی، لجائی، سمٹی سمٹائی، دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی دُلہن کی طرح سامنے آتی ہے جس کا چہرہ گھونگھٹ میں مستور ہے۔ ص 181

2۔ ان دنوں بعض رسائل کہنہ سال ڈائریکٹروں، پروڈیوسروں اور دوسرے تکنیکی ماہرین کو ہندوستانی فلم انڈسٹری سے جلاوطن کرنے کی تحریک چلا رہے تھے اور ان کی بجائے انڈسٹری کی شریانوں میں باصلاحیت نوجوانوں کا تازہ، پُرحرارت خون نفوذ کرنے کی تائید کر رہے تھے۔ ص 259

مظہر امام کے تنقیدی اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی نثر میں محاورات کا استعمال جگہ جگہ بڑی خوب صورتی سے کیا ہے اور اسے اپنی تحریر کا حصہ بنالیا ہے، چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

1۔ بلا سوچے سمجھے لکیر کے فقیر بنے رہنے سے تو بہتر ہے کہ غور و تامل کا احسان لئے بغیر نئے مزاج اور نئے رجحان کی خانہ دامادی قبول کر لی جائے۔ ص 23

2۔ ہم لوگ خود شہر کے اندیشے سے زیادہ دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ ص 67

3۔ مطلع یا مقطع کا ہونا، غزل کی شریعت میں سنت ہو تو ہو، فرض ہرگز نہیں ہے۔ ص 67

4۔ کیا ترقی پسند اور کیا رجعت پسند سب ہی سُر میں سُر ملا رہے تھے۔ ص 69

5۔ ایک ایسی صنف کو جس کی پیدائش کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں، برتر ثابت کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے معصومیت اور سادہ لوحی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ص 73

داغ دہلوی کے جہاں سیکڑوں شاگرد ہوئے ہیں ان میں ایک علامہ اقبال کا نام بھی آتا ہے۔ اس بات کو مظہر امام اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

"آپ چاہیں تو ان سعادت مندوں میں اقبال کا بھی اضافہ کر لیں، جنھیں شہرت کا تاج ہی نہیں دوام کا خلعت بھی ملا۔" ص 91

شاد عارفی کی شعری شخصیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

1۔ شاد عارفی سرتاپا اوّل تا آخر شاعر تھے، انہیں اپنے منصب شعری کی آبرو کا لحاظ تھا۔ کئی گرم و سرد آندھیاں چلیں، بڑے بڑوں نے حالات کے آگے جبین نیاز جھکا دی، لیکن شاد کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ ص 112

2۔ مجھے منصب پیغمبری کی ہوس نہیں، لیکن ادب میں پیشین گوئی کو کچھ اتنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نسل نے جس طرح راندۂ درگاہ سخن یگانہ کو پھر سے کرسی منزلت پیش کی، اسی طرح وہ شاد عارفی کو بھی مسند عظمت پر لا بٹھائے گی۔ ص 114

عصمت چغتائی اُردو کی معروف لیکن بدنام ترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے موضوعات جس طرح کے ہوتے ہیں ان سے اُردو قارئین بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مظہر امام عصمت چغتائی کا تعارف جن الفاظ میں کراتے ہیں اس سے وہ ایک بیسہ زیادہ ہیں نہ کم:

"عصمت چغتائی وہ خوش نصیب افسانہ نگار ہیں جو اُردو ادب میں ایک دھماکے کے ساتھ داخل ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی منظر نامے پر چھا گئیں... عصمت کی پہچان میں یوں بھی آسانی ہوئی کہ وہ عظیم بیگ چغتائی کی بہن تھیں، علی گڑھ کی تعلیم یافتہ بی اے۔ بی ٹی تھیں، صنفِ نازک سے تعلق رکھنے کے باوجود ایسے افسانے لکھتی تھیں کہ پہلوانوں کے بھی پسینے چھوٹ جائیں۔" ص 205

اسی طرح اپنے پہلے مجموعہ کلام 'جلوہ گاہ' کی دوسری اشاعت پر مخمور جالندھری کی رائے پیش کرنے کے بعد کہ 'جلوہ گاہ' ان کی شاعری کے دورِ اوّلین کا مکمل اور واضح آئینہ ہے..... مظہر امام تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دیکھنا یہ ہے کہ اس آئینے میں کتنی آب ہے، اور آیا یہ آئینہ بال سے بے نیاز ہے یا نہیں....." ص 220

محولہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مظہر امام کا تنقیدی اسلوب بے حد سبک، رواں، سہل اور سادہ ہونے کے باوجود اپنے اندر کشش بھی رکھتا ہے اور جاذبیت بھی۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت جملے موتی میں پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تشبیہات، محاورات، ادبی اصطلاحات اور ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ معروف مصرعوں اور شعر کے ٹکڑوں نے ان کی نثر میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور ان کی نثر شاعرانہ نثر ہو گئی ہے، جسے میں دراصل ان کی شاعرانہ شخصیت کا پرتو مانتا ہوں جو اُن کی نثر میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ اور یہی مظہر امام کے تنقیدی اسلوب کا وصفِ خاص ہے۔ OO

شخصی خاکے

اکثر یاد آتے ہیں

اسلوب احمد انصاری

شخصی خاکوں کا یہ مجموعہ معروف اور ممتاز شاعر مظہر امام کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھا۔ یا جس سے اُردو کے عام قارئین زیادہ شناسائی نہیں رکھتے تھے۔ خاکہ نگاری بھی ایک فنِ لطیف ہے۔ اس میں اور باضابطہ سوانح نگاری میں وہی فرق ہے جو افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے مابین ہے۔ یہ چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے یعنی ایک محدود بساط پر ایک دل کش نقش کا کاڑھنا، یا قلم کی چند جنبشوں سے شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کو نمایاں کرنا۔

دو امور جو خاکہ نگاری کے لئے لابدی ہیں، معروضیت اور ہمدردی کی یک جائی اور ان کی بیک وقت موجودگی۔ اور اولیں کلیہ یہ تو ہے ہی کہ جس کا ذکر کیا جارہا ہے، اس سے غیر رسمی طور پر گہری شناسائی اور وابستگی ہو۔ اس کتاب میں جن آٹھ ادبی شخصیتوں سے بازدید کی نوبت آئی ہے، ان میں صرف اشک امرتسری اور اختر قادری ہی غیر معروف اور نا مانوس سے نام ہیں۔ لیکن انہیں بھی مظہر امام نے اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنی عجوبہ زائیوں کے باوجود دل چسپ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس صنف میں طبع آزمائی میں مظہر امام کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم تفصیلات سے تصویر کو اجاگر کرنے کا کام لیتے ہیں اور اپنے حافظے کے خزانوں کو اس عمل کے لئے کھنگالتے ہیں۔ جگر مرادآبادی ہوں یا ملیح آبادی (مولانا عبدالرزاق) جمیل مظہری ہوں یا پرویز شاہدی، کرشن چندر ہوں یا خلیل الرحمٰن اعظمی، ان سب کو انہوں نے صفحۂ قرطاس پر اس طرح لا بٹھایا ہے کہ وہ ہمارے آپ کے رفیق اور ہمدم معلوم ہونے لگتے ہیں اور یہ راز بھی کھلتا ہے کہ وہ سب اپنے علمی و ادبی کمالات اور امتیازات کے باوجود بشری کمزوریوں میں پوری طرح حصے دار تھے۔ ضمناً اور دوسرے مسائل پر بھی روشنی کی ایک کرن پڑجاتی ہے۔ مثلاً مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے خاکے میں یہ بہت صحیح بات مظہر امام کے قلم سے نکل گئی ہے:

''مولانا آزاد کا اندازِ نگارش اُردو زبان کے حق میں کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس اسلوب نے بالواسطہ روزمرہ اور بول چال کی زبان سے اُردو نثر کو دور رکھنے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے اُردو زبان کی عمومی مقبولیت پر دور رس منفی اثرات مرتب ہوئے۔ مولانا آزاد کا اسلوب منفرد اور سحر انگیز سہی لیکن اس کا حلقۂ اثر محدود ہے۔''

اس اندازِ تحریر پر خطابت بھی حاوی ہے اور اس پر معرب اور مفرس الفاظ کا بھی غلبہ ہے جس کے بوجھ تلے یہ دبا ہوا ہے اور یہ اُردو زبان کے محاورۂ گفتگو کو ارتقا کی اس منزل سے ہٹا دیتا ہے۔ جس کی طرف غالب اور حالی کے زیرِ اثر وہ شائستگی اور سہولتِ اظہار کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس لئے اس کا تفاعل رجعت پسندانہ کہا جاسکتا ہے۔ ایک اور جگہ مظہر امام لکھتے ہیں:

''اگر انسانیت موت کے دروازے پر'' شہید اعظم، اور الہلال' اور 'البلاغ' کے بعض مضامین، مولانا کے نام سے موسوم ہیں، تو یہ امر حیرت ہی نہیں، افسوس کا بھی ہے کہ انہوں نے (ابوالکلام آزاد نے) اس کی تردید نہیں کی، اور غلط فہمی کو پھیلنے کا موقع دیا۔ یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد دوسروں کے کام کا کریڈٹ بھی خود لینا چاہتے تھے۔''

یہ رویّہ دراصل اس attitudinizing کا ایک مظہر ہے جو مولوی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا جزو اعظم تھا اور جس کے بارے میں مہاتما گاندھی نے بڑے ہی بلیغ انداز میں کہا تھا کہ 'مولانا ہمیشہ یہ تاثر دیتے تھے کہ وہ گویا اسٹیج پر کھڑے ہیں' یعنی کرتب دکھا رہے ہیں (حوالہ: ہنڈرسن ڈگلس کی ابوالکلام آزاد پر کتاب)۔

چوں کہ مظہر امام نے کم و بیش اپنے سبھی ممدوحین کو بہت قریب سے خلوت و جلوت میں دیکھا ہے۔ اس لئے اس آئینے میں خود ان کی تصویر کا انعکاس بھی نظر آنے لگتا ہے۔ ایک بات اس سلسلے میں لائقِ توجہ یہ بھی ہے کہ جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اختر قادری صاحب کے وسیلے سے ہمیں صوبۂ

بہار کی بعض اہم اور نام ور شخصیتوں سے بھی شناسائی اور تعارف کا موقع مل جاتا ہے اور صوبۂ بہار کی پوری ادبی فضا اور اس کے زیر و بم کی جھلکیاں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

ان تینوں کے علاوہ ملیح آبادی کا زیادہ اور کرشن چندر کا کسی قدر تعلق بہار اور کلکتہ کے ادبی مناقشوں اور مباحث و مذاکرات سے بھی ہمارے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے اور خود مظہر امام اپنے ادبی اور شعری ارتقا کے دوران جن جن منزلوں سے گزرے ہیں، اس کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کے اپنے مخصوص معمولات اور دل چسپیوں پر ایک پھسلتی سی روشنی مذکورہ بیانات سے پڑتی ہے۔ جیسی کہ بالواسطہ طور پر اس بیان سے:

"اکتوبر 1967 میں تبدیل ہو کر پٹنے آیا۔ ارادہ تھا کہ ذرا وہاں کے حالات درست کر لوں تو کلکتہ جاؤں اور کسی مے کدے میں پرویز صاحب کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر ان سے اس طرح باتیں کروں، جن کے لئے برسوں سے ترس گیا ہوں۔ لیکن 5 مئی 1968 کو وہ دنیا کے مے خانے سے اچانک اٹھ کر چلے گئے اور اپنے ساتھ لطف مے کشی بھی لے گئے۔"

اس خاکہ نویسی کے دوران خودستائی کی آہٹ بھی گاہے گاہے سنائی پڑتی ہے، جس کا زیادہ نوٹس نہیں لینا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ معمولاً اپنی انا کے قتیل نہیں ہیں، اسی لئے ان میں جارحیت بھی نہیں ہے۔ وہ بڑے مرنجان مرنج، انسان دوست، بامروّت اور تحمل والے فن کار ہیں۔ ان کے رویّے میں ایک طرح کا توازن، ٹھہراؤ اور اعتدال نظر آتا ہے۔ وہ زندگی میں جس جس طرح کے سخت و سست سے گذرے ہیں، اس نے ان کی پوری شخصیت میں نرمی، سوز و گداز اور سلامت روی پیدا کر دی ہے۔ جگر مراد آبادی، ملیح آبادی اور جمیل مظہری سے تو ان کا رشتہ خوردی بزرگی کا رہا ہوگا اور پرویز شاہدی سے برابری کا۔ اسی لئے موخرالذکر کی خاکہ نگاری میں وہ خاصی جرأت، صاف گوئی اور بے باک پن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کرشن چندر سے ان کا رشتہ عقیدت، محبت اور احترام کا ہے۔ ان کے خاکے میں یہ اندراج خاصا اہم اور چشم کشا ہے:

"تنظیمی بے حسی کی بات پر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کرشن چندر نے کہا کہ انجمن (انجمن ترقی پسند مصنفین) اپنا رول پورا کر چکی ہے، اور موجودہ حالات میں اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں مارکسزم کے نظریے کی بنیاد پر ایک ایسی انجمن بنانا چاہئے جو ملک کو سوشلزم کی منزل تک لے جانے میں مدد ہو۔"

اور خاکے کے آخر آخر میں یہ اندراج بہت دل چسپ ہے:

"زندگی کے حسن سے کرشن چندر کا نکاح بچپن ہی میں ہو چکا تھا، انہوں نے اس منکوحہ کو بھرپور محبت دی۔ وہ مایوس اور دل شکستہ بھی ہوئے کہ زندگی کو بدصورت اور بدمزہ بنانے کی کوششیں ہر طرف سے ہو رہی تھیں۔ لیکن زندگی کو خوبصورت دیکھنے کی آرزو سے وہ آخر دم تک سرشار رہے۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی سے مظہر امام خاصے قریب نظر آتے ہیں۔ ان کے وہ حد درجے معترف، مداح اور تحسین شناس ہیں۔ دونوں طرف سے بے تکلفی اور دل دہی کا انداز اس تراشے میں دیکھئے:

"مارچ 1960 میں جب میں کٹک میں تھا، مجھے آل انڈیا ریڈیو کے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے اور اس سے زیادہ خلیل صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے دہلی سے انہیں غالب کا پٹا ہوا یہ شعر لکھ بھیجا:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

خلیل صاحب نے فوراً جواب میں عندلیب شادانی کا شعر لکھا:

میں تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کہیں بھولا ہے نشیمن کو کبھی

اور بڑی گرم جوشی برتے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔"

ان کی ناگہانی موت کا مظہر امام پر بہت گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا اور وہ بہت زود نویس اور طباع تھے۔ یہ خاکہ راقم الحروف کو خاص طور سے اس لئے متوازن اور دل کش معلوم ہوا کہ مرحوم سے علی گڑھ میں برسوں قریبی تعلق رہا۔ اس نے جب علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں بحیثیت لیکچرر اپنے کام کا آغاز کیا تو پہلے ہی سال بی اے کے انگریزی کے طالب علموں میں خلیل الرحمٰن اعظمی موجود تھے۔ اس وقت سے لے کر ان کی وفات تک ان سے برابر ملنا جلنا ہوتا رہا۔ ان میں وہ سب خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں جن کا ذکر مظہر امام نے اس خاکے میں کیا ہے۔ ان خاکوں میں وہ نکیلا پن یعنی pointed ness اور سوفسطائیت یعنی sophistication تو نہیں ہے جو رشید احمد صدیقی کے قلمی مرقعوں کی نمایاں خصوصیات ہیں لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور مشتاق یوسفی ہی کے انداز میں خاکے لکھے؟ یہ خاکے اپنی جگہ بڑے پرلطف ہیں اور کہیں کہیں ناہمواری کے باوجود بڑی دل سوزی، خلوص اور احساس یگانگت کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور پوری دل چسپی کے ساتھ پڑھے جانے کا مطالبہ کرتے اور لالچ دلاتے ہیں۔ OO

اعترافِ ہنر
مظہر امام مشاہیر ادب کی نظر میں
تصانیف کے حوالے سے

'زخم تمنا'
1962

نیاز فتح پوری
میرے نزدیک آپ قدر اوّل کے شاعر ہیں

29 مارچ 1963

ڈاکٹر ذاکر حسین
کل کی ڈاک سے آپ کے کلام کا مجموعہ 'زخم تمنا' ملا۔
میں ایک نشست میں زیادہ شعر نہیں پڑھتا۔ ٹھہر ٹھہر کر دم لے لے کر چلتا ہوں۔ لیکن آپ کی غزلیں جو رات شروع کیں تو سب ہی پڑھ ڈالیں۔ کئی شعروں کو دیر تک گنگنایا۔ اور آپ ہی کے لفظوں میں کہوں تو بار بار ایسا لگا کہ

تیرے اشعار کا یہ رنگ امام
ان کے ہونٹوں پہ شفق ہو جیسے

نظمیں شروع کرنے سے پہلے غزلیں پھر کم سے کم ایک بار اور پڑھوں گا۔

8 جنوری 1963

رشید احمد صدیقی
اس کم عمری میں زبان و بیان پر اتنی قدرت تعجب و تعریف کی بات ہے۔ آپ اور آپ کا کلام قابل ستائش ہیں۔

مارچ 1963

آنند نرائن مُلّا
آپ ایک انفرادیت کے مالک ہیں۔ آپ کے کلام میں قدم قدم پر خیال حُسن بیان کی وجہ سے اور زیادہ دل کش بن کر سامنے آتا ہے۔

20 جنوری 1965

ل۔ احمد اکبر آبادی
شاعری میں خیال و احساس کی نزاکت خود شاعر کی ثقافت یا تہذیب نفس کا عکس ہوتی ہے۔ مظہر امام کے کلام شعری میں یہ خصوصیت برملا نظر آتی ہے۔ اپنے احساس کو عمومی احساس کا رنگ دے دینا یا عمومی احساس کو اپنا احساس بنا لینا ان کی دوسری بڑی خصوصیت ہے۔ مظہر امام کی ایک اور خصوصیت مختصر بیان میں وسعت معانی ہے۔ جو الفاظ کی تحقیق و تلاش پر دلالت کرتی ہے۔

فراق گورکھپوری
مظہر امام کی شاعری لطافت احساس اور طہارت فکر کی خوب صورت مثال ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسا چٹیلا پن اور نشاط آمیز دل گرفتگی ہے جو ان کے کلام کو انفرادیت بھی عطا کرتی ہے اور دل نوازی بھی۔

سیّد سجّاد ظہیر
میں بہار کو عظمت کی سرزمین کہتا ہوں۔ گوتم بدھ کے عرفان کی سرزمین، ودیاپتی کے شیریں نغموں، مرزا عبدالقادر بیدل کی عظیم شاعری کی سرزمین! بدقسمتی سے میں بہار کے جدید ادب سے اس قدر واقف نہیں جتنا کہ ہونا چاہئے، لیکن اردو والوں میں جب سوچتا ہوں تو پرویز شاہدی اور سہیل عظیم آبادی کے بعد تمہارا ہی نام ذہن میں چکر لگانے لگتا ہے۔

14 اگست 1963

ڈاکٹر اعجاز حسین
مظہر امام کے کلام کی خوبیوں میں سب سے نمایاں خوبی ان کا ایک واضح تصور ہے اور یہ تصور خلوص کے ساتھ شعر میں آکر ایک ایسی تازگی پیدا کر دیتا ہے جو روح کے لئے لذت اور دماغ کے لئے غذا مہیا کرتی ہے۔ ان کی باتیں دل سے نکلی ہوئی آوازیں ہیں۔ ان کی نظر ایک خاص دل چسپی کا سامان لئے ہوئے اسی طرح پیدا ہوئی ہے جس طرح زمین کے سینے سے دھان کے پودے جنم لیتے ہیں۔

میرزا ادیب
آپ بہت اچھی غزل کہتے ہیں۔
آپ کا کلام واقعی بڑا پختہ اور بڑا خوب صورت ہوتا ہے۔ میں خاص طور پر متاثر ہوتا ہوں۔

7 جولائی 1960

اختر اورینوی
مظہر امام کی شاعری روایت اور نئی تبدیلیوں کا خوش گوار امتزاج پیش

کرتی ہے۔ یہ مخلصانہ، جاندار اور پُر اثر ہے۔ اس میں انفرادیت پائی جاتی ہے کیوں کہ شاعر کو ذوقِ جمال بھی حاصل ہے اور ذہن بیدار بھی۔

مظہر امام سطحی ترقی پسندی اور سستی پیام رسانی سے اجتناب کرتے ہیں۔ شاعر کو سلیقۂ فن اور زبان دانی سے آگاہی حاصل ہے۔

پرویز شاہدی

بحمداللہ آپ ایک مقام بنا چکے ہیں اور آپ کا کلام اپنی جاذبیت کا خود اعلان کر رہا ہے۔ آپ کی شاعری بلند بالا، جامہ زیب، خوش لباس اور خوش اندام شاعری ہے۔ آج کے دور کا کرب بڑی رعنائی کے ساتھ آپ کے اشعار میں ظاہر ہوتا ہے۔ 10 اکتوبر 1962

وامق جون پوری

میں نے آپ کو ہمیشہ ایک اچھا، صاف ستھرا اور سنجیدہ انسان سمجھا اور آپ کی شاعری کو ان اوصاف کا آئینہ دار پایا۔ میں تقریباً دس بارہ سال سے آپ کے اشعار پڑھ رہا ہوں اور مجھ کو وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی شاعری ترقی کرتی نظر آتی ہے۔ بالخصوص اس دور میں جب کہ برصغیر کے بیشتر شعرا فراری اور مضحکہ خیز تجرباتی شاعری میں پناہ لے رہے ہیں۔ میں نے آپ کو فن کی سنگلاخ اور حقیقت پسند راہوں پر گام زن پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اور آپ کی شاعری اسی کے بل بوتے پر آئندہ زندہ رہے گی۔

کم اگست 1961

علی جواد زیدی

مظہر امام کی نظموں میں ایک سنجلا ہوا ادراک، ایک متحرک شعور، ایک بیدار مشاہدہ ملتا ہے اور یہ بات خلوص کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

سلام مچھلی شہری

میں نئی نسل کے اردو شاعروں میں مظہر امام کی شخصیت اور فن سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی کے نقوش جوان کے خدوخال سے ابھرتے ہیں، وہی ان کی شاعری میں بھی جھلکتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے آئینہ خانۂ شاعری میں نئی تصویریں پیش کرتے ہوئے بھی کلاسیکی ادب کی نزاکتوں اور عظمتوں کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

نشور واحدی

سچ تو یہ ہے کہ ان کافرانِ عہدِ جدید نے جو اس دور کے نوجوان شاعر کہے جاتے ہیں، ایک نئی شاہراہ کی تعمیر کا عہد کیا ہے۔ مظہر امام بھی اس جادۂ نو کا خاص معمار ہے۔ اس راستے کا عجیب عالم ہے۔ بادلوں کی گہری چھاؤں، دوپہر کی کڑی دھوپ، ریشمی جسموں کی سرسراہٹ، خونچکاں زخموں کی چبھن، پلکوں کے گھنے سائے، زندگیوں کے ڈراؤنے خواب، خواب گاہوں کا جادو، زندانوں کی جھنکار، سرخ جھنڈے، سیاہ شامیں، غرض تمام کیفیتیں اس طرح ملی جلی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔ امام بھی اس رنگا رنگ فضائے فکر و نغمہ میں ایک نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مظہر امام نے جدید تقاضوں کے سنگ و خشت کو حسنِ اعتدال کے ساتھ صنم تراشوں کی طرح مرمریں جسموں میں تبدیل کر دیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد

مظہر امام کا شمار ہمارے ملک کے ان شعرا میں ہے جن کا کلام، غزل ہے یا نظم، خالص تغزل میں رچا ہوا ہے۔ میں نے یہاں تغزل کا لفظ جان بوجھ کر غزل کے عام مفہوم سے ہٹ کر استعمال کیا ہے۔ اس لئے کہ آج اکثر و بیشتر ایسی غزلیں پڑھنے میں آ رہی ہیں جن میں سوائے تغزل کے سب کچھ ہے۔ ان میں مسائل ذات بھی ہیں اور مسائل حیات بھی، فکر بھی ہے اور سیاست بھی لیکن اگر نہیں ہے تو تغزل کی وہ کیفیت جس کا ہونا اشد ضروری ہے۔

آج جب کہ ہمارے اکثر شعرا نے اپنی روایت سے قطعاً بے گانہ ہو کر نظم اور نعرہ بازی کی حدیں بڑی حد تک ملا دی ہیں، مظہر امام کی نظموں میں درد و گداز کی ایک ایسی چنگاری نظر آتی ہے جو دنیائے نظم کو چمک دمک بھی دے رہی ہے اور سوز و تپش بھی۔

نریش کمار شاد

مظہر امام کی صبح بہار کی طرح تازہ و شاداب شاعری میں روایت اور جدّت کا نہایت متوازن اور خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کے اکثر اشعار نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ سچے اور حقیقی شاعر ہیں۔ مظہر امام کی جان دار شاعری اردو شعر و ادب میں جمود کے دعوے کی نہایت شاندار تردید کرتی ہے اور اردو شاعری کا مستقبل اُن سے بلاشبہ بہت بڑی امیدیں وابستہ کر سکتا ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی

مظہر امام ان معدودے چند شعرا میں ہیں جنھیں اپنا ہم عصر اور ہم سفر سمجھنے میں مجھے ہمیشہ مسرت محسوس ہوئی ہے۔ ان کے شعری مزاج کے بارے میں جب بھی میں نے سوچا ہے، مجھے اس دریا کا خیال آیا ہے جو میدانوں میں بہتا ہے اور اس کی چال میں سکون اور گمبھیرتا ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تیز روشنی اور تیز رنگوں کی چونکا دینے والی شاعری نہیں۔ اُن کے کلام میں ایک سلونا پن ملتا ہے جو زمین سے قربت اور اپنائیت کی وجہ سے پیدا

ہوا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے نوجوان شاعر طوفان کی طرح آئے لیکن ان کی آوازیں بہت جلد فضا میں کھو گئیں۔ مظہر امام نے آہستہ آہستہ اپنی آواز کا جادو جگایا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کا فن دیرپا ثابت ہوگا۔

گوپی چند نارنگ

.............دوسری طرف ہماری نئی نسل کے بعض وہ شاعر ہیں، جو روایت کے پابند نہیں اور شاعری کو فکر و اسلوب کے اعتبار سے نئی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ نئی نسل کے نظم گو شاعروں میں جو نئے نام ابھرے ہیں اور جنہوں نے فکر و احساس کا نیا جادو جگایا ہے، ان میں خورشید الاسلام، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام، شاذ تمکنت، وحید اختر، شہر یار، محمود ایاز، انور معظم، شہاب جعفری، شفیق فاطمہ شعری، عمیق حنفی اور بلراج کومل قابل ذکر ہیں۔

وزیر آغا

مظہر امام کی شاعری کے پس پشت زندہ رہنے کی ایک تیز خواہش موجود ہے۔ لیکن خواہش اور تکمیل خواہش کے درمیان حادثات پیہم کے عفریت سینہ تان کے کھڑے ہوگئے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے آئینۂ دل کے چور چور ہو جانے کی ہزار کیفیتوں کو اپنی نظموں میں سمو لیا ہے۔ فی الواقعہ یہ زندگی سے ان کا بے پناہ اُنس ہے جو ابِ صورت بدل کر شکستِ دل کی صدا بن گیا ہے اور ان کے کلام میں وہ کسک نمودار ہوگئی ہے جس کے بغیر عمدہ شاعری کبھی تخلیق نہیں ہو سکتی۔

محمد حسن

مظہر امام نئی نسل کے مقبول اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں مٹھاس اور شگفتگی ہے۔ درد آشنائی ہے، شکست خوردگی اور قنوطیت کے بغیر! حسن کاری ہے، کاریگری اور تصنع کے بغیر! مزہ ہے، آلودگی کے بغیر! وہ لہجے کی نرمی اور آواز کی ملائمت کے جادو سے واقف ہیں اور ان کی شاعری میں یہی سنبھلی ہوئی کیفیت، یہی شائستۂ غم لطافت اور یہی نکھری ہوئی دردمندی موجود ہے۔

نثار احمد فاروقی

مظہر امام کی شاعری صحت مند دماغ کی پیداوار ہے۔ انہوں نے فکر اور احساس کا ایسا لطیف آمیزہ تیار کیا ہے جو ہمارے بیش تر کہنہ مشق شاعروں کو برسوں کی ریاضت سے بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس دور میں بہت سے شاعروں کی شہرت کا ایوان پروپگنڈے کے ستونوں پر کھڑا ہوا ہے۔ لیکن مظہر امام نے اچھے شاعروں کی صف میں اپنی ممتاز جگہ محض اپنے کلام کی فنی قدر و قیمت سے بنائی ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاص، دروں بینی، شدت احساس، رنگینیِ ادا اور جوش اظہار پایا جاتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔

شاذ تمکنت

مظہر امام تہذیب و روایت کے سنگم پر نغمہ ریز ہیں۔ انہیں ماضی کے ادب کے مرتبہ و منصب کا بھی احساس ہے اور حال و مستقبل کے دیدہ و نادیدہ تقاضوں کا بھی کما حقہٗ شعور ہے۔ ساز اور آواز کی ہم آہنگی اور سریلے پن نے انہیں نئے شاعروں کی صف میں ایک نمایاں اور ممتاز جگہ عطا کی ہے جو قابل رشک بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔ مظہر امام کے شعر کی یہ سہی قامتی ان کی نگاہِ بلند کی رہین منت ہے۔ یہ شاعری ڈھل کی گونج بھی ہے اور دور بجتی ہوئی بانسری کی لے بھی۔ جلال و جمال کا یہ امتزاج اس دور کی دین ہے، جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔

رشتہ گونگے سفر کا
1974

کرشن چندر

مظہر امام کی شاعری جدیدیت اور ترقی پسندی کا سنگم ہے...انہوں نے یقین کے ساتھ بھی کہا ہے، اور اس منزل پر بھی پہنچے ہیں، جہاں ایک ہی مرکز سے کئی راستے مختلف سمتوں میں جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر مظہر امام نے انسانیت اور انسان پرستی کا راستہ اختیار کیا ہے، عینیت اور شکیت کا نہیں۔ ان کی اعلیٰ شعری تخلیقات میں اگر ذاتی کرب ہے تو سماجی دردمندی کا احساس بھی ہے۔ وہ اپنی ذات کے دائرے میں منفرد اور الگ ہیں، لیکن سماجی حلقے میں پہنچ کر دوسروں سے جُڑے ہوئے بھی ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت جزیرہ بھی ہیں اور جزیرہ نما بھی۔ وہ ایک معتدل متوازن شعری مزاج کے مالک ہیں اور اسی وجہ سے متضاد ادبی حلقوں میں بھی عزت اور وقار کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

جمیل مظہری

بیسویں صدی کی درمیانی دہائیوں میں اردو کی تاریخ ادب نے دو نئے ابواب کا اضافہ کیا۔ ایک تحریک ترقی پسندی اور دوسری وہ تحریک جسے جدت پسندی یا جدیدیت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان دونوں تحریکوں نے ہماری شاعری میں کم و بیش ایک ذوقی اور اسالیبی انقلاب برپا کیا اور ہمیں ایسے شاعر اور فن کار دیئے جو بہ اعتبار فکر نہ سہی مگر بہ اعتبار اسالیب و آہنگ عہد آفریں ثابت ہوئے۔ لیکن جدت پسندی اور ترقی پسندی دونوں تحریکوں کے معنوی اثرات اگر توازن و اعتدال کے ساتھ کسی ایک جگہ جمع ہیں تو وہ مظہر

امام کا فن اور مظہر امام کی شاعری ہے۔ یہی ان کی وہ فنی خصوصیت ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی

اسلوب اور طرزِ فکر میں ثنویت ہے یا وحدت، یہ بحث بڑی پرانی ہے۔ کم کوش نقاد اس مرحلے کو یوں حل کرتا ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ شعرا کے یہاں 'فکر وفن کا امتزاج' دریافت کرتا ہے۔ گویا فکر وفن کے بغیر بھی فن یا فن کے بغیر بھی فکر ممکن ہے۔ لیکن اس بحث کو طے کرنے کا آسان طریقہ ہے کہ کسی سچے شاعر، مثلاً مظہر امام کے کلام کا مطالعہ کیا جائے۔ شعر کا جو اظہار ان کے کلام میں ہے، اسے جدید شعری فکر کا بھی اظہار کہہ سکتے ہیں۔ مظہر امام کو اپنے لہجے کی انفرادیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات سے ان کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس کا تصور کسی روایتی فکر سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی کرید، ان کا تجسس، اُن کی برہمی، ان کی بے چارگی، پُرتفکر محزونی، ان عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو یہ عصر حاضر کی عمومی فضا میں جگہ جگہ مل جائیں گے۔ لیکن شعری فکر کی انفرادیت نے ان مختلف دھاروں کو یک جاکر کے انہیں اپنے کوزے میں بند کرلیا ہے۔

قمر رئیس

مظہر امام کی شاعری سلگتے ہوئے قلب، دھڑکتے ہوئے ذہن، دہکتے ہوئے شعور اور ہانپتے ہوئے خوابوں کی شاعری ہے۔ ایک بے پایاں، رُدِ ایک مستقل کرب جواُن کی ہر تخلیق میں چمک اٹھتا ہے، وہی اس دور سے، اس زندگی سے اور خود شاعری سے ان کے رشتوں کا شناختی نشان ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں دونوں کے بین الحروف جوڑ و بتا ساتخیلی انداز اور نرم حسیاتی لہجہ ہے، اُس میں یہ نشان صاف نظر آتا ہے۔

سید محمد عقیل

مظہر امام کو اس کا لالچ نہیں کہ وہ کئی شعری مجموعوں کے خالق ہو جائیں لیکن اس کی فکر ضرور رہتی ہے کہ وہ اپنے افکار کے اندکاس میں انسانوں کی دنیا سے اتنی دور نہ چلے جائیں جہاں فکر واحساس کا شہ باز ناٹک ٹوئیاں مارتا رہ جائے۔ مظہر امام کی شاعری روایت اور تجربوں کا ایک سنگم ہے۔ روایت جو اردو شاعری کے ارتقائی تسلسل سے منسلک ہے اور تجربے جو نت نئی زندگی کی پیچیدگیوں سے رشتہ جوڑتے اور توڑتے رہتے ہیں اور اس طرح ان کی شعری تخلیق کا عمل جاری رہتا ہے۔

غیاث احمد گدی

مظہر امام کی شاعری جہاں اردو کی کلاسیکی شاعری کے کس بل کو لے کر چلی ہے وہاں جدید حسی اور تکنیکی تجربوں کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ ناموں کی بھیڑ میں مظہر امام اپنی خوب صورت شاعری اور منفرد لب ولہجہ کے سبب، بہت اونچے دکھائے دیتے ہیں۔

زیب غوری

'تمہارے لئے ایک نظم' آہستہ آہستہ کسی بوسیدہ نامہ محبت کی طرح داخلی کیفیت کے سہارے کھلتی ہے۔ مصرعوں کی سبک تراش اور لفظوں کا تخلیقی استعمال قابل ستائش ہے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے staticاور انفعالی جذبہ میں چند ناطق لمحات کے وسیلے سے احساس کی تھرتھری پیدا کردی ہے۔

بانی

ایک عمر سے تمہارا کلام پڑھتا ہوں۔ اور تمہیں اپنے قبیلے کے شاعروں کا پیش رو سمجھتا ہوں۔ تمہاری شاعری مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی

آپ نہایت اچھے شاعر وادیب اور میرے پیش رو ہیں۔ میری نگاہ جہاں تک پہنچ سکی ہے وہاں تک آپ مجھے منفرد اور ناگزیر نظر آئے ہیں۔

مُصوّر سبزواری

آپ کا کلام برابر پڑھ رہا ہوں۔ وہی دانش ورانہ لہجہ اور پُر وقار رنگ و آہنگ۔ یقین جانئے، اس دور میں جب کہ بانی، فکری وغیرہ سب ہی بجھ گئے ہیں، آپ کے یہاں آب وتاب میں اضافہ ہے۔

پچھلے موسم کا پھول
1988

تنویر احمد علوی

...میں نے اب تک جتنا اسے (شعری مجموعے کو) دیکھا ہے، آپ سے ذہنی قربت کا احساس بڑھتا رہا ہے۔ نئی غزل ہماری شاعری کی نئی نمود ہے اور آپ کی غزل نگاری اس کا ایک خوب صورت پیکر۔

نئی غزل کا ایک مختص پہلو شخصی اظہار ہے اور اس شخصی اظہار کا پیرایہ وہ خود کلامی ہے جس کی انفرادیت میں آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں۔ یہ آپ کی آواز ہے، دل کی دھڑکن کی طرح منفرد...

21اگست 1989

پروفیسر شکیل الرحمٰن

مظہر امام کی غزلیں 'میں' 'تم' 'اور وہ' کی کہانی لئے ہوئے ہیں۔ ان ہی تین کرداروں کا قصہ طرح طرح سے بیان ہوا ہے۔ ان تین کرداروں سے ہی تو زندگی

عبارت ہے۔ کبھی 'میں' 'تم' میں جذب ہو جاتا ہے اور کبھی 'تم' "وہ" میں، کبھی 'میں' کی انا چیختی ہے اور کبھی 'تم' کا جادو 'میں' کی انا کو ختم کر دیتا ہے، ایک ہی کردار مختلف قصوں اور تجربوں میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مظہر امام کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے صرف ان تین کرداروں کی جمالیاتی تمثیلیں پیش کی ہیں اور حسیات اور مشاہدے سے انہیں جاذب نظر بنایا ہے۔ کہیں کہیں تحت البیان (Understatement) سے بھی لطف بڑھ گیا ہے۔

رشید حسن خاں

مجموعے کے کئی شعر اچھے لگے، مثلاً:

ہر ایک شخص کا چہرہ اداس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے

یہ آرزو تھی کہ یک رنگ ہو کے جی لیتا
مگر وہ آنکھ جو شیطاں بھی ہے، فرشتہ بھی!

متعدد غزلیں اس میں مسلسل ہیں۔ مسلسل غزل کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ وہ خیال کے اس انفرادی ارتکاز کو ختم کر دیتی ہے جو غزل کا اصلی حسن ہے۔ پھر بھی 'ہمیں کیا' والی غزل خوب ہے۔

اسلوب احمد انصاری

مجموعہ پسند آیا۔ پچھلے دونوں مجموعوں سے زیادہ قابلِ وقعت میں نے اسے پایا۔ اس کے لہجے میں ایک نیا پن ہے جو یقیناً قابلِ قدر ہے۔

زبیر رضوی

مجموعہ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ یقینی طور سے تم غزل کہتے اور لکھتے ہوئے اپنے ہم عصروں سے الگ لگتے ہو۔ 'دعا' کا کلیدی لفظ تمہاری پوری شعری لفظیات میں بڑا نمایاں ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ تم نے بے ضرر اور نہ دکھ دینے والے رویے کو اپنے مزاج کا حصہ بنا لیا، تو پھر اگر تمہارے ہونٹوں پر حرفِ خیر ہو اور تم ہمیشہ دست بدعا نظر آتے ہو تو یہ اچنبھے کی بات نہیں۔ یہ غزلیں ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر مظہر امام سے ملاتی ہیں۔

افتخار عارف

'پچھلے موسم کا پھول' جاتی بہار کے ساتھ ملا تو ساری شام اس کی خوش بو میں بسی ہوئی ہے۔ ہندستان میں غزل کہنے والے جو لوگ مجھے اچھے لگتے ہیں، ان میں آپ کا نام بھی ہے۔

کمار پاشی

آپ کی نئی شعری کتاب مل گئی تھی۔ کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور روحانی مسرت حاصل کر چکا ہوں۔ جب جب آپ کی غزلیں پڑھتا ہوں، ایک بالکل نئی کیفیت سے گذرتا ہوں۔ کتاب آپ کے شعری سفر کی نئی منزل کا سفر نامہ ہے۔ آج کی غزلیہ شاعری میں جو اکتا دینے والی یکسانیت راہ پا گئی ہے، آپ کی غزلیں اس کے برعکس ہوا کے اس تازہ جھونکے کی طرح ہیں، جس سے ذہن و دل کو راحت ملتی ہے۔

8 نومبر 1989

عبد الصمد

مظہر امام نے یک سوئی کے ساتھ اپنے فن پر توجہ دی اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے اپنے فن میں جدید حسیت کی زندہ اور تابندہ روح کو سمو دیا بلکہ انہوں نے فنی اعتبار سے بھی اپنی شاعری میں کسی قسم کے جھول کی گنجائش نہیں رکھی۔ 'زخم تمنا' اور 'رشتہ گونگے سفر کا' سے 'پچھلے موسم کا پھول' تک کا سفر اس کا ثبوت ہے۔ 'کشمیر کی غزلیں' کے عنوان سے ان کی جو غزلیں آئی ہیں، وہ بلاشبہ اردو غزل میں اضافہ ہیں۔

فیاض رفعت

'پچھلے موسم کا پھول' نے مجھے بہت attract کیا۔ آپ کی شاعری مستحکم ہے اور کہیں کہیں سے بہت بڑی شاعری ہے۔ یہ انکشاف اور اکتشاف کی شاعری ہے۔ جذبہ کی نزاکتوں کی شاعری ہے۔ اظہار کے آبگینوں کی شاعری ہے۔

ظفر پیامی (دیوان بیریندر ناتھ)

سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کی آزاد غزلیں بہت اچھی لگیں۔ مبارک باد۔ نہ جانے کیوں لوگ آزاد غزل کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جو صنف جس قدر آزاد ہوگی، وہ اسی قدر زیادہ خونِ جگر طلب کرے گی اپنے خالق سے... خدا کا شکر ہے کہ آپ کا فن اپنی روایت کے سرمائے کا پوری طرح وارث اور امین ہوتے ہوئے بھی ستاروں سے آگے کی دنیاؤں کی تلاش میں ہے۔ دعا ہے کہ نہ آپ کو چین نصیب ہو نہ یہ آپ کا حسین سفر ختم ہو۔

آتی جاتی لہریں
1981

اختر الایمان

'آتی جاتی لہریں' میں جو بات اچھی لگی وہ بے لاگ رائے ہے، ورنہ اکثر لکھنے والے رکھ رکھاؤ سے بات کرتے ہیں اور مصلحت کو سامنے رکھتے ہیں۔

آل احمد سرور

'آتی جاتی لہریں' میں ایک رچا ہوا ذوق اور ایک شگفتہ اسلوب ملتا ہے۔ ہمارے کلاسیکی سرمایے پر مظہر امام کی نظر گہری ہے اور فکر و فن کے نئے میلانات سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں۔

گوپی چند نارنگ

اردو شاعری میں مظہر امام ایک مقتدر اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ نثر نگاری کے میدان میں بھی وہ اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کے بعض تنقیدی مضامین خاصے بحث انگیز ثابت ہوئے ہیں۔

کرامت علی کرامت

جہاں تک مظہر امام کی تنقید کا سوال ہے، ان کی تیکھا انداز آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ وہ چند الفاظ میں بڑی گہری باتیں کہہ جاتے ہیں۔ آپ ان گہرائیوں میں اترتے جائیں تو گویا ایک اتھاہ سمندر میں ڈوبتے ہی جائیں گے اور خود آپ کو اندازہ نہیں ہوگا کہ آپ کتنی گہری سطح تک پہنچ چکے ہیں۔

اسلم پرویز

اس کتاب کے بیش تر مضامین کا مطالعہ اردو ادب کے ان طالب علموں کے لئے مفید ہوسکتا ہے جو یونی ورسٹیوں کے کورس میں قلی قطب شاہ، میر، سودا اور غالب وغیرہ کے بارے میں تو بہت پڑھتے ہیں، لیکن پچھلے پچاس برسوں میں اردو ادب میں کیا ہوتا رہا ہے، اس سے بالکل نابلد ہیں۔

مظفر حنفی

بلاشبہ ان مضامین میں مظہر امام نے بے باکی اور جرأت اظہار کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ گذشتہ تیس پینتیس برسوں سے دشت ادب کے سیاح ہیں اور اس میدان کے نشیب وفراز پر ان کی نگاہ ہے۔ چناں چہ انہوں نے اپنی وسعت مکالمہ اور ذاتی تجربات کی روشنی میں بہت سی ایسی باتیں برجستگی کے ساتھ بیان کردی ہیں جن پر ہمارے پیشہ ور نقاد جم کر گفتگو نہیں کرسکتے۔

انور سدید

مظہر امام کے یہاں ادبی مسائل پر غور کرنے اور ان سے معنی خیز نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت نمایاں ہے۔ انہوں نے ادب کی سیاحی میں جو عمر گزاری ہے، اس کے ثمرات کو بڑی خوبی سے تنقید میں استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ بات پورے یقین سے کرتے ہیں اور ان کے اس یقین میں مکالمے کی روشنی اور ذاتی تجربے کی آنچ صاف نظر آتی ہے۔ مظہر امام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مباحث کو بوجھل نہیں ہونے دیا۔ ان کا اسلوب شگفتہ اور رواں ہے، اور قاری انہیں پڑھتے ہوئے لطافت محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔

شمیم حنفی

خشونت، جارحیت، ہٹ دھرمی، علم نمائی اور ایک طرح کی بے روح سنجیدگی کے عیب سے یہ مضامین یکسر پاک ہیں۔ یہ کتاب مظہر امام کی بے تکلف نثر اور بے ساختہ اسلوب کے سبب ذہن پر بوجھ نہیں بنتی۔ عام نقادوں کے برعکس انہوں نے اپنے موضوعات پر اظہار خیال ایک ایسے تناظر کے ساتھ کیا ہے جو صرف کتابی نہیں ہے اور جس کے سلسلے انسانی تجربوں کی کائنات میں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔

بلراج کومل

مظہر امام کے مضامین چوں کہ درسی اور مکتبی ہرگز نہیں ہیں اور طرز اظہار کے اعتبار سے فطری غیر آراستہ لب ولہجے کا استعمال کرتے ہیں، اس لئے مجھے اکثر وبیش تر ان کی شعری شخصیت ہی کی توسیع محسوس ہوتے ہیں۔ بھاری بھرکم تنقیدی ہجوم اصطلاحات ولفظیات سے پاک ہے اور غیر رسمی لب ولہجہ واسلوب سے منور مجموعہ مضامین ہے۔

انور صدیقی

مظہر امام کی باخبری کی سطح بہت سے پیشہ ور نقادوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ وہ تنقیدی پرکھ کے معیار تخلیق سے ہی برآمد کرتے ہیں اور پھر ان کے اطلاق میں اس ذہنی ہم دردی کا ثبوت دیتے ہیں جس کی اردو کی نئی تنقید میں بڑی کمی ہے۔

ابوالکلام قاسمی

'آتی جاتی لہریں' مظہر امام کے مخصوص رواں اسلوب اور شگفتہ نثر میں لکھے ہوئے مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا مکالمہ تنقید کے بے آب وگیاہ صحرا میں دل چسپی، تازگی اور تخلیقی شان کے برگ وبار کا نظارہ کراتا ہے۔

پروفیسر محمد حسن

بہت دنوں بعد اردو میں تنقیدی مضامین کا ایسا ہلکا پھلکا مجموعہ شائع ہوا ہے جسے مزے لے لے کر پڑھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

مظہر امام بڑے شاعر بھی ہیں اور قابل قدر اچھے نقاد بھی ہیں۔

مقام حیرت تو یہی ہے کہ لفاظی اور حوالہ جات کے ذریعے سے کسی موضوع پر شب خون مارنے والے کو تو نقاد سمجھ لیا جاتا، لیکن جو نپی تلی بات کرتا ہے، چھان بین سے کام لیتا ہے، محرکات ذہنی وقلبی سے واقفیت رکھتا ہے، وسیع المطالعہ بھی ہے، تخلیقی ادب بھی پیش کرتا ہے، اس سے ہم اردو والے بالعموم ہی نہیں، بالخصوص بھی چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔

مظہر امام کے تنقیدی مضامین پر مشتمل (یہ) کتاب زیادہ سے زیادہ توجہ اور التفات کی مستحق ہے۔

وارث علوی

لطف آتا ہے ایسی تنقیدیں پڑھنے میں، جو مسائل اٹھاتی ہیں۔ کتاب کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ وہ تجسس اور اکساہٹ پیدا کرتی ہیں۔ آپ جارگون jargon سے بچ گئے ہیں، یہ ایک بڑی چیز ہے۔ زبان بھی ایسی لکھتے ہیں کہ فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کو کچھ کہنا ہے اپنی زبان میں۔ ایسے لوگوں کی باتیں سننے میں مزا آتا ہے۔ اتفاق اور اختلاف کے مراحل بھی تو اسی وقت درپیش ہوں گے جب آپ باتیں سنیں۔

نظیر صدیقی

آپ کے اندر سچ بولنے اور انصاف کرنے کی دو بڑی خوبیاں ہیں جو آج کل کے نقادوں میں ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ آپ کی نثر بھی بہت readable ہے۔

ابن فرید

آپ بہت زیادہ سچ بولتے ہیں۔ اسے ہمارے عصری ادب میں کہاں برداشت کیا جاتا ہے!

علی حماد عباسی

آپ کا ذہن نہایت ہی رسا، مطالعہ وسیع اور موضوع کی گرفت بے مثل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بعد ہمارے ملک میں اتنا well-informed آدمی کوئی دوسرا نہیں جتنا کہ میں نے آپ کو ان مضامین میں پایا ہے۔

ایک لہر آتی ہوئی
1997

نیّر مسعود

فکر انگیز تحریروں کے اس مجموعے کو میں نے بہت دل چسپی سے پڑھا۔ آپ کے مطالعے کی وسعت کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ وسیع مطالعہ تو بہتوں نے کیا ہے، لیکن آپ کی طرح مربوط مطالعے والے لوگ کم ہیں۔ آپ کی نگاہ مباحث کے بنیادی نکتوں تک پہنچتی ہے اور ان کو روشن کرنے میں آپ کا مطالعہ کام آتا ہے۔

کسی ادبی بحث کو صحیح راستے پر لگانے میں آپ کی تحریروں سے جتنا کام لیا جاسکتا ہے اتنا لیا نہیں جاتا، یہ افسوس کی بات ہے۔

عرفان صدیقی

آپ کے مضامین میں اسلوب کی شگفتگی اور روانی اور اظہار کی دیانت واخلاص متاثر کرنے والے عناصر ہیں۔ ادب کے مطالعے میں اختلاف اور اتفاق اپنی جگہ، لیکن بڑی اہمیت ادب سے سچی وابستگی کی ہے، جو آپ کے یہاں نمایاں ہے۔

شہپر رسول

کیا خوب صورت اور زندہ بالکل سانس لیتی ہوئی کتاب آپ نے ادب کو دی ہے۔ میں نے ابھی 'غالب بے رنگ' اور مولانا صہبا والے مضامین پڑھے ہیں۔ ذہن سیراب ہوگیا۔

تنقید نما
2004

وارث علوی

ہلکے پھلکے دل چسپ معلوماتی تنقیدی مضامین اب سوائے آپ کے کون لکھ رہا ہے۔ آپ وہ ہیں
جو میں بھی تھا

لیکن اب میں نہیں رہا۔ اور نہ رہنے کا افسوس ہے۔ یعنی ادب کا ایسا قاری جس کی نظروں سے ادب کی کوئی بھی اہم تحریر جو کسی بھی کتاب یا رسالے میں چھپی ہے، بچنے نہ پائے، اور ذہن پر نقش ہوجائے۔ وسیع اور متنوع ادبی حوالوں سے تنقیدی گفتگو کا لطف رہتا ہے اور یہی باتیں آپ کے مضامین کو دل چسپ اور معلوماتی بناتی ہیں۔

وارث کرمانی

آپ نے 'تنقید نما' نام رکھ کر خاکساری کی ہے۔ 'تنقید نما' ہزاروں تنقیدی کتابوں سے بہتر ہے۔ ہاں، اس معنی میں یہ عنوان صحیح ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ تنقید لکھنا سیکھ جائیں گے۔

بشر نواز

مضامین میں تنقیدی بصیرت تو ہے ہی، انداز بیان بھی اتنا دل کش ہے کہ پوری کتاب (''تنقید نما'') ایک دونشستوں میں پڑھ لی۔ پورے ایک دور کا منظر نامہ پیش کردیا آپ نے۔ زیر بحث افراد کی پوری شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

آپ کا حافظہ بھی بلا کا ہے۔ جزئیات کے ساتھ اپنے پرانے واقعات کا بیان حیرت انگیز بھی ہے اور دل چسپ بھی۔

صدیق عالم

آپ کی تخلیقات سے بے نیازانہ گذر جانا ناممکن ہے۔ یہ مضامین ادب کے منظر نامے پر وہ نشانات ہیں، جنھیں آپ نے اس کتاب کے ذریعے مٹنے سے روک لیا ہے۔

بیانِ خود، زبانِ خود

میرا ذہنی سفر

مظہر امام

میرا وطن شمالی بہار کا ایک شہر دربھنگا ہے۔ یہ متھلا کا وہ علاقہ ہے جو ودّیا پتی کے نغموں کی گونج سے آج بھی سرشار ہے۔ میری زندگی کا ابتدائی حصہ وہیں گزرا ہے اور بی اے تک تعلیم وہیں حاصل کی ہے۔ میٹرک کی سرٹیفکیٹ کی رُو سے میری تاریخ پیدائش 5 مارچ 1930 ہے۔ لیکن پرانے کاغذات میں ایک آدھ جگہ 12 مارچ 1928 درج ہے۔ میں اسے ہی صحیح سمجھتا ہوں۔ اسکول میں عمر کم کر کے نام لکھانے کا رواج عام رہا ہے۔

میری پیدائش مونگیر میں ہوئی جہاں میرے والد سیّد امیر علی بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ میرے دادا انبالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے اور فوج میں ڈاکٹر تھے۔ وہ انبالہ چھاؤنی سے تبدیل ہو کر بکسر (Buxar) چھاؤنی (موجودہ ضلع بھوجپور، بہار) آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ میرے والد اور میرے چچا (میرے والد کے چھوٹے بھائی) اُن کے ساتھ ہی انبالے سے آئے تھے۔ میرے والد کی عمر اس وقت یہی کوئی اٹھارہ اُنیس سال رہی ہوگی۔ خاندان ہی کی ایک لڑکی سے اُن کی شادی ہوئی تھی۔ اُن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُنھیں ہم لوگ بڑی امّاں کہا کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ میرے والد نے دادا سے مشورے کے بغیر محکمۂ ڈاک وتار میں ملازمت کر لی اور دس روپے کی تنخواہ سے شروع کر کے چار سو روپے کی تنخواہ تک پہنچے اور 1932 میں سلکشن گریڈ ہیڈ پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ پوسٹ آفس کی ملازمت کے دوران اُن کا تبادلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوتا رہا۔ لہریا سرائے (دربھنگا) میں پوسٹنگ کے دوران انھوں نے دوسری شادی کی اور ریٹائر ہونے کے بعد دربھنگے میں (لیکن اپنی سسرال میں نہیں) باقاعدہ سکونت پذیر ہوئے۔ دربھنگے کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ امدادیہ میرے نانا کے بھائی مولانا منوّر علی کی قائم کی ہوئی ہے۔

میں نے اپنے والد کے ہاتھ میں کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں دیکھی۔ قرآن، حدیث اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ ان کے معمولات میں شامل تھا۔

بچپن کے تصوّر کے ساتھ ایک خوش حال گھرانے کا تصوّر اُبھرتا ہے۔ گیارہ کمروں کے ایک پُروقار مکان میں ہم لوگ رہا کرتے تھے۔ میرے والد، میری والدہ، بڑی امّاں، میری ایک چچازاد بیوہ بہن، ہم تین بھائی اور دو بہنیں۔ (حُسنِ اتفاق کہ میرے والد کے مکان 'امیر منزل' اور اقبال کے 'جاوید منزل' کا سنہ تعمیر 1932 ہی ہے) 11 نومبر 1939 کو میرے والد کا انتقال ہوا۔ اس وقت ہم سب بھائی بہن کافی چھوٹے تھے۔ والد کی وفات کے بعد ہماری تربیت اور سارے کنبے کی دیکھ بھال کی ذمہ داریاں، معمولی تعلیم کے باوجود، میری والدہ سیّدہ کنیز فاطمہ نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ ہمارے سرپران کا سایہ 31 مئی 1965 تک قائم رہا۔

میری ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ مولوی یوسف صاحب باقاعدہ ہمارے گھر رہا کرتے تھے اور ہم بھائیوں اور بہنوں کو پڑھاتے تھے۔ قرآن حفظ کرنے کا سوال تو کبھی پیدا نہیں ہوا، لیکن میں روانی اور صحت کے ساتھ قرآن پڑھتا تھا۔ اسماعیل میرٹھی کی اُردو کی تیسری چوتھی تک اور فارسی میں گلستاں بوستاں تک تعلیم ختم کرنے کے بعد انگریزی کی طرف توجہ ہوئی۔ اسکول میں حساب اور جغرافیہ سے دل چسپی پیدا نہ ہو سکی، اگرچہ میٹرک میں حساب میں اچھے نمبر آئے۔ ادب سے دل چسپی ہوئی لیکن شغف کی حد تک نہیں۔ نارتھ بروک ضلع اسکول میں جناب حسن رضا ثاقب عظیم آبادی اُردو پڑھاتے تھے۔ ان کا تحقیقی رسالہ 'یادگارِ عشق' ان ہی دِنوں چھپ کر آیا تھا۔ اُنھیں اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر بہت اچھی دست گاہ تھی۔ اُردو شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں پہلی رہ نمائی اُن ہی سے حاصل ہوئی۔

تیرہ سال کی عمر میں یعنی اسکول چھوڑنے سے قبل ہی اُردو ادب اور شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ پڑھنے کا بھی اور لکھنے کا بھی۔ گھر میں جاسوسی ناولوں اور عبدالحلیم شرر کے ناولوں کے علاوہ کچھ داستانیں مثلاً باغ و بہار، آرائش محفل، فسانۂ عجائب وغیرہ نہ جانے کیسے موجود تھیں۔ ان سب کو ایک ماہ کے

اندر ختم کر ڈالا۔ عموماً ایک دن کے اندر ایک کتاب ختم ہو جاتی تھی۔ اسی سال لکھنے کی کوشش کی تو تیس پینتیس دنوں کے اندر تیرہ افسانے لکھ ڈالے۔ شروع میں شعر وادب سے ایک طرح کی بے زاری تھی۔ میرے بڑے بھائی حسن امام درد مجھ سے کئی سال پہلے ہی افسانہ نگاری اور شاعری کرنے لگے تھے۔ میں والدہ سے جا کر اس 'حرکتِ قبیح' کی شکایت کیا کرتا۔ میرے بڑے ماموں جناب منظور احمد نظر سرتاپا شاعر تھے۔ انہیں شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ برابر اس پر فخر کیا کرتے۔ اپنے استاد سے اس درجہ عقیدت میں نے بہت کم شاعروں میں پائی ہے۔ جناب منظور احمد نظر دربھنگوی کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام قیس عظیم آبادی کے مرتبہ 'گلشن حیات' اور اقبال عظیم کے تذکرے 'مشرقی بنگال میں اُردو' میں موجود ہیں۔ منظور ماموں کی دیکھا دیکھی میرے دو اور ماموں جناب خلیل احمد اور جناب افتخار احمد نے بھی بالترتیب جگر اور دہر تخلص اختیار کر لئے تھے۔ خلیل احمد جگر تو منظور احمد نظر کے 'عطیات' پر ہی اکتفا کرتے رہے، لیکن افتخار احمد دہر ناصری نے شعر وشاعری سے رسمی دل چسپی رکھنے کے علاوہ اردو گرامر اور کمپوزیشن پر معتد بہ کام کیا۔ قواعد پر ان کی ایک کتاب شائع بھی ہوئی اور کئی برس تک نصاب میں شامل رہی۔ کمپوزیشن پر ان کی ایک ضخیم تالیف مکمل تھی۔ 'انیس الشعرا' کے نام سے انہوں نے تذکیر وتانیث کا ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا۔

مختصر آیہ کہ میری نانیہال میں جو میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر واقع تھی، شعر وشاعری کا چرچا تھا۔ شہر میں سید محمد کریم تمنا دربھنگوی (شاگرد نوح ناروی) اور جناب سوزاں سہسرامی کی معرکہ آرائیوں کی گونج تھی۔ اقبال اور جوش کے رنگ میں شعر کہنے والے عبدالعلیم آسی کی شاعری نئے نوجوان ذہن کو پسند آئی تھی۔ میری عمر بارہ تیرہ سال کی رہی ہوگی جب 1941 میں دربھنگا سے ایک معیاری ادبی ماہنامہ 'ہمالہ' کا اجرا ہوا اور اس کی ادارت کے لئے شِ مظفر پوری کو بطور خاص منتخب کیا گیا، جو اس وقت نو عمر لیکن نہایت ہر دل عزیز افسانہ نگار تھے۔ ایک شہرت یافتہ ادیب کو میں نے پہلی بار دیکھا۔

یہی وہ پس منظر تھا، جس نے میرے اندر سوئے ہوئے ادبی ذوق کے لیے ایک منظر عطا کیا۔ لیکن جس نے میرے ادبی ذوق کو واقعی مہمیز لگائی وہ ایک مشاعرہ تھا، جو کسی نمائش کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے کے لیے جگر مراد آبادی کا ایک مصرعہ بہ طور طرح دیا گیا تھا:

'نادیدہ اک نگاہ کیے جا رہا ہوں میں'

اس مشاعرے سے واپس آنے کے بعد لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ پہلے افسانے لکھے، پھر شاعری شروع کی۔ ناول، افسانے اور شعری مجموعے بے تحاشا پڑھتے۔ میرے والد بجنور کا سہ روزہ 'مدینہ' اخبار منگوایا کرتے تھے، جو اُن کے انتقال کے بعد بھی دو تین سال تک جاری رہا۔ اس میں ماہر القادری کا کلام ہر ہفتے بلکہ ہر اشاعت میں اور جگر مراد آبادی کا کلام اکثر شائع ہوتا رہتا تھا، جنہیں میں بہت توجہ اور دل چسپی سے پڑھتا تھا۔

میرے ماموں خلیل احمد جگر محکمۂ ڈاک کی ملازمت میں تھے۔ انہیں رسالے پڑھنے کا شوق تھا، اس لئے ہر مہینے دوسروں کے نام آئے ہوئے پانچ سات پرچے وہ پوسٹ آفس سے ضرور لاتے تھے۔ ان میں ساقی، ادب لطیف، ادبی دُنیا، عالم گیر، نیرنگ خیال، شاہکار (تاجور نجیب آبادی) وغیرہ جیسے اہم رسائل بھی شامل ہوتے تھے۔ یہ زمانہ اُردو افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، احمد ندیم قاسمی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، ممتاز مفتی، دیوندر ستیارتھی، اُپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور وغیرہ کے بعض بہترین افسانے ان ہی رسائل کے توسط سے پڑھنے کو ملے۔ نو آمدہ ممتاز شیریں اور قرۃ العین حیدر نے بھی متوجہ کیا۔ پریم چند کی تقریباً تمام تصانیف پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ پریم چند کے مجموعوں کے بعد اُپندر ناتھ اشک کا مجموعہ 'ڈاچی' پہلا افسانوی مجموعہ تھا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ کرشن، بیدی وغیرہ کے مجموعے بعد میں زیر مطالعہ آئے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ان افسانہ نگاروں سے پہلے عظیم بیگ چغتائی اور ایم اسلم کے افسانوں نے خاصا اثر ڈالا تھا اور میرے ابتدائی افسانے ان ہی سے متاثر ہو کر لکھے گئے تھے۔ یہ دونوں 'ساقی' کے خاص لکھنے والوں میں تھے۔ ابتدا میں ایک دو سال میں نے افسانہ نگاری کی، پھر سارے افسانے نذرِ آتش کر دیئے۔ تین چار سال کے توقف کے بعد دو طویل افسانے لکھے۔ ایک افسانہ 1948 میں 'مضراب' کراچی میں 'آخر اس درد کی دوا کیا ہے' کے نام سے شائع ہوا۔

1950 میں صوبائی انجمن ترقی اُردو بہار کی جانب سے پٹنہ میں ایک شاندار جلسہ اور مشاعرہ منعقد ہوا تھا، جس میں پنڈت دتاتریہ کیفی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، پرویز شاہدی، مجاز وغیرہ جیسی مقتدر ہستیاں شریک ہوئی تھیں۔ اتنے سارے اکابرینِ ادب کو دیکھنے اور سننے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اس موقع پر افسانہ، شاعری اور تنقید کے سلسلے میں ایک انعامی مقابلہ بھی ہوا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ افسانوی مقابلے میں زکی انور اور انور عظیم نے بھی حصہ لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ بہر حال، اس مقابلے میں میرا افسانہ 'وصال کے بعد' پہلے انعام کا مستحق قرار پایا۔ انعام کی رقم تو خیر کیا ملتی، افسانے کا مسودہ بھی غائب ہو گیا اور اس

افسانے کو کبھی اشاعت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں یہ بھی بتا ہی دوں کہ نظموں کے مقابلے میں اوّل انعام کے مستحق منظر شہاب اور میں دونوں قرار پائے تھے۔ 1950 کے بعد کوئی افسانہ نہ لکھ سکا، لیکن فکشن کے مطالعے سے جو دل چسپی تھی وہ ہنوز قائم ہے۔ میں نے اُردو افسانے کا مطالعہ شاعری کے مقابلے میں زیادہ ترتیب اور باقاعدگی سے کیا ہے۔

میں نے کہا ہے کہ میں نے شاعری اور افسانہ نگاری انداز اً تیرہ سال کی عمر سے ہی شروع کر دی تھی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت کی غزلوں میں اکثر مصرعے نظرِ ثانی کے محتاج ہوتے تھے اور افسانوں میں زبان و بیان کی ناہمواریوں کے علاوہ عجیب و غریب مضحکہ خیز، غیر حقیقی پلاٹ ہوتے تھے۔ لیکن یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی میری شاعری اور افسانوں میں حسن و عشق سے زیادہ دوسرے موضوعات کا دخل تھا اور اکثر ان میں جذباتی اور افلاطونی محبت کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔

طبیعت شروع سے ہی جدّت کی طرف مائل تھی، ہر چند میری پرورش کٹر مذہبی اور روایت پرستانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ اس وقت در بھنگے کی ادبی فضا (جسے مشاعرے کی فضا کہنا چاہیے) پر رسمیت اور روایت پرستی کا غلبہ تھا۔ وہی گل و بلبل اور بہار و خزاں کی شاعری تھی۔ ویسے شعر و شاعری کا چرچا کافی رہا کرتا تھا اور مشاعروں کی محفلیں برابر منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، عبدالعلیم آسی دوسرے شاعروں سے مختلف معلوم ہوتے تھے، کیونکہ وہ اقبال اور جوش کے رنگ کی شاعری کرتے تھے۔ محسن در بھنگوی کی غزلوں کا لہجہ اُس زمانے میں اپنی 'شوخ نرمی' کے باعث متوجہ کرتا تھا اور اختر قادری کے سانیٹ اپنے فارم کی وجہ سے متاثر کرتے تھے۔ موخرالذکر ان دنوں در بھنگا سی ایم کالج میں استاد تھے۔

میں نے ترقی پسند ادب کا نام شاید 1944 میں سب سے پہلے اپنے دوست سیّد منسوب حسن سے سنا۔ وہ اسکول کے زمانے سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن تھے اور کمیونسٹ پارٹی سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ انھیں سیاست کے علاوہ ادب سے بھی کافی دل چسپی تھی۔ ہم دونوں کے سیاسی اور ادبی نظریات میں کافی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ ان دنوں اُردو کے مشہور رسالے ادبِ لطیف، ادبی دُنیا، ساقی، ہمایوں وغیرہ تھے۔ 'آج کل' نیا نیا نکلا تھا۔ اس کے ادارے میں معین احسن جذبی بھی تھے۔ یہ رسائل در بھنگے میں نظر نہ آتے تھے۔ اس وقت تک اپنے ماموں خلیل احمد جگر کے توسط سے بھی رسالے ملنے تقریباً بند ہو گئے تھے۔ میں نے اور منسوب حسن نے ان رسائل کی خریداری قبول کی۔ اسی طرح ہم دونوں نے اس وقت کی تازہ مطبوعات مکتبۂ اُردو لاہور، ساقی بک ڈپو دہلی اور اُردو اکیڈمی سندھ سے منگوائیں جن میں فیض، راشد، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، قیوم نظر، میراجی، یوسف ظفر، سلام مچھلی شہری، سجاد ظہیر، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، محمد حسن عسکری، اُپندر ناتھ اشک وغیرہ کی تصانیف شامل تھیں۔ اس وقت تک در بھنگے میں کالج کے طلبہ تو کیا، اساتذہ تک ان میں سے بیش تر کے نام اور کام سے قطعاً ناواقف تھے۔ ممتاز شیریں کا 'نیا دور' بھی ان ہی دنوں نیا نیا بنگلور سے نکلا تھا۔ اسے بھی ہم لوگوں نے منگوایا۔ 1942 سے 47-1946 تک بے شمار رسائل اور کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔

میں نے میٹرک میں اور کالج کے پہلے سال میں میر، درد، مومن، حالی، چکبست، اقبال، اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی کو پڑھا تھا، لیکن بے قاعدگی کے ساتھ۔ میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں بھی زیرِ مطالعہ رہی تھیں اور نظیر اکبر آبادی کی بہت سی نظمیں بھی۔ نئے ادب کے نمونوں سے آشنا ہوا تو جوش کو کھنگال ڈالا۔ وہ کافی دنوں تک میرے افکار پر مسلط رہے۔ ان کے سحر سے چھوٹا تو راشد، فیض، یوسف ظفر، اختر الایمان اور منیب الرحمٰن کی نظموں اور فراق کی غزلوں سے نیاز حاصل ہوا۔

میری نثری اور شعری نگارشات 45-1944 سے ہی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ پہلی تحریر ہفتہ وار 'نقاش' کلکتہ میں شائع ہوئی۔ ابتدائی تحریریں 'جادہ' بھوپال، 'مضراب' کراچی، 'ادب' کراچی، 'جائزہ' کراچی اور 'آنچل' رامپور میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ 'آنچل' 1949 میں شائع ہوا تھا اور اچھا خاصہ معیاری رسالہ تھا۔ اس نے میرے کلام کی بڑی پذیرائی کی اور مجھے کافی اہمیت دی۔ کوثر چاند پوری نے اپنے رسالے 'جادہ' میں میری بابت عمدہ تعریفی نوٹ لکھے۔

لیکن میری طرف توجہ اُس وقت دی گئی جب میرا کلام 'نقوش' اور 'شاہ راہ' میں شائع ہوا۔ 'نقوش' کا پہلا شمارہ 1948 میں احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کی ادارت میں نکلا تھا۔ چار اشاعتوں کے بعد ہی رسالے پر حکومت کی جانب سے چھ ماہ کی پابندی لگا دی گئی، کیوں کہ اس میں منٹو کا افسانہ 'کھول دو' شائع ہوا تھا۔ جب پابندی اُٹھی تو وقار عظیم مدیر مقرر ہوئے۔ میری نظم 'وہ دیکھو' ان ہی کی ادارت کے زمانے میں دسمبر 1950 (سال نامہ) میں شائع ہوئی تھی۔ 'نقوش' میں کسی غیر معروف شاعر کا اور خصوصاً جو صوبہ بہار سے تعلق رکھتا ہو، چھپ جانا کسی طرح ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ واضح رہے کہ اس وقت تک اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کے علاوہ بہار کے کسی ادیب یا شاعر کی تحریر

'نقوش' میں شائع نہیں ہوئی تھی۔

'شاہ راہ' کا پہلا شمارہ 1949 کے اوائل میں ساحر لدھیانوی کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ ہندوستان کا سب سے اہم ادبی جریدہ سمجھا جاتا تھا اور ادیب و شاعر اس میں لکھنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اس رسالے پر گروہ بندی اور حلقہ بندی کا الزام عام تھا۔ ساحر کے بمبئی جانے کے بعد پرکاش پنڈت اس کے ایڈیٹر ہو گئے تھے۔ بہار کے لکھنے والوں کو بہ طور خاص شکایت تھی کہ اس میں اس صوبے کے لکھنے والوں کو جگہ نہیں دی جاتی۔ 'شاہ راہ' میں پہلی دفعہ نومبر 1950 میں میرا ایک مضمون شائع ہوا جو انگریزی سے ترجمہ تھا۔ اور ستمبر 1951 میں میری نظم 'رہنمائی' چھپی (یہ نظم میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے)۔ اس وقت تک زکی انور کے ایک افسانے کے علاوہ بہار یا بنگال کے کسی شاعر یا ادیب کی کوئی چیز اس میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ منظر شہاب، انور عظیم، پرویز شاہدی، غیاث احمد گدی اور دوسرے لکھنے والوں کی تخلیقات بعد میں وہاں اشاعت پذیر ہوئیں۔ 1953 سے 'شاہ راہ' میں میرے کلام کی باقاعدہ اشاعت ہونے لگی تو میرا نام لکھنے پڑھنے والے حلقوں میں مانوس ہونے لگا۔ اس وقت تک جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کو بھی بہار اور بنگال سے باہر کم ہی جانا پہچانا جاتا تھا۔ اس لیے بہار سے وابستہ کسی نئے شاعر کے لئے اپنے آپ کو متعارف کرانا کافی دشوار تھا۔ دسمبر 1954 کے 'شاہ راہ' میں میری نظم 'خواب سچ بھی ہوتے ہیں' شائع کرتے ہوئے ظ انصاری نے ایک تعارفی نوٹ لکھا۔ ظ انصاری بڑے نک چڑھے ایڈیٹر سمجھے جاتے تھے۔ 1955 میں مخمور جالندھری دوبارہ 'شاہ راہ' کے ایڈیٹر ہوئے تو انہوں نے نئی نسل کے بعض شاعروں پر تنقیدی مضامین چھاپے۔ اس سلسلے کا آغاز مجھ سے ہی ہوا۔ یہ میری شاعری پر پہلا مضمون تھا جسے اویس احمد دوراں نے لکھا تھا۔ 1958 میں اعجاز صدیقی نے 'شاعر' میں میری شاعری پر ایک دوسرا مضمون چھاپا جو سیّد احمد شمیم کا تحریر کردہ تھا۔ سرورق پر میری تصویر بھی چھاپی۔ سجاد ظہیر غالباً پہلے قابل ذکر ادیب ہیں جنہوں نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ 'صبا' 1957) میں دوسرے نئے شاعروں کے ساتھ میرا نام بھی لیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے 'نقوش' میں 1958 کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے میرے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا۔ آج جب ناموں کی کھتونی بہت عام ہو گئی ہے، شاید یہ باتیں زیادہ اہمیت کی حامل نہ ہوں، لیکن اُس زمانے میں ان کی قدر محسوس ہوتی تھی اور خاص طور پر اس لئے کہ اُردو کے اہم ادبی رسالوں میں بہار اور بنگال سے متعلق کسی شاعر کا ذکر شاذ ہی آتا تھا۔

میں بچپن میں اپنے والد سے بہت مانوس اور قریب تھا۔ وہ مذہبی ارکان کی ادائیگی کے بڑے پابند تھے، لیکن مجھے ان کے یہاں کسی تنگ نظری کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے خود سچائی، نیکی، ایمان داری، انسان دوستی اور دوسری اخلاقی قدریں عزیز تھیں، لیکن مذہبی ادعائیت اور توہم پرستی سے بے زار تھا۔ والد کے انتقال کے بعد مجھ پر عدم تحفظ کا احساس حاوی ہو چکا تھا۔ غیر ضروری بندشوں اور پابندیوں نے کئی Inhibitions پیدا کر دیئے تھے اور میں آہستہ آہستہ depression کا شکار ہو رہا تھا۔ میں اُس وقت کی کمیونسٹ پارٹی کی عملی سیاست میں بھی شریک ہوا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، لیکن راہ زندگی کے کہر آلود موڑ پر اشتراکیت اور مارکسزم کے فلسفے سے زیادہ ترقی پسند ادبی تخلیقات نے بہت سہارا دیا۔ میں عنفوانِ شباب کی جن منزلوں سے گزر رہا تھا اُن میں جنس، مذہب، سماج وغیرہ کے بارے میں باغیانہ اور غیر رسمی خیالات اپنے مزاج سے قریب معلوم ہوتے تھے۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے متاثر ہونے کی یہی وجہ تھی۔

ہم لوگوں نے دربھنگے میں 1945 میں 'اُردو ادارہ' کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں نئے رنگ کی نظمیں، غزلیں اور کہانیاں پڑھی جاتی تھیں اور ان پر تنقید و تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ چند سال بعد ہم لوگوں نے وہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔ میں حسب معمول فعال تھا۔ اس انجمن کے ترجمان کے طور پر ہم لوگوں نے ایک رسالہ 'نئی کرن' کا بھی اجرا کیا جس کی مجلسِ ادارت میں میں اور منظر شہاب شامل تھے۔ اس رسالے کے تین شمارے وقفے وقفے پر شائع ہوئے مگر اسے ترقی پسند ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔

میں شروع ہی سے اپنے آپ کو ادب کا قاری سمجھتا رہا ہوں۔ بہت سے اچھے لکھنے والوں کو پڑھا، بہت سی اچھی کتابیں پڑھیں، مگر یہ سارا مطالعہ سمندر کے قطرے کے برابر ہے۔ میری اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں ٹیگور کا بہت چرچا تھا۔ ان کا انتقال بھی اُن ہی دنوں ہوا جب میں اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ان کی کچھ کتابیں اُردو میں پڑھیں، 'گیتا نجلی' (نیاز فتح پوری کا ترجمہ) 'ڈاک گھر' وغیرہ۔ اور کچھ انگریزی میں، خصوصاً افسانے، ڈرامے۔ ان ہی دنوں سرت چندر چٹرجی کے بھی بہت سے ترجمے پڑھ ڈالے۔ کالج میں بائرن، شیلی اور کیٹس میرے محبوب رومانی شاعر تھے۔ شیکسپیئر اور برنارڈ شا کے کئی ڈراموں کو طالب علم کی طرح پڑھا۔ ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی اور پطرس بھی کالج کے دنوں میں میرے محبوب مصنف تھے۔ ان دنوں پڑھی ہوئی بعض کتابیں جواب بھی

حافظے میں محفوظ ہیں، ان میں ہارڈی کا ناول Tess of the D'Urbervilles اور آسکر وائلڈ کا The Picture of Dorian Gray کے علاوہ کرسٹوفر اشروڈ Christopher Isherwood کے Goodbye to Berlin کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ موخرالذکر ناول (اگر اسے ناول کہا جائے) کا ترجمہ بعد میں محمد حسن عسکری نے 'آخری سلام' کے نام سے کیا۔ ایک اور کتاب جس نے میری شخصیت پر بہت اثر ڈالا ہے وہ H.C.Armstrong کی Grey Wolf ہے۔ اس کتاب کا تعلق ادب سے نہیں ہے۔ یہ مصطفیٰ کمال کی سوانح عمری ہے۔ سوانح عمریاں میں نے اور بھی پڑھی ہیں، مگر اس کتاب کا impact ہی کچھ اور ہے۔ فارسی کے کلاسیکی شعرا میں حافظ اور نظیری میرے محبوب ترین شاعر رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل کے شاعروں میں پور داؤد اور پروین اعتصامی پسند آئے۔ نسبتاً جدید شاعروں میں فروغ فرخ زاد اپنی بے باکی اور جسارت کے لیے اچھی لگیں۔

میں نے 1951 میں امتیازی حیثیت سے بی اے کیا اور اس کے بعد محمد یونس نظری کے بلاوے پر روزانہ 'کارواں' کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہوکر کلکتہ چلا گیا۔ میں نے یکم اکتوبر 1951 سے اس اخبار میں بحیثیت مترجم (جسے کلکتہ کی صحافتی زبان میں سب ایڈیٹر کہا جاتا ہے) کام کرنا شروع کیا۔ معاوضہ سو روپے ماہ وار طے ہوا تھا۔ اس زمانے میں لکچراروں کو بھی سو سو روپے سے زیادہ بمشکل مل پاتے تھے، اس لیے ان دنوں مجھے یہ رقم اچھی خاصی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن 22 دنوں بعد یہ اخبار ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ مجھے قسطوں میں کل ملا کر 35 روپے ملے۔ 'کارواں' کی ملازمت کے دوران ہی لیاقت علی خاں کو راولپنڈی میں گولی مار کر ہلاک کردیا گیا اور مجھے پہلی بار ایک روزانہ اخبار کا اداریہ لکھنا پڑا۔ یہ تجربہ میرے لیے کافی exciting تھا۔

اخبار سے بے تعلق ہونے کے بعد ایک دو ماہ بے کاری کے گزرے۔ اس دوران دس روپے ماہ وار کی ایک ٹیوشن سے کام چلایا۔ ان دنوں انور عظیم کلکتے میں ہی تھے۔ وہ دہلی چلے گئے تو ان کی جگہ پر انجمن ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ تنخواہ وہی ساٹھ روپے مقرر ہوئی جو انور عظیم کو ملا کرتی تھی۔ اسکول کی حالت خستہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر پرویز شاہدی تھے جو ڈیڑھ سو روپے پر کام کر رہے تھے اور انہیں یہ تنخواہ قسطوں میں اور عموماً کافی دیر سے ملتی تھی۔ پندرہ سولہ دن بعد ہی مجھے سی ایم او ہائی اسکول میں جگہ مل گئی اور میں پرویز صاحب کے تامّل کے باوجود اس اسکول میں چلا گیا۔ یہ اسکول نہ صرف یہ کہ میری جائے رہائش سے بالکل قریب تھا بلکہ یہاں تنخواہ بھی پندرہ روپے زیادہ تھی۔ ایک سال بعد پرویز شاہدی بھی اسی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوکر آگئے۔ 1953 میں حسن نعیم بھی اس اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے آئے، لیکن چند ماہ بعد ہی ایک بہتر معاش کی سبیل پاکر دہلی چلے گئے۔ میں اس اسکول سے پورے سات سال وابستہ رہا اور 1958 کے اواخر میں جب میں نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت اختیار کی تو میں وہاں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور پرویز صاحب تقریباً ایک سال قبل لکچرار ہوکر کلکتہ یونیورسٹی چلے گئے تھے۔

میرے ذہنی سفر میں کلکتہ نہایت اہم پڑاؤ ہے۔ یہاں قیام کے زمانے میں 1953 اور 1955 کے درمیان میری جذباتی زندگی نامحسوس غیر مرئی بہاروں سے آشنا ہوئی۔ میرے بعض خوابوں نے حقیقت کا پیرہن پہنا اور وہ اُمنگیں جو اب تک قلب کے زنداں میں محبوس تھیں، کھلی فضا میں سانس لینے لگیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میری شاعری میں حوصلوں اور ولولوں کی صبح جگمگائی اور میرے فکر و شعور سے رجا و نشاط کی شعاعیں پھوٹیں۔

کلکتہ کے زمانہ قیام میں ماہ نامہ 'معاون' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتا رہا اور 'سہیل' گیا اور 'کہانی' کلکتہ کی مجلسِ ادارت سے بھی وابستہ رہا۔ پرویز شاہدی بنگال کے سب سے ہردل عزیز شاعر تھے اور بنگلہ حلقوں میں بھی اتنے ہی مقبول تھے۔ ہرچند وہ کٹر ترقی پسند شاعر تھے، لیکن ان کا فارسی اور اُردو کی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور نظم The Waste Land پر بھی ان کی بڑی نظر تھی۔ کم و بیش پانچ سال تک روزانہ ان سے کئی کئی گھنٹوں کا ساتھ رہا۔ رومانی دور کے بلند مرتبت افسانہ نگار ل احمد اکبرآبادی (جوش اور نیاز کے خاص دوست) جو طامس مور کی مثنوی 'لالہ رُخ' کے لازوال ترجمے کے سبب 'ادیب شہیر' کہلاتے تھے، کلکتے میں برسوں سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے، مگر کسی کو ان کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ میں نے انہیں ڈھونڈ نکالا اور ادبی حلقوں کو ان سے متعارف کرایا۔ بعد میں وہ کلکتہ کے ادبی منظر نامے کا اہم حصہ بن گئے۔ وہ میری رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر رہتے تھے اور مجھے اپنے تشکیلی دور میں ان سے استفادہ کرنے کا بہت موقع ملا۔ کلکتہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی صحبتوں سے بھی فیض اٹھایا۔

اُردو شاعری میں نئی تبدیلیاں 56-1955 سے ہی ظاہر ہونے لگی تھیں۔ لیکن 60-1959 تک ان کی کوئی واضح شکل نہیں بنی تھی اور نہ 'جدیدیت' کے خد و خال نمایاں ہوئے تھے۔ میری شاعری اُردو ادب میں

ہونے والی تبدیلیوں سے کبھی غافل نہیں ہوئی۔ انگریزی اور فرانسیسی ادب میں نمو پانے والے جدید رجحانات اور نئی تحریکات سے دلچسپی کافی پہلے سے تھی۔ البتہ 57-1956 میں انگریزی کے توسط سے موجودہ فرانسیسی ادب کے مطالعے کا نسبتاً بہتر موقع ملا۔ مجھ پر استاں دال جیسے معتبر ناول نگار سے لے کر فرانسوا ساگاں جیسی نوخیز ادیبہ تک کے افکار اور طریقہ ہائے اظہار نے اپنے اثرات مرتب کیے۔ اس زمانے کی دو مشہور انگریزی کتابوں Lust For Life اور Moulin Rouge کے اثرات شاید کچھ اور گہرے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے بعد کٹک کے ابتدائی دورانِ قیام یعنی 60-1959 میں اُڑیا زبان کے ایک نوجوان شاعر دوست کے ذریعے ملارمے، ورلین اور راں بو کی شاعری سے متعارف ہونے کی سبیل نکلی۔ البیر کامو Albert Camus کو بھی پہلی دفعہ اُن ہی دنوں پڑھا۔

میری شاعری کے مزاج میں 58-1957 سے ہی تبدیلی رُونما ہونے لگی تھی، جو 61-1960 تک کچھ اور واضح ہوگئی۔ 'شعاعِ فردا کے راز دانو'، 'اشتراک'، 'غم کدۂ شام وسحر'، 'بیوہ' وغیرہ نظمیں جو میرے پہلے مجموعۂ کلام 'زخمِ تمنا' میں شامل ہیں، میرے بدلے ہوئے مزاج کی نشان دہی کرتی ہیں، یا یوں کہنا چاہیے کہ 1949 سے پہلے کی میری شاعری سے ناطہ جوڑتی ہیں۔

1961 میں ہندی کی نئی شاعری کے ایک نمائندہ شاعر گرجا کمار ماتھر آل انڈیا ریڈیو کٹک کے سربراہ ہوکر آئے۔ اُن سے اور ان کی بیوی شکنتلا ماتھر سے، جو خود نئی شاعری کی جانی پہچانی شاعرہ تھیں، گھریلو مراسم قائم ہوئے۔ ان ہی کے یہاں ڈاکٹر کیلاش باجپائی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اسی زمانے میں رگھوویر سہائے اور جگدیش گپت سے بھی ملنا ہوا۔ یہ سب 'تارسپتک' (ہندی کے جدید شاعروں کا انتخاب، مرتبہ: اگیے) کے مختلف دَور کے شعرا ہیں۔ انہیں اور 'تارسپتک' کے دوسرے شاعروں کو اسی زمانے میں پڑھا اور ہندی کی تجرباتی اور نئی شاعری سے خاصی شناسائی حاصل ہوئی۔

1962 میں اگست اور نومبر کے دوران میں نے سات نظمیں کہیں جو میری شاعری کے نئے رُخ کا اشاریہ ہیں۔ واضح رہے کہ اُس وقت 'جدید شاعری' کا نام تو سنا جانے لگا تھا، لیکن 'جدیدیت' ایک رجحان یا تحریک کے طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔ ان میں سے اکثر نظموں کا موضوع ازدواجی زندگی کی بے معنویت اور لطیف شائستہ جنسی آزادی کی اہمیت ہے۔ ان موضوعات اور خصوصاً اوّل الذکر موضوع کو اُردو شاعری میں اس طرح پیش کرنے کی کوئی اور کوشش میرے علم میں نہیں ہے۔

1963 میں میرا تبادلہ گوہاٹی ہوگیا۔ اسی سال اُردو کی معروف ادیبہ، فعال شخصیت اور فخرالدین علی احمد کی بہن حمیدہ سلطان گوہاٹی تشریف لائیں۔ ان کے مشورے اور تعاون سے میں نے انجمن ترقی اُردو آسام کی طرح ڈالی، جسے اس وقت کے آسام کے وزیر مالیات فخرالدین علی احمد (جو بعد میں جمہوریۂ ہند کے صدر ہوئے) کی سرپرستی حاصل تھی۔ انجمن کے صدر آسامی زبان کے معتبر شاعر دیوکانت بروا بنائے گئے جو اس وقت وہاں وزیرِ تعلیم تھے اور بعد میں بہار کے گورنر اور پھر مرکزی وزیر ہوئے۔ محترمہ عابدہ احمد نائب صدر منتخب ہوئیں اور مجھے جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔ انجمن کے زیرِ اہتمام گوہاٹی اور شیلانگ میں پہلی بار دو پُروقار کل ہند مشاعروں کا انعقاد ہوا جن میں جگن ناتھ آزاد اور روش صدیقی نے بھی شرکت کی۔

اکتوبر 1967 میں گوہاٹی سے تبدیل ہوکر پٹنہ پہنچا تو وہاں کے سارے اکابرینِ ادب زندہ اور فعال تھے۔ اتنا بڑا اور عظیم الشان اجتماع ان کے رخصت ہوجانے کے بعد پھر پٹنہ (یا عظیم آباد) کو نصیب نہیں ہوا۔ کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، رضا نقوی واہی، سیّد حسن عسکری، عطا کاکوی، پروفیسر سیّد حسن، پروفیسر سیّد محمد محسن اور شکیلہ اختر کی کہکشاں سے پٹنہ جگمگا رہا تھا۔ ان سب سے میرے گہرے ذاتی روابط قائم ہوئے اور بعض کے ساتھ گھریلو مراسم رہے۔ اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں کن کن کے نام لوں، اور میرے بعد کی جو نوخیز اور نوعمر نسل تھی اور اُس وقت ادب میں نووارد تھی آج ان میں سے کئی بلند پایہ ادبی شخصیتیں ہیں۔ اُس زمانے میں ہر شام میرے یہاں اُن سب کا جمگھٹا رہتا۔ 'شب خون' زور شور سے پڑھا جا رہا تھا۔ جدیدیت کی اُٹھان کا زمانہ تھا۔ میں نے پٹنہ ریڈیو سے پہلی بار بہار کے جدید شاعروں کا مشاعرہ نشر کرایا۔ یہ ہندوستان میں ریڈیو سے اُردو کے جدید شاعروں کا پہلا مشاعرہ تھا۔ خود ستائی نہیں بیانِ واقعہ ہے کہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے اُردو پروگرام کے اوقات بڑھوانے، جدید نسل کے لکھنے والوں کو ریڈیو کے ذریعے باقاعدہ متعارف کرانے، وہاں کے اُردو پروگراموں کو نئی سمت دینے، اور بہ طور خاص، دہلی سے اُردو خبریں ریلے کروانے میں میری انفرادی کوششوں کا ہی دخل رہا ہے۔ میں نے پٹنہ ہی کے دورانِ قیام میں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم اے کیا اور دونوں ادبیات میں اوّل آیا۔

اپنے وطن دربھنگا کو چھوڑ کر میرا سب سے زیادہ قیام سری نگر کشمیر میں رہا۔ یعنی پورے سوا چودہ سال۔ یہیں میں نے اپنی زندگی، اپنے ادبی اور منصبی کیریئر کے سب سے خوب صورت دن گزارے۔ اس وقت وہاں کی فضا نہایت خوش گوار اور پُرامن تھی۔ میرے ریٹائرمنٹ کے تقریباً دو سال

بعد جب حالات نازک مرحلے میں داخل ہوئے تو بادلِ ناخواستہ آدم کی طرح اس دشت سے نکلنا پڑا۔

یہیں میں نے جو غزلیں کہیں اور جو 'کشمیر کی غزلیں' کے نام سے مشہور ہوئیں، ان ہی کے حوالے سے آل احمد سرور، مسعود حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر عالم خوندمیری اور حامدی کاشمیری جیسے صاحبانِ علم و ذوق نے اپنے تنقیدی محاکموں کے ذریعے عصری غزل میں میری حیثیت کو مستحکم کیا۔ ان ہی غزلوں کے مجموعے 'پچھلے موسم کا پھول' کو ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا۔ ان غزلوں میں جن کیفیات کا اظہار ہوا ہے وہ کشمیر کی دین ہیں۔ کشمیر کا فطری حسن ہی نہیں، وہاں کے آبشار، برف، چنار اور گلاب ہی نہیں بلکہ وہاں کی انسانی محبتیں، حسنِ اخلاق، یگانگت، شخصیت کی دل کشی اور دلبری، سب نے مل کر میری جذباتی زندگی پر، میرے محسوسات و تجربات پر بڑے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں اور ان کا اظہار ان غزلوں میں ہوا ہے۔ جس نے کشمیر میں ایک لمبے عرصے تک زندگی نہ گزاری ہو وہ ان لطافتوں اور نزاکتوں کے رمز سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

میری زندگی کا بیش تر حصہ ان علاقوں میں گزرا جو اُردو کے مین اسٹریم Mainstream میں شامل نہیں ہیں۔ ان میں سے کشمیر بھی ایک ہے۔ مگر وہاں ادب، فلم اور ثقافت کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتیں کسی نہ کسی سلسلے میں باقاعدگی سے آتی رہتی تھیں۔ ادب کی بعض نہایت گراں قدر ہستیوں سے ملنے اور ان سے فیض یاب ہونے کا وہاں موقع ملا۔ کشمیر میں میرے دورانِ قیام میں جن مقتدر شخصیتوں نے وقتاً فوقتاً میری رہائش گاہ تک تشریف لانے کی زحمت گوارا کی، ان میں آل احمد سرور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر عالم خوندمیری کے علاوہ ملک راج آنند، عصمت چغتائی، بلونت گارگی، خواجہ احمد فاروقی، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری، سلطانہ جعفری، مجروح سلطان پوری، حمیدہ سلطان، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر محمد حسن، ظ انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، مہندر سنگھ بیدی سحر کے نام آتے ہیں۔

میرے ہم عصروں اور ہم عمروں میں شاید ہی کوئی ایسا معروف ادیب، نقاد، شاعر، افسانہ نگار ایسا ہو جو سری نگر آیا ہو اور جس نے میری رہائش گاہ تک قدم رنجہ نہ فرمایا ہو۔ یہ سب ہی بڑے نام ہیں۔ کن کن کے نام گناؤں، پہلے ان کے نام لکھ دیتا ہوں جو ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ حسن نعیم، بانی، زیب غوری، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، انور عظیم، راہی معصوم رضا، عزیز قیسی، وحید اختر، کمار پاشی، راج نرائن راز، عنوان چشتی، ظہیر احمد صدیقی، رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی۔ اور پھر آج کے یہ چمکتے ہوئے ستارے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، خلیق انجم، قمر رئیس، شمیم حنفی، وہاب اشرفی، احمد یوسف، جعفر رضا، کرامت علی کرامت، ابوالکلام قاسمی، مجتبیٰ حسین، شہریار، رفعت سروش، بلراج کومل، قاضی سلیم، زبیر رضوی، مخمور سعیدی، ندا فاضلی، محمد علوی، فیاض رفعت، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سلمیٰ صدیقی، جوگندر پال، کشمیری لال ذاکر، منظور الامین، رفیعہ منظور الامین، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، فضا ابن فیضی، ملک زادہ منظور احمد، پریم کمار نظر، آزاد گلاٹی، منظر شہاب، علقمہ شبلی۔ کمال احمد صدیقی، شکیل الرحمٰن اور حامدی کاشمیری تو سری نگر میں تھے ہی۔ ان کے علاوہ میرے یہاں آنے والوں میں فلم ساز مظفر علی، ٹی وی اور فلم اداکارہ نیلما عظیم، موسیقار احمد حسین محمد حسین، صحافی سعدیہ دہلوی، شجاع خاور، ظہیر صدیقی، صلاح الدین پرویز، رضوان احمد، افتخار امام صدیقی، ساحل احمد، سید احمد شمیم، عبدالصمد، مناظر عاشق ہرگانوی، اعجاز علی ارشد، ابوذر عثمانی، ش اختر، حامد چھپروی، افصح ظفر، نجم الہدیٰ، ڈاکٹر امتیاز احمد جیسے نام بھی ہیں۔

میرے دل میں ہمیشہ اپنے ادبی پیش رووں کے لیے ارادت کا جذبہ رہا ہے، میں نے اپنے ہم عصروں سے محبت اور یگانگت کا رشتہ رکھا ہے اور کم عمروں سے شفقت برتی ہے۔ ان سب سے میں نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے۔ اپنے ذہنی سفر میں ان سب کی ہم سفری مجھے عزیز ہے۔

جدت پسندی اور نئے تجربات سے مجھے ہمیشہ دل چسپی رہی ہے۔ میں نے آزاد نظم اس وقت لکھی (1944 میں) جب مخدوم محی الدین کے علاوہ کسی ترقی پسند شاعر نے (فیض نے بھی نہیں) اور بہار سے تعلق رکھنے والے کسی شاعر نے آزاد نظم نہیں کہی تھی۔ میں نے ترائیلے ان دنوں لکھی جب یہ اُردو میں بالکل نئی نئی تھی (1946 میں) اور عطا محمد شعلہ اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ کسی نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی تھی۔ میں نے ان ہی دنوں سانیٹ بھی لکھے اور مروّجہ بحر میں ایک رُکن بڑھا کر ایک چھوٹی سی نظم بھی کہی۔ تجربوں کی اسی دل چسپی کے تحت میں نے اوائل عمری میں ہی (1945 میں) آزاد غزل کا تجربہ بھی کیا جس کے لیے اکثر مجھے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔

گذشتہ پندرہ سولہ سال سے میرے ذہنی سفر کا نیا پڑاؤ دہلی ہے۔ دہلی بھی نئے تجربات کا شہر ہے۔ اس کی روداد بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ 12 مارچ 2006 کو سفرِ حیات کے 76 سال پورے ہو چکے۔ ذہنی سفر جاری ہے:

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

OO

مظہر امام

حمد

ترا ہی بحر، سفینہ رواں بھی تیرا ہے
بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے
ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری؟
چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے
مجھے تو نذر بھی کرنے کو کچھ نہیں اپنا
جبیں کی خاک تری، آستاں بھی تیرا ہے
نقوشِ پا کو اٹھائے کہاں کہاں جاؤں!
کہ گردِ رہ بھی تری، کارواں بھی تیرا ہے
دیا ہے کیوں مجھے لوح و قلم کا بارِ گراں؟
کہ گردشیں بھی تری، آسماں بھی تیرا ہے
میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں؟
فنا بھی تیری ہے، نام و نشاں بھی تیرا ہے

غزل

حرفِ دل نارسا ہے ترے شہر میں
ہر صدا بے صدا ہے ترے شہر میں
کوئی خوش بو کی جھنکار سنتا نہیں
کون سا گل کھلا ہے ترے شہر میں!
کب دھنک سوگئی، کب ستارے بجھے
کوئی کب سوچتا ہے ترے شہر میں!
اب چناروں پہ بھی آگ کھلنے لگی
زخم لو دے رہا ہے ترے شہر میں
جتنے پتے تھے سب ہی ہوا دے گئے
کس پہ تکیہ رہا ہے ترے شہر میں
ایک دردِ جدائی کا غم کیا کریں
کس مرض کی دوا ہے ترے شہر میں!
اب کسی شہر کی چاہ باقی نہیں
دل کچھ ایسا دکھا ہے ترے شہر میں

غزل

آمادہ رقابت پہ مرا دل ہی نہیں تھا
یا پھر، کوئی اس بار مقابل ہی نہیں تھا
اک تیغِ انا تھی جسے سب چوم رہے تھے
اب کے سرِ مقتل کوئی قاتل ہی نہیں تھا
کب ڈوب کے مرنے کی خوشی تھی ہمیں لیکن
کشتی کو کہاں لاتے کہ ساحل ہی نہیں تھا
یا تھے تری راہوں میں بھی کانٹوں کے بگولے
یا میں سفرِ لطف کے قابل ہی نہیں تھا
اب کے جو وہ بچھڑا تو کوئی شاخ نہ سوکھی
اب کے مرے پہلو میں مرا دل ہی نہیں تھا
کچھ اپنی کہیں رسمِ محبت کے شناسا
میں تو ہنرِ شوق میں کامل ہی نہیں تھا
اب نام کسی موڑ پہ آتا نہیں اُن کا
لکھا ہے، میں اس بھیڑ میں شامل ہی نہیں تھا

مظہر امام

غزل

فسونِ حرف لے گیا، طلسمِ خواب لے گیا
ورق ورق اُسی کا تھا، وہی کتاب لے گیا

ابھی نگہ جھکی نہ تھی کہ میں نے ہونٹ رکھ دیے
سوال وہ نہ کر سکا مگر جواب لے گیا

مجھے پتہ تھا راہ میں چراغ جل نہ پائے گا
وہاں گیا تو اپنے ساتھ آفتاب لے گیا

فروغِ جسمِ تازہ سے، خمارِ رنگِ غازہ سے
نشہ بہت بڑھا گیا، مگر شراب لے گیا

مری ازل کی تشنگی بجھا گیا وہ نرم دل
نشاطِ آب دے گیا، غمِ سراب لے گیا

تھا دیکھنے میں سادہ رو، مگر بڑا ذہین تھا
مجھے گناہ گار کر کے وہ ثواب لے گیا

لٹا گیا وہ گل بدن چمن کے سارے ذائقے
یہاں وہ خار دے گیا، وہاں گلاب لے گیا

غزل

شبِ خیال ہے تارے ہیں جگمگائے ہوئے
ابھی وہ آئے نہیں، لگ رہے ہیں آئے ہوئے

دیارِ ہجر میں کیا جُراتِ طلب کرتے
گزر گئے ترے دل سے نظر بچائے ہوئے

پناہ مانگتی ہے اپنے ہی عزیزوں سے
زمیں ہے اہلِ زمیں کا سراغ پائے ہوئے

ہوائے گل سے بہت شاد تھے کہ یاد آیا
اُسے زمانہ ہوا میرا دل دُکھائے ہوئے

وہ موج موج ہوا، ساحلوں کی رقاصہ
برہنہ ریت سے گزری بدن چرائے ہوئے

یہ کس حسین شب کی ہیں انگلیاں جن میں
ہیں جگنوؤں کے نگینے سے جھلملائے ہوئے

مغنیہ! ترے نغموں کی رات بھیگ چلی
جھپک رہی ہے پلک میرا غم جگائے ہوئے

غزل

مری روداد طولانی بہت ہے
کہ میں نے خاک بھی چھانی بہت ہے

جو آئینوں میں حیرانی بہت ہے
مجھے خود بھی پریشانی بہت ہے

کنارے ہی پہ جا کر ڈوب جائیں
اگر موجوں میں طغیانی بہت ہے

مگر سب تیلیاں جلنے لگی ہیں
قفس میں یوں تو نگرانی بہت ہے

لہو بھی دیکھ اپنے ساحلوں کا
ترے دریاؤں میں پانی بہت ہے

مجھے اب دیکھنا ہے اپنا کل بھی
تری بات آج تک مانی بہت ہے

ادائیں اس کی ہیں شہزادیوں سی
مزاج اپنا بھی سلطانی بہت ہے

مظہر امام

غزل

اب کیا یہ دھواں سا اٹھ رہا ہے
وہ شہر تو کب کا جل چکا ہے!
تلخاب جہاں کہ آتشِ جاں
سب ہجر کا تیرے ذائقہ ہے
شاید کبھی غم پلٹ بھی آئے
تنہا مجھے چھوڑ کر گیا ہے
تم سے تو امید ہی کہاں تھی
موسم بھی نظر بدل رہا ہے
برسوں سے چتا میں جل رہا ہوں
لمحے کے گناہ کی سزا ہے
یہ خواب بھی میری شب سے لے لو
دن کو مرے پاس کیا رہا ہے!
میری ہی طرح گو ستارے
تم نے یہ مزا کہاں چکھا ہے!
میں تیرا ہی ہو کے رہ گیا ہوں
ورنہ یہ جہاں بھی کیا برا ہے!
خوش بو سے کہو ادھر بھی آئے
سنتے ہیں گلاب کھل چکا ہے

غزل

خواب زاروں کی شفق ہو جیسے
زیست پھولوں کا ورق ہو جیسے
محو ہوتی ہی نہیں یاد تری
کوئی بچپن کا سبق ہو جیسے
صبح آنے کو تو آئی ہے، مگر
چہرہ خورشید کا فق ہو جیسے
یوں امنڈ آتے ہیں الفاظ سے اشک
سینہ جذبات کا شق ہو جیسے
آرزو شرح و بیاں سے محروم
کوئی مضمونِ ادق ہو جیسے
پھر سے تجدید تعلق کی خلش
آس کی دل میں رمق ہو جیسے
بے سبب مجھ سے یہ خفگی، کیا خوب
مجھ پہ کچھ آپ کا حق ہو جیسے
پردۂ ذہن پہ لہراتے خیال
کوئی تابندہ اُفُق* ہو جیسے
ظرف اتنا ہے تمنا کا بلند
آسماں ہی کا طبق ہو جیسے
تیرے اشعار کا یہ رنگ امام!
اُن کے ہونٹوں پہ شفق ہو جیسے

غزل

جو زیاں دل کا ہوا اس کا ازالہ ہو جاؤں
اب تو اظہارِ محبت کا سلیقہ ہو جاؤں
کھینچتا ہے ترے دامن کو حریفانہ مجھے
اک ذرا رک مرے یوسف میں زلیخا ہو جاؤں
میں ستارے کی طرح وقت پہ ہوتا ہوں غروب
شب ترا ساتھ رہا اب میں سویرا ہو جاؤں
تیرے بیمار کا ہوتا ہے مرض اور سوا
تو جو بیمار ہو میرا تو میں اچھا ہو جاؤں
میں شناور ہوں زمانے کے بھرے دریا کا
پار اترنا ہو تجھے گر تو سفینہ ہو جاؤں
اتنا بے درد ابھی دل تو نہیں ہے میرا
ساتھ کیوں چھوڑ دوں اپنا میں زمانہ ہو جاؤں؟
وقتِ رخصت تو چمک اپنی دکھاتی ہے مجھے
چاند بننے سے رہا صبح کا تارا ہو جاؤں

*میں اس تلفظ کو بھی درست سمجھتا ہوں۔

مظہر امام

نظم

بے ادب ستاروں نے

بے ادب ستاروں نے
نیند میں مخل ہو کر
تم سے کچھ کہا ہوگا
لیکن اُن کی باتوں کا
تم یقین مت کرنا

آؤ آ کے خود دیکھو
مضطرب کہاں ہوں میں

نظم

کھلے آسمان کے نیچے

وہ ترے الطافِ بے پایاں کی رات
وہ ترا اخلاص بے پروا، خلوصِ بے نیاز

میری جانب سے کوئی تحفہ نہیں
زیور نہیں
ساڑی نہیں
اجرت نہیں
حد تو یہ، شادی کا وعدہ بھی نہیں!

نظم

تحفہ

''زمانہ خرمنِ عیش کرا بہ یغما داد؟
کہ گل بہ دامنِ ما دستہ دستہ می آید''

سوچتا ہوں کہ تجھے کون سا تحفہ بھیجوں
اپنے ہونٹوں کی جلن اپنی نگاہوں کی تھکن
اپنے سینے کی گھٹن، اپنی امنگوں کا کفن
جادۂ زیست پہ بکھرے ہوئے کانٹوں کی چبھن
عمر بھر کا مرا سرمایہ یہی ہے اے دوست!

آرزو تھی کہ رخِ فن کی چمک نذر کروں
زلفِ خم دارِ معانی کی مہک نذر کروں
اپنے بازوئے تخیل کی لچک نذر کروں
ساغرِ فکر مگر آج تہی ہے اے دوست!

وہ بھی دن تھے کہ سزاوارِ محبت تھا میں
جگمگاتے ہوئے فردوس کی زینت تھا میں
اپنی دنیائے مجازی میں حقیقت تھا میں

پالکی کاہکشاں کی مرے گھر آتی تھی
چاندنی رات بہ اندازِ دگر آتی تھی
ساعتِ وصل سے پہلے نہ سحر آتی تھی

اور اب زخم سلگتے ہیں مرے سینے میں
اشک آنکھوں سے چھلک آتے ہیں مے پینے میں
''اپنی صورت'' نظر آتی نہیں آئینے میں

وہی دن بھر کی مشقت وہی شب بھر کی تھکن
وہی برباد مسرت، وہی آباد محن
ہاں وہی روح کی ٹھنڈک وہی سانسوں کی جلن

تجربے، چند حبابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
علم، دو چار کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری منزل مرے خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جس سے ڈرتا تھا مرا حال وہی ہے اے دوست!

سوچتا ہوں کہ تجھے کون سا تحفہ بھیجوں
اپنے ہونٹوں کی جلن، اپنی نگاہوں کی تھکن
اپنے سینے کی گھٹن، اپنی امنگوں کا کفن
جادۂ زیست پہ بکھرے ہوئے کانٹوں کی چبھن
عمر بھر کا مرا سرمایہ یہی ہے اے دوست!

مظہر امام

نظم

شام کے ساحلوں پر

مجھے سب پتہ ہے
کہ تو شام کے ساحلوں پر چراغاں کیے
دیر تک ریت کے گھر بناتی رہی ہے

کبھی ریت پر
تیری تحریر سے وہ نیا نام ابھرا
جسے میری امید کے ساتھ پانی کی لہریں بہالے گئیں

کبھی ریت پر
تو نے وہ نام لکھا
جسے میری آنکھوں نے دیکھا تو ان کو یقیں ہی نہ آیا
کہ میں خود سر شام
اکثر دیے لے کے نکلا ہوں
اور ریت کے گھر بناتا رہا ہوں

نظم

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء

سوادِ غم میں
مہیب ظلمت کا رنگ تحلیل ہو رہا ہے
فضا میں پت جھڑ کے خشک پتوں کی بو
تسلط جمارہی ہے

کہاں ابھی دولتِ بہاراں؟
کہ دشتِ پرخار میں ہی رہبر کو رہ نوردوں نے
منزلِ گل کے راستے سے ہٹا دیا ہے!
ابھی کہاں ساحلِ تمنا؟
کہ اہلِ کشتی نے ناخدا کو
خود اپنے ہاتھوں سے تند طوفان کی لحد میں سلا دیا ہے!
جو سرفروشانِ عزم پرور
رُخِ سحر کی لگن میں جانِ عزیز سے اپنی کھیلتے تھے
جو سالہا سال سے نگارِ صبا کی آمد کے منتظر تھے
انہی کے اک ہم وطن نے ہی ایک زہر آلود تیر
سورج کے دل میں پیوست کر دیا ہے!
حسینۂ صبح موت کے آہنی شکنجے میں گھر گئی ہے
وہ رو رہی ہے
وہ چیختی ہے

شب سیہ کا ڈراؤنا بھوت فخر سے سر ہلا رہا ہے
وہ اپنی ہیبت سے آنے والے زمانے کا منہ چڑا رہا ہے
اور اس کا پُر ہول قہقہہ جیسے کہہ رہا ہو:
"میں جاوداں ہوں!
میں جاوداں ہوں!!
میں جاوداں ہوں!!!"

نظم

پوسٹ نہ ہونے والا ایک خط

کئی مہینے ہوئے
ایک ماہ نامے میں
تمہارے بچوں کی تصویر میں نے دیکھی تھی
بہت ہی بھولے، بہت ہی حسین بچے ہیں

بس ایک لمحے کو ایسا خیال آیا تھا:
یہ بچے
کاش
مجھے
ماں
پکارتے ہوتے!

مظہر امام

تمہارے لئے ایک نظم

تمہارے لئے میں نے اب تک کوئی نظم لکھی نہیں ہے

وہ الفاظ، جن کے سہارے کبھی ہم کلامی کے
آداب سیکھے تھے میں نے
وہ الفاظ اپنے مفاہیم کی کینچلی پھینک کر
وشتِ بے معنویت میں گم سم کھڑے ہیں
میں
اُن ساعتوں کی گزرگاہ پر آبلہ پا رواں ہوں
جو
دفتر کی،
بیوی کی،
بچوں کی،
احباب کی،
ملکیت ہیں!
میں اب وہ نہیں ہوں
جو میں تھا
اب اک مردہ انسان کا کوٹ میرے بدن کی
کثافت چھپائے ہوئے ہے
میں برسوں کی رسوائیاں
اس کی بوسیدہ جیبوں میں مدفون کرنے میں
مصروف ہوں

میں شانوں پہ روزِ ازل سے اسی جھوٹ کا بوجھ
ڈھوتا رہا ہوں
جو میں ہوں
جو تم ہو!

ذرا مہر برلب لفافے سے اپنی وہ بھولی ہوئی
داستانیں نکالو
جو اس شہر کی سرحدیں توڑ کر
غیر ملکوں میں تشہیر پاتی رہی ہیں
لطیفوں میں احساس کا زہر چھپتا نہیں ہے
مسرّت، فقط روح غازہ نہیں ہے
صرف آرائشِ پیچ کا کل نہیں ہے
کہ ان اونچی اونچی دوکانوں کے پیچھے وہی ڈھیر
ہے رڈیوں کا...!
یہ دنیا اک ایسا مکاں ہے
جہاں کوئی کھڑکی نہیں
صرف دروازہ ہے ایک
اندر سے جو بند ہے
اگر کھول پائیں تو کھولیں
کہ اندر ہمیں ہیں!

وہ... مری روح کی شاہزادی
مرے شوق و ارماں کا مرکز نہیں

رات کے چند بے کیف لمحات کو چھوڑ کر
میرا اور اس کا رشتہ
نہیں ہے کوئی
پھر بھی وہ میرے انفاس کی آمد و شُد کا حصہ
مرے خون کی رازداں ہے!

وہ
تمہارے نفس کی حرارت، تمہارے لہو کی روانی
سکی
یہ بتاؤ، تمہاری بھٹکتی ہوئی روح کا شاہزادہ بھی ہے؟
رات کے چند بے کیف و پر کیف لمحات کو چھوڑ کر
تم سے کچھ اُس کا رشتہ بھی ہے؟

بیستونِ الم کاٹ کر کوئی فرہاد جوئے مسرت نکالے اگر
ایک دو گھونٹ تم بھی پیو
ایک دو گھونٹ میں بھی پیوں
اور پھر اپنا زادِ سفر... اپنی رسوائیاں
اپنے کاندھے پہ دونوں اٹھالیں
اور اس طرح کھو جائیں اک دوسرے میں
جیسے یہ آخری بار ملنا ہو
جیسے کبھی پھر نہ ہم مل سکیں گے!

مظہر امام

آزاد غزل

تو جو مائل بہ کرم تھا تو زمانے کا مجھے ہوش نہیں رہتا تھا
میں، کہ خودسر تھا، ترے زیرِ نگیں رہتا تھا

شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا، یہیں رہتا تھا

دل سے بے ساختہ بہتے ہوئے آنسو کا سفر آنکھ کی
منزل سے پرے ختم ہوا
کون ویران مکاں دیکھ کے پوچھے کہ: "یہاں
کوئی مکیں رہتا تھا؟"

خاک اڑتی ہوئی دیکھی تو دلوں کی یاد آئی
کیا یہاں کوئی حسیں رہتا تھا!

رات آنکھوں میں حیالے کے گزر جاتی تھی
لمحۂ شوق، بہت چیں بہ جبیں رہتا تھا

دور سے دیکھ رہا ہوں میں اجڑتی ہوئی بستی کا دھواں
وہ اسی جلتے ہوئے گاؤں کا باسی تھا، وہیں رہتا تھا

آزاد غزل

اسی سرمئی روشنی میں رواں دل کا بارا ہوا کارواں ہے
چراغ سحر میں دھواں ہی دھواں ہے
ملی ہے جو منزل تو یہ لگ رہا ہے کہ سارا سفر رائگاں ہے
کہ اب سانس کا بوجھ ڈھونا بھی جی کا زیاں ہے
مکیں ہیں نئے، اُن کی قدریں نئی ہیں
ستم آزمودہ گلی میں ابھی تک ہمارا پرانا مکاں ہے!

جسے ڈھونڈتا ہوں وہ میرے ہی دل کے دریچے
سے لگ کر کھڑا ہے
جسے پا چکا ہوں، کہاں ہے!

وہی نقشِ اوّل وہی نقشِ ثانی
وہی نقشِ جاں ہے

جو تھے اپنے گفتار کی گل فشانی پہ نازاں، وہ اپنی
زباں کاٹتے ہیں
کیا ہے مجھے جس نے سرشارِ یاقوتِ لب، میرا
عجزِ بیاں ہے

مری آنکھ کا زاویہ میری فکر و نظر کو بھی دائروں میں
سمیٹے ہوئے ہے
نشست اپنی بدلوں تو دیکھوں: مرے شوقِ آخر کی
سرحد کہاں ہے!

آزاد غزل

سراسر اس پہ تہمت ہے کہ اس نے مجھ سے کچھ
رشتہ نہیں رکھا
جہاں کے کارِ غم بخشے، مجھے تنہا نہیں رکھا

تمازت مہر امکاں کی پکھاتی خوش مروّت تھی
شجر ہم نے لگایا گھر کے آنگن میں، مگر سایہ نہیں رکھا
رہیں بے خانماں سب نیکیاں اپنی
خدا نے میرے رستے میں کوئی دریا نہیں رکھا

ہمیں سب رنگ اس کے زہر لگتے ہیں
زمانے کو شکایت ہے کہ ہم نے اپنی آنکھوں پر کوئی
پردا نہیں رکھا

سمندر سے گھبرانا بہت مشکل نہ تھا، لیکن
ہمیں نے اپنی کشتی کے جزیرے سے نکلنے کا کوئی
رستہ نہیں رکھا

نشے میں خوش گمانِ صبح تھے اتنے
کسی نے زخمِ شب پر آج تک پھاہا نہیں رکھا

اک انجانی صدا کانوں سے ٹکرائی
دیا لے کر چلے ہم، پھر خیال آیا کہ ہم نے گھر میں
دروازہ نہیں رکھا

نام : مظہر امام
تاریخ پیدائش : 5 مارچ 1930
بعض پرانے کاغذات کے مطابق 12 مارچ 1928
جائے پیدائش : دربھنگا (بہار)
تعلیم : ایم۔اے (اردو)، فرسٹ کلاس، گولڈ میڈلسٹ
ایم۔اے (فارسی)، فرسٹ کلاس، گولڈ میڈلیسٹ
پراگیا (ہندی)، امتیاز کے ساتھ
تربیت : ٹیلی ویژن پروگرام: پیش کش اور تکنیکی امور، فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ، پونا
ملازمت : اکتوبر 1951 روزنامہ 'کارواں' کلکتہ کے سب ایڈیٹر
جنوری 1952 تا دسمبر 1958 سی ایچ ادہائی اسکول کلکتہ میں درس و تدریس سے وابستگی
1958 کے اواخر میں آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام آفیسر منتخب۔ آکاش وانی اور دوردرشن کے مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 1988 میں سینئر ڈائرکٹر دوردرشن سری نگر کے منصب سے وظیفہ یاب۔
ادبی زندگی کا آغاز: 1943 میں افسانہ نگاری سے۔ اسی سال نظمیں اور غزلیں بھی کہیں۔
پہلی آزاد نظم : 1944 پہلی آزاد غزل: 21 فروری 1944 (5)
آغاز اشاعت: 'نقوش' لاہور، سال نامہ 1950 'شاہراہ' دہلی، اکتوبر 1951

تصانیف (شعری):

(1) زخم تمنا (نظمیں، غزلیں) 1962
(2) رشتہ گونگے سفر کا (نظمیں، غزلیں) 1974
(3) پچھلے موسم کا پھول (غزلیں) 1988
(4) بند ہوتا ہوا بازار (کلیات نظم) 1992
(5) پالکی کہکشاں کی (کلیات غزل) 2000
(6) پچھلے موسم کا پھول (غزلیں، ہندی رسم خط میں) 1999

تصانیف (نثری):

(1) آتی جاتی لہریں (تنقیدی مضامین) 1981
(2) ایک لہر آتی ہوئی (تنقیدی مضامین) 1997
(3) تنقید نما (تنقیدی مضامین) 2004
(4) اکثر یاد آتے ہیں (خاکے، یادداشت) 1993
(5) آزاد غزل کا منظر نامہ (تحقیقی اشاریہ) 1988
(6) جمیل مظہری (مونوگراف) 1992
(7) نگاہ طائرانہ (تبصرے، دیباچے) زیر طبع 2007

ترتیب و تدوین:

* نگارشات آرزو جلیلی (ترتیب و مقدمہ) 2001
* تثلیث حیات: پرویز شاہدی (شعری مجموعہ، پاکستانی ایڈیشن) 2005

خطوط کا مجموعہ: نصف ملاقات (مظہر امام کے نام مشاہیر کے خطوط)

فن اور شخصیت پر کتابیں:

مظہر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر امام اعظم
مظہر امام کی تنقید نگاری	پروفیسر محمد رضا کاظمی
مظہر امام: نئے منظر نامے میں	جمال اویسی
دستار طرح دار (مظہر امام کے فکر و فن کا منظوم جائزہ)	عبدالمنان طرزی
مظہر امام: نئی نسل کے پیش رو	مناظر عاشق ہرگانوی
مظہر امام: حیات اور فن	پریمی رومانی

فن اور شخصیت پر خاص نمبر:

'لمحے لمحے' بدایوں مرتب: حسیب سوز
'رابطہ' دہلی مرتب: نذرالاسلام نظمی
'خیال' کراچی مرتب: حسیب احسن

فن اور شخصیت پر گوشے:

• 'شاعر' بمبئی • 'جدید ادب' پاکستان • 'شاہکار' الہ آباد • 'گلبن' محمد آباد
• 'چنگاری' دہلی • 'تجدید' موتی ہاری، بہار • 'تحریر نو' ممبئی

انعام و اعزازات:

ساہتیہ اکیڈمی انعام	شعری مجموعہ 'پچھلے موسم کا پھول' 1994
غالب ایوارڈ	برائے اردو شاعری 1998
دہلی اردو اکادمی انعام	برائے اردو شاعری 2000
بہار اردو اکیڈمی انعام	اردو زبان و ادب کی مسلسل خدمات کے لئے 1987
مولانا مظہر الحق ایوارڈ	برائے مجموعی ادبی خدمات (ڈیڑھ لاکھ روپے) 2003
پرویز شاہدی ایوارڈ	برائے مجموعی ادبی خدمات 2001

آل انڈیا میر اکیڈمی ایوارڈ 1983
کرٹک سرکل آف انڈیا Critic Circle of India ایوارڈ اردو ادب اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے کے فروغ کے لئے 1982، کشمیر کا اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ دو بار

دیگر امتیازات: • ایک نئی صنف سخن 'آزاد غزل' کی ایجاد۔
• شخصیت اور شعری و ادبی کارگزاریوں سے متعلق تحقیقی مقالوں پر پانچ مختلف یونی ورسٹیوں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی جا چکی ہے۔
• کلام کے ترجمے انگریزی، روسی اور عربی کے علاوہ ہندی، بنگالی، اسامی، میتھلی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، کشمیری اور ڈوگری زبانوں میں ہو چکے ہیں۔
• چار شعری مجموعے مختلف یونی ورسٹیوں کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہیں۔

رابطہ: #176-B, Pocket-1, Mayur Vihar, Delhi-110091
Phone: 011-22756049, 65818283

خصوصی مطالعہ

منشا یاد

محمد منشایاد اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں مجھے اس وجہ سے مختلف...اور خوش گوار حد تک مختلف لگتا ہے کہ وہ بڑبولا نہیں ہے۔ وہ اپنے ادب کی سرگوشی کو نشر کرنے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کرتا۔ وہ افسانہ لکھتے ہوئے بھی اور لکھ کر بھی اور چھپوا کر بھی اور سب افسانوں کو کتابی صورت میں مرتب کر کے بھی چپ کا رہتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ سننے والے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، مگر سرگوشی آفاق میں پھیلی ہوئی گونج بن جاتی ہے، جسے سننا نہ بھی چاہیں تو سنائی دے جاتی ہے۔ منشایاد کی کہانیاں یہی سرگوشیاں ہیں۔ ان کی سادگی پر نہ جایئے کہ یہ بہت گہرائی تک وار کرنے والی کہانیاں ہیں.....

احمد ندیم قاسمی

ملاقات

آپ منشا یاد سے ملنا چاہتے ہیں تو یوں کریں کہ اپنے پُرعافیت ڈرائنگ روم سے نکل کر سیدھے اس پگڈنڈی پر ہولیں جو کبھی کسی کو کہیں بھی لے کر نہیں گئی۔ اس شاہ راہِ حیات کے آس پاس ہی کہیں ایک راج بہا آپ کی راہ کاٹے گا، آپ پگڈنڈی کو چھوڑ اسی پر ہولیں۔ نامعلوم سے نامعلوم کی طرف بہتا ہوا یہ راج بہا کبھی مٹی رنگے پانی کی گزرگاہ ہوگا مگر اب تو جانے کتنے یگوں سے یہاں سیاہ کیچڑ سا بہا کرتا ہے۔ آپ اپنے چم چم کرتے جوتے اس کیچڑ میں لتھیڑ کر پار اتریں تو سامنے آپ کو تاحد نگاہ پھیلے لینڈ اسکیپ کے بیچوں بیچ جادوئی حصار میں ایک بستی دکھلائی پڑے گی۔ آپ غور سے دیکھیں تو اس بستی میں سرخ اور سیاہ دھند کے امنڈتے ہوئے مرغولوں کے بیچ شاخوں، پتوں اور چھاؤں سے محروم ایک بڑے شرینہہ (سرس) کا ٹھنٹھ کھڑا یہاں زندگی کے ہونے کا اعلان کرتا دکھائی دے گا۔ زندگی، مگر کیسی؟ اپنے جیسی، سحر زدہ، بے ثمر اور جبر کے بھاری پتھر تلے سسکتی زندگی۔

یہ بستی کہ جسے ویسٹ لینڈ کہیں یا خلا اندر خلا، کوڈو فقیر، علیا نائی، ناتو سانسی، دتے کمہار، زیناں، غفوراں، میری، آپ کی اور منشا یاد کی بستی ہے۔ وہ آپ کو اس بستی کے بنجر موسموں میں سبز لفظوں کی فصل بونے میں ہمہ تن مصروف ملے گا۔

کہانی منشا یاد کے ہونے کا واحد جواز ہے لیکن وہ شہرزاد سے ان معنوں میں ضرور مختلف ہے کہ شہرزاد کے سامنے جیسے تیسے رات کاٹنے اور اپنی گردن بچانے کا مسئلہ تھا جب کہ منشا یاد کے لئے کہانی ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہے جسے وہ ہاتھ میں تھامے رات کے ساتھ نامختتم جنگ لڑ رہا ہے۔ رہی جان تو اس کی اسے فکر کیوں ہو کہ وہ تو اپنی ذات کو رات کی سفاکی سے دھندلائے ہوئے کچلے، مسلے، لڑتے بھڑتے کرداروں میں تحلیل کر چکا ہے.....

عاطف علیم

نقد و نظر

محمد منشا یاد اور تماشا

پروفیسر گوپی چند نارنگ

منشا یاد کا کہنا ہے کہ "میں سچی کہانی نہیں لکھنا چاہتا" لیکن وہ جھوٹی کہانی بھی نہیں لکھتا۔ وہ کہتا ہے "میں افسانہ لکھنا چاہتا ہوں" یعنی وہ سچی کہانی، جھوٹی کہانی اور افسانے میں فرق کرتا ہے۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ "تخلیقات کو میں نظریے کی کھونٹی سے نہیں باندھتا" لیکن اس کے زیادہ کردار گرے پڑے مفلوک الحال اور بے توقیر لوگ ہی ہیں، خواہ وہ کوڈو فقیر ہو، علیا نائی ہو، ساد و ترکھان ہو، شید و مہترانی ہو، یا آگ میں گھری زیناں جو اس قدر حسین ہے کہ محض آئینہ دیکھ کر وقت گزار سکتی ہے لیکن جسے ایک بھینس اور گدھی کے عوض خریدا گیا تھا۔ محمد منشا یاد کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'بند مٹھی میں جگنو' 'ماس اور مٹی' اور نیا مجموعہ 'خلا اندر خلا' 1983 میں شائع ہوا۔ اسی آخری مجموعے میں ایک کہانی ہے 'تماشا'۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کہانی پڑھ کر ہم دم بخود رہ جاتے ہیں یا سارا خون ذہن میں ایک نقطے پر سمٹ آتا ہے۔ اچھے شعر کا معاملہ نسبتاً اتنا مشکل نہیں، اچھی کہانی کے ساتھ بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے۔ درد کے کئی ان دیکھے رشتے قائم ہو جاتے ہیں، اور دبی دبی ٹیس رہ رہ کر اٹھتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی سچی کہانی یا جھوٹی کہانی سے بچنے کے لیے محمد منشا یاد نے یہ افسانہ لکھا۔ بے شک یہ سچی کہانی بھی نہیں ہے، جھوٹی کہانی بھی نہیں اور جس طرح یہ لکھی گئی ہے، افسانہ بھی بن گئی ہے۔ یقین نہ آئے تو کہانی کے ان ساختیوں کو دیکھیے:

1۔ ایک مداری اور اس کا بیٹا تماشا دکھانے کے لیے نئی بستی کی تلاش میں سرگرم سفر ہیں۔

2۔ دریا کے کنارے چلتے چلتے اس پار انھیں بستی دکھائی دیتی ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے پل ہے نہ کشتی۔

3۔ دونوں دریا میں اترنا چاہتے ہیں تاکہ اسے پار کر سکیں لیکن بڑے کو رات کا بھیانک خواب یاد آ جاتا ہے اور وہ فیصلہ کرتا ہے کہ آج کا دن ان کے لیے اچھا نہیں۔ دریا میں نہیں اترنا چاہیے۔

4۔ دریا کے کنارے کنارے وہ جتنا چلتے ہیں، دوسری طرف بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے نظر آتے ہیں اور پل بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے۔

5۔ اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے سے انھیں اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں قریب ہی کوئی دوسری بستی ہے۔ دونوں فیصلہ کرتے ہیں کہ رات اس بستی میں گزار لیں، صبح سویرے تازہ دم ہو کر پھر چلیں گے۔

6۔ لیکن یہ بستی عجیب بستی ہے۔ بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا ہے۔ لوگ جمع تو ہو جاتے ہیں لیکن مرد عورتیں نہیں صرف بچے۔ یہ بچے بھی عجیب بچے ہیں۔ ان کے بال سفید ہیں اور چہروں پر جھریاں ہیں۔ ساری بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں۔

7۔ بڑا سب سے پہلے تین گولے نکالتا ہے اور باری باری پیالے اٹھا کر انھیں غائب کر دیتا ہے۔ پھر ایک کے بعد ایک کئی تماشے دکھاتا ہے۔ خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرے ہوئے گلاس کو الٹ دینے سے پانی نہیں گرتا۔ وہ خود کو سانپ سے ڈسواتا ہے۔ منھ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔ لیکن بچے تماشائی تالی نہیں بجاتے، داد نہیں دیتے۔ مداری پریشان ہو جاتا ہے۔

8۔ آخر میں وہ سب سے بڑے تماشے کا اعلان کرتا ہے کہ میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارہ زندہ کر کے دکھاؤں گا۔ اس پر بچے تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں۔ بڑا حیران ہوتا ہے کہ عام طور پر تماشائی اس کھیل کو پسند نہیں کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں لیکن کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹتے ہیں۔ جمورے کو لٹا کر اس پر چادر تان کر وہ چھری چلاتا ہے۔ تماشائی زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں اور سکے پھینکتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان خالی ہو جاتا ہے۔ بڑا جمورے کو آواز دیتا ہے۔ مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔ وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے، کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس

کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔

اوپر جو آٹھ ساختیے پیش کیے گئے، ان میں سے ہر ساختیہ باقی تمام ساختیوں کی مدد سے معنی حاصل کرتا ہے اور ہر ساختیہ میں کہانی کو کوئی دوسرا موڑ دینے کی گنجائشیں ہیں۔ افسانہ نگار کے لیے ہر شق میں ممکن تھا کہ وہ دوسری راہ اختیار کر لیتا اور پوری کہانی کا رخ بدل جاتا۔ مثال کے طور پر مداری اور اس کا بیٹا سفر میں ہیں۔ سفر کی ضد گھر ہے۔ انجان بستی کی طرف جتنا چلتے ہیں، اس کی طرف جانے والا پل اتنا دور ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پل پار کر لیتے اور انجانی بستی میں اتر جاتے، جس سے کہانی میں اسرار کی کیفیت ختم ہو جاتی اور لحہ بہ لحہ بھیدوں میں اترنے اور grotesque کے بھیانک انجام تک پہنچنے کا عمل رونما نہ ہو سکتا۔ پھر یہ کہ جس بستی میں وہ پہنچتے ہیں وہ عجیب الخلقت بونوں کی بستی ہے جہاں سب (نا پختہ بچے) مداری ہیں۔ اس کے برعکس بھی دکھایا جا سکتا تھا۔ لیکن کہانی میں وہ بات نہ بنتی جو اب بنی ہے۔ اسی طرح ہر شق اور ہر کڑی کو لیا جا سکتا ہے جس میں معنوی جہات تراشنے اور کہانی کو مرکزیت دینے کی دوسری معنوی اور اظہاری گنجائشیں موجود ہیں۔ آخر میں مداری کے تماشے سے کچھ اور نتیجہ بھی برآمد ہو سکتا تھا لیکن جس اچانک صدمے سے موجودہ انجام قاری کو دوچار کرتا ہے اور ذہن پر ضرب لگا کر قاری کو ایک تحیر زا بھیانک سوال کی زد میں لا کر چھوڑ دیتا ہے، کیا وہ کسی دوسری طرح ممکن تھا؟

سامنے کی بات ہے کہ کہانی میں پلاٹ ہے۔ واقعات ارتقائی عمل سے گزرتے ہیں، ان میں وحدت تاثر ہے۔ زماں اور مکاں کی ترتیب منطقی ہے۔ کہانی میں کردار بھی ہیں، مداری، جمورا اور تماشائی۔ کردار، واقعات اور مکالمات سے جڑے ہوئے ہیں۔ کہانی میں نقطۂ عروج بھی ہے اور انجام بھی۔ تو کیا یہ روایتی کہانی ہے؟ لیکن اس کی ساخت کی جو شقیں اوپر پیش کی گئی ہیں ان کی روشنی میں شاید ہی کوئی ذی شعور آدمی یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ کہانی روایتی ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ روایتی کہانی نہیں ہے تو کیا یہ علامتی کہانی ہے؟ یا تمثیلی کہانی ہے؟ یا منشایاد کے الفاظ میں ''محض افسانہ'' یعنی نہ سچی کہانی اور نہ جھوٹی کہانی۔ حق بات یہ ہے کہ ان سوالوں کا جواب اتنا سادہ نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جا سکتا ہے لیکن اتنا وقت طلب بھی نہیں کہ اس کی کوشش ہی نہ کی جائے۔ افسوس کا پہلو یہ ہے کہ بعض حضرات نے خانہ بندی بہت سخت کر رکھی ہے۔ آمد و رفت ممنوع ہے۔ دلیل و برہان نہیں اور تجزیہ تنقید سے مفقود ہے۔ اوپر کے دو تجزیوں سے تو اتنی بات بہر حال واضح ہو چکی ہے کہ اردو میں علامتی اور تمثیلی کہانی عملاً ایک دوسرے سے اتنی الگ الگ نہیں جتنی بالعموم سمجھی جاتی ہے۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں صرف چند امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

ساختیاتی نظام کے بعد کہانی کے تمثیلی عنصر کو دیکھیے۔ جب دوسرے کنارے پر بستی دکھائی دیتی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے نہ پل ہے نہ کشتی، بڑا کچھ دیر تامل کر کے کہتا ہے:

''اللہ کا نام لے کر چل پڑتے ہیں پتر۔''

لیکن پھر اسے رات والا ڈراؤنا خواب یاد آ جاتا ہے اور وہ اپنا فیصلہ بدل دیتا ہے۔

''کیسا خواب ابا؟''

''بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر۔''

''کیا دیکھا تھا ابا؟''

''میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے میں تماشائیوں کے درمیان کوڑیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں۔ اچانک کوڑیوں والا جسے میں نے تمھاری طرح لاڈ پیار سے پالا تھا میری گردن میں دانت گاڑ دیتا ہے اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔''

''پھر کیا ہوا ابا؟''

بڑا بتاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ اور وہ اپنی رہی سہی طاقت جمع کر کے بیٹے کو پکارتا ہے۔ پھر اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے اور کتے رو رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمھارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمھارے گلے پر چھری چلانے اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔

کیا یہ خواب کہانی کا وہ مرکزی تمثیلچہ نہیں جس کے چاروں طرف کہانی بنی گئی ہے۔ کہانی کے معنوی امکانات کو جس طرح اس خواب صورت تمثیل نے گہرا کر دیا ہے، کیا کسی اور طرح ممکن تھا؟ اول تو اس میں بھیانک پن اور دہشت کی وہ فضا ہے جس کے گرد پوری کہانی نمو پاتی ہے۔ دوسرے اس میں اپنوں کے ہاتھوں سفاکانہ ہلاکت کا جو منظر ہے وہ دوہری معنویت رکھتا ہے۔ کوڑیالے سانپ کو بڑے نے اپنی اولاد کی طرح لاڈ پیار سے پالا تھا لیکن وہی اس کی گردن میں دانت گاڑ دیتا ہے۔ یہاں موت اولاد سے باپ کی طرف

ہے جب کہ کہانی میں اس سفاکانہ عمل کی تقلیب ہوتی ہے اور چھری باپ کے ہاتھوں بیٹے کی گردن پر چلتی ہے۔ خواب کا دوسرا حصہ یعنی "رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنے چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا" کہانی کے انجام سے مربوط ہے۔ لیکن کہانی کا انجام بہر حال تحیر زا اور غیر متوقع ہے۔

علاوہ خواب کی تمثیل کے کہانی میں دوسرے تمثیلی عناصر بھی ہیں۔ باپ اور بیٹا دریا کے کنارے کنارے چلتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بستی کی مسجد کے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر پل پھر بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے۔

اسی طرح جس بستی میں پہنچتے ہیں وہاں کوئی بالغ نہیں، سب بچے ہیں۔ لیکن ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں ہیں۔ اگرچہ ان کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں لیکن ان کے ذہن ناپختہ ہیں۔

گویا کہانی کی ساخت میں ایک نہیں تین شقیں سراسر تمثیلی ہیں۔ لیکن کیا اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانی محض تمثیلی ہے۔ لیکن یہ بات ابھی طے نہیں کی جا سکتی کیوں کہ کہانی کے بہت سے دوسرے معنوی ابعاد پر ابھی ہم نے غور کیا ہی نہیں۔

بڑا کون ہے، چھوٹا کون ہے۔ کیا یہ صرف مداری اور اس کا بیٹا ہیں۔ یا اس پُر اسرار تماشے کا حصہ ہیں جو اس کارزارِ حیات میں ہر روز ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ان کا سفر کیسا سفر ہے۔ "اندھیرے کا طویل سفر" طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہ زندگی کا سفر تو نہیں۔ اندھیرا ماضی تو نہیں جو پیچھے چھوٹتا چلا جاتا ہے اور کیا سورج کا طلوع ہونا لمحۂ حاضر تو نہیں۔ جس میں ہم وقت کے دریا کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ باپ بیٹا یعنی قدیم انسان اور آج کا انسان دریا کو پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وقت کے دریا کو کس نے پار کیا ہے۔ انسان ہمیشہ ان دیکھی بستیوں کی کھوج میں مگن ہے لیکن وہ جتنا سفر کرتا ہے زندگی کے بھید اتنے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو جاتی ہے لیکن زندگی کے بھید جتنے حل ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ گہرے بھی ہو جاتے ہیں۔

"عجیب بات ہے جمورے، پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔"

"اور بستی بھی ابا۔ مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔"

"عجیب بات ہے جمورے۔"

"بہت ہی عجیب ابا۔"

"یہ کوئی اسرار ہے پتر۔"

"میرا خیال ہے ابا، ہم ہر روز لوگوں سے مذاق کرتے ہیں، آج ہمارے ساتھ مذاق ہو رہا ہے۔"

بیٹا اپنے باپ کی مخلوق ہے۔ دونوں مل کر معاشرے کو رجھاتے ہیں لیکن اب دونوں وقت کی ایسی منزل میں ہیں جہاں خود ان کے ساتھ بہت بڑا تماشا ہونے والا ہے۔ چلتے چلتے تھک جاتے ہیں۔ دونوں کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں، تو بڑا کہتا ہے:

"رک جا پتر۔ اس پار بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں۔"

"پھر کیا کریں ابا؟"

"واپس چلتے ہیں پتر۔"

"نہیں ابا، ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے۔"

صاف ظاہر ہے بیٹا جستجو میں باپ سے زیادہ گرم جوش ہے۔ نئی نسلیں اگر پچھلی نسلوں سے زیادہ پر جوش نہ ہوں تو پھر نئی نسلیں ہی نہیں۔ نئی نسل زیادہ ذہین اور براق بھی ہے۔ اس کا ثبوت دونوں کے مکالموں سے جگہ جگہ ملتا ہے۔ باپ یہ کہتا ہے:

"نیں وی ڈونگھی تلہ پرانا شیہاں تاں پتن ملے۔"

چھوٹا لقمہ دیتا ہے: "میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلّے۔"

باپ بیٹے میں ایک رشتہ تو خالق اور مخلوق کا ہے، دوسرا پرانی اور نئی نسل کا۔ ایک اور پہلو بھی ہے یعنی معاشرے اور نظام کا۔ اور شاید یہی پہلو کہانی کے مرکزی سوال سے زیادہ جڑا ہوا ہے۔

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ساری کہانی میں بھید کی فضا ہے۔ عجیب بستی کے قریب پہنچنے پر بڑا اچانک ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جمورا مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے۔ بیر چکھتا ہے اور تھوک دیتا ہے۔ بڑا کہتا ہے "رب خیر کرے بیری کے ساتھ دھرکونے، کوئی اسرار ہے پتر۔"

چھوٹا منہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ بڑا کہتا ہے:

"ابابیلیں ہیں پتر۔"

"ہاں ابا پورا لشکر ہے۔"

"دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر۔"

"کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا۔"

"اور کیا پتر؟"

"ہاتھیوں کو ابا۔"

"نہیں پتر، یہ وہ ابابیلیں نہیں، یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے والی ابابیلیں ہیں۔"

"یہاں سے نکل چلیں ابا، یہ ٹھیک جگہ نہیں۔"

قرآن حکیم کی روایت کی طرف اشارہ وسیع تر معنیاتی تناظر فراہم کرتا ہے۔ لیکن ابابیلیں یہاں خیر، نیکی اور رضائے الٰہی کی علامت نہیں، اس کا برعکس ہیں کیونکہ زندگی دراصل آسیب میں گھر گئی ہے۔ یہ جگہ واقعی ٹھیک جگہ نہیں۔ یاد رہنا چاہیے کہ کہانی کا عنوان 'تماشا' ہے۔ یہ طنزیہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بستی جس میں مداری اور جمورا پہنچتے ہیں، آسیب میں گھری ہوئی ہے۔ کہیں سماج کسی ایسے وقت میں تو گرفتار نہیں ہو گیا، جہاں وہ خود اپنے آپ کو یا نظامِ اقدار کو یا عزیز ترین تصورات کو ذبح کیے دے رہا ہے۔ بڑا انتہائی دردناک لہجے میں آخر یوں کہتا ہے:

"پتر جموریا، ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں (خالی) ہو گیا۔"

کیا یہاں تک پہنچتے پہنچتے بڑا ہمارے عہد کی علامت نہیں بن جاتا، جو اقدار کے کرائسس کا شکار ہے۔ یعنی ڈگڈگی بجاتے بجاتے جس کے بازو شل ہو چکے ہیں اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے جس کا باطن خالی ہو گیا ہے لیکن کسی پر اس کا کوئی اثر نہیں، کیونکہ ہر عین کی معنویت جاتی رہی ہے، خواہ وہ تین لوگوں کا تماشا ہو، دو کے چار بنانے کا، بھرے گلاس کو خالی کرنے کا یا خالی گلاس کو بھرنے کا، جلتے ہوئے سگریٹ کو نگلنے کا یا رومال کے رنگ کو تبدیل کرنے کا۔ کوئی تصور اکساتا نہیں بس تماشا ہو رہا ہے۔ ہر قدر بے مایہ اور بے آبرو ہو گئی ہے۔ چاروں طرف نظر آنے والے تماشائی سب ناپختہ ہیں۔ بستی میں اب "پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہا۔" یعنی معاشرہ ایسے انسانوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے جو اقدار کی لذت سے آشنا تھے اور اس کے شیدائی تھے۔ یہ اقدار روحانی بھی ہو سکتی ہیں اور سماجی، سیاسی بھی۔ اس عہد میں "بچے" "کسی کو رہنے ہی نہیں دیتے" "ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔" یہ بچے کون ہیں؟ یعنی ذہنی اعتبار سے ناپختہ لوگ جنھوں نے آسیب زدہ بستی پر قبضہ کر رکھا ہے، اور سب بڑوں کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ آخری تماشا جمورے کو زمین پر لٹا کر، اس پر چادر ڈال کر گردن پر چھری چلاتا ہے۔ باپ کا جو رشتہ اولاد سے ہوتا ہے، وہی معاشرے کا اپنے عزیز ترین تصورات سے ہے۔ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔ کیا انسان کے ہاتھوں اپنی اقدار کا قتل نہیں ہو رہا ہے۔ کیا معاشرہ اپنے عزیز ترین تصورات کا خود قاتل نہیں؟ کیا ہماری عزیز ترین متاع خون میں لت پت نہیں پڑی ہے؟ کیا بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے انسان کا باطن خالی نہیں ہو گیا؟ اور کیا وہ آوارہ اور بے خانماں کو بہ کو سرگرداں نہیں؟

ہم نے اس کہانی کی روایتی، تمثیلی اور علامتی تینوں توجیہیں آپ کے سامنے رکھ دیں۔ اب آپ آسانی سے اس سوال کا جواب خود ہی پا سکتے ہیں کہ یہ کہانی روایتی ہے، تمثیلی یا علامتی ہے۔ اتنی بات تو شروع کے ساختیاتی بیان کے بعد ہی واضح ہو گئی تھی کہ کہانی روایتی نہیں۔ دوسرے بیان سے یہ بات سامنے آئی کہ افسانہ نگار نے تمثیلی پیرایے کو بھی برتا ہے۔ تیسرے یعنی آخری بیان سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ کہانی کی پوری بافت از اول تا آخر علامتی ہے اور تمثیلی عنصر بھی اسی علامتیت کا حصہ ہے۔

یوں تو کہانی کو محض لغوی سطح پر بھی لیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ لطف و اثر سے خالی نہیں لیکن اس کے لطف و اثر کے تمام امکانات اسی وقت روشن ہوتے ہیں جب اس کے علامتی مفاہیم بھی نظر میں رہیں۔ علامتی مفاہیم کے کچھ اور پہلو بھی ہو سکتے ہیں، لیکن ارتکاز کی خاطر ہم نے صرف ان پہلوؤں کو پیش کیا جو ہمارے نزدیک اظہاری اعتبار سے زیادہ قابل قبول ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نئے اردو افسانے میں علامتی اور تمثیلی پیرائے بالکل الگ نہیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ بالکل ہو سکتے ہیں اور اس کی مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں لیکن اردو کے نئے افسانے میں اکثر و بیشتر علامتی و تمثیلی پیرائے مل جاتے ہیں اور تمثیلی عنصر اور وسائل سے علامتی ساخت کو خاصی معنیاتی تقویت ملتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا نئے افسانے کے تخلیقی مضمرات سے عدم واقفیت کا ثبوت دینا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ کہانی کا ڈھانچہ یا اس کا اظہاری پیکر خواہ کچھ ہو، ضروری ہے کہ اس میں لطف و اثر ہو، وہ دلچسپی کو قائم رکھ سکے اور حظ و انبساط اور لطف و نشاط سے سرشار کر سکے۔ کتھارسس جو سچے ادب کی پہچان ہے، اس کی اصلی توجیہہ بھی یہی جمالیاتی توجیہہ ہے۔ کہانی خواہ علامتی ہو یا تمثیلی یا ملی جلی حقیقت نگاری کی کہانی ہو، یا سرئیلی کہانی ہو، یعنی شعور سے زیادہ لاشعور کو انگیز کرتی ہو، ضروری ہے کہ وہ کسی قیمتی تجربے سے آشنا کرے، یعنی اس کے اظہاری قالب میں یہ طاقت ہو کہ دل پر چوٹ پڑے یا ذہن پر ضرب لگائے، استعجاب میں غرق کر دے یا

سوچنے پر مجبور کر دے یا زندگی کے بارے میں آگہی اور بصیرت کا کوئی نیا دریچہ کھول دے۔ یہ منصب کہانی کے جوہر کا ہے۔ علامتی یا تمثیلی پیرائے محض وسیلے ہیں۔ وسائل کچھ بھی ہو سکتے ہیں، اصل چیز 'جوہر' ہے اور کہانی کے اسی جوہر کی حفاظت محمد منشا یاد نے کی ہے۔

OO

نقد و نظر

درخت آدمی

ڈاکٹر وزیر آغا

منشا یاد کے افسانوں کے حوالے سے ایک معزز نقاد نے لکھا ہے کہ اپنے تمام تر دیہاتی پن اور پنجابیت کے باوجود منشایاد نے زمین اور مٹی کو اپنے لئے بت نہیں بنایا۔ یہ کام اس نے بعض ذرائع ابلاغ پر متمکن مبلغین کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ موصوف نے ان ''ذرائع ابلاغ پر متمکن مبلغین'' کی نشان دہی نہیں کی۔ اگر وہ نشان دہی کر دیتے تو مناسب تھا کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ان نام نہاد مبلغین نے بھی زمین اور مٹی کو اپنے لئے بت نہ بنایا ہو اور وہ زمین اور مٹی کے حوالے سے انسانی ثقافت کی تہوں کو کھول کر ان خزائن تک پہنچنا چاہتے ہوں جو زرخیزی اور روئیدگی کے عناصر کی صورت زیرِ زمین چھپے ہوئے ہیں اور معمولی سی کوشش سے نظر آ سکتے ہیں۔

خود منشایاد کے افسانوں میں (کم از کم 'درخت آدمی' میں شامل افسانوں میں) سب سے جان دار حوالہ ہی اُن وظائف کا ہے جو زیرِ زمین ثقافتی آثار کو زمین پر موجود ثقافتی مظاہر سے ہم رشتہ دکھانے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی بہترین مثال منشایاد کا افسانہ پولی تھین ہے، جس کے بارے میں مظفر علی سید کا یہ خیال ہے کہ یہ ''پرانے بھوک کے موضوع پر لکھا ہوا ایک نیا افسانہ ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ ضبط اور کفایت کے ساتھ محرومی کے دور رس اثرات کو پیش کرتا ہے'' حالاں کہ پولی تھین کا اصل موضوع 'بھوک' ہے ہی نہیں! کسی زمانے میں ترقی پسند ناقدین اس قسم کی اکہری تنقید کیا کرتے تھے مگر اب وہ بھی کم از کم تخلیق کی دوہری ساخت کی طرف ایک آدھ اشارہ ضرور کر دیتے ہیں۔

مگر سید صاحب نے خود کو اس افسانے کی محض بالائی سطح تک محدود رکھا ہے۔ اس افسانے کا اصل موضوع تہذیبوں کی آویزش ہے۔ ان میں سے ایک تہذیب زمین میں بطور آثار قدیمہ دفن ہے اور ماہرین اس کی بازیابی میں مصروف ہیں۔ جب کہ ایک اور تہذیب زمین کی سطح کے اُوپر آباد ہے اور پھل پھول رہی ہے، مگر افسانہ نگار نے دیکھ لیا ہے کہ تہذیبوں کو 'زندہ' اور 'مُردہ' میں تقسیم کرنے کا یہ مشغلہ تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔ وجہ یہ کہ وہ تہذیب بھی جس کے آثار زیرِ زمین ملے ہیں ہزار ہا سال سے بالائے زمین بھی موجود رہی ہے۔ منشایاد کے الفاظ میں۔

''حملہ آور اُجڈ اور وحشی قبائل نے گھروں کو جلا ڈالا اور بستی کو مسمار کر دیا۔ فصلیں اجاڑ ڈالیں اور لوگوں سے مویشی، اناج، زیورات اور عورتیں چھین لیں۔ مردوں کو تہہ تیغ کر دیا یا انہیں غلام بنا لیا۔ بعض جنہوں نے اطاعت قبول نہ کی جنگلوں بیلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور جب تک بن پڑا ان لیٹروں سے اپنی زمینیں اور عورتیں واپس لینے کے لئے برسرِ پیکار رہے جنہوں نے اصل باشندوں کو بے دخل کرنے کے بعد مسمار شدہ بستیوں کے قریب ہی نئے گاؤں تعمیر کر لئے تھے۔ بے دخل کئے جانے والے اصل باشندے آہستہ آہستہ بھوک، بیماری اور کس مپرسی کا شکار ہو کر کم زور پڑتے گئے۔ پھر انہوں نے نئی بستیوں کے قریب تالابوں کے کنارے جھنڈوں اور جھگیوں میں رہنا شروع کر دیا اور چوہڑے، چمار، گگوے اور سانسی کہلانے لگے اور آہستہ آہستہ بھول گئے کہ کبھی وہ بھی ان زمینوں اور بستیوں کے اصل مالک تھے۔''

گویا آثار قدیمہ کے ماہرین جس قدیم تہذیب کی تلاش میں ہیں اس کے آثار تو زیرِ زمین موجود ہیں مگر خود یہ تہذیب زمین کے اُوپر آباد ہے جو ماہرین کو نظر نہیں آ رہی۔ مگر افسانہ نگار نے دیکھ لیا ہے کہ قدیم تہذیب جسے حملہ آور ہزاروں برس کی کوشش کے باوجود مٹا نہ سکے اب بیسویں صدی کی مغربی تہذیب کے تند و تیز ریلوں کے سامنے ناپائیدار ثابت ہو رہی ہے، افسانے میں کالو 'قدیم تہذیب' کا نمائندہ ہے (کالو کا اسم بجائے خود سیاہ رنگت کے حوالے سے قدامت کی نشان دہی کرتا ہے) جب کہ پولی تھین نئی تہذیب کا علامتی مظہر ہے۔

قدیم اور جدید کی اس آویزش میں کالو کا پولی تھین کے حصول میں بجلی کی کرنٹ سے مرنا اس امر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ نئے

exposure نے قدیم تہذیب کے سارے مدافعتی نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے اور وہ جو ہزار ہا برس سے اپنے تشخص کو برقرار رکھے ہوئے تھی اب اس نئے حملہ آور کی تہذیب کے سامنے بے دست و پا ہو کر رہ گئی ہے۔ اس حوالے سے جب ہم اس کہانی کی ساخت اور اس ساخت میں استعمال ہونے والے جملہ ثقافتی مظاہر کے ٹکراؤ اور اس ٹکراؤ سے پھوٹنے والے کرداروں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو افسانے کی معنیاتی تہوں کے کھلنے کا ایک دل فریب منظر نظروں کے سامنے اُبھر آتا ہے۔ ایسے خوب صورت افسانے کو محض بھوک کے موضوع تک محدود کرنا افسانہ اور افسانہ نگار، دونوں کے ساتھ زیادتی ہے۔

منشایاد کے افسانوں کے بارے میں ایک عام تاثر یہ ہے کہ ''ان کے کوئی سے دو اچھے افسانوں کو آپ ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھیں تو پتا نہیں چلتا کہ ایک ہی لکھنے والے نے ان دونوں کو کیسے لکھ لیا۔'' گویا 'تنوع' ان افسانوں کا امتیازی وصف ہے۔

تاہم میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر کسی مصنف کی تخلیقات کے پیچھے خود مصنف کی ذات بطور ایک عقبی دیار موجود نہیں ہے تو ان تخلیقات کا تنوع لخت لخت ہونے کا منظر دکھائے گا نہ کہ ساختیاتی وحدت کا۔ ایک صحافی بھی جس کا فرض معروضی زاویے کو برتنا ہے جب کسی واقعہ کو دیکھتا ہے تو کسی نہ کسی حد تک اپنے شخصی ردعمل کی زد پر ضرور ہوتا ہے۔ یہ مجبوری ہے۔ رہا تخلیق کار کا معاملہ تو اُس کی خوبی معروضی رویہ اس قدر نہیں جتنا کہ مبتلا یعنی involve ہونا۔ خود فکشن کی تنقید نے بھی خالص معروضی رویہ (یعنی اوّل neutrality دوئم impartiality سوئم impossibility) پر عمل پیرا ہونے کو ناممکن قرار دیا ہے۔ (اس سلسلے میں Wayne Booth کی مشہور کتاب The Rhetoric Of Fiction قابل مطالعہ ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تخلیق کی کہانی، کردار نیز اس کے مجموعی tone میں خود افسانہ نگار شامل نہ ہو تو بات نہیں بنتی، مگر شرط یہ ہے کہ افسانہ نگار جذبات کا اظہار تو کرے مگر جذباتی نہ ہو جائے اور تنوع کا مظاہرہ کرے مگر عقب میں موجود ساختیاتی وحدت سے منقطع نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں اگر وہ اپنی شخصیت کا تابع مہمل ہو گیا تو اُس کی جملہ تخلیقات ایک مخصوص وضع اور چھاپ کی حامل ہوں گی لیکن اگر وہ اپنی شخصیت کے عقب میں موجود اجتماعی ساخت سے ہم رشتہ ہو گیا تو وہ تنوع کا ایسا منظر دکھائیں گی جو لخت لخت ہونے کے عمل سے یکسر مختلف ہوگا۔ کسی بھی مصنف کی تخلیقات کنول کے اُن پھولوں کی طرح ہیں جو پانی میں اُگے ہوتے ہیں۔ پانی کا ہونا ضروری ہے ورنہ کنول کے سارے پھول مُرجھا جائیں گے۔ اسی طرح مصنف کی تخلیقات کے پس پشت مصنف کی ذات (جو اجتماعی ساخت کی زائیدہ ہے) ایک قطعۂ آب کی طرح پھیلی ہوئی ہو تو تخلیقات کا داخلی ربط ابھرے گا ورنہ بکھراؤ کے سوا کچھ نظر نہیں آئے گا۔

اگر یہ بات ہے تو پھر دیکھنا چاہئے کہ منشایاد کا افسانوں کا تنوع متفرق واقعات سے جنم لینے والے فوری لیکن عارضی نوعیت کے ردعمل کا نتیجہ ہے یا ذات کو داخلی ساخت اور مزاج کے تابع ہے؟ میرا تاثر یہ ہے کہ منشایاد اُن افسانہ نگاروں میں سے نہیں ہے جو اصلاً رپورٹر ہیں اور واقعات، سانحات اور کرداروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں تا کہ اخبار کے لئے 'تنوع' کا اہتمام کر سکیں۔ منشایاد تو ایک ایسا افسانہ نگار ہے جو ماحول کو اپنے پورے وجود کے ساتھ 'محسوس' کر کے کہانی کہتا ہے۔ لہٰذا واقعات، سانحات اور کرداروں کی بالائی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ اُس بنیادی ساخت تک پہنچتا ہے جس سے یہ سب کچھ پھوٹا ہے۔

مثلاً کتاب کے نام 'درخت آدمی' ہی کو لیجئے جس میں کلچر کی گہری animistic سطح مضمر ہے۔ آرٹسٹ طاہر رشید قابل مبارک باد ہے جس نے اس نکتے کو گرفت میں لے کر درخت کے 'ذی روح' ہونے کی صورت کو کمال خوبی سے اُجاگر کیا ہے۔ چونکہ قدیم انسان تخلیقی سطح پر زندہ تھا لہٰذا اس کے لئے سارا ماحول بلکہ ساری کائنات ہی ایک نظم یا افسانہ تھی جسے وہ 'محسوس' کرنے پر قادر تھا۔ اس حد تک کہ درخت، چرند، پرند حتیٰ کہ پہاڑ، سمندر، ستارے سب ذی روح ہونے کے باعث اس کی اپنی برادری میں شامل تھے اور وہ بآسانی ان سے ہم کلام ہو سکتا تھا۔

اصلاً ایک تخلیق کار اسی قدیم انسان کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ اس جمِ غفیر سے جو عقل اور منطق کی مدد سے چیزوں کی لخت لخت کر کے سمجھنے میں دن رات کوشاں ہے۔ یوں کہنا بھی غلط ہوگا کہ تخلیق کار اشیا کے باہمی فرق کو مٹا کر انہیں یک جا بلکہ یک جان کرتا ہے جب کہ عام لوگ اشیا کے باہمی فرق کو اجاگر کر کے کثرت کے ایک عالم کو وجود میں لے آتے ہیں۔

ایک تخلیق کار کی اصل پہچان یہ ہے کہ اُس نے کہاں تک اجتماعی انسانی ساخت سے خود کو ہم آہنگ کر کے یکتائی بحال کرنے میں کام یابی حاصل کی ہے۔ منشایاد کے افسانے اپنے تمام تر بالائی سطح کے تنوع کے باوصف ذات کی اس قدیم ساخت primordial structure سے ہم رشتہ ہیں جو بطور اک جوہر یا شبیہہ (Icon) موجود نہیں ہے بلکہ 'رشتوں کی ایک گرہ' کی حیثیت رکھتی ہے۔

مثال کے طور پر منشایاد کے افسانہ 'درخت آدمی' کو لیجئے جس میں

افسانہ نگار نے درخت اور آدمی کو باہم مربوط کر کے انسانی ارتقا کے ایک انتہائی قدیم دور کو بالائے زمین لانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ تاہم اس سلسلے میں اُس نے ماہرین آثار قدیمہ کا تتبع نہیں کیا جو مُردہ اشیا کو برآمد کرتے ہیں بلکہ یہ تاثر دیا ہے کہ انسان اور درخت کا رشتہ جو انسان کے بائیں دماغ کے غلبے کے باعث ٹوٹ گیا تھا، آج بھی تخلیقی طور پر فعال انسانوں کے ہاں جوں کا توں موجود ہے۔

افسانہ 'درخت آدمی' کا کرمو ایک ایسا ہی تخلیق کار ہے جو درختوں اور پودوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور جس نے اپنی ساری زندگی انہیں بنانے سنوارنے میں گزار دی ہے۔ مگر پھر جب ایک روز اُسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے محبوب درخت پر کلہاڑا چلا دے تو اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کلہاڑا اپنے کسی عزیز پر چلا رہا ہے یا جیسے اُس نے کلہاڑا اپنے ہی جسم پر چلایا ہے کیونکہ جب درخت کٹتا ہے تو ساتھ ہی وہ بھی کٹ جاتا ہے۔ منشایاد کے الفاظ:

1۔ چودھری صاحب نے بارہا اُسے (یعنی کرمو کو) پیڑوں سے باتیں کرتے اور ان کا حال احوال پوچھتے سنا تھا۔

2۔ کرمو کو نہر والا باغ یاد آتا ہے جو اب بھی جوں کا توں اُس کے اندر آباد تھا۔

3۔ چودھری صاحب اور ان کے گھر والے ٹیلی وژن پر صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور گاڑی صاف کر رہا تھا اور دارو باورچی کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کر رہی تھی کہ اچانک درخت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی کرمو کی ایسی چنگھاڑ جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیخ تھی یا نعرہ! سب لوگ دوڑتے ہوئے پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ درخت گرا پڑا ہے اور خون میں لت پت کرمو اس کے نیچے دبا ہوا ہے۔''

اس افسانے میں کرمو اور درخت کا رشتہ آہستہ آہستہ اُجاگر ہوتا ہے۔ پہلے وہ درخت کو ذی روح قرار دے کر اس سے باتیں کرتا ہے، پھر اُسے اپنا ایک قریبی دوست گردانتا ہے مگر آخر آخر میں درخت اور کرمو ایک ہو جاتے ہیں۔ نفسیات والوں نے درخت کی مادری حیثیت کو اُجاگر کیا ہے۔ بعض نے اسے phallic symbol بھی قرار دیا ہے اور یوں زرخیزی اور روئیدگی کے اس قدیم دور سے انسان کے تعلق خاطر کو ثابت کیا ہے جو آج بھی انسانی سائیکی میں موجود ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے کہا یہ قدیم دور انسان کے لاشعور میں دفن پڑا ہے لہٰذا لوگ باگ اپنی عام زندگی میں اس سے منقطع ہو گئے ہیں مگر خلاق اذہان منقطع نہیں ہوئے۔ چنانچہ شاعر، مصور، موسیقار اور افسانہ نگار اس دور کے باقیات میں شمار ہو سکتے ہیں۔ کرمو بھی ان ہی میں سے ایک ہے اور کرمو کے حوالے سے خود منشایاد بھی۔ جس کے بیش تر افسانوں کی ساخت میں یہ قدیم دور کسی نہ کسی سطح پر موجود دکھائی دیتا ہے۔

جس قدیم دور کا ابھی ذکر ہوا اس میں ارواح کے تصور کے ساتھ ساتھ 'روحِ کُل' کا وہ تصور بھی مقبول تھا جسے میناmana کا نام ملا تھا۔ یہ روحِ کل ہر شے میں جاری و ساری تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ اس روح کے سمندر میں تمام اشیا تیر رہی تھیں اور پانی کی معرفت آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ مینا کا یہی تصور آگے چل کر ایک طرف وحدت الوجودی نظریے کی صورت میں نمودار ہوا اور دوسری طرف طبیعات کے حوالے سے ابتداً ایتھر ether اور بعد ازاں سپر اسٹرنگز کے تصور میں متشکل ہوا۔ منشایاد کے افسانوں میں نمودار ہونے والی alienation کی رو کے مقابلے میں (جو رشتوں کے ٹوٹنے سے عبارت تھی) ارتباط اور ہم آہنگی کا تصور ابھرا ہے جو اشیا اور افراد کو ایک داخلی اجتماعی 'ساخت' کے حوالے سے جُڑی ہوئی صورت میں دیکھنے پر مصر ہے۔

اس اعتبار سے دیکھیے تو اُن جدید افسانہ نگاروں کے برعکس جنھوں نے مغرب کے تتبع میں تنہائی، اجنبیت اور لخت لخت ہونے کے احساس کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے منشایاد نے مشرق کے اس میلان کا احساس دلایا ہے جو انسان کی اجتماعیت سے مربوط ہونے کے باعث ابھی تک خاصا طاقت ور ہے۔ اس سلسلے میں 'درخت آدمی' میں اُبھرنے والے رشتے کا اوپر ذکر ہوا۔ اب میں منشایاد کے تین ایسے افسانوں کا ذکر کرتا ہوں جن میں افسانے کا مرکزی کردار کسی نہ کسی جانور سے ہم رشتہ ہو کر اُبھرا ہے۔ اور بالائی سطح کے سارے تنوع کے باوصف ایک عمیق داخلی اسٹرکچر کا مظہر ہے۔

ان میں سے ایک افسانے کا عنوان ہے: 'چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں'۔ یہ عنوان ایک بیان یا statement کے طور پر اُبھرا ہے لہٰذا علامتی تہوں سے عاری ہے۔ اور حتمی ہونے کے باعث قاری کی توجہ کو افسانے کے ایک خاص معنی پر مرتکز کرنے کی سعی کرتا ہے۔ دوسری طرف خود یہ افسانہ اپنے اندر متعدد علامتی تہیں رکھتا ہے جن کے نتیجے میں افسانے کا 'انجام' تک افسانہ نگار کے مقرر کردہ عنوان کے دائرے سے باہر جا پڑا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ پائے کے افسانے کی اضافی خوبی ہے کہ وہ اپنے خالق کے قبضۂ قدرت سے نکل جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس نے دانۂ گندم چکھ لیا ہو۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مذکورہ بالا کہانی دو کرداروں ہی کی نہیں دو دیہاتوں کی کہانی بھی ہے۔ ان میں سے جب ایک گاؤں والے دوسرے

گاؤں کی لڑکی بیاہ لاتے ہیں تو لڑکی کے حوالے سے دو متحارب دیہاتوں یعنی 'میکہ گاؤں' اور 'سسرال گاؤں' میں بٹ جاتے ہیں۔ ویسے بھی میکہ گاؤں والوں کے لئے سسرال گاؤں والے وہ ڈاکو ہیں جنھوں نے میکے گاؤں پر ڈاکہ ڈال کر اس کا خزانہ لوٹ لیا تھا۔ شائد اسی لئے آج بھی جب گاؤں میں برات آتی ہے تو گاؤں کی عورتیں گیتوں میں انہیں لٹیروں اور ڈکوؤں کا حملہ قرار دے کر ہدف دشنام بناتی ہیں۔

منشایاد نے اپنے اس افسانے میں میکے گاؤں اور سسرال گاؤں کی معروف کہانی کی باز آفرینی کی ہے تا ہم اپنے ہاتھوں کے لمس سے اسے 'انوکھا' بھی بنا دیا ہے۔ گویا ساخت تو پرانی ہے لیکن پیٹرن pattern نیا نویلا ہے۔ ان میں میکہ گاؤں لٹتا ہے تو وہ سسرالی گاؤں سے اس کا انتقام لیتا ہے۔ ایک لڑکی (بی بی) کو اٹھالے گیا تھا دوسرا گھوڑی (رانی) کو اٹھالاتا ہے اور یوں ان دونوں کے درمیان خلیج مزید کشادہ ہو جاتی ہے۔ مگر گاؤں کی بیٹی کا منصب خلیج پیدا کرنا یا اسے کشادہ کرنا نہیں بلکہ خلیج کو پاٹنا ہے۔ سو بی بی اور رانی دو کردار نہیں رہتے ایک کردار بن جاتے ہیں (بالکل جس طرح 'درخت آدمی' میں کرمو اور درخت ایک کردار بن گئے تھے) لہٰذا سسرال والوں کے لئے بی بی اور رانی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اب دونوں اُن کے لئے عزیز ہیں۔ افسانے کے آخر میں جب سسرال گاؤں کی بانو آگے بڑھ کر بی رانی کو گلے لگاتی ہے تو گویا پہلی بار بی بی کو بطور دلہن قبول کیا جاتا ہے (شائد اس لئے بھی کہ وہ بغیر جہیز کے آئی تھی مگر اب وہ جہیز (بصورت رانی) ساتھ لائی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کہانی کے آخر میں بی بی کے اس تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی اپنی حیثیت بدستور صفر کے برابر ہے۔ اس کی اگر اب قدر کی جا رہی ہے تو یہ رانی کے صدقے میں ہے۔

مگر کہانی نے کہانی کار کی اس 'دخل اندازی' کو مسترد کر دیا ہے۔ یعنی ہر چند کہ افسانہ نگار چلاتا رہ گیا ہے کہ دیکھو ہیڈ ورکس پر آہنی دروازے گرا کر نہر کو بند کر دیا گیا ہے اور اب دور دور تک کیچڑ ملی ریت کے سوا اور کچھ نہیں مگر افسانے نے افسانہ نگار کی اس بات کو نہیں مانا۔ اس کے بجائے اس نے یہ تاثر ابھارا ہے کہ پل بنانا یا نہر کے پانی کو خشک کر دینا اصلاً ایک ہی بات ہے۔ مقصود تو راستہ بنانا ہے جو بی رانی کی آمد سے از خود بن گیا ہے۔ لہٰذا افسانے کا مجموعی تاثر بی بی کے احساس کم مائگی کے بجائے دو دیہاتوں (میکہ گاؤں اور سسرال گاؤں) اور دو کرداروں (بی بی اور رانی) کی یک جائی کی صورت میں اُبھرتا ہے اور بین السطور رانی کی بازیابی کو مذہب الارواح کے حامل اس معاشرے کی بازیابی کے مترادف قرار دیتا ہے جو اندر سے پوری طرح جڑا ہوا تھا..... اس قدر کہ اس میں درختوں، انسانوں اور جانوروں میں بھی خون کا رشتہ قائم تھا۔ یہ نہیں کہ منشایاد نے اس کہانی کے ذریعے 'جدید' کے اندر سے 'قدیم' کو کھود کر باہر نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے تو فقط کہانی کے کرداروں کو کھلی چھٹی دی ہے کہ وہ اپنی داخلی جہت کے تحت رشتوں میں منسلک ہو کر ایک نیا پیٹرن بنائیں تاہم جب پیٹرن بنتا ہے تو قاری یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ اس پیٹرن کی بُنت میں 'قدیم' کے دھاگے کس فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں۔

جولین جینز نے لکھا ہے کہ قدیم انسان جب کسی غیر معمولی کرب ناک صورت حال سے دوچار ہوتا تو اسے اپنے اندر سے آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں جنہیں وہ 'دیوتاؤں' کی آوازیں قرار دیتا اور ان ہی سے ہدایات حاصل کر کے بحران کا مقابلہ کرتا۔

جب کوئی جیٹ ہوائی جہاز فضا میں اڑتا ہے تو میلوں دور مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے لرزنے اور گنگنانے لگتے ہیں۔ بس یہی اس گنگناہٹ کا پس منظر ہے کہ انسانی سائیکی کے اندر کوئی نہایت قدیم عنصر متحرک ہو گیا ہے جو مخفی نوعیت کا ہے مگر جس میں بلا کی شکتی بھی ہے۔ قدیم معاشرے کے شیمن ہی نہیں عام لوگ بھی اس 'گنگناہٹ' سے آشنا تھے۔ مگر پھر جب دماغی سٹرکچر کا منطقی حصہ غالب آ گیا تو انسان بتدریج اس گنگناہٹ سے محروم ہوتا چلا گیا۔ مگر یہ گنگناہٹ پوری طرح ختم نہ ہو سکی اور گاہے گاہے تخلیق کاروں یا بحرانی کیفیت میں مبتلا کرداروں کے ہاں ابھرتی رہی۔ منشایاد نے اپنے اس افسانے میں اسی گنگناہٹ کا ذکر کیا ہے جو معاشرے کے زیر زمین مہا اسٹرکچر کا ایک زاویہ ہے۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ منشایاد ان افسانہ نگاروں کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتا جو معاشرے کی بالائی سطح پر بکھرے ہوئے واقعات، کرداروں اور مسائل کو محض چھو لینے تک اکتفا کرتے ہیں۔ منشایاد نے تو انہیں اپنے پورے وجود کے ساتھ 'محسوس' کیا ہے اور یہ اسی اقدام کا نتیجہ ہے کہ وہ معاشرے کی زیریں سطح تک رسائی پانے میں بھی کامیاب ہوا ہے۔

منشایاد کے افسانوں میں معاشرہ ایک متحجر fossil کی طرح نہیں بلکہ ایک ذی روح یا organism کے طور پر ابھرا ہے لہٰذا افسانہ نگار کی حیثیت اس ماہر آثار قدیمہ کی سی نہیں ہے جو زمین کھود کر آثار دریافت کرتا ہے بلکہ اس کسان کی سی ہے جو زمین سے بیج کے پھوٹنے کا منظر دیکھتا ہے اور پھر اس ساری تمثیل کو بیان کر دیتا ہے جس کا ایک ایکٹ بالائے زمین جب کہ دوسرا زیرِ زمین کھیلا گیا ہے۔ OO

نقد و نظر

منشایاد: کاریگر افسانہ نگار

مظفر علی سید

"کہانی کہنے کا فن آخری دموں پر ہے۔ ڈھنگ سے کہانی کہنے کی اہلیت ہمارے درمیان کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے۔ جب بھی ہم کوئی قصہ سننا چاہیں تو اکثر و بیشتر سنانے والا گھبرا کر پہلو بدلنے لگتا ہے۔ گویا ایک ایسی چیز جو ہم سمجھتے تھے ہم سے کوئی نہ چھین سکے گا اور جو ہمیشہ ہماری مٹھی میں محفوظ رہے گی، اب ہتھیائی جا چکی ہے... یعنی تجرباتِ زندگی کا تبادلہ کرنے کی صلاحیت۔" (والٹر بنجمن بعنوان لیسکوف کی کہانی پر سوچ بچار)

جرمنی کے اس مفکر نقاد (15 جولائی 1892-27 ستمبر 1940) نے زار شاہی کے مقبول عام روسی فن کار پر لکھتے ہوئے کہانی کہنے کے فن کو محنت کشی کے ماحول سے مربوط کیا ہے جو دیہات میں اور شہروں میں بلکہ سمندروں تک (اور آج کی دنیا میں فضاؤں اور خلاؤں تک) پھیلا ہوا ہے۔

"اپنی جگہ قصہ گوئی کا ہنر بھی کاریگرانہ ابلاغ کی ایک صورت ہے۔ اس کا ہدف کسی شے کے جوہر خالص کو ہم تک پہنچانا نہیں ہے، جیسا کہ اخباری اطلاع یا رپورٹ کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ اس شے کو کہانی کار کی زندگی میں ڈبو دینے کا نام ہے تاکہ اسے پھر سے نمودار کیا جا سکے۔"

یہیں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے زمانے کا بیشتر افسانہ کیوں اس قدر اُتھلا ہے۔ اس میں نہ کوئی چیز ڈوبنے پاتی ہے، نہ خود کہانی کار کو جو اپنی انا کا پرچم اٹھائے پھرتا ہے، کسی چیز میں ڈوبنے کی ہمت پڑتی ہے کہ مبادا پھر سے نمودار ہی نہ ہو سکے۔ یوں بھی اکثر و بیشتر جدید افسانہ سطحی اور نمائشی دانش وری کی دین ہے۔ نہ محنت کا ماحول مصور کرتا ہے اور نہ خود محنت سے جنم لیتا ہے۔

انانیت کے الزام پر کئی ایک لکھنے والے منٹو کی طرف اشارہ کریں گے جو مشہور ہے کہ بڑا خود پسند تھا۔ لیکن محمد حسن عسکری کے خیال میں منٹو کی مبینہ انانیت ایک نقاب تھی جو اس نے اپنی سچائی کی حفاظت کے لیے اوڑھ رکھی تھی، ورنہ اس کی فنی شخصیت کی گہرائی میں ایک سچے فن کار کی نفی خودی کارفرما تھی۔ عسکری کے نزدیک:

"انانیت کی مدد سے آدمی، تنقید یا بری بھلی نظمیں لکھ لے تو لکھ لے۔ افسانہ لکھنے کے لیے تو سڑک کے روڑوں تک کو اپنے اوپر فوقیت دینی پڑتی ہے"

منٹو کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنی انا کو زیادہ سے زیادہ دبا کر رکھا ہے ان میں منشایاد کا شمار بھی لازم ہے۔ اس نے بہت سی چیزوں کو اپنی ذات میں جذب ہونے دیا ہے اور ان سے زیادہ رنگارنگ اشیا میں اور اشخاص میں خود کو جذب کیا ہے۔ اسے بقولِ خود "لت پڑ گئی ہے" کہ اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھے بلکہ ان کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ بقول انتظار حسین اس کا جی چاہے تو بکرے کی کھال میں بھی چھپ جائے۔ جیسا کہ اس نے "ڈنگر بولی" میں کیا ہے۔

یہ صلاحیت اُس قوتِ مشاہدہ سے مختلف ہے جس پر ہمارے مکتبی ناقدین افسانہ اصرار کیا کرتے تھے۔ مشاہدہ تو تجربۂ حیات کی پہلی منزل ہے جہاں بہت سے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند افسانہ نگار کسی زمانے میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ منشایاد کا کہنا ہے:

"میں نے سینکڑوں روپ بدلے۔ ان گنت قالبوں میں ڈھلا، بہت سی ایسی زندگیوں کے تجربات حاصل ہوئے جو میں نے خود تو نہیں گزاری تھیں لیکن ایسے لگتا تھا جیسے میں نے گزاری ہیں۔"

ایسے لگتا تھا اور ایسے لگتا ہے، اسی کا دوسرا نام کہانی ہے اور منشایاد کے چار مجموعوں میں شامل اور اخباروں رسالوں میں بکھری ہوئی سو ایک کہانیوں میں جو پچھلے تیس ایک برسوں کے دوران لکھی گئیں، کم ہی کوئی ہوگی جو اس نے خود پر گزری ہوئی محسوس نہ کی ہے۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو خود اس کی گرفت میں نہیں آ سکیں اور ایسی بھی جو ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں، لیکن ایسی کہانی بہت کم ہوگی جو اس نے محض اس لیے لکھی ہو کہ آج کل اس قسم کی کہانیوں کا فیشن چل نکلا ہے۔

افسانے کے فن پر اس کے جو بھی شعوری خیالات ہوں یا دوسروں کے

افسانوں پر اس نے جتنی بھی وسیع القلبی یا تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہو، خود اس کے اپنے افسانوں کو دیکھئے تو 'بند مٹھی میں جگنو' سے لے کر 'وقت سمندر' تک بلکہ تازہ ترین افسانوں میں بھی بہت سے رجحانات یکے بعد دیگرے یا بیک وقت موجود یا باہم دست و گریباں ملیں گے۔ سب سے غالب رجحانات میں ایک تو اس کا دیہاتی پن ہے اور دوسرا اس کی روشن خیالی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں خصوصیات ایک دوسری کی ضد ہیں لیکن ان کے باہمی تصادم کے بغیر اس کی بہترین کہانیوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ابتدائی کہانیوں میں موضوع اور تکنیک دونوں کے اعتبار سے وہ انداز نمایاں ہے جسے احمد ندیم قاسمی کے یہاں دیکھ کر منٹو نے کہا تھا کہ آپ نہایت درجہ سادہ لوح ہیں اور ہڈیوں کے گودے تک جذباتی۔ منٹو کو یہ تو تسلیم تھا کہ وہ خود بھی بہت سینٹی مینٹل ہے لیکن وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ "ہمیں افسانوں میں سینٹی مینٹ زیادہ نہیں بھرنا چاہیے۔" اس نے مطالعہ کیا تھا کہ ندیم کے یہاں سینٹی مینٹ اس کی بیخ تک پہنچ چکا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ "اسے دبانے کی کوشش کیجیے۔"

اب یہ معلوم نہیں کہ منشایاد نے اپنی پہلی کتاب (مطبوعہ 1975) کے افسانے لکھنے سے پہلے یا ان کے دوران منٹو کے خطوط ندیم کے نام جو 1962 میں شائع ہو چکے تھے، پڑھے تھے یا نہیں، لیکن صرف پڑھنے سے کیا ہوتا ہے وہ تو خود ندیم صاحب نے بھی بیس برس پہلے پڑھے ہوں گے۔ تاہم 'بند مٹھی میں جگنو' جن دو حصوں پر مشتمل ہے، ان کے درمیان بقول مرزا حامد بیگ کوئی نہ کوئی شعوری غیر شعوری تبدیلی ضرور آئی تھی جس کی بنا پر بہت سے ابتدائی افسانے رسائل میں چھپنے کے باوجود کتاب میں شامل نہ ہو سکے بلکہ جو چند ایک نمونہ کلام کے طور پر درج کتاب ہوئے بھی تو ان کو پہلے حصے میں جگہ ملی۔ آج ان میں سے شاید ہی کوئی افسانہ سنجیدہ توجہ کے قابل نظر آئے۔ خصوصاً اس معیار کو دیکھتے ہوئے جو منشا کے یہاں بعد میں نظر آتا ہے۔

پھر بھی چند ایک کہانیاں ایسی ضرور ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے آنے والی پختگی کا ایک نہ ایک عنصر نمایاں کرتی ہیں۔ سب سے پہلی کہانی 'دل کا بوجھ' تعمیرِ مکان کے دوران رکھے گئے چترالی چوکیدار گلباز خاں پر فوکس کرتی ہے اور گول مال کے ماحول میں ایک ایسے دیانت دار محنت کش کی تصویر کشی جو ایک چوکیدار کی تنخواہ میں مزید دو عدد مزدوروں کا کام بھی نمٹا دیتا ہے۔۔ جذباتی انجام سے ٹیگور کا 'کابلی والا' یاد آتا ہے جس کے نمونے پر ہمارے یہاں بیسیوں کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن وہ کاریگرانہ ماحول اور تعمیراتی سامان خرد برد کرنے کی تفصیل بیان کرنے کا لہجہ، منشا کا اپنا ماحول اور اپنا لہجہ محسوس ہوتا ہے۔ جذباتیت سے کہانی اشک آلود تو ہو جاتی ہے لیکن بنیادی کردار کو اخلاقی سطح پر ایک فوق البشر بنا کے رکھ دیتی ہے۔ تاہم اتنا غنیمت ہے کہ اس میں پرانے ترقی پسند افسانے کی طرح محنت کشوں کی عظمتِ کردار پر کوئی خطبہ نہیں دیا گیا، نہ ہر مزدور کو فرشتہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

'خواہش کا اندھا کنواں' ایک ایسا ابتدائی افسانہ ہے جس میں منشا کی نفی خودی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک بازاری کتے کی کہانی میں اس نے اتنی دردمندی بھرنے کی کوشش کر دی ہے کہ بے چارہ کتا بھی اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اور بابا آخرالیسوپ (Aesop) کے لالچی کتے کی طرح اسے بھی ایک ناسحانہ انجام کا ہدف بننا پڑتا ہے۔

پالتو اور بازاری کتوں کا مکالمہ طبقاتی امتیاز پر زور دیتا ہے لیکن جب وہ تازہ روٹیوں کی چنگیر اٹھائے ہوئے ایک بڈھے آدمی کو گراتا ہے اور "اتنی ساری روٹیاں جو اس نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں" کھانے میں مصروف ہو جاتا ہے تو اسے اپنے آپ کی سدھ نہیں رہتی۔ عین اس وقت کمیٹی کا ٹرک راولپنڈی کے وہ تمام محلے چھوڑ کر جن سے یہ بھوکا کتا گزر کر آیا تھا اور جہاں بہت سے خونخوار کتے کھلے پھرتے ہیں، یہاں کیسے پہنچ گیا؟ اس قسم کی علت و معلول سے کہانی کار کو کوئی سروکار نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ آوارہ کتے کی آوارگی کا پیچھا کرتے کرتے افسانہ نگار بھی تھک گیا ہے اور اسے "خواہش کے اندھے کنویں" میں جھونک دینے کے سوا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب کیا کرے۔

'ماس اور مٹی' سے جو پہلی کتاب کے پانچ برس بعد 1980 میں شائع ہوئی، منشایاد کی خود شعوری اور ذاتی شناخت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس نے اکادکا افسانے ایسے ضرور لکھے ہیں جو پختگی اور معیار کے لحاظ سے فزوں تر ہوں، لیکن اس مرحلے پر یوں لگتا ہے جیسے اس کی آواز دور کا سفر طے کر کے آرہی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آس پاس کو بھی پورے تناظر میں محسوس کر رہی ہو۔

راستے بند ہیں، بانجھ ہوا میں سانس، اندھیرے سے اندھیرے تک، رکی ہوئی آوازیں۔ محض عنوانات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اجتماعی حساسیت سے واسطہ ہے۔ اب خود افسانہ نگار ہی چیزوں میں جذب نہیں ہو رہا، اس کے کردار بھی اشیا کے ساتھ ایک باطنی رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔

بعض اوقات یہ رابطہ اتنی شدت سے قائم ہوتا ہے کہ سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں 'راستے بند ہیں' کا مرکزی کردار جس کا راوی کی طرح کوئی نام نہیں، اتنا ہی بھوکا ہے جتنا کہ 'خواہش کے اندھے کنویں' کا بھکاری کتا۔ لیکن وہ میلے

میں آیا ہوا ہے اور اس طرح کہ ''کھانا کھاتے ہوئے آدمی کے سامنے اکڑوں بیٹھے کتے کی آنکھ میں بھی اتنا ندیدہ پن نہیں ہوتا جتنا حلوا پوری کھاتے اور فالودہ پیتے لوگوں کو دیکھ کر اس کی نگاہوں سے جھلکنے لگتا ہے۔''

قریب ہے کہ وہ میلے پر آئے ہوئے جان پہچان کے لوگوں میں شامل ہو کر یا تو نمبر دار کے بیٹے کی چلمیں بھرے یا دلالی کرے یا پھر مہرو سانسی کی طرح لذیذ چیزوں کی چوری پر کمر باندھ لے ''اس نے کئی بار ارادہ کیا ہے کہ کسی حلوائی کی دکان یا کسی ہوٹل میں گھس کر جی بھر کے کھائے اور خود کو دکان دار یا پولیس کے حوالے کر دے۔''

لیکن راوی اس کو نفسیاتی خود فریبی کا طریقہ سکھاتا ہے اور وہ جو کچھ کسی کو کھاتے پیتے دیکھتا ہے، محض دیکھنے سے وہی چیز کھانے پینے کی لذت محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ مشاہدے کو واردات بنانے کا یہ عمل افسانہ نگار نے بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ لیکن جب اس خود فریب کے سامنے ایک آدمی ٹرک کے نیچے آ کر کچلا جاتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے یہ ٹرک خود اس کے اوپر سے گزر رہا ہے اور یہ پیش آمد اسے اتنی شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ دھڑام سے گر پڑتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

بات انہونی ہے لیکن افسانہ نگار چار ساڑھے چار صفحوں میں اس میلو ڈرامائی انجام کو نفسیاتی سطح پر قابلِ فہم بنا دیتا ہے۔ تاہم قابلِ فہم بننے کے باوجود، کیا اسے قابلِ قبول بھی کہا جا سکتا ہے؟ شاید نہیں۔ لیکن نکتے کی بات یہ ہے کہ ایک آدمی جس کی جیب میں کوڑی نہ ہو اور وہ زندگی کے میلے کی لذتوں سے اپنا حق مانگتا ہو، پھر اسے چور یا باغی بننے سے روکا جائے تو نفسیاتی بریک ڈاؤن سے وہ کیسے محفوظ رہے؟

پھر بھی 'کچی پکی قبروں' کا گورکن لڑکا اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی خود فریبی میں ایک پہلو کاریگری کا بھی شامل ہو گیا ہے۔

'پانی میں گھرا ہوا پانی' کا دتا کمہار جانتا ہے کہ زیناں جیسی آگ بگولہ عورت، گھنگھوڑوں پر زندہ نہیں رہ سکتی لیکن جب وہ خود کسی طرح ایک ''باوا'' بنا لیتی ہے تو اسے بھی شرینہ کے پودے کی طرح اپنی تخلیق سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر یہ ایک پیچ دار کہانی ہے اور سنگر کے ''گمپل دا فول' کی یاد دلاتی ہے لیکن جہاں سنگر کا 'گمپل (ایک نقاد کے الفاظ میں) 'مایوسی کے اس پار نجات کا امکان' پیدا کر لیتا ہے اور 'مکمل انفعالیت'' میں کے ساتھ لڑھکنا'' سیکھ لیتا ہے، دتا کمہار ابھی اضطراب اور بے چینی کے عالم میں ہے۔ تاہم وہ اپنی دیوتی پر کوئی جارحانہ ردِ عمل بھی نہیں دکھاتا اور حقیقتِ حال معلوم ہونے کے بعد بھی زیناں کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہ جاتا ہے جس کے بعد افسانہ نگار صرف ایک بلیغ جملے کا اضافہ کرتا ہے کہ ''وہ اپنے اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا۔''

البتہ دتے کا یہ کہنا کہ میں پانی میں گھرا ہوا پانی اور زیناں کا یہ جواب کہ میں آگ میں گھری ہوئی آگ ہوں، ایک ایسی زبان ہے جو دتے اور زیناں کی بجائے جدید افسانہ نگاروں بلکہ ٹی وی ڈرامے لکھنے والوں کی مصنوعی شعریت سے خطرناک حد تک مشابہ ہے۔

'ماس اور مٹی' کا نانو سانسی غالباً 'راستے بند ہیں' کا وہی مہرو سانسی ہے جو شہر منتقل ہونے کے بعد اور بھی کاریگر اور دلیر ہو گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی چوریاں، کھانے پینے کی چیزوں سے آگے نہیں بڑھیں۔ پھر بھی اس کا شمار ان بہادروں میں کیسے ہو جنھوں نے شروع کی حمد کے مطابق ''ہر حال میں زندگی کا سفر جاری رکھا۔'' اسی طرح 'رکی ہوئی آوازیں' میں الہامی ترجموں کی زبان لکھنے کا التزام ہے لیکن ڈرانے دھمکانے کے بعد جس طرح اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکالنے کی تبلیغ کی گئی ہے، وہ بھی کشمکش کے تضاد میں آسانی کا راستہ معلوم ہوتی ہے۔

شہری اور دیہی زندگی کا تقابل بہت سی کہانیوں میں پیش ہوا ہے۔ 'باگھ بگھیلی رات' میں ایک روایتی دیہاتی صورت حال کو خواب کی طرح بیان کیا گیا ہے لیکن یہ خواب آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ 'اپنا گھر' میں شہری اور دیہی تجربے کا تصادم، شخصیت کے دولخت ہونے کا عکاس ہے۔ 'گھر سے باہر ایک دن' جدید شہری زندگی کی بے چارگی کا نقشہ دکھاتا ہے لیکن آخری فقرہ ہجو ملیح کے لہجے میں صبر و رضا کی تلقین کرتا ہے۔ یہی زہر خند افسانے کے اندر بھی ایک حد تک موجود ہے۔ ہجو ملیح کا یہی لہجہ 'اوور ٹائم' کے آخر میں بھی سنائی دیتا ہے لیکن یہاں منشا کا زہر خند زیادہ ڈرامائی ہے اس لئے کہانی کی بناوٹ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ منشا کا کہنا ہے کہ منٹو کے افسانوں کا (تازیانے جیسا) انجام اسے پسند نہیں، اگرچہ خود اس نے اپنے افسانوں میں اسے خاصی کاریگری سے برتا ہے۔

'(ا+ب)^2' میں اس لہجے کا رخ راوی کی طرف ہے جو درسی کتابوں کی زبان میں اپنی لغزش کو بیان کرتا ہے' پے انگ گیسٹ' کے حمید صاحب جو اپنی بیوی کو لینڈ لیڈی بتاتے ہیں اور بیٹیوں کو غیر کی نظر سے دیکھتے ہیں، ایک استحصال زدہ صاحبِ خانہ ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنی صورت حال کے لئے ذمے دار ہیں اور ایک ایسے بیوروکریٹ جو خود اپنے گھر میں مہمانوں کی طرح رہتا ہے اور اپنے بال بچوں سے بھی اپنائیت محسوس نہیں کرتا۔ کہانی شروع سے آخر تک حمید صاحب کے نقطۂ نظر سے بیان کی گئی ہے لیکن افسانہ نگار کا تحتِ کلام انداز، ان ہی پر ضرب لگاتا ہے۔

'بانجھ ہوا میں سانس' (ہوا سے آکسیجن نکال لی گئی ہے) ایک فینٹسی ہے جس کے بعد لکھنے والا بیدار ہو جاتا ہے اور خواب کی مدد سے گردوپیش کا شعور پیدا کر لیتا ہے۔ کہانی کا یہ سانچہ کہ اس کے بعد آنکھ کھل جاتی ہے، منشا یاد نے متعدد مرتبہ استعمال کیا ہے۔ بہت سی کہانیوں میں اسے لگتا ہے، وہ دیکھتا ہے، کیا دیکھتا ہے اور اس کے بعد ہڑ بڑا کر اٹھنے یا جگائے جانے کا صراحت سے ذکر ہوتا ہے۔ اس سے خواب اور بیداری میں ایک میکانگی سا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید ان کہانیوں کا شمار منشایاد کی ان تحریروں میں ہو جن میں اس نے بقول خود "قاری کو بہلا پھسلا کر اپنی کہانی پڑھوانے کا اہتمام" کیا ہے۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ واضح اشاروں کے بغیر افسانہ ذرا مبہم ہو جاتا ہے لیکن یہ وہ ابہام ہے جس کے بغیر فن کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ اور جو سہولت فہم سے زیادہ ضروری ہے۔

'زمستانی کہانیوں' کی خالق دخنین کے نزدیک "افسانے کی یہ کوئی برائی نہیں کہ اس کا زیادہ سے زیادہ آدھا حصہ سمجھ میں آتا ہے" مگر منشایاد اس مرحلے پر کوئی ایسا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں جو اسے اپنے پڑھنے والوں سے دور کردے۔

منشایاد اب بھی خود فریبی اور خوش گمانی کے افسانے لکھتا ہے اور ایسے خوف ناک خواب پارے بھی جن کے بعد دفعتہً نیند اُچٹ جائے لیکن اب ان کا طلسم ٹوٹتا ہے تو پھر سے جڑ بھی جاتا ہے جیسے 'دھوپ، دھوپ، دھوپ' اور 'بوکا' نام کے افسانوں میں۔ غالبًا ایسی تحریروں کو دیکھ کر امرتا پریتم نے لکھا تھا کہ (رات کو پڑھنے کی بجائے) یہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی لالی کے وقت پڑھی جانے والی کہانیاں ہیں۔ جاگتے ہوئے باشعور ذہن کی پیداوار۔

'خلا اندر خلا' کا آخری افسانہ 'بیک مرر' بھی خصوصی مطالعے کا متقاضی ہے جو ٹریفک کے ایک حادثے پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس افسانے کا پنجابی روپ جو 'کال بلیندی اے' کے عنوان سے 'لہراں' کے 'منشایاد نمبر' میں شامل ہے، اپنے اردو متن کی نسبت اور بھی زیادہ کاریگرانہ ہے۔ تاردا اور ہوتی تو، اردو افسانے میں بھی، شیطان اور تباہی کے لوک ناموں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں لیکن کال جو اردو میں کل بن گیا تھا، لوک داروں کی وہ فضا پیدا نہیں کرتا جو پنجابی افسانے کو اساطیری جہت بخشتا ہے۔ اسی طرح پنجابی افسانے کا پہلا پیرا جو رسالے کے آدھے صفحے پر محیط ہے اور تکنیکی ندرت کو نمایاں کرتا ہے اور افسانے کے آغاز میں اس کی ایک چھوٹی سی تلخیص ملتی ہے۔

حیرت ہے کہ ایک ہی دور میں کوئی افسانہ نگار اس قدر متنوع قسم کی کہانیاں لکھے یا لکھ سکے۔ آئرستانی افسانہ نگار اور ناقد شان او فاولین نے ڈی ایچ لارنس کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اچھے افسانہ نگاروں کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان کے کوئی سے دو اچھے افسانوں کو آپ ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر دیکھیں تو پتہ نہیں چلتا کہ ایک ہی لکھنے والے نے ان دونوں کو کیسے لکھ لیا۔ ہمارے دور میں اس تنقیدی تحیر کا اطلاق منشایاد سے زیادہ کسی اور افسانہ نگار پر مشکل ہوگا۔

تازہ ترین افسانوں میں جہنم سے فرار، چراغ، سلاٹر ہاؤس اور کیچز (چیزیں اپنے تعلق سے پہچانی جاتی ہیں) کو پڑھتے ہوئے منشایاد کے تکنیکی اور موضوعاتی تنوع پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ 'چراغ' میں ایک پختہ عمر کے راوی کو اپنے بچپن کی روشن خیالی پر جو ایک بزرگ سے برسوں کے بعد خراج تحسین ملتا ہے وہ آگے کی منزلوں کو روشن کر جاتا ہے۔ 'سلاٹر ہاؤس' ایک افسانے سے زیادہ احتجاج ہے۔ جدید زندگی کے خطرات کے خلاف، لیکن یہاں بھی اہم بات یہ ہے کہ دیہات کو پناہ گاہ بنا کر پیش نہیں کیا گیا بلکہ وہاں کے خطرات سے آگہی تو اور بھی شدت سے محسوس کی گئی ہے۔

منشایاد نے اپنے تمام دیہاتی پن اور پنجابیت کے باوجود نہ تو اپنے لئے کوئی جذباتی جنت تعمیر کی ہے اور نہ زمین اور مٹی کو اپنے لئے بت بنایا ہے۔ اس نے اپنی افسانوی زبان میں کثرت سے دیہاتی اور پنجابی الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن اوچھی سطح کے کالم نگاروں کی طرح اس نے یہ کام ہنسانے کی کوشش میں نہیں کیا، چنانچہ اس کے برتے ہوئے پنجابی الفاظ نہ صرف ماحول کی فضا بندی کے لے ناگزیر محسوس ہوتے ہیں اور نہ صرف واقعاتی مکالمے کے لئے لازم ہیں بلکہ افسانے کی ہیبت اور المیہ کی شدت میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ شاید اس لئے منشایاد، پنجاب سے باہر بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا پنجاب میں۔

منشایاد کی ہردل عزیزی بلکہ اس کی کاریگری میں بھی یہ خطرہ موجود ہے کہ کہیں وہ اپنے دیہاتی پنجابی امیج کا اسیر نہ ہو کر رہ جائے۔ مرحوم شاہد احمد دہلوی تو منٹو سے بھی دیہات کا افسانہ طلب کیا کرتے تھے۔ اب تک منشایاد نے دیہات کی غربت اور محرومی، قتل وغارت اور جہالت، رواج اور تعصب پر کھل کر تنقید کی ہے اور پنجاب کا ایک ایسا نقشہ کھینچا ہے جو مقامی استعمار اور استحصال کے جبر تلے انسانی معیار سے بہت نچلی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ بھی ذرائع ابلاغ پر متمکن مبلغین کی طرح، زمین اور مٹی کو بت بنالے اور طبقاتی معاشرے کو مستحکم کرنے پر تل جائے تو یہ جدید افسانے ہی کا نہیں، روشن خیالی کا بھی المیہ ہوگا۔

کاریگر اسی وقت تک کاریگر رہتا ہے جب تک کہ وہ محنت کشی کے ماحول سے منسلک ہو۔

OO

نقد و نظر

منٹو، جنس اور منشا یاد

محمد حمید شاہد

منشا یاد کے افسانوں میں جنس اور عورت کو تلاش کرتے ہوئے مجھے عین آغاز میں ہی منٹو یاد آ گیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ جنس منٹو کا مرغوب موضوع تھا، آپ ایک لمحے کا توقف کیے بغیر، ترت مان لیں گے۔ اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ منٹو کا نام آتے ہی اس کے، بہت سارے جنسی چٹخارہ چھوڑتے کردار سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی جنس، فحاشی، لذت اور سنسنی خیزی کو منٹو سے متھ بنا کر یوں نتھی کر دیا گیا ہے کہ ادھر اس کا نام سوچا ادھر لذت کے چھینٹے اڑے، کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جنس سے باہر رہ جانے والے منٹو کو دریافت نہ کر کے ہم زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ تاہم اس کا کیا کیجئے کہ خود منٹو نے ہمیں کسی اور طرف ملتفت نہیں ہونے دیا۔ مثلاً اس کا فرائیڈن تھیوری پر یوں ایمان لانا: "اور سچ پوچھیے تو فی زمانہ مرد اور عورت کا پریم ہوتا ہی جنسی ہے" ہمیں کہیں اور کیسے جانے دے گا۔

منٹو کے ہاں یہ جنس مرد سے کہیں زیادہ عورت کے راستے سے آتی ہے جنس کی نمائندہ عورتیں ہی اس کی پسندیدہ عورتیں ہیں۔ اس کہنا ہے کہ چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے اس کے افسانوں کی عورت نہیں ہو سکتی۔ خود منٹو کے الفاظ میں:

"میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آیا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اچٹتی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں۔ اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں، ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔"

منٹو پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں لکھنا اس لیے فضول گردانتا تھا کہ بقول اس کے اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔ مگر لطف دیکھیے کہ منشا یاد کو وہ عورتیں قطعاً نہیں بھاتیں جو منٹو کو مرغوب تھیں۔ وہ پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کی دنیا میں رہتا ہے اور اس کی پروا کیے بغیر کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، ان کے خدوخال یوں اجالتا ہے کہ وہ ہر بار نئی جمالیاتی جھلک دے جاتی ہیں۔ پھر یوں بھی ہے کہ منشا کو عورت اور جنس پر براہ راست لکھتے ہوئے بہت لاج آتی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس گون کا آدمی ہے ہی نہیں کہ منہ اٹھائے اور کوٹھے کی سیڑھیاں پھلانگتا طوائف کے گھٹنوں سے گھٹنا جوڑ کر بیٹھ جائے۔ وہ ایسا کیوں نہیں ہے؟ آپ جاننا چاہیں تو میں آپ کو اس کا بچپن یاد دلاتا ہوں۔ خود ہی قیافہ لگائیں کہ جس کی ماں بیٹے کو ننگے سر ماموں کے سامنے نہ جانے دیتی ہو اور جس کی سینما دیکھنے پر پیشی ہو جاتی ہو وہ بڑا ہو کر بے ایمان بنے گا بھی تو کتنا؟

اچھا صاحب، قرینے سے چلتے ہیں۔ جس ترتیب سے منشا یاد کو دیکھا جا سکتا ہے، ذرا اس کی ترتیب بناتے ہیں۔ یہ وسط سے اسے دیکھنا، یا آدھے دھڑ سے اسے جانچنا مجھے خود بھی کھلنے لگا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ:

O جس دور میں منشا یاد نے شناخت پائی وہ دور علامت نگاری اور تجرید کے نرغے میں تھا۔ ایسا زمانہ کہ منٹو اور روایت سے جڑی ہوئی کہانی، دونوں کو بہ سہولت گالی دی جا سکتی تھی، اور منہ بھر کر گالی دی جا رہی تھی۔ ایسے میں منشا یاد نے بھی علامتی کہانیاں لکھیں، ہوا جو چل نکلی تھی... اور اسی لہر میں قلم سے اس قبیل کی کئی باکمال کہانیاں بھی نکل گئیں... مگر لطف یہ ہے کہ شناخت بیانیہ کہانی ہی سے بنی۔

O منشا یاد کا دوسرا حوالہ اسی سے مخصوص دیہات نگاری بنتا ہے۔ وسطی پنجاب والا دیہات۔

O منشا کے افسانوں کی تیسری شناخت طبقاتی تفاوت اور تضاد پر اس کا شدید ردعمل بنتا ہے۔ اس موضوع پر لکھتے ہوئے وہ معاشرے کے پسے ہوئے کرداروں کو اٹھاتا ہے اور انہیں مراعات یافتہ طبقے کے مقابل لا کر یوں

نمایاں کرتا ہے کہ قاری خود بخود کمہاروں، فقیروں، ترکھانوں، تیلیوں، موچیوں، اور زمین پر رزق کے لیے رینگنے والے کیڑوں جیسے انسانوں کے ساتھ جا کھڑا ہوتا ہے اور انہیں باوقار بنا دیتا ہے۔

O منشایاد کی کہانیوں کی چوتھی شناخت اس کا مضبوط اور تخلیقی رس سے بھرا ہوا بیانیہ بنتا ہے، شگفتگی اور دیہی دانش کا امتزاج اس کے بیانیے کو نکھارتا ہے اور اس کا اپنا خلوص پوری کہانی کے بیان کو اتنا خالص اور پاکیزہ بنا دیتا ہے کہ ہر جملہ قاری کے قلب تک رسائی پالیتا ہے۔

O عصری آگہی اور سیاسی شعور منشایاد کا پانچواں اختصاص ہے، تاریخ کیسے مسخ ہوتی ہے اور عام آدمی سیاست کے ہاتھوں کیسے مار کھاتا ہے، جمہوری آوازیں کیسے دبا دی جاتی ہیں اور سامراج کے داروغے کیسے قوموں کو تذلیل سے دوچار کرتے ہیں اس کی کہانیوں کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔

صاحب، اگر میں یوں ہی گنواتا گیا تو عورت اور جنس کا نمبر آئے گا ہی نہیں یا بہت بعد میں آئے گا...مگر میرے اندر کا ٹیڑھ دیکھیے کہ اوپر والی ترتیب سے آگے بڑھ ہی نہیں پا رہا ہوں اور دل ہے کہ منشا کی معدودے چند عورتوں اور ان سے تشکیل پانے والی جنسی حسیت ہی کی طرف مچلنے لگا ہے۔

ہم طے کر چکے کہ پورے سماج کے اعصاب پر بری طرح سوار عورت اور سارے بدن پر حکومت کرنے والی اول اول نمبر کی جنس منشایاد کے مہذب معاشرے میں وکٹری اسٹینڈ پر نہیں ہے، وہ جنس جو اچھلتی کودتی ہے، اور اس عورت کے بدن سے پھوٹتی ہے جسے عریاں ہونے میں باک نہیں ہے، قوسوں کمانوں کی نمائش سے اشتہا پیدا کرنا جسے مرغوب ہے، اس سے منشایاد کی کہانی کی کوئی نسبت نہیں ہے۔ اب آپ پوچھ سکتے ہیں تو باقی کون سی جنس رہ جاتی ہے؟ اور میرا کہنا یہ ہے کہ وہ جو چپکے چپکے میٹھے سروں بدن بیچ بہتی ہے اور دیمک کی طرح اندر ہی اندر سے چاٹتی رہتی ہے، لباس میں چھپی ہوئی اور تہذیب کی خوش بو میں بسی ہوئی۔ ہاں، یہی تو منشایاد کے ہاں ہے۔ چھپی ہوئی یہ جنس اور مستور عورتیں جہاں جہاں اس کی کہانی کے باقی حوالوں کے اندر سے جھلک دیتی ہیں، ہماری اپنی زندگی کی تفسیر بن جاتی ہیں۔

عشق محبت اور جنس، تینوں کو ایک ہی معنی کے سلیتے (ریشوں سے بٹے ہوئے بال) میں نہیں سمیٹا جا سکتا۔ تینوں کا ذائقہ جدا ہے...منشایاد کے ہاں جنس کہیں محبت کے زیر اثر رہتی ہے اور کہیں عشق بن کر بھڑک اٹھتی ہے تاہم ایسا بہت کم کم ہوتا ہے کہ وہ فقط لذت بن گئی ہو۔ اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ محض جنسی کجی کو موضوع نہیں بناتا۔ اسے سماجی اور تہذیبی مسئلہ کے طور پر کہانی کے وسط میں یوں نہاں کرتا ہے جیسے بدن کے وسط میں اسے قدرت نے رکھ دیا ہے۔

بات وسط تک پہنچ گئی ہے تو لازم ہو گیا ہے کہ منشایاد کی کہانیوں اور چند نسوانی کرداروں کو سامنے رکھ کر بات کی جائے۔

اس موضوع کی ایک بہترین مثال اس کا افسانہ 'بند مٹھی میں جگنو' بنتا ہے۔ یہ افسانہ جہاں ہماری جمالیات کو تسکین پہنچاتا ہے، وہیں بہت معنی خیز بھی ہے۔ تاہم میں آغاز ہی میں آپ کو چوکنا کر دوں کہ اس کہانی کو سیدھے سجاؤ سمجھنے کی غلطی ہرگز ہرگز نہ کیجیے گا کہ پہلے اس تنہائی اور یکسانیت کو سمجھا جانا بہت ضروری ہے جو کالج کی ایک لڑکی کے اندر جنسی گھٹن کا سبب بن گئی تھی۔ افسانے کے اندر اس فضا بندی کا فن کارانہ اہتمام ملتا ہے:

''وہ کتابوں اور رسالوں سے اکتا گئی تھی...''

''تھوڑی دیر پہلے روٹی لے کر کھیتوں کو جاتے وقت، پھوپھی اس پر تنہائی کا ٹوکرا رکھ گئی تھی''

''تنہائی کے ٹوکرے کے نیچے پڑے پڑے اسے بدبو کے بھبوکوں نے گھیر لیا تھا...''

ان جملوں میں تنہا اور اکتائی ہوئی لڑکی کا تصور تو ابھرتا ہے مگر یہ تنہائی اس کے وجود کے اندر اتری ہوئی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ منشایاد جیسا افسانہ نگار اتنے پر اکتفا کیسے کر سکتا تھا لہذا آگے چل کر وہ ان محرکات کو سامنے لاتا ہے جنھوں نے لڑکی کا باطن تشکیل دیا تھا:

• ''بچپن میں اس کا خیال تھا کہ آسمان پر ہزاروں لاکھوں سورج ہیں اور ہر روز نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک یہی سمجھتی رہی کہ ہر شام ایک سورج بجھ جاتا ہے اور اگلی صبح ویسا ہی یا موسم کے لحاظ سے چھوٹا بڑا سورج طلوع ہو جاتا ہے۔''

• ''مگر اب اسے پتہ تھا کہ ایک ہی پرانا سورج اور ایک ہی تھکا ہارا چاند ہر روز استعمال ہوتے ہیں پرانی چیزوں سے اس کا جی اوبھ گیا تھا۔''

• ''تازگی کا عالم گیر قحط پڑا ہوا تھا۔ ہر صبح بوسیدگی کی دبلی گائیں تازگی کی فربہ گایوں کو ہڑپ کر جاتی تھیں۔''

• ''تازگی کو سورج کی شعاؤں سے بچا کر فریج میں کئی کئی دن تک رکھا جاتا تھا۔ تازگی آٹھ آٹھ دن کی مری ہوئی مچھلیوں کی صورت بکتی تھی۔''

• ''جسموں کی بوسیدگی کو ڈھانپنے کے لیے نت نئے فیشن ہوتے تھے اور آؤٹ آف ڈیٹ نظریات پر لفظوں کا ملمع چڑھایا جاتا تھا۔''

• ''ٹیلی ویژن اور فلموں کی نقلی لڑائیاں، سنے سنائے لطیفوں کی طرح بور لگتی تھی۔''

آپ نے دیکھا کہ ایک اکتائی ہوئی لڑکی ایک مختلف منظرنامے میں

اپنی مکمل نفسیات کے ساتھ اس تجربے سے گزرنے کے لیے بالکل تیار ہو گئی ہے جس سے افسانہ نگار نے اسے گزارنا ہے۔ یہی پوری طرح اندر سے اکتائی ہوئی لڑکی آخری سیڑھی پر بیٹھ جاتی ہے لمبا سانس لیتی ہے اور نظارہ کرتی ہے۔ اس کے سامنے لڑنے والی بھی عورتیں ہیں۔ یہ منشایاد کی عورت کا ایک اور روپ ہے مگر ہمیں سیڑھی پر بیٹھی لڑکی کی بات کو آگے بڑھانا ہے جس کے اندر ابھی تک جنس کے جرثومے نے آنکھ نہیں کھولی ہے۔ لڑنے والی عورتوں کے چہروں پر آگ کے شعلے تو تھے، مگر وہ نفرت نہیں تھی۔ ان کی آوازوں میں بجلی کی کڑک تھی مگر سانسوں میں سانپوں کی پھنکار نہیں تھی۔ شریفاں اور نوراں جنہیں وہ پہلے سے جانتی تھی اس نظارے میں پچھے کٹنیاں بن کر سامنے آئی تھیں۔

یہیں کچھ آگے چل کر منشایاد نے اکتائی ہوئی لڑکی کے لئے چار الگ الگ کیفیات درج کر کے آگے سوالیہ نشان ڈال دیئے ہیں۔

''خواب؟ معدے کی گرانی؟ واہمے؟ لاشعور میں چھپی ہوئی خواہشات؟''

اور اس کے بعد اس نے لکھا ہے کہ:

• ''ایک بار اس نے دیکھا وہ چائے بناتے بناتے خود کیتلی میں بند ہو گئی ہے، وہ چیختی چلاتی ہے مگر کوئی ڈھکنا نہیں اٹھاتا یہاں تک کہ اس کا دم گھٹ جاتا اور وہ مر جاتی ہے۔''

• ''بھرے پرے گھر میں بھی اس پر اداسی اور تنہائی کے تمبو ہر وقت تنے رہتے۔ کبھی کبھی وہ اپنے جسم کی ان پڑھی کتاب کھول کر خود ہی تصویریں دیکھنے بیٹھ جاتی، پھر میلی ہونے کے ڈر سے بند کر کے ایک طرف رکھ دیتی''

• ''اسے ہر چیز باسی محسوس ہونے لگتی۔ اسے اپنا جسم، جس پر اسے خود سونے کا پانی چڑھا ہوا لگتا تھا، سوکھا چمڑا نظر آنے لگتا۔ پسینے سے مردہ مچھلیوں کی بدبو آتی اور کتاب یا رسالہ کھول کر بیٹھتی تو جگہ جگہ مری ہوئی مکھیاں چپکی ہوئی دکھائی دیتیں۔ بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں سوچ کی مکروہ چمگادڑ چکر لگانے لگتی اور اسے ہر چیز سے گھن آتی۔ موسیقی مردہ کوے کی لاش پر سینکڑوں کوؤں کی کائیں کائیں معلوم ہوتی۔ انڈوں سے بساندے اور سالن سے مردہ گوشت کی سڑاند آتی۔ اس کا جی متلانے لگتا اور وہ قے کرنے لگتی۔''

گویا اس جنس کا وہ جرثومہ جس نے ابھی تک آنکھیں کھول کر ادھر ادھر منہ نہیں مارا تھا، اپنی نفسیات میں مکمل تھا۔ مکمل بھی اور کارگزاری دکھانے کے لیے بے کل بھی۔ یہی سبب ہے کہ آخری سیڑھی پر بیٹھی لڑکی کے اندر کھد بد ہونے لگتی ہے۔ پچھے کٹنیاں اپنی جون بدل کر لچیاں اور لفنگیاں ہو جاتی ہیں، آنکھ مٹکا کرنے اور کسی کے ساتھ ادھل جانے والیاں۔ ادھل جانے کا رومان بھی لڑکی پر جست لگا چکا ہے۔

میں نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ لڑنے والیوں کے اب تک دو گروپ بن چکے تھے۔ افسانہ نگار نے انہیں جیٹھانی اور دیورانی گروپ کا نام دے کر دیہی معاشرے کی روایتی مگر پر خلوص لڑائیوں کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ جیٹھانی کو رنج تھا کہ اس کی مرغیاں دیورانی کے گھر انڈے دیتیں اور کڑ کڑ کرنے اپنے گھر آ جاتی تھیں جبکہ دیورانی کا کہنا تھا کہ وہ مرغیاں فاحشہ تھیں۔ اپنے بانجھ پن کو چھپانے کے لیے کڑ کڑانے والیاں اور انڈے دینے کی بجائے مرغوں کی طرح بانگیں دینے والیاں۔

ایک ایسی شہری لڑکی جس کے گھر والے اس کے سامنے محتاط ہو کر بات کرتے رہے ہو۔ اس کے لئے جیٹھانی اور دیورانی گروپ کی اس لڑائی میں لذت بھر گئی تھی۔ کہانی ہمیں بتاتی ہے کہ وہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے کس طرح ادھل جانے کے رومان اور مرغیوں کی فاشی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ لڑائی آگے بڑھی اور پچھلی سات پشتوں کے گڑے مردوں کو اکھاڑا گیا اور ان کے بدنوں کے کفن نوچ لئے گئے تو اس کی آنکھوں کے سامنے قبرستانوں میں راتوں کو الاؤ کے گرد ناچتی عورتیں گھوم گئیں۔ جھجک جھجک کر بدن کی کتاب جھانک لینے والی لڑکی اب ننگی گالیاں اور پوشیدہ انسانی اعضا کے نام سن رہی تھی، اس کے ذہن کے پنجرے میں قید بے شمار چڑیاں یک بارگی پھر سے اڑ گئی تھیں اور اس کے بدن سے چمٹی ہوئی جونکیں ایک ایک کر کے جھڑنے لگی تھیں۔

جنس کے جرثومے کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اب افسانے کی لڑکی اکتائی ہوئی نہ رہی تھی، بالکل بدل گئی تھی، اس کا سارا جسم دہکنے لگا تھا۔ اس کے اندر سے جو نیا سورج اُگنے لگا تھا اُس نے اس کے رخساروں کو اپنی لذیذ گرمی سے دہکا دیا تھا۔ لڑکی پسینے میں بھیگ گئی تھی اور اس کا بدن ہلکا ہو کر زمین سے اوپر ہی اوپر اٹھنے لگا۔ کہانی کے آخر میں غلیظ مکھیاں پھر بھنبھنانے لگتی ہیں، چربی جلنے کی سڑاند ہر طرف پھیل جاتی ہے اور لڑکی قے کر دیتی ہے... کیسے؟ یہاں جنس کا ابال، کڑھی کے ابال کا سا ہو جاتا ہے جو اپنے تئیں الگ سے توجہ چاہتا ہے۔

اب تک منشایاد نے شہری زندگی کے حبس زدہ سکون اور مضمحل کر دینے والی یکسانیت کے مقابلے میں دیہی زندگی کی کشادگی اور بے ساختگی کو رکھ کر جنسی جذبے کی نمود اور بالیدگی کو دکھایا ہے۔ اور صاحب، اگر آپ نے دیہی اور شہری زندگی، دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے تو ماحول، لہجے اور لغت کی تبدیلی کا یہ موتیف آپ کو ایک اور ہی دنیا میں لے جائے گا۔ شہری لڑکی کے لئے جو الفاظ فحش تھے دیہی زندگی میں معمول کا حصہ ہو جانے کی وجہ سے فحش نہیں رہے تھے فقط گالی جیسے ہو گئے تھے۔ وہ جو پوشیدہ اعضائے انسانی کے

نام دوسروں کو برا بھلا کہنے، دبکانے، طعنے دینے یا اکسانے کے لیے سرعام لیے جا رہے تھے وہ شہری لڑکی کے اندر ابال لا رہے تھے مگر دیہی عورتیں انہیں یوں اگل رہی تھیں جیسے ان کے کوئی معنی نہ تھے یا وہ گوشت پوست کے اعضا نہ تھے، پتھر تھے، جن سے مقابل کو زخمی کیا جا سکتا تھا یا پھر لیروں اور ناکیوں کے ایسے کھدو تھے جن کے ذریعے بکنے والیوں کے منہ بند کیے جا سکتے تھے۔ لڑکی کے اندر بپا تبدیلی کو افسانہ نگار نے مثبت دکھایا ہے مگر اس کے بعد یہی دیہی موتیف اس کے جذبوں کو اوندھا کر رکھ دیتا ہے۔ اور یہ تب ہوتا ہے جب بھری عورتوں میں بیچ بچاؤ کی نیت سے آگے آنے والا ستر سال کا ایک باوقار نظر آنے والا شخص ناکام ہو جاتا ہے اور چھوٹے قد کے مریل سے شخص کی فحش گالیاں سن کر سب لڑنے والے ادھر ادھر کھسک جاتے ہیں۔ اب یہ فحش ا لفاظ، جو اس کے اندر ابال پیدا کر رہے تھے، ابکائی پر مجبور کر دیتے ہیں۔

جنس کا ایک اور انداز سے مطالعہ منشایاد کے افسانے 'پانی میں گھرا ہوا پانی' میں ملتا ہے۔ ایک لمحے کو رک کر صرف اس کے نام ہی کا لطف لے لیجئے... پانی میں گھرا ہوا پانی۔ آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ منشا کہانی کا عنوان رکھنے کے حوالے سے 'نام میں کیا رکھا ہے' کو نہیں مانتا اس پر بہت غور کرتا ہے اور سوچ سمجھ کر نام اور عنوان رکھتا ہے۔ ہاں تو ہم منشا کے ہاں عورت اور جنس کو ایک اور پہلو سے دیکھنے چلے تھے اور اس کے لیے میں نے جو افسانہ چنا ہے اس میں شہر اور شہری زندگی کا کوئی حوالہ نہیں ہے اس کی کہانی کے تمام لوازم دیہات ہی کی سوندھی سوندھی مٹی سے پھوٹتے ہیں۔ اوپر جس کہانی کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے اس میں مرد کہانی کے آخر میں آتے ہیں مگر زیر نظر کہانی کے آغاز میں ہی ایک مرد آ گیا ہے... کہانی کی عورت میرے اس جملے کو پڑھ کر شاید کھلکھلا کر ہنس دے یا پھر شاید رو دے اور ممکن ہے کچھ بھی نہ کرے۔ جس ماحول سے اس کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے اس میں ایک عورت آخر کر بھی کیا سکتی ہے؟ کہانی کا مرد تپتی دوپہروں میں چکنی مٹی سے گھوڑے، بیل اور بندر بناتے بناتے ایک روز آدمی بناتا ہے اور اسے سوکھنے کو رکھ دیتا ہے۔

یہاں بات روک کر ذرا اس منظر نامے سے مانوس ہو لیں جس میں مٹی کا باوا بنانے والے مرد کو دکھایا جا رہا ہے۔ ویران اور کلر زدہ زمین، دور دور تک کسی چرند پرند کا نشان تک نہیں، کھڑی دوپہر میں شرینہہ کے درخت جھلس رہے ہیں اور ہر طرف ہو کا عالم ہے۔ اسی منظر نامے میں ایک عورت کے نام کو بھی شامل کر لیجئے جو ابھی تک باوا بنانے والے مرد کے لیے روٹی لے کر نہیں آئی ہے تاہم افسانہ نگار نے اس کی طرف اشارہ کر کے اسے اس ماحول کا حصہ بنا دیا ہے۔ افسانہ نگار نے یہ بھی بتایا ہے کہ مٹی سے گھوڑے بیل بنانے والے کے ذہن میں بہت سی متاثر کرنے والی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں۔ وہ انہیں توڑ کر، جوڑ کر اور مٹی میں گوندھ کر ایک ایسا مرد بنانا چاہتا تھا جو مکمل ہو اور جسے دیکھ کر کم از کم زیناں ضرور دنگ رہ جائے۔

ایک مکمل مرد، کہانی کے مرد یعنی دتے نے بنا لیا اور اسے سوکھنے کے لیے دھوپ میں رکھ کر بہت کچھ سوچ لیا تو زیناں بھی آ گئی۔ دتے کے روٹی کھا چکنے کے بعد اور زیناں کے جانے سے پہلے دونوں کے بیچ کا مکالمہ جس مشاقی سے منشا نے لکھا ہے اس کا لطف غارت کرنے کو تلخیص نہیں کروں گا 'عین مین نقل کر رہا ہوں کہ اس میں سمجھنے کو بہت کچھ ہے:

"زیناں، میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔"

کیا؟"

"بوجھو تو؟"

"مرتبان؟" وہ بولی "تم نے اچھا کیا جب بھی لسی مانگنے جاتی ہوں، چودھرانی مرتبان کا ضرور پوچھتی ہے۔"

"وہ بھی بنا دوں گا لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے۔"

"اچھا اچھا" وہ ہنس پڑی "مجھے پتا چل گیا' جھانواں۔"

وہ ہنس پڑا، کہنے لگا "جھانواں تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیوں کہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے... میں نے باوا بنایا ہے۔"

"باوا؟"

"ہاں باوا، اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے، تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوب صورت چیزیں بھی ہیں یا بنائی جا سکتی ہیں۔"

"اچھا، چلو دکھاؤ" وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھی تھیں مگر یہ جان کر پریشان ہو گیا کہ گھوڑے، بیل، بندر اور دوسری سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر وہاں آدمی نہ تھا۔ آدمی نہ آدم زاد....

باقی کی کہانی میں اسی گم ہو جانے والے آدمی کی ڈھنڈیا رہتی ہے۔ زیناں کو وسوسے اٹھتے ہیں جیسے یہ آدمی بنایا ہی نہیں گیا تھا اور دتے کو یقین ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ زیناں جانتی تھی کہ اس کا دتا کئی پشتوں سے نفرتوں کا ستایا ہوا اور محبتوں کو ترسا ہوا تھا اور جو کچھ اب ہو رہا تھا وہ اسے اسی کا شاخسانہ سمجھ رہی تھی۔ دونوں کا مکالمہ ایک بار پھر:

"میری طرف دیکھو... میں بھی تو ہوں... تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو۔"

"اور تم نے جو اتنے سارے کھنگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا رکھے ہیں؟"

''ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ؟''

''لیکن تمہیں رب نے اتنا حسن دے دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو۔''

یہاں زیناں کے مخمصے کی وجہ سے مکالمہ رُک جاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آرہا کہ وہ دتے کی بات پر روئے یا اترائے۔ اس کے بعد کہانی اپنے عنوان سے جڑ جاتی ہے۔ زیناں کی زبان سے دبیز جملے نکلتے ہیں:

''دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو اور میں آگ میں گھری ہوئی آگ۔ تمہیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے؟ تم آوی میں چیزیں ضرور پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر نہیں دیکھا۔''

اب دتے کی باری ہے زیناں سے حد درجہ مرعوب دتا، جس نے بہت خوب صورت باوا بنایا اور دھوپ میں سوکھنے کو رکھ دیا مگر جسے تپتی دھوپ نگل گئی تھی۔ کہنے لگا:

''میں تو پہلے ہی تمہیں ناری سمجھتا ہوں۔''

زیناں اس کے بعد جو کہنے والی ہے اس مرحلے تک افسانہ نگار کچ کچ چلا ہے، سلیقے سے، جملے جملے کو جوڑتے اور رمز کو معنی میں تحلیل کرتے ہوئے۔ اگلا جملہ اور پھر اس سے اگلے جملے ایسے ہیں کہ دتا ننگا ہو جاتا ہے اور خود زیناں کا کرب چیختا چنگھاڑتا قاری کے اندر گھس بیٹھتا ہے۔ زیناں دتے کے جواب میں کہتی ہے:

''نہ اڑیا... مجھے خاکی ہی رہنے دے... میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض...''

دتا اس جواب پر جھینپتے ہوئے زیناں کو بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار کرنے سے منع کرتا ہے اور اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے کہتا ہے کہ اگر اس کے پاس قارون کا خزانہ ہوتا تو اسے دے کر بھی وہ زیناں کو حاصل کر لیتا۔ مگر وہ دتے کی اس بات کو کوئی وقعت نہیں دیتی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ سفاک جملے بولتی ہے:

''ذکر کیوں نہ کروں... بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی...''

اجازت دیجئے صاحب کہ کہانی کو یہاں روک کر آپ کو یاد دلا دوں کہ دتے نے مٹی کا آدمی بنایا تھا، زیناں کے برابر کا، خوب صورت بلکہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت۔ اور مکمل آدمی۔ جسے دیکھ کر زیناں کو حیران ہونا تھا... مگر یہ آدمی دتے کو قاری کے سامنے عریاں کرنے کے بعد اور زیناں کی نظر میں آنے سے پہلے ہی کھسک گیا تھا۔ اگر کہانی میں دتے کے علاوہ کوئی اور مرد تھا تو وہ رمجا تھا۔ گاؤں بھر کے مردوں میں سے افسانہ نگار نے الگ کر کے اس اکیلے رمجے کو اس لئے کہانی کے اندر گھسنے دیا تھا کہ بس وہی تو تھا جو دتے کو آدمی سمجھتا تھا۔ ہاں یہ بات الگ رہی کہ وہ بھی صرف زیناں کی وجہ سے۔

کہانی آخر تک پہنچتے پہنچتے بہت لطیف ہو جاتی ہے۔ باوا گم ہونے کی وہ خبر جو زیناں نے رمجے کو سنائی تھی پورے گاؤں میں گونج گئی پھر لوگ اسے بھول گئے۔ آوی دہکتی رہی، گھگو گھوڑے بنتے اور پکتے رہے حتیٰ کہ بہت سا وقت گزر گیا اور کہانی کے نیا موڑ کاٹنے کا مرحلہ آ گیا۔

اب فوراً ہی مجھے رخصت ہونا ہے... اپنی بات ادھوری چھوڑ کر... کہ من بہت کچھ کہنے کا تقاضا کئے جاتا ہے، جب کہ بات پہلے ہی بہت طول کھینچ چکی ہے۔ تاہم آخر میں، یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں جب بھی اور جہاں بھی عصمت چغتائی کے 'لحاف' محمد حسن عسکری کے 'پھسلن' سعادت حسن منٹو کے 'ٹھنڈا گوشت' آغا بابر کے 'خالہ تاج' رحمان مذنب کے 'تیکی جان' ممتاز مفتی کے 'جھکی جھکی آنکھیں' قدرت اللہ شہاب کے 'شلوار' سلیم اختر کے 'جلے پاؤں کی بلی' وغیرہ جیسے افسانوں کی بابت سوچتا رہا ہوں، منشایاد کے جنسی حسیت کے یہ افسانے بھی دھپ سے میرے دھیان کی چھت پر اُترتے رہے ہیں۔ یہ افسانے زیر نظر موضوع کے حوالے سے یوں بھی لائق اعتنا ہیں کہ صنفی اشتہا انگیزی میں طاق اور جنسی گمرہی سے لذت گیری کے حصول میں مگن نہ ہوتے ہوئے بھی یہ تخلیقی اور تکنیکی سطح پر اتنے اہم ہو گئے ہیں کہ فکشن کا قاری ان سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

منٹو نے احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں بتایا تھا کہ وہ جب بھی عشق و محبت کی بابت سوچتا تھا تو اسے شہوانیت ہی نظر آتی تھی۔ مگر منشایاد نے عورت کو شہوت سے الگ دیکھا ہے اور الگ کر کے دکھایا بھی ہے۔

یہیں محمد حسن عسکری کی ایک بات بھی یاد کر لیتے ہیں: ''گندی سے گندی بات اچھا ادب بن سکتی ہے مگر جنسیت سے مغلوب ہو کر بڑا ادب پیدا نہیں کیا جا سکتا۔'' میں نہیں جانتا عسکری کی اس بات میں سچ کتنا ہے کہ کہنے والوں نے منٹو کو 'لذت گیر' کہا مگر کون ہے جو اس کی کہانی کو بڑی کہانی نہیں کہے گا۔ یہ کچھ ایسی بات ہے، جس پر سیدھا سادا فتویٰ کام نہیں آتا۔ کہانی کے اپنے بھید ہیں اور ان بھیدوں کے عقدے بہر حال منٹو پر پانی تھے۔ بعد میں جس نے منٹو کا سا وتیرہ اپنایا، وہ منہ کے بل گرا۔ منشایاد کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس باب میں بھی اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ وہ کہیں بھی جنسیت سے مغلوب نہیں ہے... ہاں وہ عسکری والی بات منشایاد کے حوالے سے ضرور بامعنی ہو جاتی ہے اور دل کو لگتی بھی ہے۔ اللہ حافظ، مگر یاد رکھیئے گا کہ یہ موضوع منشایاد کا صرف اور محض ضمنی حوالہ ہے۔ OO

نقد و نظر

ٹانواں ٹانواں تارا پر ایک نظر

اسلم سراج الدین

وہ دسمبر کی ایک دھند آلود سہ پہر تھی جب 'ٹانواں ٹانواں تارا' مجھے ملا اور میں کوئی وقت ضائع کئے بغیر دریا آباد کی دنیا میں چلا گیا اور جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ دنیا مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہے اور میں راوی اور چناب کے دو آبے بیچ بسے موضع چاہ کلاں اور چاہ خورد میں رہنے لگا ہوں۔ ہوتے ہوتے اپنے Immediate گردو پیش فراموش کرنے لگا اور موضع چاہ خورد، اس کی مسجد، مسجد کی ٹھنڈے پانی والی کھوہی اور اس کے نزدیک کا پہاڑی ایسا ٹبا اور گاؤں اور ٹبے کے بیچ کا راج بہا جو آگے جا کر کھیتوں میں گم ہو جاتا ہے... مجھے اپنے ماحول سے زیادہ مانوس نشان معلوم ہونے لگے۔

آپ کو برسوں سے خوب تھکی گزری جگہوں سے نکال کر اپنے ساتھ بہا لے جانا... یہ ہے اعجاز منشایاد کے طاقت ور بیانیے کا جس نے ابتدا سے ہی مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور برتے گئے الفاظ کی قوت کا احساس دلا کر مارکیز کی زندگی کے ایک واقعہ کی یاد دلائی۔ جب وہ بارہ برس کا تھا تو ایک روز سڑک پر چلتے چلتے قریب تھا کہ ایک سائیکل اس پر چڑھ جائے، پاس سے گزرتا ایک پادری چلایا: ''Watch Out'' سائیکل سوار زمین پر گر گیا۔

"Did you see the power of the word?"

گیبرئل گارشیا مارکیز کہتا ہے کہ اس روز اس نے لفظ کی قوت کے بارے میں جان لیا۔

منشایاد کو لفظ کی اس قوت کا ادراک جاں گسل Societal تجربات میں گزر کر ہوا ہے اور اس گزران کے اخیر پر اسے ایک ایسا توانا بیانیہ ارزانی ہوا ہے کہ کوئی بھی بڑا ادیب جس کی خواہش کر سکتا یا خواب دیکھ سکتا ہے۔ ضروری مقامات پر کفایتِ بیان نے بیانیے کو مزید پر قوت بنایا ہے خاص طور پر مرکزی کردار خالد کی صحت عقلی سے فاتر العقلی میں Transformation حیران کن ہے۔ میرے جیسے کم تر صلاحیت کا کوئی بھی آدمی بات کو پھیلا دیتا اور نتیجتاً تاثر اور تاثیر کا ناس مار دیتا۔ ایک کلیدی واقعے کو صرف تین چار صفحات میں سمیٹنا مصنف کی اپنے فن پر گرفت کا پتہ دیتا ہے۔ منشایاد کی تحریر میں ارنسٹ ہیمنگوے کی تحریر کی سادہ دل پذیری اور چارلس ڈکنز کا زندگی سے گہرا ربط جھلکتا ہے۔

کتنے ہی لکھنے والے زندگی سے اپنی نا وابستگی، تجربے کی کوتاہی اور سہل انگاری کو تجریدیت میں چھپاتے ہیں۔ منشایاد کے پاس بیانیے کے وہی روایتی آلات ہیں جو ہر قلم کار کے پاس ہوتے ہیں یعنی حروف اور الفاظ۔ اس کائنات میں عدم کی کوئی مثال ہیں تو وہ حروف اور الفاظ ہیں اور وجود کی بھی کوئی مثال ہیں تو وہ حروف اور الفاظ ہی ہیں۔ یہ لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اپنے ان آلات سے عدم لکھتا ہے کہ وجود۔ حروف اور الفاظ میں ایک ناقابل فہم اسرار اس وقت داخل ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے توسط سے عدم لکھنے والے لیکھک کو بھی معدوم کر دیتے ہیں اور جو اُن سے وجود لکھے اس کے نام روپ کی تجسیم کو صدیوں پر پھیلا دیتے ہیں۔ منشایاد لفظ سے وجود لکھتا ہے۔ اس کا قلم چلتا رہتا ہے۔ زندہ مناظر، لوگ، جگہیں ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ قلم، کینوس، قرطاس، منشا و مانی ایک ہو جاتے ہیں اور تحریر و تصویر کی دوخیالی میں ہمیں Van Gogh کی بات یاد آتی ہے:

It is interesting and as difficult to say a thing well as to paint it. There is the art of lines and colours, but the art of words exists too, and will never be less important.

منشایاد کی ایک بڑی خوبی صورت حال کو Intellectualize کئے بغیر بڑی بات کہنا ہے۔ اس کے اس ناول میں زندگی ہے جیسا کہ وہ بسر ہوتی ہے اور بسر کی جاتی ہے۔ وہ نہیں جو محض سوچی جاتی ہے۔

بڑے ناول کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آپ بھول جائیں کہ یہ کس زبان میں لکھا گیا ہے جیسے One hundred years of solitude پڑھتے ہوئے یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ ہسپانوی

زبان کا ناول ہے۔ 'ٹانواں ٹانواں تارا' کا بیانیہ اس قدر ہموار ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے بمشکل ہی یہ خیال آتا ہے کہ یہ نثری لحاظ سے ایک کم مایہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول پنجابی نثر کو گراں مایہ بناتا ہے۔

ویسے تو اردو زبان میں ناول نگاری بھی کچھ کم حوصلے کی بات نہیں۔ آپ قرۃ العین حیدر کو لیجئے۔ میری پیدائش کے کہیں ادھر اُدھر 'میرے بھی صنم خانے' شائع ہوا۔ میں بڑھاپے میں قدم رکھ رہا ہوں اور ان کی طرف، 'آگ کا دریا'، 'آخرِ شب کے ہم سفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے' اور 'گردشِ رنگ چمن'، ایک ایسی سن رسیدگی کی طرف جاتے ہوئے سنگ ہائے میل ہیں جن کے گرد عظمت کا تابناک ہالہ ہے اور میرا سحر زدہ سفید سر اس عظمت کے آگے خم ہے۔ لیکن کیا اردو بولتی دنیا کے باہر بھی کوئی سر اس عظمت کے آگے جھکتا ہے؟ افسوس کہ نہیں۔ لیکن ذرا ارون دھتی رائے کو دیکھئے۔ ابھی تیس کی بھی شاید ہی ہو۔ ایک ناول God of Small Things اس نے لکھا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زبانوں کی جغرافیائی حدود پار کر گئی ہے۔ اب ایک عالم میں اس کا ڈنکا بجتا ہے۔ کیا ارون دھتی کی خوش بختی کا نام اس کا وسیلہ اظہار انگریزی ہے؟ یقیناً۔ اس صورت حال میں پنجابی زبان میں ناول لکھنا واقعی دل گردے کا کام ہے کہ نثری لحاظ سے اس زبان کی حالت اس کے بولنے والوں کو رنجیدہ کرتی ہے۔ اس کے بہت سے مسائل ابھی حل طلب ہیں۔ آپ کسی زبان کی بنیادی سے بھی بنیادی بات اس کے حروف تہجی کو ہی لیجئے۔ ابھی تک پنجابی زبان کے حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب ہی طے نہیں ہوئی۔ آصف خان، بشیر گورایہ اور امین خیال کے مرتبہ تین قاعدے اس مضمون نگار کے علم میں ہیں اور وہ پنجابی ہونے کے ناتے ذمہ داری کے اس احساس سے، جو وہ اپنی مادری زبان کے سلسلے میں پوری نہیں کر سکا، یہ کہتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ تینوں میں حروف تہجی کی تعداد اور ترتیب جدا جدا ہے۔ محترمی سبط الحسن ضیغم صاحب نے جو تعداد بتائی وہ ان تینوں سے الگ تھی۔

اس ناول کے بے مثال بیانیہ کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے لئے آیئے تھوڑا اِدھر اُدھر جھانکیں۔ جوشوا فضل دین ہی کے ناولوں کو پاکستان میں پنجابی ناول کا نقطہ آغاز جاننا چاہئے۔ کیونکہ تقسیم سے پہلے کے ان کے گرمکھی لپی میں لکھے گئے ناول ہی تقسیم کے بعد فارسی لپی میں شائع ہوئے۔ جوشوا کا بیانیہ سیدھا سادا ضرور ہے، سپاٹ ہرگز نہیں۔ معاشرے کے عام سیدھے سادے لوگوں سے ہم دردی، ان کے دکھ درد میں شرکت اور سماج سدھار کا جذبہ اس بیانئے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ میراں بخش منہاس کا ناول 'جٹ دی کرتوت' اور عبد المجید بھٹی کا ناول 'ٹھیڈا' بھی زبان و بیان کے لحاظ سے موثر ہیں۔ گویا پنجابی ناول کے لئے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ترقی یافتہ پیرایہ اظہار کے لئے ایک Credible بنیاد موجود تھی۔ ڈرامے کی حد تک میجر اسحٰق اور نجم حسین سید نے اس بیانیہ کی Credibility میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اسے ایک قوت، وقعت اور فکر بھی عطا کی۔ لیکن ناقابل فہم طور پر پنجابی ناول معیاری بیانیہ سے محروم رہا۔ سوال یہ ہے کہ معیاری بیانیہ ہے کیا؟ مسئلہ یہ ہے کہ پنجابی کی بنیادی لفظالی ایک فیوڈل دیہی اور زرعی سیٹ اپ سے ماخوذ ہے۔ اس زبان میں اس کی بنیادی پنجابی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے Current مسائل کے غیر کھردرے پیرایہ اظہار میں بیان کے لئے بہت مہارت اور استاکاری کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ہم At Random منشایاد سے پہلے کے دو نام اٹھاتے ہیں۔ افضل احسن رندھاوا اور فخر زمان۔ دونوں پنجابی ناول کے حوالے سے معروف نام ہیں۔ رندھاوا کا بنیادی نقطہ نظر تو فیوڈل ہے ہی (دیوا تے دریا، دوآبا...) ساتھ ساتھ بیانیہ بھی غیر ہموار اور کھردرا ہے۔ ان دو ناولوں کے برعکس لوئیس سے پل ویدا کے ناول کا ان کا ترجمہ 'بڈھا جو عشقیا کہانیاں پڑھدا'۔ اپنے پیرایۂ اظہار سے پڑھنے والے کو حیرت زدہ رکھتا ہے۔ یہ معیاری پنجابی بیانئے کی ایک ارفع مثال ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ کسی اپنے طبع زاد ناول میں بھی رندھاوا پیرایہ اظہار کی اس بلندی کو چھو لیں۔ کچھ یہی حال فخر زمان کے ناولوں کا ہے (ست گواچے لوک، اک مرے بندے دی کہانی، بندی وان...) ایک تو یہ بات کہ ان کے فکشن پر خارجی اثرات اس قدر نمایاں ہیں کہ پنجابی میں لکھے جانے کے باوجود اسے بمشکل ہی پنجابی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے اس کے بیانئے میں غرابت کی غیر ہمواری بہت ہے۔ لیکن 'ٹانواں ٹانواں تارا' سے پہلے پڑھنے والوں کے سامنے پنجابی فکشن کا کوئی بڑا کام نہ تھا جس کے حوالے سے فخر زمان اور رندھاوا کے کام کو صحیح طور پر Place کیا سکتا۔ حسین شاہد کے ناول 'ڈراکل' کا بیانیہ جگہ جگہ صحافتی ہو کر بیان کی سطح پر اتر آتا ہے۔ تو معیاری پنجابی بیانیہ ہوا کیا؟ بیسویں صدی کے آخری دہاکے (عشرے) پر نظر رکھتے ہوئے عصری روح کی حسیت کو پنجابی کی بنیادی لیکن نامیاتی اور نمو پذیر لفظالی میں اس طرح بیان کرنا کہ پنجابی وسیب کا دھڑکتا توانا، معاشرتی، لسانی، تاریخی اور فکری لمس تو برابر محسوس ہوتا رہے لیکن یہ عوامل بیانیہ کی راہ میں کھردری نارواداری کا ویٹس نہ کھڑی کریں، شاید اس ہنر کے حصول میں ہی کہیں پنجابی کے معیاری بیانئے کا سراغ ہے... منشایاد سے پہلے کسی کو یہ سراغ مقدر نہیں ہوا۔

ایک عمر کے بعد جب آدمی Ironical Situations کی پرخار

کارگہ میں قدم رکھتا ہے اور اپنی کسی پرانی بے حد عزیز بار بار کارٹلینڈ، نسیم حجازی یا سڈنی شیلڈن کی ادھر اُدھر سے ورق گردانی کرتے ہوئے طفولیت کے دھندلے ناسٹلجیا سے لڑتے ہوئے اس آسودگی کو مس کرتا ہے جو ان کتابوں کی قرأت سے نکل کر کہیں اور جا چکی ہوتی ہے...تو وہ اس گم گشتہ آسودگی کے پیچھے مارا مارا کتابیں الٹتا رہتا ہے اور یوں Cervantes کو یا شیکسپئر کو، راجندر سنگھ بیدی یا احمد ندیم قاسمی کو، منٹو، گیبریئل گارشیا مارکیز، میلان کنڈیرا، قرۃ العین حیدر یا منشایاد کو دریافت کرتا ہے... Cervantes کیوں عظیم ہے؟ کیوں اسے شیکسپئر بھی دھندلا نہیں سکا؟ اس لئے کہ ڈان کوئزوٹ Don Quixote ایسا Ironically ٹریجک کردار شیکسپئر کے کسی کھیل میں، ہیملٹ، میکبتھ، کنگ لیئر اور اوتھیلو کے باوجود نہیں ہے۔ اس کے کسی کردار کو اپنی شناخت اور وجود کی جستجو میں Irony کی اس سنگلاخی میں سے نہیں گزرنا پڑا جس میں سے ڈان کوئزوٹ گزرا... آیئے Irony اور Identity کے اس جدل کو دیکھیں جس کا نام 'ناتواں ناتواں تارا' ہے۔

مولوی عبدالکریم اپنے بیٹے مولوی عبداللطیف کو بیاہنے داڑھیوں کی برات لایا ہے۔ بڑی رونق ہے۔ کچھ لڑکیاں گا رہی ہیں، کچھ چھت پر چڑھی دولہا دیکھنے کی کوشش میں ہیں اور سکینہ موچن کے ساتھ کھڑی نجی سنیاری اس تاک میں ہے کہ ناول کا ہیرو خالد کب اوپر دیکھتا ہے۔ مگر وہ نہیں دیکھتا... منجے پر لیٹا وہ بے خبر ہے کہ اس گھڑی تقدیر اس کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے... خالد کا بڑا بھائی پیدائشی فقیر ہے۔ دادا رب نواز اپنے پردادا کی طرح دنیا چھوڑ کر فقیر ہو گیا تھا... خالد کا والد بھی یہ راہ پکڑے گا اور انجام کار خالد... سفید کھمبور کپڑوں، کھچڑی بالوں اور زخمی پیروں والے خالد کی ابلتی ہانڈی کا ڈھکن بھی اٹھ ہی جائے گا اور پکی سڑک پر چلتے چلتے ایک موڑ پر چڑھ کر وہ لڑکوں کے ساتھ بارہ کنال کھیلنے لگے گا۔ ایک لڑکا اس کے لئے پانی لائے گا۔ وہ شکر کی جگہ مٹھی بھر ریت اس میں ملا کر غٹاغٹ پی جائے گا۔ چھنے کی تہہ میں بیٹھی ریت وہ انگلیوں سے چاٹ لے گا۔ لڑکے اس سے ڈر کر بھاگ جائیں گے اور جب اپنے بزرگوں کو لے کر واپس آئیں گے تو وہ مزے سے میٹھا ریت پھانکتا ہوا کنکر روڑے چبا رہا ہوگا۔ وہ اپنے فوری اور بعید گرد و پیش میں حسن و خیر، خوبی نیکی اور انصاف کی ارزانی کے لئے نکلا تھا۔ لیکن سنگین گرد و پیش جو کسی حالت میں بھی سنگینی سے کمپرومائز کے لئے تیار نہیں ہیں اسے کنکر چبوا دیتے ہیں۔ دادا، دادا کے پردادا اور پھر ان کی اولاد کے حواس پر شب خون مارنے چلا آتا ہے۔ یہ کیسا Fatalism ہے۔ لیکن اسے Fatalism سے زیادہ Historical Determinism کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ یہ اس بھوت واقعہ سے قطعی مختلف ہے جو تھامس ہارڈی کے ناولوں میں کہیں سے تیر کی طرح آتا ہے اور اچھے دنوں کی امید کے آرپار ہو جاتا ہے۔ ناول 'میئر آف کیسٹر برج' میں نیوسن ٹھیک اس وقت الزبتھ جین پر دعویٰ جتانے آ جاتا ہے جب ہینچرڈ کو اپنی اس سوتیلی بیٹی کی قربت کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ہارڈی کے ہاں انسان کے اندر باہر کے تمام تر رویے اور اسے پیش آنے والے واقعات ایک طرح سے Pre-Programmed ہیں۔ ہارڈی کی الیہ وژن میں تقدیر انسان کو خارج اور داخل کے دو پاٹوں کے بیچ پیستی رہتی ہے اور پس کر جو کچھ باہر آتا ہے وہ انسان کی زندگی ہے۔ منشایاد میں ایسا نہیں۔

دکھ منشایاد کے وسیب کے پیداواری اور غیر پیداواری تعلقات کے تانے بانے میں ہی اس طرح گندھے ہیں کہ کسی Chance وقوعہ کے لئے اس دکھانت میں اضافہ کر سکنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ رشتے ناتوں کی فیوڈل بساط تو صدیوں سے بچھی ہے۔ خالد کے والد حکیم صاحب، دادا رب نواز، پردادا اور جانے ایسے کتنے پیارے جانباز، گھوڑوں کی ٹاپوں تلے آتے رہے ہیں۔ یدھ مگر جاری ہے۔ خالد جانتا ہے کہ اس کے پرکھوں کے دماغ اور دل، نسل بعد نسل، ملک خوشی محمد اور مراد علی ایسے فیوڈل گھوڑوں کے سموں تلے کچلے جاتے رہنے سے ہی اب چھوٹے اور کم زور رہ جاتے ہیں۔

اپنی deficiencies کا یہ شعور اور اس شعور کے باوصف پہاڑوں کی فیوڈل رینج کو صرف اور صرف اس چھوٹے دماغ سے کاٹنے کا عزم، ایس ایم خالد، اس خالد کو جو عاشی کے جگہ جگہ سے جھانکتے گورے چٹے بدن سے ہمیشہ خائف رہا... میرے لئے ان سورماؤں سے بڑا سورما بنا دیتے ہیں جو کانٹوں اور کیلوں پر چلتے ہوئے قطبی انتہاؤں کو چھونا چاہیں یا آکسیجن کے بغیر ایورسٹ سر کرنا چاہیں۔

خالد جانتا ہے کہ اس وسیب میں جگہ جگہ بینا نابینا کنویں کھدے ہیں۔ بھوئیں دار سماج کی ہنڈی ورتی پرانی رسمیں ریتیں اپنے بہترین لوگوں کے حواس سلب کر کے انہیں ان کنووں کی جانب دھکیل دیتی ہیں تا کہ اپنی رو میں خود ہی وہ کسی دن ان کے اندھیروں میں جا پڑیں، وسیب پر ان کے قتل کا الزام بھی نہ آئے اور ان کی موت و حیات کے اسرار سے وہ دھند بھی اخذ کی جا سکے جو سماج کے ہر سیاہ فعل کو تقدیس دیا کرتی ہے۔ تو 'ناتواں ناتواں تارا' کا family saga دراصل ایک ہی کنبے کی کئی نسلوں کا بھوئیں دار سماج کے خلاف یدھ کا عظیم رزمیہ ہے۔ خود اس کنبے کو ایسا چھوٹا زمین دار کنبہ کہا جا سکتا ہے جسے جاگیر دار سماج اپنی ناروائی کی بڑھت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ سو اس کی زمین اپنے نام لکھوا کے اسے فقیر کر دیتا ہے اور سماج کا یہ کیسا چلتر ہے کہ فقیر خود اپنے ہی خلاف گواہ ڈھونڈ کر لاتا ہے اور گواہ بھی کون!؟... سید وارث شاہ:

ساڑھے تن ہتھ زمیں ہے ملک تیری

وارث شاہ کیوں ولیں ولائیاں نوں

اوراس واقعے کی دہشت ناکی سے ڈرکر ہمارے جنگ نامے کا ایک اور ہیرو یونس ماں کی کوکھ میں ہی سدھ بدھ گنوا بیٹھتا ہے اور پھر باہر آ کر تیتروں اور سوروں کے پیچھے بھاگتا، خاک چھانتا کسی تماشا گر کی رسی کے سرے پر ناچتا دکھائی دیتا ہے۔ Irony اور Identity کی یہ کیسی خوفناک جدلیات ہے کہ جو آدمی شناخت کھو بیٹھے پھر اس پر لازم آتا ہے کہ آپ اپنے خلاف گواہ کے طور پر پیش ہو اور اگلی نسل میں ریچھ کی شناخت کو بہ رضا و رغبت قبول کر لے۔ تو 'نانواں نانواں تارا' دراصل اس گھسان کے رن کی عمومی تاریخ ہے جو فیوڈل میدان میں ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ منشایاد کا کمال فن یہ ہے کہ اس نے گھمسان کی گھن گرج کو Low Key رکھا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ شوریلی بلند آوازیں پردۂ سماعت سے ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں جب کہ مدھم، کم شور آوازیں پڑھنے والوں کے اندر جا کر جرے جرے وہی مشک مچانے لگتی ہیں جو خود مصنف اور اس کے پاتروں کے اندر مچ رہا ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ اثر پذیری میں اضافے کے لئے ان آوازوں کی صورت یکسر بدل دیتا ہے۔ اس صورت میں میدان رہتا تو میدان جنگ ہی ہے مگر منظر دوسرا ہوتا ہے۔ مثلاً بارات کا منظر (رزم گاہ کا بارات کے منظر میں منقلب ہونا height of irony)۔ یہاں ہمارا سورما بارو بھانڈ ہے۔ باپ دادا سے کلاسیکی گائیکی سیکھا ہوا، اور گو اُسے کنجریاں تو استاد مانتی ہیں مگر وہاں پکے گانے کا دماغ کسے تھا۔ سو وہ نئی جنگاہ منتخب کرتا ہے۔ اب وہ ایک نقلیا ہے۔ نت نئے روپ دھارن کیا کرتا ہے۔ اپنی شناخت کی تلاش بھی جاری رکھتا ہے اور سماج کو اس کی شناخت کے بارے جھنجھل بھوسے میں ڈال کر ناں نفقہ سے جڑی چند ضروری رعائتیں بھی لے لیتا ہے۔ اس کی نقل کے آخری ایکٹ میں ہم وار war کا بارات اور بارات کا وار میں منقلب ہونا دیکھتے ہیں۔ واہ کیا بارات ہے اور کیا وار! اور کیا واریئر warrior کہ صدیوں آلاتِ حرب کو اپنے ننگے نہتے بدن پر روکتے روکتے جس کی کھال اور روح کی تقلیب ہو چکی ہے انجام کار سوچتے ہوئے کہ وہ نقلیا ہے گویا کہ سورما، وہ عین لڑائی میں پینترا بدلتا ہے اور لڑتے لڑتے مرنے کی نقل کرتے ہوئے مر جاتا ہے اور یوں فرحاں دشمن کے لڈو کے لئے کھلے منہ میں نیم کے ملیدے کی کڑواہٹ ٹھونس دیتا ہے۔ "ایس کنجر اج ای مرنا سی..." دشمن کہتا ہے۔ سو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بارو بھانڈ کاز cause کے لئے نہیں مرا۔

پھر مولوی عبدالکریم کا بیٹا عبدل ہے۔ گیت، ترنم اور نغمگی سے بھرا سادہ دل آدمی جس کے اندر کا پگھلا گداز ہمیشہ بہنے کو تیار رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ خالد کی بارات کے ساتھ جاتا ہے تو رخصتی کے وقت دلہن کے ماں باپ کو روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگتا ہے۔ میلوں میں وہ کنجریوں کے ساتھ مل کر ڈوئیٹ duet گاتا ہے اور کنجر افسوس کرتے ہیں کہ ایسا سریلا لڑکا مولویوں کی بجائے ان کے گھر کیوں پیدا نہ ہوا۔ اپنی آواز ریکارڈ بند یا ٹیپ بند کرانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے مگر وہ گراموفون کمپنی تک نہیں پہنچ پاتا۔ راستے میں کوئی اس کی جیب کاٹ کر گویا ایک ایسی "اچرج اور خوب صورت" آواز کے vocal chords کاٹ دیتا ہے، جس میں مردانہ کرارا پن اور زنانہ لوچ شیر و شکر ہو گئے تھے۔ اس کی ایک پہچان ختم ہوئی دوسری شروع ہوئی... اب وہ مولوی ماسک پہن لیتا ہے مگر باز نہیں آتا۔ جوں ہی موقع ملتا ہے ماسک ذرا سا ہٹا کر اصلی چہرہ دکھا دیتا ہے۔ جمعہ کی نماز سے پہلے نظمیں، قصے اور ہیر پڑھتے پڑھتے شاید گراموفون کمپنی پہنچ جاتا ہے۔ دیکھئے کردار اپنی شناخت کی تلاش میں irony کے کن خارزاروں سے گزرتے ہیں...

ان میں سے ہر کردار کو اپنے فوری گردو پیش سے باہر کسی ارفع آئیڈیل کی تلاش رہی ہے۔ فرح کسی اور کو، خالد فرح کو، نجی خالد کو، انور نجی کو، آپا بھاباسو اور عبدل ٹیپ ریکارڈر کو چاہتا ہے۔ مطلوب کی تلاش میں وہ تمام ایک دوسرے کی راہ بھی کاٹتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ممد و معاون بھی ہیں۔ مطلوب دکھائی تو دیتا ہے مگر قریب نہیں آنے دیتا۔ اس لئے کہ مطلوب خود طالب بھی ہے، کھوجی بھی ہے۔ مقیم نہیں ہے سو قریب کیوں کر آنے دے۔ اب تو اس کا pristine حسن بھی ماند پڑ چکا ہے۔ باسو کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ آپا چاہے تو اسے لے لے۔ یہ ٹیپ ریکارڈ پڑا ہے، عبدل چاہے تو اسے اٹھا لے مگر اب وہ اس میں بھرے گا کیا؟ اس کی اچرج اور خوب صورت آواز تو ختم ہو چکی ہے۔ سونی سناری کا سونا ادھالے کا سرور لوٹ لے گیا۔ لے لے انور اسے۔ مگر خالد چاہے بھی تو فرح کو نہیں لے سکتا۔ شاید چاہ ہی نہیں سکتا، کہ اس کی طلب کے کارزاروں میں بھٹکتے اس خواب باف نے دوسرے خواب بن لئے ہیں۔ فرح اس کے خوابوں کی tapestry کا نقط ایک ڈیزائن ہے جس سے آگے نکل کر اب وہ ایک ایسے utopia کی بنت کاری میں مشغول ہو چکا ہے جس میں سچی جمہوریت ہو، عزت نفس، ایثار اور مساوات ہو... ایک ایسا نظام جس میں کوئی طبقاتی تفریق، فرقہ وارانہ تعصب، ذات پات اور اونچ نیچ نہ ہو۔ ممکن ہے خواب دیکھنا اس کا نسلی وصف ہو۔ اس کا دادا بھی شاید زمین کی ذاتی عدم ملکیت کا خواب دیکھتے دیکھتے ہی اپنی بھوئیں کسی کے نام کر گیا تھا۔ اس کے بڑے بھائی یونس کو تیتر

اور مور دکھائی دیتے تھے۔ شاید خوابوں کے تعاقب میں یوٹوپیا کے بہتر موروں کے پیچھے بھاگتے ہی وہ ہوش وخرد کی حدوں کے پار چلے جاتے ہیں۔ مگر شناختی بحران کی جس چٹیل زمین پر وہ ہیں، وہ ان کی یک جائی پر خوش ہے اس لئے کہ وہ خود بھی اسی بحرانِ ذات کی بیمار ہے۔ اگر چہ قدرت اللہ فاطمی ایسے اسکالر کہہ رہے ہیں کہ موجودہ پاکستان میں شامل علاقے پانچ سات ہزار سال قبل سے ایک علاحدہ جیولوجیکل، جیوگرافیکل اور سوشیو کلچرل وحدت رہے ہیں، پھر بھی مدارس اور جامعات میں نہایت سنجیدگی سے مطالعہ پاکستان کی ابتدا سنہ سینتالیس سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سنہ 1940 تک پیچھے بھی ٹھیک ہے۔ اگر چہ 712 عیسوی پیچھے تک بھی ٹھیک ہی ہے۔ مگر درمیان میں پریشان کن سوالات سر اٹھانے لگتے ہیں۔ مثلاً راجہ داہر کون تھا کیا تھا!؟ محمد بن قاسم کون تھا کیا تھا!؟ غزنہ کا محمود نائک تھا کہ کھل نائک!؟ 712ء سے پیچھے تو خیر جانا ہی نہیں چاہئے کہ وہاں تو رگ وید بھی ہے جو ادھر ہی کے علاقوں میں لکھی گئی۔ ازاں بعد ویدانت اور یہ سوال کہ تصوف اور ویدانت ایک دوسرے کو شمول ہیں کہ ایک دوسرے سے باہر... اور پانینی جس نے ان ہی علاقوں میں دنیا کی پہلی گرامر لکھی... ہمارا سپوت تھا کہ کپوت!؟ اور چندر گپت موریہ راولپنڈی کا باشندہ کیوں تھا؟ پھر ہڑپہ اور موہن جوڈارو... یہ بھدے دھبے ہیں کہ ارضِ وطن کا شاندار ماضی!؟... ان ڈھیریوں تلے مدفون لوگوں سے ہمارا کیا ناتا ہے؟... اور ان explosives کے shrapnels سے بچنے کے لئے اگر ہم سنہ چالیس اور سینتالیس کے محفوظ زمانی علاقے میں ہی رہیں تو وہاں ایک مولانا بھی تھے جو قرونِ اولیٰ کے لوگوں جیسی زندگی گزارنے کے باوجود اپنے آپ کو صرف اشتراکی ہی نہیں کہتے تھے بلکہ اس زمانے کے ہفتہ وار قوم کے 11 دسمبر 1925 کے شمارے کے مطابق وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل بھی ہو گئے تھے (دیکھئے قرۃ العین حیدر کا مضمون مایا سرکار: مکالمہ: 1966) تو ان مولانا کا، نامِ نامی جن کا حسرت موہانی ہے، تحریک اور تاریخ پاکستان میں کتنا حصہ ڈالا جائے۔ ڈالا بھی جائے کہ گول ہی کر دیا جائے۔ اور پھر بنگال! بنگال! بنگال! شاید ارضِ وطن کی شناخت ان اور ایسے ہی کئی دوسرے سوالات کے اٹھتے غبار میں کہیں بھٹک رہی ہے۔ اور 'تانواں تانواں تارا' کا قاری... خاک بسر، بانہیں آسمان کو اٹھائے ہوئے منشایاد کا گریہ سن سکتا ہے کہ اے ارضِ وطن! میری ماں! حیف! ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تیرے بیٹے ان سوالات کے جوابات لانے نکل کھڑے ہوتے اور جاں گسل مہمات سر کرنے کے بعد جوابات لا کر تیرے جھول و ذلول اعدا مقتدر طبقات کے منہ میں ٹھونس کر ان کی سرکوبی کر دیتے... تجھے تیری شناخت مل جاتی اور رفاہ، رواداری، انصاف اور عدل کے نور سے تیرے بیٹے بیٹیوں کی گزر راہ چھوٹ جاتی۔ افسوس ایسا نہ ہو سکا اور بے شناختی کے چٹیل میدانوں سے اڑ اڑ کر تھور کی دھول ان کے سروں میں جا پڑی۔ اے ارضِ وطن! اپنے خالدوں عبدلوں کو دیکھو، باسودس، نجیبوں اور فرح جمالوں کی خبر لو۔ اے ارضِ وطن! اے ارضِ وطن!

یہاں توقف کیجئے اور داد دیجئے کہ کس مہارت اور فنی چابک دستی سے مصنف نے ناول کا بنیادی خیال پڑھنے والوں پر آشکار کیا ہے۔ یعنی جب زمین کے چہرے پر بے چہرگی لکھی ہو تو یہاں حسن وفن کی قدر کیسے ہو گی۔ صحیح الدماغی کی جگہ کہاں ہو گی! مصنف نے خود کچھ نہیں کہا، کوئی نعرہ نہیں لگایا۔ جو کچھ سامنے آیا ہے وہ کرداروں کے اعمال اور انہیں قدرتی طور پر پیش آمدہ واقعات کے تال میل کے منطقی نتیجے کے طور پر سامنے آیا ہے... کہ گر آپ خالد ہیں اور کوئی حسین آپ کو اپنی طرف کھینچتا ہے تو یاد رکھئے کہ جلد، آپ کی رسائی سے باہر اس حسین کی خوب صورت آنکھوں پر نظر کا چشمہ ہو گا، چہرے پر جھریاں اور سراپے پر کہولت کے سائے ہوں گے اور جب آپ اس کے حسن کے پار بہتر معاشرے کے خواب میں تلاش کرنا شروع کریں گے تو آپ سے صحت دماغی چھین لی جائے گی اور گھر کے آرام وعافیت سے نکال کر آپ کو ریت کے ٹیلوں پر بٹھا دیا جائے گا جہاں آپ کو ریت پھانکنا ہو گی، کنکر چبانا پڑیں گے۔ اور اگر آپ قرۃ العین حیدر ہو اور دماغی صحت کی ہٹ پر جمے ہو تو ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت کرنا پڑے گی۔ اگر آپ میاں عبدل ہیں اور سریلی آواز رکھتے ہیں تو صرف ایک جیب تراش کے ہاتھوں آپ کی یہ آواز دنیا پر ہمیشہ کے لئے دم توڑ دے گی۔ اگر آپ استاد بڑے غلام علی خاں ہیں تو آپ کو اپنی جنم بھومی چھوڑنا پڑے گی۔ اگر آپ باسو کھیڈ کار ہیں تو بہتر ہو گا کہ چپکے سے ٹانگ تڑوا لیں اور گھر بیٹھ کر بھانڈے ٹینڈے بنایا کریں۔ اگر آپ ڈاکٹر عبدالسلام ہیں تو theoretical physics کو بھول جائیے اور فٹ بال ٹیم کی انچارجی کیجئے۔ اگر آپ شکیب جلالی یا ثروت حسین ہیں تو جتنی جلدی ہو سکے گردن پٹری پر رکھ دیجئے اور ریل گاڑی کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ اگر آپ نسوانی حسن کا مثالی نمونہ نجی ہیں تو جلد یا بدیر کوئی راکھشس آپ کو ادھال لے جائے گا اور برباد کر دے گا۔ اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے سنہری اصول کچھ یوں ہیں: آواز دبا لو، انگلیاں فگار کر لو، حسن پر بھول بل لو..... کسب کمال کن گر خواہی زیستن۔ ناصر کاظمی یوں ہی نہیں کہتا تھا کہ: ہمارے زمانے کی رات میر کے زمانے کی رات سے جا ملی ہے۔

لیجئے معاملات افسردگی کی طرف مائل ہونے لگے۔ لیکن یہ حزن یہ افسردگی تو تمام بڑے ادب کا خاصہ ہے اور 'تانواں تانواں تارا' بلاشبہ ایک بڑا ناول ہے۔

OO

ملاقات

منشا یاد سے ایک ادبی مکالمہ

اسد فیض

منشا یاد نے 1950 کی دہائی کے آخر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ اب تک ان کے دو سو سے زائد افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع دیہی تمدن ہے۔ جدید زمانے میں جب کہ شہروں کی دل کشی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ دیہات کی زندگی اور کسانوں کے مسائل عدم توجہی کا شکار ہیں۔ منشا یاد نے اس کلچر کو اپنے افسانوں میں تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کے امین ہیں لیکن معاصر زندگی کے دیگر مسائل بھی ان کے افسانوں کا موضوع بنے ہیں۔

پیش ہیں اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر اسد فیض کے ساتھ اس منفرد تخلیق کار کی گفتگو کے اہم اقتباسات:

اسد فیض: افسانہ نگاری کا آغاز آپ نے کب کیا اور پہلا افسانہ کب چھپا؟

منشا یاد: یوں تو میں نے چھٹی ساتویں جماعت ہی میں بچوں کے رسالوں میں کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کر دی تھیں لیکن پہلا افسانہ دسویں جماعت کا امتحان دینے کے فوراً بعد 'کنول' کے عنوان سے لکھا جو اس زمانے کے ایک نیم ادبی مگر مقبول ترین رسالہ 'شمع' لاہور میں شائع ہوا۔ اس کے بعد میرے افسانے ماہ نامہ عکسِ نو لاہور میں شائع ہونے لگے۔ لیکن یہ ابتدائی مشق کا دور تھا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میری ادبی زندگی کا اصل آغاز اس افسانے سے ہوا جس کا عنوان 'کہانی' تھا اور جو میں نے 1957 میں لکھا مگر یہ 1959 میں اشفاق احمد صاحب کے خوب صورت رسالے 'داستان گو' میں شائع ہوا تھا۔ اب تک میرے افسانوں کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ایک پنجابی افسانوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ پنجابی میں ایک ناول 'ٹاواں ٹاواں تارا' شائع ہو چکا ہے اور اُردو کے دو ناول زیرِ تصنیف ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے افسانوں کی کچھ انتھالوجیز بھی مرتب کی ہیں۔ اور بچوں کے لئے لکھی گئی ثاقبہ رحیم الدین کی کتاب کا پنجابی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

اسد: افسانے کی صنف کو ہی اظہار کے لئے کیوں منتخب کیا؟

منشا: شروع میں شاعری بھی کرتا رہا مگر ناول اور افسانے سے میری دل چسپی زیادہ تھی۔ ناول لکھنے کے لئے زندگی کے تجربے، ریاضت اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُردو کے زیادہ تر ادیبوں کی طرح میں بھی پارٹ ٹائم ادیب تھا اور ملازمت کے دوران میں افسانہ لکھنے کا وقت بھی مشکل سے نکال پاتا تھا۔ کئی بار ناول لکھنے کی کوشش کی مگر عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہر بار یہ کوشش اُدھوری رہ گئی۔ شروع میں تو افسانے کو اختصار کی سہولت کے پیشِ نظر ہی اختیار کیا مگر پھر محسوس ہونے لگا کہ یہ بہت عمدہ صنفِ ادب ہے۔ آپ اس میں ہر طرح کے خیالات اور جذبات کا بھرپور اظہار کر سکتے ہیں۔ پھر یہ افسانے ساتھ ساتھ ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ جس سے قارئین کے علاوہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں، اور رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں سے مسلسل تعلق قائم رہتا ہے۔

اسد: کن افسانہ نگاروں سے ابتدا میں متاثر تھے جن کے اثرات آپ کی افسانہ نگاری پر مرتسم ہوئے۔

منشا: جب میں نے افسانہ پڑھنا اور پھر لکھنا شروع کیا تو میں سبھی اچھے اور مشہور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں سے متاثر تھا۔ میں نے ابتدا میں نسیم حجازی کے سارے ناول پڑھ ڈالے۔ مرزا ادیب کے صحرا نورد کے خطوط اور رومان اور اس عہد تک چھپے ہوئے سارے اردو ناول۔ لیکن جن افسانہ نگاروں کے افسانے میں دل سے پسند کرتا تھا ان میں پریم چند، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور اشفاق احمد شامل تھے۔ میرا خیال ہے میں نے ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھا۔ ان کے علاوہ نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں آغا بابر کا مشہور افسانہ 'گلاب دین چٹھی رساں' جو 'توازن' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، احمد ندیم قاسمی کا 'بھرم' اور تسنیم سلیم چھتاری اور بہت سے دیگر لوگوں کے افسانے اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس لئے میرے افسانوں پر سبھی کے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ میں انتظار حسین کے افسانوں کو بھی پسند کرتا ہوں مگر شعوری طور پر میں نے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی کسی سینئر افسانہ نگار کے فکر و اسلوب کے سحر میں گرفتار ہو کر رہ گیا۔

اسد: افسانہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟

منشا: میرے نزدیک افسانہ ایک ایسا مختصر نثر پارہ ہے۔ جس میں کسی واقعہ، منظر، خیال، جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایسے بہترین اور موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کو متاثر کرے اور اس کی یادداشت کا حصہ بن جائے اور اسے زندگی کے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے۔

اسد: افسانہ کیسے لکھتے ہیں اور کتنے عرصے میں ایک افسانہ مکمل ہوتا ہے؟

منشا: سب سے پہلے مجھے کوئی آئیڈیا سوجھتا ہے۔ اس کے بیجوں میں نشوونما کی گنجائش ہو تو ذہن میں فوراً ہی پلاٹ کی تشکیل شروع ہو جاتی ہے۔ کردار سرگوشیاں کرنے اور ان کے مکالمے سنائی دینے لگتے ہیں۔ مگر میں اسے فوراً ہی لکھنے نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اسے ذہن کے سٹور روم میں ڈال دیتا ہوں جہاں پہلے سے کئی کچے پکے آئیڈیاز فالتو سامان کی طرح اِدھر اُدھر پڑے ہوتے ہیں۔ وہ نیا آئیڈیا کبھی خود اور کبھی کسی دوسرے آئیڈیا، کردار، واقعہ، تاثر یا احساس سے مل کر اُگنا اور بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ انڈے سینے جیسا عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھریلے نہ ہوں تو کچھ عرصہ بعد انڈوں کے خول توڑ کر بچے باہر نکل آتے اور ذہن چوں چوں کی آوازوں سے بھر جاتا ہے۔

میں افسانہ لکھنے کے لیے عمدہ کاغذ یا ڈرافٹ پیڈ استعمال کرتا ہوں تاکہ جب ذہن میں خیالات کی آندھی سی اٹھ رہی ہو اور الفاظ تیزی سے اُترتے چلے آ رہے ہوں تو کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور قلم کاغذ پر پھسلتا چلا جائے۔ پہلے اچھی قسم کا پین استعمال کرتا تھا پھر عمدہ بال پوائنٹ سے لکھنا شروع کیا مگر اب چند برسوں سے پنسل سے لکھتا ہوں تاکہ تبدیلی اور درستی کی خاطر لفظوں کو کاٹنے یا کاغذ پھاڑنے کی بجائے ربڑ سے مٹا کر لکھا جا سکے۔ بلکہ اب تو میں کمپیوٹر پر براہ راست لکھ سکتا ہوں لیکن عام طور پر پنسل سے لکھ کر ساتھ ساتھ اپنے معاون کو ٹائپ کے لئے دیتا جاتا ہوں۔ پھر اس کی ایڈیٹنگ کر لیتا ہوں۔ عام طور پر کچھ روز کے وقفوں سے اس پر نظر ثانی کرتا رہتا ہوں۔ جب اس میں مزید مختصر یا بہتر ہونے کی گنجائش نہ رہے اور میرے اندر کا نقاد مطمئن ہو جائے تو اسے پرنٹ کر لیتا یا ای میل سے کسی ادبی رسالے کو بھیج دیتا ہوں۔

شروع میں ایک یا دو ہی نشستوں میں افسانہ مکمل کر لیتا تھا۔ عام طور پر ہفتے کی رات کو شروع کر کے اتوار کی رات تک ایک افسانہ مکمل ہو جاتا تھا۔ اب بھی پہلا ڈرافٹ اتنا ہی وقت لیتا ہے مگر ایڈیٹنگ اور نظر ثانی میں اب زیادہ وقت لگتا ہے۔ تسلی نہیں ہوتی۔ ڈر رہتا ہے کوئی کمی یا خامی نہ رہ جائے۔ جو تھوڑی بہت عزت کمائی ہے وہ بحال رہے۔ تاہم حلقہ کی تنقیدی محفل میں افسانہ سنا کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ قارئین اور ناقد حضرات تک یہ کس طرح پہنچا ہے۔ کوئی مفید مشورہ ہو تو اس پر غور کرنے میں باک نہیں سمجھتا۔

اسد: 60 میں جدیدیت کے زیر اثر افسانہ میں تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

منشا: زندگی اور فن کے ارتقائی سفر میں تبدیلیاں اور نئے تجربات ناگزیر ہوتے ہیں۔ ہر تبدیلی اور تجربہ فن کو کسی نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ میں ساٹھ کی دہائی میں فن افسانہ نگاری میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ابتدا میں بعض لکھنے والے افراط و تفریط کا شکار بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر جدیدیت کی اس تحریک یا رجحان نے افسانے کو نئی زندگی دی۔

اسد: کیا آپ نے علامتی کہانیاں لکھیں، اور کیا وہ قابلِ فہم تھیں؟

منشا: میں نے پچاس کی دہائی میں لکھنا شروع کیا اور بہت سے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح میری ابتدائی کہانیاں بھی روایتی اور وضاحتی اسلوب کی حامل تھیں۔ لیکن میں بھی عصری افسانے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس لئے علامتی اور نیم علامتی بہت سی کہانیاں لکھیں مگر ایک تو یہ قابل فہم تھیں دوسرے ان میں کہانی پن سے بھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔

اسد: کیا علامتی اور تجریدی افسانے جیسے تجربات نے افسانے کی صنف کو نقصان پہنچایا؟

منشا: اُردو افسانے میں علامت نگاری کوئی نئی چیز تو نہ تھی۔ اس کی اولین مثالیں ہمیں ابتدائی دور کے افسانوں میں بھی ملتی ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو داستانوں اور اساطیری کہانیوں کے دیو، پریاں، بھوت، بیتال، آفات، جادوگر اور توتے مینا بھی علامتیں ہی تھیں۔ یلدرم سے لے کر منٹو تک کئی ایک افسانہ نگاروں کے ہاں اس کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک تحریک یا رجحان کے علامت نگاری کو ساٹھ کی دہائی ہی میں فروغ ملا۔ کافکا اور دوسرے فرانسیسی افسانہ نگاروں کے زیر اثر اردو افسانے میں بھی علامت اور تجرید کا استعمال شروع ہوا۔ بھارت میں اس کا آغاز سریندر پرکاش اور بلراج مینرا اور پاکستان میں انتظار حسین اور انور سجاد نے کیا۔ اگرچہ انتظار حسین کی علامت نگاری کی نوعیت ذرا مختلف تھی کہ ان کہانیوں کی فضا، مواد اور اسلوب اساطیری کہانیوں سے متاثر و ماخوذ تھا۔ دوسروں کے ہاں جدیدیت، علامت، استعارے اور تجرید کے استعمال و امتزاج اور اسلوب کی تازہ کاری سے آئی۔ مگر بعض افسانہ نگاروں نے لسانی تشکیلات کی آڑ میں بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت سمجھ لیا۔ کردار، پلاٹ اور کہانی پن کو نظر انداز کیا جانے لگا جس سے افسانہ روکھا پھیکا اور بے ربط ہو گیا۔ اس سے پڑھنے والے پہلے چونکے پھر بدک گئے۔ ان ہی بے اعتدالیوں کی وجہ سے علامتی افسانے کو ایک زمانے میں ملامتی افسانہ کہہ کر گالی دی گئی۔ مگر ستر کی دہائی کے بعد صورت حال تبدیل ہو گئی اور نئے تجربوں میں پختگی اور استحکام آیا اور ایک متوازن اور معتدل رجحان وجود میں آیا جس میں روایتی افسانے کی خوبیاں بھی تھیں اور جدیدیت کی بھی۔ جو باہر سے ہی نیا نہیں تھا اندر سے بھی یعنی فکری لحاظ سے

بھی جدید تھا۔ نئے تجربوں کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ ان سے افسانے کا کینوس وسیع ہوا۔ افسانے کو غیر ضروری اور طولانی تمہید، خارج کے وضاحتی اور صراحتی بیان اور بے وصف نثری اسلوب سے رہائی ملی۔ اس طرح ان تبدیلیوں نے اس فن افسانہ نگاری کو نئی زندگی دی۔

اسد: افسانہ میں بیانیہ کی واپسی کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

منشا: اُردو افسانہ تجربوں اور تبدیلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر دوبارہ اپنی ڈگر پر آ گیا ہے۔ لیکن یہ ڈگر عین مین وہی نہیں ہے جسے چھوڑ کر اس نے تجربوں کا سفر شروع کیا تھا۔ واپسی میں اس کے ساتھ بہت کچھ نیا بھی آیا ہے۔ اس لئے یہ خوش آئند بات ہے کہ پلاٹ، کردار اور کہانی کو افسانے میں دوبارہ استحکام حاصل ہوا۔ دراصل فن افسانہ نگاری بنیادی طور پر بیانیہ ہی ہے۔ مگر نئے تجربوں نے بیانیہ کی صورت بھی تبدیل کر دی ہے اور بہت سے نئے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اب افسانہ پہلے سے زیادہ متنوع، عمیق اور توانا ہو گیا ہے۔

اسد: آپ کے افسانوں کے موضوعات کیا ہیں؟

منشا: افسانے کا عام طور پر کوئی ایک موضوع نہیں ہوتا۔ میرے افسانوں کے موضوعات بھی مخصوص نہیں، متنوع ہیں۔ انسانی زندگی کے سارے ہی پہلوؤں اور رخوں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیہاتی اور شہری زندگی کے مختلف پہلو، فرد اور معاشرے کے داخلی اور خارجی معاملات و مسائل اور فکر و خیال کے متنوع رنگ۔ یوں انسانی زندگی کا سب سے بہترین موضوع محبت ہے اور میں نے بھی اس پر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں مگر کسی بھی سماجی، نفسیاتی اور سیاسی موضوع کو شجر ممنوعہ نہیں سمجھتا۔ تاہم عام آدمی کے دکھ سکھ، ماحول کی گھٹن، سیاسی جبر اور طبقاتی تقسیم سے متعلق موضوعات میرے بہت سے افسانوں کا موضوع بنے۔

اسد: کوئی ایسی کہانی جو آپ ابھی لکھنا چاہتے ہوں؟

منشا: ایک نہیں ابھی میں بہت سی کہانیاں لکھنا چاہتا ہوں۔ پہلا افسانہ 1955 میں اٹھارہ سال کی عمر میں، میٹرک کا امتحان دینے کے فوراً بعد لکھا تھا۔ اس طرح مجھے افسانہ لکھتے ہوئے پچاس برس ہو گئے ہیں۔ ہزاروں کہانیاں پڑھیں، سیکڑوں لکھیں مگر ایک بڑا اور ناقابلِ فراموش افسانہ لکھنے کی خواہش میں مسلسل مشق کرتا رہتا ہوں۔ ابھی میرے اندر کہانیوں کا بہت بڑا انبار ہے، اتنا بڑا کہ ان سب کا لکھا جانا ایک زندگی میں ممکن نہیں۔ اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ افسانچے لکھنا شروع کر دیئے ہیں تا کہ وہ کہانیاں بھی کسی طرح محفوظ کر سکوں جنہیں لکھنے کے لئے میں پورا وقت نہیں نکال پا رہا۔ میرے نئے مجموعہ میں ایسے بہت سے افسانچے بھی شامل ہیں۔

اسد: افسانہ میں کس کی ساخت پر آپ کی زیادہ توجہ مرکوز رہتی ہے افسانے کے کرداروں یا اسلوب پر؟

منشا: اسلوب ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر ہمہ وقت توجہ مرکوز رکھی جائے اس کا تعین افسانہ شروع کرتے وقت ہی ہو جاتا ہے۔ پھر افسانہ مکمل کرنے کے بعد آپ نظر ثانی کرتے ہوئے زبان و بیان کی خامیاں اور اسلوب کی کمزوریاں دور کر سکتے ہیں۔ میری زیادہ تر توجہ اس آئیڈیا یا تھیم کی طرف ہوتی ہے جس کی خاطر میں افسانہ لکھتا ہوں۔ کردار تو ٹولز ہوتے ہیں جو لکھنے والے کی بات قاری تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن کرداروں پر پوری توجہ نہ دینے سے کردار مصنوعی اور جھوٹے معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اسد: آپ کے خیال میں ایک اچھے افسانے کے ضروری عناصر کیا ہیں؟

منشا: ایک اچھے اور مکمل افسانے میں سارے ہی عناصر اور اجزا تھیم، پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطہ نظر، ہیئت اور تکنیک وغیرہ ضروری ہوتے ہیں اور ان میں توازن پایا جانا چاہئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں سب سے اہم وہ آئیڈیا یا تھیم ہے جس کو بنیاد بنا کر یا جس کی بنیاد پر افسانے کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ آپ اسے مرکزی خیال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کا تاثر اُبھارنے کے لئے افسانہ نگار کردار اور ماحول تخلیق کرتا اور اسی کے مطابق زبان و بیان اختیار کرتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کی کچھ خصوصیات اور ضروریات ہوتی ہیں جن میں سب سے اہم غزل کی سی ایمائیت اور ایجاز و اختصار ہے جو شارٹ سٹوری یا مختصر افسانے کی بنیادی خصوصیت اور پہچان ہے۔ یوں افسانہ نگار کو فن اور فکر کے سارے پہلوؤں پر توجہ رکھنا ہوتی ہے۔ افسانے کی سرخی یا عنوان سے لے کر اس کے آخری جملے یا اختتامیے تک۔ مثلاً عنوان یاد رہ جانے والا اور بامعنی ہو۔ آخری جملہ ایسا ہو کہ کسی بات کا انکشاف کرے اور تکمیل کا احساس ہو۔ القصہ جس طرح، بول، دھن، ساز اور آواز بھی اچھے ہوں تو ہی ایک اچھا گیت تخلیق ہوتا ہے اسی طرح افسانے میں بھی مرکزی خیال (آئیڈیا)، پلاٹ، کردار نگاری، فارم، تکنیک، اسلوب، منظر نگاری اور لکھنے والے کا نقطہ نظر سبھی کچھ اچھا ہونا ضروری ہے۔

اسد: اگر آپ کو کہا جائے کہ عالمی افسانے کے انتخاب میں آپ اپنا کوئی افسانہ خود منتخب کریں تو آپ کون سا افسانہ شامل کریں گے اور کیوں؟

منشا: میرے بہت سے افسانے دوسری زبانوں میں ترجمہ اور عالمی افسانوں کے انتخاب میں شامل ہو چکے ہیں۔ مثلاً: بچے اور بارود، اپنا گھر، ماس اور مٹی، دام شنیدن، (ڈنگر بولی)، ریپلیکا (تاج محل کی سیر)، دیدۂ یعقوب، پھندا اور تماشا وغیرہ۔ لیکن تماشا سر فہرست ہے اور یہ اس لئے کہ اس میں اچھے افسانے کی ساری خوبیاں ہیں۔ اس کا موضوع دل چسپ اور گہری معنویت کا حامل ہے۔ اس میں ترقی پذیر ملکوں کے فرد اور اجتماع کے انسانیت کش رویوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، احمد فراز، مظفر علی سید اور بہت سے دیگر اہل رائے نے اس کے بارے میں اظہار پسندیدگی کیا۔ محمد عمر میمن نے

اسے انگریزی میں ترجمہ کرکے انتھالوجی میں شائع کیا۔ ٹیلی ویژن پر یہ لانگ پلے کی صورت نشر ہوا اور عوام نے بھی اسے پسند کیا۔ میرے، بہت سے افسانوں کے انگریزی، فارسی، ہندی، فرانسیسی ترکی، عربی، پنجابی (گورمکھی) زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں۔ انگریزی تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ 'تماشا اینڈ ادر سٹوریز' جسے پروفیسر جمیل آذر نے مرتب کیا تھا، 1994 میں دہلی (بھارت) سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل تھے۔ اسی سال کچھ اضافوں کے ساتھ یہ' سلیکٹڈ سٹوریز آف منشا یاد' کے نام سے پاکستان میں بھی شائع ہوا۔ امرتا پریتم نے اپنے رسالے ناگ منی (دہلی) کا 'ماس اور مٹی' نمبر شائع کیا تھا جس میں اس نام کے مجموعے کی بہت سی کہانیاں پنجابی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ میری اُردو کہانیوں کو پنجابی میں ترجمہ کرکے چھاپتی رہتی تھیں۔ افسانہ دامِ شنیدن (ڈنگر بولی) ہندی اور پنجابی کے علاوہ بھارت کی بعض اور زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا جیسے کناڈا وغیرہ۔

اسد: ہمارے ہاں فکشن کی تنقید کے معیار سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

منشا: پاکستان میں فکشن کی تنقید کے معیار اور مقدار دونوں سے میں زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔ ہمارے نقادوں کی زیادہ توجہ نصابی موضوعات اور شاعری تک محدود رہتی ہے۔ ہم عصر افسانے پر بہت کم نقادوں نے توجہ دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے خاصے مطالعہ اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے بہت سے افسانہ نگار خود تنقید لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی افسانے پر اچھی نظر ہے مگر ان کے مضامین سے پتا چلتا ہے کہ وہ نئے افسانوں کو نہیں پڑھتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا تنقیدی کام قابل داد ہے۔ نئے افسانے کو سید وقار عظیم اور ممتاز شیریں جیسے نقادوں کی ضرورت ہے۔

اسد: پاک بھارت میں فکشن کے کس نقاد کے کام کو آپ تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں؟

منشا: پاکستان میں ڈاکٹر وزیر آغا نے فکشن کی تنقید پر سب سے زیادہ توجہ دی۔ انہوں نے اپنے مضامین، مقالات اور رسالہ اوراق کے ذریعے نئے افسانے کی حوصلہ افزائی، ترقی اور اشاعت کا کام بھی کیا۔ افسانے کی تنقید پر ان کی کتاب بھی موجود ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی تنقید بہت تخلیقی اور ٹو دی پوائنٹ ہے اور فکشن کے فن کو سمجھنے میں بہت ممد و معاون ثابت ہوئی۔ سلیم آغا قزلباش کا افسانے پر ڈاکٹریٹ کا تھیسس بھی شائع ہو چکا ہے جو خاصا وقیع ہے۔ فتح محمد ملک نے اپنے مضامین میں اردو افسانے اور خاص طور پر منٹو کے فن کے بہت اچھے تنقیدی جائزے پیش کئے ہیں۔ وہ بھی افسانے کو بہت اچھی طرح سمجھنے والے نقاد ہیں۔ اسی طرح محمد علی صدیقی، مظفر علی سید، ڈاکٹر انوار احمد، شہزاد منظر، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا تنقیدی کام قابل توجہ ہے۔ ادب اور افسانوں کے کچھ ڈاکٹروں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر اعجاز راہی اور ڈاکٹر آصف فرخی نے بھی اردو افسانے کی تنقید میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد کی تنقید بھی نہایت معیاری ہے۔ بھارت میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، وارث علوی اور شمس الرحمٰن فاروقی افسانے کے بہت اچھے نقاد ہیں۔ ان دنوں میں وارث علوی کے مضامین کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے ان کی اپروچ درست اور انداز تحریر بہت اچھا اور دلچسپ لگتا ہے۔

اسد: ادبی جرائد دم توڑتے جا رہے ہیں اور سرکاری جرائد کا کوئی معیار ہی نہیں ایسی صورت حال میں ادب کے فروغ کے لئے کیا اقدامات ہونے چاہئے؟

منشا: ادبی جرائد کہاں دم توڑ رہے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں آئے روز بہت سے نئے، معیاری اور اچھے رسائل کا اجرا ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہے کہ نقوش اب پہلے جیسا نہیں رہا بلکہ پتہ نہیں ہے بھی کہ نہیں اور اوراق بھی دیر سے آتا ہے اور کچھ دُبلا بھی ہوگیا ہے مگر فنون، سیپ، سویرا، معاصر، ادب عالیہ، قومی زبان، بادبان، مکالمہ، ادبیات، دنیا زاد، ارتکاز، بیاض، آج تشکیل، آئندہ، روشنائی، ادب وثقافت، ماہ نو، کتاب، جدید ادب، تادیب، الماس (خیر پور، یونیورسٹی)، قرطاس (گوجرانوالہ)، نیرنگ خیال، ادراک (گوجرانوالہ)، آفاق (راولپنڈی)، سورج، الحمرا، نوادر، ادب لطیف، تخلیقی ادب وغیرہ کتنے ہی ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ بھارت میں شب خون بند ہوا ہے مگر اس کا دو حصوں پر مشتمل آخری شمارہ قریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت میں ذہن جدید، استعارہ، شاعر، شعر و حکمت، نیا سفر، نیا ورق، ادب ساز، سبق وغیرہ بہت معیاری ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر جدید ادب اور بہت سے دوسرے اردو میگزین موجود ہیں۔ ان اتنے بہت سے رسائل کی موجودگی میں آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادبی جرائد دم توڑ رہے ہیں۔ مجھے ادبیات کی حد تک آپ کی اس بات سے بھی اتفاق نہیں ہے کہ سرکاری جرائد کا کوئی معیار ہی نہیں۔ ماہ نو کو البتہ توجہ کی زیادہ ضرورت ہے۔

اسد: افسانے کے علاوہ اور کس صنف میں کام کا ارادہ کرتے ہیں؟

منشا: افسانے کے علاوہ میرا ایک پنجابی ناول چھپ چکا ہے۔ اُردو کے دو ناول زیر ترتیب ہیں اور یادیں کے نام سے یادداشتیں لکھ رہا ہوں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لئے ڈرامے اور سیریلز بھی لکھ چکا ہوں۔ اب بھی ایک سیریل لکھ رہا ہوں۔ اخبار میں کالم بھی جاری ہے اور حسب ضرورت مضامین بھی لکھتا رہتا ہوں۔

اسد: اُردو افسانے کے کس دور کو آپ اُردو افسانے کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں؟

منشا: اُردو افسانے کا سنہرا دور تو وہی ایک ہے جب منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، مرزا ادیب، اشفاق احمد، اوپندر ناتھ اشک، شوکت صدیقی، عزیز احمد، انور عظیم، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، غیاث احمد گدی، قاضی عبدالستار، آغا بابر، بانو قدسیہ، اے حمید، رام لعل، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین ایک ساتھ افسانہ لکھ رہے تھے۔ البتہ جدید افسانے پر ساٹھ ستر کی دہائی میں ایک بار خوب جوبن آیا تھا آپ اسے سنہری نہیں تو تقریٔ دور تو ضرور کہہ سکتے ہیں۔ جب انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، بلراج منیرا، احمد ہمیش، وقار بن الٰہی، خالدہ حسین، رشید امجد، اعجاز راہی، سمیع آہوجا، مظہر الاسلام، اسد محمد خاں، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، غلام الثقلین نقوی، رتن سنگھ، محمد عمر میمن، قمر احسن، نیّر مسعود، احمد یوسف، سلام بن رزاق، کلام حیدری، شوکت حیات، انور عظیم، آغا سہیل، محمود احمد قاضی، انور زاہدی، ناصر بغدادی اور بہت سے افسانہ نگار نئی حسیت کے ساتھ ابھرے (چاہیں تو مجھے بھی ان میں شامل کر لیں) اور افسانے کا علامتوں اور استعاروں سے ڈھک گیا تھا۔ اسی طرح افسانے کا ایک تیسرا اور موجودہ دور بھی کم اہم نہیں ہے۔ لیکن یہ ابھی جاری ہے۔

اسد: کیا آج ہمارے ہاں معیاری افسانہ لکھا جا رہا ہے؟

منشا: جی ہاں۔ ہمارے ہاں ہر دور میں عمدہ افسانے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اب بھی پاک و ہند میں بہت اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور معیاری افسانے لکھ رہے ہیں۔ نئی نسل کے افسانہ نگاروں کے پیش نظر افسانے کا وہ سارا فنی اور فکری سفر اور تجربات ہیں جن میں کامیابیاں ہی نہیں ناکامیاں بھی تھیں۔ مگر یہ کامیابیاں اور ناکامیاں نئے راستے متعین کرنے میں ان کی معاونت کر رہی ہیں۔ اس نسل میں محمد حمید شاہد، آصف فرخی، عبدالوحید، اسلم سراج الدین، نگہت سلیم، سلیم آغا قزلباش، نیلوفر اقبال اور شبانہ حبیب جیسے باصلاحیت افسانہ نگار شامل ہیں۔

اسد: اُردو میں نئے تنقیدی نظریات مثلاً ساختیات وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کیا اس سے افسانے کی تفہیم ممکن ہے؟

منشا: جس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ادبی اصناف میں نئے اسالیب اور رجحانات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی طرح تنقید میں بھی نئے نئے نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ساختیات وغیرہ کا نظریہ بھی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے اور کسی حد تک افسانے کی تفہیم میں مددگار ثابت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن پوری تفہیم نہیں کر سکتا۔

اسد: آپ کے کتنے ڈرامے ٹیلی ویژن پر پیش کیے گئے ہیں؟

منشا: میرے بہت سے افسانوں کی ریڈیو اور ٹی وی کے لئے ڈرامائی تشکیل ہو چکی ہے۔ پنجابی میں کم، اردو میں زیادہ۔ کچھ اوریجنل ڈرامے بھی لکھے۔ جیسے 'کچے پکے رنگ' اور 'ڈرائنگ روم' وغیرہ۔ ٹی وی سیریلز میں جنون، بندھن، راہیں، پورے چاند کی رات، آواز (ابھی ٹیلی کاسٹ نہیں ہوا) اور رنگ وفا (زیر تحریر) شامل ہیں۔ ان میں راہیں پر سال کے بہترین سکرپٹ کا پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ بھی ملا تھا۔

اسد: ڈرامہ اور افسانہ میں کس صنف کو پسند کرتے ہیں؟

منشا: جہاں تک پسند کا تعلق ہے تو ظاہر ہے میں (فکشن) پسند کرتا ہوں اسی لئے افسانہ، ڈراما اور ناول لکھتا ہوں۔ البتہ افسانے اور ناول کو میں ڈرامے کے مقابلے میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں کیوں کہ یہ زیادہ تخلیقی چیز ہیں۔ ڈراما ان کے بعد آتا ہے۔

اسد: پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات کی مقبولیت کا ایک سبب اُردو ڈرامہ تھا لیکن اب وہ اس معیار کو قائم نہیں رکھ سکے اس کی کیا وجہ ہے؟

منشا: اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان ٹیلی ویژن کی نشریات میں اُردو ڈراما سب سے مقبول تھا اور اس کا معیار بھی بہت اچھا تھا مگر پھر اس میں بہت زیادہ کمرشل ازم آ گیا۔ تخلیقی ڈرامے کی جگہ پاپولر ڈرامے نے لے لی ہے۔ اشتہارات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی جس کی وجہ سے اس میں فرمائشی گلیمر ڈالا جانے لگا۔ تھوڑے وقت میں زیادہ پروڈکشن کا رجحان ہوا۔ پرائیویٹ چینلوں (جو بھارتی ڈراموں اور فلموں سے متاثر ہیں) کے ساتھ مقابلے نے پی ٹی وی کے معیار کو بھی پست کر دیا۔ اوریجنل اور نئے اسکرپٹس کی بجائے ٹی وی پروڈیوسروں کا کچھ مقبول ڈراموں کو ملا کر ایک نیا ڈراما بنا لینے کا رجحان بہت خطرناک رویہ ہے۔ چربے اور نقل کے اس رویے کی وجہ سے پاکستان کی فلم انڈسٹری تباہ ہو چکی ہے۔ پھر پی ٹی وی کی پالیسیوں، بدانتظامیوں اور ترجیحات نے بھی ڈرامے کو نقصان پہنچایا اور روز بروز اس کا معیار گرتا چلا جا رہا ہے۔ اکا دکا ہی سہی مگر اچھے اور معیاری ڈرامے اب بھی لکھے جاتے ہیں مگر پاپولر اور کمرشل ڈراموں کے ڈھیر میں وہ دب جاتے ہیں۔ البتہ ایک بات ضرور کہوں گا۔ ہم بنیادی طور پر ماضی پرست ہیں۔ پرانے چاولوں، پرانی فلموں، پرانے گیتوں اور بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم ماضی کی چیزوں اور معیاروں میں گھر کر رہ جاتے ہیں اور نئی چیزوں اور خیالات کو مشکل سے یا بدیر قبول کرتے ہیں۔ کچھ تو ڈراموں کی بھرمار کی وجہ سے ڈرامے کا معیار گر گیا ہے کچھ ہم سمجھتے ہیں کہ حال کی بجائے ماضی کی ساری چیزیں اور سبھی ڈرامے اچھے تھے۔

اسد: آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟

منشا: اپنے دو ادھورے ناول مکمل کر رہا ہوں اور یادیں کے نام سے اپنی یادداشتیں لکھ رہا ہوں۔ گاہے گاہے افسانہ بھی لکھتا رہتا ہوں اور اخبار کا کالم بھی جاری ہے۔

OO

ملاقات

''معزز''

ممتاز مفتی

منشا یاد جب اسلام آباد آیا تھا تو وہ ایک فرد تھا اب وہ ایک ادارہ ہے۔

اس کے متعلق بھانت بھانت کی باتیں مشہور ہیں۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔

کوئی کہتا ہے کہ اسلام آباد افسانے کا شہر ہے اور منشا یاد اس کا صدر دروازہ ہے۔

کوئی کہتا ہے منشا یاد ذات کا معمار (انجینئر) ہے۔ تنخواہ سی ڈی اے سے لیتا ہے لیکن اسلام آباد میں تعمیر ادب کی کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے منشا یاد پی آر کے زور پر ادیب بنا ہے، اس نے اپنا مکان ادیبوں کا ٹی ہاؤس بنا رکھا ہے۔ کوئی کہتا ہے منشا یاد اسلام آباد کے ادبی حلقوں کی ڈائریکٹری ہے۔ ادیبوں کا کہنا ہے کہ افسانہ نویس گنتی کے حساب سے افسانے لکھتے ہیں، منشا یاد ڈھیروں کے حساب سے افسانے لکھتا ہے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ منشا یاد افسانہ نویسوں میں چگادڑ سمان ہے، علامتیے کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہے، روایتیے کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہے۔

ایک دانش ور کہتا ہے کہ آج کا دستور ہے کہ نام ہو کام چاہے ہو نہ ہو۔ یہ منشا یاد کیا عجوبہ ہے کہ نام بے معنی ہے، کام با معنی ہے۔

بہر صورت ایک بات یقینی ہے کہ اسلام آباد میں ادبی آلودگی کی تمام تر ذمہ داری منشا یاد پر عائد ہوتی ہے۔

صاحبو یہ سنی سنائی نہیں آنکھوں دیکھی بات ہے۔

منشا یاد کی آمد سے پہلے اسلام آباد کی فضا میں بڑی خوش گوار ہم آہنگی تھی۔ یہاں بیگمات تھیں، صاحب تھے، بیرے تھے، خانسامے تھے بنگلے تھے، باغ تھے، سرجی تھے، جی حضوریے تھے۔ اس آرکسٹرا میں سب شدھ سر تھے۔ Conformist تھے۔ منشا یاد نے آتے ہی شہر میں گھوم پھر کر کونوں کھدروں سے Non-Conformists نان کنفرمسٹس کو جنہیں عام زبان میں ادیب کہتے ہیں، اکٹھا کیا۔ ادبی محفلوں کی رسم ڈالی۔ ادیبوں کو اپنی گاڑی میں ڈھو ڈھو کر محفلیں جمائیں۔ ابتدا میں یہ محفلیں نیشنل سنٹر میں ہوتی تھیں۔

پھر منشا یاد نے سی ڈی اے کے معصوم صاحبوں کو ورغلایا۔ انہیں کہا سرجی بنگلے تعمیر کرنے سے شہر نہیں بنتے۔ اگر صاحبوں کو اس کالونی کو شہر بنانا ہے تو یہاں کلچر کے فروغ کی چیزیں بنائیے جہاں لوگ اکٹھے ہوں مل بیٹھیں۔ اپنی بات کو تقویت دینے کے لئے اس نے ریفرنس کے طور پر شعر پڑھ دیا کہ جناب والا شاعر کہتا ہے ''پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا''

سی ڈی اے کے صاحب منشا یاد کے بہکاوے میں آگئے۔ انہوں نے اقبال ہال بنا دیا۔ منشا نے ہال کا ایک کمرہ ادبی محفلوں کے لئے مخصوص کروا دیا۔ صاحبوں کو شعور نہ ہوا کہ منشا یاد اسلام آباد میں Non Conformist یعنی میں نہ مانوں اسپرٹ کو ہوا دے رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ ادبی محفلیں فائیو سٹار ہوٹلوں تک جا پہنچی ہیں۔

شخصیت کے لحاظ سے منشا یاد دورنگی ہے۔ بیک وقت اس کی شخصیت سرخ بھی ہے اور سبز بھی۔ اس میں قیام بھی ہے اور حرکت بھی۔ پانی بھی ہے اور مٹی بھی۔ مادہ بھی ہے اور انرجی بھی۔ اس کی شخصیت فن کارانہ بھی ہے اور غیر فن کارانہ بھی۔ ان دونوں میں کوئی ربط نہیں بلکہ تضاد ہی تضاد ہے۔ ایک میٹھی ہے دوسری پھیکی۔ وہ دونوں آپس میں ملی جلی ہیں مگر ایسے کہ ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ سوکنیں ہونے کے باوجود آپس میں لڑتی جھگڑتی نہیں۔ یوں گھر میں یک جہتی کی فضا قائم رہتی ہے۔

یہ حیرت کی بات ہے۔ لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو حیرت انگیز مخلوق پیدا کرنے سے بڑی دل چسپی ہے۔ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک لذیذ و شیریں دوسرا تلخ اور شور اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو ان دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

مثلاً بحیرۂ روم اور بحر اوقیانوس آبنائے جبرالٹر کے ذریعے ملے ہوئے ہیں۔ لیکن دونوں سمندروں کی اپنی اپنی کیفیات دائم و قائم ہیں۔ بحیرہ روم کی اپنی حرارتی کیفیات ہیں، اپنا نمکیاتی تناسب ہے اور بحر اوقیانوس کی اپنی کیفیات ہیں۔ ملے ہوئے ہونے کے باوجود ان کی کیفیات گڈمڈ نہیں ہونے پاتیں۔

یہ میں نہیں کہہ رہا یہ آج کے سائنس دان کہہ رہے ہیں۔ وہ حیران ہیں کہ اس بات کا ہمیں آج علم ہوا ہے لیکن قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس کی نشان دہی کی تھی۔ یہ تو تھی سمندروں کی بات۔ انسانی شخصیت میں ایسی حیران کن باتیں عام پائی جاتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ منشایاد کی شخصیت دومونہی سانپ جیسی ہے۔ عام سانپ کے ایک سرے پر سر ہوتا ہے اور دوسرے سرے پر دم۔ دومونہی سانپ کے دونوں سروں پر سر ہوتا ہے۔ جب وہ چاہتا ہے ایک سر کو اٹھا کر ادھر چلنے لگتا ہے جب چاہتا ہے دوسرے سر کو اٹھا کر ادھر چلنا لگتا ہے۔ نفسیات کی رو سے فن کار کی شخصیت میں الجھاؤ ہوتے ہیں ٹیڑھ میڑھ ہوتی ہے۔ بھنبھیریاں چلتی ہیں۔ فن کار انٹروورٹ ہوتا ہے۔ اپنی میں میں ڈب جھلکے کھاتا رہتا ہے۔ اس میں ضبط نہیں ہوتا۔ قیام نہیں ہوتا حساسیت اور شدت کی وجہ سے بے چین رہتا ہے وہ پریکٹیکل نہیں ہوتا۔ عمل سے گریزاں رہتا ہے۔ زندگی میں ویل ایڈجسٹڈ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے فن کار کی شخصیت کو ٹیڑھی لکیر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

یہی بات میرے لئے باعث حیرت ہے کہ منشایاد فن کار ہونے کے باوجود سیدھی لکیر ہے جیسے فٹے سے لگائی گئی ہو۔

منشایاد ایک معقول آدمی ہے پریکٹیکل ہے۔ عمل کا قائل ہے۔ رسمی معززیت کا دل دادہ ہے۔ سوشل ہے۔ زندگی میں Well ایڈجسٹڈ ہے۔

منشایاد شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا، ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنے گاؤں کا واحد تعلیم یافتہ فرد ہے جو مرکزی حکومت میں بڑے عہدے پر فائز ہے۔ اپنی تعلیم اور کردار کی وجہ سے وہ گاؤں میں معزز ترین فرد سمجھا جاتا ہے۔ گاؤں والے اس کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ اس کی بُردباری، نیک نیتی اور بے لاگ لگاؤ میانہ روی کی وجہ سے گاؤں والے اس کے ہر مشورے کو حکم کا درجہ دیتے ہیں جس کی تعمیل کرنا لازم ہے۔ گاؤں میں بڑے سے بڑا جھگڑا اس کی سفارش پر ختم کر دیا جاتا ہے اور دونوں پارٹیاں خوش دلی سے راضی نامے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے منشایاد کے چہرے پر معززیت اور سنجیدگی کے دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کا چہرہ گونگا ہے اور اس کی sned prestige زودحس! یہی اس کی شخصیت کا سب سے بڑا تضاد ہے۔ اس کا کردار روایت زدہ ہے لیکن اس کی سوچ اور فن، انفرادیت کے حامل ہیں۔ اس کی زندگی دو محوروں پر گھومتی ہے۔ رسم و روایت اور فنی انفرادیت۔

میری بہو نے منشایاد کا ایک افسانہ پڑھا۔ بڑی متاثر ہوئی۔ مجھ سے کہنے لگی یہ منشایاد خوب لکھتا ہے۔ میں نے کہا خوب نہیں بہت خوب لکھتا ہے۔ اتفاق سے اسی روز منشایاد آ گیا۔ تہمینہ نے پہلی مرتبہ اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ چلا گیا تو کہنے لگی۔ وہ افسانہ اس منشایاد نے لکھا تھا۔ میں نہیں مانتی۔ یہ شخص وہ افسانہ نہیں لکھ سکتا۔ میں نے کہا وہ افسانہ باہر کے منشایاد نے نہیں لکھا۔ اندر کے منشایاد نے لکھا ہے۔ میں نے کہا پیاری یہ باہر کا منشایاد ایک گھریلو آدمی ہے۔ گھر کا سودا خود لاتا ہے۔ بہت بڑا منتظم ہے۔ دفتر میں بڑا انتظامی افسر ہے۔ بڑا قابل اعتماد فرد ہے۔ جملہ دوستوں سے رسمی میل جول رکھتا ہے۔ رکھ رکھاؤ کا رسیا ہے۔ چہرے پر معززیت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور معزز چہرے بے حس ہوتے ہیں۔ فن کار ہونے کے باوجود منشایاد ایک گھریلو آدمی ہے، گھر کے سارے کام خود کرتا ہے۔ اگرچہ بیٹے جوان ہو چکے ہیں، برادری کی ہر رسم میں شمولیت کرتا ہے۔ ہر رواج کو نباہتا ہے۔ گھر میں ہیڈ آف دی فیملی کی طرز سے دار دستار باندھے رکھتا ہے۔ دفتر میں وہ یوں کام کرتا ہے جیسے پیدائشی کلرک ہو۔ اگرچہ افسر ہے لیکن رویہ مسٹر جان کا سا ہے۔ مسٹر جان ایک بڑے صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ بڑے صاحب نے پوچھا۔ مسٹر جان آپ نے یہ رپورٹ دیکھ لی، یس سر مسٹر جان نے جواب دیا۔ بڑے صاحب بولے۔ آپ اس پر نظر ثانی کر لیں۔ مسٹر جان نے کہا۔ سر جس چیز کو جان ایک بار دیکھ لے اسے نظر ثانی کی ضرورت نہیں رہتی۔

منشایاد نے اپنے افسر اعلیٰ سے کہا۔ سر ایک بات یاد رکھئے کہ منشایاد کی میز پر کوئی کاغذ یا فائل کبھی pending نہیں رہتا۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھئے۔

منشایاد نے بڑی دیر تک یہ بات دفتر والوں سے چھپائے رکھی کہ وہ ادیب ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ افسروں کو پتہ چل گیا تو وہ بات بات پر طعنہ دیں گے کہ چھوڑو منشایاد کی کیا بات کرتے ہو وہ تو کہانیاں لکھنے والا ہے۔

مجھے یاد ہے تقسیم سے پہلے ایک انگریز افسر نے مجھے اپنے دفتر میں آسامی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگا اچھا تو آپ افسانہ نویس ہیں۔ معافی چاہتا ہوں ہمیں دفتر میں کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ Imagination والے ڈسپلن کو خراب کرتے ہیں۔ منشایاد کا کردار ویسے تو بڑا مستحسن ہے لیکن اس میں ادیبانہ شان نہیں ہے۔ میرے ایک عزیز دوست شاعر تھے۔ ان کی بیوی حاملہ تھی۔ آخری دن تھے۔ انہوں نے ازراہ ہمدردی بیوی سے کہا بیگم آج کھانا نہ پکائیں۔ میں ابھی بازار سے کھانا خرید لاتا ہوں۔ اگلے دن جب وہ گھر واپس آئے تو نوزائیدہ بچہ پنگوڑے میں پڑا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

میرے ایک اور دوست جو جانے پہچانے شاعر تھے، دفتر کے کام میں بڑے ماہر تھے۔ وہ خود دفتر نہیں آیا کرتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان کے ہم کار انہیں ڈھونڈ کر تانگے میں ڈال کر دفتر لایا کرتے تھے۔ اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ہوش میں آ جاتے اور پھر دنوں کا کام گھنٹوں میں ختم کر دیتے۔

منشایاد کی ادب دوستی اور ادیب نوازی نے ہمیں بُری طرح زچ کر رکھا ہے۔ منشایاد کا ڈرائنگ روم ادیبوں کا ریسٹ ہاؤس بھی ہے اور ریستوران بھی۔ اس کی بیوی ادیبوں کے لیے چائے بناتے بناتے بوڑھی ہو گئی ہے۔

منشایاد ذات کا انجینئر ہے لیکن اس کی گاڑی سے انجینئروں کی نہیں

بلکہ ادیبوں کی بو آتی ہے کیوں کہ اس نے ادیبوں کو لفٹ دینے کا کام اپنا رکھا ہے۔ گھر سے محفل تک محفل سے گھر تک۔ منشایاد کی نوٹ بک میں ادیبوں کے اَپ ٹو ڈیٹ پتے، فون نمبر اور دیگر کوائف ریکارڈ کئے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم سب اسے ادبی انسائیکلو پیڈیا سمجھتے ہیں۔

یہ ادب دوستی کی بیماری بہت پرانی ہے۔ 1960 میں جب وہ اسلام آباد میں آیا تو یہاں ادبی اور ثقافتی ایکٹیویٹی کا فقدان تھا۔ منشایاد نے یہاں کے ادیبوں کو اکٹھا کیا اور بزمِ ادب کی بنیاد ڈال دی۔ 1972 میں اس نے حلقہ اربابِ ذوق کا اجرا کیا، پھر سی ڈی اے سے کہہ کر اقبال ہال میں ایک بڑا کمرہ ادبی محفلوں کے لیے مخصوص کرا دیا۔ اسلام آباد میں ادبی ایکٹیویٹی کو وقار بخشنے کے لیے وہ باری باری ہر سینئر ادیب سے ملا اور انہیں محفل میں شمولیت پر راغب کیا۔ پھر اُس نے کتابوں کی رونمائی کے لیے بزمِ کتاب کا اجرا کیا۔ جب بات چل نکلی تو شہرت پسند لوگ مونچھ مروڑ کر میدان میں آ گئے۔ دقت یہ تھی کہ یہ لوگ صرف شہرت کے طالب تھے۔ کام سے جی چراتے تھے، اس لئے ان سے بات نہ بنی، ادھر منشایاد نام کا نہیں بلکہ کام کا دلدادہ تھا۔ کام کے حوالے سے میں نے منشایاد سا حریص آدمی نہیں دیکھا، اسے ادب میں اُونچا مقام حاصل کرنے کا جنون ہے اور اونچا، اور اونچا۔ اسے اس بات کا شعور نہیں کہ ادب میں وہ ایک خاصا مقام حاصل کر چکا ہے، اور اس کا شمار چوٹی کے افسانہ نویسوں میں کیا جا رہا ہے۔

اتنی چھوٹی عمر میں اس کے افسانوں کے چند مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے ڈیسک میں رسائل میں چھپی ہوئی کہانیاں اتنی تعداد میں موجود ہیں جن کے دو مجموعے بن سکتے ہیں۔ اس کے ذہن میں افسانے یوں پھوٹتے ہیں جیسے برسات میں خودرو کھمبیاں اُگتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس وقت بھی ایک غیر مطبوعہ افسانہ اس کی فائل میں لگا ہے۔ ایک افسانہ وہ لکھ رہا ہے اور ایک افسانے کا پلاٹ اس کے ذہن میں بے تابی سے سینگ مار رہا ہے کہ آ مجھے لکھ۔

منشایاد کے متعلق لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ علامتی افسانے لکھتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے کیوں کہ اس کے افسانے سمجھ میں آتے ہیں۔ البتہ منشایاد اپنے افسانوں میں علامت برتتا ضرور ہے، لیکن علامتی ہونا اور بات ہے، علامت برتنا اور بات۔ علامت برتنا قدیم فن ہے۔ شعرا اور نثر نگار ہمیشہ اپنے مضامین کو علامت سے سجاتے رہے۔

منشایاد کی معصومیت ملاحظہ ہو۔ اپنے چھٹے مجموعے درخت آدمی، میں اس نے مظفر علی سید کے تنقیدی مضمون سے اقتباس دیباچے کے طور پر شامل کر لیا ہے۔ یہ مضمون 'قومی زبان' کے جنوری 1990 کے شمارے میں چھپا تھا۔

مظفر علی سید بہت پڑھے لکھے دانش ور اور پروفیشنل نقاد ہیں۔ پروفیشنل نقاد میں چند ایک بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔

1۔ وہ west oriented ہوتا ہے۔ مغربی منکروں کی آرا کو اپنے فکر کی بنیاد بنا لیتا ہے۔

2۔ اس کا رخ تعمیری نہیں ہوتا اس لئے توجہ کمیوں اور کجیوں پر مرکوز رہتی ہے۔

3۔ اس کا رویہ non commital ہوتا ہے، صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کے مصداق وہ کھل کر بات نہیں کرتا۔ اس لئے تحریر میں رُو کومت جانے دو قسم کے جملے عام ہوتے ہیں۔

4۔ خود کرسی پر بیٹھ کر مصنف کو سامنے کھڑا کر لیتا ہے، اور اپنے فیصلے یوں سناتا ہے جیسے وہ حتمی سچائی کے آئینہ دار ہوں۔

مظفر علی سید نے اپنے مضمون کا عنوان رکھا ہے "منشایاد: ایک کاریگر افسانہ نگار۔" ظاہر ہے کہ مظفر علی سید کی نگاہ میں افسانہ نویس فن کار نہیں بلکہ ایک ٹیکنیشن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بات کی وہ خود وضاحت کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ قصہ گوئی کا ہنر بھی کاریگرانہ ابلاغ کی ایک صورت ہے۔ مظفر علی سید اپنے مضمون کی ابتدا جرمن منکر کے اس قول سے کرتے ہیں کہ کہانی لکھنے کا فن آخری دموں پر ہے۔ مظفر علی سید کا کہنا ہے کہ آج کل افسانہ نویس اپنی انا کا پرچم اٹھائے پھرتا ہے اور جدید افسانہ سطحی اور نمائشی دانش وری کی دین ہے۔

سیانے کہتے ہیں اگر کسی موضوع سے آپ کو دلی ہم دردی نہیں ہے تو اُس موضوع پر لکھنے کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں۔

مظفر علی سید اس مضمون میں منشایاد کی تحریروں کی تعریف تو کرتا ہے لیکن reservation کے ساتھ۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ ڈنڈی مار رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مظفر علی سید نے یہ مضمون اپنی انا کا پرچم لہرانے اور اپنی دانش وری کا رعب جمانے کے لئے لکھا ہے لیکن مظفر علی سید کا یہ مضمون ایک الگ موضوع ہے۔ منشایاد کی معصومیت کا بھی جواب نہیں جس نے ایسے مضمون کے اقتباسات کو اپنی کتاب میں جگہ دی۔

میری دانست میں منشایاد واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں ہمارے دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہی دلاتا ہے۔ ہمیں اپنی روایات اور شناخت کی یاد دلاتا ہے۔ city oriented ہونے کی وجہ سے ہم اپنی روایات سے کٹ گئے ہیں۔ ہمارا کلچر کھچڑی کلچر بن کر رہ گیا ہے۔ ہمارے دانش ور west oriented ہونے کی وجہ سے مظفر علی سید بن گئے ہیں۔ اپنی فوک وزڈم کو ہم بھلا چکے ہیں۔ ترقی پسندوں نے مسلسل پراپیگنڈا سے ہمیں یقین دلایا کہ ہمارے عوام مل مزدور ہیں۔ ہمارے اخبار عوام کے نمائندے بنے بیٹھے ہیں۔ ہمارے سیاستیوں کے نزدیک عوام وہ ہیں جو نعرے لگانے اور ووٹ دینے کے کام آتے ہیں۔ منشایاد وہ واحد افسانہ نویس ہے جو ہمیں اپنے اصلی دیہاتی عوام کے جذبات سے آگاہ کرتا ہے اپنی لوک روایات کی یاد دلاتا ہے۔ جو ہماری شناخت ہیں۔

OO

واقفیت

افسانے کے شہر کا دروازہ

عطاالحق قاسمی

محمد منشایاد کے ساتھ میری اور امجد اسلام امجد کی دوستی بہت پرانی ہے۔ پرانی چیزوں کی جھاڑ پونچھ کی عموماً ضرورت پڑتی ہے، چنانچہ ہم ایک دوسرے کو اکثر جھاڑ لیتے ہیں اور کبھی ''پونچھ'' بھی لیتے ہیں اور یوں دوستی کا یہ سلسلہ پوری خوش اسلوبی سے جاری ہے۔

منشایاد مجھے اور امجد کو علیحدہ علیحدہ مل کر بہت خوش ہوتا ہے۔ کہتا ہے تم دونوں علیحدہ علیحدہ ملتے ہو تو بہت عزت سے ملتے ہو، لیکن جب تم اکٹھے ہو جاتے ہو تو پتہ نہیں تمہیں کیا ہو جاتا ہے، خواہ مخواہ مجھ پر حملہ آور ہو جاتے ہو اور اُلٹی سیدھی جملے بازی شروع کر دیتے ہو، حالاں کہ سچی بات یہ ہے کہ جب ہم منشا سے الگ الگ ملتے ہیں تو جی اُس وقت بھی یہی چاہ رہا ہوتا ہے، مگر احتیاطاً ایسا نہیں کرتے کہ منشایاد جملے بازی کے جواب میں ''محمد علی'' کلے بن جاتا ہے اور اکیلے ہونے کی صورت میں اس سے ہمیں چھڑانے والا کوئی نہیں ہوتا!

یہی حال خود منشایاد کا بھی ہے، وہ بھی جب ہم دونوں سے اکیلا ملتا ہے تو بالکل ٹھیک ہوتا ہے، لیکن جب وہ اپنے افسانے کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم دونوں کو بولنے جوگا نہیں چھوڑتا۔ اس وقت ہم بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور اُس کے سامنے عقیدت سے یوں سر جھکا دیتے ہیں، جیسے وہ پیر صاحب ہوں اور ہم نے اُن کے دستِ حق پر بیعت کر رکھی ہو۔

یہ پیر صاحب کے حوالے سے یاد آیا کہ منشایاد علامہ اقبال کے مصرعے ''اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری'' کا بہت بڑا ماننے والا اور اُس کا عظیم پرچارک ہے۔ دیہی زندگی کے حوالے سے اس کے لکھے ہوئے افسانے ان ہی سلطانوں ان ہی ملاؤں اور ان ہی پیروں کی چیرہ دستیوں کے حوالے سے ہیں جو ہمارے معصوم اور سادہ لوح لوگوں کی زندگیوں میں زہر گھولتے رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کاندھوں پر لٹھ اُٹھائے اُن کے پیچھے ہوتا ہے، اور وہ دُم دبا کر بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ تو واقعات کی تصویر کشی اتنے خوب صورت اور فن کارانہ انداز میں کرتا ہے کہ افسانہ پڑھتے ہوئے قاری کا دھیان صرف افسانے کے پیچ و خم میں اُلجھا رہتا ہے۔

پتہ تو اُسے اُس وقت چلتا ہے جب یہ افسانہ ختم ہوتا ہے اور دیہی معاشرے کے یہ ظالم کردار اپنی گھناؤنی صورت میں پوری طرح قاری پر آشکار ہو جاتے ہیں۔ ایک بڑے اور چھوٹے لکھنے والے میں یہی فرق ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے لکھنے والے کی منزل پہلی ہی سطر میں قاری کے سامنے آ جاتی ہے اور وہ قاری کو باقی پینڈا خواہ مخواہ طے کراتا ہے، جب کہ بڑا لکھنے والا قاری کو نہایت مشکل راستوں کا سفر اپنے دل میں اُتر جانے والوں سے اس طرح طے کراتا ہے کہ اُسے منزل دُور نہیں لگتی اور یہ احساس بھی اُسے منزل پر پہنچنے کے بعد ہوتا ہے کہ وہ کن ہول ناک راہوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ منشایاد کی بھی یہی تکنیک ہے۔ وہ ہمیں نیم تاریک راہ داریوں سے گزارتا جب آخری سرے پر پہنچتا ہے، تو اچانک کئی سو پاور کا ایک بلب روشن ہو جاتا ہے جس سے وہ تمام راستے روشن ہو جاتے ہیں جن سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

منشایاد کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ صرف پسے ہوئے طبقے کی دبی دبی چیخیں اور آہیں قاری کے کانوں میں اُنڈیلتا ہے، ایک چوتھائی سچ ہے، کیوں کہ اس کے افسانوں میں انسانی فطرت کے حوالے سے اتنی باریک باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ اس پر ماہر نفسیات ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں جبر اور گھٹن کے حوالے سے اس نے جو کہانیاں لکھی ہیں میرے خیال میں اس دور میں شاید کسی نے بھی اس سے بہتر اور مؤثر نہیں لکھیں۔

ہمارے ملک میں گزشتہ پچاس برس سے جو نظام نافذ ہے اس کے نتیجے میں آج ہمارا معاشرہ بچوں کے اس غول جیسا ہے جو منشا کے افسانے 'تماشا' میں مداری کے گرد جمع ہوتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ پر اس سے زیادہ دردناک اور دل ہلا دینے والا تبصرہ افسانے کی صورت میں شاید کسی نے بھی نہیں لکھا۔ اسی طرح ملک جب بھی ترقی کے راستے پر گام زن ہونے لگتا ہے، تو ایک طالع آزما کہیں سے نمودار ہوتا ہے

ٹانواں ٹانواں تارا: اشفاق احمد کے تاثرات

منشایاد فکشن دی دنیا وچ بہت اگے نکل گیا اے تے ہن جھات مار کے ایہہ دسن دی لوڑ باقی نہیں رہ گئی پئی اگیرے جان والی منڈلی وچ جہڑے دوتن سب توں اگا نہہ جاندے نظر آندے نیں اوہناں وچ اک منشایاد وی اے۔

اسیں سارے ای ایس گل دی پکی آس لائی بیٹھے سی پئی منشایاد اُردو ادب نوں اک چنگا چوکھا تے بھرواں جہیا ناول عطا کرے گا، جہڑھا اوہدے اسلوب دے سوجھورے نوں سرے تے گنڈھ مار کے اوہدے فن دا ستارا کر دے گا۔ پر منشا نے اردو دی تھاں ....

(ترجمہ)

فکشن کی دنیا میں منشایاد بہت آگے نکل گیا ہے اور اب دور سے دیکھ کر پہچاننے میں کوئی دقت نہیں رہی کہ دو تین آگے جانے والوں میں ایک منشایاد بھی ہے۔

ہم بھی قوی امید لگائے بیٹھے تھے کہ منشایاد اردو ادب کو ایک بہت اچھا اور بھرپور ناول عطا کرے گا جو اس کے اسلوب کو اپنے اندر سمیٹ کر اس کے فن کا ستارا کر دے گا مگر منشا نے اردو کی جگہ پنجابی میں 'ٹاواں ٹاواں تارا' لکھ کر اس بات پر مہر لگا دی ہے (ثابت کر دیا ہے) کہ زبان خواہ کوئی ہو منشا کا قلم ایک جیسے پھول پودے لگا کر ایک جیسی بہاریں سجا سکتا ہے۔ جب بھی اس ناول کو اردو میں ترجمہ کیا گیا اور منشا کے بچے کھچے (اردو) قارئین نے بھی اس کو پڑھا تو پھر وہ یقینا قریب ہم نوا ہو کر کہیں گے کہ بابا تم سچ کہتے تھے تمہاری آواز اب ہمارے دلوں کی آواز بھی بن گئی ہے۔

اس ناول میں منشایاد نے بڑی دنیا سمیٹی ہے اور طرح طرح کے کرداروں کا مینا بازار لگا کر کردار نگاری کی دیوار اٹھا دی ہے (انتہا کر دی ہے)۔ میرے خیال میں یہ ناول ولایتی اور روسی ناولوں کے سلسلے کا وہ آخری ٹکڑا ہے جو وقت کی تقسیم کی وجہ سے آج ہم تک پہنچا ہے۔ اس کہانی کے خیمے کی طنابیں اتنی کسی ہوئی ہیں جو ایک بڑے، عظیم اور گھیر لینے والے ناول کو اَن تولی دھرتی پر تول کے رکھنے کے لئے پختہ بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔

واہ منشایاد! اللہ کرے تم اور بہت کچھ لکھو اور لکھتے رہو۔ اشفاق احمد (1997)

اور ترقی کی اس گاڑی کو، ریورس گیئر میں ڈال دیتا ہے۔

چناں چہ اس موضوع پر منشا کا افسانہ 'بوکا' آج بھی اتنا ہی ریلیونٹ relevent ہے جتنا کل تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انسان شعوری سطح پر اشرف المخلوقات اور لاشعوری سطح پر اسفل السافلین ہے۔ منشا کا خیال بھی یہی ہے۔ چناں چہ اس کا افسانہ 'دام شنیدن' پڑھ کر منشا کی طرح مجھے بھی گوشت خوری سے نفرت ہو گئی ہے، تاہم (اس) تقریب کے اختتام پر میرا، اور منشا کا پروگرام مزنگ چونگی جا کر کڑاہی گوشت کھانا ہے کہ ہم دونوں بطور انسان اپنی سفاکانہ فطرت سے بہر حال باہر نہیں جا سکتے!

منشایاد کی شخصیت اور اس کے فن کے بارے میں کہنے کی بے شمار باتیں ہیں، لیکن اس نوع کی محفلوں میں میں کم گوئی کا عادی ہوں، تاہم آخر میں مجھے اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ آج اگر علامتی اور تجریدی افسانہ اپنی قاری سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانہ نگار خود کو نظریاتی کہلانے کے شوق میں اُن موضوعات پر افسانے لکھتا ہے جن سے اپنے حلقے میں وہ کمیٹڈ committed افسانہ نگار سمجھا جائے۔

مگر اس عمل کے دوران گھپلا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا نظریہ تو سامنے آ جاتا ہے، کہانی کے خدوخال سامنے نہیں آتے۔ کہانی کی عفیفہ بھاری بھرکم نظریے کے بوجھ تلے آخری سانسیں لیتی رہتی ہے اور جب قاری اس کہانی اور کہانی کار دونوں پر لعنت بھیجتا ہے، تو پھر ناقدری زمانہ کا گلہ کیا جاتا ہے۔ منشایاد کے موضوعات اس کی کہانی میں گھلے ملے ہوتے ہیں، وہ پہلے افسانہ نگار ہے اور بعد میں کچھ اور ہے۔

افسانہ منشی پریم چند سے چلتا ہوا، انتظار حسین تک، اور انتظار حسین سے منشایاد تک، پہنچا ہے اور اس کے سارے پیش رو اس پر فخر کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اب عہد جدید تر میں منشا سے بڑا افسانہ نگار کوئی نہیں۔ آج کا اُردو افسانہ اگر شہر ہے تو منشایاد اس شہر کا دروازہ ہے۔ OO

شخصیت

مت سہل ہمیں جانو

اکبر حمیدی

جس طرح لاہور کے ساتھ شاہی قلعے، انارکلی اور مینارِ پاکستان کا تصور وابستہ ہے اسی طرح اسلام آباد کا خیال آتے ہی ذہن میں منشایاد آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے ایک جملے کو اگر تھوڑا سا تبدیل کر لیا جائے تو میں کہوں گا اسلام آباد ایک چھوٹا سا منشایاد ہے اور منشایاد ایک بڑا سا اسلام آباد۔

منشایاد پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہے اور ادب اس کی محبت ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعمیر اس کا پیشہ ہے اور تخلیق اس کا شوق۔ اس نے ادب کی خاطر بہت قربانیاں دی ہیں، مواقع ملنے کے باوجود مڈل ایسٹ وغیرہ محض اس خیال سے نہیں گیا کہ وہ ادب اور ادبی محفلوں سے دور ہو جائے گا۔ اس شہر کی داغ بیل ڈالنے اور تعمیر و ترقی میں اس کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔ 1958 کے آغاز میں وہ کالج آف ٹیکنالوجی رسول سے سول انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کر کے شیخوپورہ سے راولپنڈی پہنچا۔ پھر کچھ عرصہ مری میں تعینات رہا۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے اسے یہ سارے شہر ادھورے ادھورے سے لگنے لگے چنانچہ اس نے جلد ہی ان سب شہروں کو ملا کر اپنی پسند کا الگ شہر تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مئی 1960 میں اس نے اس بے آب و گیاہ علاقے کا سروے شروع کر دیا جہاں اب ہرا بھرا اور سرسبز و شاداب اسلام آباد ہے۔ جوں ہی اس شہر کی کچھ صورت شکل بن گئی اس نے اس میں ادبی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ شروع میں اس نے لکھنے والوں کی انجمن قائم کی پھر 1972 میں حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی جس کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ابنِ انشا مرحوم نے خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اب اسلام آباد بھی ثقافت (اور ادب) سے آلودہ ہونے لگا ہے۔

گذشتہ پندرہ سال سے میں منشایاد کے شب و روز اور اس کی زندگی کے ہر گوشے میں شریک ہو رہا ہوں۔ وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ اس نے زندگی اور ادب میں موجودہ مقام تک پہنچنے کے لئے بڑی محنت کی ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے گذشتہ تیس برسوں میں اس نے یہاں کے ادیبوں شاعروں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور یہاں کے ادیبوں شاعروں نے اسے کتنی محبت لوٹائی ہے۔

1980 میں جب میں اسلام آباد آیا تو سب سے پہلا شخص منشایاد تھا جس نے مجھے یہاں مستقل طور پر ٹھہرنے کے لئے حوصلہ دیا۔ میں نے اسے اپنے مسائل بتائے اور اس نے ایک ایک کر کے سب کے حل بتا دیئے جیسے کوئی پڑھا کو بچہ ٹو کویں (کہیں کہیں سے) پہاڑے سنا دیتا ہے۔ اول اول میں سمجھا یہ حسنِ سلوک صرف مجھی سے ہے مگر پھر معلوم ہوا کہ یہ تو اس کی 'عادت' ہے کہ اس سے کوئی راہ گیر راستہ پوچھے تو وہ اسے محض راستہ ہی نہیں بتاتا اکثر گھر تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔

منشایاد اپنے محکمے کے مختلف شعبوں میں کام کرتا رہا ہے۔ کچھ عرصہ وہ پبلک ریلیشنز آفیسر بھی رہا اور اس نے پبلک ریلیشننگ کے کچھ گُر بھی سیکھ لئے بلکہ شاید اسے فلاح کا کام کہنا چاہئے کہ رائٹرز ہاؤسنگ سوسائٹی کو جو 25 پلاٹ ملے اس میں سی ڈی اے کے سابق چیئرمین سید علی نواز گردیزی کے علاوہ منشایاد کی مساعی بھی شامل تھیں۔ اسلام آباد میں ہر سال یوم آزادی کے موقع پر کل پاکستان مشاعروں کی طرح بھی اسی دور میں منشایاد نے ڈالی اور ان میں پڑھے جانے والے کلام کو باتصویر مجلوں کی صورت شائع بھی کیا۔

ریٹائرمنٹ سے پہلے منشایاد اپنے محکمے (دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے) میں چیف کمپلینٹس آفیسر یعنی افسر اعلیٰ شکایات کے طور پر کام کر رہا تھا جو انجینئرنگ اور عوامی بہبود کی ملی جلی جاب ہے۔ اس کے بے تکلف احباب اس کا پنجابی ترجمہ "سب توں وڈا شکایتی" بھی کرتے تھے لیکن منشایاد شکایتیں کرتا نہیں سنتا اور دور کرتا تھا اور ایک ایسے ادارے کے اہل کاروں سے کام نکلوانا جس کے بارے میں انور مسعود نے اپنے دشمن کو بددعا دی تھی "جا تجھے سی ڈی اے سے کام پڑے" کوئی آسان کام نہیں ہے۔

شروع میں میرا خیال تھا کہ منشایاد کا خدمت کا وطیرہ پبلک ریلیشنگ کی غرض سے ہے لیکن کئی برس دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ تو اس کے خمیر میں رچا ہے اور یہ سلسلہ محض اپنے خاندان اور ادیب برادری تک محدود نہیں اس کے گاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ جبھی وہ اکیلا شیخوپورہ سے آیا تھا اب اسلام آباد کے اندر ایک

شیخوپورہ آباد ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کا پہلا لڑکا تھا جس نے پرائمری سے آگے تعلیم جاری رکھی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی اس کی گاؤں میں بڑی عزت اور اہمیت تھی اور لکھنے پڑھنے کے ہر کام میں گاؤں والے اس سے مدد لیتے تھے۔ (اس کے گاؤں میں عام لوگ کم اور ڈاکو زیادہ تھے)۔ مالیے آبیانے کی رسیدیں اور خط پڑھنے سے لے کر مقدموں کی تاریخیں اور بستہ ب کے بدمعاشوں کو راہ داریاں لکھ کر دینے تک سارے کام اس کے ذمے تھے۔ چنانچہ اس کی حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی اور اب جب کہ اس کی تصویر اخبار میں چھپتی، اس کے ڈرامے اور بھی وہ خود گاؤں کی چوپال کے ٹی وی پر نظر آتا ہے، وہ گاؤں سے دور رہتے ہوئے بھی گاؤں والوں کے دلوں کے اور قریب ہو گیا ہے۔

منشایاد کا گھر، افسانہ منزل، ادیبوں کے لئے ٹی ہاؤس ہے اور وہ خود چلتی پھرتی ادیبوں کی ڈائریکٹری۔ کبھی کبھی مجھے وہ حاتم طائی کی طرح لگتا ہے جو لوگوں کے سوالات پورے کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احسان میرا

منشایاد پرلے درجے کا شریف آدمی ہے یا شاید بزدل کہ ہر شریف اور سفید پوش آدمی اصل میں بزدل ہوتا ہے۔ اس لئے افسانہ نگار لڑکیاں بے دھڑک اس سے ملتی ہیں جیسے وہ اس کی گہری سہیلیاں ہوں۔ بعض تو ضرورت پڑنے پر اس سے ذاتی مسائل پر مشورے بھی لیتی ہیں۔ اس لئے نن کی پرستار لڑکیاں اس سے مل کر مزید اس کی پرستار بن جاتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ شعر کہنے والی نوجوان لڑکیاں بھی اصلاح سخن کی خاطر اس سے ملنا بہتر سمجھتی ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ ایک تائب شاعر ہے اور شاعری سے توبہ بھی اس نے عین وقتِ شباب کر لی تھی۔ ادبی محفل کے اختتام پر لڑکیاں منشایاد کی گاڑی تلاش کرتی ہیں اور منشایاد بھی انہیں گھروں تک پہنچانے کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ صرف ایک دفعہ منشا کا کسی لڑکی سے رومان کا چرچا ہوا تھا مگر یہ لڑکی ادبی حلقوں سے باہر کی تھی، منشایاد بھی خوش ہوا کہ اسے بھی یہ اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ مگر معلوم ہوا یہ بامراد منشا کوئی اور ہے۔

ان سب نرمیوں، محبتوں اور برائیوں کے پیچھے منشایاد کی مضبوط شخصیت کارفرما ہے۔ وہ اکثر کہتا ہے کہ منشایاد کی اپنی ایک شخصیت ہے اور وہ اس کو بحال رکھے گا۔ وہ دوسروں کے طعنے سہنے اور الزام سن کر بھی اپنے حسنِ سلوک میں کمی نہیں آنے دیتا۔ اسی طرح وہ کسی ادبی سیاست میں اپنی شخصیت کو گم نہیں ہونے دیتا۔ وہ ایک روشن خیال اور سائنٹیفک سوچ رکھنے والا نیک دل آدمی ہے اس کے رویے اور اس کی تحریریں ان ہی الفاظ کے گرد گھومتی ہیں۔ راولپنڈی اسلام آباد میں وہ غالباً واحد افسانہ نگار ہے جس کے بیک وقت احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے خوش گوار تعلقات ہیں اور وہ 'فنون' 'اوراق' دونوں جگہ وقار کے ساتھ چھپتا ہے۔ اس کی امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی سے پرانی اور گہری دوستی ہے اور ڈاکٹر سلیم اختر اور انتظار حسین تو منشایاد ہی سے مل لینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ منشایاد میں خوب صورت لڑکیوں والی کوئی خوبی ہے جو دوسروں کو اس کی طرف کھینچتی ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہوں، شمس الرحمان فاروقی، جوگندر پال، بلراج مینرا، محمد علی صدیقی یا جمیل الدین عالی، منشایاد کے سب لوگوں سے خوش گوار اور دوستانہ مراسم ہیں۔ بقول ضیا جالندھری صاحب منشایاد میں سینس آف ڈپلومیسی بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔

اس نے خود افسانے لکھنے اور دوسروں کے لکھے ہوئے افسانوں کے انتخاب (انتھالوجیز) بھی شائع کئے۔ بہت سے ہلکے پھلکے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور کالم اور ایک آدھ انشائیہ بھی لکھا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی کئی ڈرامے لکھ چکا ہے اس کے ٹی وی سیریلز جنون، بندھن، راہیں اور پورے چاند کی رات بھی بہت مقبول ہوئے۔ 'راہیں' کو تو سال بھر کے بہترین سیریل کا پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ بھی ملا۔ اس کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ فلسفہ، مذہب، سائنس، تاریخ، طب اور نفسیات تو خیر کم و بیش سبھی پڑھتے ہیں لیکن ایک روز اس نے بتایا کہ وہ دراوڑی زبان کے الفاظ اور سنسکرت زبان سے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا ہے۔ غالباً اسے ہندی اور گورمکھی پڑھنا بھی آتی ہوگی کہ اس کی بہت سی کہانیوں کے تراجم بھارتی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ اس نے مجھے گراموفون ریکارڈ سنائے جو کسی مرحومہ بائی کے گائے ہوئے گیتوں کے تھے۔ ریکارڈ سن کر میں نے کہا منشا جی آپ کو معلوم ہے یہ بائی آپ کے دادا جان کی ہم عمر ہیں آپ کچھ خیال کریں۔ اس پر وہ مجھ سے لڑ پڑا۔

لتا منگیشکر کی آواز پر تو وہ باقاعدہ عاشق ہے۔ شاید ہی لتا کی کوئی اچھی تصویر یا اچھا گیت ہو جو اس کے پاس موجود نہ ہو۔ اسلم سراج الدین جب بھی جدہ یا گوجرانوالہ سے اسلام آباد آتا ہے یہ دونوں گھنٹوں لتا اور روشن آرا کے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی گیت سنتے رہتے ہیں۔ اکثر دونوں ایک دوسرے کو موسیقی کی کیسٹوں کے تحفے بھیجتے رہتے ہیں۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ڈاکٹر وزیر آغا اور منشایاد کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ ہر مذہب میں تھوڑے تھوڑے شامل ہیں اور ہر مذہب سے تھوڑے تھوڑے باہر۔ بہر حال منشایاد عیدین کی نماز بہت ہی اہتمام اور شوق سے پڑھتا ہے کہ بالکل ہی کافر نہ ہو جائے۔ منشایاد کے پاس زندگی کا اتنا گہرا اور متنوع تجربہ ہے۔ اتنا وسیع مشاہدہ ہے کہ میں نے اکثر محسوس کیا کہ وہ کہانیوں سے لبالب افسانہ نگار ہے اور اس کے گودام کبھی خالی نہیں ہوتے۔ آج اردو کہانی اپنے کہانی پن کی وجہ سے جو دوبارہ مقبول ہونے لگی ہے تو اس میں سب سے بڑا حصہ منشایاد کا ہے۔ OO

اعترافِ ہنر

منشایاد کے امتیازات

تخلیقات کے حوالے سے

امرتا پریتم

"روشنی اور اندھیرے کے درمیان ایک چیز ہوتی ہے جو دونوں جانب کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ وہ اندھیرے کو روشن اندھیرا، اور روشنی کو کلخائی روشنی بناتی ہے" یہ مصوری کے سلسلے میں لیونارڈو کے اہم الفاظ ہیں، لیکن مصوری اور ادب کی لپی خواہ الگ الگ ہوتی ہے، عبارت ایک ہوتی ہے۔ اس لئے یہ الفاظ محض مصوری تک محدود نہیں کئے جا سکتے، یہ ادب پر بھی اسی شدت کے ساتھ لاگو ہوتے ہیں۔

محمد منشایاد کی کہانیاں پڑھتے ہوئے، اس کے کہانی کہنے کے انداز کو دیکھ کر، مجھے لیونارڈو کے یہ الفاظ سطر سطر پر یاد آتے رہے اور یہی گواہی ہے کہ لفظوں میں پوشیدہ احساسات کیسے ایک اندھیرے کو روشن بنا سکتے ہیں اور کیسے ایک روشنی کو کلخائی روشنی۔ اور یہی سبب ہے کہ ان کہانیوں نے رات پڑے کہانیاں کہنے اور سننے کی روایت کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہ کہانیاں طلوع ہوتے سورج کی لالی کے وقت پڑھی جانے والی کہانیاں ہیں۔

رات گئے کہانیاں کہنے کی روایت کے پیچھے انسان کا اچیت (لاشعور) من ہے، جو کولہو کی طرح جتی ہوئی دیہاڑی کے بعد، رات کی نیند کے لئے اپنے خوابوں میں کچھ اُڈاری (پرواز) بھرنا چاہتا ہے تاکہ وہ ایسے گوشے کھنگال سکے جو دن کی روشنی میں اس کے لئے ممنوع ہوتے ہیں۔ مگر منشایاد کی کہانیاں جاگتے ہوئے باشعور، من کی کہانیاں ہیں اس لئے ان کہانیوں نے اچیت (سوئے ہوئے لاشعوری) مَن کے طے شدہ وقت کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اور اپنے لئے چڑھتے سورج کی لالی کا وقت مقرر کیا ہے۔ تاکہ انسان کے لئے جو کچھ بھی دن کی روشنی میں ممنوع ہے وہ اس کے پوشیدہ اسباب کی جڑیں تلاش کر سکے، خواہ وہ ہدایتوں اور روایتوں کی قابلِ پرستش جڑیں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کہانیاں ایک سان ہیں جن کے لفظ لفظ پر چڑھ کر انسان کی نظر تیز ہوتی ہے۔

میں منشایاد کی کہانیاں پڑھنے والے قارئین کی نظر کو سان مبارک، کہنا چاہتی ہوں۔

(رسالہ ناگ منی، دہلی۔ ماس اور منی نمبر)

۔پنجابی سے ترجمہ احمد سلیم

احمد ندیم قاسمی

محمد منشایاد اس دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کے مقابلے میں مجھے اس وجہ سے مختلف... اور خوش گوار حد تک مختلف لگتا ہے کہ وہ بڑبولا نہیں ہے۔ وہ اپنے ادب کی سرگوشی کو نشر کرنے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کرتا۔ وہ افسانہ لکھتے ہوئے بھی اور لکھ کر بھی اور چھپوا کر بھی اور سب افسانوں کو کتابی صورت میں مرتب کر کے بھی چپکا رہتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ سننے والے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں، مگر سرگوشی آفاق میں پھیلی ہوئی گونج بن جاتی ہے، جسے سننا نہ بھی چاہیں تو سنائی دے جاتی ہے۔ منشایاد کی کہانیاں یہی سرگوشیاں ہیں۔ ان کی سادگی پر نہ جایئے کہ یہ بہت گہرائی تک وار کرنے والی کہانیاں ہیں۔ موضوع یا اندازِ بیان کے مقابلے میں انہیں آرائش و زیبائش یا ڈوریوں پھندنوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہی فراق کے شعر والا معاملہ ہے کہ:

یوں ہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی چاند کا ٹکڑا نہ کوئی زہرہ جبیں

یہ سادہ نگاری افسانہ نویس کی خود اعتمادی سے پیدا ہوتی ہے اور منشایاد کے پاس خود اعتمادی کا ایک معقول سرمایہ موجود ہے۔ صرف ایک مقام پر وہ ذرا سا ڈگمگایا ہے جب وہ یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے کہ تخلیقی ادب کو مخصوص نظریات کے گملوں میں نہیں اُگانا چاہئے بلکہ اس کے لئے زمین پر آزادانہ

نشوونما ضروری ہے۔ آزادانہ نشوونما کا میں بھی قائل ہوں اور سانچوں اور مولڈوں molds کا میں بھی مخالف ہوں، مگر جب بھی ہر ادیب کا ایک خاص رویہ ہوتا ہے۔ یہی رویہ تو اس کا انفرادی اسلوب معین کرتا ہے اور اس رویے کو نظریہ کہتے ہیں۔

منشایاد کا بھی ایک واضح رویہ ہے۔ جب وہ اپنے افسانوں میں معاشرے کے متوسط طبقے اور محنت کش طبقے کے کرداری تضادات کو موضوع بناتا ہے تو وہ بالواسطہ طور پر اپنے رویہ کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔

پھر وہ جسے ہم انسانی تہذیب وتمدن کا ارتقا قرار دیتے ہیں، یہی تو ہے کہ انسان آزادانہ نشوونما میں ایک ترتیب، ایک تناسب، ایک قرینہ پیدا کرنے کے قابل ہو سکا۔ یہ آزادانہ نشوونما کی ایک ترقی یافتہ بازیافت ہے، اسی کو نظریہ کہتے ہیں۔

بس اتنا ہے کہ ادب میں نظریہ بین السطور ہی بھلا لگتا ہے۔ وہی بات کہ نظریے کا لاؤڈ اسپیکر لگ گیا تو ادب کا قصہ ختم ہو گیا۔ سو منشایاد چاہے اس بات کا بُرا مانے مگر میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ انسان اور زندگی اور اس کے حقائق کے بارے میں ایک غیر مبہم رویے کا ادیب ہے۔

وہ خود کہتا ہے کہ ادب براہِ راست، زندگی کی کتاب کے مطالعے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے... اور جب وہ یہ کہتا ہے تو اس کا رویہ تو بن گیا۔ نظریہ تو متعین ہو گیا۔ اور اس کے اپنے الفاظ میں... گملا تو لگ گیا۔ اور یہ میں منشایاد کی تنقید نہیں کر رہا ہوں، تحسین کر رہا ہوں۔

منشایاد ایک ایسا ہی افسانہ نگار ہے جس نے اپنے اردگرد حصار نہیں اُٹھا رکھے ہیں، بلکہ اس کے سامنے تو امکانات کے اُفق حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کی دُنیا میں اس کے بہت آگے بڑھ جانے، بہت دُور نکل جانے کے امکانات موجود ہیں۔ منشایاد کے اس بے حصار اور بے فصیل رویے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اُردو افسانے کی روایت کو اپنے جلو میں لے کر چلتا ہے، اور روایت سے دوستی اس شعور کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ جدید دور کا ادیب ہے اور جدید دور کے بعض اپنے مخصوص تقاضے بھی ہیں۔ ادب کی ہر صنف کو اس ذہن کے نوجوان دست یاب ہوں تو پھر ادب کے مستقبل کا بول بالا سمجھیے۔

'بند مٹھی میں جگنو' کو دو حصوں میں تقسیم کر کے منشایاد نے اپنے اس نقطۂ نظر کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے۔ پہلے میں حقیقت نگاری اور براہِ راست کہانی کہنے کا جو طرزِ عمل ہے وہ دوسرے حصے کے علامتی افسانوں پر بھی اپنا پرتو ڈال رہا ہے، اور یہی سبب ہے کہ منشایاد کی علامتیں بالکل سامنے کی اور بہت واضح علامتیں ہیں۔ اکاؤ کا کہانی ایسی بھی ہے جہاں علامت پکڑائی نہیں دیتی، مگر ایسی کہانی کو ہم زیادہ سے زیادہ تجرباتی ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ منشایاد کا مخصوص رنگ نہیں ہے اور ادب میں تجربوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کرنی چاہیے بشرطیکہ ہر تجربہ ادب رہے، غیر ادب یا اینٹی ادب نہ بن جائے۔

جو لوگ عمر میں آگے بڑھ جاتے ہیں انہیں پند ونصائح کے پتھر لڑھکانے کی عادت پڑ جاتی ہے، سو مجھے بھی یہ عادت پوری کرنی ہوگی۔ مجھے بھی ایک پتھر لڑھکانے کی اجازت ہونی چاہیے کہ میں منشایاد کو یہ دوستانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ بھائی، تم حقیقت پسندانہ کہانی لکھو یا علامتی یا استعاراتی یا مابعد الطبیعاتی، اس اعتماد کے ساتھ، اس حسن کاری کے ساتھ، اور اس سادگی کے ساتھ لکھتے رہو جس کی ایک بلیغ مثال تمہارا یہ مجموعہ 'بند مٹھی میں جگنو' ہے۔ تم عمر بھر ایک ہی دائرے گھومتے رہنے والے افسانہ نگاروں سے مختلف افسانہ نگار ہو۔ تم محض کہانی نہیں لکھنا چاہتے۔ کھل کر کہو، مستقبل نے تمہاری آواز پر کان لگا رکھے ہیں۔

('بند مٹھی میں جگنو' کی تعارفی تقریب کا خطبہ صدارت 1976ء لاہور)

اشفاق احمد

منشایاد کی کہانی کا اور اُس کے کہانی کہنے کے پینترے کا میں اُس دن سے قائل ہوں جس دن سے اُس کی کہانی 'داستان گو' میں چھپنے سے پہلے میں نے پڑھی تھی۔ میں نے اُسے خط لکھ کر پوچھا تھا کہ بھئی آپ کون ہیں اور آپ کا کیا ارادہ ہے؟

منشا نے ایک سیدھا سا خط لکھ کر یہ تو بتا دیا کہ وہ کون ہے مگر اپنے ارادے کو چھپا گیا اور کوئی بات نہ کی، بالکل وڑ وٹ گیا۔ پھر اس کے افسانے دھڑا دھڑ رسالوں اور اخباروں کے ادبی نمبروں میں چھپنے لگے اور شہرت کے معاملے میں وہ ہم سے بھی آگے نکل گیا۔ مگر یہ منشایاد کے اُردو افسانوں کی بات ہے۔

پنجابی کہانیوں کے معاملے میں مَیں نے کبھی غور کیا نہ ہی کسی نے مجھے بتایا کہ وہ جو اُردو میں مار و مار کیے جاتا ہے، وہ رانجھ پنجابی کے میدان میں بھی مشعلیں جلائے ہوئے ہے۔ پچھلے دنوں مَیں نے اُس کے چند افسانے پڑھے اور تشنگی بڑھ گئی۔ سید اختر حسین اختر نے تین کہانیاں بھجوائیں۔ مگر یہ پیاس کم نہ ہوئی۔

پھر سیدھا منشا ہی کو پوچھا، بھائی جو کچھ تمہارے پاس ہے دو چار دن کے لیے اُدھار دے دو۔ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا۔ اُس نے مجھے کوئی بارہ کہانیوں کی فوٹو کاپیاں بھجوا دیں اور میرا کام بن گیا۔

لیجیے صاحب! اب میں بالکل نہیں ڈرنے والا۔ آپ خواہ میری بات سُن کر جھجکتے رہیں، اور چاہے منشا بھی توبہ توبہ کرکے کانوں کو ہاتھ لگائے، مگر میں کہوں گا اور ببانگِ دہل کہوں گا کہ اس شخص کی کہانی میں افسانے کے دو بڑے اُستادوں کی رُوح اکٹھی ہوگئی ہے۔ ایک گورکی اور دوسرا موپاساں۔ کہانی کی شکل وشباہت اور وجود گورکی جیسا اور خاتمہ اور آخری چٹکی موپاساں جیسی۔ آدمی جو آرہے ہوتے ہیں آدمی جو جارہے ہوتے ہیں۔ اکیلے یا اکٹھے، گردنیں جھکائے یا ٹکٹکی باندھے جو بھی لوگ کھڑے ہوں، وہ سارے ہی منشا کے افسانوں میں ملتے ہیں، وہ سبھی کے سبھی اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ ناراض ناراض اور خفا خفا ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں لگتے۔ ان دیکھے، انجانے اور بے شناخت لوگ بھی کہیں دیکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں خواہ اُن میں سے کسی کے نام اور ٹھکانے کا پتہ نہ ہو۔

ایسی کردار نگاری اسی شخص کا کمال ہے اور اسی کا حصہ ہے۔ اس کی کہانیوں کے کردار بہت سیدھے سادے، بے چنک اور بے توقیر لوگ ہوتے ہیں۔ کسی میں کوئی پیچیدگی یا نفسیاتی کمزوری نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کو ہلا کر رکھ دے۔ تانگوں کے اڈوں، بس اسٹاپوں، ضلع کچہریوں اور سوئموں چہلموں کے لوگ... جو آتے رہتے ہیں اور جاتے رہتے ہیں۔ نہ بور کرتے ہیں نہ دماغ چاٹتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں لکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔

ہمارے اُستاد کہا کرتے تھے کہ (ہنچ بیک آف... ناسٹرڈیم) کی کردار نگاری سب سے آسان ہے۔ وہ ٹیڑھا ہے ترچھا بھی، بدشکل بھی اور بے عقل بھی۔ احساسِ کمتری کا زخم خوردہ بھی اور حسرتوں کا رکھوالا بھی۔ ایسے کردار پر جتنا بھی لکھتے جاؤ سب سچ ہوگا۔ سب صحیح معلوم ہوگا۔ کچھ قاری کے تجربے سے گزرا ہوگا، کچھ اُس کا گمان سمجھ لے گا۔ مگر آسان کرداروں کے بارے میں کچھ لکھنا اور پڑھنے والے کو ساتھ لے کر چلنا بڑا ہی مختلف اور مشکل کام ہے۔ اور ایسے مشکل کام کا منشا یاد بڑا سیانا ہے۔ وہ مشکل راستوں سے یوں گزر جاتا ہے، جیسے کائی والے تالاب کو چیر کر مرغابی گزر جاتی ہے۔ کبھی اُوپر سے اور کبھی غوطہ لگا کر۔

میرے خیال میں پنجابی کو آگے بڑھانے کے لئے یہ افسانے اتنے یادگار ہوں گے کہ آنے والا ناقد ان افسانوں کے حوالے سے ایک اہم پیش قدمی کے نئے موڑ، کے ذکر پر مجبور ہوگا۔ میری آج کی یہ پیشین گوئی کل کی حقیقت بن کر خود ہی سامنے آجائے گی۔

(پنجابی کے افسانوی مجموعہ وگدا پانی پر لکھے گئے دیباچے کا اردو ترجمہ)

اسد محمد خان

پہلی بات تو یہ کہ تم ایسی مستحکم بُنت کے ساتھ کہانی بُنتے ہو کہ ہر اعتبار سے یہ ایک finished product معلوم ہوتی ہے۔ جب نظم اور کہانی پوری شدت سے آنے کے لئے شور مچا رہی ہوتی ہے تب تم توجہ فرماتے ہو اور شاید اپنی انجینئرنگ کی تربیت سے مدد لے کر اپنے ڈرائنگ بورڈ پر اپنے سیٹ اسکوائر، اپنے کمپاس کی مدد سے اُسے کھینچ دیتے ہو۔ کم سے کم لائنوں (کم سے کم ضروری لائنوں) کی مدد سے۔ اب اگر ایک لائن بھی مزید کھینچی جائے گی تو فاضل اور غیر ضروری اور rob off کئے جانے کی سزاوار ٹھہرے گی اور یہ تمہاری کرافٹس مین شپ ہے، تمہارا مسلک ہے۔ کہانی بناتے ہوئے تمہارا طریقہ کار ہے۔ پھر گمان غالب ہے کہ تم اپنے first draft کو پالش کے عمل سے بھی گزارتے ہوگے۔ یعنی بار بار پڑھتے اور کا، کے، ہے، ہیں، اور وغیرہ کو صحیح جگہ بٹھاتے اٹھاتے ہوگے، یا جملے کے جملے نکالتے، شامل کرتے ہوگے۔ پھر شاید ستر دفعہ پڑھنے کے بعد ایک ایسا saturation point آجاتا ہوگا، جہاں تم کہانی کو دستخط کرکے تاریخ ڈال کر رکھ دیتے ہوگے اور بچوں کے ساتھ فلم دیکھنے یا یاروں کے ساتھ گپیں مارنے نکل جاتے ہوگے۔ اس عمل کے بعد اگر منٹو صاحب بھی تم سے کاٹنے بڑھانے کا مطالبہ کریں گے تو ٹکا سا جواب پائیں گے، گویا یہ کہانی لکھنے کا physical execution ہو سکتا ہے تمہارا۔ تمہاری کہانیوں کو پڑھنے کے بعد میں نے یہی محسوس کیا ہے۔

تم کہانیاں لکھتے ہو، شعر کہتے ہو گویا پینٹ کرتے ہو۔ یہ بات کہ تم روز ساڑھے نو بجے ڈیسک پر بیٹھ کر کہانی لکھنے نہیں بیٹھتے، مجھے تمہاری کہانیوں سے معلوم ہوتی ہے، جن میں کسی فارمولے پر وفاداری کے ساتھ عمل کرنے، کسی سوچی سمجھی، طے شدہ، منظور شدہ image کو ترتیب دینے، پروان چڑھانے، اور قائم رکھنے کا کوئی شائبہ تک نہیں ملتا۔ تم نعرے لگاتے ہوئے نہیں گزرتے ہو کہ میں باغی ہوں non conformist ہوں۔ میں احتجاجی ہوں، میں پرومیتھیس ہوں، میں کمٹڈ committed ہوں یا "میں یہ فریم توڑ رہا ہوں"، جب کہ تم نے ایک صفت زدہ تشبیہوں سے اَٹی ہوئی ووکیبلری vocabulary سے (جو ممکن ہے تمہارے جغرافیائی قرب میں رائج ہو) انحراف بھی کیا ہے۔ چھوٹی بڑی سامنے کی اور گہری subtle اور brash منافقت پر اور ناانصافیوں پر احتجاج بھی کیا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ تم نے بہت سے سانچے توڑے ہیں۔ تم کلیشے cliche سے بچنے والے آدمی ہو، اپنی زبان خود لکھتے ہو۔ رائج الوقت زبان یا رائج الوقت

لسانی فیشن تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ پنجابی ادبیات کی اعلیٰ سند اس نئی اُردو کے بہاؤ میں تمہارے کام آ رہی ہے، جسے آج کا ذہین نوجوان کہانی کار برصغیر کے طول و عرض میں ایک پُر شور دریا بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ تمہارے یہاں پنجابی کے الفاظ اور phrases کسی بدصورت پیوند کی طرح نہیں آتے بلکہ drafting کے ایک فطری groove میں بیٹھتے چلے جاتے ہیں۔

میرے عزیز دوست، میں بڑا jealous اور خاصا، سچ بولنے والا آدمی ہوں، اس لئے اگر میں یہ لکھوں کہ 'ماس اور مٹی' کی بعض کہانیاں پڑھتے ہوئے میں ایک عجب طرح کے رشک میں مبتلا ہوا ہوں تو اسے محض compliment نہ سمجھنا، ایک واقعہ کا اظہار جاننا۔ یہ کہانیاں 'راستے بند ہیں' 'کچی پکی قبریں' 'باگھ' 'کھیلی رات' 'ماس اور مٹی' (لاہور) [۴] 1978، کا آخری افسانہ 'پناہ' وغیرہ وغیرہ، اگر میں نے لکھی ہوتیں تو بہت اچھا تھا۔ ویسے منشایاد نے ایسی کہانیاں لکھ کر میرے ہاتھ مضبوط کئے ہیں، ہم سب کو مضبوط کیا ہے۔

ایک آخری بات یہ کہ تم under dogs کے کہانی کار ہو۔ گمی کاریوں کے اور خدا کے رگیدے ہوئے لوگوں کے اور کوڑے دان میں پڑے ہوئے rejected Homo Sapiens کے کہانی کار ہو۔ تم ان میں اُتر کے ان کی طرح محسوس کر کے ان کی بات اپنے دردمند لہجے میں کہنے کا ہنر جانتے ہو۔ تم 'راستے بند ہیں' کے، (وہ)، (میں) ہو۔ اس وقت کی کہانی کے پورے منظر میں شاید تم ایک ہی ایسے آدمی ہو جو ان چیزوں سے بھی محبت کر سکتا ہے جو اس نے نہیں بنائیں، تمہارا غصہ کسی صاحب حال صوفی کا غصہ ہے جس کی نسبت جلالی سے زیادہ جمالی ہے۔ تم خدا پر چیخ کر نہیں دوڑتے میرے عین الحق کی طرح موجودات کو سر سے بلند کر کے زمین پر نہیں دے مارتے تم اس garbage can سے ایک ٹوٹے ہوئے Homo Sapiens کو اُٹھاتے، جھاڑ پونچھ کر سینے سے لگاتے اور یہ دیکھ کر سرگوشی میں پوچھتے ہو، ''اے بندہ بنایا ای؟'' پھر تم اس بندے کا سارا latent حُسن اپنی کہانی کے رستے ہمیں منتقل کر دیتے ہو کہ سفال آفریدی، ایاغ آفریدم۔

ڈاکٹر رشید امجد

منشایاد ایک صاحب فن افسانہ نگار ہے۔ اسے داستان تراشنا اور داستان بیان کرنا دونوں فن آتے ہیں۔ اس کی کہانیوں کا سماجی سیاسی دائرہ بہت وسیع ہے کہ اُس نے کھلی آنکھ سے زمانوں کو گزرتے اور واقعات کو بیتتے دیکھا ہے۔ دیہات سے شہر اور شہر سے نئے شہر تک اس کے کردار پڑھنے والے کے اندر اتر جاتے ہیں کہ منشایاد انہیں اپنے فن کے چاک پر اس مہارت سے ترتیب دیتا اور تخلیق کرتا ہے کہ وہ ایک جیتا جاگتا کردار ہی نہیں رہتے ایک علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اس کے پاس کھتی ہوئی کہانی جسے اس نے اپنے زندہ اور رواں اسلوب سے ایسی صورت عطا کی ہے کہ جدید افسانے میں اس کا نام اہم ہی نہیں منفرد بھی ہے، ایک طویل فنی ریاضت، مشاہدے اور مطالعے نے اس کی کہانیوں کو اگر ایک طرف اپنے عصر سے جوڑا ہے تو دوسری جانب ان میں ایک ماورائے عصر خوش بو بھی ہے۔ جدید افسانے کی کوئی بھی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔

امجد اسلام امجد

منشایاد میرے نزدیک جدید اُردو افسانے کا سب سے معتبر حوالہ ہے۔ گذشتہ بیس برس میں اس کی کہانیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے ہیں اور ہر مجموعہ اس کے فن اور فکر کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت ہے... 'جدیدیت' کے بخار نے افسانے میں سرسام کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی اور ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب یہ مریض بچتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایسے میں جو نوجوان لوگ مسیحا بن کر اُبھرے، میرے نزدیک اُن میں منشایاد کا نام سب سے اُوپر ہے (کہانی کاروں کے اس تازہ تر کارواں میں، مظہر الاسلام، نجم الحسن رضوی، منیر احمد شیخ، اسد محمد خاں، امراؤ طارق، سلطان جمیل نسیم، احمد جلیل، طارق محمود، سعید شیخ، نیلوفر اقبال اور عطیہ سید کے علاوہ اور بھی کئی نام ہیں)۔

میں علامتی افسانے کے خلاف نہیں ہوں، لیکن وہ علامت جو افسانہ نگار کی ژولیدہ خیالی کے فشار میں بے چہرہ ہو جائے، مجھے وارا نہیں کھاتی۔ اسی طرح وہ کہانیاں بھی میرے دل کو نہیں چھوتیں جو حقیقت سے قطع تعلق کر کے انسانی کی باطنی کشمکش کے ایسے منظرنامے پیش کرتی ہیں، جن میں مصنف کی فکر اور مکالمہ اپنی زمین کے بجائے انسان کی اس تنہائی اور زندگی کی لایعنیت کے تصور سے پیدا ہوتے ہیں جن کا چرچا ہمیں مغرب کے جدید ادب میں سنائی دیتا ہے... منشایاد اور اس کے بہت سے ہم عصر علامت نگاروں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ علامت کو obsession نہیں بناتا اور اسے اسی قدر استعمال کرتا ہے جتنی ضرورت ہو۔ اس کی کہانیوں میں موضوع اور ہیئت کا یہی خوب صورت توازن ہے جس نے اس کے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے۔

منشایاد کی کہانیوں کی تعریف جس قدر آسان ہے ان کا انتخاب اسی قدر مشکل ہے، کیوں کہ یہاں معاملہ یہ نہیں کہ کون سی کہانی منتخب کی جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کون سی چھوڑی جائے اور کس بنیاد پر؟ (پیش لفظ محمد منشایاد کے بہترین افسانے سطور ۱۹۹۲ء نئی دہلی)

OO

افسانے

تماشا

منشایاد

'تماشا' کا شمار پریم چند کے 'کفن' منٹو کے 'بابو گوپی ناتھ'، 'ہتک' اور 'بو' اور بیدی کے 'گرہن' اور 'الٰہ آباد کے حجام' کے شانہ بہ شانہ نہیں تو ان کے فوراً بعد ضرور کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایسے افسانوں کی ذیل میں جن کی نت نئی تفسیریں ہو سکتی ہیں اور کوئی حتمی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اتنا پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کہانی کی نفسیاتی، اجتماعی، فنی اور فکری تہیں اپنی اپنی جگہ مضبوط ہیں اور ایک سے دوسرے کی نفی نہیں ہوتی۔

مظفر علی سید

اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔

کنارے پر جگہ جگہ ادھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں۔

چھوٹا کہتا ہے۔

"یہ لدھروں کی کارستانی لگتی ہے ابا۔"

"ہاں پتر۔" بڑا کہتا ہے۔ "یہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو خراب اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دیتے ہیں۔"

"یہ اتنی ساری مچھلیاں!" چھوٹا کہتا ہے۔ "ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں... تو دریا مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائے گا؟"

"اگر لدھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں۔ بستی... جہاں انہیں پہنچنا ہے اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے پل ہے نہ کشتی... وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا اور چوڑا ہے۔ بڑا کچھ دیر تامل کرتا ہے پھر کہتا ہے:

"اللہ کا نام لے کر ٹھل پڑتے ہیں پتر۔"

"جیسے تمہاری مرضی ابا۔"

"اگر ڈوب گئے تو"

"تو آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"تو کافی ہوشیار ہو گیا ہے جمورے" بڑا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

"تمہارا چیلا جو ہوا ابا۔"

"ضرور ٹھل پڑتے پتر۔" بڑا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے۔ "مگر مجھے رات والا خواب یاد آ رہا ہے۔"

"کیسا خواب... ابا؟"

"بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر۔"

"کیا دیکھا تھا ابا؟"

"میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے۔ میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجاتے اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں کہ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمہاری طرح لاڈ پیار سے پالا ہے، میری گردن میں دانت گاڑ دیتا اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا ابا؟"

"پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے لوگوں کے چہرے دھندلا جاتے اور آوازیں ڈوب جاتی ہیں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں

موت ایسی نیند کے اندھے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈوبتے ڈوبتے رہی سہی طاقت جمع کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں آواز کا تیر پھینکتا اور تمہیں پکارتا ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر میں اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے۔ کتے رو رہے ہیں اور اوس سے بوجھل ہوا اداس اداس پھر رہی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلانے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔"

"بس!" چھوٹا کہتا ہے۔ "اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں دریا میں نہیں اترنا چاہیے۔"

"ہاں پتر۔ آج کا دن ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔"

وہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا ہے۔ چھوٹا ابھی تک تازہ دم ہے۔ دوڑ دوڑ کر ٹیلوں پر چڑھتا اترتا ہے اور اچانک پکارتا ہے۔

"ابا پل... مجھے پل دکھائی دے رہا ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

"پل کا نام سن کر بوڑھے کے بوڑھے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑ جاتی ہے وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا ٹیلے پر آتا ہے اور اس طرف کو دیکھتا ہے جدھر پانی بہتا ہے۔ پھر خوش ہو کر کہتا ہے۔ "ہاں پل زیادہ دور نہیں... مگر راستہ دشوار گزار ہے۔"

"کوئی بات نہیں ابا۔"

دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا لیتے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ راستہ مشکل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز۔ ٹیلے اور کھائیاں۔ ندی نالے۔ گھنا جنگل۔ خاردار جھاڑیاں اور پاؤں لہولہان کر دینے والی دوب... مگر وہ چلتے رہتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ تھک جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر پل اب بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے جتنا اس وقت نظر آتا تھا جب وہ چلے تھے۔ بڑا کہتا ہے۔

"عجیب بات ہے جمورے... پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔"

"اور بستی بھی ابا" چھوٹا کہتا ہے۔ "مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔"

"عجیب بات ہے جمورے۔"

"بہت ہی عجیب ابا۔"

"یہ کوئی اسرار ہے پتر۔"

"میرا خیال ہے ابا" چھوٹا کہتا ہے۔ "ہم ہر روز لوگوں سے تخول کرتے ہیں آج ہمارے ساتھ تخول ہو رہا ہے۔"

"اللہ خیر کرے۔"

چلتے چلتے دوپہر ڈھلنے لگتی ہے۔ وہ چل چل کر نڈھال ہو جاتے ہیں۔ دریا کا گدلا پانی پی پی کر ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں خاردار جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر لباس تار تار ہو جاتا اور پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں۔ مگر پل اور بستی کے مینار اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آتے ہیں۔

"رک جا پتر" بڑا کہتا ہے۔ "اس پار والی بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے ہم اس آگے ہی آگے چلتے ہوئے پل تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔"

"پھر کیا کریں ابا؟"

"واپس چلتے ہیں پتر؟"

"نہیں ابا۔ واپس جا کر کیا کریں گے۔ ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے اور پھر ابا... واپس پلٹ جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔"

"ہاں پتر۔ تم ٹھیک کہتے ہو... ہماری تو زنانیاں بھی دریا کی بپھری ہوئی لہروں سے نہیں ڈرتیں... کچے گھڑوں پر ٹھل پڑتی ہیں۔"

"واہ ابا... کیا بات کہی ہے... چلو ٹھل پڑتے ہیں۔"

"نہیں پتر... تم تھک جاؤ گے... اور پھر ہمارے پاس سامان ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو ابا... اور سامان کا کیا ہے وہاں جا کر نیا بنا لیں گے۔"

بڑا کوئی جواب نہیں دیتا۔ سامان نیچے رکھ کر دریا کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر گانے لگتا ہے:

"نیں وی ڈونگھی تلہ پرانا شینہاں تاں پتن ملے۔"

(ندی گہری اور کشتی پرانی ہے اور گھاٹ پر شیروں کا پہرا ہے)

چھوٹا لقمہ دیتا ہے۔ "میں وی جانا جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے۔"

(مجھے بھی محبوب کی بستی پہنچنا ہے، کون میرے ساتھ چلے گا)

اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

"یہ آوازیں؟" چھوٹا کہتا ہے۔ "اس جنگل بیابان میں؟"

"میرا خیال ہے یہاں قریب ہی کوئی آبادی ہے کوئی دوسری بستی۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"پتر کیوں نہ آج کی رات یہیں اس بستی میں گزار لیں۔ صبح سویرے

O ''نہیں میں اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی''
''کتنی دیر رہ سکتی ہو؟''
''آفس آورز کے بعد میکسی مم ایک گھنٹہ''
''تاکہ گھر والے سمجھیں اوور ٹائم لگ رہا ہے''
''اوور ٹائم ہی تو ہے''

O ''کچھ اس کا اتا پتہ؟''
''بہت مزے میں ہے۔ ایک ہی برس میں اس کے نیچے بائیسکل کی جگہ پجیرو آ گئی''
''چندوں، زکاتوں اور خیراتوں سے؟''
''ایک وہی کیا بہت سی دینی اور سیاسی پارٹیاں اور لاکھوں لوگ پل رہے ہیں''
''اور کرتا کیا ہے؟''
''وہی جو پیداواری عمل میں حصہ نہ لینے والے دوسرے کرتے ہیں''
''ہماری سوسائٹی میں نان پروڈکٹیو لوگوں کی تعداد کتنی ہوگی؟''

... حرف ریزے ...

(منشا یاد کے افسانے 'خواب دان' سے)

O ''یار میری رقم کا کیا ہوگا؟''
''گھبراؤ نہیں دیانت داری ان کے بزنس کا پہلا اصول ہے''
''اصول یا تقاضا؟''
''جو بھی سمجھ لو۔ میں نے انھیں سو سو ڈالر کے نوٹوں سے ایک ایک رات میں لاکھوں کروڑوں کا جوا کھیلتے دیکھا ہے۔ مجال ہے کبھی کسی نے روند ماری ہو''

O ''ہاں پتر اب خاندان میں مجھ سے بڑا تو کوئی رہا نہیں۔ سب کچھ مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ تم اگر کچھ روز پہلے آ جاؤ تو وسمہ مہندی، سہرے گانے بینڈ باجے اور ویڈیو وغیرہ...''
''میں آ جاؤں گا اور سارا انتظام کر لوں گا تایا جی۔ آپ فکر نہ کریں ہم سارے چاؤ پورے کریں گے اور پہلے بیاہ کی حسرتیں نکالیں گے، لیکن تایا جی میں شہ بالا بنوں گا''

O ''علاج معالجے اور مرہم پٹی کے بہانے سارا خون نکال لیتے ہیں''
''کس نے بتایا؟''
''ایک واپس آنے والے نے''
''اور کیا بتایا اس نے؟''
''کہہ رہا تھا ہمارے ساتھ دھوکا ہوا۔ ہم لڑنے گئے تھے مگر ہماری ڈیوٹی دوسرے کاموں پر لگا دی گئی''
''دوسرے کام؟''
''ان کی جسمانی ضروریات پوری کرنا۔ اور وہ اسے بھی نفس کا ایثار اور جدوجہد کا حصہ سمجھتے تھے''

O ''اب ایک ہی راستہ ہے''
''کون سا''
''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے''
''نہیں، سب سے پہلے پاکستان''

تازہ دم ہو کر چلیں گے۔''
''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

بڑا کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر آوازوں کے تعاقب میں چلنے لگتا ہے چھوٹا پلٹ پلٹ کر دریا کے اس پار والی بستی کی طرف دیکھتا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ دریا کا کنارا لحظہ لحظہ دور ہوتا جاتا ہے اور وہ چھوٹی سی ایک بستی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اچانک بڑا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ ''یہ کیا تماشا ہے جموریا۔''

جمورا بیری کی طرف دیکھتا ہے۔ زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے پھر زمین سے بیر اٹھا کر چکھتا اور تھوک دیتا ہے۔

''تمہارا شک ٹھیک ہے ابا... دھرکونے (نبولیاں) ہی ہیں کڑوے زہر''

''رب خیر کرے۔ بیری کے ساتھ دھرکونے'' بڑا کہتا ہے۔ ''کوئی اسرار ہے پتر۔''

چھوٹا کوئی جواب نہیں دیتا۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے۔ بڑا پوچھتا ہے۔

''کیا دیکھ رہے ہو پتر ابابیلیں ہیں''
''ہاں ابا... پورا لشکر ہے۔''
''دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر۔''
''کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا۔''
''اور کیا پتر؟''
''ہاتھیوں کو ابا۔''
''نہیں پتر... یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چھپانے اور چوگ بدلنے والی ابابیلیں ہیں۔''
''یہاں سے نکل چلیں ابا... یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔''
''رب خیر کرے گا پتر۔'' بڑا کہتا ہے۔ ''کچھ دھندا کر لیں۔ رات بسر کر کے صبح سویرے نکل چلیں گے۔''
''جیسے تمہاری مرضی ابا۔''

بستی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کھلی جگہ پر سامان رکھ کر آس پاس کا

جائزہ لیتے ہیں۔ پھر چھوٹا زمین پر چادر بچھا کر اس کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ بڑا چھوٹے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو۔

اب رات بسر کرنے کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔

بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا رہتا ہے، جب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے۔

"پتر جموریا... یہ بستی بھی عجب ہے۔ ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا ہے اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں (خالی) ہو گیا ہے مگر ابھی تک کسی بالغ مرد یا عورت نے جس کے کھیسے میں پیسے ہوں ادھر کا رخ نہیں کیا۔"

"کیا پتہ ابا۔" چھوٹا کہتا ہے۔ "یہاں کے لوگ بہرے ہوں یا انہوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہو۔"

"وہ کیوں پتر۔"

"وہ اس لئے ابا... کہ جب بندہ کبھی بھی خیر کی خبر نہ سنے تو آہستہ آہستہ اس کا دل اکا سننے ہی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔"

"واہ جمورے تو نے سبق خوب پکایا ہوا ہے، اچھا یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے کبھی خیر کی خبر نہیں سنی۔"

"میں نے ان نیانوں (کم سنوں) کی صورتوں سے اندازہ لگایا ہے ابا۔"

"تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے جمورے۔"

"تمہارا چیلا جو ہوا ابا۔"

"واقعی پتر... ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے یتیم ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے ابا جیسے انہوں نے اپنے باپوں کو شہر بدر کر دیا ہوا ہے۔"

"شاید ہم غلط جگہ آ گئے ہیں۔"

"ہاں ابا۔"

"دیکھ نا پتر... ساری بستی میں کوئی ایک بھی بالغ مرد عورت نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بھی ہماری طرح دوسری بستیوں میں تماشا دکھانے گئے ہوں گے۔"

"پھر تو ان کی واپسی کا انتظار ضرور کرنا چاہئے ابا۔"

"کیوں پتر۔"

"یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ بڑے مداری ہیں یا تم؟"

"نہیں جموریا مجھاں بچوں سے خوف آنے لگا ہے۔ عجیب سے بچے ہیں۔"

"تو پھر یہاں سے چلتے ہیں ابا۔"

"ہاں پتر... چلے جانا ہی اچھا ہے مگر تو ذرا ان چھوٹوں سے یہ تو پوچھ ان کے بڑے کہاں ہیں؟"

"ہم خود بڑے ہیں۔" مجمع میں سے ایک بچے کی آواز آتی ہے۔ "کیا ہم تمہیں چھوٹے نظر آتے ہیں؟"

بڑا اور چھوٹا چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ابھی اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چھوٹی عمر کا ایک اور بچہ نہایت پختہ لہجے میں کہتا ہے۔

"منشی ٹھیک کہتا ہے... تم لوگ جلدی جلدی کھیل دکھاؤ اور اپنی راہ لو... ہم ایسے لوگوں کو جو خود کو ہم سے بڑا سمجھتے ہوں بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"تو کیا اس بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔"

"ہم رہنے ہی نہیں دیتے..." ایک بچہ ہنس کر کہتا ہے۔ "ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

"تو یہ بستی؟" بڑا ہکلا جاتا ہے۔

"ہاں یہ بستی... یہ ہماری بستی ہے اور میں یہاں کا سردار ہوں۔ لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم نے کوئی اچھا کرتب دکھایا تو ہم تمہیں ضرور انعام دیں گے... چلو تماشا دکھاؤ۔"

"ابھی تو ہم خود دیکھ رہے ہیں۔" چھوٹا کہتا ہے۔

"تمیز سے بات کرو لڑکے۔" سردار غصے سے کہتا ہے۔ "ورنہ!"

"ارے۔" چھوٹا ہنستا ہے۔ "تم تو واقعی سردار کے بیٹے لگتے ہو۔"

"سردار کا بیٹا نہیں... میں خود سردار ہوں۔"

"ہاں ہاں... یہ سردار ہے۔" بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ چھوٹا ہنستا چلا جاتا ہے پھر بڑے کے قریب آ کر کہتا ہے۔

"میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آ گئے ہیں۔"

"مداری... یہ کیا بکواس ہے۔" سردار چلا کر کہتا ہے۔ "یہ ہمیں بونے کہتا ہے اس بدتمیز بچے کو چپ کراؤ، ورنہ بستی سے نکل جاؤ۔"

بڑا ششدر کھڑا چاروں طرف دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ سے کہتا ہے۔

"جمورے چپ ہو جا... یہ کوئی اسرار ہے۔"

"کیا اسرار ہے ابا... یہ بچے۔"

"یہ بچے نہیں ہیں پتر۔" بڑا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

"پھر کیا ہیں ابا؟"

''غور سے دیکھو جمورے... ان کے بال سفید ہیں اوران کے چہروں پر جھریاں ہیں ان کی عمریں زیادہ ہوگئی ہیں مگران کے ذہن نابالغ رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ہوسکتے ہیں۔''

''عجیب بات ہے۔''

''بہت ہی عجیب پتر... رب خیر کرے۔''

اچانک چند بچے بہت سی چارپائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں اور سردار بچے سمیت بہت سے دوسرے تماشائی بچے ان چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردار تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے۔

''کھیل شروع کیا جائے۔''

بڑا پریشان ہو کر تماشائیوں پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چیزیں نکالنے لگ جاتا ہے۔

سب سے پہلے وہ تین گولے نکال کر زمین پر رکھتا ہے پھر انہیں تین پیالوں سے ڈھانپ دیتا ہے۔ کچھ پڑھ کر پھونک مارتا اور باری باری سارے پیالے اٹھا کر دکھاتا ہے۔ گولے غائب ہوچکے ہیں۔

وہ تماشائیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ تالیاں نہیں بجاتے، داد نہیں دیتے، چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وہ پیالوں کو اوندھا کر کے باری باری اوپر اٹھاتا ہے اب ہر پیالے کے نیچے ایک ایک گولہ دکھائی دیتا ہے وہ دوبارہ سردار اور دوسرے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

پھر وہ جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالتا ہے ایک کے دو اور دو کے چار بناتا ہے اور کہتا ہے:

''مہربان... قدردان... میں جادوگر نہیں ہوں۔ یہ محض ہاتھ کی صفائی ہے جادوگر ہوتا تو یہاں نہ ہوتا گھر میں بیٹھا سکے بنا رہا ہوتا۔''

''ہمیں معلوم ہے تم کھیل دکھاؤ۔'' سردار اسے ٹوکتا ہے۔

''تو پھر تم خود ہی میدان میں آجاؤ۔'' جمورا طنز کرتا ہے۔

''مداری... یہ لڑکا!'' سردار غضب ناک ہوجاتا ہے۔

''میں معافی چاہتا ہوں سردار۔'' بڑا کہتا ہے اور اشارے سے جمورے کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے اور باری باری بہت سے کھیل دکھاتا ہے۔ خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرا ہوا گلاس اوندھا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔ مٹھی میں بند کر کے نکالنے سے رومال کا رنگ تبدیل ہوجاتا ہے۔ جلتا ہوا سگریٹ نگل کر کانوں کی طرف سے دھواں نکالتا ہے۔ کوڈیوں والے سے ڈسواتا اور اسے گردن میں ڈال لیتا ہے۔ منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔

مگر سردار سمیت کوئی تماشائی تالی نہیں بجاتا داد نہیں دیتا۔ وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ پھر اعلان کرتا ہے۔

''اب آخر میں میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دوبارہ زندہ کر دکھاؤں گا۔''

سردار سمیت سارے تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں۔ وہ بے حد حیران ہوتا ہے۔ عام طور پر تماشے کے آخر میں جب وہ اس کھیل کا اعلان کیا کرتا ہے تو بہت سے تماشائی اس کھیل کو ناپسند کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں۔ مگر پتا نہیں یہ کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ہیں۔

وہ جمورے کو زمین پر لٹاتا ہے اس کے اوپر اسی طرح چادر ڈالتا ہے۔ جیسے ہمیشہ ڈالا کرتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چھری نکال کر اس کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے:

''صاحبان... قدردان... کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا... نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہوسکتا ہے... یہ سب کچھ ایک کھیل ہے... نظر کا دھوکہ... اس پاپی پیٹ کی خاطر۔''

''ہمیں معلوم ہے۔''

''ہم جانتے ہیں۔''

''باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔'' سردار کہتا ہے۔

''چھری چلاؤ...'' ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''چھری چلاؤ... چھری چلاؤ'' تماشائی شور مچاتے ہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آکر چھری چلاتا ہے۔

تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے ہیں، سکے پھینکتے اور بکرے بلاتے ہیں اور جمورے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پڑ خالی ہوجاتا ہے۔

وہ جمورے کو آواز دیتا ہے۔ ''اٹھ پتر... پیسے جمع کر۔''

مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔

وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن بیچ بیچ کٹی پڑی ہے۔ اس کی چیخیں ساری بستی میں گونجنے لگتی ہیں۔

OO

افسانے

درخت آدمی

منشا یاد

غیر متوقع واقعات اور حادثات چاہے سیدھے سادے اور دوٹوک ہی کیوں نہ ہوں ٹھوس شواہد کی عدم موجودگی ان میں شک و شبہ اور پراسراریت پیدا کر دیتی ہے اور جب ایک بار کرید کا سلسلہ شروع ہو جائے تو کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات اور زیادہ پراسرار معلوم ہونے لگتے ہیں اور شکوک و شبہات بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

اس کا نام کرمو تھا اور وہ نہر والے باغ کا مالی تھا۔

اور جب سے نہر والا باغ اجڑا تھا۔ چھوٹے چودھری صاحب اسے اپنے پاس اسلام آباد بلا رہے تھے مگر کئی پشتوں سے گاؤں کی زمین میں دھنستے دھنستے اس کی جڑیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ اب مٹی اسے چھوڑتی تھی نہ وہ کسی شجر کی طرح وہاں سے حرکت کر سکتا تھا۔

چھوٹی بیگم کو اس کی بیٹی دارو کا کام اور سگھڑاپا پسند تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے اپنے ساتھ شہر میں رکھنا چاہتی تھیں وہ خود بھی شہر جانا چاہتی تھی۔ یہاں اس کے سامنے ساری گلیاں بند تھیں اور بیوگی کا زخم مندمل ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے بوڑھے باپ کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی تھی۔

انہوں نے کرمو کو لالچ بھی دیا کہ روٹی کپڑے اور رہائش کے علاوہ باپ بیٹی کو اچھی تنخواہ بھی دی جائے گی۔ اس نے نقدی کی صورت میں کبھی نہیں لیا تھا ہر فصل پر اسے غلے کی صورت میں معاوضہ مل جاتا تھا۔ شادی غمی کے موقعوں پر بھی بڑے چودھری صاحب خود ہی خرچ کرتے تھے اس کی سمجھ میں نہ آتا وہ تنخواہ کے پیسوں کا کیا کرے گا۔ بڑی بیگم نے بھی اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ پیسے جمع کر کے دوبارہ بیٹی کا گھر آباد کر سکتا یا حج پر جا سکتا ہے۔ مگر شاید درختوں کے درمیان زندگی گزارتے گزارتے اس کا دماغ کاٹھ کا ہو گیا تھا۔ اسے نفع و نقصان کا اندازہ ہی نہ ہوتا۔

اسے باغ کٹ جانے کا بہت دکھ تھا اس نے بہت مخالفت کی تھی مگر اس کی کون سنتا تھا۔ جب تک بڑے چودھری صاحب زندہ تھے باغ بھی قائم رہا مگر اس چھتنار کے گرتے ہی آپو دھاپی پڑ گئی سب کچھ تقسیم ہو گیا زمین ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ منجھلا بیٹا شہر میں سرکاری افسر تھا۔ باغ اور اس کے ارد گرد کی زمین اس کے حصے میں آئی اس نے کچھ ہی عرصہ بعد باغ کٹوا کر وہاں گندم کاشت کرا دی جس سے باغ کے مقابلے میں خوب منافع ہونے لگا۔ مگر کرمو کی دنیا اجڑ چکی تھی وہ باغبان سے ایک معمولی کھیت مزدور بن گیا اور باغ کے بجائے مویشیوں کے باڑے میں رہنے لگا تھا دارو بھی نوکریوں میں پھل جمع کرنے اور پھولوں، کلیوں کے ہار اور گلدستے بنانے کی بجائے اپلے تھاپنے، برتن مانجھنے اور جھاڑو دینے لگی۔ کرمو کو ایسا لگتا جیسے اسے ایک بار پھر باغ بہشت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔ اس بار بھی اس کے جنت سے نکلنے کا باعث دانہ گندم ہی تھا۔

کرمو اگرچہ اب ایک عام مزدور تھا مگر گھروں، کھیتوں اور قبروں کے سرہانے درخت لگانے کے لئے گاؤں کے لوگ اب بھی اس کے مشورے اور خدمت حاصل کرتے تھے سارے گاؤں میں درختوں سے اس کی دلچسپی محبت اور واہموں کے طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ درخت اس کا کہنا مانتے اور اس کی باتیں سمجھتے تھے۔ بہر حال یہ ضرور باور کیا جاتا تھا کہ اس کا لگایا ہوا درخت یا پودا کبھی مرجھاتا نہیں تھا اور دوسروں سے زیادہ پھلتا پھولتا تھا۔ درختوں کے بارے میں اس کی معلومات بھی خاصی وسیع تھیں۔ اسے اپنے باغ یا گاؤں کے درختوں کے علاوہ پورے علاقہ کے قابل ذکر درختوں کے بارے میں پتہ رہتا کہ کون سا درخت ٹوٹ یا کٹ چکا ہے کون سا کس حال میں ہے۔

درخت کرمو کی کمزوری تھے۔ وہ کسی بھی قسم کے درخت کو کٹتے یا گرتے نہ دیکھ سکتا تھا وہ باغ کے درختوں کی چھنگائی بھی اس احتیاط سے کرتا جیسے ماہر حجام بال تراشتے ہیں۔ جب بھی وہ کسی درخت کے کٹنے کی خبر سنتا اسے اتنا ہی صدمہ ہوتا جتنا کسی عزیز کے مرنے پر ہو سکتا ہے۔

باغ کے درخت تو اسے مثل اپنے بزرگوں، دوستوں اور بیٹوں کے عزیز تھے۔ اس کے علاوہ گاؤں کے بعض درختوں سے اسے خاص لگاؤ تھا جن میں چوپال کا بوڑھا برگد شامل تھا۔ جس کے سائے میں گرمیوں کی دوپہروں کو آدمی اور مویشی پناہ لیتے اور ڈھولے اور واریں گانے کی محفلیں جمتی تھیں۔

لوہاروں کے خراس کے پاس پھرواتہہ کا ایک بڑا درخت تھا۔ تیز ہوا چلتی تو اس کے اندر ایک ساتھ ان گنت سارنگیاں سی بجنے لگتیں۔ وہ ایک طرح سے بادپیا تھا ہوا کی رفتار کے ساتھ کبھی شوکتا کبھی پھنکارتا۔ ہوا مدہم ہوتی تو بھی اس کے سسکارنے اور سانس لینے کی آواز سنائی دیتی رہتی۔

یوں تو چودھری اللہ وسایا کی بہو کے حسن و جمال کی بڑی دھوم تھی مگر اس کے آنگن میں ایک خوب صورت بکائن بھی تھی جسے دیکھ کر لگتا گویا ہرے رنگ کی ایک بڑی سی چھتری سیدھی جنت سے اتری اور اپنے ہی وزن سے زمین میں دھنسی کھڑی ہو۔ کھرلوں کے آموں کے جھنڈ نہر کے شیشموں کی قطاروں اور نمبردار کی رکھ (ذخیرے) کو تو ہر صاحب ذوق پسند کرتا تھا لیکن کرمو کو تو مسجد کے پچھواڑے والے میدان کے دن کے درخت بھی عزیز تھے جو نہایت بدوضع اور ٹیڑھے میڑھے تھے بعض تو زمین پر ادھ موئے سے لیٹے ہوئے تھے ان کی کھوؤں میں طوطوں کے بچے پلتے اور سانپ چھپے رہتے تھے۔ ان ونوں کو بیلو لگتے تھے نہ ان کی لکڑی ہی اچھی تھی۔ سو تختی نہ فروختنی البتہ لڑکے بالے دن بھر یہاں کرل کا نگھ کھیلتے اور اودھم مچائے رکھتے تھے کیا پتہ کرمو کو ان میں اپنے پیدا نہ ہو سکنے والے لڑکوں کی صورتیں نظر آتی ہوں۔

کرمو کو موچیوں کے گھر کی لسوڑی (گوندنی) سے بھی بڑی دل چسپی تھی حالاں کہ یہ نہایت فضول قسم کا درخت سمجھا جاتا تھا اور اس کا پھل بے مزہ اور غلیظ۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ دارو کی ماں سے بیاہ کرنے سے پہلے کرمو کا موچیوں کے ہاں بہت آنا جانا تھا ان کی ایک لڑکی بھی لسوڑی کی طرح اس سے چپکنا چاہتی تھی مگر گھر والوں نے اس کا کہیں اور بیاہ کر دیا۔ بڑے چودھری کے مربعوں میں بہنے والے کھالوں پر کرمو نے خوب شجرکاری کر رکھی تھی اور اب وہ دھریکوں، ٹاہلیوں اور شہتوتوں والے کھال کہلاتے تھے۔

اب باغ نہیں تھا مگر کہیں کہیں اس کے درخت چھوڑ دیئے گئے تھے۔ وہ ان بچے کھچے باغ کے درختوں اور گاؤں کے دوسرے درختوں کے سہارے زندگی کے باقی دن گزار سکتا تھا اس نے شہر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

وہ اس گھر کا جدی پشتی نمک خوار تھا اسے مجبور بھی کیا جا سکتا تھا مگر چھوٹے چودھری صاحب ایسا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر پتہ نہیں یہ باغ سے جدائی کا نتیجہ تھا یا کام کی نوعیت اور ماحول کی تبدیلی کا اثر تھا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اور جان کے لالے پڑ گئے۔ اتفاق سے ان ہی دنوں چھوٹے چودھری صاحب اپنی جیپ میں گاؤں آئے ہوئے تھے انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور علاج کے بہانے باپ بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ تاہم انہوں نے تشفی دی کہ اگر ٹھیک ہونے کے بعد بھی ان لوگوں کا شہر میں جی نہ لگے تو وہ انہیں واپس گاؤں بھجوا دیں گے۔

ڈاکٹری علاج سے کرمو چند روز بعد ٹھیک ہو گیا تو چودھری صاحب اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگے وہ اسے باغوں، پارکوں، نرسریوں اور ایسی سڑکوں پر گھماتے جن کے دونوں جانب طرح طرح کے ملکی اور غیر ملکی اشجار کی قطاریں تھیں۔ انہوں نے کرمو کی کم زوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔ کرمو نئے نئے درخت اور پودے دیکھ کر خوش ہوتا مگر یہ خوشی ادھوری تھی یہ خوب صورت درخت اسے اجنبی اور پرائے پرائے سے محسوس ہوتے جیسے وہ اس کی زبان نہ سمجھتے ہوں پھر بھی اسے توقع تھی کہ وہ جلد ہی ان سے دوستی پیدا کر لے گا۔ چودھری صاحب نے بارہا اسے ان پیڑوں سے باتیں کرتے اور ان کا حال احوال پوچھتے سنا اور خوب ہنسے۔ وہ خوش تھے کہ وہ شہر کے درختوں سے راہ و رسم بڑھا رہا تھا۔

پھر وہ اسے روز گارڈن میں پھولوں کی نمائش میں لے گئے جہاں ملک بھر سے طرح طرح کے پودے پھول اور جھاڑیاں shrubs لا کر رکھی گئی تھیں۔ انہوں نے اسے مارگلہ اور مری کے جنگلات کی سیر بھی کرائی جہاں طرح طرح کے قدرتی اور لگائے گئے درخت اور پودے تھے اس نے بہت سے ایسے درخت پہلی بار دیکھے جن کے اس نے بزرگوں، سنیاسیوں اور مالیوں سے محض نام سن رکھے تھے یا جن کی صرف لکڑی یا پھل دیکھ رکھا تھا۔ دیودار پر اگر واقعی دیو اور جن رہتے تھے تو شاہ بلوط یقیناً پریوں کا مسکن ہوگا۔ کیل، اخروٹ، کہو اور سیب کے درخت دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اسے لگتا جیسے وہ درختوں کی جنت میں آ گیا ہے۔ چودھری صاحب کی کوٹھی میں بھی باغ بانی کا شوق پورا کرنے کی کافی گنجائش تھی۔ اس کا دل بہل گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسلام آباد میں گھریلو ملازم نہ ملتے ہوں البتہ امیروں، وزیروں اور سفیروں کی وجہ سے ان کے معاوضے بہت بڑھ گئے تھے۔ پھر کرمو اور دارو کی تو بات ہی دوسری تھی وہ غلام ابن غلام تھے۔ نہایت محنتی اور قابل اعتبار۔ ان کی وجہ سے چودھری فیملی کے بہت سے مسائل حل ہو گئے کرمو نے مالی اور چوکیدار کا کام سنبھال لیا اور دارو نے گھر کا سارا کام۔

چھوٹے چودھری صاحب نے بیگم کو سمجھا دیا تھا کہ وہ شروع شروع میں دارو پر کام کا زیادہ بوجھ نہ ڈالیں اور اسے اچھے کھانے اور ٹیلی ویژن کی عادت ڈالیں۔ اور جس طرح خرکار اپنے مزدوروں کو چرس اور افیم کا عادی بنا دیتے اور ٹھیکیدار اپنے راج مستریوں کو کھلے دل سے ایڈوانس دے کر قرضے کے جال میں جکڑے رکھتے ہیں اسی طرح چودھری فیملی نے کرمو اور دارو کو

رہنے سہنے اور کھانے پینے کی سہولتوں اور چھوٹے موٹے احسانات کے پھندوں میں پھنسالیا۔ اور منہ مانگا ایڈوانس دینے لگے۔ کرمو کو بیس سے زیادہ گنتی نہ آتی تھی۔ تنخواہ کے پیسے ہاتھ آئے تو گنتی بھی آ گئی اور خرچ کے کئی راستے بھی نکل آئے۔ دارو کو اچھی بھلی اترن مل جاتی تھی پھر بھی اس کا دل سپر مارکیٹ اور بازے کے چکر لگانے کو مچلتا رہتا۔ ہر مہینے نئے نئے کپڑے، سینڈل، گرگابیاں اور میک اپ کی چیزیں خریدی جانے لگیں۔ کوارٹر سے ٹرانزسٹر کی آواز بھی سنائی دینے لگی کچھ ہی عرصہ میں اس کے چہرے سے بیوگی اور بڑھتی عمر کی کرختگی کے چھلکے اترنے لگے اور ان کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ آہستہ آہستہ چیزوں اور ضروریات کے مقابلے میں پیسے کم پڑنے لگے اور قرض کا چکر چلا۔ یوں گاؤں واپسی کا راستہ روز بروز دھول میں اٹتا چلا گیا۔

انہیں گھر میں ہر طرح کا آرام تھا کوارٹر میں چھت کا پنکھا اور بجلی کا بلب لگا ہوا تھا۔ ساتھ ہی غسل خانہ بھی موجود تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی آندھی ہو یا بارش جب چاہو جتنی بار چاہو، ہوا آؤ۔ انہیں علیحدہ کھانا بھی نہیں پکانا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ہی عرصہ بعد کرمو اداس رہنے لگا۔ اسے گاؤں کی کٹیا کے مقابلے میں، سارا باغ جس کا آنگن ہوا کرتا تھا، یہ بند بند کوارٹر ایک بڑا پنجرہ محسوس ہونے لگا۔ اسے نہروالا باغ یاد آتا جواب بھی جوں کا توں اس کے اندر آباد تھا۔

وہ وہیں باغ کے اندر ایک کٹیا میں پیدا ہوا تھا۔ اور طرح طرح کے خوب صورت درختوں، پھولوں، پھلوں، تتلیوں اور رنگا رنگ پرندوں کی چہچہاٹوں کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ اسے اس باغ کے ایک ایک پیڑ کی صورت یاد تھی۔ اسے ان کی بور اور پھلوں سے لدی شاخیں، ہوا سے تالیاں بجاتے پتے اور گھنے سائے سب کچھ ازبر تھا۔ اسے وہ پرندے بھی یاد تھے جو راتوں کو باغ کے درختوں پر بسیرا کرتے اور دن کو کچے پکے پھل کتر کتر کر نیچے گراتے رہتے تھے اور جنہیں وہ ڈراتا دھمکاتا اور غلیل سے اڑانے کی کوشش کرتا رہتا تھا مگر وہ بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ اور وہ پرندے بھی جو باغ کی روشوں پر چل چل کر پنجوں سے طرح طرح کے نقش و نگار بنا دیتے۔ پانی کی کھالیوں اور آڈوں سے چونچیں بھر بھر کر پانی پیتے اور سیراب کیاریوں میں بھیگ کر زور زور سے پروں کو پھڑ پھڑاتے۔ چڑیوں، کوؤں، تلیروں اور جنگلی کبوتروں کی ڈاریں اترتیں اور اس کی پالتو بطخوں اور مرغیوں کے ہم راہ دانہ دنکا چگتی پھرتیں۔ اسے پرندوں کے نغموں سے معمور صبحیں اور شامیں بھی یاد تھیں اور وہ بھنورے اور شہد کی مکھیاں بھی جو پھولوں، کلیوں اور درختوں کے بور پر منڈلاتی اور خوش بو اور مٹھاس جمع کرتی رہتیں۔ اسے باغ کی ایک ایک چیز سے پیار تھا۔ اسے تو وہ سانپ بھی اپنے رفیق معلوم ہوتے تھے جو باغ کے کسی نہ کسی گوشے میں اکثر نظر آتے تھے مگر انہوں نے کبھی اندھیرے یا اجالے میں اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے باغ کی رکھوالی کرتے رہتے تھے۔

کرمو کو گپ شپ کی عادت تھی۔ نہروالا باغ کافی فاصلے پر تھا اور بہت کم لوگوں کا وہاں آنا جانا ہوتا تھا مگر درخت اس کی زبان سمجھتے تھے۔ وہ ان سے بات چیت کر لیتا تھا۔ اور اسے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا مگر یہاں درخت بھی اس کی زبان نہ سمجھتے تھے۔ ڈرائیور زیادہ تر گھر سے باہر رہتا اور باورچی اپنے کام میں مصروف۔ اڑوس پڑوس کے نوکر چاکر اپنے اپنے گھروں اور کوارٹروں سے باہر نہ نکلتے۔ چودھری صاحب سے تو کئی کئی روز ملاقات نہ ہو پاتی۔ وہ بے حد مصروف رہتے۔ صرف جمعہ کے روز تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر آتے اور پھول پودوں اور اس کے کام کا معائنہ کرتے، شاباش دیتے اور کبھی موڈ میں ہوتے تو گپ شپ بھی کر لیتے وہ انہیں گاؤں، نہر والے باغ کے درختوں اور اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے قصے سناتا وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر دلچسپی کا اظہار کرتے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ درختوں میں بھی ایک طرح کی زندگی ہوتی ہے وہ بھی خوشی، غمی اور خوف محسوس کرتے ہیں۔ بعض زیادہ۔ بعض قدرے کم۔ آدمیوں کی طرح ان میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ پھل صرف مادہ درختوں کو لگتا ہے جس کے لئے ان کا اپنے ہم جنسوں سے تعلق اور ملاپ ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ اپھل رہتے ہیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ درختوں کا جنسی ملاپ پرندوں، بھنوروں، شہد کی مکھیوں اور ہوا کے ذریعے ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ درخت خوش اور ناراض ہو سکتے تھے اور ایک خاص حد تک اپنی خدمت کرنے یا نقصان پہنچانے والے ہاتھوں کو پہچانتے تھے۔ ایک روز کہنے لگا۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے چودھری صاحب جب ابھی دارو کی ماں سے میرا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دوپہر کو اکثر نہر پر کپڑے دھونے آتی اور مجھے غافل پا کر پھل چرا کر بھاگ جاتی۔ میں گیلی کیاریوں اور روشوں کی دھول پر لگے اس کے قدموں کے نشانات سے کھوج لگا تا اس تک پہنچ جاتا مگر وہ بچا کھچا پھل اور گٹھلیاں پانی میں پھینک دیتی اور اس سے کچھ برآمد نہ ہو سکتا۔ بعض اوقات اس کے ہونٹ جامنیں کھانے کی چغلی کھا رہے ہوتے مگر وہ صاف مکر جاتی اور مجھے چڑاتی رہتی۔ میری کوشش رہتی کہ اسے کسی روز رنگے ہاتھوں پکڑوں اور اسے ہراساں کر کے اپنے دل کی بات اس سے کروں۔ مگر وہ اس کا موقع ہی نہ دیتی تھی۔ لیکن پھر ایک روز جب میں دوپہر کو وہیں ایک جامن کے پیڑ کے قریب سو رہا تھا ایک جامن بڑے زور سے میرے ماتھے پر لگی اور عین موقع پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ جامن کے پیڑ نے مجھے عین وقت پر جگایا ہے۔"

"واقعی بڑا ذہین اور فرماں بردار درخت تھا۔" چودھری نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سارے درخت ایسے ہی تھے۔ چودھری صاحب میں جو کہہ دیتا بھی نہ ٹالتے میرے دل کی بات جان لیتے۔''

کرمو کو جب بھی موقع ملتا وہ اس قسم کی گفتگو کرنے لگتا۔ چودھری صاحب کو علم تھا اسے گپ ہانکنے کی عادت ہے اور وہ دارو کی مرحومہ ماں کو یاد کرنے کا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتا ہے۔

کوٹھی میں کرمو سے پہلے بھی ایک پارٹ ٹائم مالی کام کرتا تھا اور گھر میں بہت سے درخت، پھول اور پودے تھے مگر کرمو کے آنے سے کچھ ہی عرصہ میں سارا گھر گل و گلزار بن گیا۔ گھر کے عقبی حصے میں آم کا ایک پیڑ تھا جسے بہت کم پھل لگتا تھا۔ ایک روز کرمو نے کہا۔ ''چودھری صاحب اس بار آم کا یہ پیڑ بہت پھل دے گا۔''

''وہ کیسے۔'' بیگم نے پوچھا۔

''میں نے اس کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ کو یاد ہے قربانی کے بکروں کا خون بھی اس کی جڑوں میں ڈالا تھا اور اب میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر وہ پھل نہیں دے گا تو اسے کاٹ دیا جائے گا۔''

''آم کے پیڑ نے کیا جواب دیا ہے۔'' چودھری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''رت آنے دیجئے پھر دیکھئے کیا جواب دیتا ہے۔'' کرمو نے وثوق سے کہا اور جب پھل لگنے کا موسم آیا تو چودھری اور ان کی بیگم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سچ مچ اس برس آم کے پیڑ کو اس قدر پھل لگا کہ پچھلے چھ سات برسوں میں کبھی نہیں لگا تھا۔ کرمو بہت خوش تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ اس دھمکی کا نتیجہ تھا جو اس نے آم کے پیڑ کو دی تھی۔ مگر پڑھے لکھے چودھری صاحب اس کی باتوں پر کیسے یقین کر لیتے اگرچہ انہیں اس کا کوئی دوسرا سبب بھی معلوم نہ تھا۔ بیگم پہلے ہی اسے خبطی سمجھتی تھیں اب انہیں یقین ہو گیا کہ کسی روز اس کا دماغ بالکل ہی چل جائے گا اور وہ آدمی اور درخت میں تمیز کرنے سے قاصر ہو جائے گا۔

دارو اب مکمل طور پر شہری رہن سہن اور آسائشوں کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کی عادات و اطوار بھی بدل گئی تھیں مگر کرمو ویسے کا ویسا گنوار تھا اس پر شہر کی زندگی نے کچھ بھی اثر نہ ڈالا تھا۔ شہر کے مخصوص کھانے اسے کچھ مزہ نہ دیتے چٹنی اچار اور پیاز سے روٹی کھا لیتا چائے پینے سے اسے گرمی لگنے لگتی۔ اسے ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بھی کچھ زیادہ دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ذہنی طور پر اپنے نہر والے باغ میں رہتا جو اس کے ذہن کے سوا اب کہیں موجود نہ تھا۔ وہ خوابوں میں گاؤں کے درختوں سے باتیں کرتا ان کے دکھ سکھ اور شکوے شکایتیں سنتا۔ کبھی بوڑھے برگد کی پکار سن کر جاگ پڑتا کبھی پھروانہہ کی سسکاریاں سن کر خواب میں رونے لگتا۔

پھر ایک روز اس نے ایک نہایت بری خبر سنی۔ چودھری صاحب کوٹھی کے عقبی حصے میں توسیع کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور اس کے لئے نقشہ بنوا رہے تھے۔ انیکسی تعمیر کرنے کا مشورہ انہیں ان کے ایک ٹھیکیدار دوست نے دیا تھا جس کا کہنا تھا کہ اتنی ساری جگہ محض پھول پودوں کے لئے چھوڑ دینا کہاں کی دانش مندی تھی جب کہ انیکسی کی تعمیر سے ہر ماہ اچھا خاصا کرایہ حاصل ہو سکتا تھا۔ کرمو تو وہ چھوٹا سا باغیچہ بھی جو اس نے دن رات کی محنت سے آباد کیا تھا اجڑتا نظر آیا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے احتجاج کرنا چاہا مگر اس کی کیا حیثیت تھی۔ اس بار بھی اس کی ایک نہ سنی گئی اور نقشہ پاس ہوتے ہی آڑو، اشپاتی، لوکاٹ اور خوبانی کے پیڑ کاٹ دیئے گئے۔ گلاب، موتیا اور دوسرے رنگا رنگ پھول اور پودے اینٹوں اور ریت بجری کے ڈھیروں تلے دب گئے۔ کرمو کا جی چاہا؛ ہاں سے بھاگ جائے مگر دارو کی صورت اس کے پاؤں میں زنجیر پڑی تھی۔ چودھری صاحب بھی اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں کام میں مدد اور نگرانی کے لئے اس کی اب پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی۔

کھدائی کرنے سے پتہ چلا کہ آم کا پیڑ بھی کاٹنا پڑے گا ورنہ اس کی جڑیں بنیادوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ویسے بھی آندھی یا طوفان کی وجہ سے اس کے ٹوٹنے سے نئی عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اسے جڑوں سمیت نکالنا ضروری سمجھا گیا اور یہ کام کرمو کے ذمہ لگا دیا گیا۔ کرمو کو ایسا لگا جیسے اسے کسی عزیز کو قتل کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہو۔ اس نے پہلے تو انکار کر دیا مگر جب چودھری صاحب بگڑ گئے تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

اگلے روز کام بند تھا درخت نکل جاتا تو ایک ساتھ ساری بنیادوں میں روڑی ڈالی جاتی۔ کرمو نے صبح ہوتے ہی کلہاڑا لے کر درخت کاٹنا شروع کر دیا۔ یہ وہی درخت تھا جس کی جڑوں میں وہ قربانی کے بکروں کا خون ڈالتا رہا تھا اور جس نے اس کی دھمکی سن کر اپنا وطیرہ بدل لیا تھا۔

چودھری صاحب اور گھر والے ٹیلی ویژن پر صبح کی نشریات دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور گاڑی صاف کر رہا تھا اور دارو باورچی کے ساتھ مل کر ناشتہ تیار کر رہی تھی کہ اچانک درخت کے ٹوٹ کر گرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کرمو کی ایسی چنگھاڑ جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ چیخ تھی یا نعرہ۔ سب لوگ دوڑتے ہوئے پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ درخت گرا پڑا ہے اور خون میں لت پت کرمو اس کے نیچے دبا ہوا ہے۔

وہ لوگ جو اسے قریب سے جانتے تھے اور وہاں موجود تھے شروع میں اسے ایک اتفاقی حادثہ ہی سمجھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شکوک و شبہات پیدا ہوتے چلے گئے اور یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس کی آخری آواز چیخ تھی یا نعرہ۔ پھر جب اس کی ذہنی کیفیت اور باتوں پر غور شروع ہوا تو مزید الجھنیں پیدا ہوتی گئیں اور آج تک وہ کسی ایک نتیجے پر متفق نہیں ہو سکے۔ OO

افسانے

پانی میں گھرا ہوا پانی

منشایاد

چکنی مٹی سے گھوڑے بیل اور بندر بناتے بناتے اس نے ایک روز آدمی بنایا اور اسے سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا...

سخت دوپہر تھی، چلچلاتی دھوپ کے شعلے ویران اور کلرزدہ زمین پر جگہ جگہ رقص کر رہے تھے۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ چرند پرند پناہ گاہوں میں چھپ گئے تھے۔ شرینہہ (سرس) کا بوڑھا پیڑ دھوپ میں چپ چاپ کھڑا جھلس رہا تھا اور زیناں اب تک روٹی لے کر نہیں آئی تھی۔

اس نے گاؤں سے آنے والے راستے پر دور دور تک دیکھا مگر چلچلاتی دھوپ کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا، اس نے چلم کو ٹٹولا وہ گرم تھی، مگر اس نے کش لیا تو اس کے منہ میں جل چکے تمباکو کی بو آئی... وہ اٹھ کر سائے میں آ گیا اور زیناں کی راہ دیکھنے لگا۔

ایک مدت سے اس کی خواہش تھی کہ وہ ایک ایسا باوا بنائے جسے کم از کم زیناں دیکھ کر ضرور دنگ رہ جائے اور اس کی کاریگری کی تعریف کرے۔ اس کے ذہن میں جوانی کے دنوں سے ایسے بہت سے لوگوں کی شکلیں اور قامتیں محفوظ تھیں، جن سے وہ کبھی نہ کبھی متاثر ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا دیکھے ہوئے ان بہت سے چہروں اور جسموں کو توڑ کر ان کے خمیر سے ایک نہایت عمدہ قد و قامت اور چہرے مہرے والا آدمی بنائے جو ہر طرح سے مکمل اور نادر ہو۔ اس نے اپنے ذہن میں اسے کئی بار مکمل کیا تھا مگر بار بار اس کی شکل و صورت اور ساخت اس کے ذہن سے اتر جاتی یا دھندلا جاتی۔ وہ اسے مکمل یکسوئی اور اطمینان سے بنانا چاہتا تھا، لیکن اطمینان نصیب نہ ہوتا تھا۔ اسے ہر گھڑی زیناں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ کئی بار اس نے کوشش بھی کی مگر پھر اسے ادھورا چھوڑ دیا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ اسے اس وقت یاد آتا جب مٹی کم ہوتی یا اچھی نہ ہوتی اور کبھی اس وقت جب وہ رات کو کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹ کر حقہ گڑگڑا رہا ہوتا۔ مگر آج گھوڑے، بندر اور بیل بناتے بناتے اچانک اس کے دل میں دردِ زہ کی سی ٹیس اٹھی اور اس نے اسے بنایا اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔

بیٹھے بیٹھے اس نے شرینہہ کی سوکھی ہوئی پھلی لے کر مروڑی اور بیج نکال کر گننے لگا۔ اسے خیال آیا کہ بوڑھے شرینہہ کے سوکھنے یا ٹوٹ جانے سے پہلے دوسرا شرینہہ لگا دینا چاہیے لیکن پھر وہ کسی ان جانے خیال سے اداس ہو گیا۔ اسی لمحے زیناں روٹی لے کر آ گئی، اس نے ہمیشہ کی طرح اطمینان کا سانس لیا پھر گھڑے سے پانی کا پیالہ بھرا اور منہ ہاتھ دھونے لگا۔ زیناں اس کے سامنے بیٹھ کر دوپٹے کے پلو سے پنکھا کرنے اور نظر نہ آنے والی مکھیاں اڑانے لگی پھر بولی:

"تمباکو نہیں ملا... دکان والا پچھلے پیسے مانگ رہا تھا... تم کہو تو رہے سے کچھ...!"

"نہیں۔" اس نے چھاچھ کا پیالہ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔ "میں شام کو آ کر خود اس سے بات کر لوں گا فی الحال ایک آدھ چلم ہے کام چل جائے گا۔"

"میں تو کہتی ہوں۔" زیناں شرینہہ کی ڈالیوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ کو ہاتھ کی پشت پر روک کر بولی۔ "دوپہر کو گھر آ جایا کرو... درخت بوڑھا ہو گیا ہے اور لوگوں نے اس کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر اسے اور بھی ٹنڈ منڈ کر دیا ہے۔"

"یہ بڑا برکت والا ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ نہ ہوتا تو بدھائی مانگنے والوں کو گھر تلاش کرنے میں دقت پیش آتی، سارے گاؤں میں یہی ایک تو شرینہہ ہے۔"

وہ روٹی کھا چکا تو وہ برتن سمیٹنے لگی۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ بے قراری سے بولا۔

"زیناں میں نے آج ایک کمال کی چیز بنائی ہے۔"

"کیا؟"

"بوجھو تو۔"

"مرتبان" وہ بولی۔ "تم نے اچھا کیا جب بھی لسی مانگنے جاتی ہوں چودھرانی مرتبان کا ضرور پوچھتی ہے۔"

"وہ بھی بنا دوں گا لیکن یہ ایک دوسری چیز ہے۔"

"اچھا اچھا۔" وہ ہنس پڑی۔ "مجھے پتہ چل گیا، جھانواں۔"

وہ بھی ہنس پڑا کہنے لگا۔

"جھانواں تو نہیں پر ایک لحاظ سے جھانواں ہی سمجھو کیونکہ اس میں عقل تمیز نہیں ہے... میں نے باوا بنایا ہے۔"

"باوا؟"

"ہاں باوا اور ایسا بنایا ہے کہ بس جان ڈالنے کی کسر رہ گئی ہے تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی کہ دنیا میں تم سے زیادہ خوب صورت چیزیں بھی ہیں یا بنائی جاسکتی ہیں۔"

"اچھا چلو دکھاؤ۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

وہ اسے لے کر وہاں آیا جہاں اس نے ساری چیزیں دھوپ میں سوکھنے کے لئے رکھی تھیں مگر وہ یہ جان کر پریشان ہوگیا کہ گھوڑے، بیل، بندر اور دوسری سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں مگر آدمی وہاں نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی دور دور تک چلچلاتی دھوپ اور چمکتا ہوا کلر پھیلا ہوا تھا۔ کہیں آدمی نہ آدم زاد... پرندے تک گھونسلوں اور درختوں کی گھنی شاخوں کی تلاش میں نکل گئے تھے۔ وہ پریشان ہوگیا۔

"پتہ نہیں آدمی کدھر گیا۔"

"سو بار کہا ہے۔" زیناں بولی۔ "دوپہر کے وقت آرام کرلیا کرو مگر تم مانتے ہی نہیں، مجھے ڈر ہے کسی روز تم سچ مچ سودائی ہو جاؤ گے۔"

"تمہیں یقین نہیں آیا۔" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولا "خدا کی قسم میں نے تمہارے آنے سے ذرا پہلے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا، آنکھوں سے بنا ہوا دیکھا اور یہاں رکھا تھا اور ابھی تو وہ اچھی طرح سے سوکھا بھی نہیں تھا۔"

"کہیں چلا گیا ہوگا۔" زیناں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا پتہ تمہارے لئے تمبا کو لینے گاؤں چلا گیا ہو۔"

اس نے نظریں جھکا لیں اور نڈھال نڈھال سا شرینہہ کے نیچے آ گیا، زیناں کچھ دیر خاموش رہی پھر ناخنوں سے درخت کے تنے کی کھال کھرچتے ہوئے بولی۔

"تو تم نے سچ مچ باوا بنایا؟"

"تو اور کیا، میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

"اگر ایسا ہے تو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" زیناں بولی۔ "تم گھر چلو... دیکھو یہ وقت ٹھیک نہیں ہوتا، ویسے بھی یہ سنسان جگہ مجھے تو کچی معلوم ہوتی ہے۔ ایک دن میں واپس جا رہی تھی تو ٹبے کے پاس سے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو... میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہیں تم غلط نہ سمجھو... اللہ کی مخلوق۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی:

"پتہ ہے ایک بار ابا گدھے پر سوار کہیں جا رہا تھا اس نے دیکھا اس کے آگے آگے ایک اور شخص بھی گدھے پر سوار جا رہا ہے پھر دونوں غائب ہو گئے آدمی بھی اور گدھا بھی۔"

بڑا افسانہ نگار!

بڑے افسانہ نگار کی اولین شناخت ہی یہ ہے کہ اسے کہانیاں سوجھتی ہیں۔ ادب لطیف کے لکھنے والوں کو دیکھئے ل۔ احمد، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم سب رتوندے کے شکار ہیں۔ کہانیاں سوجھتی ہی نہیں۔ دنیائے افسانہ میں اندھے حافظ جی کی طرح زبان کی فراست پر روٹیاں کما کھاتے ہیں۔ افسانہ میں پلاٹ کا سہارا وہی لیتا ہے جو کہانی کہنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ کہانی تو اسی طرح نشوونما پاتی ہے جیسے بیج میں سے درخت پھوٹتا ہے۔ پلاٹ کا سہارا وہی لیتا ہے جس کا تخیل کہانیاں ایجاد نہیں کرسکتا۔ کیونکہ پلاٹ کے ذریعہ اتفاقات، حادثات، انہونی باتوں، سنسنی خیزی، اب کیا ہوگا والی حیرت زدگی کو داخل افسانہ کیا جاسکتا ہے۔ اعظم کریوی، سدرشن، سلطان حیدر جوش اور اختر انصاری، پریم چند سے اسی لئے چھوٹے ہیں کہ وہ پلاٹ پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ پریم چند ہمارے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں کیوں کہ انہیں بہت وافر تعداد میں کہانیاں سوجھتی ہیں اور کہانی کو دل چسپ بنانے کے لئے انہیں پلاٹ کی آبلہ فریبیوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔ عصمت، منٹو، بیدی اور غلام عباس کو بھی نت نئی، انوکھی اور معنی خیز کہانیاں وافر پیمانہ پر سوجھتی ہیں۔ کرشن چندر کے پاس سڈول کہانیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہیں تکنیک اور پلاٹ اور انشا پردازی کی عشوہ فروشیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ انور سجاد اور بلراج مینرا کو کس معنی میں ہم کہانی کار کہہ سکتے ہیں۔ ہاں انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش اور محمد منشایاد کو کہانیاں سوجھتی ہیں۔ نت نئی، انوکھی، نکتہ رس۔ لیکن ایسا لگتا ہے مس حیدر اپنی کہانیوں کا اسٹاک خالی کرچکی ہیں اور سریندر پرکاش کا منفرد تخیل، صحافت کی تاریک پرچھائیوں سے خود کو بچا نہیں پاتا۔ محمد منشایاد پر قدرت بہت مہربان ہے۔ ان کے آسمان تخیل پر کہانیوں کے تارے ٹوٹتے ہی رہتے ہیں ——— ذہن جدید، نئی دہلی

ابا نے اتر کر دیکھا وہاں تک گدھے کے پاؤں کے نشان تھے جہاں سے وہ غائب ہوا تھا۔

''میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا'' وہ بولا اور پھر انہوں نے باوے کا کیا کرنا تھا؟

''اللہ جانے... میں تو کہتی ہوں گھر چلے چلو''

''نہیں زیناں... میں گھر میں چھپ کر کب تک بیٹھ سکتا ہوں اور پھر تمہیں پتہ ہے مجھے گاؤں میں آ کر وحشت ہوتی ہے۔ پورے گاؤں میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہے جو مجھے آدمی سمجھتا ہو۔ لے دے کے ایک رہ جا ہے وہ بھی تمہاری وجہ...''

''ایسی باتیں نہ کیا کرو دتے؟'' وہ اداس لہجے میں بولی۔ ''مجھے پتہ ہے کہ تم نفرتوں کے ستائے ہوئے اور کئی پشتوں سے محبت کے لئے ترسے ہوئے ہو، لیکن میں جو ہوں... میری طرف دیکھو... میں بھی تو ہوں... تم تو پھر دن بھر کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہو۔''

''اور تم نے جو اتنے سارے گھگھو گھوڑے پڑچھتی پر سجا کر رکھے ہیں؟''

''ہاں رکھے تو ہوئے ہیں مگر کیا فائدہ؟''

''لیکن تمہیں رب نے اتنا حسن دیا ہے کہ تم محض شیشہ دیکھ کر بھی وقت گزار سکتی ہو۔''

زیناں کی سمجھ میں نہ آیا روئے یا اترائے۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولی۔

''دتے تم پانی میں گھرے ہوئے پانی ہو اور میں آگ میں گھری ہوئی آگ۔ تمہیں کیا پتہ آگ کیا ہوتی ہے؟ تم آوی میں چیزیں پکاتے ہو لیکن تم نے خود آوی میں پک کر کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں تو تمہیں پہلے ہی ناری سمجھتا ہوں۔''

''نہ اڑیا... مجھے خاکی ہی رہنے دے... میں تو ایک بھینس اور ایک گدھی کے عوض۔''

''بھینس اور گدھی کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اگر میرے پاس قارون کا خزانہ ہوتا اور تم مجھے اس کے بدلے مل جاتیں تو بھی میں خود کو خوش قسمت سمجھتا۔''

''ذکر کیوں نہ کیا کروں... بھینس اب تیسرے چوتھے سوئے میں ہوتی اور گدھی۔''

''تم نہ آتیں تو میرا کیا بنتا... برادری والوں نے تو غریب سمجھ کر صاف جواب دے دیا ہوا تھا... میرا جنازہ''

''ہاں تمہاری روٹی کون پکاتا... کپڑے کون دھوتا اور تمہارا جنازہ کیسے جائز ہوتا؟'' وہ اداس اور پریشان ہو گئی۔

وہ بولا۔ ''اب تم گھر چلی جاؤ... میں اسے تلاش کرتا ہوں۔''

''دوسرا بنالو'' وہ برتن اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''آخر ایک باوا ہی تو تھا۔''

''دوسرا تو میں کسی بھی وقت بنالوں گا'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن پہلا کدھر گیا۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو وہ پہلا والا کدھر گیا۔''

''عجیب بات ہے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''کاش میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی لیکن میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا اللہ اپنا فضل کرے... اچھا میں جاتی ہوں۔''

وہ اٹھ کر چل دی... وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، گم صم کھڑا رہا۔ جب وہ ٹبے کے پاس پہنچ گئی تو اس نے اسے آواز دی۔

''زیناں... کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔''

مگر زیناں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پتہ نہیں وہ مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی یا آواز کی سرحد پار کر چکی تھی اسے پشیمانی ہونے لگی۔ اس نے زیناں کو پہلے کیوں تاکید نہ کر دی کہ وہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرے، لوگ اسے پہلے ہی بے وقوف اور حقیر جانتے تھے، نئی بات سن کر اور ہنسی اڑائیں گے اور اس کا جینا دوبھر کر دیں گے۔ پھر اس نے چشم تصور سے دیکھا زیناں گلی کے موڑ پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

''رجے... تیرے بھائیے نے آج آدمی بنایا۔''

''آدمی بنایا؟''

''ہاں اور وہ غائب ہو گیا۔''

''کون بھائیا؟''

''نہیں آدمی۔''

''بھائیا بھی تو آدمی ہے... کھوہ ہے کہ نہیں۔''

''ہے... مگر اس نے باوا بنایا تھا۔''

''دیکھ زینی... بجھارتیں نہ ڈالا کر... بھائیے کا باوا گم ہو گیا ہے تو تو اسے دوسرا بنا دے تو بھی تو کاریگری ہے۔''

اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ورنہ زیناں پتہ نہیں کیا کہہ دیتی۔ شام کو وہ گاؤں پہنچا تو اس کا خدشہ درست ثابت ہوا، سارے گاؤں میں باوے کے گم ہو جانے کی خبر پھیل چکی تھی۔

تنور، چوپال، مسجد اور بڑی دکان پر ہر جگہ لوگ اس کی سادگی اور بے

دتونی پر ہنستے اور وہ جدھر سے گزرتا اسے چھیڑتے۔

”سنا ہے دتے... تیرا بندہ گم ہو گیا ہے؟“

”یار دتے... بڑا افسوس ہے تو نے ساری عمر میں صرف ایک باوا بنایا تھا وہ بھی چیل اٹھا کر لے گئی۔“

مولوی صاحب نے لاحول پڑھ کر کہا۔ ”جب شرک کے کام کرو گے تو ایسا ہی ہو گا۔ کم بخت بت بناتے ہو یاد رکھو، اللہ ایسے لوگوں کی مت مار دیتا ہے۔“

اسے بے حد رنج ہوا... زیناں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے زیناں پر بہت غصہ آیا مگر وہ ضبط کر گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ اس سے روٹھ نہ جائے۔ اس کے پاس زیناں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ پتہ نہیں کاغذ کی یہ ناؤ اب تک کیسے سلامت تھی۔ وہ ہر روز گھر آتا اور اسے گھر میں پا کر متعجب ہوتا تھا... اسے دوپہر کو اکثر شبہ رہتا تھا لیکن وہ خلاف توقع ہر روز روٹی لے کر آ جاتی تھی۔ باوے والی بات پر اس نے گاؤں والوں کی پھبتیاں، طعنے اور باتیں سنیں اور برداشت کیں اور بظاہر ایسا رویہ اختیار کر لیا جیسے وہ زیناں اور گاؤں والوں سے خود مذاق کر رہا تھا مگر اندر ہی اندر اس کے دل میں گرہ سی پڑ گئی اور اسے عجیب طرح کی چنتا لگ گئی، آخر وہ کدھر گیا؟ کون لے گیا؟

زیناں کو اس کی بات کا یقین آ گیا اور وہ جلد ہی بھول گئی۔ لوگ بھی بھول گئے مگر وہ پریشان اور اداس رہنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب اس کے اور زیناں کے سوا وہاں کوئی نہیں آیا تھا تو وہ کدھر گیا۔ زیناں اس سے پریشانی اور اداسی کا سبب پوچھتی تو وہ اسے ادھر ادھر کی باتوں میں ٹال دیتا۔

وہ گھگھو گھوڑے بناتا اور آوی میں پکاتا اور زیناں سر پر کھاری رکھے آس پاس کے دیہاتوں میں گلی گلی گھومتی اور کھلونے بیچتی رہی... شرینہہ کی ٹہنیاں کٹ کٹ کر گاؤں کے مختلف دروازوں پر بجتی رہیں۔ بہت سا وقت گزر گیا مگر اس کی الجھن دور نہ ہوئی۔

اس دوران اس نے شہر جا کر جیوتشی سے پوچھا... سائیں بہار شاہ کے میلے پر طوطے سے فال بھی نکلوائی اور پیر ہدایت اللہ سے تعویذ بھی لیا مگر اس کی الجھن دور ہوئی نہ اس کے ذہن سے باوے کا خیال محو ہوا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ پھر سے بنا لے... سامنے بیٹھ کر سکھائے اور پکائے لیکن یہ سوچ کر اسے ہول آتا تھا کہ اگر وہ اس کے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا تو؟

اس نے ہر پور میں سے اچھے اچھے کھلونے نکال کر گھر کی بڑچھتی پر محفوظ کئے ہوئے تھے۔ اگر باوا بڑچھتی پر پڑا پڑا غائب ہو گیا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جائے گا اور زیناں تو خوف اور دہشت کے مارے بے ہوش ہو جائے گی اور گھر کے در و دیوار سے خوف کھانے لگے گی۔

موسم آتے جاتے رہے۔ رتیں بدلتی رہیں۔ بہار کے موسم میں نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں اور برسات کے دنوں میں بادل امنڈ امنڈ کر آتے رہے۔ پھر ایک موسم برسات میں آسمان سے اس قدر پانی برسا کہ جل تھل ایک ہو گیا۔ سیلاب کا پانی اترا تو کلر زدہ زمین پر جا بجا گھاس اور طرح طرح کی بوٹیاں اگ آئیں۔

ایک ایسی صبح کو جب منڈیروں پر کوے کلول کر رہے تھے اور چڑیاں چہچہا رہی تھیں دتے کے گھر سے چلم کے لئے جلائے گئے اپلوں کا دھواں اور زیناں کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں جو تھوڑی دیر بعد گھنگھریالے قہقہوں میں تبدیل ہو گئیں... اور اسے پتہ چلا کہ اس کے گھر کے آنگن میں ایک ننھا سا شرینہہ اُگ آیا ہے۔ پتہ نہیں شرینہہ کے بیج کب اور کیسے گھر میں آئے تھے۔ کیا خبر بیجوں کی کوئی پھلی زیناں کی کھاری یا چنگیر میں آ گئی ہو، کوئی بیج اس کے اپنے جوتوں کے ساتھ چپک کر وہاں پہنچ گیا ہو یا پھر ہوا کے جھونکے اسے اڑا لائے ہوں۔

”شرینہہ برکت والا درخت ہے۔“ اس نے سوچا ”اور اس کی نسل گاؤں میں ختم نہیں ہوئی۔ بوڑھا شرینہہ ابھی کھڑا تھا کہ دوسرا اُگ آیا۔“

بڑچھتی پر رکھے ہوئے کھلونوں کی گرد صاف کی گئی اور گھر کے اندر سارے فرش پر گوبر کا لیپ کیا گیا۔

زیناں ٹھیک ہو گئی اور کام کاج کرنے لگی تو وہ بھی ایک صبح کام پر روانہ ہوا۔ زیناں نے کہا۔ ”دوپہر کو گھر آ جانا دتے... وہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

”کیوں ٹھیک نہیں؟“

”تمہیں یاد ہے وہ باوا؟“

”باوا؟“ وہ چونک پڑا۔

”ہاں وہی باوا... جس کے غم میں تم اتنا عرصہ اداس اور پریشان رہے۔“

”تو تم جانتی ہو؟“

”ہاں۔“

”اور تمہیں یقین ہے میں نے بنایا تھا۔“

”ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو اُن چیزوں سے بھی محبت کر سکتا ہے جو اس نے نہ بنائی ہوں۔“

اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے زیناں کی طرف دیکھا اور اوزار اٹھا کر باہر نکل گیا۔

OO

افسانے

جہنم سے فرار۔۲

منشا یاد

وہ ایک طویل عرصہ سے ایک ایسی اذیت ناک بیماری میں مبتلا تھا جسے معالجوں نے نا قابلِ علاج قرار دے دیا تھا۔ وہ درد اور اذیت سے ایڑیاں رگڑتا اور مرنے کی دعائیں کرتا۔ اس نے بیماری کا زیادہ تر عرصہ پین کلر دواؤں اور ٹیکوں کے سہارے گزارا تھا مگر اب وہ بھی بے اثر ہو گئے تھے۔ اس نے کئی بار ڈاکٹروں کی منت سماجت کی کہ وہ اسے مرسی کلنگ mercy killing کی بنیاد پر کوئی انجکشن لگا کر اس تکلیف دہ زندگی سے نجات دلا دیں مگر وہ مذہبی اعتقادات، اخلاقی اور قانونی ضابطوں اور اپنے پیشہ ورانہ اُصولوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکتے تھے۔ اس نے خود بھی کئی بار حرام زندگی پر حرام موت کو ترجیح دیتے ہوئے خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اس کے بے درد لواحقین اور معالجین ہر مرتبہ اس کی کوشش کو ناکام بنا دیتے اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اُسے اذیت کے بھوکے بھیڑیوں کے آگے پھینک کر چلے جاتے جو اس پر ایک ساتھ جھپٹتے، تیز دانتوں اور نوکیلے پنجوں سے اس کی کھال ادھیڑتے، جسم کو کاٹتے، چیرتے، پھاڑتے اور اس کی ہڈیاں چچوڑتے۔ پھر جب وہ سارا کھایا نگلا جا چکتا تو وہ کھائی ہوئی ایک ایک بوٹی اُگل دیتے۔ آن کی آن میں بوٹیاں ایک دوسری سے جڑنے لگتیں اور ہڈیوں پر ماس چڑھنے لگتا اور وہ درد کے ظالم بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لئے دوبارہ پورا بن جاتا۔

کبھی کبھی جب درد کی شدت نا قابلِ برداشت ہو جاتی اور کوئی دوا یا ٹیکہ کارگر ثابت نہ ہوتا تو وہ درد کے مارے بلند آواز میں چیخنے چلانے لگتا۔ اس کی چیخیں اس قدر ہولناک ہوتیں کہ ڈاکٹر، نرسیں اور لواحقین ہی نہیں ملحقہ جنرل وارڈ کے مریض بھی سہم جاتے اور اس کی موت کی دعائیں کرنے لگتے کہ وہی اس کو تکلیف سے نجات دلا سکتی تھی مگر کسی کی کوئی دعا قبول ہوتی نہ کوئی دوا اثر کرتی۔ لیکن انسانی خوش گمانی خراب سے خراب تر صورتِ حال سے بھی اپنے فائدے اور تشفی کا کوئی پہلو نکال لیتی ہے۔ آدمی نے مذہب اور عقیدے کے نام پر جو بہت سے ڈھکوسلے بنا رکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دُنیا میں جن لوگوں کو حد سے زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑے انھیں اسی دنیا میں اپنے گناہوں کی سزا مل جاتی ہے اور وہ اگلی دنیا کے عذاب سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن پھر ایک ایسی رات آئی جس کا اسے مدت اور شدت سے انتظار تھا اور جس کے لئے وہ دعائیں مانگتا تھا۔ ہسپتال کی بند کھڑکی سے چند سیاہ پوش سائے اندر آئے اور حالاں کہ وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا مگر وہ اسے کھینچنے اور گھسیٹنے لگے۔ پھر اسے ایک تنگ و تاریک پائپ ایسی سرنگ میں لے گئے جس کے دوسرے سرے پر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ یہ سرنگ آگے جا کر مزید پتلی اور تنگ ہوتی جا رہی تھی اور گھسیٹے اور دھکیلے جانے کے بغیر پار نہیں کی جا سکتی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ بارے (جنتری) میں سے گزارا جانے والا تار ہو مگر جوں ہی وہ اس سرنگ سے باہر نکلا اسے اچانک درد اور اذیت سے نجات مل گئی اور اسے لگا ہر طرف رحمت کی ہوائیں چلنے لگی ہیں۔ وہ ایک عجیب سکون و سرور کی فضا میں پہنچ گیا اور خود کو خوش و خرم اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اب وہ خلا کے سمندر میں تیر اور ہوا کے دوش پر اُڑ سکتا تھا۔

پھر اس نے دیکھا اس کا مادّی جسم ابھی تک بے سدھ اور بے حرکت ہسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا اور اس کے عزیز و اقارب ایک اطمینان بخش دکھ کے ساتھ رو رہے تھے۔ وہ انھیں دیکھ سکتا تھا ان کی باتیں سن سکتا تھا اور ان کے اصلی اور دکھاوے کے آنسوؤں کو پہچان سکتا تھا مگر انھیں چھو سکتا تھا نہ ہی وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔

پھر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اچانک انھیں کفن دفن کی جلدی پڑ گئی ہے حالاں کہ ڈاکٹر نے میت خراب ہونے کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی تھی۔ ان میں اس کا وہ عزیز جو مذہبی رجحان کا حامل تھا، سب میں پیش پیش اور پُر جوش تھا۔ اسے حیرت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ وہ عزیز ہر کام میں سست

اور کاہل مشہور تھا مگر اس کی تدفین میں وہی سب سے زیادہ آگے تھا۔ جیسے مردے کو جلد از جلد قبر میں اُتارنے اور حساب کتاب کے لئے پہنچانے کی ذمہ داری اسی کی ہو اور تاخیر کی صورت میں نکیرین کی بازپرس کا ڈر ہو۔

وہ اس کی میت کو ایمبولنس میں ڈال کر گھر لے گئے۔ اڑوس پڑوس اور محلے کے لوگ آنے لگے۔ پھر رشتہ داروں کی آمد شروع ہوئی۔ ہر کوئی آتے ہی بلند آواز میں نعرہ مار کر روتا یا اُونچی آواز میں سسکیاں لیتا مگر پھر فوراً ہی نارمل ہو کر ایک جیسے بے معنی سوال کرنے لگتا۔ کب اور کیسے فوت ہوئے؟ آخری وقت میں کون پاس تھا؟ کیا وصیت کی؟ کس کس کو اطلاع دی ہے۔ جنازے کا کیا وقت مقرر کیا ہے؟ وغیرہ۔

وہ ساری کاروائی دیکھتا رہا۔ کیسے اسے نہلایا اور کفنایا گیا۔ کس کس نے اس کا چہرہ دیکھنا پسند کیا۔ مرنے کے بعد اس کی شکل اور بگڑ گئی تھی اور اس کا جی چاہ رہا تھا کوئی اس کی صورت نہ دیکھے مگر سبھی ایک نظر ڈال لینا ضروری سمجھتے بلکہ بعض ایسوں نے بھی اس کا چہرہ دیکھا جنھیں وہ جانتا تک نہ تھا اور جنھیں اس نے زندگی میں کبھی اپنا چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ اسے بہت سے عزیزوں اور رشتہ داروں کے رویوں پر افسوس بھی ہو رہا تھا اور ان کی منافقت اور اداکاری دیکھ کر غصہ بھی آرہا تھا مگر وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا۔ یوں بھی زندگی کی یہ چھوڑی ہوئی منزل اسے حقیر اور بے معنی لگ رہی تھی اور وہ جلد از جلد ایک لمبی اور پر سکون نیند سونا چاہتا تھا۔

اس کے جسم کو قبر میں اتارا گیا تو اس نے محسوس کیا وہ بھی قبر میں بند ہو گیا ہے۔ پھر انھوں نے قبر پر عرقِ گلاب چھڑکا، پھولوں کے ہار ڈالے اور اگربتیاں سلگائیں اور دعا مانگ کر چلے گئے۔ وہ اطمینان سے اپنی میت کے ساتھ ہی لیٹ گیا اور گہری نیند سو گیا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا پھر اچانک آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اسے لگا کہ چوہا، سانپ، نیولا یا تازہ مردے کی تلاش میں بجو قسم کا کوئی چوپایہ ہے۔ اس نے بجو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر بجوؤں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ وہ تازہ مردوں کے انتظار میں رہتے اور انھیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بلکہ اس کے ایک دوست کا دادا جسے بابا جی کہتے تھے ان کی بڑی خوف ناک تفصیل بتایا کرتا تھا کہ وہ کیسے مردے کو قبر سے نکال کر اور تختے کو دبا کر سیدھا کھڑا کر لیتے اور اپنی پسند کی بوٹیاں نوچنے لگتے ہیں۔ مگر وہ بجو تھے نہ سانپ اور نیولے۔ وہ دو تھے اور ان کی صورتیں نورانی مگر تھوڑی تھوڑی غیر انسانی تھیں مگر پھر بھی ایک کی مشابہت ان مولانا سے تھی جو ٹیلی ویژن پر درس دیتے تھے اور جن کی بڑی بڑی غضب ناک آنکھیں تھیں اور درس کے دوران میں سامعین، ناظرین اور مخاطبین کو گردنوں تک گناہ ہائے کبیرہ میں ڈوبے ہوئے فرض کر کے یوں دھاڑتے تھے جیسے دیہاتی تھانے میں کوئی بڑا تھانے دار کمی اور مفلس قسم کے مجرموں پر۔ اور عورت کا ذکر آتا تو اور بھی بپھر جاتے اور وجودِ زن کو کائنات میں باعثِ خرابی اور بدی قرار دیتے۔ دوسرے کی صورت اس کے چھٹی جماعت کے ریاضی ٹیچر ماسٹر عبدالغفار سے مشابہ تھی جو لڑکوں کو غلطیوں پر یوں سزا دیتے تھے جیسے انتقام لے رہے ہوں۔ ساتھ ساتھ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتے بھی جاتے۔ ظاہر ہے یہ ایسی گالیاں ہوتی ہوں گی جن کا بلند آواز میں اظہار نا مناسب تھا ورنہ عام گالیاں جیسے نالائق، پاجی، گدھا، الو اور حرام خور وغیرہ وہ بلند آواز میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ ان کے صرف سر ہی نظر آتے تھے پتا نہیں دھڑ تھے یا نہیں اور دھڑ کی انھیں ضرورت بھی کیا تھی؟ اس نے انھیں پہچان لیا۔ مگر پتا نہیں ان میں منکر کون تھا اور نکیر کون؟

"تمھارا نام؟"

ان میں سے ایک نے جس کی آنکھیں سرخ انگارہ تھیں آتے ہی تحکم آمیز لہجے میں پوچھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ عربی بول رہا تھا مگر وہ اس کی سمجھ میں آرہی تھی حالاں کہ عربی اس نے ساتویں جماعت ہی میں عربی کے ٹیچر کی وجہ سے چھوڑ دی تھی۔ وہ اچھی شکل اور گورے رنگ کے لڑکوں کو گھر بلا کر مفت ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ اس نے سوچا جس بات کا کھٹکا تھا اور جن آسایشوں کے چھن جانے کے خوف سے وہ زندگی بھر حکومتی احتساب کے بہت سے اداروں سے ڈرتا رہا وہ سب تو چھن چکیں اب ڈر کیسا؟

"الف بے جیم دال" اس نے جواب دیا۔

"یہ تمھارا نام نہیں ہے۔" دوسرے نے دانت پیستے ہوئے کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"اپنا اصلی نام بتاؤ۔" پہلے والا دوبارہ بولا۔

"اگر تمھیں میرا اصلی نام معلوم ہے تو پوچھتے کیوں ہو؟"

"نام ہی نہیں ہمیں تمھارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے مگر ہم تمھارے منھ سے سننا چاہتے ہیں۔"

"اگر میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو تو سوال و جواب میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟"

"تم وقت کی فکر نہ کرو۔ وہ تمھارے پاس بھی بہت ہے حشر تک۔ اور ہمیں بھی کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے تم بے کار لوگ ہو۔ سادہ اور معصوم انسانوں کو تنگ کرنے کے سوا تمھیں کوئی کام نہیں ہے۔"

"منھ سنبھال کر بات کرو۔"

"کیسا اور کون سا منھ؟"

"ہم بے کار نہیں ہیں۔ ہمارے ذمے حساب کتاب اور احتساب کرنا ہے کیا یہ کام نہیں؟"

"نہیں۔ یہ نہایت فضول سا کام ہے جس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ کام وہ ہوتا ہے جس میں جسمانی یا ذہنی محنت درکار ہو اور جس سے کچھ حاصل ہوتا ہو۔ جیسے کسان کے زمین میں ہل چلانے اور بیج بونے سے فصل تیار ہوتی ہے۔ مزدور کے کارخانہ چلانے سے کپڑا اور دیگر مفید چیزیں بنتی ہیں یا جیسے مٹی، لکڑی اور لوہے کو خاص شکل دینے سے اپنے یا دوسروں کے استعمال کی چیزیں اور اوزار بنتے ہوں۔ غور و فکر کرنا بھی کام ہے کہ زندگی کے سربستہ رازوں سے آگاہی ہوتی ہے حتیٰ کہ فنون لطیفہ سے بھی احساس اور جذبے کی سطح پر تسکین اور مسرت حاصل ہوتی ہے مگر تمھاری تنقید اور احتساب سے کیا حاصل ہوتا ہے؟"

"نیکی کا اجر ملتا ہے اور بدی کی سزا۔"

"چھوٹی بڑی خوشیوں اور لذتوں سے محروم پوری زندگی گزارنے کے بعد اب میں تمھارے اجر کا کیا کروں گا؟"

"سزا اور عذاب سے تو بچ جاؤ گے۔"

"میں سزا اور عذاب دنیا میں جھیل آیا ہوں میرے گناہ جھڑ چکے ہیں۔"

"تمھیں سزا اور عذاب کا اندازہ نہیں ورنہ ایسا نہ کہتے۔"

"مجھے سب معلوم ہے۔"

"تم نے صرف جہنم کا نام سنا ہے۔ جب دیکھو گے تب پتا چلے گا۔ اس میں ایک وادی ہے جس کا نام لم لم ہے۔ اس میں سانپ ہیں جو اونٹ کی گردن کے برابر موٹے ہیں اور ان کی لمبائی ایک مہینہ کی مسافت کے برابر ہے۔ جہنم میں ایک میدان ہے جس کا نام جب الحزن ہے۔ وہ بچھوؤں کا گھر ہے اور ہر بچھو خچر کے برابر بڑا ہے۔ تم نے بہت سی نمازیں قضا کی ہیں اور جانتے ہو جو شخص نماز کو قضا کردے گو وہ بعد میں پڑھ بھی لے پھر بھی وقت پر نہ پڑھنے کی وجہ سے ایک حقب جہنم میں جلے گا اور حقب کی مقدار اسی برس کی ہوتی ہے اور ایک برس تین سو ساٹھ دن کا اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہوگا۔ اس حساب سے ایک حقب دو کروڑ اٹھاسی لاکھ برس کا ہوا۔"

"تم مجھے کسی مدرسے کا کم سن طالب علم یا نیم خواندہ مسلمان نہ سمجھو جو ایسی مبالغہ آمیز باتوں پر بے تامل یقین کر لیتا ہے۔ مجھے خدا نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے۔"

"تمھارا نامۂ اعمال سیاہ ہے اور تم جہنم رسید کیے جاؤ گے۔"

"تم مجھے ڈرانے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔"

"ابھی تمھیں اس کی ایک جھلک دکھائیں گے تو تمھیں خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔" ایک بولا۔

"میں خود اذیت کے جہنم زار سے گزر کر آیا ہوں۔"

"وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی تمھیں عنق (لمبی گردن) کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" دوسرا کہنے لگا "جہنم میں جب یہ ظاہر ہوگی تو لوگوں کو پھاندتی ہوئی چلی آئے گی۔ اس میں دو چمک دار آنکھیں ہوں گی اور نہایت فصیح زبان ہوگی۔ وہ کہے گی کہ میں ہر اس شخص پر مسلط ہوں جو متکبر، بدمزاج ہو اور مجمع میں سے ایسے لوگوں کو اس طرح چن لے گی جیسا کہ جانور دانہ چگتا ہے۔ ان سب کو چن کر جہنم میں پھینک دے گی اس کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ

انشائے منشا

برادرِ عزیز اے۔ غفار پاشا صاحب، السلام علیکم!

آپ کے انشائیوں کی آدھی درجن کتابیں ملیں۔ شکریہ۔ 'اسٹے آرڈر' کا دیباچہ پڑھ کر پتہ چلا انشائیوں کا میزان اکھوتر سو یعنی ایک سو ایک ہے۔ انشائیے کی اتنی وافر پیداوار دیکھ کر یقیناً ڈاکٹر وزیر آغا بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ ہمارا ملک کم از کم صنفِ انشائیہ کی حد تک خود کفیل ہو گیا ہے۔ آپ نے جس طرح انشائیے کا گولڈن جوبلی سال منایا اس پر آپ اور ڈاکٹر وزیر آغا کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بلکہ سارے انشائیہ نگار اس مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس لیے سب میں برابر برابر بانٹ دیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وزیر آباد ایک بڑا ریلوے جنکشن ہے اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا بھی ایک بڑا ادبی جنکشن ہیں جہاں سے شاعری کی میل، نقد و نظر کی مال اور ادب کی پسنجر ریل گاڑیاں چہار اطراف کو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انشائیے کی کچھ ریل کاریں بھی صبح و شام مختلف شہروں کو روانہ ہوتی ہیں جو اگر چہ خسارے میں چلتی ہیں مگر چھوٹے اسٹیشنوں پر نہیں رکتیں۔ وزیر کوٹ کے علاوہ ان کے بڑے بڑے اسٹیشن غلام جیلانی اصغر پورہ، جمیل آذر آباد، ڈیرہ اکبر حمیدی کوٹ حامد برگی، قلعہ سلیم آغا قزلباش، مقبرہ مشتاق قمر، فورٹ ناصر عباس اور ماڑی پروین طارق ہیں۔ چوں کہ ہمیشہ سے ان ریل کاروں کے خلاف تخریبی کارروائیوں کا اندیشہ رہتا تھا اس لئے ڈاکٹر آغا کو خود بطور گارڈ ساتھ رہنا پڑتا.....

(چیف ایڈیٹر ماہنامہ 'پارسا' کے نام منشایاد کے ایک دل چسپ خط کا اقتباس)

ظاہر ہوگی اور...''

''بس بس۔ مجھے ایسی اصطلاحات سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایسا سادہ لوح نہیں ہوں کہ سزاؤں کی غیر منطقی باتوں پر بے تامل یقین کرلوں اور خوف سے کانپنے لگوں۔ میں خدا کو ایسی قہار اور انتقام لینے والی ہستی تصور نہیں کرتا۔ اُسے سب سے بڑا تخلیق کار اور حیات و کائنات کی مادر اعظم سمجھتا ہوں۔ جو اپنی مخلوق کے لئے شفیق، مہربان اور سراپا رحمت ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک بڑی عظیم المرتبت عارفہ رابعہ بصری نے جنت کو جلانے اور جہنم کی آگ کو سرد کرنے کی بات کی تھی تا کہ انسان جنت کے لالچ اور دوزخ کی آگ کے خوف سے بالاتر ہو کر خدا سے محبت کرے۔''

منکر یوں زیر لب مسکرایا جیسے کبھی آمریت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے شیر صفت سیاست دان کو دیکھ کر انصاف و احتساب کی کرسی پر براجمان قد آدم چوبا مسکرایا ہو گا یا جیسے تباہی کے سکندر اعظم نے تیل کے پورس کی گرفتاری کی تصویر دیکھ کر تبسم فرمایا ہو گا۔ اس نے بغل سے مہاجنوں کی بہی جیسی کتاب نکالی اور اس میں دیکھ کر بولا:

''یہ ہے تمھارا نامہ اعمال۔ تمھارا سارا کچا چٹھا اس میں درج ہے۔ تمھاری زندگی کی ہر حرکت، تمھارے بچپن سے لے کر یہاں آنے کے لمحہ تک ہر چھوٹی بڑی نیکی اور گناہ کا احوال۔''

''اگر میں اسے ماننے سے انکار کردوں تو؟''

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔'' نکیر نے جواب دیا۔

''جب سارے فیصلے پہلے سے کر لئے گئے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی تو مجھے پریشان کیوں کرتے ہو۔ جاؤ جو کرنا ہے کرو۔ میں بہت تھکا اور جاگا ہوا ہوں۔ مجھے سونے دو۔ قیامت کے روز اٹھوں گا تو دیکھا جائے گا۔''

''حساب کتاب تو تمھیں دینا ہی ہوگا۔''

''کس چیز کا؟''

''دنیا میں تم نے جو کچھ کیا ہے اس کا۔''

''دنیا کو چھوڑو۔ وہ پیچھے رہ گئی ہے۔ گزری باتوں کو جانے دو۔''

''یہ ممکن نہیں ہے ہم ایک ایک بات کا حساب لیں گے۔''

''جب تمھیں انسانی زندگی کا تجربہ ہی نہیں۔ تم نے بھوک دیکھی ہے نہ بیماری۔ تمھیں کبھی دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے نہ کسی سے محبت کی ہے تو تمھیں ان انسانی ضرورتوں، مجبوریوں، جذبوں اور احساسات کا کیسے اندازہ ہو سکتا ہے۔ تم عرش پر رہنے والے بے حس اور جذبات سے عاری، خیر ہی خیر نوری کیا جانو انسانی زندگی کتنا بڑا امتحان ہوتی ہے؟''

''ہمیں یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں''

منکر غصے سے بولا مگر وہ اپنی ہی رو میں کہتا رہا۔

''قدم قدم پر ضرورتوں کی دلدلیں، مجبوریوں کے الاؤ، محرومیوں کے خارزار، ناکامیوں کے جہنم، رشتہ داروں کے ہمہ وقت تپتے حسد کے تنور، دوستوں کی در پردہ رقابتوں کے گھپے وار اور زور آوروں کی ناانصافیاں اور مقتدر لوگوں کی چیرہ دستیاں۔ تم کیا جانو ان مصائب سے نکلنے کے لئے انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ پھر طرح طرح کی ترغیبات۔ مال و دولت، سونا چاندی، زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے والی سہولتیں اور طرح طرح کا سامان تعیش اور حسین و جمیل صورتیں۔''

''یہی تو تمھارا جرم ہے کہ تم ان مادی چیزوں کے لالچ میں پڑ گئے۔''

''اگر خدا نہیں چاہتا تھا کہ ہم ان مادی چیزوں کے لالچ میں پڑیں تو اس نے یہ سب کیوں بنایا؟ کیوں کم زور انسان کو گم راہی کی راہ پر چلنے کے اسباب پیدا کئے؟''

''تا کہ برے اور صالح لوگوں کی پہچان ہو سکے۔''

''لیکن خدا تو اپنی بنائی ہوئی ہر اچھی بری چیز سے محبت کرتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو برے اور گناہ گار لوگوں کو پیدا نہ کرتا۔''

''تم حجتیں بہت کرتے ہو۔''

''اس لئے کہ جس زندگی کا تم امتحان لے رہے ہو میرا اس زندگی کا تجربہ اور معلومات تم لوگوں سے زیادہ ہیں۔ تم نے دنیا کو دور سے دیکھا ہے جب کہ میں نے اس میں زندگی کے بہت سے برس گزارے ہیں۔''

پھر ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اشارے کرنے لگے۔

اچانک زلزلے کی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ایک شدید جھٹکے کے ساتھ زمین شق ہوگئی اور دونوں اطراف کی دیواریں ستر ستر قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ ابھی اس کی حیرت دور نہ ہوئی تھی کہ پیچھے ہٹ جانے والی دونوں دیواریں نہایت تیزی سے آئیں اور اسے بھینچ ڈالا۔ یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں پیوست ہوگئیں۔

درد کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ تب اسے انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''ہوش آ رہا ہے۔''

''آپریشن کامیاب ہو گیا۔''

''اللہ کا شکر ہے۔''

OO

آپ بیتی

منشا کی یادیں

زیرِ تصنیف خودنوشت 'یادیں' کا ایک حصہ

ماں جی کے چلے جانے کے بعد گھر کا نظام الٹ پلٹ ہوگیا۔ پھوپی سمیت سبھی قریبی رشتہ داروں نے منہ پھیر لیے۔ ان کا مشورہ اور خواہش تھی کہ میری شادی یا منگنی کر دی جائے یا کم از کم رشتہ ہی طے کر دیا جائے تا کہ وہ ہماری اور گھر کی دیکھ بھال کر سکیں مگر میں رضامند نہ ہوا۔ مجھے خالہ کی حمایت بھی حاصل تھی جو ماں جی کی خواہش کے مطابق میری تعلیم کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں چاہتی تھیں۔ اس کی پاداش میں ددھیالی رشتہ داروں نے ہم سے بالکل ہی کنارہ کشی کر لی۔ پھوپی نے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہماری مدد کرنا چھوڑ دیا۔ کچھ لوگوں نے ابا کو دوسری شادی کا مشورہ دیا مگر وہ ماں جی کی وصیت کہ میرے معصوم چوزوں میں کوئی بلی نہ لے آنا پر قائم تھے مگر اب کسی بلی کا آنا ناگزیر ہوتا جا رہا تھا۔ بہن زہرہ فاطمہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس سے چولھے میں ٹھیک سے آگ بھی نہ جلائی جاتی۔ روٹی تو تنور سے لگ کر آ جاتی مگر اصل مسئلہ ہانڈی پکانے اور کپڑے دھونے کا تھا۔ ابا ان مردوں میں سے نہیں تھے جو ضرورت کے وقت کھانا وغیرہ پکا لیتے ہوں۔ وہ دودھ لسی کے ساتھ روٹی کھا سکتے تھے اور بھوکے رہ سکتے تھے مگر بچوں کو تو کھانے اور سالن کی ضرورت ہوتی۔ میں گھر میں ہوتا تو کچھ مدد کر دیتا ورنہ زہرہ وہی کچھ پکانے کی کوشش کرتی جو پھوپھی پکا رہی ہوتیں۔ دونوں چولھے قریب قریب تھے۔ وہ انہیں دیکھتی جاتی۔ وہ مرچ مصالحہ ڈالتیں تو یہ بھی ڈال دیتی۔ وہ پانی ڈالتیں تو یہ بھی پانی ڈال دیتی۔ جب وہ ہانڈی نیچے اتارتیں تو یہ بھی اتار کر رکھ دیتی۔ اس کے باوجود اس کا پکایا ہوا سالن وہ خود ہی کھا سکتی۔ حیرت ہے کہ پھوپی سب دیکھتیں مگر کسی طرح کی مدد نہ کرتیں۔ بلکہ بات بھی نہ کرتیں۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ آپس میں رشتے کر لیں مگر یہ ہمیں منظور نہ تھا۔ انہیں موقع مل جاتا تو وہ زہرہ کو ڈانٹ پھٹکار بھی کر لیتیں۔ پھر بھی ان کی تسلی نہ ہوتی تو طعنے دینے لگتیں تمہاری ماں ایسی تھی، ویسی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ کہ پھوپی میرے چھوٹے بھائی مشتاق سے بہت پیار کرتی تھیں۔ وہ اسے کھانا بھی کھلا دیتیں اور اس کا خاص خیال رکھتیں۔ لیکن پہلے ماں جی سے اور اب بہن سے ان کا برتاؤ اچھا نہ تھا۔ ظاہر ہے، بہن سوائے رونے کے کیا کر سکتی تھی۔ ان حالات کو دیکھ کر خالہ نے فیصلہ کیا کہ ابا کی دوسری شادی کر دی جائے۔ ابا مان گئے بلکہ چوزوں میں ایک بلی بھی لے آئے یا وہ خود ہی کہیں سے آ گئی۔

میں ساتویں میں تھا اور مجھے اسکول سے گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ وہ دور پار کی ایک رشتہ دار بیوہ تھی۔ وہ پھوپی کو ملنے کے بہانے گھر میں آئی اور گھر والی بن بیٹھی۔ ابا بھی اس پر مہربان ہو گئے۔ شکل وصورت کی اچھی تھی مگر مجھے بالکل اچھی نہ لگتی اور میں اس سے بدتمیزی سے پیش آتا۔ اس پر مجھے ابا سے ڈانٹ بھی پڑی مگر وہ میری ماں جی کی چیزوں کو ہاتھ لگائے اور ان کی جگہ لے، یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ ابا اس سے نکاح کا پروگرام بنا رہے تھے مگر وہ پریشان تھی کہ بڑا لڑکا اسے ناپسند کرتا ہے، کیا ہوگا؟ پھوپی کو بھی وہ عورت پسند نہیں تھی اور انہیں موقع مل رہا تھا کہ وہ باپ اور بیٹے کے درمیان اختلاف سے فائدہ اٹھائیں۔ ظاہر ہے مجھے ماموں، چچا اور تایا کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی۔ ابا نے صورتِ حال کو بھانپتے ہوئے مجھے الگ بٹھا کر سمجھانے اور اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ کہنے لگے۔

''مجھے شادی کرنے کا کوئی شوق نہیں اور نہ ہی میرا ارادہ تھا مگر مجبوری ہے۔ تم دیکھ رہے ہو سب رشتہ داروں نے اپنی بات منوانے کے لئے ہمارا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ عورت کے بغیر گھر نہیں چل سکتا۔ خصوصاً لڑکی کو دیکھ بھال اور نگرانی کی زیادہ ضرورت ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگے ''سب کچھ تمہارے سامنے ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہوگیا ہے کہ یا تو تمہارا رشتہ طے کر دیا جائے یا پھر مجھے شادی کرنا ہوگی۔''

''رشتہ طے ہوگیا تو جلد یا بدیر شادی بھی کرنا پڑے گی اور میں شادی

نہیں کرنا چاہتا، ابھی پڑھنا چاہتا ہوں۔ آپ شادی کرلیں لیکن اس عورت سے نہیں۔" میں نے کہا

"وہ بے چاری بیوہ ہے۔ وہ تم سب کی خدمت کرے گی۔ اس سے اولاد ہونے کا بھی امکان نہیں ہے کیوں کہ اسے طلاق ہی اسی لئے ہوئی تھی کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔"

"وہ مجھے زہر لگتی ہے۔ اگر آپ نے اس سے نکاح کرلیا تو میں اسے مارڈالوں گا۔"

وہ کچھ دیر غصے سے مجھے گھورتے رہے۔ میں اندر ہی اندر تھپڑ کا انتظار کررہا تھا مگر وہ خلاف توقع اچانک نرم پڑ گئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے:

"تم فکر نہ کرو۔ میں وہی کروں گا جیسے تم چاہو گے۔ میں اپنے بچوں کو مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا۔"

انہوں نے اسی روز مہمان خاتون کو رخصت کردیا۔

میرے نانا جان نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ ہماری نانی کے فوت ہوجانے کے بعد انہیں بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دوسری نانی سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جو ابھی غیر شادی شدہ تھیں۔ بڑی مجھ سے تھوڑا بڑی تھی اور اس کا رشتہ ہوچکا تھا مگر منجھلی تقریباً میری ہم عمر تھی اور میں اسے نام سے پکارتا تھا۔ خالہ عائشہ نے دو ایک بار مجھ سے ذکر کیا تھا کہ اگر تمہارے نانا جی مان جائیں تو منجھلی خالہ تمہاری امی کی جگہ آسکتی ہے۔ یہ تجویز مجھے بہتر محسوس ہوئی تھی مگر ابا اور منجھلی خالہ کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ وہ چالیس سے زیادہ کے تھے اور وہ چودہ پندرہ برس کی تھیں۔

"میں خالہ عائشہ سے بات کروں گا۔" میں نے ابا سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ابا نے کہا "پہلے والدین بچوں کا رشتہ پسند کرتے تھے اب تم اپنے باپ کا رشتہ تلاش کرو۔"

اگلے روز میں خالہ کے ہاں چلا گیا انہیں ساری بات بتائی۔ وہ مہمان عورت کے ساتھ میری بدتمیزیوں کی باتیں سن کر اور اسے گھر سے نکالنے کا میرا کارنامہ سن کر بہت خوش ہوئیں اور دیر تک ہنستی رہیں۔ پھر ایک روز مجھے ساتھ لے کر نانا جی کے پاس چلی گئیں۔ ساری برادری میں ہمارا ساتھ خالہ عائشہ اور نانا جی ہی دے رہے تھے۔ خالہ نے میری موجودگی میں ان سے بات کی۔ انہوں نے عذر پیش کیا کہ عمروں میں بہت فرق ہے مگر جب خالہ نے وکالت کرتے ہوئے ہماری حالت زار کا احوال بیان کیا تو نانا جی رونے لگے اور مجھے گلے سے لگا کر پیار کیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے عائشہ۔ میں اپنی مرحومہ بیٹی کی اولاد کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

نانی اور ماموں جان نے کوئی دخل نہ دیا مگر ممانی نے مخالفت کی۔ دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی روکا مگر نانا جی اپنی بات پر قائم رہے۔ وہ بہت نیک دل اور دردمند انسان تھے اور سب سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس کے بعد نکاح کی تیاری ہونے لگی۔ میں نے خالہ کے ساتھ شہر جاکر شادی کی شاپنگ کی اور اپنی ہونے والی ماں کے کپڑے وغیرہ خرید کر دے گیا کیوں کہ میری چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں۔ پھر نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ میں اس ہفتے دانستہ اپنے گاؤں نہیں آیا۔ ابا چند آدمیوں کے ساتھ اپنی سسرال گئے اور نہایت سادگی کے ساتھ نکاح ہوگیا اور وہ چھوٹی خالہ کو گھوڑی پر بٹھا کر لے آئے۔ یہ خاص طور پر گھوڑی کا ذکر میں نے اس لئے بھی کیا ہے کہ واپسی پر پانی سے بھرے ہوئے ایک بڑے کھالے کو پھلانگتے ہوئے گھوڑی کا پاؤں پھسل گیا اور دولہا دلہن پانی میں گر گئے تھے۔ اس بدشگونی نے کچھ عرصہ ہمیں پریشان بھی رکھا مگر ابا ایسی باتوں کو نہیں مانتے تھے۔

دوسری والدہ کے گھر آجانے کے ایک ہفتہ بعد میں گاؤں آیا۔ میرے عجیب وغریب جذبات تھے۔ اپنی ماں جی کی جگہ کسی دوسری عورت کو دیکھنا، چاہے وہ خالہ ہی تھی، میرے لئے آسان نہیں تھا۔ میں بائیسکل پر بیس بائیس میل کا طویل اور تھکا دینے والا سفر کرکے گاؤں پہنچا تو دروازے پر جاکر رک گیا۔ اندر داخل ہونے کے لئے میرے قدم نہیں اٹھ رہے تھے۔ کہاں میں زور زور سے بائیسکل کی گھنٹی بجا کر اعلان کیا کرتا: "ماں جی میں آگیا۔"

اور وہ جلدی سے دروازے کی طرف لپکتیں اور اسے یوں چوپٹ کھول دیتیں جیسے مجھے بائیسکل چلاتے ہوئے ہی اندر داخل ہونا ہو۔ مجھے دیکھ کر ان کے منھ سے نکلتا "بسم اللہ۔" بعض اوقات مجھے گھنٹی بجانے کی ضرورت نہ پڑتی، وہ چھت پر چڑھ کر مجھے دور سے آتے ہوئے دیکھ چکی ہوتیں اور دروازہ کھول کر انتظار میں کھڑی ہوتیں۔ اور کہاں آج میں دروازے پر رکا کھڑا تھا اور بائیسکل کی گھنٹی بجانے یا دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ ہورہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا اندر کیسے جاؤں؟ چھوٹی خالہ اور ابا کا سامنا کیسے کروں؟ خالہ کو کس رشتے سے پکاروں؟

مجھے یاد ہے میں نے اندر جاکر بائیسکل دیوار کے ساتھ کھڑی کردی تھی اور ابا کی طرف پیٹھ کرکے چپ چاپ بیٹھ گیا تھا۔ میں نے سلام کیا نہ انہوں نے خیریت پوچھی۔ ہم کچھ دیر یوں ہی ایک دوسرے سے شرمندہ شرمندہ اور روٹھے روٹھے سے پاس پاس بیٹھے رہے۔ پھر اچانک چھوٹی خالہ جو اب نئی امی تھیں، شادی کے کپڑوں میں ملبوس پانی کا گلاس لے کر آگئیں اور میرے سامنے آکر اجنبیوں کی طرح چپ چاپ کھڑی ہوگئیں۔ ایک

دوسرے سے شرمندہ شرمندہ انسانوں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔ میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر پانی کا گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ چپ چاپ اندر چلی گئیں۔ میرے اندر کوئی ہچکیاں لے کر رونے لگا اور اس گلاس کا سارا پانی آنسو بن کر میری آنکھوں سے ٹپک گیا۔ حکیم صاحب یوں خاموش دیکھتے رہے جیسے یہ رونا میرے لئے بہت ضروری اور علاج کا حصہ ہو۔ میں اس رونے سے جاں بر ہوا تو ان کی آواز سنائی دی:

''کب چلے تھے؟''

''ظہر کے بعد۔''

''ہوا مخالف تھی؟''

''جی۔''

''کھانا کھایا تھا؟''

''نہیں۔''

''منہ ہاتھ دھو کر کھالو۔''

میں نے منہ ہاتھ دھوئے اور زہرہ اور مشتاق سے باتیں کرنے لگا۔ خالہ کھانے کی ٹرے لے آئیں۔ انہوں نے میرے لئے خاص اہتمام کیا تھا۔ میری پسندیدہ سویٹ ڈش بھی بنائی تھی۔ وہ کھانا رکھ کر چلی گئیں۔ میں نے کھانا کھالیا۔ تو ان کے لئے لایا ہوا کوئی چھوٹا موٹا گفٹ انہیں دیا۔ وہ شکریہ کہہ کر گھر کے کام میں لگ گئیں۔ میرے اندر مستقبل کا ادیب آنکھیں ملنے لگا۔ اچانک خیال آیا۔ اپنے سے تگنی عمر کے مرد سے شادی ہو جانے پر نہ جانے اس بے چاری لڑکی کے کیا جذبات ہوں گے جس کی ابھی گڑیوں سے کھیلنے کی عمر تھی۔ مگر اللہ نے عورت کو صبر و شکر کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ وہ ہم مردوں کی طرح بزدل نہیں ہوتیں۔ بہت کچھ چپ چاپ سہہ جاتی ہیں۔ ماں باپ کنویں میں کودنے کو کہیں تو بھی چپ چاپ کود جاتی ہیں۔ بابل کے باڑے کی گیاں، ماں باپ نے جس کے ہاتھ رسی تھما دی سر نہوڑا کر اسی کے ساتھ چل دیں۔ مجھے ایک دم چھوٹی خالہ یا نئی امی سے بہت سی ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

''کھانا بہت اچھا ہے۔'' وہ رو پڑیں۔ پتہ نہیں دکھ سے یا خوشی سے۔

انہیں میرا بھائی اور بہن خالہ کہتے ہیں مگر میں انہیں اب بھی ان کے نام ہی سے بلاتا ہوں۔ اللہ نے ان کو دو بیٹے اور تین بیٹیاں دیں۔ بہنیں میرے ہی گھر میں پل کر بڑی ہوئیں۔ میرے راولپنڈی اور اسلام آباد میں سیٹل ہوتے ہوتے زہرہ کی اسکول داخل ہونے کی عمر بیت چکی تھی۔ لیکن باقی بہنوں کو میں اپنے پاس لے آیا اور داخل کرادیا۔ ان کی شادیاں کیں اور انہیں بیٹیوں کی طرح رخصت کیا۔

ماں جی کے چلے جانے کے بعد میں بہت حساس ہوگیا اور بالکل ہی کتابی کیڑا بن گیا۔ آٹھویں نویں تک میں نے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پیسہ سیریز کی ایک ایک کتاب۔ جنوں کی کہانیاں، پریوں کی کہانیاں، ماہی گیروں کی کہانیاں، بادشاہوں کی کہانیاں، چوروں کی کہانیاں وغیرہ۔ بلکہ بچوں کا پورا میٹر ادب۔ دسویں سے پہلے بانگ درا، پریم چند، احمد ندیم قاسمی، منٹو، بیدی اور کرشن چندر کے افسانے، مرزا ادیب کے صحرا نورد کے خطوط۔ میاں ایم اسلم، رشید اختر ندوی، رئیس احمد جعفری اور نسیم حجازی کے متعدد ناول۔ سردیوں میں کورس کی کتابوں میں چھپا کر اور گرمیوں میں رات کو گھر والوں سے چھپ کر چاندنی کی روشنی میں کہانیوں اور نظموں کی پوری پوری کتاب ختم کر ڈالتا۔ اسی طرح میلے ٹھیلے، سرکس، تھیٹر اور فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ خالہ کے گاؤں میں ہم گھر کے سب لڑکے ونگن (حویلی) میں سوتے تھے وہیں اسکول کا کام کرتے تھے۔ وہاں ایک بزرگ بابا حیدر، ہماری نگرانی پر مامور تھے۔ مگر وہ بہت اچھے تھے۔ ہم ان سے فلم کی اجازت اور بعض اوقات پیسے بھی لے لیتے اور دیگر گھر والوں سے چوری چوری رات کو شہر جا کر فلم دیکھ آتے۔

میرا ہیڈ فون ریڈیو خالہ کے گاؤں میں کار آمد ثابت نہ ہوا۔ شائد لاہور ریڈیو اسٹیشن سے فاصلہ زیادہ تھا یا گاؤں کے قریب سے گزرنے والی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لگی ٹیلی فون اور ٹیلی گراف تاروں کی انٹرپشن اس کی وجہ تھی۔ گھر میں ایک گراموفون موجود تھا اس پر رات کو دروازے بند کر کے وہی سنے ہوئے ریکارڈ بار بار سنتے رہتے اور خود بھی ساتھ ساتھ گاتے گنگناتے۔ البتہ گرمی کی چھٹیوں میں ہمیں بیٹری پر چلنے والا کرائے کا ریڈیو لانے اور سننے کی اجازت مل جاتی۔ ان سب چیزوں نے میرے اندر ادب اور شعر و نغمہ سے دلچسپی اور ذوق پیدا کیا۔

سہگل کا زمانہ بیت چکا تھا مگر اس کے گیتوں کی بازگشت ابھی تک فضاؤں میں تھی۔ اس دور میں امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی انبالے والی، شمشاد بیگم، سی ایچ آتما، طلعت محمود، پنکج ملک، ثریا، محمد رفیع اور نور جہاں کے گانے بے حد مقبول تھے۔ اور میری پسندیدہ گلوکارہ لتا منگیشکر کی آواز میں کچی کلیوں کی باس تھی۔ مگر ابھی اس نے طوفان نہ اٹھایا تھا۔ جگنو، دوپٹہ اور چن وے میں نور جہاں کے گائے ہوئے گیت سب کی زبان پر تھے۔ اداکاروں میں راج کپور اور نرگس کی جوڑی مشہور تھی مگر دلیپ کمار اور مدھوبالا کا کوئی ثانی نہ تھا۔ پنجابی فلموں میں انڈین لچھی، پوستی اور ونجارا اور پاکستانی چن وے، لارے اور پھیرے بہت مقبول تھیں۔ غالباً اسی زمانے میں ثریا اور بھارت بھوشن کی فلم مرزا غالب نہایت کامیاب اور مقبول ہوئی تھی۔ یہ سب میوزیکل

پریم چند کی روایت کا دیہات نگار

منشایاد نے پچاس کی دہائی کے آخر میں افسانہ لکھنے کا آغاز کیا اور عصر حاضر تک اس نے دوسو افسانے تحریر کئے ہیں۔ اپنے افسانوں میں منشایاد نے پنجاب کے دیہات کی ریت روایت، کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کی کہانی بیان کی ہے وہ ماحول اور ثقافت جو شہروں کی دلکشی کے پس منظر میں گم ہوتا جا رہا ہے منشایاد نے اس کی کہانیوں کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ پریم چند کی روایت کا ایک دیہات نگار ہے۔ البتہ اس کے دیہات پریم چند کے برعکس بیسویں اور اکیسویں صدی کے دیہات ہیں لیکن لگتا ہے کہ مسائل آج بھی وہی ہیں اور نچلی ذاتوں کو خواہ ہندو معاشرہ ہو یا مسلم، دیہات میں ایک جیسے مسائل کا سامنا ہے۔ وہ جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور ان کی زندگیاں زمیندار کے رحم و کرم پر ہیں۔

ڈاکٹر اسد فیض

کہانیوں میں گھرا ہوا آدمی

آدمی جتنا حساس ہو اور جتنا زیادہ سوچے اور محسوس کرے اتنی ہی زیادہ کہانیاں بنتی چلی جاتی ہیں۔ کسی انوکھے خیال یا معمول اور معقولیت سے ہٹی ہوئی کسی بات کی پونی میرے ہاتھ آتی ہے تو ذہن فوراً ہی کسی نئی کہانی کا سوت کاتنے لگتا ہے۔ ہر کہانی کار کی طرح میرے اندر بھی ایک جولاہی بیٹھی ہے جو دن رات مختلف خیالوں کے رنگا رنگ گچھل کھولتی، انہیں ایک دوسرے سے الگ کرتی اور گولے پنے بناتی رہتی ہے۔ میں ان گولوں پنوں سے اپنے فن کے چرخے پر نئی نئی کہانیاں اور ان کے لباس تیار کرتا ہوں۔ کبھی جب اندر کا موسم نامہربان ہو یا کھانے کمانے کے دنیاوی دھندوں سے زیادہ دن فرصت نہ ملے تو لکھنے والا کہانیوں سے انصاف نہیں کر پاتا اور ان میں گھر جاتا ہے۔ میں بھی کہانیوں میں گھرا ہوا آدمی ہوں۔ میرے چاروں طرف بے شمار کہانیاں ہیں اور ہر کہانی جلدی میں ہوتی ہے۔ اپنی باری کا انتظار بھی نہیں کرتی۔ وقت بے وقت ایک ہی پکار۔ وے بھائی کہانی والے، شتابی کر، مجھے پہلے لکھ۔ اب آدمی کو اور کام بھی ہوتے ہیں...

منشا یاد کی ایک تحریر

فلمیں تھیں۔ کچھی اور ونجارا پنجابی فلموں کے گیت لتا منگیشکر نے گائے تھے اور بہت ہٹ ہوئے تھے بلکہ آج تک پسند کئے جاتے ہیں۔ جیسے ”کالی کنگھی نال کالے وال پئی واہنیاں۔ ڈھول جانیاں۔“ اور ”تالے لمی تے نالے کالی ہائے وے چناں رات جدائیاں والی۔“ کچھی فلم کا گانا ”میرے لگدی کسے نہ ویکھی تے ٹُٹدی نوں جگ جان دا“ بھی بہت مشہور تھا۔ چن وے کے سوا باقی دونوں فلموں کے زیادہ تر گانے منور سلطانہ نے گائے تھے۔ ان کے لاہور ریڈیو سے گائے گئے لوک گیت بھی بہت مشہور تھے۔ عنایت حسین بھٹی کا ایک گیت ”بھاگاں والیو نام جپو مولا نام“ بھی اسٹریٹ سونگ کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں ہر ہفتے اپنے گاؤں تو آتا ہی تھا۔ وہاں سڑک سے ہری چند گاؤں کا ایک لڑکا گزرتا تھا جو اجنیا نوالہ مڈل سکول کی لائبریری سے اچھی اور نئی کتابیں چوری کر کے لاتا تھا۔ ان کتابوں کا پورے علاقے میں میرے سوا کوئی خریدار نہ تھا۔ علامہ اقبال کی بہت سی کتب اور دیوان غالب مع شرح کو میں نے اونے پونے خرید کر پہلی بار نویں دسویں کے زمانے میں پڑھا۔ اب یاد کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ بعض اشعار کے معنی میں نے اس زمانے میں کیا سمجھے تھے۔ لیکن اس کثرت مطالعہ کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اوائل عمر میں ہی دماغ طرح طرح کے خیالات اور سوچوں سے بھر گیا بلکہ چھلکنے لگا اور شعر و ادب سے مزید لگاؤ پیدا ہو گیا۔ متخیلہ متحرک اور شعر و نغمہ کا ذوق تو تھا ہی طبیعت میں موزونیت بھی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ والی بال اور فٹ بال بھی کھیلتا تھا مگر کھیل کود سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ تاش اور دوسری ان ڈور گیمز سے بھی کوئی خاص دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ ہر وقت پڑھتے یا لکھتے (یا بقول ابا کے کاغذ کالے کرتے) رہنا۔ میٹرک تک آتے آتے پتہ نہیں ابھی میں خود ذہنی طور پر بالغ ہوا تھا کہ نہیں مگر میں نے بالغوں کے لئے نظمیں، غزلیں اور کہانیاں لکھنا شروع

کردیں۔ اور انہیں رسالہ نقاد، قندیل، شمع، زیب النساء، حرم اور عکس نو جیسے مشہور رسالوں میں چھپوانا شروع کر دیا۔ اس وقت لکھنے کا ایک ہی مقصد تھا۔ اپنے ساتھیوں اور دوستوں میں مقبول، مختلف اور ممتاز نظر آنا اور رسالے میں اپنا چھپا ہوا نام دیکھ کر خوش ہونا۔ لیکن بعد میں کچھ دوسری حسیات ابھرنے لگیں جیسے احساس محبت و ہمدردی، احساس حسن و جمال اور معاشرتی ناانصافی اور طبقاتی ناہمواری کا احساس۔ اپنے اردگرد کی زندگی میں طرح طرح کے تضادات، مظالم اور مصائب دیکھ کر دکھی ہوتا۔ کہانی اب ایک آؤٹ لیٹ، ایک دریچہ بن گئی۔ جو بات منہ پر نہ کہی جا سکتی وہ میں اپنی کہانی میں کہہ لیتا۔ جس احتجاج کی کھلے عام اجازت نہ ہوتی وہ کہانی کے پردے میں کر لیا جاتا۔ جن جذبات کا اظہار کسی کے سامنے نہ کیا جا سکتا اسے کہانی سمیٹ لیتی۔ آہستہ آہستہ کہانی ایک ہمراز رفیق اور ہمدرد دوست بنتی چلی گئی۔ اس سے سارے دکھ سکھ کہہ لیتا۔ عمر اور فکر کی مزید پختگی کے ساتھ لکھنا ایک سماجی ذمہ داری اور فریضہ محسوس ہونے لگا اور اب کہانی لکھنا پڑھنا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے سانس لینا۔ میں نے اپنا بہت کچھ کہانی پر قربان کیا اور بہت کچھ اس میں منتقل کر دیا ہے۔ جیسے افسانے اپنا گھر، بحران، کاشی، ماں جی اور دیدۂ یعقوب وغیرہ۔

کسی انوکھے خیال یا معمول اور معقولیت سے ہٹی ہوئی کسی بات کی پونی میرے ہاتھ آتی تو ذہن فوراً ہی کسی نئی کہانی کا سوت کاتنے لگتا۔ ہر کہانی کار کی طرح میرے اندر بھی ایک جولاہی بیٹھی تھی جو دن رات مختلف خیالوں کی رنگارنگ گچھیاں کھولتی اور گولے بنے بناتی رہتی۔ میں ان گولوں بنوں سے اپنے فن کے چرخے پر نئی نئی کہانیاں اور ان کے لباس تیار کرتا۔ کبھی جب اندر کا موسم نامہربان ہو یا کھانے کمانے کے دنیاوی دھندوں سے کچھ روز فرصت نہ ملے تو لکھنے والا کہانیوں سے انصاف نہیں کر پاتا اور ان میں گھر جاتا ہے۔ میں بھی کہانیوں میں گھرا ہوا آدمی ہوں۔ میرے چاروں طرف بے شمار کہانیاں ہیں اور ہر کہانی جلدی میں ہوتی ہے۔ اپنی باری کا انتظار بھی نہیں کرتی۔ وقت بے وقت ایک ہی پکار۔ وے بھائی کہانی والے، شتابی کر، مجھے پہلے لکھ۔ اب آدمی کو اور کام بھی ہوتے ہیں اور اسے زندہ رہنے کے لئے کئی طرح کے جتن کرنا پڑتے ہیں۔

میٹرک کا امتحان دینے سے پہلے میری کہانیاں اور نظمیں بچوں کے رسالہ پندرہ روزہ ہدایت میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان دنوں اس کے ایڈیٹر سید نظر زیدی تھے۔ بعد میں الطاف پرواز ایڈیٹر ہو گئے۔ میں اس کے طرحی مشاعروں میں حصہ لیتا رہتا تھا۔ جو نام میرے حافظے میں اب تک موجود ہیں ان میں تمہید الاسلام، سرفراز شاہد، جمیل ہمدم (جمیل یوسف) چکوال، فضل الٰہی بہار، خالد بزمی لاہور، محمد جان انجم وزیر آباد، محمد اسحٰق بوریوالا اور آثم میرزا سیالکوٹ شامل ہیں اور طرحی مصرعے اس قسم کے ہوتے تھے:

آج بھولو کی پٹائی ہو گئی

چھٹیاں یوں گزارتے ہیں ہم

چھٹی کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

ماسٹر نے کس خطا پر اس قدر مارا مجھے

جو چند اشعار ذہن میں رہ گئے وہ بھی سن لیجئے:

چھٹی کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا
جیسے ہوا کا جھونکا ادھر سے ادھر گیا

پین چرانے کے لئے کہتا تھا سردارا مجھے
ماسٹر نے کس خطا پر اس قدر مارا مجھے

اسکول میں میری اس حوالے سے اچھی شناخت بن چکی تھی اور میں بزم ادب کے پروگراموں اور تقریروں پر چھوٹے موٹے انعامات حاصل کرتا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تھا تو سیکنڈ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں دسویں جماعت کی فیئرویل پارٹی کے لئے کوئی نظم لکھوں۔ میں نے علامہ اقبال کی پرندے کی فریاد کی تضمین کی اور ایک دلچسپ نظم پڑھی:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
گھر سے سکول جانا رستے سے بھاگ جانا
تاریخ میں تھے تھپڑ جغرافیہ میں جھڑکیں
انگلش کے پیریڈ میں سردرد کا بہانہ

اس نظم کو بے حد پسند کیا گیا اور ماسٹر صاحب نے مجھے پورا ایک روپیہ انعام دیا تھا۔

1955 میں جب میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا تو ایک افسانہ 'کنول' کے نام سے لکھا اور اپنے دور کے مقبول ترین رسالے شمع لاہور کو، جس میں اس دور کے بھی مشہور ادیبوں کے افسانے چھپتے تھے، بھیج دیا۔ جب دو چار ہفتے گذر گئے اور پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تو میں شاہ عالمی لاہور میں واقع شمع کے دفتر پہنچ گیا۔ ایڈیٹر کے کمرے کی چق اٹھائی تو ایک مولانا صبیحہ خانم کی بڑی سی تصویر سامنے رکھے دکھائی دیے۔ چپراسی مجھے روکنے لگا تو مولانا نے شائد میرے گرمی اور غصے سے تمتماتے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے منع کر دیا۔ میں نے افسانے کے بارے میں دریافت کیا تو جواب میں انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور میرے لئے ٹھنڈا پانی منگایا اور نہایت شفقت سے میرا نام اور افسانے کا عنوان پوچھا۔ پھر نائب مدیر عماد صدیقی کو بلوایا۔ رسالے کے

سرورق پر چھاپنے کے لئے تصویر ان کے حوالے کی اور میرے افسانے کی تلاش کا حکم دیا اور جب تک افسانہ ملتا انہوں نے میرے کوائف پوچھ لیے۔ میں نے بتایا کہ گھر والے مجھے انجینئرنگ کا ڈپلومہ کورس کرانا چاہتے ہیں تا کہ جلدی سے باروزگار ہو جاؤں مگر میں کالج میں پڑھنا اور ادب میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں۔ کسی ردی کی ٹوکری سے افسانہ مل گیا۔ انہوں نے پڑھا۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے ''تم نے خود لکھا ہے؟''

میں بھڑک اٹھا'' کیوں میں خود نہیں لکھ سکتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں نے چوری کیا ہے؟''

کہنے لگے ''اس میں کرداروں کے نام ہندو کیوں ہیں؟''

میں نے جواب دیا ''اس میں ایک بیوی شوہر کے لئے جس قسم کی قربانی دیتی ہے۔وہ ایک پتی ورتا یا ستی ہو جانے والی ہندو عورت ہی دے سکتی ہے کہ اسے ہی یہ سکھایا گیا ہے۔دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ کوئی مولوی اعتراض نہ کر دے۔''

مولوی کی بات سن کر وہ مسکرائے تو مجھے خیال آیا وہ خود بھی تو مولوی ہیں۔مگر بات زبان سے نکل چکی تھی۔انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا اور اصرار کر کے کھلایا۔حالانکہ لاہور میں میری دو خالائیں تھیں اور میرا ارادہ بڑی خالہ کے گھر جا کر کھانے کا تھا۔ کہنے لگے افسانہ ضرور چھپے گا مگر تم افسانوں کی بجائے ابھی اپنے کیریئر کی طرف توجہ دو۔ کالج کی بجائے ٹیکنیکل تعلیم تمہارے لئے بہتر رہے گی۔ورنہ مجھے دیکھو اتنی لمبی ڈاڑھی اور اداکاراؤں کی تصاویر۔باروزگار ہو جاؤ تو بی اے، ایم اے بھی کر لینا۔رہی افسانہ نگاری تو اس کے لئے عمر پڑی ہے۔وعدہ کرو انجینئرنگ اسکول میں داخل ہونے کے بعد مجھے خط لکھ کر اطلاع دو گے۔ مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔

میں نے وعدہ کر لیا تو وہ کہنے لگے۔آج تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے شرقپور کا محمد امین پھر سے جوان ہو گیا ہے۔میں بھی کبھی اسی طرح اعتماد، غصے اور جوش سے بھرا، ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا گاؤں سے لاہور کے ایک دفتر میں آیا تھا۔ مجھے بھی کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔یہ شمع، بانو، کھلونا اور مکتبہ شمع کے مالک و مدیر مولانا محمد امین شرقپوری تھے۔ان کے افسانوں کی ایک کتاب بھی چھپ چکی تھی۔وہ میرے مشفق اور محسن تھے۔ان سے بعد میں بھی رابطہ رہا۔جب میں نے بڑے ادبی پرچوں میں چھپنا شروع کر دیا اور شمع کو بھول گیا تو انہوں نے ایک انعامی سلسلے میں مجھے انعام دلوانے کے لئے تلاش کروایا اور تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد میرے دو افسانوں 'شب فراق' اور 'صبح نو' پر انعامات دیے۔

گورنمنٹ اسکول آف انجینئرنگ (جی ایس ای) کے داخلہ فارم اور پراسپکٹس لاہور سے ملتے تھے۔میٹرک کا پروویژنل اور مضامین کا تفصیلی نمبروں کا سرٹیفکیٹ بھی وہیں سے لینا تھا۔البتہ میڈیکل سرٹیفکیٹ شیخوپورہ کے سول ہسپتال سے حاصل کرنا تھا۔ ابا صاحب نے سارے اخراجات اور کرایہ وغیرہ کا حساب کر کے مجھے پیسے دیئے۔اب مجھے یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ انہوں نے کتنے پیسے دیئے تھے لیکن وہ جتنے بھی دیتے انہیں آگے جا کر کم پڑ جانا تھا کہ میں لاہور میں اس خالہ کے ہاں جا رہا تھا جس کی بیٹیوں میں سے ایک کا مستقبل میں مجھے عمر بھر کا خرچہ اٹھانا تھا۔یوں بھی ابا کے پاس پیسے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ابا کے پاس کیا اس زمانے میں لوگوں کے پاس نقدی ہوتی ہی کہاں تھی۔ہم کریانے کی دکان سے روزمرہ کی چیزیں نقد پیسوں سے نہیں غلہ دے کر خریدتے تھے۔میرے ہوش سنبھالنے تک دمڑی، پائی، دھیلا اور کوڑی کا زمانہ بیت چکا تھا اور ہم نے بزرگوں سے ان سکوں کے صرف نام ہی سنے تھے۔اب نیا عہد تھا اور اس کا بنیادی سکہ چاندی کا روپیہ تھا۔جس میں دو اٹھنیاں، چار چونیاں، سولہ اکنیاں (آنے)، بتیس ٹکے (یا ادھنیاں) اور چونسٹھ پیسے ہوتے تھے اور یہ سارے سکے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق قوت خرید رکھتے تھے مگر اب ان میں سے زیادہ تر سکے صرف محاوروں اور ضرب الامثال میں باقی ہیں۔ جیسے دو ٹکے کا آدمی۔ چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔ پائی پائی ادا کرنا۔کوڑیوں کے بھاؤ۔ سولہ آنے سچ۔ پیسے پیسے کا محتاج۔ پلے نہیں دھیلا کردی میلہ میلہ۔ ہاں ایک پنجابی فلم کا گانا بھی مشہور تھا:

اٹھاں پیسیاں دی یار جی دوانی ہندی اے
جہڑی روٹیاں پکائے اوہ زنانی ہندی اے
جہڑی ماں دی ہووے ماں اوہ نانی ہندی اے

ہم اٹھنی اور روپے میں بیساکھی یا میاں علی محمد کا میلہ دیکھ آتے تھے۔
آپ نے 'اک پیسہ' کا پرانا لوک گیت تو سنا ہوگا:

''اک پیسہ۔ساویاں بوتلاں، پیلیاں بوتلاں، میریاں چوڑیاں ،کاکے دا چھنکنا ،لے کے گڈی چڑھ آویں وے۔دھیلا موڑ لیاویں وے۔اک پیسہ''

اس زمانے میں محمد رفیع کا ایک گانا بھی بہت مشہور تھا جسے انہوں نے بڑے لجاجت بھرے لہجے میں گایا تھا'' اک پیسہ دے دے۔او جانے والے بابو'' مگر اب 2005 تک آتے آتے اسقدر ڈیویلیوایشن ہو چکی ہے کہ بھکاری روپیہ دو روپیہ کی بھیک بھی قبول نہیں کرتے۔انہیں سکہ دیں تو غور سے دیکھتے ہیں کہ روپے دو روپے کا ہے یا پانچ کا؟ اگرچہ سکے کے علاوہ ابھی پانچ روپے کا نوٹ بھی موجود ہے مگر جیسے نوجوان بیٹا آہستہ آہستہ اپنے بوڑھے باپ کی جگہ

لے لیتا ہے یہ سکہ coin بھی جلد ہی نوٹ کو replace کر دے گا۔لیکن جب بازار حیات میں باپ ہی کی کوئی وقعت نہ رہے تو بیٹے کو کون پوچھتا ہے ۔حالانکہ ایک طویل عرصے تک سب سے زیادہ چلنے والا اور مقبول ترین نوٹ پانچ روپے کا تھا۔ یوں سمجھ لیں جہاں جہاں اب سو روپے کا نوٹ استعمال ہوتا ہے وہاں پانچ کے نوٹ سے کام چل جاتا تھا۔اور یہ تو کل کی بات لگتی ہے کہ مزدور کو ایک دو روپے اور راج مستری کو دو تین روپے دیہاڑی ملتی تھی ۔غریب آدمی پانچ روپے کی خاطر پچاس کوس کا فاصلہ پیدل چل کر جاتا تھا۔ پانچ روپے کی ایک من گندم مل جاتی تھی اور لوگ کہتے تھے بہت مہنگائی ہو گئی ہے۔خود میرا کیریئر پانچ روپے کی خاطر داؤ پر لگ گیا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ان دنوں میرا ہم جماعت ماموں زاد بھائی محمد اسلم لاہور میں تھا۔

اس نے بھی نویں اور دسویں جماعت خالہ عائشہ (جو اس کی پھوپی لگتی تھیں) کے ہاں رہ کر میرے ساتھ ہی پاس کی تھی ۔ اس نے بچپن میں اپنی والدہ کی بیماری کے سبب چند روز اپنی نانی کا دودھ پیا تھا۔تب شائد ڈبے کے دودھ کا رواج نہیں تھا۔مگر نانی کا یہ دودھ اسے بہت مہنگا پڑا۔وہ اپنی ماں کا بیٹا رہا نہ نانی کا بیٹا بن سکا اور زندگی بھر رشتوں کے برزخ میں کلبلاتا اور کئی قسم کے کمپلیکسز میں مبتلا رہا۔وہ سگی اور رشتے کی درجن بھر خالاؤں کا ہی نہیں اپنی والدہ کا بھی ہم شیر (بھائی) بن گیا۔اس غیر فطری رشتے سے ہونے والے نقصان کا سلسلہ یہیں کہیں رک جاتا تو بھی خیر تھی مگر اس کی بدقسمتی کہ بیٹھے بٹھائے اس چلو بھر دودھ کی وجہ سے اس پر اپنی ساری خالہ زاد (کزنز) سے جو ڈیڑھ درجن سے زیادہ تھیں شادی بھی حرام ہو گئی اور وہ اس کی بھانجیاں بن گئیں۔ کسی شخص کی اس سے بڑھ کر محرومی اور اس کے ساتھ اس سے بڑی ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت ، پڑھی لکھی اور سگھڑ کزن موجود ہو مگر وہ اسے ماموں سمجھتی اور پکارتی ہو۔

وہ ان دنوں اپنی آپا (جو دراصل خالہ تھی) کے ہاں لاہور میں رہ کر اپنے بہنوئی (خالو) حاجی عبدالغفور خاں کی نگرانی میں ملازمت کے لئے مختلف دفاتر میں درخواستیں دیتا اور انٹرویوز کی تیاری کرتا تھا۔مگر بہن کے گھر میں بھائی کی حیثیت کا تو آپ کو اندازہ ہی ہو گا۔اور جب بھائی بھی نام نہاد یعنی سگا نہ ہو تو؟ اس کا کمرہ گھر کے باہر تھا جو وہ بھینس کے ساتھ share کرتا تھا ۔لیکن ان دنوں گرمیاں تھیں اس لئے صرف چارا اندر تھا، بھینس اور کٹڑا باہر ہی بندھتے تھے اور پورا کمرہ اسی کے استعمال میں تھا۔میرے آنے سے دو تین روز کے لئے اس کمرے میں رونق ہو گئی ۔ (بعد میں بھینس والا یہ کمرہ میرے لئے مخصوص کر دیا گیا اور میں نے فرنشنگ کے بعد اس کا نام یادمحل رکھا اور اس عنوان سے ایک افسانچہ بھی لکھا) میں اسے اپنی کہانیوں کے پلاٹ اور نظمیں سناتا اور وہ درخواستوں کے مضمون ۔اس نے اب اور بھی شدت اور باقاعدگی ۔ سے نمازیں پڑھنا اور دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ اپنی نوکری کے علاوہ اس من پسند لڑکی سے شادی کی ،جس کے والدین سے ان دنوں رشتے کی بات چل رہی تھی۔

خالو صاحب کم گو تھے ۔وہ ہم دونوں کے ساتھ اور بھی ریزرو رہتے یوں بھی ہماری اور ان کی عمروں میں بہت فرق تھا۔ہم ان کے پاس خاموش بیٹھے رہتے اور وہ ہماری بجائے اپنے حقے کی طرف متوجہ رہتے جو ان کے ہر کش کا بڑبڑا کر جواب دیتا۔ میں خالہ کے ہاں پہلے بھی دو چار بار آ چکا تھا اور وہ اسی طرح لئے دیئے رہتے تھے۔انہیں محمد اسلم کو تو جعلی یا نام نہاد سالا ہی سہی ،مجبوراً گھاس ڈالنا پڑتی تھی مگر میری انہیں کیا مجبوری ہو سکتی تھی ۔ میں تو بس ایک دور پار کا معمولی رشتہ دار لڑکا تھا اور اس قسم کے لڑکے دیہات سے ان کے گھر میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ ممکن ہے انہیں اس بات کا بھی ڈر ہو کہ کہیں محمد اسلم کے ساتھ میں بھی وہیں ڈیرہ نہ ڈال دوں۔ خالہ نے بھی حسب معمول کچھ زیادہ توجہ نہ دی۔ لیکن جب خالو جان کو میرے آنے کی اصل وجہ معلوم ہوئی کہ میں انجینئرنگ اسکول میں داخلہ لینا چاہتا ہوں اور میں نے محمد اسلم کی اردو اور فارسی مضامین کے ساتھ سیکنڈ ڈویژن کے مقابلے میں ڈرائنگ اور سائنس کے ساتھ اول درجے میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ہے تو وہ تھوڑے چونکے اور مجھے پنجاب پرنٹنگ پریس کا نقشہ کاغذ پر بنا کر دیا اور اپنی بائیسکل بھی عنایت کی۔

میں پراسپکٹس اور داخلہ فارم لے کر لوٹا تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور پراسپکٹس پڑھ کر مجھے داخلے کا سارا طریقہ کار سمجھایا۔ اگلے روز میں ان کے بتائے ہوئے پتے پر پنجاب یونیورسٹی چلا گیا۔ وہاں ان دنوں ہمارے ایک عزیز لال خاں کھرل کام کرتے تھے۔ انہوں نے بھی میری طرح اپنے چھوٹے بھائی شبیر خاں کے ساتھ ٹھٹہ کلیاں کے اسی گھر میں رہ کر حافظ آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا ہوا تھا جہاں سے میں نے پاس کیا۔ وہاں گھر میں سب ان بھائیوں کو لال شبیر کے نام سے پکارتے تھے۔ 1955 میں جب میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو یہ انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کا پہلا امتحان تھا۔ اس سے پہلے میٹرک کا امتحان پنجاب یونی ورسٹی لیتی تھی (اور اس سے بھی پہلے کلکتہ یونی ورسٹی) بھائی لال خاں نے پروویژنل اور تفصیلی نمبروں کے سرٹیفکیٹس وغیرہ لینے میں میری مدد کی اور یہ سن کر کہ میں ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں، بہت خوش ہوئے اور میری حوصلہ افزائی کی۔

خالو جان ملٹری اکاؤنٹس سے ڈی سی ایم اے کے عہدے سے ریٹائر

ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف میرا درخواست فارم خود بھر دیا بلکہ میری اسناد کی نقلیں ٹائپ کر کے ان پر تصدیق کی مہریں بھی لگا دیں۔ اور آئندہ کی کسی ضرورت کے لئے کچھ فالتو نقلیں بھی بنا دیں۔ اس پر محمد اسلم نے دبے دبے لہجے میں شکایت کی۔ کہنے لگا میں اتنے دنوں سے انتظار میں ہوں کہ وہ میری اسناد کی نقلیں ٹائپ کر دیں مگر انہیں فرصت نہیں ملتی تھی۔ مگر تمہارا کام انہوں نے اتنی جلدی کر دیا ہے۔ میں نے کہا اس لئے کہ میں مہمان ہوں مگر تم گھر کے آدمی ہو اور یہیں رہتے ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ خالو صاحب کا رویہ میرے ساتھ بالکل ہی بدل گیا اور وہ مجھ سے کھل کر باتیں کرنے لگے۔ پھر انہوں نے مجھے ایک وکیل دوست کے نام رقعہ دیا جو ضلع کچہری شیخوپورہ میں کام کرتے تھے اور ڈومیسائل کے حصول میں مدد کر سکتے تھے۔

خالہ کی بیٹیاں خوب صورت اور اچھی تھیں مگر وہ ابھی چھوٹی تھیں اور اپنی پڑھائی اور مشاغل میں مصروف رہتیں۔ مجھے بھی اپنے داخلے کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی مگر یہ بلوغت آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کے زمانے کی تھی جس میں عقل ذرا دیر سے آتی تھی۔

میں لاہور میں حلوہ پوری کا پر تکلف ناشتہ کر کے اور خالہ کی دعائیں لے کر، جو اب مہربان ہو گئی تھیں، ضلع کچہری شیخوپورہ پہنچا۔ خالو کے دوست وکیل صاحب رقعہ دیکھ کر بہت اچھی طرح ملے اور پورے دن کا کام تھوڑی دیر میں کروا دیا۔ کچہری کے کام سے فارغ ہو کر میں سیدھا سول ہسپتال پہنچا۔ مجھے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے اپنا میڈیکل چیک اپ کروا کر سرٹیفکیٹ لینا تھا۔ مجھے یاد ہے سولہ روپے فیس ادا کرنے کے بعد میرے پاس صرف پانچ روپے بچے تھے مگر یہ کم نہیں تھے۔ میں آسانی سے دوپہر کا کھانا کھا سکتا، بھائی بہنوں کے لئے پھل یا مٹھائی خرید سکتا اور بس اور تانگے کا کرایہ ادا کر کے گھر پہنچ سکتا تھا۔ لیکن گڑبڑ ہو گئی۔

ایم ایس کے ظاہری یا نظری معائنے میں نبض، دل کی دھڑکن، سانس اور چھاتی کا پھیلاؤ وغیرہ چیک کرنا شامل تھا لیکن جب اس نے بعض نازک اور ناپاک جگہوں کو ٹٹول کر مجھے کھانسنے کو کہا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی فیس اتنی زیادہ کیوں تھی۔ یہ سب انجینئرنگ اسکول کی requirements تھیں۔ وہاں ان دنوں بالکل فوجی طریقے سے تعلیم دی جاتی اور پریڈ کرائی جاتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے آنکھیں اور پیشاب ٹسٹ کروانے کے لئے پرچیاں دے کر متعلقہ شعبوں میں بھیج دیا۔ میں نظر کے ٹسٹ میں تو پاس ہو گیا مگر پیشاب ٹسٹ کرنے والے لیبارٹری ٹیکنیشن نے کہا

"تمہارے پیشاب میں شوگر ہے۔"

میں نے میٹرک پاس کیا ہوا تھا اور وہ بھی تازہ تازہ، شوگر کے معنی اچھی طرح معلوم تھے کہ شکر کو کہتے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا:

"جی ضرور ہو گی آج صبح میں نے حلوہ پوری کا ناشتہ کیا تھا اور مٹھائی بھی کھائی تھی۔"

اس نے کہا "خوش ہونے کی بات نہیں۔ پیشاب میں شوگر بیماری ہوتی ہے۔"

بے شک والد صاحب حکیم تھے اور گھر میں بیماریوں اور دواؤں کا ذکر رہتا تھا مگر میں نے اس بیماری کا نام کبھی نہ سنا تھا۔ پتہ نہیں ان دنوں کسی کو یہ بیماری لگتی نہیں تھی یا پھر کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ اور بے شک میں بالغوں کے رسالے کے لئے پہلا افسانہ لکھ چکا تھا لیکن اسکول کے اساتذہ کے علاوہ کسی سرکاری اہلکار سے مجھے براہ راست پہلی بار پالا پڑا تھا۔ جب لیبارٹری والے نے مجھے بتایا کہ پیشاب میں شوگر کی وجہ سے مجھے میڈیکل سرٹیفکیٹ نہیں مل سکتا تو میرا تو سر گھوم گیا۔ میں نے ان چند دنوں میں اتنے بہت سے پل، سڑکیں، اور عمارتیں بنا ڈالی تھیں اور نہروں اور دریاؤں کے معائنے کر چکا تھا کہ اب کسی دفتر میں کلرک یا ٹائپسٹ لگ کر بقول ابا کے لوہا کوٹنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن مایوسی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس لیبارٹری والے نے اُمید کا چھوٹا سا چراغ خود ہی روشن کر دیا۔ کہنے لگا:

"تم نے حلوہ پوری کا ناشتہ کیا اور مٹھائی بھی کھائی۔ اگر تم میرے لئے بھی مٹھائی کا بندوبست کر دو تو میں تمہیں پاس کر سکتا ہوں۔"

میں نے سوچا اس دھان پان سے آدمی کے لئے چار آٹھ آنے کی پاؤ بھر مٹھائی بہت ہو گی۔ میں نے کہا "میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ برفی لاؤں یا قلاقند؟"

"تم پیسے دے دو۔" اس نے میری سادگی یا بے وقوفی پر مسکرا کر کہا "میں مٹھائی خود ہی لے لوں گا۔"

میں نے پہلے ایک روپیہ، پھر دو، پھر تین روپے نکال کر دیئے مگر اس نے ہر بار نفی میں سر ہلایا۔ پھر مٹھی کھول کر ایک ہاتھ کی انگلیاں دکھائیں۔ میں نے ابھی مصلحت آمیز جھوٹ بولنا بھی نہ سیکھا تھا، گڑگڑا کر کہا: "سر میرے پاس کل پانچ روپے ہیں۔ دوپہر کا کھانا نہ بھی کھاؤں تو بھی مجھے تانگے اور بس کا کرایہ تو چاہئے۔ ورنہ میں اپنے گاؤں کیسے جاؤں گا؟"

اس بے درد نے کہا "ٹھیک ہے تمہاری مرضی۔"

میں نے پانچ روپوں کی وجہ سے اپنا مستقبل تاریک ہوتے دیکھا تو پوری رقم نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے مجھے ٹسٹ میں پاس کر دیا اور میں چٹ لے کر سول سرجن یعنی ایم ایس کے دفتر میں آ گیا۔ انہوں نے پوچھا "کسی نے پریشان تو نہیں کیا؟"

"جی نہیں۔" میں اور کیا جواب دیتا۔ (لیکن بعد میں جب میں نے ٹسٹ کروایا تو مجھے شوگر کی کوئی تکلیف نہیں تھی)

بہر حال اب میرے پاس تمام ضروری اسناد موجود تھیں۔ لیکن کھانے پینے کے لئے پیسے تھے نہ بس کا کرایہ۔ گاؤں کا اڈہ وہاں سے پندرہ میل دور تھا۔ میں ضلع کچہری چلا گیا۔ خیر سے میرے گاؤں بوہڑ باٹھ میں ڈاکو بہت تھے۔ (چور کوئی نہ تھا۔ وہ اسے حقیر لوگوں کا کام سمجھتے تھے) اور آپس کی دشمنیاں بھی بہت تھیں۔ گاؤں کے کسی نہ کسی آدمی کا کچہری میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ میں نے سوچا وہاں کوئی نہ کوئی ضرور مل جائے گا اور اس کے ساتھ گاؤں چلا جاؤں گا مگر میرے وہاں جاتے جاتے دفتروں کا وقت ختم ہو گیا۔ میں کچھ دیر ہمایوں اور اکبر بازاروں میں چکر لگاتا رہا پھر لاری اڈے پر آ کر کسی واقف کار کے انتظار میں کھڑا ہو گیا مگر مجھے کوئی جاننے والا نہ ملا۔ خالو کے وکیل دوست اتنے اچھے طریقے سے ملے تھے کہ ان کے پاس دوبارہ جاتے اور کرائے کے نام پر ادھار مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ میں نے ایک نواحی گاؤں 'قانون گو' جانے کا ارادہ کر لیا جہاں ہماری رشتہ داری تھی اور کچھ عرصہ پہلے ابا جی نے مجھے وہاں قرضہ کی وصولی کے لئے بھیجا تھا اور انہوں نے جلد ادائیگی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا قرضے کے دوسو روپوں میں سے دس پانچ روپے تو آسانی سے مل جائیں گے بلکہ وہ خوش ہوں گے۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

جب میں بہار شاہ چوک (جسے اب بتی والا چوک بھی کہتے ہیں) پر پہنچا جہاں سے گوجرانوالہ، لاہور، فیصل آباد اور سرگودھا کو سڑکیں جاتی ہیں تو شدید کالی آندھی آ گئی۔ میں نے اپنی قیمتی اسناد بچانے کے لئے ایک بند دکان کے برآمدے میں پناہ لی۔ آندھی بارش اور طوفان میں تبدیل ہو گئی اور وہیں بیٹھے بیٹھے رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ رات بھر میں اپنے کاغذات کے تھیلے کو سینے سے چمٹائے دیوار سے ٹیک لگا کر وہیں بیٹھا رہا اور جھکڑ چلتے اور بارش ہوتی رہی۔ اگر اسناد کے بھیگنے کا ڈر نہ ہوتا تو میں بارش کے کسی وقفے میں نکل کر موضع 'قانون گو' پہنچ سکتا تھا مگر کاغذات کے تھیلے میں میرا مستقبل بند تھا جس کے لئے میں کوئی خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ سوتے جاگتے رات بیت گئی اور صبح ہو گئی۔ مطلع اب صاف ہو گیا تھا۔ بھوک اور پیاس سے برا حال تھا۔ حلوہ پوری کے ناشتہ کو آٹھ پہر گزر چکے تھے۔ پیدل چل کر قانون گو جانے کی سکت نہیں تھی۔ قریبی کھیتوں میں رفع حاجت کے بعد میں نے میونسپل کمیٹی کے نل پر ہاتھ منہ دھویا، کلی کی اور ہاتھ کا چلو بنا کر خالی پیٹ کو پانی سے بھرنے کی کوشش کی۔ یہی میرا ناشتہ تھا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی اور تھیلا لے کر نئے سرے سے کسی واقف کار کی تلاش میں بازار اور کچہری کی طرف چل پڑا۔ مگر آج بھی گاؤں کا کوئی آدمی خرید و فروخت، ضمانت کرانے یا تاریخ بھگتنے آیا تھا نہ جیل کے کسی قیدی سے ملاقات کرنے۔ تاہم بارہ ایک بجے کے قریب

جب میں بھوک اور نقاہت سے بے حال ہو رہا تھا لاری اڈے کی طرف جاتے ہوئے تیز تیز چلتا لمبی ٹانگوں والا ممد انائی دکھائی دیا۔ میں نے اسے یوں آواز دی جیسے کوئی بچہ عید کا چاند دیکھ خوشی سے پکارتا ہے۔ وہ چلتے چلتے آشنا سی آواز سن کر ٹھٹکا اور مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ جانتا تھا اب اس کے کرائے بھاڑے کا انتظام ہو جائے گا۔ میں گاؤں کا واحد پڑھا لکھا لڑکا۔ سب میری بہت عزت کرتے تھے۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ادب سے سلام کیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''گاؤں'' اس نے جواب دیا ''فلاں چودھری کی شادی کی گنڈھ (دعوت یا سندیسہ) دینے گیا ہوا تھا اب واپس گھر جانا ہے۔''

مجھے یہ اندازہ کر کے کہ اس کے پاس معقول پیسے ہوں گے، اطمینان ہو گیا۔ میں نے کہا:

''ابھی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہارا کرایہ بھی دے دوں گا۔''

''جی اچھا۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

ٹھیک ہی کہتے ہیں پیٹ نہ پیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں۔ میں کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے چل پڑا پھر واپس پلٹ کر کہا:

''یار ممدے تمہارے پاس ٹوٹے ہوئے پانچ روپے ہوں گے؟ میں سو کا نوٹ تڑوانا نہیں چاہتا، خواہ مخواہ زیادہ پیسے خرچ ہو جائیں گے۔''

''ہاں جی۔'' اس نے پانچ کا نوٹ نکال کر دیا ''یہ لیجیے۔''

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں ایک ضروری کتاب لے کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اسے اڈے پر بٹھا کر جلدی سے ایک ہوٹل میں آیا اور کھانا منگا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ پھر ممدے نائی کے ساتھ لاری میں بیٹھ کر گاؤں چل پڑا۔

ہم فاروق آباد کے سچا سودا گوردوارہ سے ذرا آگے چاہ سرکاری کے لاری اڈے پر اترے تو گاؤں کا تانگہ کھڑا تھا۔ میں نے سالم تانگہ کرایا اور ہم دونوں گھر پہنچ گئے۔ راستے میں پیسوں کا اس نے پوچھا نہ میں نے ہی ذکر کیا مگر گھر جا کر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ ابا سے پیسے لے کر چھوٹے بھائی کے ہاتھ ممدے نائی اور تانگے والے محمد حسین موچی کو بھجوائے۔

اس کے کئی برس بعد جب میں ایکسین (ایگزیکٹو انجینیئر) کے عہدے پر کام کرتا تھا اور ایک عرصہ بعد گاؤں آیا تھا، ممد انائی مجھے ملنے کے لئے آیا اور سلام کر کے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا مگر وہ بولا ''آپ بڑے آدمی ہیں جی۔ میں آپ کے برابر کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔''

ایک تو ان کی کاریوں اور چھوٹے آدمیوں کو اپنی عزت نفس کا ذرا

احساس نہیں۔ نہ ہی انہوں نے علامہ اقبال کا فلسفہ خودی پڑھا سنا ہے۔ میں نے سوچا اور اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ بٹھایا۔ اس وقت میرے پرائمری سکول کے ٹیچر ماسٹر رحمت اللہ بھی موجود تھے۔ وہ ایک ان پڑھ اور کمی شخص کو اپنے ساتھ بٹھانے پر بہت خوش ہوئے اور مجھے شاباش دی۔ میں نے کہا:

''ماسٹر جی کمی اور غریب آدمی جب نیچے بیٹھتے، پاؤں کو ہاتھ لگاتے اور ٹانگیں دباتے ہیں تو ہر 'بڑے' آدمی کی طرح مجھے بھی بہت مزہ آتا اور میرے اندر غرور کا ایک پھول سا کھل اٹھتا ہے لیکن کیا کروں۔ اس ممدے نائی کا مجھ پر ایک بہت بڑا ذاتی احسان ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے پورا واقعہ سنایا اور کہا ''ممدے تم میرے محسن ہو۔ مجھے اس بلندی تک پہنچانے والی سیڑھی کا ایک ڈنڈا تم بھی ہو۔''

ممدے نائی کی آنکھیں خوشی اور حیرت سے چمکنے لگیں۔

ستمبر 1955 کا آخری دن تھا۔ مجھے گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ میں داخلہ مل گیا تھا اور میں حاضری کے لئے جا رہا تھا۔ لالہ موسیٰ ریلوے اسٹیشن پر میں نے اکتوبر 1955 کا شمع لاہور دیکھا جس میں میرا پہلا افسانہ 'کنول' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد شمع، عکس نو، حرم، روزنامہ تعمیر، اور ہفت روزہ ہمدرد راولپنڈی وغیرہ میں میرے افسانے چھپتے رہے۔ لیکن یہ سب ابتدائی کہانیاں تھیں۔ اس لئے پتہ نہیں میری ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اس کہانی سے سمجھنا چاہیے جس کا عنوان غالباً 'آزادی کے بعد' تھا اور جو 56 یا 57 میں عکس نو میں چھپی تھی یا اسی کہانی کے ایک الگ اور موڈیفائیڈ حصے پر مبنی 'کہانی' سے، جو کچھ عرصہ بعد اشفاق احمد صاحب کے داستان گو میں چھپی تھی۔ بہر حال میری افسانہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔

میں اپنا چھپا ہوا افسانہ دیکھ کر اکسائٹڈ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ سیکنڈ ائر کا ایک رشتہ دار محمد بشیر بھی تھا۔ اس نے مجھے نصیحت کی کہ رسالہ چھپا دوں اور اس میں چھپنے والے افسانے کا کسی کو پتہ نہ چلنے دوں ورنہ مشکل ہو جائے گی۔ مجھے بھی اسکول کی فولنگ کا اندازہ تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن پتہ نہیں کیسے سیکنڈ ائر کے لڑکوں کو اس کا علم ہو گیا اور وہ ہر روز رات کو آ کر مجھ سے بلند آواز میں وہی ایک افسانہ بار بار سنتے اور طرح طرح کے سوالات کر کے مجھے پریشان کرتے۔ میں یہ افسانہ سنا سنا کر تنگ آ گیا اور مجھے اپنے لکھے ہوئے سے نفرت ہو گئی۔ مگر جب دوسرے فرسٹ ائیر فولز کی درگت بنتی دیکھتا تو غنیمت سمجھتا کہ صرف افسانہ سنا کر گلو خلاصی ہو جاتی ہے۔ یہ بہت رعایت تھی اور اس میں بشیر کی سفارش بھی شامل تھی، ورنہ وہ گجرات کے عزیز احمد کو میز پر کھڑا کر کے ڈانس کرواتے۔ راولپنڈی کے اشفاق سے دونی کا پہاڑا سنتے اور میانوالی کے لمبے تڑنگے احمد خان کو ریل گاڑی کا انجن بنا کر رات بھر بھگاتے رہتے۔ وہ منہ سے چھک چھک کی آواز نکالتا اور سیٹیاں بجاتا۔ باقی کے فولز ایک دوسرے کی کمر پکڑے ریل کے ڈبے بنے اس کے پیچھے بھاگتے رہتے اور منہ سے کبھی مسافر گاڑی کی اور کبھی مال گاڑی کی آوازیں نکالتے۔ مسافر گاڑی کی آواز تو آسان تھی: ''ٹک دی کلک ٹک ٹک ٹک ٹک۔ ہاؤوٹ یووٹ ڈوڈو کے اک''

مگر کم بخت راستے میں بار بار چڑھائی اترائی آ جاتی۔ اور انجن کو منہ سے تیز تیز بول کر ظاہر کرنا پڑتا کہ کتنی سخت چڑھائی یا اترائی ہے۔ اسی طرح مال گاڑی کے لئے ''لالہ موسیٰ چھے چھے پیسے۔ لالہ موسیٰ چھ چھ پیسے'' کی گردان کرنا پڑتی اور چڑھائی اترائی کو تیز تیز یا آہستہ آہستہ بول کر بتانا پڑتا۔ میں چھپ کر کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھتا اور لرز لرز جاتا۔ اگر بھائی محمد بشیر اور 'کنول' کی پناہ حاصل نہ ہوتی تو یقیناً وہ میرے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے اور محض افسانہ سننے پر اکتفا نہ کرتے۔ مجھے یاد ہے ایک نہایت قابل لڑکا جس نے اپنے اسکول ہی میں نہیں صوبہ کے بورڈ میں بھی نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی اس فولنگ سے گھبرا کر اسکول چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں نے بعد میں اس موضوع پر ایک دل چسپ افسانہ 'ایڈیٹ' کے عنوان سے لکھا تھا جو روزنامہ تعمیر کے سنڈے ایڈیشن اور ماہنامہ حرم لاہور میں شائع ہوا تھا۔ مگر وہ میرے بہت سے ابتدائی افسانوں کی طرح کتابی صورت میں شائع ہونے سے محروم رہ گیا۔

دریائے جہلم اور اس سے نکلنے والی نہروں کے خوب صورت سنگم پر واقع انجینئرنگ اسکول رسول کا شمار برِ صغیر کے قدیم اور مشہور ٹیکنیکل اور سول انجینئرنگ کے تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ اب یہ پولی ٹیکنیک کالج کہلاتا ہے جہاں سول ٹکنالوجی میں ڈپلوما کے علاوہ بی ای ٹیک کا ڈگری کورس بھی کرایا جاتا ہے لیکن اس زمانے میں یہ جی ایس ای رسول کہلاتا تھا اور روڑکی (انڈیا) کے بعد، جہاں سے اردو کے کلاسیک ناول امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا ہادی رسوا نے سول اوورسیئر کا کورس پاس کیا تھا، پاک و ہند کا سب سے بڑا ادارہ تھا۔ اس کا محل وقوع نہایت شاداب اور خوب صورت ہے اور یہ بہت وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ شاندار تعلیمی بلاکس، رہائشی کالونی، کشادہ سڑکیں، کھیل کے بڑے بڑے میدان، جدید طرز کے شاندار ہوسٹلز، ورکشاپس۔ مارکیٹس، سوئمنگ پولز، ری کری ایشن ہال جس میں اخبارات، ان ڈور گیمز اور میری دل چسپی کی چیز ریڈیو موجود تھا۔ لیکن اس زمانے میں پڑھائی فوجی انداز میں ہوتی تھی۔ ہم آرمی جیسی خاکی وردی پہنتے اور فوجی ڈسپلن

کے ساتھ کلاسوں میں آتے جاتے تھے۔صبح کو پریڈ ہوتی تھی اور سونا جاگنا، لکھنا پڑھنا اور کلاس اور کھیل کے میدان میں آنا جانا بگل سے ہوتا تھا۔

مجھ سے ہمیشہ انٹرویوز میں یہ سوال پوچھا جاتا رہا کہ آپ انجینئر ہو کر ادب کی طرف کیسے آ گئے اور میں اس کا جواب دیتا کہ اردو کا سب سے مقبول اور شاندار ناول جس پر متعدد فلمیں اور ڈرامے بن چکے ہیں اور جو برصغیر میں ہر جگہ ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہے رڑکی سے اوورسیئر کا امتحان پاس کرنے والے مرزا ہادی رسوا نے لکھا تھا۔اور پھر اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔محمد خالد اختر، محسن بھوپالی، ڈاکٹر انور سدید اور بہت سے دوسرے پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں اکاؤنٹس، میڈیکل، انجینئرنگ اور ایسے دیگر پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ، ادب پڑھانا جن کا پیشہ نہیں ہوتا، عام طور پر ادب سے زیادہ سچی گہری اور پرخلوص وابستگی رکھتے ہیں۔

...رات کو کھانے کے بعد دو گھنٹے کا اسٹڈی پیریڈ ہوتا تھا اس کے بعد بگل بجتا اور لائٹ آف کر دی جاتی تا کہ لڑکے صبح کو جلدی جاگنے کے لئے سو جائیں۔ کسی کو اس پیریڈ کے بعد لیمپ وغیرہ جلا کر پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ایک لڑکا رات کو اٹھ کر پیشاب کرنے گیا تو میجر صاحب نے جو راؤنڈ پر تھے اس سے باز پرس شروع کر دی۔ باتھ روم مشترکہ اور الگ تھے اس نے بتایا کہ وہ پیشاب کرنے باتھ روم گیا تھا۔میجر صاحب نے کہا کہ مجھے دکھاؤ تم نے کہاں پیشاب کیا ہے۔اس نے باتھ روم میں جا کر تازہ کیا ہوا پیشاب دکھایا تب جا کر کہیں میجر صاحب کی تسلی ہوئی اور لڑکا کنڈکٹ مارکس کے فائن سے بچ سکا۔

ایک رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ۔میرے پاس سگریٹ ختم ہو گئے تھے۔ میں اسٹڈی پیریڈ کے بعد نیکر پہنے ہوسٹل سے ملحقہ دکان پر سگریٹ لینے چلا گیا۔لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میجر صاحب نے پکڑ لیا۔ ''وٹ از یور رول نمبر؟''

''سر فائیو تھرٹی تھری''

''ویل بلڈی فائیو تھرٹی تھری۔وٹ آر یو ڈوانگ ہیئر؟''

اب بڑی مشکل پیش آ گئی۔سچ بولتا ہوں تو جرمانہ کہ سگریٹ کیوں پیتے ہو اور نہیں بولتا تو بھی مارا جاؤں گا کہ دوسرے ہوسٹل جانے کا ارادہ تھا۔ آخر سچ بول دینا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔اتفاق سے میجر صاحب اس وقت سگریٹ پی رہے تھے اور خوش بو سے برانڈ کا پتہ چل رہا تھا۔میں نے کہا سر مجھے سونے سے پہلے سگریٹ پینے کی بری عادت ہے ورنہ نیند نہیں آتی اور آج میرے پاس سگریٹ نہیں تھے میں نے سوچا دوڑ کر ایک سگریٹ لے آؤں۔

کہنے لگے کون سا سگریٹ پیتے ہو؟ میں نے کہا ''سر قینچی کا۔''

انہوں نے خلاف توقع اپنے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر دیا اور کہا ''واپس جاؤ اور سگریٹ پی کر سو جاؤ۔لیکن آئندہ رات کو نظر آئے تو معاف نہیں کروں گا۔''

میں نے سگریٹ لے لی اور سلام کر کے واپس آ گیا اور پھر کبھی رات کو ہوسٹل سے باہر نہیں گیا۔

رسول میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں افسانے بھی لکھتا رہا، جو میں اپنے ہوسٹل کے دوستوں اور ساتھیوں کو بھی سناتا۔ان ہی دنوں میں نے دو ایک نظمیں بھی لکھیں۔میری لاہور والے خالو صاحب، عکس نو کے مدیر زیب ملیح آبادی اور شمع کے ایڈیٹر مولانا محمد امین شرق پوری سے خط و کتابت رہتی تھی۔میرے ابتدائی افسانے اب عکس نو میں بھی چھپنے لگے تھے۔بلکہ زیادہ افسانے اسی ماہنامے میں شائع ہوئے۔اس کی چیف ایڈیٹر بیگم حسن زمانی عالمگیر تھیں جو بعد میں پرچے کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئیں۔بعد میں زیب ملیح آبادی سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی ۔اس رسالے میں چھپنے والے نثر نگاروں میں یونس جاوید الطیف کاشمیری، جعفر شیرازی ،اختر لنگاہی، پنہاں انصاری، اور غالباً بشریٰ رحمان بھی شائع ہوتی تھیں۔اسی رسالے کے اوراق پر یونس جاوید سے میری قلمی لڑائی بھی ہوئی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہو گئی۔

ایک بار والد صاحب کا بھیجا ہوا میرا منی آرڈر گم ہو گیا۔میں نے نوائے وقت راولپنڈی میں ایڈیٹر کے نام اپنی شکایت لکھ بھیجی۔ڈاک خانہ کے محکمہ نے مجھے منی آرڈر کی رقم فوراً ادا کر دی۔اس اخباری مراسلہ کی وجہ سے راولپنڈی کا ایک قلمی دوست بھی مل گیا جو شاعر تھا بعد میں اس سے ملاقات بھی ہوئی۔ بعد میں پتہ نہیں وہ کہاں گم ہو گیا اور اب تو اس کا نام بھی بھول گیا ہے۔ایک بار میں نے والد صاحب کو لکھا کہ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے وہ مجھے تار منی آرڈر سے رقم بھجوائیں۔وہ بے چارے پریشان ہو گئے ۔پیسے لے کر حافظ آباد آئے اور ڈاک خانے والوں سے تار منی آرڈر کرنے کو کہا اور پوچھا کہ کتنی دیر میں ملے گا۔انہوں نے کہا:

''چاچا جی زیادہ جلدی ہے تو خود جا کر دے آئیں۔رسول کون سا دور ہے۔کرایہ جتنی تو تار منی آرڈر کی فیس بھی لگ جائے گی۔''

وہ بس میں جا بیٹھے اور چند گھنٹوں میں اسکول پہنچ گئے۔اپنے اپنے والدین سے اداس لڑکوں نے دو ایک روز ان کی اتنی خدمت اور دیکھ بھال کی کہ وہ زندگی بھر اس کا ذکر کرتے رہے۔ OO

نام : محمد منشایاد/منشایاد
والد : نذیر احمد
تاریخ پیدائش : 5 ستمبر 1937
جائے پیدائش : ضلع شیخوپورہ (پنجاب) پاکستان
تعلیم : ایم اے اُردو۔ایم اے۔پنجابی۔ڈپلوما سول انجینئرنگ
ملازمت : ڈپٹی ڈائریکٹر (ریٹائرڈ) دارالحکومت کا ترقیاتی ادارہ، اسلام آباد

تصانیف: افسانوں کے مجموعے:

(1) بند مٹھی میں جگنو (1975)
(2) ماس اور مٹی (1980)
(3) خلا اندر خلا (1983)
(4) وقت سمندر (1986)
(5) وگدا پانی (پنجابی) (1987)
(6) درخت آدمی (1990)
(7) دور کی آواز (1994)
(8) تماشا (1998)
(9) خواب سرائے (2005)

ناول:

(1) ٹانواں ٹانواں تارا (پنجابی 1997)
(2) راہیں (اُردو۔زیر طبع)

متعلقہ کتب/انتھالوجیز رسائل:

(1) منشایاد کے تیس منتخب افسانے مرتبہ خاور نقوی 1992 (پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ لاہور)
(2) منشایاد کے بہترین افسانے مرتبہ امجد اسلام امجد 1993 (ادب پبلی کیشنز نئی دہلی)
(3) منتخب کہانیاں (انگریزی تراجم) مرتبہ جمیل آذر 1994 (اسٹرلنگ پبلشرز۔نئی دہلی اور لاہور)
(4) منشایاد کہانی نمبر لہراں لاہور 1986
(5) منشایاد کے منتخب افسانے مرتبہ طاہر اسلم گورا اور امجد طفیل (1997)
(6) شہر فسانہ (بذات خود منتخب کردہ پچاس افسانوں کی انتھالوجی۔2004)

اعزازات: *ادب (ناول/افسانہ) کے شعبے میں نمایاں کارکردگی پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی (پرائڈ آف پرفارمنس 2005)

*پنجابی افسانوں کے مجموعے 'وگدا پانی' پر اکادمی ادبیات پاکستان کا 'وارث شاہ ایوارڈ' (1987)

*اردو افسانے 'تاج محل کی سیر' (ریپلیکا) پر نقوش ادبی ایوارڈ (1989)

*پنجابی ناول 'ٹانواں ٹانواں تارا' پر مسعود کھدر پوش ایوارڈ اور اکادمی ادبیات پاکستان کا وارث شاہ ایوارڈ (1998)

*ڈراما سیریل 'راہیں' پر پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ برائے سال 1998

فن اور شخصیت کے خصوصی مطالعے: اوراق لاہور 1991 طلوع افکار کراچی 1995 چہار سو راولپنڈی 2001

ادبی مصروفیات/سرگرمیاں:

• اسلام آباد میں پہلی ادبی تنظیم حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد کی بنیاد رکھی (دسمبر 1972) تفصیلات کے لئے لاگ ان کریں:
http://halqa1.tripod.com

• اسلام آباد میں لکھنے والوں کی انجمن، بزم کتاب اور رابطہ تنظیمیں قائم کیں

• مختلف اخبارات میں کالم نگاری، آج کل روزنامہ ہمدرد اسلام آباد میں کالم نگاری۔پڑھنے کے لئے لاگ ان کریں:
http://kalumnigar.tripod.com

• ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شرکت اور ٹی وی ڈرامے اور سیریلز جنون، بند حسن اور راہیں اور پورے چاند کی رات وغیرہ

• دہلی میں پنجابی ادبی کانفرنس (1987) کے علاوہ ادیبوں کے وفد کے ہم راہ دورۂ چین۔1999)

• اردو اکادمی دہلی اور لندن، نیویارک، سان فرانسسکو اور ڈیلاس امریکہ کی ادبی تنظیموں کے خصوصی جلسوں میں شرکت (2004)

• افسانوں کی بہت سی انتھالوجیز مرتب کیں اور بہت سے افسانوں کے دوسری زبانوں میں تراجم ہوئے

• مدیر معاون ہفت روزہ ہمدرد راولپنڈی (1958 تا 1959)
شریک مدیر ماہنامہ علامت لاہور 1990 تا 2001)

رابطہ: افسانہ منزل، 8 سیونتھ ایونیو، جی سیون فور اسلام آباد (44000)
ای میل: afsananigar@yahoo.com
manshayaad@hotmail.com
فون: 051-2277373 موبائل: 0333-5114335
ویب سائٹس: www.manshayad.com اور
http://afsana3.tripod.com

بابِ غزل

حضرت عزیز لکھنوی
کے فرزند ارجمند

حیات لکھنوی

کے نام

27 فروری 1931 • 15 اگست 2006

حیات لکھنوی

کیسے سمجھاؤں میں تجھ کو اے وفا نا آشنا
اپنی تاثیروں سے ہے تیری ادا نا آشنا

میں بجاں آواز دیتا ہوں کوئی سنتا نہیں
جیسے مجھ سے ہوگئی ساری فضا نا آشنا

سلسلہ کوئی نہیں ہے عبداور معبود میں
مُدعا سے ہوگیا دستِ دعا نا آشنا

کس طرف بارش ہوئی ہے کس طرف شعلے اُٹھے
اس حقیقت سے رہی موجِ ہوا نا آشنا

قربتیں یوں دوریوں میں ہوگئیں او جھل حیات
ایک سے لگنے لگے سب آشنا نا آشنا

چاند، سورج، پیڑ، ندیاں اور سمندر کس لیے
چارسُو اُس نے سجائے ہیں یہ منظر کس لیے

زندگی بھر کے سفر میں کیا ملا ہے آپ کو
میں چلوں پھر آپ کے نقشِ قدم پر کس لیے

جن کے سر جھکتے رہے ہیں دوسروں کے سامنے
میں جھکاؤں اب انہی کے سامنے سر کس لیے

جب مجھے معلوم ہے وہ غور سے سنتا نہیں
پھر کروں میں زحمتِ عرضِ مکرّر کس لیے

جب مجھے اپنے کیے کی روز ملتی ہے سزا
تو نے پھر رکھا ہے یارب روزِ محشر کس لیے

اس بھری بستی میں مجھ پر خوف ساطاری ہے کیوں
رات دن منڈلا رہا ہے سر پہ خنجر کس لیے

جس زمیں میں مَیں نے اپنا خون بویا ہے حیات
اُس زمیں کو کہہ رہے ہیں لوگ بنجر کس لیے

بیٹھا نہیں تھا اُجڑا ہوا گھر سجا کے مَیں
تھا کربِ انتظار میں اُس کو بُلا کے مَیں

مایوسیاں ہیں، اس میں انا کا سوال کیا
نادم ہوا ہوں دستِ طلب کو بڑھا کے مَیں

بے نام خواہشوں کی طرف دیکھتا ہے کون
کس سمت جاؤں بارِ تمنا اُٹھا کے مَیں

میرے لیے ہے چاروں طرف نفرتوں کی آگ
مجرم ہوں ایک جلتا ہوا گھر بچا کے مَیں

نکلا نہیں ہوں اب بھی صدا کے حصار سے
اپنے شجر کے سارے پرندے اُڑا کے مَیں

بدلی ہوئی فضا نے مجھے کردیا نڈھال
سمجھا تھا کامیاب ہوں فصلیں اُگا کے مَیں

جب زندگی سے ترکِ تعلق کا ہے سوال
اب اور کس کو دیکھوں گا اپنا بنا کے مَیں

میرا وجود اُس کی نظر میں نہیں حیات
لایا تھا جس کو سب کی نظر سے بچا کے مَیں

رفعت سروش

چمن کے منظرِ وحشت اثر کو دیکھتے ہیں
قفس میں ٹوٹے ہوئے بال و پر کو دیکھتے ہیں

ہے جس کے سامنے شرمندہ فتنۂ چنگیز
ہم اپنی آنکھوں سے اس فتنہ گر کو دیکھتے ہیں

یہ زندگی کا تسلسل ابھی رکے نہ تھمے
مدام گردشِ شام و سحر کو دیکھتے ہیں

پسِ غبار فقط کہکشاں ستاروں کی
اس آئینے میں جہانِ دگر کو دیکھتے ہیں

گذر کے صدیوں کی تہذیب کے اندھیروں سے
ہم اپنے دور کے شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

یقین ہی نہیں ان کو خدا کی رحمت پر
دعا کے بعد جو بابِ اثر کو دیکھتے ہیں

سروش عمر گذاری ہے خوابِ غفلت ہیں
ہے چل چلاؤ تو رختِ سفر کو دیکھتے ہیں

ظفر اقبال

مسائل بڑھ گئے ہیں، گفتگو ہونا ضروری ہے
ہمارا آپ کا اب روبرو ہونا ضروری ہے

محبت کی ذرا سی تھرتھری کافی ہے دونوں کو
نہ میں ہونا ضروری ہے نہ تو ہونا ضروری ہے

خصائل تجھ میں ہوں گے خوب رووں کے بہت لیکن
کوئی اپنا تمہارا رنگ و بو ہونا ضروری ہے

کسی صورت کوئی کلسِ سوادِ خواب ظاہر ہو
کہیں سر میں غبارِ آرزو ہونا ضروری ہے

ہیں اس جیسی بہت شکلیں پکھاں سے خوب تر بھی ہیں
مگر میرے لئے وہ ہو بہو ہونا ضروری ہے

نکل بھاگے نہ وہ، یوں اس کو گھیرے میں لئے رکھیں
کہ ساری رات اس کے چار سُو ہونا ضروری ہے

اب اس کی دھمکیوں کا تو اثر مجھ پر نہیں ہوتا
سو میرے ساتھ اس کا دوبدو ہونا ضروری ہے

تلاش اس بے نشاں کی اس قدر آساں بھی مت سمجھیں
کہ اپنا کم سے کم بھی کو بکو ہونا ضروری ہے

ظفر، ان آنسوؤں کا رنگ بدلے گا کبھی، لیکن
کچھ اس سے پیشتر دل کا لہو ہونا ضروری ہے

شجاع خاور

ہوتا نہیں اس پر مری باتوں کا اثر کچھ
مجھ پر ہی اثر ہوتا ہے ہوتا ہے اگر کچھ

ہے جب سے شکم چین سے بے چین ہے سر کچھ
احساس یہ اچھا ہے پر اظہار تو کر کچھ

ہیں قید ادھر ہم تو اُدھر امن و اماں ہے
لگتا ہے اب اس شہر میں بدلا ہوا ہر کچھ

وہ رات گئی جس میں چمکتے تھے ستارے
یہ وقتِ سحر ہے نہیں آئے گا نظر کچھ

جب جیسے جہاں چاہیں یہ چلتی ہیں شجاع اب
موسم کا نہیں ہوتا ہواؤں پہ اثر کچھ

پروفیسر حامدی کاشمیری

ستاروں میں گلابوں میں نہیں ہے
کہاں ہے گر حجابوں میں نہیں ہے

مہ و اختر بھی پیچ و تاب میں ہیں
مری جاں ہی عذابوں میں نہیں ہے

ہیں کیوں سرگوشیاں پرچھائیوں کی
اگر کوئی خرابوں میں نہیں ہے

تو کیا ہے فصلِ نور و تیرگی میں
گناہوں اور ثوابوں میں نہیں ہے

طلوعِ مہر کا امکاں نہیں ہے
تردّد ماہتابوں میں نہیں ہے

چلے جاتے ہیں کیوں افتاں و خیزاں
اگر دریا سرابوں میں نہیں ہے

مخمور سعیدی

آج اپنے قبیلے کا ہر آدمی دوستو شائد آدھا ادھورا سا ہے
جیسے شانوں پہ گردن کسی کے نہ ہو، جیسے جو بھی ہے وہ سر بریدہ سا ہے
جانتا ہے نہ پہچانتا ہے کوئی، آشنا اب کسے مانتا ہے کوئی
چہرہ چہرہ بھٹکتی ہے تنہا نظر، بھیڑ میں رہ کے بھی دل اکیلا سا ہے
رات کی کالی بستی سے مہتاب تو اپنا رختِ سفر باندھ کر جا چکا
کچھ ستارے مگر ٹمٹماتے تو ہیں، آسماں پر ابھی کچھ اجالا سا ہے
اجنبی اجنبی سے یہ شام و سحر، اپنی پہچان بھی اب نہیں معتبر
مدتیں ہو گئیں خود کو دیکھے ہوئے، وقت کا آئینہ دھندلا دھندلا سا ہے
ہو نہ ہو، یہ وہی پانچویں سمت ہے جس کی ہم کو بشارت ملی تھی کبھی
گھور اندھیرے ہیں چاروں طرف خیمہ زن، ایک جانب مگر کچھ اجالا سا ہے
موت کی آہٹیں بھی سنوں دم بہ دم، زندگی کا سفر بھی میں جاری رکھوں
پاس آتی ہوئی ایک پرچھائیں سی، دور جاتا ہوا ایک سایہ سا ہے
کل سرِ راہ دیکھا تھا مخمور کو، تھا دریدہ قبا اور ژولیدہ مو
کس طلب میں بھٹکتا ہے وہ کو بہ کو، کس تجسس میں وہ کھویا کھویا سا ہے

مظفر حنفی

چار سمتیں ہوں گی پگڈنڈی بدلتی جائے گی
یوں ہی چلتا جا، کوئی صورت نکلتی جائے گی

فطرتاً سورج کو جلنا ہے سو جلتا جائے گا
برف اپنے آپ گرمی سے پگھلتی جائے گی

ایک ریلے کی کسر ہے ایک جھونکے کی کمی
تا کجا یہ مشتِ خاکستر اچھلتی جائے گی

ہاتھ میں زیتون کی ڈالی ہے سر پر فاختہ
اندر اندر خون کی تلوار چلتی جائے گی

حسرتِ تعمیر رہ جائے گی مٹھی بھینچ کر
ریت آخر ریت ہے وہ تو پھسلتی جائے گی

گردِ شہرت نے مرے چہرے کو دھندلا کر دیا
جس قدر سایہ بڑھے گا دھوپ ڈھلتی جائے گی

وادیٔ ظلمات میں چھیڑو مظفر کی غزل
روشنی افکار تازہ سے ابلتی جائے گی

دامن دامن چاک صدف کا، موتی موتی عریاں ہے
صحرا صحرا ریت اڑتی ہے دریا دریا طوفاں ہے

میرے اندر کی بے چینی آخر کیسے ظاہر ہو
میں پابستہ اور بگولا صحرا میں سرگرداں ہے

چاروں جانب جال بچھائے نقشِ تمنا بیٹھے ہیں
اب جس کے پیروں میں دم ہو یہ تو دشتِ امکاں ہے

اس کی خوش بو کیسے آئی وہ تو میرے پاس نہ تھا
اس کا عکس کہاں سے آیا آئینہ خود حیراں ہے

جیسے ہاتھوں میں آ جائے آشا کی اک نازک ڈور
برکھا رت کی اندھیاری میں ایک ستارا نوراں ہے

میں اپنی پہچان کی تختی پیشانی پر جڑتا ہوں
شہر خرابے میں تو یارو سب کا چہرہ یکساں ہے

انسانوں کے پاس مظفر انساں کب تک پہنچے گا
اس کی گردِ سفر تو اب تک سیاروں میں رقصاں ہے

نظر بچھائے ہیں لوہے کی بیڑیاں خاموش
کہ ریل آئے تو بجتا ہے بعد ازاں خاموش

مطالبات کا پرچم بلند رکھتے تھے
کہا کہ خون عطا ہو تو مہرباں خاموش

وہ راستہ ہے کہ چلنے سے اور بڑھتا ہے
زمیں نگاہ بچاتی ہے آسماں خاموش

فضا سکوت زدہ، چاندنی میں بوجھل پن
کھڑا ہوا ہے درختوں کا کارواں خاموش

قدم ہیں دوسری راہوں پہ رخ مری جانب
نظر فسانہ سناتی ہوئی، زباں خاموش

وہاں پہنچ کے مظفر نے حق بیانی کی
جہاں دکھائی دیے سارے خوش بیاں خاموش

عبدالاحد ساز

کہ ہوں شرارِ فلک رس مگر الاؤ میں ہوں
میں لامکاں کا مسافر بدن کی ناؤ میں ہوں
مرا وجود، جزیرہ نحیف سانسوں کا
میں موج موج تنفس شکن دباؤ میں ہوں
نہ چھو سکیں مجھے لمحوں کی جوہری آنکھیں
میں مثلِ موج گہر وقت کے بہاؤ میں ہوں
یہ عکس عکس تصادم یہ انجذاب کی دھن
میں آئنے کی طرف مستقل کھنچاؤ میں ہوں
شکن سمجھ کے نہ ملبوس کی جھٹک مجھ کو
میں خم کی طرح ترے جسم کے کساؤ میں ہوں
نہ پوچھ مجھ سے ابھی امتزاج کا آہنگ
میں اب تلک وہی رنگوں کے بھید بھاؤ میں ہوں
قلم کی نوک ترازو نہ بن سکی اب تک
میں لفظ لفظ خیالوں کے بھاؤ تاؤ میں ہوں
مری شکست بھی آرائشِ وجود ہے ساز
بڑے قرینے کا حصہ ہوں اد کھڑ کھاؤ میں ہوں

عبدالاحد ساز

نہ مقامات نہ ترتیب زمانی اپنی
اتفاقات پہ مبنی ہے کہانی اپنی

جم سی جاتی ہے تہہ حرف کسی کثر کی موج
تھم کے رہ جاتی ہے لفظوں کی روانی اپنی

پھیل جاتی تھی سماعت کی زمینوں میں نمی
تھی کبھی تر سخنی آب رسانی اپنی

لاکھ تم مجھ کو دباؤ میں ابھر آؤں گا
سطح ہموار کئے رہتا ہے پانی اپنی

اک ستم اور پئے زینتِ طاقِ نسیاں
بھول جانے کی تو عادت ہے پرانی اپنی

ماجرا روح کی وحشت کا ئی ہے اے ساز
آگے روداد نہیں ہم کو سنانی اپنی

سیفی سرونجی

(ایک شگفتہ غزل)

فرصت نہیں ذرا اسے بحث و دلیل سے
میں نے کیا ہے عشق مگر اک وکیل سے

منصف سلام کرتا ہے مجرم کو بار بار
رتبہ ملا ہے مجھ کو یہ ربِّ جلیل سے

اتنا اکڑ کے آپ نہ چلئے زمین پر
اکثر مرا ہے آدمی چھوٹی سی کیل سے

گدڑی پٹھان شیخ کا کب تک کروگے ذکر
کرنے لگے ہیں بور یہ قصے طویل سے

جانا ہے مجھ کو پار تو جا کر رہوں گا میں
زنجیر سے رکوں گا نہ اونچی فصیل سے

لڑتے ہوئے تمہیں بھی زمانہ گزر گیا
رہنے لگے ہیں دوستو ہم بھی علیل سے

غالب سی کوئی بات نہ انداز میر کا
چلتا ہے میرا نام تمہارے قبیل سے

پرتپال سنگھ بیتاب

کیا مسیحا ہے مجھے جب بھی شفا دیتا ہے
میرے سوئے ہوئے سب درد جگا دیتا ہے

آئینہ دیکھنے سے ڈرنے لگا ہوں اب تو
مجھ کو ہر بار نئی شکل دکھا دیتا ہے

ایک مدت سے اسے ڈھونڈ رہا ہوں باہر
وہ جو اکثر مجھے اندر سے صدا دیتا ہے

مجھ سے لڑتا ہے تو بن جاتا ہے جانی دشمن
اور کچھ دیر میں ہر بات بھلا دیتا ہے

دیکھتا جب بھی ہے وہ چشمِ کرم سے مجھ کو
میرے تن من میں عجب روگ لگا دیتا ہے

میرے جلنے سے اسے ہے کوئی نسبت گویا
ایک جھونکا ہے جو شعلوں کو ہوا دیتا ہے

سفرِ وادیِ اسرار میں اکثر بیتاب
میں بھٹک جاتا ہوں وہ راہ دکھا دیتا ہے

گم گشتہ حکایات کو ڈھونڈوں پھر سے
بکھرے ہوئے اوراق سمیٹوں پھر سے

ہاتھوں میں جب آئیں تو انہیں چھوڑ بھی دوں
آوارہ پرندوں کو پکاروں پھر سے

جس شہر میں اتروں اسے منزل جانوں
کچھ دیر میں کچھ سوچ کے چل دوں پھر سے

سمٹا ہوں ضرورت سے زیادہ شاید
اک بار یہی سوچ کے بکھروں پھر سے

یہ زیست بھی الجھن سی کوئی الجھن ہے
رہ رہ کے سنوں اور ادھیڑوں پھر سے

خوابوں میں طنابوں کو کسوں ہوں بیتاب
جاگوں ہوں تو خیمے کو اکھاڑوں پھر سے

دستکوں پر کوئی صدا بھی نہیں
در کھلا ہے مگر کھلا بھی نہیں

پیچھے دیکھیں تو پھر وہی سب کچھ
آگے جائیں تو راستہ بھی نہیں

زرد پر ہم بھی خیمہ زن نہ ہوئے
سبز منظر کوئی ملا بھی نہیں

ہم بھی شاخوں پہ چڑھ نہیں پائے
ان درختوں سے پھل گرا بھی نہیں

سرد راتیں ہیں اپنے حصے میں
اور بدن پر کوئی ردا بھی نہیں

گر رہی ہیں عمارتیں بیتاب
شہر میں کوئی زلزلہ بھی نہیں

غلام مرتضیٰ راہی

کیسے یہ کہوں اثر نہیں ہے
پتھر کا مرا جگر نہیں ہے
ترتیب سے حسن ہے جہاں کا
اک چیز اِدھر اُدھر نہیں ہے
کافی تھا جہاں اشارہ پہلے
کہنے کا بھی اب اثر نہیں ہے
سمجھو کہ قیام ہے سفر میں
دنیا ہے سرائے، گھر نہیں ہے
رکھے وہ لحاظ فاصلے کا
کم زور مری نظر نہیں ہے
ارباب علم و آگہی کو
ہمسائے کی کچھ خبر نہیں ہے
اک دار پہ ہے تو ایک در پر
کاندھوں پہ کوئی بھی سر نہیں ہے
لگتا نہیں کیا اے سطح بینو!
کچھ تہہ کی تمہیں خبر نہیں ہے
بس موم ہوا وہ اب کوئی دم
اک آنچ کی بھی کسر نہیں ہے

کرشن کمار طور

سُنا کہ سنگ ملامت برا نہیں لگتا کچھ
ہوں ایسے حال میں اب تو خدا نہیں لگتا کچھ

نظر میں رنگ نظر صفر کیا ہوئے ہیں کہ اب تو
صدا میں منصب حرف صدا نہیں لگتا کچھ

وہ شہد وصل یہاں ہو کہ زہر ہجر محبوب
مری نگاہوں کو اچھا برا نہیں لگتا کچھ

نہ جانے کب سے اٹھائے ہوئے ہیں ہاتھوں کو ہم
کھلا ہوا ہو وہ باب عطا نہیں لگتا کچھ

کروں میں مقطع سے اے طور آب سخن کا آغاز
نہ ہو نشانے پہ سنگ صدا نہیں لگتا کچھ

کرشن کمار طور

کہاں کسی پہ بھلا مہرباں ہے کوچۂ خاک
خود اپنے آپ میں اک امتحاں ہے کوچۂ خاک

جڑے ہوئے ہیں سرا اک دوسرے سے آپس میں
زمین صفر پہ کیا آسماں ہے کوچۂ خاک

میں آج بھی ہوں اسیر طلسم کتبۂ عشق
مرے وجود کو نقش مکاں ہے کوچۂ خاک

ہمارے خوں سے ہے سرسبز کاروبار جہاں
کہاں ہے کوچۂ خاک اب کہاں ہے کوچۂ خاک

ہمارے اشکوں کی خاطر ہے ارض چشم وجود
ہمارے سر کے لئے آستاں ہے کوچۂ خاک

یہ ناصبوری مرے اپنے اختیار سے ہے
ہر آدمی سے ہوں کہتا کہاں ہے کوچۂ خاک

کسی نگاہ سکوت آشنا کی رمز ہے طور
کسی حکایت دل کا بیاں ہے کوچۂ خاک

شین کاف نظام

موج ہوا تو اب کے عجب کام کر گئی
اڑتے ہوئے پرندوں کے پر بھی کتر گئی
اتنی خبر تو ہے کہ گلی آئی تھی تری
پھر اس کے بعد جانے کدھر رہ گزر گئی
آنکھیں کہیں دماغ کہیں دست و پا کہیں
رستوں کی بھیڑ بھاڑ میں دنیا بکھر گئی
کچھ لوگ دھوپ پیتے ہیں ساحل پہ لیٹ کر
طوفان تک اگر کبھی اس کی خبر گئی
نکلے کبھی نہ گھر سے مگر اس باوجود
اپنی تمام عمر سفر میں گزر گئی
دیکھنا انہیں تو دیکھنے سے جی نہیں بھرا
اور آنکھ ہے کہ کتنے ہی خوابوں سے بھر گئی
سورج سمجھ سکا نہ اسے عمر بھر نظام
تحریر ریت پر جو ہوا چھوڑ کر گئی

خورشید اکبر

کسی بہشت کی خوش بو چمن سے چاہتے ہیں
ہم اپنی جان کو لیکن بدن سے چاہتے ہیں

ہمارے درد کو نسبت ہے تیرے جنگل سے
سو اس قدر کہ عیادت ہرن سے چاہتے ہیں

تری شراب امانت ہے دل کے شیشے میں
مگر یہ ٹوٹے کسی روز چھن سے چاہتے ہیں

دیارِ غیر پہ قبضہ ہو قبر بھر اپنا
یہ فیصلہ بھی کسی دن وطن سے چاہتے ہیں

ہمارے بعد برہنہ رہے نہ کوئی وجود
بس ایک آخری خواہش کفن سے چاہتے ہیں

خورشید اکبر

روا روی تھی بہت عمر بھر خطا سے گئے
سزا یہ کم تو نہیں ہم تری سزا سے گئے

یہ اور بات کہ پھر کشمکش کہیں نہ رہی
صنم کے ہو نہ سکے اور ہم خدا سے گئے

ترے شہید ترے درد کے حوالے ہیں
حیات مانگنے والے تری قضا سے گئے

کہاں وہ دستِ شفا اور کہاں ترے بیمار
دوا سے جو نہ گئے تھے تری دعا سے گئے

سفر کے نام تقاضے ہزار تھے لیکن
جو ابتدا نہ چلے تھے وہ انتہا سے گئے

شہاب کاظمی

مل کر کبھی جب اس مہِ کامل سے آئے ہیں
آپے میں لوٹ کے بڑی مشکل سے آئے ہیں

ہم کو یہ کیا ہوا ہے کہ یاروں کی بزم میں
گردن بچا کے پنجۂ قاتل سے آئے ہیں

اتنا تھا خوفِ تہمتِ احسانِ ناخدا
طوفاں میں لوٹ لوٹ کے ساحل سے آئے ہیں

ہم پر وہ مہرباں ہیں کچھ آج اس طرح
لگتا ہے ہو کے غیر کی محفل سے آئے ہیں

حق گوئی کی نہ پھر ہمیں ترغیب دو کہ ہم
چھٹ کر ابھی تو قید و سلاسل سے آئے ہیں

کارِ طلسمِ دانۂ گندم نہ پوچھئے
آدم بہشت چھوڑ کے مشکل سے آئے ہیں

اس وقت خود کو قیس نے مجنوں سمجھ لیا
جب سنگ و خشت پردۂ محمل سے آئے ہیں

آئینہ ہاتھ میں ہے لبوں پر سکوت ہے
اٹھ کر نہ جانے کس کے مقابل سے آئے ہیں

وہ جانتے ہیں آبلہ پائی کی لذتیں
منزل پہ جو گزر کے منازل سے آئے ہیں

تاریخ حق اس امر کی غماز ہے شہاب
خنجر میں زخم گردنِ بسمل سے آئے ہیں

رضیہ فصیح احمد

نیند میں غفلت بہت، جاگے تو بیداری بہت
بے پیے بھی اک زمانے میں تھی سرشاری بہت

شعر کی تعریف استادوں سے یہ ہم نے سنی
سادگی الفاظ میں، معنی میں تہہ داری بہت

جانتے تو آپ بھی ہیں مانئے نہ مانئے
جان کر بھی ہم نے بازی آپ سے ہاری بہت

یہ نہ پوچھو فیض کس کا کون کس پردے میں ہے
بے ہنر لوگوں میں دیکھی ہے ہنر داری بہت

آپ اس کو حوصلہ کہئے کہ کہئے خوجیت[1]
پاؤں لرزاں، آنکھ میں آنسو، جگر داری بہت

گو کتابوں میں بہت الجھے رہے دن رات ہم
کی ہے پر خاتونِ خانہ جیسی گھر داری بہت

سادگی، سادہ دلی کی دھوم جن لوگوں کی تھی
بھول پن میں ان کے دیکھی ہم نے ہشیاری بہت

1۔ خوجیت: سرشار کے دھان پان مرزا خوجی کی طرف اشارہ جو اپنی قرولی سے ہر ایک کو دھمکاتے تھے۔

رضیہ فصیح احمد

کیسے کیسے پیارے لوگ
کیسے کیسے ان کے روگ

جیتے گاتے ہنستے لوگ
خواب ہوئے وہ سارے لوگ

رات اندھیری گم سم سی
جانے اس کو کس کا سوگ

بھیس بنا رکھا ہے سب
کس کی پوجا کیسا جوگ

تو نے اس کو چاہا تھا
اب اس کا خمیازہ بھوگ

شفق سوپوری

شعلے سے وابستہ خس کر
مجھ کو وجود مرا واپس کر

کرنے والا تھا دشت عبور
اتنے میں صدا آئی بس کر

تو خضر کو بھیج یہاں یا پھر
غیب سے حاضر ایک فرس کر

پھول مرے سرہانے رکھا
خواب میں کس نے ماتھا دس کر

میں بن جاؤں گا طائر وہم
تو ایجاد خیالی قفس کر

کس کی پیاس بجھاتا ہے تو
دریا پر اے ابر برس کر

دیارِ سبز پہ اترے عذاب کیوں دیکھوں
مجھے بتا دے کہ میں پھر سے خواب کیوں دیکھوں

لکھا ہوا کسی سفاک شب کے ماتھے پر
میں اپنے سود و زیاں کا حساب کیوں دیکھوں

مجھے خبر ہے بہر حال خار چبھتے ہیں
مگر میں جبر سے تیرے گلاب کیوں دیکھوں

کوئی ضرور نہیں میرا عکس جڑ جائے
میں آئینے کی طرح سطحِ آب کیوں دیکھوں

نہ سلطنت کی ہے خواہش نہ تاج کی چاہت
میں داستانوں میں جادو کے باب کیوں دیکھوں

سفید اسپ کا شب میں عجب مقدر تھا
عقب میں فوج عدو سامنے سمندر تھا

میں ساری رات مچھیروں کے گیت سنتا رہا
اگرچہ شور ہوا کا بھی ساحلوں پر تھا

وہ اک پرانے زمانے کا قلعہ تھا جس پر
حصار ڈالے ہوئے اب بھی میرا لشکر تھا

فصیل خواب کے گمنام گوشے سے کل شب
میں گر گیا تو ترے راستے کا پتھر تھا

انا کے آئینے میں اپنے ٹوٹ جانے کا
میں خود ہی دیکھنے والا تھا خود ہی منظر تھا

یہاں بھی ریت کی دیوار اٹھا دی لوگوں نے
مرے مکاں کا وہ ٹوٹا دریچہ ہی در تھا

علی ظہیر

یہ چمک دھول میں تبدیل بھی ہو سکتی ہے
کائنات اک نئی تشکیل بھی ہو سکتی ہے

تم نہ سمجھو گے کوئی اور سمجھ لے گا اسے
خامشی درد کی ترسیل بھی ہو سکتی ہے

کچھ سنبھل کر رہو ان سادہ ملاقاتوں میں
دوستی عشق میں تبدیل بھی ہو سکتی ہے

میں ادھورا ہوں مگر خود کو ادھورا نہ سمجھ
مجھ سے مل کر تری تکمیل بھی ہو سکتی ہے

کاشارات کا آسان بھی ہو سکتا ہے
دل میں اک یاد کی قندیل بھی ہو سکتی ہے

اس قدر بھی نہ بڑھو دامنِ دل کی جانب
یہ محبت کوئی تمثیل بھی ہو سکتی ہے

ہاں دل و جان فدا کر دو ظہیر اس پہ مگر
یہ بھی امکان ہے تذلیل بھی ہو سکتی ہے

تم آؤ گے تو نئی محفلیں سجائیں گے
پھر ایک بار محبت کو آزمائیں گے

چراغ لائیں گے ہم پھر نئی دکانوں سے
ہوائیں روٹھ گئی ہوں تو پھر منائیں گے

بنائیں گے کسی مہتاب کو جبیں اپنی
اگر ملے کہیں سورج تو وہ بھی لائیں گے

اگر یقین ہو تم کو کہ ہے کوئی اپنا
پھر ایک بار یہ دستِ دعا اٹھائیں گے

ظہیر اپنی کہانی کے اب تو چرچے ہیں
کبھی یہ فکر تھی کیسے اسے سنائیں گے

یوں تو ہر چہرے پہ سو خاموش ویرانے لگے
غور سے دیکھا تو سارے لوگ افسانے لگے

آسماں پر جب نظر کی اجنبیت مٹ گئی
اور زمیں کو جب بھی دیکھا نقش بے گانے لگے

میں نے جب آئینہ دیکھا کاغذِ رنگیں لگا
جب نظر کی بازوؤں پر اجنبی شانے لگے

روز دہلاتا ہے جی کو خوفِ فوجِ اشقیا
کوئی تو اس وقت پہنچے شام جب آنے لگے

میں کھڑا تھا جس جگہ کچھ دیر اپنے واسطے
دکھ کے سارے راستے اس راہ سے جانے لگے

کب تلک اہلِ خرد کی احتیاطوں کا چلن
کچھ تو شکوہ ہو زباں پر ظلم جب چھانے لگے

ایم۔قمرالدین

(محترم احمد ندیم قاسمی کی نذر)

پھر اک الاؤ کی صورت ہر اک نظر میں رہوں
کبھی جو میں کسی بجھتے ہوئے شرر میں رہوں

یہ ذہن کا ہے تہیہ کہ اب سے تیغ میں ہی
یہ قلب کی ہے تمنا یوں ہی سپر میں رہوں

غلام[1] جو نہ رہوں میں، رہوں نہ آقا بھی
جو زیر میں نہ رہوں میں، نہ میں زبر میں رہوں

دکھائی دوں تجھے اس وقت جب ہو دھوپ کڑی
ہمیشہ سایہ ہی بن کر ہر ایک شجر میں رہوں

دعا ہے ختم جو ہو، اپنی زندگی کا سفر
میں اپنے شعروں سے شامل ترے سفر میں رہوں

مجھے بھی شوق رہا ہے، یہ مدتوں پہلے
رہوں کسی بھی طرح روز ہی خبر میں رہوں

شفق کے ساتھ رہے دور تک اجالا بھی
تو کوئی فرق نہیں شام یا سحر میں رہوں

1."As I would not be a slave,I would not be a master." Abraham Licoln.

(محترم وزیر آغا کی نذر)

سب کچھ وہی تھا شام میں، جو کچھ سحر میں تھا
وہ یوں کہ زندگی کا نظارہ نظر میں تھا

کل تھا زمین دوز، فلک بوس آج ہے
خود کو بدل کے، تخم جو میرے شجر میں تھا

دونوں کی پیش ہم رہے بے زور ہی فقط
کب زیر میں وہ زور نہ تھا جو زبر میں تھا

ظاہر نہیں رہا تھا، مگر ہم قدم رہا
ایک ایسا ہم سفر بھی ہمارے سفر میں تھا

کرتا بھی اور کیا جو نہ کرتا لغت کو بند
جو اس کے عیب میں تھا وہ اس کے ہنر میں تھا

ردِ عمل، کہ خود سے بھی ہم بے خبر ہوئے
کیسا طلسم آج کی تازہ خبر میں تھا

چکھنے سے پہلے جس میں تھی پیوست ہر نگہ
بے ذائقہ سا ذائقہ اس اک ثمر میں تھا

(برادرم شہپر رسول کی نذر)

نگاہ گل کی طرف تھی، نہ تھی ثمر کی طرف
یہ جب اٹھی تو اٹھی رہ گئی شجر کی طرف

خبر نہیں ہے زمانہ خبر چشیدہ ہے کیوں؟
لپکتے رہتے ہیں، ہم صبح سے خبر کی طرف

اس ایک لمحے کی مجھکو تلاش ہے کب سے
جو شام ہی کی طرف ہے نہ ہے سحر کی طرف

جب ایک عیب سے، اعزاز سارے مل جائیں
جھکے بھلا کوئی پھر کیوں کسی ہنر کی طرف

اک ان کی رسہ کشی سے ہے خوب منظر پیش
یہ زیر ہی کی طرف اور وہ زبر کی طرف

اس اک سفر میں کئی ہم سفر ہیں، جس کے بعد
مرے قدم نہ اٹھیں گے کسی سفر کی طرف

وہ اب تک آیا تھا اردو میں شہر کی جانب
وہ اب سے آئے گا ہندی میں "نئی شہر" کی طرف

پی پی سریواستو رند

دراز قامتی تیرا ہنر گیا آخر
جو قد کو میں نے بڑھایا تو سر گیا آخر
وہ جنگ جیت کے لوٹا تو لوگ پوچھتے تھے
لہو اچھالنے والا کدھر گیا آخر
کرے گا کون تعاقب اداس لمحوں کا
کہ جو علیل تھا مجھ میں وہ مر گیا آخر
جو ایک لفظ تڑپتا تھا میرے ہونٹوں پر
وہ کرب بن کے لہو میں اتر گیا آخر
طلسم توڑ کے احساس وفکر و خواہش کا
یہ کون روح کو بیدار کر گیا آخر
مجھے جنون تھا تاروں کو توڑ لانے کا
مگر میں خود ہی خلا میں اتر گیا آخر
تمام عمر کے دکھ سکھ کو بانٹ کر اے رند
مرا نغیم مرے ساتھ مر گیا آخر

کہر کی چادر، سیہ طوفاں کا خطرہ اور میں
بادبانی کشتیاں خوابوں کا دریا اور میں
کیسے حل ہوتا انا کا مسئلہ تھا اور میں
بے تعلق ہی رہا یہ جسم میرا اور میں
ہر طرف شمشان میں شمشان کے شعلوں کا رقص
شہر پر آشوب کا منظر الگ تھا اور میں
صبر و استقلال کی دولت سے مالا مال تھے
دل مرا درویش کے حجرے کا کاسہ اور میں
کچھ عجب سرگوشیوں کی بھیڑ میرے آس پاس
دور تک خاموش تنہائی کا صحرا اور میں
ان گنت جگنو لہو میں تیرتے ہوں جس طرح
ساتھ اس کے رات کا عالم عجب تھا اور میں
عمر بھر اے رند دونوں گفتگو کرتے رہے
ایک منظر زیست کا آدھا ادھورا اور میں

اوڑھ کر حادثوں نے تاج مرا
زندگی سے لیا خراج مرا
یہ رتیں کیوں بدلتی رہتی ہیں
صرف اتنا ہے احتجاج مرا
میں تو تنہائیوں کی محفل ہوں
مجھ میں پلتا ہے اک سماج مرا
کرب کی اک لپٹ بھی مرا وجود
اور سکوں لمس بھی مزاج مرا
دکھتے لمحوں پہ پتیاں رکھ کر
موسموں نے کیا علاج مرا
دودھیا صبح کا حسیں سورج
راستا دیکھتا ہے آج میرا
حال کا کیا ہے حال تو اے رند
کل نہیں ہوگا جو ہے آج مرا

خورشید طلب

سبب اس کی پریشانی کا میں ہوں
نمک کی فصل وہ، پانی کا میں ہوں
یہ جنگل مجھ کو راس آتا نہیں ہے
پرندہ دشتِ امکانی کا میں ہوں
مری مشکل، مری مشکل نہیں ہے
وسیلہ تیری آسانی کا میں ہوں
مجھے دنیا لٹا دے گی کوئی دن
اثاثہ عالمِ فانی کا میں ہوں
ابھی ساحل مرا رستہ نہ دیکھے...
ابھی دریا کی طغیانی کا میں ہوں
وہیں مجھ کو سپردِ خاک کرنا
کہ جس خاک بیابانی کا میں ہوں
اگا ہوں دستِ گل میں خار بن کر
نتیجہ قہر سامانی کا میں ہوں
مرے ہونے کا کچھ مطلب نہیں ہے...
تو کیا بے کار، بے معنی کا میں ہوں
فقیرانہ طبیعت کا ہوں ورنہ
طلب حق دار سلطانی کا میں ہوں

قصور وار ہو تم تو خطا ہماری بھی ہے
دیے بجھانے میں شامل ہوا ہماری بھی ہے
ہمیں بھی زیبِ سماعت کبھی بنایا جائے
ان ہی فضاؤں میں بکھری صدا ہماری بھی ہے
بہت عزیز ہمیں تیری دوستی ہے مگر
اگر غرور ہے تجھ میں انا ہماری بھی ہے
ہمارے پاس بھی جلتے ہوئے سوال ہیں کچھ
فقیہہ شہر سے کچھ التجا ہماری بھی ہے
کسی نے دل پہ مرے ہاتھ رکھ کے پوچھا تھا
تری بہشت میں کیا کوئی جا، ہماری بھی ہے
ہم اس زمین سے کس طرح بے دخل ہو جائیں
اسی زمین کے اندر غذا ہماری بھی ہے
کہاں سے لائیں ہم اپنے مزاج میں نرمی
زمینِ سخت کی نشو و نما ہماری بھی ہے
ہر ایک آنکھ میں خود کو تلاش کرتے ہیں
ابھی شناخت طلب گم شدہ ہماری بھی ہے

علامت گونجنے والی، اشارہ بولنے والا
غزل کو چاہیے اب استعارہ بولنے والا
بہت اچھا لگا اس بار جھیلوں کا سفر مجھ کو
کہیں سے آ گیا تھا اک شکارہ بولنے والا
خموشی اور گہری اور گہری ہوتی جاتی ہے
ہوا جاتا ہے چپ اک اک ستارہ بولنے والا
میں ہنستے بولتے ماحول کا عادی ہوں بچپن سے
مجھے تو چاہیے ہر پل نظارہ بولنے والا
کسی جگنو کے پیچھے آج کل پاگل ہے سنتے ہیں
ہمیشہ مجھ کو اپنا چاند تارہ بولنے والا
یہ میرا دکھ بھی پنجرے میں کھلے اس پھول جیسا ہے
جسے کوئی نہیں آ کر ہمارا، بولنے والا
تم ان پہ گولیاں برساؤ کہ میزائلیں داغو
کہاں اب راکھ میں کوئی شرارہ بولنے والا
مری شہرت ہے میرے ساتھ لیکن خوش نہیں رہتی
طلب میں ہوں منافع کو خسارہ بولنے والا

اشہر ہاشمی

یہاں ہونا نہ ہونا ایک جیسا ہوتا جاتا ہے
رواں پانی میں جیسے عکس دھندلا ہوتا جاتا ہے

ہوا جس شام اس کا جسم چھوتی ہے تجھے چھو کے
وجودِ شوق خوشبو کا سراپا ہوتا جاتا ہے

دعائیں ہچکیاں بن جاتی ہیں ہونٹوں تک آتے ہی
تمہارا نام بھی لینا گراں سا ہوتا جاتا ہے

بہت سے پھول، شیرنی، دعائیں اس کی چوکھٹ پر
خموشی سے کوئی رکھ کر ستارہ ہوتا جاتا ہے

کسی کا نام لکھا ہے، نہ ہے کوئی پتہ اس پر
مگر اک خط کسی گھر کا شناسا ہوتا جاتا ہے

تماشہ ہے کہ دل کی بات ہونٹوں تک نہیں آتی
مگر اس کا دھڑکنا ایک نغمہ ہوتا جاتا ہے

یہ برسوں بعد اشہر ہاشمی کا پھر غزل کہنا
طبیعت میں روانی کا اشارہ ہوتا جاتا ہے

اشہر ہاشمی

کیا ہے جو یہ شب بیداری ہوتی ہے
رات تو ہر بیمار پہ بھاری ہوتی ہے

سب سے جھوٹ کے وقت طاری ہوتی ہے
خود سے ملنے کی تیاری ہوتی ہے

شہر میں سورج دیر سے ڈھلتا ہے، لیکن
رات بڑی شدت سے طاری ہوتی ہے

لمس ولایت دے جاتا ہے، نیکوں کو
مجھ سے بد کی قسمت خواری ہوتی ہے

اس کے پیچھے ہوتا ہے ہیجان بہت
جو صورت جذبات سے عاری ہوتی ہے

گلشن کھنہ

بغض و حسد کی آگ میں انسان جل گئے
بجلی گری کچھ ایسی کہ کھلیان جل گئے

نفرت میں آتما کی نفی اس طرح نہ کر
کیا پھول بچ سکیں گے جو گلدان جل گئے

جلنا تو دھوپ میں تھا مقدر پہ غم یہ ہے
ہم تیرے آستاں پہ مری جان جل گئے

کھیتوں میں میرے دیکھ کے گندم کی بالیاں
اپنے لہو کی آگ میں دہقان جل گئے

اتنے ستم ہوئے ہیں وفاؤں کے نام پر
جتنے تھے میرے دل میں وہ ارمان جل گئے

افسوس زندگی میں خوشی ہے نہ خوش دلی
اس دور میں یقین کے فرمان جل گئے

گلشن ہمارے باغ میں کیسی لگی یہ آگ
پھولوں کے ساتھ ساتھ دل و جان جل گئے

ارشد کمال

راستے ہر طرف، گھر ہی ہر طرف
روشنی میں بسی تیرگی ہر طرف
ایک دریا اُبلتا ہوا چار سو
العطش کی صدا گونجتی ہر طرف
شہر آشوب دل میں سمایا، مگر
فاختہ گفتگو میں اُڑی ہر طرف
خامشی میں تپش، گفتگو میں شرر
رقص میں آتشیں زندگی ہر طرف
ساعتوں کا سمندر اُمنڈتا ہوا
ناؤ کاغذ کی بہتی ہوئی ہر طرف
گفتگو نے بہت سرکھپایا، مگر
رقص کرتی رہی خامشی ہر طرف
ایک ہیجان سا ہے مری ذات میں
ورنہ دنیا میں ہے آشتی ہر طرف

اک لفظ آ گیا تھا جو میری زبان پر
چھایا رہا نہ جانے وہ کس کس کے دھیان پر
مجھ کو تلاش کرتے ہو اوروں کے درمیاں
حیران ہو رہا ہوں تمھارے گمان پر
محفل میں دوستوں کی، وہی نغمہ بن گیا
شب خون کا جو شور تھا میرے مکان پر
شاید مری تلاش میں اُتری ہے چرخ سے
جو دھوپ پڑ رہی ہے مرے سائبان پر
بے شک زمیں ہنوز ہے اپنے مدار میں
لیکن دماغ اس کا تو ہے آسمان پر
میری خموشیوں میں تکلّم کی بازگشت
کیا ہرج ہے جو قفل لگا ہے زبان پر
احساس اُس کا، جامۂ اظہار مانگے ہے
افتاد آ پڑی ہے یہ ارشد کی جان پر

مجھے وہ کھیل تماشا دکھائی دیتا ہے
کہیں بھی کوئی جو ہنستا دکھائی دیتا ہے
ہر ایک شعبۂ ظلمت کو، ڈھلتے سورج کی
کرن کرن میں سویرا دکھائی دیتا ہے
بجز ہمارے، مداوا کوئی نہیں اس کا
غریب دشت جو تنہا دکھائی دیتا ہے
'وہ آ رہا ہے کہ اُس کا خیال آیا تھا'
ہر ایک سمت اُجالا دکھائی دیتا ہے
یہ مانا دھند میں لپٹی ہے زندگی، لیکن
قدم بڑھاؤ تو رستہ دکھائی دیتا ہے
سُلگتا دشت ہے وہ اپنی اصل میں، لیکن
ہماری پیاس کو دریا دکھائی دیتا ہے
امیرِ شہر کے دامن کو کیا ہوا ارشد
کہ سامنے سے دریدہ دکھائی دیتا ہے

نقشبند

ابھی تک جانب منزل کوئی رستہ نہیں نکلا
کہ جیسے پاؤں سے میرے ابھی کانٹا نہیں نکلا

تمناؤں کے سوکھے کھیت بھی سیراب ہو سکتے
کسی کی آنکھ سے ایسا کوئی دریا نہیں نکلا

کہیں ایسا نہ ہو اک تیر بے موسم ادھر آئے
اک عرصے بعد بھی دل سے یہ اک کھٹکا نہیں نکلا

زمانے کے کمال قادر اندازی پہ حیراں ہوں
لگا جو تیر دل میں وہ کبھی ترچھا نہیں نکلا

لگاتا ہوں قبائے زیست میں پیوند پے در پے
یہ وہ گدڑی ہے جس میں سے کوئی ہیرا نہیں نکلا

یہ کیسی بزم رنگیں تھی سبھی تھے آشنا لیکن
ہجوم دوستاں میں بھی کوئی اپنا نہیں نکلا

نقیب فصل گل جس کو یقیں کے ساتھ کہہ سکتے
ابھی تک شاخ حسرت پر وہ اک پتہ نہیں نکلا

(قمر نقوی ۔ تلسا، امریکہ)

جگدیش پرکاش

زیست کے تنہا سفر کو کارواں تو چاہئے
کوشش پرواز کو اک آسماں تو چاہئے

جس بلندی سے اتر کر ہم زمیں پر آگئے
اس بلندی پر ہمارا اک نشاں تو چاہئے

ہے بہت کچھ مجھ کو کہنا پر کوئی کہنے تو دے
آخر اپنی بات کہنے کو زباں تو چاہئے

فاصلے در فاصلے ملتے رہے ہر گام پر
عشق کو اہلِ وفا کا امتحاں تو چاہئے

یوں تو کٹنے کے لئے کٹ جائے گا یہ وقت بھی
بانٹنے کو درد دل اک رازداں تو چاہئے

آؤ میرے پاس میری خامشی کا ساتھ دو
میری تنہائی کو کوئی مہرباں تو چاہئے

جگدیش پرکاش

صحن سے دھوپ کا درویش جب گزرتا ہے
سلامتی کی دعا آسمان کرتا ہے

بدلنے لگتا ہے کروٹ کچھ آسماں ایسے
کہ ماں کی گود میں بچہ کوئی مچلتا ہے

محاوروں کی طرح مجھ کو مت برت اتنا
مری زبان بھی اردو ہے کیا سمجھتا ہے

نکال کچھ بھی معانی تو میری باتوں کے
میں ایسا شخص نہیں جو بیاں بدلتا ہے

میں سوچ کر نہیں لکھتا کبھی کلام اپنا
کہ میری بات کا مفہوم کیا نکلتا ہے

یہ سرحدوں میں بٹے لوگ سوچ کر دیکھیں
خلوص کا بھی کہیں راستہ نکلتا ہے

نظام بدلے نہ بدلے، تم اپنا دل بدلو
کہ دل کے ساتھ زمانے کا دل بدلتا ہے

جعفر ساہنی

لگائے ٹاٹ میں مخمل زرالی
یہ دنیا آج ہے پاگل زرالی
قدم کو چاپ منزل اُچھالے
تلاشو یار وہ دلدل زرالی
سکوں حد سے گزر کر پوچھتا ہے
کہاں گم ہوگئی ہلچل زرالی
دلاسے کا سبب بنتی رہی ہے
تپش کے گھر میں اک چھاگل زرالی
بنے گی ایک دن چہرہ بدل کر
بہت رنگیں زمین چنچل زرالی
کھلی کھڑکی سے مل کر خوش ہوئی ہے
سفیرِ گل ہوا کومل زرالی
نشہ روشن جہاں کا دے گئی ہے
اندھیرے میں کھلی بوتل زرالی
توقع کو نگل جاتی ہے اکثر
جہانِ سنگ کی موسل زرالی
خزاں کا دم معاً گھٹنے لگا ہے
نظر میں آگئی کونپل زرالی
ذرا سوچو تو چپ کیوں ہوگئی ہے
وہی چڑیا جو تھی چنچل زرالی
صدارت میں کبھی سورج کی جعفر
سنائے گا غزل بادل زرالی

جعفر ساہنی

کہاں تک وہ حقیقت مانتے ہیں
محبت کی نظر پہچانتے ہیں
شکم کی آگ کا یہ سانحہ ہے
قدم دو چار چل کر ہانپتے ہیں
ہمیشہ ڈھونڈ لیتے ہیں تمنا
کسی کا منہ کبھی ہم تاکتے ہیں
کھلی سڑکوں کا قصہ لکھ رہے ہو
سراسیمہ گلی کیوں جھانکتے ہیں
قناعت سے رہی یاری ہماری
زمانے سے کبھی کچھ مانگتے ہیں
قدم بے ربط سے ہونے لگے تھے
پھٹے جوتے کو کب تک ٹانکتے ہیں
ہمیں پیوند ہونا خاک کا ہے
مگر لگتا ہے جیسے جانتے ہیں
بہت مجبور جعفر ہوگئے ہیں
تری باتیں کبھی وہ ٹالتے ہیں

ظفر عدیم

کون اندھیروں میں تھا، کون اجالوں میں تھا
آپ خوابوں میں تھے، میں خیالوں میں تھا

ریشمی چھت نہ جانے کہاں لے گیا
وہ پڑوسی جو مکڑی کے جالوں میں تھا

اپنے حصّے کی لیتا میں کس سے بہار
شاخ کانٹوں میں تھی، پھول بالوں میں تھا

شیریں لب سے تراشی گئیں تلخیاں
ذکر میرا جو، اُن کے حوالوں میں تھا

استعاروں میں بھی یاد کرتے نہیں
وہ بھی دن تھے کبھی جب مثالوں میں تھا

دیکھ کر دل کو تھامے رہی رہ گزر
آنے والا پھر اُن جانے والوں میں تھا

خالی دامن کسی نے نہ دیکھا عدیم
چاندنی تھی مگر میں تو ہالوں میں تھا

پروین شیر

مقتل سے جب گزر کے حریفانہ آیئے
اک دشتِ بے کنار میں پھر گھر بنایئے

چہروں کی قید سے ہوئے آزاد گر کبھی
بکھرے ہوئے وجود کو کیسے بچایئے

ہونے نہ پائے پھولوں کا محتاج گلستاں
دل کے ہزار زخم ہمیشہ کھلایئے

تاریک ہونہ پائے کبھی دامنِ فلک
پلکوں پہ تا بہ صبح ستارے جلایئے

ساحل نہ دے سکا جو سہارا تو کیا ہوا
گرداب کو اسیرِ سفینہ بنایئے

عذابِ جاں ہوا پست قدوں کے شہر میں آنا
سرِ آئینہ خانہ خواب کے شیشے بکھر جانا
میں وہ طائر کہ ہے پرواز جس کی مستقل جاری
تلاشِ لامکاں میں کہکشاں کے پار ہے جانا
کہاں وہ چل دیئے ہیں قافلے ڈھونڈیں کہاں ان کو
نہ ہے گردِ سفر باقی نہ رستہ جانا پہچانا
تمناؤں کی شورش ہے تو اے شوریدہ خاطر اب
شکستہ ہی سہی اک آئینہ تو ڈھونڈ کے لانا
اسے اب سادگی کہیئے کہ حدِ عاشقی کہیئے
ترے ہاتھوں میں جو پتھر تھے ان کو پھول ہی جانا

ملال کیا ہے اگر ہجر کے عذاب ملے
نئی رتوں کے مجھے کیکٹس سے خواب ملے
شکستہ دل میں ہے اک کیفیت چراغاں سی
افق پہ نقش بناتے کئی شہاب ملے
یہ شہر دن میں بھی تاریکیوں میں ڈوبا ہے
ہجومِ یاس میں گہنائے آفتاب ملے
تباہ کاریِ نیرنگیِ سراب یہ ہے
بلا کی شکل میں ہر ایک موجِ آب ملے
شریکِ بزم وہ فن کار بھی نظر آئے
جو دل میں خار لئے صورتِ گلاب ملے
بہار آئی ہے یادوں کے خشک پودوں پر
بجھی سی آنکھوں کو پھر نور کے گلاب ملے
کبھی یہاں بھی پرند آشیاں بنائے گا
شجر کی آنکھوں کو ہر رت میں ایسے خواب ملے
بچاؤ کی بھی تدبیر کارگر پائی
ہر ایک شیشے کو پتھر کی اک نقاب ملے
چلو تلاش کریں ایسی سرزمینوں کو
جہاں بہ قدرِ جنوں رحمتِ سراب ملے

وفا سکندر پوری

سبھی کو آزمانے جا رہا ہے
وہ اپنا ڈر مٹانے جا رہا ہے
نیا سامان لایا ہے مداری
نیا کرتب دکھانے جا رہا ہے
چھپی جاتی ہے منزل گرد وہ میں
مسافر خاک چھانے جا رہا ہے
دہائی دے رہا ہے تیر اس کا
کماں ڈھیلی ہے تانے جا رہا ہے
دیا بھی کس نشے کی جھونک میں ہے
ہوا میں لڑکھڑانے جا رہا ہے
ملی ہے دعوت تقریر اس کو
سنے گا کیا سنانے جا رہا ہے
نہ راس آیا اسے دو لخت آنگن
نئی دیوار ڈھانے جا رہا ہے
وفا دل سے نہیں بہتر کوئی جا
کہاں غم کو چھپانے جا رہا ہے

دو دن کی زندگی کا بھروسہ نہیں کیا
ستر برس کی عمر پہ تکیہ نہیں کیا
در بند کرلیا پہ دریچہ نہیں کیا
محفوظ ہر لحاظ سے کمرہ نہیں کیا
ہر آئینہ انا سے کنارا انہیں کیا
ہر آن اپنے آپ کو چھوٹا نہیں کیا
ایسا نہیں کہ تیری وہ آنکھیں نہیں رہیں
میں نے ہی تیرے ساتھ گزارہ نہیں کیا
اوروں کے بام و در تو منور کیے مگر
اپنے ہی گھر میں اس نے اجالا نہیں کیا
آنکھوں نے بوند بوند کو زنجیر کرلیا
دامن کا ایک تار بھی گیلا نہیں کیا
سورج نمود شام سے ملتے ہوئے گیا
اس نے خیال شب بھی گوارہ نہیں کیا
حتی الوسع لحاظ کیا شعر گوئی کا
شعروں کے ساتھ میں نے تماشا نہیں کیا

دل اگر خوشیوں سے عاری ہے تو ہے
لمحہ لمحہ مجھ پہ بھاری ہے تو ہے
عاریت کی مے تو پی سکتا نہیں
شوق پر سکرات طاری ہے تو ہے
کیا ضروری ہے کہ جاگوں رات بھر
موسم اختر شماری ہے تو ہے
روبرو کچھ بات تو ہوتی نہیں
گفتگو خطبوں میں جاری ہے تو ہے
لوگ کیوں ہیں اس نظر کے برخلاف
میرے دل پر چاند ماری ہے تو ہے
کس کے بس میں ہے بھلا شک کا علاج
یوں ہی دل میں بے قراری ہے تو ہے
میں نبھاتا جاؤں گا رسم وفا
مجھ پر ہی پہ ذمہ داری ہے تو ہے

ڈاکٹر منور احمد کنڈے

ہر طرف شور ہے سانسوں کا مکاں کے باہر
کوئی نکلے گا ابھی شعلۂ جاں کے باہر

یہ تو سب اُس کے وزیروں کا بیاں ہے ورنہ
ایک ہنگامہ ہے ایوانِ گماں کے باہر

جب نہیں ہے مری آنکھوں میں کوئی بھی شے پھر
بھیڑ کیسی ہے محبت کی دکاں کے باہر

زیر ہوتی ہے خدائی کے ہدف کی عظمت
تیر نکلے ہیں دعاؤں کی کماں کے باہر

سچ تو یہ ہے کہ وہیں پر ہیں جہاں تھے سب ہی
لوگ نکلے ہی نہیں اپنے جہاں کے باہر

دشمنی وقت کی ہے سب سے منور اب کے
پاؤں رکھے نہ کوئی شہرِ اماں کے باہر

جب سے نشانِ راہ گذر خاک ہو گیا
دل کی زمیں پہ ایک نگر خاک ہو گیا

سانسوں کے راستے سے چلی آئی پھر ہوا
پھر آسمانِ قلب و جگر خاک ہو گیا

اک اور روح جسم سے پرواز کر گئی
اس شہر کا اک اور بشر خاک ہو گیا

نقش و نگار کھو گئے گرد و غبار میں
آندھی چلی تو حسنِ نظر خاک ہو گیا

چلتا ہوا زمیں پہ منوّر مجسمہ
پیکر تھا جسم و جاں کا مگر خاک ہو گیا

کبھی غموں کی قبا ہے کبھی خوشی کا لباس
رُتوں کے ساتھ بدلتا ہے زندگی کا لباس

وہی ہے جیب وہی آستاں وہی داماں
ہے ایک جیسا زمانے میں ہر کسی کا لباس

نہاں ہے خوف کا سایہ ہزار رنگوں میں
الگ نہیں ہے درندوں سے آدمی کا لباس

مرے مکان کا دالان جگمگاتا ہے
پہن کے آیا ہے یہ کون چاندنی کا لباس

یہ کہہ رہی ہے منور کوئی غزل تم سے
جہاں میں سب سے انوکھا ہے شاعری کا لباس

جمیل ظہیر

مجھے دیکھو نہ ازراہِ ترحم
جنوں میرا نہ ہو جائے کہیں گم

کمالِ اشتراکِ جذبۂ دل
بتائے گا نہ میں، میں ہوں نہ تم، تم

نتیجہ نا مساعد حالتوں کا
محبت دو دلوں کا ہے تصادم

نظامِ گردشِ دوراں ہے پردہ
خلش ہے خارِ حسرت کا تبسم

گلہ نا قابلِ تحسیں ہے لیکن
صدائے بازگشت اس کی ترنم

اُسے پانا بھی آخر حادثہ ہے
کوئی ہوتا ہے جس کے واسطے گم

بلاوے آرہے ہیں آدمی کو
کہ خود گم ہیں چراغِ ماہ و انجم

جمیل ظہیر

آدمی مر کے بھی اک جزوِ تحیر رہ گیا
جب بصیرت کھو گئی، عکسِ تصور رہ گیا

وقت کے طولِ سفر میں ہر خوشی گم ہو گئی
وسعتیں ہوتی ہیں غم میں اک تاثر رہ گیا

وقت اور حالات فطرت کو بدل دیں کیا مجال؟
دل کے ٹوٹے ساز میں مخصوص اک سُر رہ گیا

لطف تو پہلے دیا، ہر جذبۂ دل نے، مگر
چند لمحوں کے لئے پھر اک تکدر رہ گیا

قصر ارمانوں کا ہو کر منہدم کچھ کم نہیں
منتشر اجزا ہوئے، ہر ایک عنصر رہ گیا

ردّوکد کے مرحلے ہیں عیش و غم کے فیصلے
اک تاثر مٹ گیا اور اک تاثر رہ گیا

آدمی کی بے نیازانہ روش کے باوجود
غیر واضح حادثوں کا اک تواتر رہ گیا

اب اچھوتا جذبۂ دل دکھ یہ دیتا ہے جمیل
تشنۂ تکمیل اظہارِ تفکر رہ گیا

گوہر جمالی

آنکھ سے ٹپکا تھا غم میں جو کبھی قطرا نیا
پھیل کر وہ بن گیا دھرتی پہ ایک دریا نیا

تتلیاں جب گاؤں کی شہروں میں پھیلاتی ہیں پر
جا بجا مکھڑے بھی بُننے لگتے ہیں جالا نیا

شب کے سناٹے میں روتا ہے اگر کتا کوئی
دل کے گوشے میں جنم لیتا ہے اک خدشا نیا

پتھروں کے لمس سے پتھر کے جیسا ہو گیا
اب ہتھیلی پر کوئی اُگتا نہیں چھالا نیا

مجھ کو جیتے جی رہی اک ایسے آزر کی تلاش
اپنے فن سے جو عطا کر دے مجھے چہرا نیا

لگتا ہے دھرتی پہ کوئی انقلاب آنے کو ہے
آسماں سے ٹوٹتا ہے جب کوئی تارا نیا

مجھ کو یہ معلوم ہے تعبیر اس کی کچھ نہیں
دیکھتا ہوں پھر بھی گوہرؔ روز اک سپنا نیا

جمشید علی

لگتا تو ہے کہ ہے کوئی ہوتا نہیں کوئی
ان آہٹوں کا واقعی چہرا نہیں کوئی

اب جو بھی ہو قبول ہے جیسا بھی ہو درست
تجھ سے بچھڑ کے دل میں تمنا نہیں کوئی

ہر شخص اپنی دھن میں مگن سب سے بے نیاز
آواز بھی لگاؤ تو سنتا نہیں کوئی

میں بھی تنا اپنے آپ میں سمٹوں تو کیا کروں
اپنے حصار سے تو نکلتا نہیں کوئی

یا تو میں اپنے آپ کو واضح نہ کر سکا
یا پھر میرے مزاج کو سمجھا نہیں کوئی

دیوار و در پہ خواب سجانے سے فائدہ
آنگن میں چاند سے تو اترتا نہیں کوئی

جمشید علی

شباب کھو کر وطن کو لوٹا تو یہ سماں تھا
گلی گلی نے بچھڑ کے پوچھا کہ تو کہاں تھا

رکا تو گاؤں کا ایک تالاب بن کے سوکھا
چلا تو چھوٹی زمین، محدود آسماں تھا

اگرچہ ہے شہر دیکھا بھالا مگر یہ سچ ہے
کہ جب بھی نکلا تو ہر طرف اک نیا جہاں تھا

ادھر کئی روز ہو گئے پھر اداس ہوں میں
لگے ہے جیسے وہ کھو گیا جو متاعِ جاں تھا

ہوئے ہیں اب لاعلاج لیکن یہ سوچتے ہیں
علاج اپنے دکھوں کا شاید ترے یہاں تھا

نسرین نقاش

پتھروں کے شہروں میں بولتا نہیں کوئی
گنگ ہیں زبانیں کیوں سوچتا نہیں کوئی

ہم میں زندہ رہنے کا عزم ہی نہیں ورنہ
موت کے سمندر میں ڈوبتا نہیں کوئی

شہر کی فضاؤں میں شور ہے قیامت کا
لوگ یہ سمجھتے ہیں سانحہ نہیں کوئی

دہشتوں کی بستی میں پاؤں تیز چلتے ہیں
اب تو گھر سے مرگھٹ تک فاصلہ نہیں کوئی

خوش نما لباسوں پر سب کی نظریں جمتی ہیں
آنکھ کے دریچوں میں جھانکتا نہیں کوئی

خامشی کے خنجر سے لفظ لفظ زخمی ہیں
خامشی کے خنجر کو توڑتا نہیں کوئی

تم جو توڑ سکتے ہو توڑ کر نکل جاؤ
ظلم کے حصاروں میں راستہ نہیں کوئی

شاہد پٹھان

زندگی کا نشان کب دے گا
بے گھروں کو مکان کب دے گا
تو غنی بھی ہے تو سخی بھی ہے
میری غربت پہ دھیان کب دے گا
بے پر و بال ان پرندوں کو
عرش منزل اڑان کب دے گا
میرے اسلاف کو جو حاصل تھی
مجھ کو وہ آن بان کب دے گا
میرے ملک عزیز کو یارب!
معتبر پاسبان کب دے گا
قتل و غارت گری کے صحرا میں
امن کا سائبان کب دے گا
مضطرب آرزو ہے سینے میں
درد دل کو زبان کب دے گا
میرا شاہد ہے خود مرا قاتل
میرے حق میں بیان کب دے گا

شاہد پٹھان

نئے پیکر نئے طرز ہنر سے
غزل ہم لکھتے ہیں خون جگر سے
محبت میں جو ٹپکیں چشم تر سے
وہ آنسو کم نہیں ہوتے گہر سے
یہ کیسا سانحہ گزرا ہے یارب
ٹپکتا ہے لہو دیوار و در سے
ہمیں معلوم ہے شاہوں کی فطرت
انہیں پر خاش ہے اہل ہنر سے
بتاتا ہے ہمیں کچھ راز ہستی
وہ اک پتا جو ٹوٹا ہے شجر سے
حقیقت تجھ سے اپنی کیا چھپاؤں
تو واقف ہے مرے عیب و ہنر سے
عجب ہیں رنگ ڈھنگ ان مہوشوں کے
زباں کا کام لیتے ہیں نظر سے
مسلسل امتحان جسم جاں ہیں
میں واقف ہوں وفا کی رہ گزر سے
اگر کچھ ہوش رکھتا ہے زمانہ
نہ الجھے شاہد آشفتہ سر سے

امتیاز احمد دانش

تمام عمر کئی خود کی جستجو کرتے
ہم اپنے چاک گریباں کو کیا رفو کرتے

شکار ہم بھی اندھیروں کے ہو ہی جاتے اگر
چراغ غم کو ہواؤں کے روبرو کرتے

رہ حیات میں اب ٹھوکریں ہی حاصل تھیں
نحیف جسم کو کب تک لہو لہو کرتے

یہ اختیار بھی حاصل نہ تھا ہمیں ورنہ
خود اپنی موت کا اعلان چار سو کرتے

ہمارے دل میں یہ حسرت ہی رہ گئی اب تک
کسی کی ہم کبھی تکمیل آرزو کرتے

یہ اپنے ذہن کا شاید فتور تھا دانش
یہ چاند تارے بھلا ہم سے گفتگو کرتے

سلیمان خمار

وہ کبھی مجھ کو شکستہ نہیں ہونے دے گا
ایک چہرہ مجھے بوڑھا نہیں ہونے دے گا
چاند بن کر وہ مرے ساتھ رہے گا ہر دم
میری راہوں میں اندھیرا نہیں ہونے دے گا
ہر خوشی اپنی لٹائے گا وہ میری خاطر
اور اس کا کبھی چرچا نہیں ہونے دے گا
مجھ کو ہر بات بتائے گا وہ سرگوشی میں
یوں ہواؤں کو وسیلہ نہیں ہونے دے گا
اس کو تو میری شرارت ہی بھلی لگتی ہے
وہ کبھی مجھ کو فرشتہ نہیں ہونے دے گا
اپنے سر لے گا وہ الزام وفا کے سارے
اور مرے نام کو رسوا نہیں ہونے دے گا
وہ نہ بدلے گا کبھی عشق کا قبلہ ہرگز
دل کے کعبے کو کلیسا نہیں ہونے دے گا
فتنے جیسے بھی ہوں جھکنے نہیں دے گا مجھ کو
شر کی دہلیز پہ سجدہ نہیں ہونے دے گا
لانگھ پایا نہ کوئی اس کی انا کی سرحد
اس جزیرے پہ وہ قبضہ نہیں ہونے دے گا
ایک میٹھی سی کسک بھی ہے مرے ساتھ اس کی
ختم وہ درد کا رشتہ نہیں ہونے دے گا
وہ مصیبت میں مرا ساتھ نہ چھوڑے گا خمار
غم کے جنگل میں اکیلا نہیں ہونے دے گا

بغض ہے یا عناد ہے کیا ہے؟
تیرے دل میں فساد ہے کیا ہے
ہر طرف بورہا ہے اندھیارے
تو اماوس نژاد ہے کیا ہے
اب یہ لہجہ یہ گفتگو تیری
دشمنی ہی مراد ہے کیا ہے
خیر کے نام پر یہ شر تیرا
اک نیا اجتہاد ہے کیا ہے
ہے فضاؤں میں انتشار کی بو
یہ ترا اتحاد ہے کیا ہے
دل میں نفرت زباں پہ پیار کی بات
یہ جو تجھ میں تضاد ہے کیا ہے
زندگی کی کتاب میں تیری
بس یہی کچھ مواد ہے کیا ہے
ساتھ چلنا ہے ہم کو منزل تک
یا یہیں خیر باد ہے کیا ہے
زیست کہتے ہیں آج جس کو خمار
اک مسلسل جہاد ہے کیا ہے

پانیوں کی چٹان سے نکلا
راستہ بادبان سے نکلا
بھید اس کے تمام جرموں کا
اس کی گونگی زبان سے نکلا
کوئی نفرت سی آنکھ سے نکلی
زہر سا کچھ زبان سے نکلا
چھاؤں جیسا وہ شخص بھی آخر
دھوپ کے خاندان سے نکلا
اک گھنیرا غبار الجھن کا
فکر کے کاروان سے نکلا
اک نیا فلسفہ، نیا مفہوم
لفظ کے سائبان سے نکلا
کس کی یاد آگئی کہ ذہن خمار
جسم وجاں کی تکان سے نکلا

جناب سلیمان خمار کو کرناٹک اردو اکادمی نے اگست 2006 میں اس سال کا ایوارڈ برائے شاعری پیش کیا ہے جو مومنٹو، سپاس نامہ اور دس ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ ادب ساز اس پر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔

سہیل اختر

ہم اس ہنر میں ہوئے پھر لہولہان بہت
کہ کشتِ فن جو تھی درکار زعفران بہت

یہ اک فلک جو ہے ظالم پرندے، غم کیسا؟
ابھی اڑان کو باقی ہیں آسمان بہت

وہ اک جزیرہ ہواؤں کے رخ پہ تھا ہی نہیں
بدل کے دیکھ لئے ہم نے بادبان بہت

جہاں ہمارے لئے اور ہم جہاں کے لئے
وہ سنگ دل ہے تو ہیں ہم بھی سخت جان بہت

سنا ہے وہ مرے نزدیک رہنا چاہتا ہے
مرے محلے میں خالی بھی ہیں مکان بہت

اگرچہ لفظ ہر احساس بن نہیں پاتا
وہ لمس پھر بھی مگر تشنۂ بیان بہت

بہت سکون ہے اوپر بھی اور نیچے بھی
مگر یہ شور عجب سا ہے درمیان بہت

بنا دیا ہے مہا بھارتوں کا عادی سا
مگر ہے پھر بھی یہ بھارت مرا مہان بہت

کرن ہوں چاہوں نہ تیرگی سے میں وصل کوئی
سیاہ گرداب سی مجھے کھینچے شغل کوئی

ہمارے بھی فیصلے وہ کرتا ہے خود ہی لیکن
ہمیں ہی احکام کی نہ بھیجے وہ نقل کوئی

جو ہے گنہ گار ہم بھی ماریں گے اس کو پتھر
یہ شرط لیکن پہل کرے ہم سے قبل کوئی

ہماری پیچیدگی سے آخر ہو کیوں پریشاں
ملی ہے کب زندگانی بھی ہم کو سہل کوئی

انہیں نہ چھیڑیں گے ہم مگر ہے یہ شرط اپنی
وہ دے نہ اپنے معاملے میں بھی دخل کوئی

یہ کن جہانوں کی سیر کی تھی جنوں کے ہمراہ
وہاں تک اب تو نہیں پہنچتی ہے عقل کوئی

دلوں سے دل ملنے کے وہ موسم نہ آئیں شاید
مگر اگے اب نہ نفرتوں کی بھی فصل کوئی

نہ کر سکے بے گناہیاں اپنی ثابت اختر
کے توقع کہ اب ملے ہم کو عدل کوئی

چند لمحے مری راتوں میں اجالے تو کرو
میرے سپنے مری آنکھوں کے حوالے تو کرو

مجھ کو سقراط کے قصے نہ سناؤ لوگو!
پیش تم پہلے مجھے زہر کے پیالے تو کرو

نذر تم کو کروں بے چینیوں کی تخلیقات
تم تمناؤں کے شائع وہ رسالے تو کرو

دوسروں سے یہ توجہ کی توقع کب تک
پیدا اپنے مری جاں چاہنے والے تو کرو

ٹوٹنے اور بکھرنے سے بچالوں شاید
خود کو اک بار ذرا میرے حوالے تو کرو

راہ پر خار اب آگے ہے، سفر ساتھ مرے
ہوں مری طرح اگر پاؤں میں چھالے تو کرو

ہاں ستاروں کو بھی پانے کی تمنا بے شک
چاند پلکوں کو ذرا ایک جھکالے تو کرو

یاد رکھے گا تمہیں بھی یہ زمانہ اختر
شرط لیکن یہ ہے کچھ کام نرالے تو کرو

ہربنس سنگھ تصور

کاغذ پر فرمان بہت ہیں
درماندہ انسان بہت ہیں

ان کے وعدے اور مکرنا
جینے کے سامان بہت ہیں

جیتنا ہے تو دل ہے کافی
لڑنے کو میدان بہت ہیں

عہد حاضر کے پیتل پر
سونے کے احسان بہت ہیں

کیوں نہ تصورؔ شرمندہ ہوں
شعر ہیں کم دیوان بہت ہیں

پنجرے میں ہوں بند نظر سے
شرمندہ ہوں بال و پر سے

پر اسرار ہے مایا اس کی
سب بے خوف ہیں جس کے ڈر سے

کہتے ہیں مجھ پڑ مردہ کو
نسبت تھی سر سبز شجر سے

خط، تصویر خیالی تھے سب
کچھ بھی نہ نکلا میرے گھر سے

کیا کرنا ہے رو کے تصور
کیا لینا ہے دیدہ ور سے

صبح بھی ہے اور شام بھی ہے
پل دو پل کا قیام بھی ہے

میرے نام سے بے پرواہ
مجھ میں اک گم نام بھی ہے

دیکھنے والے پہنچے نہیں
میرا رقص تمام بھی ہے

ہر اک سانس ہے جرمانہ
ہر اک خواب انعام بھی ہے

شعر تصور خاص نہیں
اور صلائے عام بھی ہے

وھاج الحق کاشف

میری بانہوں میں شام چاہتی ہے
ایک خوش بو قیام چاہتی ہے

تیغ بھی بے نیام چاہتی ہے
اب خموشی کلام چاہتی ہے

میری فطرت بلا کی خود داری
وہ انا اب سلام چاہتی ہے

میری دنیا میں کوئی نام نہیں
تیری دنیا تو نام چاہتی ہے

مصلحت کوش ہوں، خموش ہوں میں
وہ پروں پر پیام چاہتی ہے

تشنگی باوضو سہی کاشف
پھر بھی آنکھوں سے جام چاہتی ہے

وھاج الحق کاشف

اب قلم مشک کی خوش بو میں بسا چاہتا ہے
اک گلستاں ہے کہ کاغذ پہ کھلا چاہتا ہے

میں ہوں خاموش تقاضائے محبت ہے یہی
اور وہ گیسو اسی عنوان کھلا چاہتا ہے

یہ نسیم سحری، جام، دل آویز شفق
اس بہانے مجھے ایمان ملا چاہتا ہے

میں نے صحرا میں مسافت کو دعائیں دی ہیں
جس کا انعام کہ اب ابر گھرا چاہتا ہے

بزم جاناں میں ترا نام ہے کندہ، کاشف
اس شبستان سے اب کون اٹھا چاہتا ہے

شارق عدیل

مرے دوست اپنے وجود میں یہ کمال سحر اجال دے
جو ملوں تو ہجر کا لطف دے نہ ملوں تو کیفِ وصال دے

کوئی ایسی رات بھی جان من ہو نصیب موسم عشق میں
تو جواب دے میں سوال دوں میں جواب دوں تو سوال دے

دیے ہر قدم پہ جلاؤں گا میں وہاں بھی اپنے وجود کے
مجھے بے کنار خلاؤں میں تجھے شک اگر ہے اچھال دے

جو مرے متانت و صبر کا تجھے امتحان ہی لینا ہے
اسی زندگی میں عروج دے اسی زندگی میں زوال دے

میں مسافتوں کی تھکن لئے جو مقابل آؤں تو کس طرح
مجھے خوف ہے مرا آئینہ مجھے حیرتوں میں نہ ڈال دے

رہِ زندگی میں تجلیاں جو بکھیرتا ہے بہر نفس
وہ خسارہ اپنی حیات کا مری جھولیوں میں نہ ڈال دے

زبیر شفائی

جاری سفر میں راہ کے واضح نشاں تھے ہی نہیں
آگے نہ پیچھے یہ زمین و آسماں تھے ہی نہیں

بس تھرتھراتے ہونٹ اپنی داستاں کہتے رہے
دراصل ہم محتاجِ الفاظ و بیاں تھے ہی نہیں

مجمع جمانے کے لئے پھر خود تماشا بن گئے
زنبیل میں جب ماہتاب و کہکشاں تھے ہی نہیں

پھر بھی تھے زندہ لوگ اور آسودہ خاطر بے طرح
حالانکہ ان کے پاس اسباب جہاں تھے ہی نہیں

ان پاؤں کے چھالوں کو لے جاتا تو لے جاتا کدھر
حدِ نظر خار مغیلاں گلستاں تھے ہی نہیں

یاروں سے کیا کہئے کہ بے نیل و مرام آنا پڑا
مشہور تھے لیکن مکان و لامکاں تھے ہی نہیں

یہ پھول سبزہ اوس آئینہ دھنک موسم زبیر
سارے نشاط افزا نظارے جاوداں تھے ہی نہیں

کمال وہ کسی مانوس چاپ کا ہوگا
ترا دریچہ ہوا سے نہیں کھلا ہوگا

کہیں سے کوئی چلے اور جس طرف جائے
مرا نشانِ کفِ پا ہی رہ نما ہوگا

تمام ظلمت شب کے خلاف شہر بہ شہر
چراغ اور ہوا کا مقابلہ ہوگا

شریف لوگ بھی پیدائشی لباس میں ہیں
قدیم شہر میں اب اور کیا نیا ہوگا

لہولہان تماشے بریدہ سر لائے
تعصبات سے اب دہر پاک کیا ہوگا

یہ زندگی ہے جب امراؤ جان ادا کی طرح
بقدر شوق اک اک گھر میں رتجگا ہوگا

ابھی نہیں تو کبھی آئے گا وہ دن بھی زبیر
جب آفتاب شفق گوں نہیں ہرا ہوگا

محاذ جنگ کی پل پل مجھے خبر آئے
یہاں سے جائے سپاہی وہاں سے سر آئے

پتہ نہیں کب اڑن طشتری اتر آئے
فلک شگاف ترے قہقہوں سے ڈر آئے

وہ منتظر ہوئے جب نا امید آخرِ شب
گلی کے وسط میں جلتا چراغ دھر آئے

تخیلات کو تقسیم کر دیا پھر بھی
مصوری نہ مجھے آذری ہنر آئے

وہ دائرے جو بناوٹ میں تھے کلس کی طرح
بعینہ پس و پیشِ قبا نظر آئے

جب آشنا ہی نہیں بستیاں اجالوں سے
طلوع مہر ہو کس کے لئے سحر آئے

یہ داغ داغ عناصر یہ کم سواد قویٰ
زبیر نیند ابدی اب کسی پہر آئے

محب کوثر

ہمیں پاسِ وفا داری بہت ہے
یہی تو ایک بیماری بہت ہے
مجھے بھی سوچ کر لڑنا پڑے گا
مرے دشمن کی تیاری بہت ہے
بھلا تم سے قبیلہ کیا ڈرے گا؟
اکیلے گھر کی سرداری بہت ہے
تری ہر بات یوں بھی مان لیتے
مگر تجھ میں اداکاری بہت ہے
ہمارے دوستوں سے صاف کہہ دو
ہمارے ساتھ غداری بہت ہے
جلا کر خاک کر دے گی بدن کو
ہوس کی ایک چنگاری بہت ہے
نہیں کوثر ہمارے پاس کچھ بھی
اگر ہے تو رواداری بہت ہے

محب کوثر

اس کوچۂ دل دار کا چرچا بھی بہت ہے
لٹنے کا اسی راہ میں خطرہ بھی بہت ہے

اس دورِ جنوں خیز میں ہر چیز ہے ارزاں
اس دور کے بازار میں دھوکا بھی بہت ہے

حالاں کہ مری چاہ کا اقرار ہے اس کو
پر یاد نہ کرنے کا تقاضہ بھی بہت ہے

کرتا ہے مرے سامنے وہ میری خوشامد
در پردہ مرے نام سے جلتا بھی بہت ہے

اک عمر گزاری تھی بڑی شان سے جس نے
کوثر وہ مرے شہر میں رسوا بھی بہت ہے

رضا امروہوی

صلیبوں کی کہانی آج کل اس درجہ ارزاں ہے
جہاں جاؤ جسے دیکھو وہی صورت پریشاں ہے

جسے کل رات گھر میں قتل کر ڈالا اندھیروں نے
اسی کے خون سے ان شاہراہوں پر چراغاں ہے

نگاہِ تیشہ گر سے داد خواہی کی تمنا کیوں
کہ خود آئینہ گر کو دیکھ کر آئینہ حیراں ہے

چراغِ شوق جو تم نے کبھی خود ہی جلایا تھا
رکھا ہے طاقِ نسیاں میں مگر اب تک فروزاں ہے

نواحی بستیوں میں رات بھر ہنگامہ برپا تھا
مگر شیشے کے محلوں میں چراغاں ہی چراغاں ہے

خرد مندو ذرا کچھ سوچ کے اپنے قدم رکھنا
یہ بزمِ مہ وشاں ہے یاں سلامت جاں نہ ایماں ہے

رضا کو اور ریاکاری سے نسبت کیا کہا تم نے
میاں وہ دوست ہے ہر شخص کا اک مخلص انساں ہے

متین امروہوی

غالب کی زمینوں میں

مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

سر دیکھ کر کبھی، مری دستار دیکھ کر
شرمندہ ہے وہ مجھ کو سردار دیکھ کر
آیا نہ فرق اس کی انا میں کبھی کوئی
دنیا بدل گئی، مرا کردار دیکھ کر
جنت کی جو تھی دل میں وہ حسرت نکل گئی
آنکھوں سے اپنی، کوچۂ دلدار دیکھ کر
راہِ وفا میں حادثہ اس پر بھی ہو گیا
ہم تو چلے تھے راستہ ہموار دیکھ کر
احباب مجھ کو دیتے ہیں شعر و سخن کی داد
حاسد خموش ہیں، مرا معیار دیکھ کر
انمول کر دیا ہے زلیخا نے عشق کو
یوسف یہ بولے مصر کا بازار دیکھ کر
وہ تو متین کر نہ سکا کوئی فیصلہ
دل میں نے دے دیا اسے اک بار دیکھ کر

درد منت کشِ دوا نہ ہوا

اس کو بچھڑے ہوئے زمانہ ہوا
دل سے میرے مگر جدا نہ ہوا
حال وہ بھی نہ کہہ سکے اپنا
عرض ہم سے بھی مدعا نہ ہوا
لاکھ چاہا مرے مسیحا نے
درد، منت کشِ دوا نہ ہوا
ناخدا اور جانے کیا کرتا
وہ تو اچھا ہوا خدا نہ ہوا
اس کی فطرت بدل نہیں سکتی
بے وفا کوئی با وفا نہ ہوا
غنچہ و گل اداس ہیں تب سے
جب سے آنا ترا صبا نہ ہوا
معجزہ ہے متین یہ کس کا
تیر اس کا کوئی خطا نہ ہوا

نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

مجھے جب آ گئے اس کے نظر در و دیوار
سلام شوق کیا دیکھ کر در و دیوار
اکیلا دیکھ کے ہنستے ہیں مجھ پہ ہمسائے
لپٹ کے روتے ہیں مجھ سے مگر در و دیوار
سفر میں جب مجھے گھر کا خیال آتا ہے
دکھائی دیتے ہیں ہر گام پر در و دیوار
میں اپنے گھر میں پلٹ کر کبھی نہیں آتا
نہ آتے یاد یہ مجھ کو اگر در و دیوار
ہوئی ہے عشق میں اس کی بھی خانہ بربادی
ہمیں بھی راس نہ آئے ادھر در و دیوار
دماغ اس کا فلک بوس کیا عمارت ہے؟
کہ جس میں ہیں در و دیوار پر در و دیوار
متین! خانۂ دل میں وہ زلزلہ آیا
کہ جسم و جاں کے ہوئے پر خطر در و دیوار

وسیم ملک

سلگتی پیاس کا منظر پکارتا ہے مجھے
سراب بن کے سمندر پکارتا ہے مجھے

مرے سکوں سے تھے بیزار کل درودیوار
بھٹک رہا ہوں تو اب گھر پکارتا ہے مجھے

مچل رہا ہے لہو سر سے بہہ نکلنے کو
یہ کس کے ہاتھ کا پتھر پکارتا ہے مجھے

جو تم نہیں تو غموں کا ہجوم ہے دل میں
اکیلا دیکھ کے لشکر پکارتا ہے مجھے

نہ جانے کون ہے کیوں سامنے نہیں آتا
جو خواب خواب برابر پکارتا ہے مجھے

وہ راہ جس پہ نہ چلنے کا عہد ہے میرا
اسی طرف کوئی اکثر پکارتا ہے مجھے

نہ جانے آنکھ سے کیوں نیند روٹھ جاتی ہے
وسیم جس گھڑی بستر پکارتا ہے مجھے

وفا کی سوندھی خوش بو بیان میں رکھنا
گداز میر غزل کی زبان میں رکھنا

ہمیں سکھائی ہے اسلاف نے رواداری
سنبھال کر یہ گہر خاندان میں رکھنا

محبتوں کی فضا لازمی ہے جینے کو
کوئی شگاف نہ اس سائبان میں رکھنا

صلیب ودار بھی راہِ وفا میں آتے ہیں
قدم یہ سوچ کے اس امتحان میں رکھنا

وسیم حق پہ نہ آنچ آئے خوفِ جاں سے کبھی
یہ بات اپنے بزرگوں کی دھیان میں رکھنا

سنہری دھوپ میں ظلمت کے بچھڑے لوٹ آتے ہیں
کہ پھل لگتے ہی پیڑوں پر پرندے لوٹ آتے ہیں

میں جن کو دن کے ہنگاموں میں جا کر چھوڑ آتا ہوں
ذرا سی آنکھ لگتے ہی وہ سپنے لوٹ آتے ہیں

غرور اچھا نہیں اس درجہ شہرت کے اجالے پر
میاں، سورج کے ڈھلتے ہی پرندے لوٹ آتے ہیں

ہماری لغزشیں یوں تجربوں میں ڈھل کے آئی ہیں
کہ اسکولوں سے پڑھ کر جیسے بچے لوٹ آتے ہیں

وسیم افلاس کی پگڑی جو خاطر میں نہیں لاتے
مقدر کے بدلتے ہی وہ رشتے لوٹ آتے ہیں

سعید رحمانی

میرے شعروں میں انوکھے استعارے آ گئے
پھول، خوش بو، چاند، جگنو اور ستارے آ گئے

ختم بھی ہونے نہ پائی تھی ابھی غم کی کتاب
میری خاطر درد کے تازہ شمارے آ گئے

خشک پھولوں کی اچانک پتیاں کچھ گر پڑیں
ہاتھ جب میرے پرانے خط تمہارے آ گئے

عزم کی پتوار لے کر میں چلا طوفاں میں جب
خیر مقدم کے لئے خود ہی کنارے آ گئے

ہر قدم پر مشکلیں، تنہائیاں، رسوائیاں
ساتھ دینے کے لئے کتنے سہارے آ گئے

رو پڑا جب یاد کر کے میں خطاؤں کو سعید
میرے حق میں ان کی رحمت کے اشارے آ گئے

ظہیر بابا یار

سراپا ایک مورت بن گئے ہیں
وہ شاید میرا رستہ دیکھتے ہیں
پلٹ کر دیکھنا ہے بے ضرورت
کہ ہم پیچھے تمہارے چل رہے ہیں
وہی جن کو نہیں عرفان اپنا
وہی اوروں پہ پتھر پھینکتے ہیں
بہت خوش ہیں ترے زخموں کو پا کر
تجھے ہر پل دعائیں دے رہے ہیں
ملا ہے جب کہیں رستے میں سایا
ذرا سی دیر کو ہم بھی رکے ہیں
وفا ہوں گے کہاں تک دیکھ لیں گے
ترے وعدے، بہت ہم سے ہوئے ہیں
جھکاتا ہے جو اس دنیا کی گردن
اسی کا لوگ لوہا مانتے ہیں
کبھی رکتے نہیں ہیں منزلوں پر
ہماری فکر کے جو قافلے ہیں
ظہیر ان کے سخن کو سن کے بولے
کہاں تک سچ ہے ہم یہ جانتے ہیں

نصرت ظہیر

خامشی اظہار بنتی جا رہی ہے
شاخ گل تلوار بنتی جا رہی ہے

آنکھوں میں کھلتی جاتی ہیں دکانیں
ہر گلی بازار بنتی جا رہی ہے

درد میں اک آسرا تھا بے خودی کا
وہ بھی اب ہشیار بنتی جا رہی ہے

صلح کی بنیاد رکھنے جا رہے ہیں
بیچ میں دیوار بنتی جا رہی ہے

بستیوں کو چھوڑیئے یہ دیکھیے گا
یہ سڑک ہموار بنتی جا رہی ہے

زندگی انکار تھی کل تک تو نصرت
آج کیوں اقرار بنتی جا رہی ہے

بابِ افسانہ

رشید حسن خاں

کے نام

10 جنوری 1930: 25 فروری 2006

کتنے مہر دین

محمد حامد سراج

یہ کہانی پہاڑی راستوں کی طرح کئی موڑ لے گی۔ اس کہانی کا ٹریک اور منظر آپ کا جانا پہچانا اور مانوس ہے۔ یہ کہانی اپنی مٹی سے پھوٹی ہے اور ایسی زہرناک کہانیاں پھوٹتی رہتی ہیں۔ سفر کے دوران گردوپیش پر نظر رکھئے گا منظر بدلنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ابھی پہاڑی سفر کے دوران پھولی ہوئی سانس بھی بحال نہیں ہوتی کہ خبر آتی ہے رات کی تاریکی میں پورا منظر نامہ بدل گیا۔ صبح آنکھ کھلنے پر نئے چہرے اگ آتے ہیں۔

مگر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی تو ہمیں اس کہانی کا سرا پکڑنا ہے اور سرا پکڑنا دہشت گردوں کی طرح آسان ہے کیا؟ آنکھ مچولی کا کھیل جاری ہے۔ ہر کھیل کا نتیجہ نکلنے میں وقت تو لگتا ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کون دہشت گرد تھا۔ لیکن ہماری اس کہانی میں دنیا کی کسی بھی تنظیم کا کوئی دہشت گرد نہیں ہے۔ بلاخوف وخطر اس کہانی کا مطالعہ کیجئے۔ جب آپ کہانی مکمل کر لیں گے تو اس وقت تک امید کی جا رہی ہے کہ رزلٹ نکل آئے گا۔ گو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہے گا لیکن تھوڑی دیر کہانی پڑھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم اور بھی تو اتنے بہت سے کام یوں ہی کر لیا کرتے ہیں۔

رکئے یہ ایک گاؤں کا منظر ہے۔

ستو دونوں گھٹنوں میں بالٹی پھنسائے گائے کا دودھ نکال رہی ہے۔ وقفے وقفے سے وہ دودھ کی دھاروں کا رخ بالٹی کی بجائے گائے کے منہ کی طرف کر دیتی ہے۔ گائے ہونٹ چاٹنے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ یہ جو ستو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بمشکل اٹھی ہے اور بالٹی لئے جا رہی ہے یہ اس کا بڑھاپا ہے۔ نہیں معلوم یہ عمر گزار چکی ہے یا عمر سے گزر گئی ہے۔

وہ جب اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ مہر دین کے کھوہ پر آئی تھی تو ایوب خان کا عہد تھا۔ اور مشرف کے عہد تک آتے آتے وہ زمانے کا سرد و گرم گزار چکی تھی۔ جب وہ آئی تھی تو اس کا جسم گائے کے دودھ کی طرح سفید اور مکھن کی طرح چکنا تھا۔ اس کا یہ خیال خام ثابت ہوا کہ وہ سدا جوان رہے گی کیوں کہ فوجی حکومت تو لمبے عرصے تک جوان رہ سکتی ہے لیکن انسان کو تو کہولت آ لیتی ہے۔ وہ جب پہلی بار گائے کا دودھ نکال کر اٹھی تھی تو اس کی ناک کی بائیں جانب منحنی سا چمکیلا کوکا اور کانوں میں بندے تھے۔ مہر دین کئی روز سے کھوہ پر آ رہا تھا۔ ایک روز مہر دین نے پانی پلانے کے بہانے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ اتھری گھوڑی کی طرح پاؤں پٹختی اندر کمرے میں چلی گئی۔ اسے مہر دین سے گھن آئی وہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اسے مہر دین کی نظریں اپنے پنڈے میں کھبتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس روز وہ ان ہی زہریلی نظروں کی ڈسی آدھا دودھ نکالے بالٹی اٹھائے جب کمرے میں گئی تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ مہر دین کے حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز اسے زہر لگ رہی تھی۔

زمینوں کا مالک ہے تو کیا ہوا...؟ میں اس کی رکھیل نہیں بنوں گی، جس کھوہ پر جاؤ یہ سالے وہاں ڈسنے کو موجود ہوتے ہیں۔ غریب کی تو عزت ہی نہ ہوئی نا۔ جب جی چاہا رکھ لیا اور جب جی اوبھ گیا نکال دیا۔ بابا... حکومت پھر بدل رہی ہے... مہر دین نے حقے کی نال منہ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

ہاں چودھری جی... یہ کھیل تو ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔ اوپر ہی اوپر کھیلے جاتے ہیں۔ ہماری زندگی تو ان جانوروں میں ان ہی کی طرح گزر جاتی ہے۔ ہمیں کیا خبر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جو پتہ لگ بھی جائے تو ہم نے کون سا تیر مار لینا ہے۔ ہمیں تو تڑکے تڑکے بیلوں اور زندگی کو ہانکنا ہے۔ حکومت کی بات چھوڑیں جی۔ نہر سوکھ گئی ہے کل فصل کو پانی لگانے کے لئے ٹیوب ویل نہ چلا لیں۔

ہاں ہاں... بالکل

بابا سویرے سویرے چلانا۔ میں نے کپڑے بھی دھونے ہیں۔ ستو بولی۔

ستو کے کپڑے دھونے کا سن کر مہر دین کے اندر بیٹھے شیطان نے بھرپور انگڑائی لی اور وہ ستو کے گیلے کپڑوں سے جھانکتے بدن کا چوبیس گھنٹے پہلے ہی

لطف لینے لگا۔ ستو اس کے حواس پر ایسی سوار ہوئی کہ وہ اسے ہر صورت میں حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس کے دماغ میں جتنے بھی ہرکارے تھے الیکشن کے دنوں کی طرح اس نے انہیں آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ الیکشن جیتنا تو اس کے لئے کوئی ایسا مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ مدِ مقابل کو مروا دیا جا سکتا ہے۔ ووٹ خریدے بھی جا سکتے ہیں۔ بیلٹ بکس اٹھا کر بھاگنا بھی کوئی ایسا جاں گسل مرحلہ نہیں۔ شناختی کارڈ حاصل کر کے انگوٹھے لگائے جا سکتے ہیں۔ جو دنیا سے گزر گئے ان کے شناختی کارڈ بھی با آسانی استعمال ہو سکتے ہیں لیکن ستو کوئی الیکشن تو ہے نہیں جسے آسانی سے جیت لیا جائے۔ وہ تو ایک دھڑکتا وجود ہے۔ اسے اٹھا کر گھر میں ڈال لینا بھی مشکل نہیں تھا لیکن مہر دین اسے ایم این اے کی سیٹ کی طرح مستقل اپنے پاس رکھ کر اس سے لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

عید کے روز ستو سوتیلی ماں کے ساتھ مہر دین کے گھر آئی تو اس کی بیوی کو دیکھ کر اسے سکتہ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر پلٹ کر اپنے وجود پر ڈالی اور پھر کن انکھیوں سے مہر دین کی بیوی کو دیکھا۔ بادامی آنکھ، ستواں کھڑی ناک، سونے کی گانی گردن میں، دونوں کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں، رنگت دودھ سے بھی اجلی، پاؤں میں پائل اور ملتانی کھسہ، ہاتھوں میں رچی مہندی اور پانچ انگوٹھیاں ستو اسے تکتی ہی رہ گئی۔ وہ سوچنے لگی اتنی خوب صورت بیوی کے ہوتے ہوئے انہیں جانوروں کی طرح ادھر ادھر منہ مارنے کی عادت کیوں ہے؟ ستو مہر دین کی بیوی کا زیور دیکھنے میں ایسی مگن ہوئی کہ اسے اس کا حسن بھول گیا اور وہ زیورات میں ہی کھو کر رہ گئی۔

زیورات آہستہ آہستہ وہ اپنے بدن پر سجانے لگی۔ پہلے اس نے کانوں میں بڑے بڑے جھمکے ڈالے، گانی اور پھر کنٹھا لا، دونوں ہاتھوں میں سونے کی بارہ بارہ چوڑیاں ڈال کے انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ یہ میں ہوں ستو ...... یا کوئی اور ہے۔ میں یوں ہی اپلے تھاپتی اور زندگی برباد کرتی رہی۔ اک ذرا سی دیر میں کیسے زندگی بدل گئی۔

وہ اس وقت چونکی جب اس کی ماں نے اسے مہر دین کی بیوی کے کہنے پر برتن دھونے کا کہا۔ برتن مانجھتے مانجھتے وہ اندر سے ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ برتن دھوتے ہوئے ہاتھ میں سے صابن پھسل کر گرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

مہر دین نے میٹرک میں فیل ہونے کے بعد ہی سیاست میں قدم رکھ لیا۔ امتحان اور سیاست کا فرق اسے آبا و اجداد سے ورثے میں ملا۔ میٹرک کے بعد آوارہ گردی سے بچانے کے لئے اس کے باپ نے زمینیں اس کے حوالے کر دیں۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے دوران ایک دراز قد گٹھے ہوئے بدن والی عورت نے اسے اپنے بدن میں لپیٹ لیا۔ وہ اسی کا ہو کر رہ گیا۔ یہ اس کی گناہ آلود زندگی کا پہلا باب تھا۔ وہ جلد ہی اس باب سے اکتا گیا۔ اسے خیال آیا اب کوئی اور باب پڑھنا چاہئے۔ دولت کی ریل پیل ہو تو ایسے اسباق میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔

وہ نت نئی عورت کی تلاش میں رہنے لگا اور اس کے باپ کو اس کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اسے شادی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس کے منہ کو گناہ کے خون کی چاٹ لگ گئی وہ شکاری کتوں کی طرح پگڈنڈیوں پر گنے کے کھیتوں میں کپاس کی کھڑی فصل میں ہر جگہ اپنے شکار کی تلاش میں رہنے لگا۔ موقع پاتے ہی وہ شکار کو دبوچ لیتا۔

باپ کی خوں خوار مونچھوں کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال کر شادی کر لی۔ اس کی منکوحہ ساتھ کے گاؤں سے انہی جیسی فراینتی برادری میں سے تھی۔ سہاگ رات میں اس نے کمرے میں قدم دھرا تو بھینی بھینی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ یہ خوشبو پگڈنڈیوں کی خوشبو سے یک سر مختلف تھی۔ گھونگٹ الٹنے کی دیر تھی۔ اسے حیرت نے آ لیا۔ کیا اتنی مکمل اور خوب رو عورت میری بیوی ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی۔ چپٹی ناک قدرے موٹے ہونٹ رنگ گہرا سانولا اور مسلسل سگریٹ نوشی سے پیلے دانت۔ کہاں میں اور کہاں یہ کپاس کی طرح نرم اور ملائم میری بیوی، کیا یہ مجھے قبول کر لے گی؟ حالاں کہ وہ اسے قبول کر چکی تھی۔ نہیں نہیں یہ مجھے قبول نہیں کرے گی۔ میرے ساتھ اس کا نباہ مشکل ہو گا۔ یہ کسی اور کے ساتھ تعلقات نہ پال لے۔ اس کے اندر وہم نے انگڑائی لی۔

گھونگٹ الٹتے ہی اس نے بیوی کے سینے میں ایسا تیر پیوست کیا جو ساری عمر ناسور بن کر رستا رہا۔ ایک ایسا فقرہ جو مکمل زہر آلود تھا۔ اور اس کا پورا زہر اس نے بیوی کے وجود میں انڈیل دیا۔

یہ پہلی رات ہے۔ یاد رکھنا اگر زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور تمہارے بستر پر آیا تو میری طرف سے تین طلاق۔ اس کی آواز بھاری اور جذبات سے خالی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پوری زندگی زمیں بوس ہو گئی تھی۔ منہ دکھائی کی اتنی بڑی قیمت....؟ پوری رات حیوانوں کی طرح وہ اس کا جسم بھنبھوڑتا رہا۔ اور کروٹ لے کر سو گیا۔

الیکشن کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ مہر دین کی کوٹھی پر بڑی چہل پہل رہنے لگی۔ علاقے کی کئی ٹیکسیاں جن کے ڈرائیور دن بھر اڈے پر سواری کے انتظار میں تاش اور لوگوٹی کھیلتے رہتے تھے انہوں نے اپنی ٹیکسیوں پر مہر دین کے نام اور انتخابی نشان پینٹ کرا لئے۔ ان کے لئے باب رزق کھل گیا۔ مہینے بھر کی بچت ان کے لئے ایک ایسا اطمینان تھی جس سے وہ اپنی گاڑی کی مکمل مرمت اور گھر کے چھوٹے موٹے رکے ہوئے کام نکال سکتے تھے۔ انہیں پٹرول اور ڈیزل کی فکر بھی دامن گیر نہیں تھی کیوں کہ صبح ہی صبح مہر دین کا منشی

انہیں ٹینکی بھروانے کے لئے مہر دین کی دستخط شدہ چٹ پکڑا دیتا۔

الیکشن کے دنوں میں ستّو وقتی طور پر پس منظر میں چلی گئی۔ ایک وقت میں ایک ہی الیکشن لڑنا ممکن تھا۔ وہ اپنے سیٹ کے لئے تگ و دو میں تھا اور ادھر ستّو کے اندر زیور نے ایسی جڑ پکڑی کہ وہ مہر دین کے لئے بے قرار رہنے لگی۔ حویلی میں رہنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ سارا دن چائے اور کھانے کا سلسلہ چلتا رہتا۔ ستّو نے مہر دین کی سیٹ سے پہلے اسے جیت لیا۔ مہر دین نے اپنی بیوی کے دل میں جو طلاق کا بیج ڈالا تھا اس کا خوف اسے بے چین رکھنے لگا۔ اسے زندگی سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ بے زاری اس کے رگ و پے میں رچتی چلی گئی۔ جس روز مہر دین نے الیکشن جیتا سارا دن ڈھول اور شہنائیاں بجتی رہیں۔ سارا دن وہ مبارک باد دینے والوں میں گھرا رہا۔ وہ لوگ بھی مبارک باد دینے چلے آئے جنہوں نے اسے ووٹ نہیں ڈالا تھا۔ ہر آنے والا خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مہر دین کے قریب بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے منشی کو ہدایات جاری کیں کہ ٹیکسی ڈرائیوروں کو بہترین کھانا کھلایا جائے اور ان کو فوری طور پر ان کی محنت کے چیک دیئے جائیں۔

ستّو کے ساتھ وہ اس کی پہلی رات تھی۔ اگلی صبح اسے دارالخلافہ پہنچنا تھا۔ اس کے ذہن میں موجود مسائل وقتی طور پر ستّو کے جسم میں چھپ گئے۔ ستّو نے اس سے الیکشن کی خوشی پوری پوری وصول کی۔ ستّو کو معلوم نہیں تھا کہ وہ دونوں الیکشن جیت چکا ہے۔

کہا تھا نا... ابھی پہاڑی سفر میں پھولی ہوئی سانس بھی بحال نہیں ہوتی کہ خبر آتی ہے رات کی تاریکی میں پورا منظر نامہ بدل گیا۔ صبح آنکھ کھلنے پر نئے چہرے اگ آتے ہیں۔ مہر دین جب دارالخلافہ پہنچا تو وہاں اس کی حیرت کی انتہا اس وقت نہ رہی جب اس نے وہاں ممبران سے علیک سلیک کی تو ہر ممبر کا نام مہر دین تھا۔ ایک دو ناموں میں تو مماثلت ممکن تھی لیکن یہ کیسے ہو گیا کہ سارے ہی مہر دین نکلے۔ اس نے متعدد ممبران سے ہاتھ ملایا۔ اسے یوں لگا جیسے سب ستّو سے مل کر آ رہے ہیں۔ ان سب میں ایک شخص سب سے الگ تھلگ بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر مہر دین کی تختی نہیں تھی۔

یہ کون ہے...؟ کہاں سے آیا ہے...؟ یہ اپنی ستّو کیوں ساتھ نہیں لایا...؟

مہر دین اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس کے اندر بے شمار سوال بے قابو گھوڑے کی طرح زبان کی زمین پر دوڑنے کو تیار بیٹھے تھے۔

آپ کا تعارف...؟

مجھے احمد دین کہتے ہیں!

آپ چودھری ہیں، وٹو، ٹوانے، ہراج، سید، ملک یا.....!

وہ شخص مسکرایا..... مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی

میرے نام کے ساتھ کوئی سابقہ لاحقہ نہیں ہے۔

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنے نوکروں کو ساتھ لائے ہیں یا نہیں۔ سابقہ لاحقہ یقینی طور پر آپ کے ملازمین یا باڈی گارڈز کے نام ہوں گے۔

وہ شخص پھر مسکرایا...

عجیب شخص ہے۔ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتا ہے

میں آپ کی تعلیم پوچھ سکتا ہوں؟

میں نے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لئے جرمنی کی ایک یونیورسٹی کا انتخاب کیا ہے...!

تو گویا آپ ان پڑھ نہیں ہیں

نہیں

تو پھر یہاں اسمبلی میں کیا لینے آئے ہیں...؟

ملک کی قسمت سنوارنے!

یہ اسمبلیاں چلانا پڑھے لکھے لوگوں کا کام نہیں ہے۔ چوں کہ اس ملک کی اکثریت ناخواندہ ہے اس لئے اسے صرف ہم ہی سمجھ اور چلا سکتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے جہالت کیا ہوتی ہے۔ لیکن یہ آپ الیکشن میں جیت کیسے گئے...؟

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہونے والے اس الیکشن میں کچھ بوریا نشین، درویش اور مولوی بھی حصہ لے رہے تھے۔ میں نے سوچا مجھے بھی قسمت آزمائی چاہئے۔ شاید ہماری دھرتی کی تقدیر سنور جائے۔ اس دھرتی میں اچھے لوگوں کی کمی بھی نہیں ہے۔ اچھے اور مخلص لوگ نہ ہوتے تو زمین الٹ گئی ہوتی۔ ہمیں امید کا دامن کسی بھی لمحے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہر اندھیرے میں روشنی کی ایک نہ ایک کرن موجود ہوتی ہے۔ جو ایک روز پورے اندھیرے کو نگل جاتی ہے۔

مہر دین کو یقین ہو گیا کہ یہ ممبر عوام کی بے وقوفی کی وجہ سے اسمبلی میں پہنچ گیا ہے۔ اس نے یہاں کون سے تیر چلا لینے ہیں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ علاقے کی سڑکیں کیسے پکی کرا کے نوٹوں کی طرح ووٹ سمیٹے جاتے ہیں۔ اسے تو یہ بھی خبر نہیں ہوگی کیسے بجلی کے خالی کھمبے لگوا کر بجلی کے جھوٹے وعدوں پر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ اس تعلیم یافتہ نے تو کبھی بجلی بھی چوری نہیں کی ہوگی اسے کیا معلوم لاکھوں روپے کی بجلی کیسے چوری کی جاتی ہے اور پھر بڑے آرام سے سیدھے سبھاؤ عوام پر ٹیکس لگا کر حساب سیدھا کر لیا جاتا ہے۔

وہ اس کے ساتھ اسمبلی کے لان سے کینٹین تک آیا۔ چائے کے دوران باتیں ہوتی رہیں۔ مہر دین کو احمد دین سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے احمد دین کو اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ اور اس بات پر اصرار کیا کہ آپ مجھے

بہت بھائے ہیں اس لئے باہم رابطہ رہے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ احمد دین کے جانے کے بعد اسے پھر ستّو کی یاد آئی۔ وہ سوچنے لگا یہاں اتنے بڑے شہر میں رات کیسے کٹے گی اور یہاں تو آنا بھی اب معمولاتِ زندگی کا حصہ ہے۔ یہاں بھی ایک ستّو کا ہونا ضروری ہے۔ وہ سوچ رہا تھا جس چیز کی چاٹ لگ جائے اسے چھوڑنا مشکل ہوتا ہے شراب ہو عورت یا سیاست...!

بہت دنوں بعد وہ گاؤں لوٹا تھا۔ اپنی لینڈ کروزر پر اس نے سیر کا پروگرام ترتیب دیا۔ ڈرائیونگ کے دوران اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ رات میں اس کی بیوی نے ایک ایسے موضوع پر اس سے بات چھیڑی کہ اسے لاجواب کر کے رکھ دیا۔ وہی بات اس کے ذہن سے نکالے نہیں نکل رہی تھی۔ بات کھل کر کہہ دی گئی ہوتی تو اسے سلجھانے کا راستہ نکال لیتا۔ لیکن اس کی بیوی نے اسے ادھوری بات کے عذاب میں ڈال دیا تھا۔ رات ابھی تک اس کے وجود سے چپکی ہوئی تھی۔

تم نے پہلی ہی رات طلاق کا کہہ کر مجھے عذاب میں ڈال دیا ہے۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہوگئی ہے۔ خاوند اگر محبت عزت اور وقار نہ دے سکے تو کم سے کم اسے عذاب بھی نہیں دینا چاہیے۔ جانے تم لوگ شادی کیوں کرتے ہو۔ تمہیں جنسی تسکین کے لئے کتنی ہی عورتیں مل جاتی ہیں تو پھر ایک عورت کو کیوں باندھ کے رکھنا چاہتے ہو...؟ ہمارا کیا قصور ہے...؟ کیا یہ معاشرہ صرف مرد کا ہے۔ کیا ہماری طرح تم لوگوں کی عزت داغ دار نہیں ہوتی۔ دولت کیوں تم سب کو کالے کرتوتوں کے باوجود صاحبِ توقیر بنائے رکھتی ہے۔ میں نے تو تمہارے سوا کسی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک رات تو صبر کر لیا ہوتا۔ مجھے آزما تو لیا ہوتا۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔

تم کون ہوتی ہو اپنا فیصلہ کرنے والی؟ مہر دین کی آواز میں غصے کی آمیزش تھی

مہر دین... مجھے معلوم ہے مشرقی عورت کا اپنے خاوند کو نام لے کر پکارنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن مہر دین میں کیا کروں۔ میں نے مجبوری میں یہ فیصلہ کیا ہے۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اب ہم بھی اسمبلی میں پہنچ گئی ہیں۔ اگلے کسی بھی دورانیے میں اگر تعلیم کی پابندی مزید بہتر اور سخت کر دی گئی تو تم سارے کے سارے مہر دین باہر بیٹھے رہ جاؤ گے۔

بیوی کے لہجے پر اس کو خون کھولنے لگا۔ اسے احمد دین اور اس کی تعلیم اور مستقبل کا ہیولا بھی نظر آیا لیکن سر دست وہ گھر میں الجھا ہوا تھا۔ گھر کی اسمبلی اس کے گلے میں اٹک گئی تھی۔

تو کیا تم کسی طریقے سے اسمبلی میں آواز اٹھاؤ گی...؟

نہیں...

پریس کانفرنس کے ذریعے مجھے رسوا کرنے کا ارادہ ہے تمہارا...؟

نہیں...

میرے خلاف کتاب چھاپ کر مجھے پوری دنیا میں ننگا کر کے قہقہے لگاؤ گی؟

بالکل ہی نہیں...!

تم نے جو کرنا ہے کر لو...

لینڈ کروزر کے اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت سخت ہوگئی۔ اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔ ارادہ تو اس کا ستّو کی طرف جانے کا تھا لیکن سینے میں بائیں جانب اٹھنے والے درد نے اسے ہر چیز بھلا دی۔ باڈی گارڈ نے سیٹ سنبھالی اور اسے فوری ہسپتال لے جایا گیا۔ دل کا دورہ شدید تھا۔ بیماری کے دوران وہ زیادہ تر نوکروں کے رحم و کرم پر رہا۔ اس کی بیوی کی سرد مہری نے اسے اندر سے چور چور کر رکھا تھا۔ ایک ہی سال میں دل کے دورے کے بعد اسے فالج نے آ لیا۔ وہ بستر کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ اسمبلیاں، زمینیں اور عورتیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ موت سامنے کھڑی تھی اور زندگی بھر کے اعمال حشرات الارض کی شکل میں اسے نوچنے لگے تھے۔ ایک تسلی کے سہارے وہ بستر پر سانس لے رہا تھا کہ بیوی کو میں نے جس انداز میں پہلی رات باندھ لیا تھا اب کم سے کم وہ تو آزاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن رات گئے اس کی آنکھ کھلتی تو بیوی کی دل خراش آواز اس کی سماعت پر برسنے لگتی

میں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے

فیصلہ کرنے کی بجائے اگر سنا دیا ہوتا تو میں اس عذاب سے تو نہ گزرتا۔ یہ عذاب تو دل کے دورے اور فالج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ روح اٹکی ہے میری...!

ناشتے میں ایک ملازم اسے دلیہ کھلا رہا تھا۔ اس کی بیوی لاؤنج سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ انداز بتا رہا تھا کہ وہ تیار ہو کر کہیں نکل رہی ہے۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں پوچھا

کہاں جا رہی ہو؟

عدالت میں!

کیوں؟

خلع کی درخواست دینے۔ اور ہاں کل رات ستّو آئی تھی تمہاری رکھیل۔ اسے میں نے کہہ دیا ہے کہ مہر دینوں کی اسے کیا کمی ہے۔ تمہاری بجائے کوئی اور مہر دین تلاش کر لے۔

رکو..... یہ تو بتاؤ تم خلع کیوں لینا چاہتی ہو۔ تم تو کسی کو بھی چھو کر آزاد ہو سکتی تھیں

مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ میرے بستر پر آج تک کوئی نہیں آیا۔

تو پھر خلع...

میں نے احمد دین سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے... ○○

ختم شد

مظہر الزماں خان

(علامہ اعجاز فرخ صاحب کے نام)

جب وہ گھر سے نکلا تھا۔ موسم اچھا تھا۔ زمین ٹھیک ٹھاک تھی۔ درختوں کے پتے اپنے رنگ پر تھے اور ان کی گھنی گھنیری چھاؤں چھاؤں شاخوں اور ان کی جوڑوں میں مختلف قسم اور مختلف رنگ ونسل کے پرندے بیٹھے اپنی اپنی آوازوں میں اپنے اور اپنی زمین کے قصے، کہانیاں، بیان کر رہے تھے اور راستے اطمینان بخش اور آسان آسان تھے کہ ان پر آوازوں کا شور اور پاؤں کا ہجوم نہیں تھا اور ہر قدم اس کا اپنا ہی تھا اور کوئی ایک دوسرے کے پاؤں پر پاؤں نہیں رکھتا تھا اور نہ نشانات پر کوئی پانی پھیرتا تھا کہ سبھوں کے اپنے پاؤں اپنی آواز اور اپنے نشان تھے اور نہ آسمان کو چھپا لینے والی عمارتیں ابھی پیدا ہوئی تھیں کہ ساری عمارتیں اپنی اپنی قامت میں تھیں اور تقریباً مکان ثمر آور عورتوں کی طرح تھے کہ ان کے پھل، ان کے اپنے دامنوں میں ہی گرتے تھے مگر جب وہ گھر واپس ہونے کے لئے ایک عرصے کے بعد پلٹا تو وقت پلٹا کھا چکا تھا اور ایک لمبا اور نامانوس و شوریدہ موسم اس کے پیروں کے نیچے آکر بچھ گیا تھا اور ہر چیز اجنبی اجنبی سی ہو گئی تھی کہ موسم آوازیں، زمین، شجر حجر سب بدل بدل سے گئے تھے اور راستوں پر ہجوم اس قدر بڑھ گیا تھا کہ پاؤں رکھنے کو جگہ باقی نہیں رہی تھی اور راستے اپنے اپنے رستوں سے بہک گئے تھے اور جو چہرے گھر سے نکلتے وقت جیسے موجود تھے وہ واپسی پر ویسے باقی نہیں رہے تھے کہ سفاک موسموں اور طرار بازاروں نے سبھوں کے چہرے اتار کر اپنے چہرے چڑھا دیئے تھے کہ ان کے اندر ہزاروں بدصورت خواہش پیدا ہو گئی تھیں اور جب جب قوموں میں ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آسمان ان سے منہ پھیر لیتا ہے اور آسمان کا زمین سے منہ پھیر لینا چیزوں کے زوال کی علامت ہے۔ لہٰذا میں پچھلی زمین کا راوی، اب ایک گہری نیند میں چلا جاتا ہوں کہ اب میں اس عہد کی زمین کا راوی نہیں رہا۔

چنانچہ پچھلی زمین کے راوی نے ایک اداس جماہی لی اور پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک اتھاہ گہری اور لمبی نیند میں چلا گیا تو اس کے ملبے سے ایک نیا راوی برآمد ہوا جو مسلسل کھانس اور کراہ رہا تھا اور اس کے کراہنے کی لخت لخت آواز شوریدہ زمین کے چپے چپے پر پھیل رہی تھی۔

ایک عرصے کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے اسے اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہیں آپ اور اس طرح بغیر اجازت اس پرائے گھر میں کیسے چلے آئے کہ دستک کے بغیر ہمارے اس سمجھدار گھر کا دروازہ کبھی نہیں کھلتا۔ پھر آپ بلی کی طرح اندر کیسے چلے آئے؟!"

"یہ میرا اپنا گھر ہے۔" آنے والے مرد نے کہا۔ "اور یہ میری دستک کی آواز پر ہی کھلا ہے کہ میرا گھر میری دستک کی آواز کو پہچانتا ہے اور اس نے میری دستک کی آواز کو پہچان لیا ہے۔ لیکن حیرت مجھے اس بات کی ہے کہ تم نے میری دستک کو اور مجھے نہیں پہچانا۔"

"کیا بک رہے ہیں آپ؟ یہ گھر میرا اپنا ہے اور اس گھر میں میں، میرے بچے اور میرے شوہر رہتے ہیں جو بہت ضروری چیزیں لانے بازار گئے ہیں۔ اب آتے ہی ہوں گے گو کہ انھیں گئے بہت دیر بلکہ بڑی دیر ہو گئی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ بڑی دیر کی اہمیت کو سمجھ چکے ہوں گے اور جانے اور آنے کے درمیان جو عرصہ یا وقت گذرا ہے۔ اس عرصے میں بہت ساری چیزیں ادھر ادھر ہو گئی ہیں اور بہت سی بدل گئی ہیں کہ لمحہ ایک برس کے برابر ہو گیا ہے یا ایک برس ایک لمحے کے برابر ہو گیا ہے کہ راتیں دنوں کو پی رہی ہیں اور دن راتوں کو پی رہے ہیں اور ان سبھوں کو ہم پی رہے ہیں اور وقت ہمیں پی رہا ہے کہ ایک قدم سے دوسرا قدم نا آشنا ہو گیا ہے کہ شناسائی کی ساری تصویریں جل گئی ہیں اور سنا ہے کہ جو چہرے گھر سے نکلتے وقت ہوا کرتے تھے۔ واپسی پر ویسے نہیں رہے۔ لیکن مجھے

یقین ہے کہ میرے شوہر کا وہی چہرہ ہوگا۔ جو وہ گھر سے نکلتے وقت لے کے نکلے تھے کہ وہ پچھلی زمین کے آدمی ہیں اور پچھلی زمین کے آدمی شاید دیر سے ہی بدلتے ہیں۔"

"میں وہی ہوں جو بازار گیا تھا اپنی بیوی کی منگوائی ہوئی اشیا لانے۔" مرد نے کہا۔ "یہ دیکھو!"

اور پھر وہ ایک ایک چیز کو تھیلے سے نکال کر عورت کے سامنے رکھنے لگا تو عورت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہ... یہ ساری چیزیں تو بلاشبہ میں نے اپنے شوہر سے ہی منگوائی تھیں لیکن تمہیں کیسے پتا چلا جو تم لئے چلے آئے۔" وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور پھر دانتوں کو ہونٹوں سے دباتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے اپنی فہرست میں بعض بہت ضروری چیزیں بھی لے آنے کی انھیں تاکید کی تھی جو انسان اور انسانیت کے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن آپ نے تو ایسی ایک بھی ضروری چیز نہیں لائی اگر وہ ہوتے تو ضرور لے آتے کہ وہ ان چیزوں کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔"

"ہاں!" مرد نے سانس کو اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ "تمہاری لکھائی ہوئی ان اہم چیزوں کو میں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا جو اب بازار سے غائب ہو گئی ہیں۔ لیکن میں انھیں کہیں رکھ کر بھول گیا اور لاکھ کوشش کے باوجود دوبارہ وہ مجھے کہیں بھی نہیں ملیں کہ حافظے سے اتر گئی ہیں۔ تم بتا سکتی ہو کہ وہ کیا چیزیں تھیں۔"

"مجھے بھی یاد نہیں رہیں۔" عورت نے کہا۔ "حالانکہ ابھی ابھی یاد آئیں تھیں اور ذہن سے نکل گئیں۔ لگتا ہے کہ بھٹکے ہوئے عہد نے حافظوں کو بھی بھٹکا دیا ہے کہ اب ہمارے وہ مشک ولوبان لوگ نہیں رہے جو اپنے اپنے ہاتھوں اور اپنی اپنی پلکوں پر ستارے سجائے رکھتے تھے۔ عہد حاضر کے نرگ موسموں اور گرم بازاروں نے انھیں ملیامیٹ کر دیا ہے کہ بہت سے ستارہ لوگ فلک سے اتر کر تحت الارض میں پہونچ گئے ہیں کہ تمعات دنیوی نے انھیں گھیر لیا ہے اور جب لوگ تمعات دنیوی میں گم ہو جاتے ہیں تو وہ تاریک راتوں کے سائے بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ تم اصل میں ہو کون اور یہ بہت سی چیزیں جو تم اپنے ساتھ لے آئے ہو۔ یہ تو بلاشبہ میں نے ہی لکھوائی تھیں اور یہ فہرست بھی میری ہی لکھی ہوئی ہے۔"

"ہاں!" وہ بولا۔ "یہ تحریر تمہاری ہی لکھی ہوئی ہے کہ تم نے ہی لکھی ہے لیکن اس میں سے میں غائب ہوں تو-نو!" اس نے اپنی نظر کو عورت کے چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وقت جب چٹکی بجاتا ہے تو کائنات کی بہت سی چیزیں اوپر نیچے اور ادھر ادھر ہو جاتی ہیں لیکن آدمی اس کی چٹکی کو سمجھتا ہی نہیں۔ اگر سمجھ جاتا تو ادھر اُدھر نہیں ہوتا۔ آسمان ہو جاتا۔ لیکن آج زمین ایک تماشا گاہ بن گئی ہے اور ہم سب کے سب اداکار ہو گئے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک اداکار۔ اور ہر اداکار اپنے فن کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش میں اپنے کردار اور ضمیر کو داؤ پر لگا کر چوٹی پر پہنچنے کی سعی میں لگا ہوا ہے جب کہ ایک بھی ناظر آج ہم میں موجود نہیں ہے اور یہ تماشہ چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان مسلسل چل رہا ہے لیکن لگتا ہے کہ اب چکی کا کوئی پاٹ ٹوٹنے والا ہے کہ روشنیاں بہت تیز ہو گئی ہیں۔"

"آپ کا یہ تدریسی بیان اپنی جگہ ٹھیک ہے۔" عورت نے حیرت سے مرد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ بتائیے کہ اگر آپ وہی ہیں تو پھر آپ کا وہ چہرہ کہاں چلا گیا جو زمین پر آتے وقت اور اس گھر سے نکلتے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے اور پھر آپ کی واپسی میں اتنی لمبی تاخیر کیوں ہوئی۔"

تو وہ بولا۔ "ہر قدم پر ایک نیا موسم۔ دن کو رات کرتا ہوا۔ کنوؤں میں گرم راکھ بھرتا ہوا۔ حافظوں کو غبار کرتا ہوا۔ سروں کو نگار کرتا ہوا۔ چہروں کو تار تار کرتا ہوا۔ زندگی کو غار کرتا ہوا۔ رشتوں کو مار (سانپ) کرتا ہوا۔ عریانیت کو معیار کرتا ہوا۔ مسلسل سبھوں پر سے گذر رہا تھا اور پھر اس قدر ہجوم کہ سب کے سب ایک دوسرے کو رگڑ رگڑ اور گھس گھس کر چل رہے تھے اور سب کے سب اپنے اپنے اندر سے بھٹک گئے تھے۔ گم ہو گئے تھے کہ تلاش کے باوجود خود کو حاصل نہیں کر پا رہے تھے اور پھر حاصل بھی کیسے کرتے کہ خودی کی پہچان ہی کہیں رکھ دی تھی اور اندر کی کائنات گھپ اندھیرے ڈوب گئی تھی کہ سارے چراغ بھک سے بھڑک کر بجھ گئے تھے اور سب کے ساتھ میں بھی اندھیرے میں کھو گیا تھا۔"

"لگتا ہے کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" عورت نے کہا۔ "گھروں میں بھی اب گرد و غبار داخل ہو گیا ہے۔ وہ دیکھئے کہ دھوپ ابھی دیوار کی بنیادوں پر تھی اور ابھی آدھی دیوار تک پہنچی اور پھر اب دیوار کے اُدھر چلی گئی۔ کتنی تیزی سے ساری چیزیں ادھر اُدھر چلی جا رہی ہیں۔ تاہم آپ کا چہرہ کہاں چلا گیا۔ حالانکہ آپ تو اپنے چہرے کی بہت حفاظت کیا کرتے تھے اور گھر سے نکلتے وقت آپ کا وہی چہرہ تھا جو آتے وقت آپ اپنی ماں کے پیٹ کے اندر سے لے آئے تھے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" مرد نے کہا۔ "لیکن میں اپنے چہرے کو اپنے ساتھ لے کر بازار نہیں گیا تھا۔ مجھے اس پُر ہجوم بازار میں اپنے چہرے کے گم ہو جانے کا خدشہ تھا کہ وہاں سب ایک دوسرے کے چہرے اتار رہے تھے۔ اس لئے میں نے اپنے چہرے کے ساتھ تمہارے چہرے کو بھی سیف میں ایک

خالی لفافہ میں رکھ دیا تھا۔"

"پھر اتنی دیر سے آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" عورت نے اپنے مرد کی آنکھوں میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"حافظ گم ہو گیا تھا کہ آج کل آسمان حافظوں کو گم کرنے میں لگا ہوا ہے کہ جب بھی قومیں راستوں سے بھٹک جاتی ہیں۔ آسمان حافظوں کو چھین لیتا ہے کہ اب ہم سب کے سب گم شدہ حافظوں والی آخری نسل ہیں۔" مرد نے کہا۔ "چنانچہ میں نے چہرہ، آوازیں، اقدار اور اصول تمام چیزوں کو اسی ایک لفافہ میں بند کر دیا تھا تا کہ کہیں گم نہ ہو جائیں۔ اور..."

"رُکو!" عورت نے انگلی کے اشارے سے مرد کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ وہ لفافہ کہاں رکھا تھا؟"

"اس کمرے میں؟" مرد نے دائیں جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں سب کے سب رہتے ہیں۔"

"آپ نے اس لفافہ پر کچھ اتہ پتا لکھا تھا کہ نہیں؟" عورت نے حیران کن آنکھوں سے مرد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں پتہ تو چلے کہ ہم اصل میں کہاں ہیں۔"

"اس لفافہ پر میں نے اپنا کوئی اتہ پتا نہیں لکھا تھا۔" مرد نے کہا۔ "البتہ اس لفافہ پر پہلے ہی سے جلی حرفوں میں صرف ختم شد لکھا ہوا تھا۔"

"چلو کہ چل کر دیکھتے ہیں۔" عورت نے مرد کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ دونوں اس کمرے میں پہنچے جہاں سب رہتے تھے جو اس وقت دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ دکھائی دینا باقیات کی نشانی ہے اور کمرے میں ایسی کوئی نشانیاں موجود نہیں تھیں البتہ بہت سے محراب چراغوں کے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے۔

"یہاں تو کوئی لفافہ موجود نہیں ہے۔" مرد نے تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "حالانکہ میں نے یہیں رکھا تھا۔"

"شاید اس لفافہ کو ہمارے بچوں نے یا ان کے بچوں نے کہیں رکھ دیا ہے اور رکھ کر بھول گئے ہیں۔" عورت نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہم سب کے سب بھول جانے والے عہد کا شکار ہو گئے ہیں۔"

"بچے!" مرد نے حیرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے بچے کب ہوئے۔ وہ بڑے کب ہوئے اور پھر ان کے بچے کب ہوئے اور پھر ہم بوڑھے کب ہوئے۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ بس یوں لگتا ہے کہ وقت نے چٹکی بجادی کہ وقت چٹکی ہی بجاتا ہے اور اس کی چٹکی بجاتے ہی سب کچھ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے یا غائب ہو جاتا ہے سو اس نے چٹکی بجادی اور ہمارے چہرے ہماری آوازیں ہمارے اصول سب غائب ہو گئے۔"

اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بیک وقت کہا:

"دیکھو دھوپ دیواروں کی بنیادوں سے ہوتی ہوئی اب دیواروں کے پیچھے چلی گئی ہے۔!!!"

OO

ناگہانی

حسین الحق

بی بی عزت النسا اپنا کام جلدی جلدی نپٹانے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے برتن مانجھتے مانجھتے ذرا دھڑ باہر کرکے دیکھا، شام بھاگی چلی آرہی تھی اور ڈھیر سارا کام سر پر پڑا تھا۔ دوپہر میں ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ سب الٹ پلٹ ہوگیا۔ یاد آیا کہ برتن دھو کر صبح سے پڑا کپڑا ابھی دھونا ہے۔ اور کپڑا ابھی پیشاب اور گندگی سے اٹا ہوا...

بچے بڑے ہونے لگے تو امید بندھی تھی کہ اب پوتڑے دھونے سے نجات مل جائے گی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ شوہر کو فالج مار گیا۔ چلنے پھرنے سے معذور بولنے کی کوشش کرتا تو بہ مشکل پانی، کھانا، نکل پاتا۔ عام بیماری میں آدمی چڑ چڑا ہوجاتا ہے، عزت النسا کا شوہر جلال الدین تو سخت بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ جب تک بھلا چنگا رہا تو اپنے نام کے مصداق ناک پر مکھی نہیں دی، کیا گھر اور کیا محلہ مجال کیا کہ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف ہوجائے اور وہ برداشت کرلے، تو تو میں میں سے گالی گلوچ پر اتر آتا مگر اپنی بات گرنے نہیں دیتا۔

عزت النسا بیاہ کر سسرال آئیں تو شروع شروع بڑی وحشت ہوئی، کس وحشی سے پالا پڑ گیا ہے؟ مگر بہن بھابی سہیلی سبھی نے سمجھایا کہ زمین دارانہ مزاج ہے، بڑے گھر کا بگڑا نواب، کچھ دنوں برداشت کرلو۔ آہستہ آہستہ اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا باندھو کہ سب کس بل ڈھیلا ہوجائے۔ عزت بی بی نے مشوروں کے مطابق اس کی بدسلوکی بلکہ وحشت کے مقابلے پر اپنا حسن سلوک نہیں بلکہ محبت آزمائی شروع کردی مگر جلال الدین کے اندر تو کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی بستر پر بھی عزت النسا کے ساتھ محبت بالجبر ہی کرتا تھا۔ اس کا عام مزاج یہ تھا کہ جب عزت النسا مائل ہوتیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کرلیتا جس کا اختتام عزت بی بی پر لاتوں گھونسوں سے ہی ہوتا اور پھر وہ بہت چین سے کروٹ بدل کے سوجاتا۔ عزت النسا کی کیا مجال کہ ایسے وقت میں اس کو اپنی طرف مائل کرپاتیں۔ پھر جب ان کی ماہواری کے دن آتے تو جلال الدین ان کی طرف رجوع ہوتا۔ ظاہر ہے ان چند دنوں میں وہ نجات کی خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن ان کی مصیبت کے دن بھی ہوتے۔ ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح انہیں نوچتا جھنجھوڑتا۔ عزت النسا بچنا چاہتیں مگر بچ نہیں پاتیں، اور پھر یہ بھی ہے کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النسا کے بھی چڑھتے دریا کا زمانہ تھا۔ لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات بھی ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہی ہے، سو بالآخر عزت النسا تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہوکر آنکھیں بند کرکے پڑ جاتیں۔

ان کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کی یادگار تھے۔

یہ سلسلہ شادی کے بعد تقریباً سات آٹھ سال چلا۔ بڑی بیٹی چھ سال کی تھی جب شوہر پر فالج کا حملہ ہوا، ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ عزت النساء کو حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے گرم مزاج آدمی کا بی پی ہائی ہوا تو حیرت کی کیا بات؟ مگر بلڈ پریشر ہائی ہونے کی جو وجہ تھی اس نے صرف جلال الدین کو مفلوج نہیں کیا پورے گھر کو فالج زدہ بنادیا۔

اب وہی نہیں رہا جس پہ میاں کودیں۔ زمیں داری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا۔ پورا گھر چلتا تھا۔ زمیں داری گئی تو گھر کے سارے ہائی ہوائی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کر اس کے بھائی بھی دوسرے شہروں کو سدھار گئے۔ بعد میں خبر ملی کہ وہ ان ہی شہروں سے پاکستان روانہ ہوگئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہہ سکے اور برس دو برس میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النسا کے مائکے والے پہلے ہی پاکستان جاچکے تھے۔ عزت النسا کی کائنات ان کے تین بچے تھے اور فالج زدہ شوہر!

عزت النسا کے لئے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔

اسی زمانے میں لالہ ہری ہر پرشاد اس کے گھر آئے۔

لالہ ہری ہر پرشاد جلال الدین کے خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد کے

چھوٹے بھائی تھے۔ بنسی دھر تھے تو جلال الدین کے ہم عمر، مگر کبھی جلال الدین کے سامنے بیٹھے نہیں دیکھے گئے۔ ڈیوڑھی پر جب آئے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہو۔ سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے۔ دھوتی کھول کر لنگی بنا لیتے اور برآمدے میں پڑی بینچ پر چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ اب اگر ایک گھنٹہ اندر سے کوئی باہر نہیں نکلا تو اس سے لالہ بنسی دھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کبھی لالہ کی خوش قسمتی سے اگر دس پندرہ منٹ بعد ہی اندر سے کوئی باہر آ گیا تو خبر ہو جاتی کہ لالہ آ گئے ہیں۔ مگر خبر ملنے پر بھی یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میاں (جلال الدین) لالہ سے مل ہی لیں۔

لالہ کا کام تھا کہ آئیں اور بیٹھ جائیں اور جب جلال الدین کہہ دیں یا کہلوا دیں تب ہی لالہ جائیں۔

گھر کی ساری ضرورت، ہینگ ہلدی سے کپڑے زیور تک لالہ ہی پوری کرتے۔ نہ کبھی لالہ نے پیسہ مانگا نہ کسی نے پیسہ دیا۔ جلال الدین نے کبھی لالہ سے کبھی حساب نہیں لیا۔ کتنا کھیت ہے کتنا نقدی پر گیا کتنے کی لالہ نے خود بوائی کرائی کتنا رہن رکھا گیا کتنا بیچا گیا یہ سارا معاملہ بنسی دھر کے ذمہ تھا۔ آخر تو وہ مختار عام تھے۔ مگر جب زمیں داری چلی گئی تو لالہ بھی کاہے کے مختار؟

یاد آیا باغ تو بچا ہوگا۔ مگر عزت النسا کس سے پوچھتیں، جلال الدین تو کہنے سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے، زندہ لاش نے کب کسی کو کچھ بتایا، سوچا کہ لالہ بنسی دھر سے پوچھا جائے مگر لالہ اب میسر کہاں تھے ہر دن ڈیوڑھی پر حاضری لگانے والے لالہ کو دیکھے ہوئے پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے۔ جلال الدین کے بیمار پڑنے کے بعد مہینے دو مہینے تک تو وہ پابندی نبھاتے رہے لیکن جب تمام ڈاکٹروں سے پوچھ تاچھ کر اطمینان کر لیا کہ یہ فالج اب موت کے ساتھ ہی جائے گا اور میاں اب کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ لالہ کی آمد میں ناغہ پڑنے لگا۔

جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو پہلی مرتبہ عزت النسا نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا۔ برقعہ پہن کر باہری پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

''مالکن۔ کہیں جانا ہے کیا؟''

''لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں۔''

''آپ کاہے جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔''

عزت النسا ہلکے سے ہنسیں ''زمانہ بدل چکا گھورن، مجھے ہی جانا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے مالکن۔ آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔''

'رہنے دو۔ پیدل چلی جاؤں گی''

گھورن ڈنڈوت ہوکے گڑگڑانے لگا: ''مالکن۔ ایسا مت کیجیے۔ جب تک ہم جیوت ہیں، یہ نہیں ہوگا۔''

عزت النسا ذرا آواز سے ہنسیں۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ ڈولی لے آؤ۔''

لالہ کے گھر عزت النسا پہنچیں تو گویا ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی۔ گھورن نے پہنچتے ہی گہار لگا دی تھی: ''مالک کے یہاں سے سواری آئی ہے۔'' لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی خود باہر آ گئیں...

''مالکن آپ؟''

''جی ہاں! سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔''

عزت النسا نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ کی۔ ان کی اپنی حویلی سے بڑی تھی، ان کے منشی کی حویلی۔ چاروں طرف قدم آدم چہار دیواری، احاطے کے اندر ایک طرف غلام گردش، دوسری طرف طویلہ، تیسری طرف گئو شالہ، ایک کنارے پر چھوٹا سا ایک مندر، مندر سے ذرا ہٹ کے کنواں، بیچوں بیچ لالہ کا مکان، باہری حصہ الگ، اس کے بعد ذرا ہٹ کر اندرونی حصہ، دونوں حصوں کو جوڑتی ہوئی ایک مختصر سی برساتی۔ اسی برساتی کے راستے ماتا جی عزت النسا کو لئے اندر چلی گئیں۔

مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے۔ سوا بنسی دھر کے! وہیں پہلی بار نظر آئے... لالہ ہری ہر پرشاد!

سرخی مائل گورا رنگ، تیکھا ناک نقشہ، متناسب قد و قامت، لالہ ہری ہر پرشاد کی خوب صورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی۔ اچانک سرسری طور پر عزت النسا نے سوچا: ''یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے، مجھ سے برس دو برس بڑا ہوگا۔''

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزت النسا تیس برس کی نہیں ہوئی تھیں۔

''لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟'' کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النسا نفس مطلب پر آ ہی گئیں۔

''بی بی۔ ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے۔ اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا، ہم نے نہیں سوچا تھا۔ تین ماہ پہلے اپنے بال بچوں کو لے کر دلی چلے گئے۔ اگر ہری ہر نہ ہوتا تو ہمیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا۔''

''ان کا پتہ؟'' عزت النسا کو اپنی آواز ڈوبتی محسوس ہوئی۔

''کوئی خیر خبر نہیں بی بی۔ بس یہاں سے اتنا کہہ کر نکلے کہ ہمیں اب اس شہر میں نہیں رہنا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔''

عزت النسا نے صاف محسوس کر لیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنی چاہتیں، عزت النسا یہ بھی سمجھ گئیں کہ اس کا مطلب کیا ہے اور یہی بات عزت النسا کا دل بیٹھانے والی تھی۔

''اچھا ماتا جی۔ میں چلتی ہوں۔''

گھر لوٹتے ہوئے ڈولی میں وہ جی بھر کے رو دیں۔ اس درمیان انھیں

کیا کیا نہ یاد آیا۔ بچپن کے دن، میکے کا آنگن، گھر کے پیچھے بغیچے میں لگے پھل پھول، سکھی سہیلی، بچپنے کے ڈھیر سارے کھیل، رشتے کا ایک بھائی جو اسے دیکھتا تھا تو دیکھتا ہی جاتا اور وہ اس کے باؤلے پن پر کھلکھلا کے ہنستی ہوئی بھاگ جاتی تھیں۔ ڈولی میں بی بی نے کئی دہائیاں بتا ڈالیں۔

گھر پہنچیں تو سب الٹ پلٹ دکھائی دیا۔ شوہر بستر ہی پر گندگی پھیلا چکا تھا۔ بچے رو رہے تھے۔ بڑی بیٹی اپنے جانتے سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر باپ تو بہر حال اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ عزت النسا نے پہلے شوہر کی گندگی صاف کی پھر بچوں کو سنبھالا اب باورچی خانے کی طرف پلٹ کے تاک سکیں۔ باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی۔ سب کو کھلا پلا کر وہ بستر پر گئیں تو دماغ اڑ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ شوہر کا علاج تو دور کی بات، کھانے کپڑے کا انتظام مشکل ہو گیا تھا۔ نزدیک و دور نگاہ دوڑائی، کوئی بھی تو اس مصیبت کی گھڑی میں کام آنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک بھگدڑ 1947 میں مچی اور دوسری زمینداری کے خاتمے کے بعد۔ نزدیک و دور جس کے بارے میں سوچتیں تو یاد آتا کہ وہ تو پاکستان چلا گیا۔ انہیں لگا کہ اگر جلال الدین مفلوج نہ ہوتا تو شاید وہ بھی پاکستان ہی میں پائی جاتیں۔

گزشتہ چھ مہینوں میں کیا نہیں ہو گیا۔ انہوں نے سوچا۔ گھر کا سارا سامان بکا۔ وہ بی بی صاحب سے استانی جی بن گئیں، اس سے بھی کام نہ چلا تو لوگوں کے کپڑے اور بستر سینے لگیں۔ میلاد پڑھانے لگیں۔ مگر بات تو پھر بھی نہیں بن پا رہی تھی۔ حکیم صاحب کہتے مفلوج کو کبوتر کے گوشت کا عرق چاہئے۔ مولوی صاحب کی فیس باقی تھی، نیا سال شروع ہو گیا، نئے درجے کی کتاب کا مسئلہ، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ عزت النسا ایک دن کا انتظام کرتیں تو دوسرے دن کے لالے پڑ جاتے۔

بی بی عزت النسا کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ان کا سر پھٹ جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جب لالہ ہری ہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

پوس کا مہینہ جا رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی، اندھیر اللہ گھمنڈ کر عزت النسا کے گھر پر برس رہا تھا، دور دور تک کہا سا پھیلا ہوا تھا، رات تھوڑی آگے بڑی تھی، دروازہ ابھی بند نہیں کیا گیا تھا کہ اچانک محسوس ہوا، دروازے پر کوئی ہے۔

عزت النسا سمجھ نہیں پائیں۔ اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہو سکتا ہے۔ مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان کم اور یقین زیادہ ہوا۔ انہوں نے لالٹین کی مدھم لو ذرا تیز کی اور بڑی بیٹی رقیہ کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

لالٹین کی روشنی میں ہیولا نمایاں ہوا... دروازے پر لالہ ہری ہر پرشاد کھڑے تھے۔

''لالہ جی آپ؟''

لالہ ہری ہر پرشاد دونوں ہاتھ جوڑے کھڑے رہے۔

کچھ دیر تو وہ لالہ کو صرف دیکھتی رہیں، دراصل وہ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں... مگر چند ہی لمحوں بعد وہ سنبھل سی گئیں... لالہ جی رکئے گا... ایک منٹ'' کہتی ہوئیں پلٹیں۔ جلدی سے باہری بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ چکنے سے بچی اور گرد میں اٹی دو کرسیوں اور وہیں پر پڑے ٹیبل کو جلدی جلدی صاف کیا اور دروازے کی طرف لپکیں... ''لالہ جی آیئے!''

لالہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔ عزت النسا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو لالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور آہستہ سے بولے ''نہیں ہو سکتا، پہلے آپ بیٹھیں۔'' عزت النسا مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔ لالہ کے بیٹھنے کو نصف نشست 'یا' مودبانہ نشست' کہا جا سکتا ہے... کچھ دیر دونوں کے درمیان خموشی کا صحرا پھیلا رہا عزت النسا نے محسوس کیا کہ لالہ پہل کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

''آپ نے کیسے کیسے تکلیف کی؟''

''شرمندہ ہوں۔'' لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔ ''پہلے ہی آنا چاہتا تھا، ہمت نہیں کر سکا آج ادھر سے گزر رہا تھا تو طبیعت بہت بے چین ہو گئی۔''

عزت النسا نے حیرت سے اسے دیکھا اور حیرت سے سنا بھی۔ لالہ کے لہجے میں حزن اور اضطراب دونوں شامل تھا۔ انہیں رشتے کا وہ بھائی یاد آ گیا جو ان کے لئے بولایا بولایا پھرتا تھا۔ شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ ملا تھا اور بہت بوجھل لہجے میں پوچھا تھا۔ ''بی بی کیسی ہیں آپ؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔'' بعد کے دنوں میں اس کی آواز پھر گونجی تو انہیں ایسا لگا جیسے مرتا ہوا آدمی خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ عزت النسا اندر سے کانپ سی گئیں۔

''لالہ کی آواز پر وہ باؤلا کیوں یاد آ گیا؟''

لالہ اس دن تھوڑی دیر ہی بیٹھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رخصت ہو گئے۔ دو دن چار دن جب ہفتہ گزر گیا تو عزت بی بی جیسے لالہ کا آنا بھول سی گئیں۔ ان کا ہر دن بغیر کسی وجہ اور سبب کے بسر ہوتا رہا۔

ایسے ہی بے سبب اور بے مصرف دنوں میں سے کسی ایک دن... لالہ ہری ہر پرشاد دوبارہ آئے۔ بیٹھتے ہی پوچھا: ''بچے کہاں ہیں؟''

''سو گئے۔'' عزت النسا نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا رقیہ بھی؟''

''نہیں وہ پڑھ رہی ہو گی۔''

''ذرا تکلیف کر لیجئے۔ اسے بلایئے۔''

عزت النسا رقیہ کو بلا لائیں۔ لالہ نے رقیہ کی ٹھوڑی چھو کر پیار کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا، اور پھر بغل میں رکھا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''بیٹا! آپ بھائی بہنوں کے لئے۔''

رقیہ کا ہاتھ بے ساختہ پیکٹ کی طرف بڑھا۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''لالہ جی اس کی کیا ضرورت تھی؟''

لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔ ''بچوں کے لئے ہے۔ راستے میں مٹھائی کی دوکان پر نظر پڑ گئی تو جی چاہ گیا۔''

''لے لو بیٹا تحفہ ٹھکراتے نہیں۔'' کہتے کہتے ان کی آنکھیں دھندلا گئیں یاد کرنا چاہا کہ بچوں نے مٹھائی کب کھائی تھی تو یاد نے ساتھ چھوڑ دیا۔

''چائے لے آؤ'' رقیہ جانے لگیں تو عزت النسا آہستہ سے بولیں۔

''اب رات زیادہ ہوگئی۔ اس وقت تکلیف مت کیجئے۔'' آواز لالہ جی تک تو پہنچ ہی گئی۔ ان کے ہاتھ پھر جڑ گئے تھے۔

''لالہ۔ اس گھر میں تو اس وقت سے محفل جمنی شروع ہوتی تھی۔'' عزت النسا کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

اس موڑ سے عزت النسا لالہ ہری ہر پرشاد کے سامنے کھلنی شروع ہوئیں۔ لالہ اب ہر دوسرے تیسرے دن آنے لگے۔ اور جب آتے تو بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے۔

پھر ایک دن لالہ آئے کچھ دیر بیٹھے اور جلدی ہی اٹھ گئے۔ چلنے لگے تو باہری دروازے پر پہنچ کر رکے اور ایک رومال دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھ کر عزت النسا کی طرف بڑھایا۔ انداز نذر پیش کرنے والا تھا اور لہجے میں التجا کا درد اور خوف شامل تھا۔ ''انکار مت کیجئے گا۔''

عزت النسا کچھ سمجھ نہیں پائیں... اندھیری رات، ہوا تیز، برشگال کا شور / کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی / ان آندھیوں میں کفِ دست کا سہارا کیا... ان کے کچھ فیصلہ کرنے یا کہنے سے پہلے لالہ نے رومال ان کے ہاتھوں پر رکھ دیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

عزت النسا نے دروازہ بند کیا اور دروازے ہی سے ٹک کے کھڑی ہوگئیں۔ رومال کھولا۔ شروع چاند کی رات تھی، چاند کی کم کم روشنی میں انہوں نے دیکھا۔ سو سو کے پانچ نوٹ رومال میں باندھے گئے تھے۔

عزت النسا وہیں پر جیسے تھونس کر بیٹھ گئیں اور پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

لالہ اس کے بعد دس پندرہ دن نہیں آئے۔ یہ عرصہ عزت النسا کے لئے بڑی بے چینی اور امتحان کا عرصہ تھا۔ گھر اپنی بدحالی کی انتہا پر تھا اور رومال میں بندھا پانچ سو روپیہ عزت بی بی کی صندوقچی کے بالکل نچلے حصے میں پڑا ہاتھوں کے لمس کو ترس رہا تھا۔ اس درمیان کتنی مرتبہ بچے روئے مچلے بی بی کتنی مرتبہ اندر اندر ٹوٹیں بکھریں، ان سے یہ پوچھنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ایسے ہی کئی بے پناہ لمحوں میں ان کی نگاہ شوہر کی طرف اٹھی اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ غصہ، نفرت، ترس، بیک وقت کئی جذبوں کی قید میں ہیں۔

ایسے کئی بے پناہ لمحوں میں انہیں ایک ہی سوال پریشان کرتا۔ ''یہ تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے مگر میں نے اور ان بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟''

کبھی کبھی بی بی عزت النسا تھک جاتیں ٹوٹنے لگتیں، سوچتیں، اب ایسا بھی کیا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ لالہ بنسی دھر مختار عالم تھے، جو کچھ بکا ہوگا کیا اس کی خبر لالہ ہری ہر کو نہ ہوگی؟ ہو سکتا ہے ہری ہر پرشاد نے بنسی دھر کو خبر کی ہو اور بنسی دھر ہی نے یہ پیسہ بھجوایا ہو۔'' یہاں تک پہنچ کر وہ صندوقچی کی طرف دوڑتیں۔ مگر تالا کھولتے کھولتے خیال آتا۔ ''ماتا جی نے تو صاف کہہ دیا کہ بنسی دھر کو خبر نہیں، چٹھی پتری کے لئے کوئی پتہ نہیں، پھر لالہ ہری ہر نے اس کو خبر کیسے کی ہوگی؟ تب یہ پیسہ؟''

عزت النسا ٹھٹھک جاتیں، پلو سے آنکھیں صاف کرتیں اور صندوقچی کے پاس سے ہٹ جاتیں۔

جیون تیرے رنگ ہزار، زندگی کبھی بادِ بہاراں، کبھی موج صرصر، کبھی امس، کبھی کھلی ہوا...

عزت النسا کے لئے ان دنوں جینا مدّ و جزر میں گھرے آدمی کا اُپچھ کرنا تھا۔ کبھی کبھی عزت بی بی اپنے آپ سے پوچھتیں۔

''اس میں مد کہاں ہے عزت النسا...''

ایسے ہی بے تھاہ لمحوں میں، لالہ ہری ہر پرشاد نے ایک شام پھر دستک دی، کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النسا پوچھ ہی بیٹھیں:

''لالہ بنسی دھر کی کوئی چٹھی پتری آئی؟''

''جی نہیں۔ ان کی کوئی خبر نہیں''

''اور آپ لوگوں نے کوئی خبر لی بھی نہیں؟''

''میں نے تو ارادہ کیا تھا مگر ماتا جی آڑے آگئیں۔''

''کیوں؟ ماتا جی کیوں؟''

''اب چھوڑیے جانے دیجئے اس تفصیل میں مت جائیے۔''

''لالہ میرے لئے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔ کچھ بھی چھپائیے مت۔''

لالہ نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور بہت بوجھل لہجے میں بولے۔ ''ماتا جی سے ان کا اختلاف ہوگیا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ تم جس جائداد کے مختار عام ہو، اس میں جو بھی بچا ہے، وہ اصل مالک کو لوٹا دو۔''

عزت النسا کے پاس اب پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا؟ یہ سمجھ گئی تھیں کہ لالہ کیا

چھپانا چاہ رہے تھے اور لالہ بھی سمجھ گئے تھے کہ بی بی کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ دونوں کے درمیان ترسیل کی کامیابی کا سانپ پھن کاڑھے کھڑا تھا اور کچھوے کی رفتار سے رینگتی رات دونوں کے گرد اپنا جال بہت آہستگی کے ساتھ مگر بہت مضبوطی سے بنتی جارہی تھی۔ عزت النسا اس جال کو توڑنا چاہتی تھیں مگر وہ محسوس کررہی تھیں کہ گھر پر فالج کا حملہ ہوچکا ہے۔ انھیں لگا وہ عورت بھی رہی ہوں گی مگر اب وہ ایک مکھی ہیں جسے کسی دیونے دیوار پر چپکا دیا ہے۔ انھوں نے غور سے لالہ ہری ہر پرشاد کو دیکھا... کیا وہ دیو یہی ہے؟... لالہ کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت بکھری پڑی تھی۔

اچانک لالہ ہری ہر پرشاد کھڑے ہوگئے۔ ''بی بی! میں چلتا ہوں۔''

''لالہ جی۔ ایک منٹ۔''

بی بی عزت النسا کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اور پھر وہ اچانک بالکل بے خودی اٹھیں، تیزی سے اندر گئیں، صندوقچی سے پوٹلی نکالی، اور اسی بے خود انداز میں، تیز قدموں چلتی، باہری بیٹھک میں آئیں اور پوٹلی لالہ کی طرف بڑھائی: ''لالہ جی آپ کی امانت!''

لالہ ایک منٹ تک بس ایک ٹک انھیں دیکھتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں روپیوں کی پوٹلی تھی اور وہ ہاتھ لالہ کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ لالہ نے آہستہ سے وہ پوٹلی لی، جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دی، اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بغیر آواز کے زار و قطار رونے لگے۔ عزت النسا نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ لالہ کے آنسوؤں سے تر بتر ہوا جارہا تھا۔

یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ اپنی ہی انجانی۔ عزت النسا نے چھٹپٹا کر صدیوں پر محیط لمحے کے تیز پر شور دھارے کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو بچانا چاہا مگر انھیں محسوس ہوا کہ عجیب ان دیکھا سا ایک تیز پر شور دریا تو خود ان کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس بھیانک اور قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انھیں پھر یاد آیا، جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور جس کی آواز سمندر کی آخری تہوں سے آتی سنائی دی تھی۔ ''بی بی۔ آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔''

لالہ اس حال میں اندازاً دو تین منٹ بے خود سے رہے اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

اس رات عزت النسا پر رنگوں نے یلغار کی۔ لال، بلو، کاسنی، فیروزی، چمپئی، زرد، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، آسمانی، دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا... رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد، دھند میں ڈوبا ہوا، پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ طوطا، مینا، بلبل، پپیہا، شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، تیتری، مور، باز، ساری رات وہ کیسی پر شور دریا میں اُب ڈبھ کرتی رہیں، ساری رات تھپیڑے انھیں ایک تنکے کی طرح سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بنائے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انھیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑیا کی طرح اچھالتا رہا۔

آنکھ کھلی تو انھوں نے کالا رنگ، باز پرند، دریا کے بے پناہ تھپیڑے اور صحرا کی سلگتی دوپہر یاد رکھی۔

مگر اس دن ایک بات اور بھی ہوگئی... وہ نہا کر آئینے کے سامنے بال سنوارنے بیٹھیں تو اچانک اپنے آپ کو نظر آگئیں اور انھیں حیرت ہوئی وقت کے تھپیڑے ان کا آپا سراپا نہیں چھو پائے تھے۔ لمبے بال، سرخی مائل دودھیا رنگت، خوب صورت نقش و نگار، بی بی عزت النسا کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی جس میں اپنے آپ سے شرمانے کا انداز نمایاں تھا۔

''بی بی یہ بندے پہن لیجیے۔ بہت اچھی لگیں گی۔'' اچانک آئینے کے جسم پر برسوں پرانا بھولا بسرا وہ باؤلا رشتہ دار چھا گیا۔

''پاگل۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

''آپ کو پتہ ہے؟ آپ ہنستے ہوئے سر کو جھٹک کر آگے بالوں کو جو پیچھے پھینکتی ہیں تو کائنات کی سانس رک جاتی ہے۔''

''اے بھاگو۔'' عزت النسا کو یاد آیا انھوں نے اس باؤلے کی پیٹھ پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے اسے دوڑا دیا تھا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

پتہ نہیں کب کا سنا شعر ان کے ذہن میں رینگ گیا، اور جیسے ہی ذہنی رو، دوسرے مصرعے پر پہنچی تو آئینے کے جسم پر لالہ ہری ہر پرشاد جھلملانے لگے۔

''لاحول والا قوۃ!'' عزت النسا ہڑبڑا کر آئینے کے پاس سے ہٹ گئیں۔

مگر ایک بات ضرور ہوئی۔ اس دن اس پوٹلے میں سے انھوں نے سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور برقعہ پہن کر بازار روانہ ہوگئیں۔

دوسری بات یہ بھی عجیب ہوئی کہ اب انھیں لالہ ہری ہر پرشاد یاد آنے لگے۔ خاص طور پر جب وہ جلال الدین کی گندگی صاف کررہی ہوتیں تو جیسے ایک جھما کہ سا ہوتا... گھٹنوں کے بل بیٹھا، ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتا ایک شخص... ایک قد آور جوان رعنا!

وہ سر جھٹکتیں، ذہن کو دوسری طرف مرکوز کرتیں، مگر کوئی تھا جو لپ جھپ کرتا آتا رہتا، جاتا رہتا۔

اس مرتبہ لالہ لگ بھگ بیس دن کے بعد آئے۔

آئے بھی تو یوں کہ دستک نہیں دی۔ شام اور رات کے جھٹپٹے میں اندر داخل

ہوئے اور دروازے کے اندرونی حصے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ عزت النسا باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مگر کچھ عجب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکلیں۔ سب حسب دستور تھا۔ جلال الدین اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا، بچے لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے، چھوٹا بیٹا سو گیا تھا... انہیں اطمینان ہوا، اپنے کام میں مشغول ہو گئیں... مگر دو چار منٹ بعد پھر انہیں کچھ... معمول سے الگ محسوس ہوا... وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ دل بے کل کیوں ہے... پھر پتہ نہیں ان کے من میں کیا آیا۔ وہ دروازے کے طرف متوجہ ہوئیں، ذرا آگے بڑھیں پورا اندھیرا انہیں چھایا تھا... دروازے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے پہچان گئیں... لالہ چپ کھڑے تھے!

''ارے آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں؟ دستک کیوں نہیں دی؟''

''ہمت نہیں ہوئی۔'' لالہ بہت مری ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ بھی لالہ جی... کمال کے آدمی ہیں... آیئے آیئے۔''

وہ پیچھے پیچھے باہری بیٹھک کی طرف آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

''میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔ چولہے پر سبزی چڑھی ہوئی ہے۔'' وہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

جلدی سے انہوں نے چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھا دی۔ طشتری میں اس دن بازار سے لایا کچھ ناشتہ رکھا اور پھر ایک ٹرے میں چائے پانی اور ناشتے کی طشتری سجا کر باہری بیٹھک کی طرف بڑھیں۔

''ارے یہ کیا کیا آپ نے؟'' لالہ ان کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''لالہ جی'' عزت النسا کی ہنسی میں اداسی بھی شامل تھی۔ ''اس میں میری بہت تھوڑی سی، صرف محنت لگی ہے۔'' انہوں نے صرف پر ذرا زور دیا۔

''بی بی۔'' لالہ ہاتھ جوڑے جوڑے بولے: ''جو چاہے سزا دے لیجئے، مگر آپ کا دل دکھانا میرا مقصد نہیں تھا۔''

عزت النسا مدتوں بعد، پہلی مرتبہ آواز کے ساتھ ہنسیں، ایک لمحے کے لئے انہیں لگا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔ لالہ پہلی مرتبہ کچھ دیر تک رکے، تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النسا کے میکے کی طرف مڑا، اور یوں مڑا کہ خود انہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستانوں سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں... وہ مائکے کے کمروں دالانوں اور آبگینوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں، بالا ریزے گلی میں مداری کا تماشہ دیکھتی رہیں، باپ کی شفقت ماں کی ممتا، بہنیں بھابھیاں، سکھی سہیلیاں، محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اترتا اور سارے آپے سراپے کو شانت کرتا سمے.....

عزت النسا جلال الدین کے علاوہ سب کے بارے میں بتاتی رہیں اور لالہ بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔

مسجد سے عشا کی اذان کی آواز گونجی تو وہ چونک اٹھیں۔ ''ارے اتنا وقت ہو گیا؟''

لالہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ''معاف کیجئے گا میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا۔''

''نہیں لالہ۔ تم نے تو مدتوں بعد مجھ ابلا کو وقت کی قید سے آزادی دلائی۔'' عزت النسا نے سوچا مگر بولیں نہیں۔

لالہ کرسی سے اٹھے، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہری دروازے تک آئے۔ عزت النسا منتظر تھیں کہ وہ باہر جائیں تو دروازے کا قلابہ اب لگا ہی دیا جائے۔ مگر لالہ ڈیوڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گئے۔ دو قدم پیچھے ہٹے اور بی بی کے بہت قریب آ گئے۔ بی بی نے حیرت سے انہیں محسوس کیا۔

''ایک بات کہوں؟'' لالہ کی آواز بہت بوجھل اور گھبرائی ہوئی سی تھی۔

''کہیے۔'' عزت النسا کی حیرت کا عرصہ ابھی مختصر نہیں ہوا تھا۔

''برا تو نہیں مانئے گا؟''

''اب تک آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے؟''

''گھر آنے سے منع تو نہیں کر دیجئے گا؟''

''اور آتا کون ہے؟''

''عرض کروں؟''

''ارشاد فرمایئے۔''

''میں آپ کو... سورج کی روشنی میں... ایک مرتبہ... جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں اس میں حرج کیا ہے؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف، میری خبر لینے والا یا میری گرفت کرنے والا کوئی بچا نہیں، سب پاکستان جا چکے۔ ارد گرد کے زیادہ مکانات شرنارتھیوں کو دے دیئے گئے۔ یہ بھی صحیح کہ پرانے ملنے والوں میں جو لوگ بچے ہیں، ان میں زیادہ تر سے جلال الدین کے مزاج اور بدکلامی کے سبب دوری بلکہ دشمنی کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ اب جب ہم خود محتاج ہو چکے، بھلا دوستی میں کیوں بدلنے لگا۔ اس کے باوجود نزدیک و دور کی گلیوں میں غریبوں کے کچھ گھر تو بچ ہی گئے ہیں۔ ان کی بچیاں پڑھنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی مائیں بہنیں بھی دن رہتے ہی آتی ہیں۔ ان سبھوں کو ان شرنارتھیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں آپ کو دن میں کیسے بلاؤں؟''

اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کا منہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے: "بی بی میں مر جاؤں گا... مجھے تھوڑی سی سانس... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔" لالہ کی آواز کی سمفنی میں آنسوؤں کی آمیزش کا احساس بہت طاقت ور تھا۔

عزت النسا کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہری ہر پرشاد نہیں ہے... یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے، جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔

عزت النساء کا جی چاہا... پہلی مرتبہ جی چاہا کہ...

وہ بالکل بے خود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں... ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے کو اپنے ہالے میں لینے کے لئے بے تاب تھے... وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی محسوس ہو رہی تھیں۔

گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النسا کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے دیکھتا ہے۔

بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا چہرہ لالہ کی پیاسی آنکھیں... یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اُس ٹکڑے نے دیکھا جس کا ناموجود شامیانہ ان دونوں پر تنا ہوا تھا۔

مگر پل بھر میں منظر بدل گیا۔ بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں... پھر بڑی مشکل سے... لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النسا ... آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں، اور رندھی آواز میں بولیں۔ "لالہ میرا جینا مشکل مت کیجئے۔ میرے سر پہ بڑا بوجھ ہے۔"

لالہ تڑپ کر کھڑے ہو گئے۔ عزت النسا کے آنسو لالہ کے ہاتھ پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ لالہ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں تک لائے، پھر ان پیاسے ہونٹوں نے بی بی کے آنسوؤں کو جیسے چوم لیا۔ اور لالہ کی آواز قرنہا قرن کی مسافت طے کرتی، عزت النسا تک پہنچتی محسوس ہوئی:

"بی بی۔ مریں آپ کے دشمن۔ آپ یہ سارا بوجھ تنہا کیوں اٹھائیں؟"

"لالہ آپ جائیے۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔" عزت النسا نے ہاتھ جوڑ لئے اور لالہ تڑپ گئے۔

"بس بی بی... بس میں جاتا ہوں۔" وہ آگے بڑھے پھر رک گئے۔ آہستہ سے کہا "اسے لیتی جائیے۔" لالہ نے ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہے؟"

"مجھے اتنا تو یقین ہو گیا ہے کہ آپ میری شردھا ٹھکراتی نہیں ہیں" لالہ کے لہجے میں ذرا سی شگفتگی تھی۔

عزت النسا آہستہ سے مسکرائیں... اچھا خدا حافظ!

دروازے کا قلابہ لگا کر عزت النسا اس کمرے میں آئیں جس میں نہ شوہر تھا نہ بچے۔ انہوں نے پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں سب بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ساتھ ایک ساری بھی تھی۔ اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے اچانک عزت النسا کو یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ لالہ نے جو روپے دیئے تھے اس پر ایک ماہ کی مدت گزر چکی۔

"خداوندا! میں کیا کروں؟" عزت النسا آہستہ سے بڑبڑائیں۔

اس سوال کا جواب عزت النسا کو کبھی نہیں مل سکا۔ البتہ لالہ ایک ہفتہ بعد پھر آئے۔ عزت بی بی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹیں کہ وہ اندر آجائیں۔ مگر لالہ خلاف توقع ڈیوڑھی پر ہی کھڑے رہے۔

"کھڑے کیوں ہیں؟ اندر کیوں نہیں آتے؟"

"نہیں اندر نہیں آؤں گا۔ یہ خط آپ پڑھ لیجئے گا۔"

لالہ نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔

عزت النسا نے کمرے میں آ کر لالٹین کی لو تیز کی۔

میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں... آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں... مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے، وہ میں تاحیات کیے جاؤں گا۔ اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے... مجھے بس تھوڑی سی سانس... تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔

لالہ ہری ہر پرشاد

"پیلی کوٹھی۔" بائی پاس روڈ پر، پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان
موجود رہنے کا وقت گیارہ بجے دن سے دو بجے دوپہر تک۔ بدھ اور اتوار

دوسرے دن اتوار تھا

بی بی عزت النسا تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئی تھیں۔ گھر پہنچیں تو محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی دن، مغرب بعد، اس کے یہاں محفل میلاد شریف تھی۔

میلاد میں جانے کے لئے بی بی عزت النسا نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خود عزت النسا کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

بی بی عزت النسا روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں۔

خدا کے قہر سے روزِ جزا، بچالینا
بہت ہوں عاجز و ناچار، یارسولؐ اللہ

OO

درد نہ جانے کوئی

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

کرکٹ میچ دیکھنے کا تو ایک بہانہ تھا۔ اسے چاہ تھی پاکستان جانے کی۔ پاکستان، جہاں سے اس کا خاندان ستاون برس پہلے، ملک کی تقسیم کے بعد 'اس طرف' آ گیا تھا۔ اس طرف، جو اب ہندوستان یا بھارت ہے۔

اسے چاہ تھی لاہور دیکھنے کی، جہاں سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ اسے چاہ تھی کراچی دیکھنے کی جہاں وہ صرف ایک بار، آٹھویں جماعت کے دنوں میں سیر کے لئے گیا تھا۔ اسے چاہ تھی لائل پور دیکھنے کی، جس کا نام اب 'فیصل آباد' ہے جہاں اس نے بچپن اور لڑکپن کے بہت سے برس گذارے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ چاہ تھی اسے چنیوٹ دیکھنے کی، جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ چنیوٹ جو دریائے چناب کے کنارے آباد ہے، جس دریا کے بارے میں مشہور ہے کہ اس میں پانی نہیں، محبت کرنے والے دلوں کا خون بہتا ہے۔ جو سوہنی مہیوال جیسی رومانی داستانوں کے لئے مشہور ہے جس کے بارے میں وہاں کے نوجوان یہ گیت گنگنایا کرتے ہیں۔

بلّے بلّے وے چنا دیا پانیاں

تیرے کنڈیاں تے عاشقاں نے موجاں مانیاں

اے دریائے چناب کے پانی! تیرا کیا کہنا!

تیرے کناروں پر محبت کرنے والوں نے موج مستی کے دن گذارے

اگست 1947 میں آخری بار اس نے اپنا وہ شہر دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ آج تک وہاں نہ جا سکا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا۔ لیکن ہر بار ایک عجیب قسم کے خوف نے اسے اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ یادیں جو اس کے سینے کے اندر گہری، بہت گہری دبی پڑی ہیں، اچانک اُبھر نہ آئیں اور اسے تڑپانے نہ لگیں۔ وہ وہاں سے لوٹے گا کیسے؟ اس کے کچھ دوست اور رشتہ دار جو پاکستان گئے تھے، اپنے شہر کو، اپنے مکان کو دیکھتے تو وہاں سے لوٹتے وقت آنکھوں میں آنسو اور دل میں درد لے کر آئے تھے۔ اپنی مٹی سے جدا ہونے کا درد! ستاون برس پہلے جب وہ اپنی مٹی سے بچھڑے تھے تو دُکھ اس وقت بھی تھا، لیکن اس وقت اس دُکھ پر جان بچا کر صحیح سلامت ہندوستان پہنچنے کی فکر غالب تھی!

جب گھر سے نکلے تھے تو اس خیال سے نکلے تھے کہ چند روز کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ بھلے ہی پاکستان میں رہیں گے لیکن رہیں گے تو اپنے گھر میں، اپنے شہر میں، لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے ان پر واضح ہو گیا تھا کہ ان کا گھر، ان کا شہر اُن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا تھا۔ اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان سے بھی بہت سے لوگ پاکستان آ رہے ہیں۔ یعنی سیاست کی سطح پر یہ آبادیوں کا تبادلہ تھا! ان 'ریفیوجیوں' کو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے والوں کے مکانات اور زمین الاٹ ہوئے اور ان کی چھوڑی ہوئی زمین اور مکانات ہندوستان سے پاکستان جانے والے 'مہاجروں' کو الاٹ کئے گئے۔ نہ جانے اُن کے مکان کا اب کون مالک ہے؟

اس کے والدین آگرہ میں بس گئے۔ اور پھر وہیں اس کی اور اس کے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوئیں۔ شروع شروع میں انہیں اپنا شہر، اپنا محلّہ، اپنا گھر بہت یاد آتا، لیکن پھر یادوں کا وقفہ لمبا ہوتا چلا گیا۔ اور جب اس کے والدین کی نسل ختم ہو گئی تو یہ یادیں اور بھی کم ہو گئیں۔ اس کے اپنے بچوں کے سامنے، جو ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، ان یادوں کو دُہرانے کا مطلب، محض انہیں 'ایڈونچر اسٹوریز' سنانا ہو گیا۔

ان ستاون برسوں میں نہ صرف اس کے والدین کی نسل ختم ہوئی، اس کی اپنی نسل کے بھی کئی افراد چل بسے۔ اور اب تو اس کے پوتے پوتیاں اور دو بیٹے دو بیٹیاں بھی شادی کے لائق ہو گئے تھے۔

اچانک ایک روز دلی سے اس کی بیٹی کا فون آیا۔

''پاپا! آپ اور ممی پاکستان جانے کا پروگرام بنایئے۔ ہم لوگ بھی چلے چلیں گے۔ کرکٹ کا میچ بھی دیکھیں گے۔ لاہور بھی دیکھیں گے اور آپ کا

شہر چنیوٹ بھی دیکھ آئیں گے۔ ہزاروں لوگ پاکستان جا رہے ہیں۔ بڑی آسانی سے ویزا مل رہا ہے۔"

"نہیں بیٹی۔ چنیوٹ جائیں گے تو وہاں سے اُداسی لئے لوٹیں گے۔ ایک ڈپریشن۔ کیا فائدہ؟"

"ارے پاپا۔ ہم جو ہوں گے آپ کے ساتھ۔ ہم آپ کو بغیر اُداسی کے صحیح سلامت لے آئیں گے۔ چلئے، بھائی اور بھابی کو بھی تیار کرتے ہیں۔"

لیکن نہ تو اس کی بیٹی اور داماد جا سکے، نہ ہی اس کا بیٹا اور بہو۔ اور اس نے اپنی بیوی کے ساتھ پاکستان جانے کا پروگرام بنا ہی لیا۔

اور اب وہ دونوں میاں بیوی لاہور جا رہے تھے!

اس کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے لاہور کا میچ دیکھیں گے اور لاہور دیکھیں گے۔ اور اس کے بعد اپنے شہر جائیں گے۔ اس کی بیوی نے لاہور دیکھا ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس نے پاکستان کا کوئی شہر نہیں دیکھا تھا۔ وہ لوگ کاروبار کی وجہ سے تقسیم سے بہت پہلے آگرہ میں آ بسے تھے۔ لیکن اس کی بیوی نے یہ ضرور سُن رکھا تھا کہ "جس نے لاہور نہیں ویکھیا، او جمیا ای نئیں" (جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا) اور یہ اس نے پاکستان بننے سے پہلے سن رکھا تھا۔ اور اب اس کا خیال تھا کہ لاہور دیکھ لیا اور اپنے شوہر کا شہر چنیوٹ دیکھ لیا تو سمجھو پاکستان دیکھ لیا! اس کے شوہر کا شہر، اس کا محلہ، اس کی گلی، اس کا مکان۔ اور کیا دیکھنا ہے اس نے پاکستان میں؟

وہ لوگ لاہور پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کے باسیوں نے بڑے خلوص کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہیں میچ دیکھنے میں اتنا مزا نہیں آیا، جتنی خوشی انہیں وہاں کے باشندوں کا اپنے تئیں سلوک دیکھ کر ہوئی۔ انہیں لگا جیسے وہ سچ مچ اپنے بچھڑے ہوئے بہن بھائیوں سے مل رہے ہوں! رکشا والا ہے تو اس نے بھاڑے کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ ریسٹورنٹ والا ہے تو اس نے چائے یا ناشتہ کے پیسے لینے سے منع کر دیا۔ ہوٹل والا ہے تو اس نے نہایت مناسب کرایہ پر کمرہ دے دیا۔ کئی لوگوں نے تو انہیں مہمان بنا کر اپنے گھر میں رکھنے کی پیش کش بھی کر دی۔ اور کچھ لوگ تو وہاں دو تین دن کے لئے کسی نہ کسی کے مہمان بن کر رہے بھی! یہ دیکھ کر وہ حیران ہی نہیں ہوئے، جذبات سے مغلوب بھی ہو گئے۔ یہ کرکٹ کا میچ تھا کہ دلوں کا کھیل!

لاہور میں اس نے اپنی بیوی کو خوب سیر کرائی۔ کئی بازاروں میں، کئی جگہوں پر لے گیا۔ وہ کالج بھی دکھایا جہاں سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ اور اب وہ ایرکنڈیشنڈ بس میں چنیوٹ جا رہے تھے!

یہ تین گھنٹے کا بس کا سفر اس نے یادوں میں گزارا۔ چنیوٹ پہنچنے سے پہلے ہی وہ چنیوٹ پہنچ گیا تھا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ چنیوٹ اب پس ماندہ علاقہ نہیں رہا۔ بلکہ ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔ سڑکیں پکی بن گئی ہیں۔ شہر میں فیکٹریاں، ڈگری کالج، سرکاری اور غیر سرکاری ہسپتال۔ بڑی بڑی دُکانیں، شوروم اور ریسٹورنٹ کھل گئے ہیں۔

پھر اچانک اسے یاد آنے لگا اپنا پُرانا شہر، وہ چنیوٹ جو اس نے ستاون برس پہلے چھوڑا تھا۔ اسے یاد آئی اپنی گلی جہاں اس نے اپنا بچپن اپنا لڑکپن گزارا تھا۔ یہ گلی گیارہ بارہ فٹ چوڑی تھی۔ اُن کے مکان کے اگلے حصہ کے کمروں کی کھڑکیاں اس گلی میں کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے پیچھے بیٹھ کر گلی کا نظارا کیا جا سکتا تھا۔ جب وہ چار برس کا تھا تو اس کی ماں تئیس چوبیس برس کی تھی۔ لڑکی ہی تو لگتی تھی۔ چاندنی رات تھی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی ماں گلی میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ "کیکلی" کھیل رہی تھی۔ جس کھیل میں ماں اور اس کی سہیلی ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پکڑے۔ سر اور پیٹھ کو پیچھے کی طرف جھکائے، چکر پہ چکر لگا رہی تھیں۔ ماں کی لمبی چوٹی اس کی پیٹھ کے پیچھے عموداً لہرا رہی تھی۔

کیکلی کلیر دی، پگ میرے ویر دی
دوپٹہ بھرجائی دا، پھٹے مُنہ جوائی دا

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوسرا گیت گا رہی تھیں۔ سب سہیلیاں مل کر اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں پر باری باری تالیاں بجاتے ہوئے۔

چناں وے تیری میری چاندنی، تاریا وے تیری میری لو
چن پکائیاں روٹیاں، تارا کرے رسو
چن دیاں پکیاں کھالیاں، تارے دیاں رہ گئیاں دو

اے چاند یہ چاندنی تیری اور میری دونوں کی ہے، اے ستارے یہ لو تیری اور میری سانجھی ہے

چاند نے روٹیاں پکائیں، ستارے نے رسوئی سجائی
چاند کی پکائی ہوئی کھالی گئیں، لیکن ستارے کی دو رہ گئیں

اُن کی گلی بائیں جانب کچھ دور جا کر ایک کھلے میدان میں ختم ہو جاتی تھی۔ اور کھلے میدان میں ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا۔ جس کے چاروں طرف ایک بہت بڑا چبوترہ بنا ہوا تھا جو گرمیوں کے دنوں میں اس گلی کے باشندوں کی آرام گاہ تھا۔ اسٹیشن آنے جانے کے لئے ایک کچا راستہ اسی کھلے میدان میں سے ہو کر گذرتا تھا۔ لاہور سے چنیوٹ تک تین گھنٹے بس کے سفر کے دوران، اس کی عمر کے بائیس برسوں تک کی پاکستان اور خاص طور پر چنیوٹ میں گذاری زندگی کی جھانکیاں اس کی نظروں کے سامنے سے گذرتی

رہیں۔ کبھی ترتیب وار، کبھی بلا ترتیب۔ اور پھر اُن کی بس چنیوٹ کے بس اڈے پر پہنچ گئی۔ دل کی دھڑکن یک بارگی تیز ہوگئی۔ چند سیکنڈ لگ گئے اُسے سنبھلنے میں۔ کتنا وسیع ہوگیا تھا یہ بس اڈّہ! کتنی بسیں کھڑی تھیں! اس نے پاس کھڑا ایک رکشا لیا اور محلّے کا نام بتا کر اس میں بیٹھ گیا۔ اُن ستاون برسوں میں اسٹیشن سے ان کے محلّے تک کے راستے میں اتنی عمارتیں بن گئی تھیں کہ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رکشا اسے صحیح راستے سے لے جارہا تھا یا غلط راستے سے؟ جو کھیت تھے، جن کے بیچوں بیچ اسٹیشن سے اس کے محلّے تک کچا راستہ جاتا تھا، وہ سب عمارتوں سے اٹے پڑے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ رکشہ اسی راستے پر جارہا تھا جو پہلے کچا تھا اور اب پکی سڑک بن گیا تھا! اور اب اس کی گلی آنے ہی والی تھی۔ لیکن یہ کیا؟ وہ کھلا میدان.....وہ برگد کا پیڑ.....وہ کہاں گئے؟ اس نے رکشہ رکوا کر پاس سے گذرتے اپنی ہی عمر کے ایک بوڑھے سے پوچھا۔

''ارے بھائی صاحب۔ اس جگہ ایک کھلا میدان تھا جس میں ایک برگد کا پیڑ تھا۔ وہ؟؟ وہ؟؟'' بوڑھے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ''یہ جو شاپنگ کمپلیکس دیکھ رہے ہیں نا آپ۔ اسی جگہ تھا وہ میدان۔ اور برگد کا پیڑ۔ اب تو بیس برس ہوگئے اس کمپلیکس کو بنے ہوئے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

''میں آگرہ سے آیا ہوں۔ میں ہندوستانی ہوں۔ ویسے میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ اسی محلّے کا۔''

اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔

''عجیب بات ہے! ہم لوگ آگرہ کے رہنے والے ہیں۔ وہاں سے آئے تھے۔ میری فیملی اور ہمارے بہت سے عزیز رشتہ دار۔''

''میں تو اپنا مکان، اپنی گلی دیکھنے آیا ہوں۔ یہ سامنے والی گلی تھی ہماری۔ یہ گلی کپوراں والی ہے نا؟'' اس نے گلی کے دہانے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

''جی.....یہ تو ہمیں نہیں معلوم کہ اس گلی کا کیا نام تھا؟ جب ہم آئے تھے، اس گلی کا نام آزاد اسٹریٹ پڑچکا تھا۔ اس گلی میں رہنے والے، بہت سے مہاجر آگرہ سے آئے تھے۔ میں بھی اسی گلی میں رہتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ۔''

اس نے رکشہ چھوڑ دیا۔ اور وہ دونوں میاں بیوی اس شخص کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئے۔ اس نے دیکھا۔ گلی کے سرے پر اب بھی ارائیں قوم کی عورتیں ساگ سبزی بیچ رہی تھیں!

اس نے گلی میں گھستے ہی کئی مکان پہچان لئے۔ کئی مکان باہر سے دوبارہ نئے سرے سے بن کر تیار ہو چکے تھے وہ انہیں پہچان پا رہا تھا۔ اس کا اپنا مکان گلی کے عین وسط میں دائیں طرف تھا۔ اب وہ رُک رُک کر چل رہا تھا۔ اس کی بیوی بڑی دل چسپی سے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اور وہ بوڑھا انہیں اس گلی میں لاکر بہت خوش نظر آرہا تھا۔ جیسے دو بچھڑے ہوؤں کو ملانے جارہا ہو۔ اور اب وہ گلی کے وسط میں پہنچ گئے۔ اور وہ ٹھٹک گیا۔ یہ دیکھ کر کہ وہاں تو ایک عالی شان مکان کھڑا تھا۔ اس عالی شان مکان میں وہ اپنا مکان ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاں اسی جگہ تو تھا اس کا مکان؟ اس کے آس پاس کے مکان بھی کچھ زیادہ 'ری ماڈل' ہوکر مشکل سے پہچان میں آرہے تھے۔ لیکن اُن کے مکان کے سامنے والا اس کے خالو کا مکان اسی طرح کھڑا تھا۔ اس نے اُسے پہچان لیا۔ اپنے خالو کے مکان سے اس نے اپنے مکان کے محلِ وقوع کا اندازہ لگالیا۔ ''کیا اسی جگہ تھا آپ کا مکان؟'' اس کی بیوی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''آپ کو یاد ہے؟ اسی جگہ تھا آپ کا مکان؟''

''ہاں بھئی.....یہ اس کے سامنے والا مکان میرے خالو کا تھا۔ یہ مکان اسی طرح کھڑا ہے۔ اسے میں اچھی طرح سے پہچان رہا ہوں۔ اسی کے سامنے تھا ہمارا مکان۔ ہم دونوں کے مکانوں کی اوپر کی چھتوں پر بنے کٹہرے ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ اوپر سے ہم لوگ ایک دوسرے کو کوئی بھی چیز آسانی سے پکڑا دیتے تھے۔''

اس کی آواز روہانسی ہوگئی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ مجید صاحب کا مکان ہے۔ انہوں نے اپنے پڑوس والا مکان بھی خرید لیا تھا۔ اور دونوں کو گرا کر یہ نیا مکان بنوالیا۔ یہی کوئی پندرہ برس پہلے۔'' بوڑھا اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اب وہ اس عالی شان مکان کے سامنے، اپنے خالو کے مکان کے دروازے پر کھڑا کبھی خالو کے مکان کو اور کبھی اس عالی شان مکان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر اس کی بیوی بھی پریشان ہو اٹھی۔ اور وہ بوڑھا کبھی اسے دیکھتا اور کبھی اس کی بیوی کو۔ اور کبھی اس مکان کو۔

''تو.....؟'' اسے اچانک اس بوڑھے کی آواز سنائی دے۔

''شکریہ بھائی صاحب۔ اب ہم چلتے ہیں۔'' اس نے اس بوڑھے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس سے ہاتھ ملا کر جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ آہستہ آہستہ گلی کے باہر جارہا تھا تو اچانک اسے خیال آیا کہ آگرہ میں کسی مہاجر کا جو مکان اسے ملا تھا اس نے بھی تو اس مکان کو گرا کر اب نیا مکان بنوالیا ہے!

OO

گئی پگ

صدیق عالم

رات کے چار بجے ہیں۔ نصر الدین مے خانے سے باہر آ کر شہر میں بے مقصد گھوم رہا ہے۔ جب ایک پولیس کا آدمی اسے روکتا ہے۔

"اتنی رات کو تم کس لئے بھٹک رہے ہو؟"

"جناب" نصر الدین نے جواب دیا۔ "اگر مجھے اس بات کا پتہ ہوتا تو گھر نہ چلا گیا ہوتا۔"

منے خانہ

"مجھے یہاں لانے والا ہی مجھے گھر واپس پہنچائے گا۔"

درویس

پہلی رات

یہ ایک بہت بڑا ابر تھوڑے کیک تھا جو اڑن طشتری کی طرح اڑ کر آیا تھا اور میرے سامنے سڑک کی سطح سے ٹکرا کر کسی ملک کے نقشے کی طرح بکھر گیا تھا اور اب مرطوب ہوا میں نیم جلی نیم بجھی موم بتیاں دھیرے دھیرے ڈولتے ہوئے نیچے اتر رہی تھیں۔

میں نے سر اوپر اٹھا کر تیسری منزل کی اس بے انتہا روشن بالکونی کی طرف دیکھا جس سے انسانی سروں کا ہجوم اپنی مخلوط آنکھوں سے نیچے تاک رہا تھا۔ آہ... میں نے سوچا یہ شہر کی چیخ ہے جو ابھرے بغیر معدوم ہو گئی ہے!

آدھی رات ہو چکی ہے۔ میرے قدم کہہ رہے ہیں مجھے گھر جانے کی جلدی نہیں۔ گھر! کون پرندہ اپنے پنجرے میں واپس لوٹنا چاہتا ہے؟

ایک پولیس وین گذر گئی ہے۔ ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا باوردی انسپکٹر میری طرف مشتبہ نظروں سے تاکتا ہے۔ گاڑی کے عقب میں جلتی سرخ بتیاں میرا منہ چڑھاتے ہوئے گذر جاتی ہیں۔ کیا اس شہر کی آدھی رات کا متروک چہرا ہوں؟

ہر دوسرے موڑ پر کتے میری پرچھائیں سے خوف زدہ میرے پیچھے پیچھے آتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میرا موبائل دو بار بج کر خاموش ہو چکا ہے۔ آرہا ہوں میری آقا! میں سر ہلا کر کہتا ہوں اور موبائل بند کر دیتا ہوں۔

ایک بڑے شہر کے ٹریفک کا کثیف دھواں اب تقریباً زائل ہو چکا ہے۔ انسان اور مشینوں کے شور عنقا ہیں، سڑکیں ویران، چاند کا گلوب ایک اونچی عمارت کے برج پر رکھا ہے۔ یہ ایک بازار کا علاقہ ہے۔ جس کے فٹ پاتھ پر سوتے لوگ اسی کا حصہ نظر آرہے ہیں۔ ایک جگہ ایک دیو قامت انسان لکڑی کے اسٹول پر بیٹھا اپنے ہانڈی جیسے پیٹ کو تھامے ہانپ رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے تاڑ کا پنکھا اپنے بدن پر جھل رہا ہے۔ شاید اسے دمے کی بیماری ہے۔ اس کی چرکٹ لنگی اور نیکر سڑک پر جلتے سوڈیم لیمپ کی روشنی میں اسی رنگ کے نظر آرہے ہیں۔ وہ اپنا پنکھے والا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے اور میں رک جاتا ہوں۔

"تم پولیس کے آدمی ہو؟" اس نے اپنی بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے اس کی آواز اس کے پیٹ کی ہانڈی سے آرہی ہو۔

"نہیں" میں جواب دیتا ہوں۔

"پھر اس طرح کھلے عام گھوم رہے ہو؟ پولیس اپنی گاڑی میں اٹھا کر لے گئی تو۔"

"پولیس مجھے کبھی نہیں اٹھاتی۔"

"کیوں؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم" میں آگے جانا چاہتا ہوں مگر اس کا ہاتھ پھر سے مجھے روک دیتا ہے۔

"مجھ سے کچھ کام ہے؟" میں پوچھتا ہوں۔

"میں اس فٹ پاتھ پر نہیں رہتا۔"

"کہیں تو رہتے ہوگے۔ مجھے اس سے کیا؟"

"اندر گلی میں میرا گھر ہے۔ مگر یہاں ہوا اچھی چلتی ہے۔ یہاں مجھے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے۔"

گرم ہوا کا ایک جھونکا اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس پر سوکھی کھانسی کا دورا پڑ جاتا ہے۔ وہ سینہ مسل مسل کر ہانپ رہا ہے۔ اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے۔ وہ عجیب وہ غریب آوازیں نکال رہا ہے جیسے کوئی راکشش اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کے پھیپھڑوں کو چیر رہا ہو۔

"تمہیں کسی اسپتال میں ہونا چاہیے۔" مجھے اس پر ترس آجاتا ہے۔

"آکسیجن کے بغیر تم مر جاؤ گے۔"

"میری اس بیماری کا کوئی علاج نہیں۔ یوں بھی مجھے اب اس سے کوئی

شکایت نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ جینا سیکھ گیا ہوں۔"

"پھر تو مرنا ہی تمہاری تقدیر میں لکھا ہے" میں کہتا ہوں۔

سڑک پر دو آنکھیں چمک اٹھی ہیں۔ یہ ایک سفید بلی ہے جو فٹ پاتھ کے ریلنگ پر بیٹھی مخدوش نظروں سے میری طرف تاک رہی ہے۔

"وہ اسی جگہ رہتی ہے اور بازار کے چوہوں پر زندہ ہے۔" بوڑھا میری نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"جب وہ زندہ ہے تو اس سیارے پر کہیں تو اس کا ٹھکانہ ہوگا۔" میں لاپرواہی سے کہتا ہوں۔ بوڑھے کا ہاتھ تیسری بار اٹھ کر مجھے جانے سے روک لیتا ہے۔

"تمہیں مجھ سے کوئی کام ہے بڑے میاں؟" میں اکتا کر پوچھتا ہوں۔

"نہیں جلدی ہے؟"

"نہیں" میں کہتا ہوں۔ "مگر یہاں ٹھہرنے کی بھی کوئی تک نہیں ہے۔"

"میں تمہیں اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے دل چسپی نہیں ہے۔"

"میں ایک جادوگر ہوں۔"

"یقیناً ہوگے۔ یہ سارا ملک ہی جادوگروں کے ہاتھ میں ہے۔"

"میں وہ جادوگر نہیں جو تم سمجھتے رہے ہو، میں تماشہ نہیں دکھاتا۔" اس نے میری آنکھوں میں تاکتے ہوئے کہا۔ "میں واقعی ایک جادوگر ہوں۔"

"جادو ایک تماشہ ہی تو ہے۔" میں کہتا ہوں۔ "ویسے تم ایک جادوگر ہو تو تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہی ہوگے۔"

"بالکل، سچ پوچھو تو میں تم لوگوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں جو گھر لوٹنے سے ڈرتے ہیں۔" اسکا ہانپنا کم ہوگیا ہے اور میں پہلی بار اس ٹھہرے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتا ہوں۔ گنجا سر، موٹے موٹے گال، موٹی ناک، عورتوں کی طرح بھاری سینہ، بڑے بڑے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے نتھنے، دہری ٹھوری، گھنے ابرو جن میں سے داہنا سانپ کے پھن کی طرح اوپر اٹھا ہوا ہے۔ وہاں زخم کا ایک پرانا نشان تمتما رہا ہے۔ "تم آسانی سے پہچانے جاتے ہو۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "کسی دیوار پر بیٹھے ہوئے، کسی پارک میں ٹہلتے ہوئے، کسی مارکیٹ میں لایعنی چکر لگاتے ہوئے، کبھی شراب خانے کے اندر، کبھی طوائف کے کمرے میں، کبھی سگریٹ پیتے ہوئے، کبھی ٹریگر دباتے ہوئے اور اب شہروں میں تمہاری تعداد بڑھتی جارہی ہے۔"

"اس کا کوئی علاج؟" میں پہلی بار اس کی باتوں میں دل چسی لیتا ہوں۔

"علاج ہے نا۔" وہ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا ہے۔ "میں نے تم سے کہا تھا میں ایک جادوگر ہوں۔"

"ٹھیک ہے مجھے یقین ہے۔" میں اپنا شیو کھجاتا ہوں۔ "لیکن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"تمہارا صرف ایک علاج ہے۔" وہ میری آنکھوں کے اندر جیسے کسی دوسرے انسان سے مخاطب ہے "تم غائب ہو جاؤ۔"

"تمہارا مطلب ہے شہر چھوڑ دوں؟" میرے اندر کا آدمی کہتا ہے۔

"نہیں، غائب ہو جاؤ۔"

"مر جاؤں" اندر کا آدمی پریشان ہوکر پوچھتا ہے۔

"میں ایک بار پھر دہرا رہا ہوں غائب ہو جاؤ اور جب میں کہوں غائب ہو جاؤ تو اس کا دوسرا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ شہر چھوڑ کر چلے جانا دنیا چھوڑ کر چلے جانا یہ انسان کے مسئلوں کا حل نہیں۔ بلکہ اکثر اس سے مسئلوں میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور پھر یہ تمہارے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں ایک آہ بھر کر کہتا ہوں۔ "مگر غائب ہونا بھی کب میرے اختیار میں ہے۔"

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے کہا نا میں ایک جادوگر ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہئے۔"

اس نے اسٹول اٹھا لیا تھا اور اب کسی دیو کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ سوڈیم لیمپ کی خیالی روشنی میں گھنی مسخ بھوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں گویا میرے اندر کسی برمے کی طرح سوراخ کر رہی تھیں۔

"ویسے تمہیں میری ضرورت ہو تو میں اس گلی کے اندر رہتا ہوں۔" اس نے آخری بار کہا۔ "صرف چالیس قدم اور تمہیں ایک لانڈری نظر آئے گی جس کا چولہا چوبیس گھنٹے گرم رہتا ہے۔ اس کے آدمی سے میرے بارے میں پوچھ لینا۔ میرا نام سارنگ ہے اور میں تمہارے بہت کام کا آدمی ہوں۔"

اس کے بعد میں بھی دیر تک سڑک پر آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں۔ رہ رہ کر اس آدمی کے اوپر اٹھے ہوئے ابرو کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اتنے برسوں میں اس شہر میں بھٹک رہا ہوں، کچھ چہرے آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے ہی حافظے سے غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ دہائیوں تک جنات کی طرح تمہارا پیچھا کرتے ہیں۔

دوسری رات

میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ فلائی اوور کے نیچے میں نے ایک ستون کی آڑ میں قے کی ہے۔ دریا کی طرف سے تیز ہوا آرہی ہے۔ اپنے دھندے پر ایک دیر سے نکلی ہوئی طوائف چلتے چلتے لیمپ پوسٹ کے نیچے رک گئی ہے۔ اور میری طرف دل چسپی سے تاک رہی ہے۔ وہ بھڑکیلے لباس پہنے ہوئے ہے اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں ایک موبائل بھی تھام رکھا ہے۔ میں اس سے کترا کر ستونوں کی آڑ لے کر چلنے لگتا ہوں۔

تھوڑی دور جا کر میں موبائل آن کرتا ہوں۔ اس میں تین مس کال ہیں۔ میں نے موبائل سائلنٹ موڈ میں رکھا ہوا ہے۔ یہ سارے کال میری

آ چکے ہیں۔ کہیں بارش ہوئی ہے۔ ہوا میں اچانک خنکی آ گئی ہے۔ مجھے شراب کی طلب ہو رہی ہے۔ اب بھی کچھ بار ایسے ہوں گے جن کے دروازے بند نہ ہوئے ہوں گے گرچہ آخری پیگ سرو کرنے کا وقت جا چکا۔

"تمہیں ایک پیگ کی ضرورت ہے" مجھے اپنے پیچھے سے ایک نسوانی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ وہی طوائف ہے وہ لانبے چہرے والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے جس نے اپنی گردن کو ایک اسکارف سے ڈھک رکھا ہے۔

"مجھے ایک بار کا پتہ ہے جو رات ایک بجے تک کھلا رہتا ہے۔ اس میں پولیس والوں کے لئے کچھ کمرے مخصوص ہیں۔"

"مجھے اکیلا چھوڑ دو" میں اس کی طرف سے چہرا پھیر لیتا ہوں۔

"پھر آج کی رات پولیس لاک اپ میں رہنا پڑے گا؟"

"تمہارا تعلق پولیس سے ہے؟"

"میں پچھلے دس برس سے یہاں دھندہ کرتی آ رہی ہوں۔ پارک اسٹریٹ تھانے کا ہر آدمی مجھے پہچانتا ہے۔"

"میں پچھلے بیس برس سے اس شہر میں آوارہ گردی کرتا آ رہا ہوں، میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"شاید اس سے پہلے ہمارے ستارے ٹکرائے نہ ہوں گے۔ یوں بھی یہ ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ ایک دوسرے سے ملے بغیر ہی فنا ہو جاتے ہیں۔"

"مجھے پولیس کے حوالے کر کے تمہیں کوئی انعام مل جائے گا؟"

"ہر رات مجھے ایک دو آدمی پولیس کو دینے پڑتے ہیں۔" وہ کہتی ہے۔

"یہ میرا تھانے سے ایک خاموش معاہدہ ہے۔"

"میں آدمی نہیں، ایک بوجھ ڈھونے والا جانور ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔" میں پھر سے ستونوں کی آڑ لے کر چلنے لگتا ہوں۔ کچھ دور چل کر میں مڑ کر اس کی طرف دزدیدہ نظروں سے تاکتا ہوں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی ایک ٹک میری طرف تاک رہی ہے۔ پہلی بار اس کے پیشے کے پیچھے چھپی عورت کا مجھے احساس ہوتا ہے۔ وہ حالات کتنے سنگین ہو نگے جو ایک عورت کو آدھی رات اٹھ کر اپنا جسم بیچنے پر مجبور کرتے ہوں گے! کچھ دور جا کر میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ اپنی جگہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی ہے۔

سارنگ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیڑی پی رہا ہے۔ اسے اس واقعے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

"تم بلا ناغہ یہاں بیٹھا کرتے ہو؟" میں پوچھتا ہوں۔

"صرف گرمی کے موسم میں۔" وہ کہتا ہے۔ آج وہ گفتگو کے موڈ میں نہیں ہے۔ مجھے بار بار اسے کریدنا پڑتا ہے۔

"تمہارے ڈیل ڈول کے سبب علاقے کے سارے لوگ تمہیں پہچانتے ہوں گے یہاں تک کہ کتے بلیاں بھی۔"

"میرا مذاق اڑا رہے ہو۔" وہ میرے سامنے اپنے بڑے سے چہرے کو اتنا آگے بڑھا دیتا ہے کہ مجھے اس کی سانسیں صاف سنائی دینے لگتی ہیں جیسے کوئی دھونکنی چل رہی ہو۔ "یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ تم مجھے نہیں جانتے۔"

"میں اتنا ہی جانو نگا جتنا تم بتاؤ گے۔"

"اور جو میں بتاؤں گا تم اس پر یقین نہیں کرو گے۔"

"یہ پہلے سے تم نے سوچ لیا ہے۔"

"میں نے کافی دنیا دیکھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لوگ اپنا صحیح چہرا کبھی نہیں دیتے۔"

"چلو تسلیم کر لیا میں ایسا ہی ہوں جیسا تم کہہ رہے ہو۔" میں کہتا ہوں۔

"اگر تمہیں لگتا ہے میں تمہارے لئے صحیح آدمی نہیں تو ہم بے کار اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں؟"

"تم اپنا وقت برباد کر رہے ہو۔ یہاں بیٹھنا تو میرے روز کا معمول ہے۔"

میں آگے بڑھ جاتا ہوں کہ مجھے پیچھے سے اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"یاد رکھنا، ایک دن، تمہیں میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے۔"

"میرے گھٹنے پہلے سے ہی ٹکے ہوئے ہیں" میں فٹ پاتھ سے اتر کر آگے برج کی طرف بڑھ جاتا ہوں جہاں پل کے اوپر دیسی شراب کی غیر قانونی فروخت شروع ہو چکی ہے۔ سیڑھی سے نیچے اترتے ہوئے دو شرابی لڑکھڑا کر میرے سامنے زمین پر جا کر گرتے ہیں۔ یہ جگہ قدرے تاریک ہو رہی ہے۔

"دھت تیرے کی، سالہ یہاں تو جمین ہے۔" ایک جو پہلے گرا تھا اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ آخری سیڑھی پر چوک گیا تھا۔ دوسرا جو اسی پر گرا تھا اسے چوٹ آئی تھی۔ وہ اپنا کرتا اور بنیان اٹھا کر جسم کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔

"کھون نکلا کا؟" پہلے شرابی نے پوچھا۔

"کھون رہے تب نا" دوسرا شرابی ہنسا۔ "بہن کا بز... یہاں تو سارا کھون پانی ہو چکا ہے۔"

تیسری رات

سارنگ کی کہانی جب شروع ہو چکی ہے تو میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ اسے ختم کئے بغیر چین پاؤں۔ یقیناً بہت بڑا شہر ہے یہ، بہت سارے لوگ یہاں رہتے ہیں۔ ایک سارنگ کو اس کے اندر کھو دینا بالکل آسان ہے، اپنا راستہ بدل لینا اس سے بھی سہل۔ مگر بند ہوتے ہوٹلوں کے بعد جانے کیوں سارا کچھ سمٹ کر اس ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے، سارنگ! سارنگ جس کا پیٹ ہانڈی کی طرح پھولا ہوا ہے اور آسمان پر بادل کا ہلکا سا شبہ ہونے پر بھی جس پر دمے کا دورا پڑ جاتا ہے۔

"میں برسوں سے تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔" وہ مجھے بتاتا ہے۔ "اور اب تمہارا میرے ہاتھ سے نکل جانا ممکن نہیں۔"

کہیں پر شاید ٹرام ڈپو کے اندر کسی پیڑ میں رہ رہ کر ایک کوئل کافی مضبوط آواز سے کوک رہی ہے۔ خلیج بنگال سے آتی ہوا کسی وجہ سے گرم ہے۔ اس گرم ہوا میں رات کے پھولوں کو کھلنے میں سہولت ہوتی ہوگی۔

فٹ پاتھ پر ایک آدمی جاگ گیا ہے اور لنگی اٹھا کر سڑک کے رخ کھڑا پیشاب کررہا ہے۔ اس کے کراہنے، قسم کھانے اور ریح خارج کرنے کی آواز ہم دونوں تک آتی ہے۔ میں فٹ پاتھ کے ریلنگ پر کمر لگائے خاموش کھڑا ہوں۔ وہ اپنے ابرو کا پھن اٹھائے اپنے اسٹول پر بیٹھا میری طرف تاک رہا ہے۔

''اب ختم بھی کرو۔'' میں کہتا ہوں۔ ''میں تم سے تھک چکا ہوں۔ مجھے آگے بھی جانا ہے۔''

''تمھیں کہیں نہیں جانا ہے۔'' سارنگ ہنستا ہے۔ یہ اس کے بیمار پھیپھڑوں کی آواز ہے۔ ''تم ایک کتے کی طرح اپنی دم کے پیچھے بھاگ رہے ہو جس پر کسی نے پٹرول ڈال دیا ہے۔''

''شکریہ'' میں کہتا ہوں۔ ''اور کچھ؟ ممکن ہے میں ایک گدھے کی طرح بیٹھا انتظار کررہا ہوں کہ کب میرا سایہ اٹھ کر اپنے گھر جائے تو اپنے گھر جاؤں۔''

''تم اس اسٹول پر بیٹھ جاؤ، بہت دیر سے کھڑے کھڑے تمہارا مزاج گرم ہوگیا ہے۔'' اس نے اپنے نیچے سے اسٹول نکالتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم بیٹھو'' میں کہتا ہوں۔ ''مجھ سے دوگنی عمر ہے تمہاری۔ ہمیں بڑوں کی عزت کرنی چاہئے۔ کتب میں ہمیں یہی سکھایا گیا ہے۔''

''لگ رہا ہے تمھیں نشہ چڑھ رہا ہے۔''

''شاید اسی لئے اب میں پوری طرح تمہاری تحویل میں ہوں۔''

''میری کہانی سنوگے، اپنے بارے میں نہیں بتاؤگے؟''

''میں ایک کتا ہوں جو اپنی گردن پر پٹہ ڈالے گھوم رہا ہے اور خود سے پریشان ہے اور تم کہتے ہو میرا صرف ایک علاج ہے میں غائب ہوجاؤں۔''

''کیوں کہ کبھی میں بھی اپنی زندگی سے اوب گیا تھا۔'' سارنگ نے واپس اپنے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں برسوں تک بیمار رہا۔ ایک ایسی بیماری جسے کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں گھر میں پڑا رہتا، دیوار گیر گھڑی کے کانٹے ٹک ٹک کرتے رہتے اور قطرہ قطرہ خون میرے اندر ٹپکتا رہتا۔ تم یقین کرو یا نہ کرو میں اسے ٹپکتے سن سکتا تھا۔ میری آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں۔ میری کھوپڑی کے اندر کا سناٹا میرے باہر بھی پھیل گیا تھا جہاں لوگ صرف ہونٹ ہلاتے رہتے اور پھر ایک بھیانک دھماکے کے ساتھ یہ سناٹا ٹوٹ جاتا اور ایک عجیب دل دہلا دینے والا انسانی شور مجھے اپنی گرفت میں لے لیتا اور میں دونوں کان ہاتھوں سے دبائے گھٹنوں کو سینے سے لگانے پر مجبور ہوجاتا۔''

''میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ میرا مطلب ہے مجھے یاد نہیں میں کتنے سالوں پہلے بیمار پڑا تھا۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔ آج ہر کوئی بیمار ہے۔ ڈاکٹر صرف وہی علاج کرپاتے ہیں جن بیماریوں کو وہ جانتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی معاملہ تھا۔ میری بیماری ان کی سمجھ سے باہر تھی مگر وہ ڈاکٹر تھے اس لئے دوا تو ان کو ہر حال میں دینا ہی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ میرا علاج کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ میرا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ آخر کار میرے پاس ڈاکٹروں کے لئے پیسے ختم ہوگئے اور میرے لئے صرف سرکاری اسپتال یا خیراتی شفاخانے ہی رہ گئے۔ یہی نہیں میری لمبی بیماری سے میرے گھر کے لوگ بھی اکتا گئے تھے۔ پھر میری قسمت پلٹی۔ میرے ایک چچازاد بھائی کو ریلوے کی ایک بڑی نوکری مل گئی۔ اسے مجھ سے خاصی ہمدردی تھی، ہم دونوں ایک ہی کالج میں طالب علم رہ چکے تھے۔ بہت برا وقت گذارا تھا ہم دونوں نے ایک ساتھ۔ اس نے ریلوے منسٹر کے پی اے سے کہہ کر میرا داخلہ ریلوے اسپتال میں کروادیا۔ وہاں میرا سب کچھ مفت تھا۔ برسوں تک ریلوے کے مختلف اسپتالوں میں میرا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر میرے بھائی نے اپنے کچھ اور رسوخ استعمال کئے اور ایک بہت ہی بڑے بہت ہی قیمتی اسپتال میں مجھے داخل کردیا گیا جہاں کافی بڑے بڑے VIP آیا کرتے، سنٹرل منسٹر، ارب پتی بزنس مین، ہائی فائی پروفیشنل، ماڈل، فلم اسٹار، یہ لوگ صاف ستھری راہداریوں میں سفید یونیفارم پہنے مانند قیدیوں کی طرح گھوما کرتے اور اپنے اپنے کیبن کے اندر سے بڑے بڑے معاملات چلایا کرتے اور جب میرا سامنا ان لوگوں سے ہوتا تو حیرت سے ٹھٹھک کر کھڑے ہوجاتے اور میری طرف تاکا کرتے کیوں کہ میں ایک صفر تھا، ایک معمہ، جسے وہ سلجھا نہ پاتے۔ وہاں میری خاصی تیمارداری کی گئی، میرا ہر طرح سے علاج کیا گیا۔ مگر میری حالت دن بدن خراب ہوتی گئی اور یہ وہ وقت تھا جب صبح شام میں خدا کے حضور سر جھکا کر موت کی دعا مانگا کرتا۔''

''تمھیں کبھی خودکشی کا خیال نہیں آیا؟''

''میری حالت اتنی غیر تھی کہ اس کے لئے جس طرح کی تیاری کرنی چاہئے تھی اس کی طاقت یا صلاحیت مجھ میں نہیں تھی۔'' سارنگ نے کہا۔ ''تو میں کہہ رہا تھا، میں خدا سے ہر گھڑی اپنی موت کی دعا مانگا کرتا، بس اتنا ہوش تھا مجھے اور پھر ایک دن خدا نے میری بات سن لی۔ تین ڈاکٹر میرے بستر پر آئے اور انھوں نے مجھے ایک فارم دستخط کرنے کے لئے دیا۔ برسوں کی بیماری کے سبب میری انگلیاں سوکھ گئی تھیں، مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اس پر دستخط کردیے۔''

''تمھیں پتہ ہے تم نے کس کاغذ پر دستخط کئے ہیں؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کس کاغذ پر دستخط کئے ہیں؟'' میں نے اپنے دھندلے ذہن سے ان کی بات دہرائی۔

''ہم تمہارا ایک نیا علاج شروع کرنے جارہے ہیں۔ یہ ایک طرح کا تجربہ ہے اور تم مر بھی سکتے ہو بلکہ ننانوے فیصد اس کا امکان ہے کہ تم مرجاؤگے۔''

''گنی پگ کا نام تم نے سنا ہے؟ یہ ایک امریکی چوہا ہے جو آج ساری دنیا کی لیبارٹریوں میں تجرباتی طور پر استعمال ہوتا ہے، دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہم تمھیں گنی پگ کی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''

"گنی پگ..." میں نے اس کی بات دہرائی۔ یہ نام میرے لئے نا آشنا تو نہیں تھا مگر اس وقت میرے لئے ایک نئی اہمیت کا حامل نظر آرہا تھا۔

"ہاں، ایک گنی پگ کی طرح ہم مختلف طرح کی دوائیاں اور آپریشن تم پر آزمائیں گے۔ چونکہ ہمارے پاس تمہارا کوئی علاج نہیں رہ گیا ہے اب ہمارے پاس یہی ایک راستہ بچا ہے، یوں سمجھ لو آج سے تمہاری زندگی کسی پوسٹ مارٹم ٹیبل پر شروع ہونے والی ہے۔ تمہیں زندہ رہ کر ان سب چیزوں سے گذرنا ہوگا جن سے لوگ مرنے کے بعد گذرتے ہیں۔"

میں نے انھیں بتایا کہ میں اللہ تعالی سے موت کی دعا ہی تو مانگا کرتا ہوں، اور میں جس اذیت میں زندگی گذار رہا ہوں اس سے بڑی اذیت اور کیا ہوگی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں چاہوں تو کاغذ پھاڑ سکتا ہوں۔ وہ کاغذ میرے بستر پر ڈال کر چلے گئے۔ شام کو لوٹے تو میں اسی طرح لیٹا ایک ٹک چھت کی طرف تاک رہا تھا۔ کاغذ اپنی جگہ پڑا تھا۔ اسے میں چھوا بھی نہ تھا۔

"تو تم مرنے کے لئے تیار ہو۔" ایک ڈاکٹر نے کاغذ اٹھا کر کہا۔ "شاید یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔ جس کے ذریعے تم زندہ بچ سکتے ہو۔"

مجھے الگ کمرا دیا گیا اور ایک سال سے زیادہ میں موت اور زندگی کی لڑائی رہتا رہا۔ ان دنوں تم مجھے دیکھتے تو تمہیں ایسا لگتا جیسے کسی سفید لاش کو دیکھ رہے ہو۔ میرے بدن کے سارے بال گر گئے تھے میرے چبانے کی صلاحیت جاتی رہی تھی، میری آنکھوں میں چھالے پڑ گئے تھے اور مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میرے پھیپھڑوں میں گرم سلائیں ڈالی جا رہی ہوں۔"

"تمہیں اتنا ہوش تھا؟"

"درد اس دنیا کا سب سے طاقتور میڈیم ہے جو ہمارے دماغ تک اپنی بات سب سے تیزی سے پہنچایا کرتا ہے۔" سارنگ نے کہا۔ "ایک سال تک مجھے نیند نہیں آئی۔ میں پڑا پڑا چھت اور دیواروں کو تاکتا رہا۔ پھر ایک دن کئی ڈاکٹر ایک ساتھ میرے کمرے میں آئے۔ انھوں نے مجھے مادر زاد ننگا کر دیا اور ایک میز پر لٹا کر میرے جسم کے ایک ایک حصے کا معائنہ کیا گیا، میری تمام تازہ رپورٹوں کا جائزہ لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلا دیا۔ گلاب کا ایک ہار نکال کر مجھے پہنا دیا گیا۔ ایک ڈاکٹر نے شیمپین کی ایک بوتل کھولی، شراب گلاسوں میں انڈیلی گئی اور سب نے جام ٹکرا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ کسی نے ایک گلاس میرے ہونٹوں سے بھی لگا دیا تھا جب کہ میں ٹھنڈی میز پر اسی طرح ننگا پڑا تھا۔"

"تو ان کا تجربہ کامیاب رہا تھا؟" میں نے کانپتے دل سے پوچھا۔

"ہاں۔ پھر بھی مجھے ٹھیک ہونے میں ایک سال کا عرصہ تو لگ ہی گیا۔ میرے بال اگ آئے۔ ایک فزیوتھیراپسٹ نے میری مڑی ہوئی انگلیوں کا علاج کیا، میری آنکھوں کا آپریشن کیا گیا۔ اسپتال کے ہال میں ایک بڑا جلسہ کیا گیا جس میں ریلوے کے بڑے بڑے افسران کے ساتھ ساتھ اخبارات کے صحافی اور ٹی وی والے بھی آئے اور لوگوں کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ مجھے ایک سرٹیفکیٹ سے نوازا گیا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح سائنس کی ترقی کے لئے میں نے اپنی جان تک کی قربانی دینا منظور کیا تھا۔ مجھے ریلوے کی طرف سے پنشن جاری کی گئی۔ اس کے علاوہ آج بیس برس بعد بھی رائٹرس بلڈنگ سے ہر ماہ پندرہ سو اور کلکتہ کارپوریشن کی طرف سے دو ہزار روپئے مجھے ملتے رہتے ہیں۔"

"تو یہ ہے تمہاری کہانی۔ ایک گنی پگ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مگر تم ایک گنی پگ سے جادوگر کیسے بن گئے؟"

"ابھی میری کہانی شروع کہاں ہوئی ہے۔" سارنگ زور سے ہنسا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم جیسے کم عمر کے لوگوں میں یہی خرابی ہے۔ تم پل پر پیر رکھتے ہی ایک چھلانگ لگا کر اس سے گذر جانا چاہتے ہو۔"

"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ میں تھوڑا نشے میں ہوں۔"

سارنگ اسٹول اٹھائے میری طرف تاکتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر گلی کی طرف مڑ گیا۔ میں ریلنگ سے پیٹھ لگا کر اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

"گنی پگ، تم اس سے زیادہ کیا ہو؟"

چوتھی رات

"حقیقت یہ ہے کہ یہ میری کہانی بھی نہیں ہے۔" سارنگ اپنے اسٹول پر بیٹھا بہت بے چین نظر آرہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے شہر میں بارش ہوگئی ہے جس سے شہر اور بھی گرم ہو اٹھا ہے۔ میرے بال پسینے سے تر ہیں اور مجھے اس پر غصے آرہا ہے۔

"تو وہ ساری کہانی من گھڑت تھی؟"

"کیا میں نے یہ کہا؟" سارنگ کے ابرو کا کھچن اور بھی بلند ہو گیا تھا۔ "میں نے کہا یہ کہانی میری نہیں۔ یہ ایک دوسرے آدمی کی کہانی ہے۔"

"دوسرا آدمی!"

"ہاں... وہ تمہاری طرح ہی نمودار ہوا تھا اور اپنی زندگی سے پریشان تھا کیونکہ اس کی پرانی بیماری پھر سے لوٹ آئی تھی۔ یہ کہانی اسی کی تھی۔ تب میں نے اسے غائب ہونے کی تجویز دی۔"

"اور وہ غائب ہونے پر راضی ہوگیا۔" میں مسکرایا۔ "اور یہاں سے تمہاری کہانی شروع ہوتی ہے۔"

"بالکل مجھ سے اس کی مایوسی دیکھی نہ گئی اور میں نے اسے غائب کر دیا۔"

"اگر واقعی ایسا کوئی آدمی تھا تو اس نے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔"

"وہ جھوٹا نہیں تھا۔ اس کا ثبوت میرے پاس ہے۔" اس نے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پیلا ہینڈ میڈ کاغذ برآمد کیا۔ یہ ایک سرکاری لیٹر پیڈ تھا جس پر انگریزی میں ٹائپ شدہ الفاظ دھندلے پڑ چکے تھے۔ لیٹر پیڈ کی پیشانی پر اشوک استھمبھ کا نشان ابھرا ہوا تھا، دستخط کے نیچے سرکاری مہر لگی تھی اور ریلوے کا اسٹمپ۔

"یہ جعلی سرٹیفکیٹ ہے۔" میں نے کاغذ سے سر اٹھا کر کہا۔ "جعلی اشوک

اسٹمپ، جعلی مہر، جعلی ایمبلم۔ وہ آدمی بھی جعلی تھا اور تم بھی جعلی ہو۔"

"کاش ایسا ہوتا۔ مگر یہ سچ نہیں۔ ویسے یقین کرو میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ لیکن جب وہ غائب ہونے پر راضی ہو گیا تو مجھے یقین آ گیا۔"

"اور تم نے اسے غائب کر دیا۔ ٹوپی پہنانے کے لئے میں ہی رہ گیا تھا۔"

"تمہارے یقین نہ کرنے سے مجھے کیا فرق پڑ جائے گا۔" اس نے کاغذ واپس چھینتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا تھا اگر تم غائب ہونا چاہو تو میں تمہیں غائب کر سکتا ہوں۔"

"جانے بھی دو، کسی اور کو تلاش کرو۔"

"دراصل تم میں ہمت نہیں ہے۔" سارنگ نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس پر کھانسی کا دورا پڑ گیا۔ اس سے نجات ملنے پر اس نے اپنے چہرے کا پسینہ اپنے کرتے کے کونے صاف کیا۔ "شائد اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ مجھے سوچنا چاہئے تھا تم بھاگ رہے ہو جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہارے پاس بھاگنے کے لئے کچھ ہے۔ تم کہیں بھی چلے جاؤ تم ایک نہ نظر آنے والی رسی کے ذریعے اس چیز سے بندھے رہو گے۔ تم غائب نہیں ہو سکتے۔ تاعمر گنی پگ بنے رہنا تمہاری تقدیر میں لکھا ہے۔ تمہارا اعلاج نہیں ہو سکتا۔"

"میں کیسے یقین کر لوں۔ تم ایک ایسی بات کر رہے ہو جو عقل تسلیم نہیں کرتی۔"

"تم صرف ہاں کہو، پھر اس شخص کی طرح جس کا مرض لوٹ آیا تھا میں تمہیں غائب کر دوں گا۔" اس نے حلق سے نکل آئے بلغم کو سیدھے ریلنگ کے پائے پر تھوکتے ہوئے کہا۔

"اور اگر نہ کر سکے تو؟"

"تو تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ میرا پول کھول جائے گا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ تم چاہو تو وقت لے سکتے ہو۔"

"نہیں، مجھے تمہارا یقین ہے" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہتا ہوں۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہے، میں بھاگ رہا ہوں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ ہے جس سے میں بھاگ رہا ہوں۔ مجھے پتہ ہے میں اس چیز سے پوری طرح بھاگ نہیں سکتا۔ مجھے ہر بار لوٹ جانے کی عادت ہے۔ اس کے لئے جس قوت ارادی کی ضرورت ہے وہ میرے اندر نہیں ہے۔ میرے کچھ سمجھوتے اپنے ہیں، کچھ زنجیریں میری اپنی ڈھالی ہوئی ہیں۔ کچھ فریب میرے خود کے بنائے ہوئے ہیں اور کچھ زخموں کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ میں اس پرندے کی طرح ہوں جو ایک پنجرے میں پیدا ہوا اور اسی کے اندر مر جانے والا ہے۔"

"میں جانتا تھا تم غائب نہیں ہو سکتے۔" اس نے ہانپتے ہوئے دردمندی کے جذبے کے ساتھ کہا۔

"ہاں میرے پاس ساری عمر گنی پگ بنے رہنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ میں واقعی اس شہر کا گنی پگ ہوں" میں ریلنگ سے الگ ہٹ کر فٹ پاتھ سے نیچے اتر جاتا ہوں اور کوڑے کے ایک ڈھیر کو اپنے جوتے کی نوک سے اڑاتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہوں ٹرام ڈپو کی طرف، جہاں سے کسی کوئل کی کوک نہیں ابھرتی۔

آخری رات

ہوا بند ہے۔ فٹ پاتھ پر ایک جگہ دیوار کی آڑ لے کر ایک آدمی اپنی عورت کے ساتھ صحبت کر رہا ہے۔ اس کے بچے اس سے تھوڑے فاصلے پر فٹ پاتھ کے ایک دوسرے حصے پر سو رہے ہیں۔ مرد کے نرخرے سے غرانے کی آواز نکل رہی ہے۔ شاید اسے اپنے انزال تک پہنچنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اس کے نیچے عورت کسی مردے کی طرح خاموش پڑی ہے۔ اپنے اسٹول پر بیٹھا سارنگ ان کی طرف نہیں تاکتا مگر اسے اس بات کا علم ہے۔ بڑے بڑے عمودی کھمبوں پر سوڈیم لیمپ سورج کے ٹکڑوں کی طرح دہک رہے ہیں۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور اسٹول اٹھا کر گلی کے اندر لوٹ جاتا ہے۔

گلی کو روشنی اور تیرگی نے الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ فضا میں گرم بھاپ اور گیلے کپڑوں کی ملی جلی بو تیر رہی ہے۔ لانڈری کا ننا آدمی ایک کاربائڈ لیمپ جلا کر اس کی روشنی میں کپڑے استری کرنے میں مصروف ہے۔ اس کا چہرا دہکتے کوئلوں کی آنچ سے تمتما رہا ہے۔ سارنگ کو گذرتے دیکھ کر وہ ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کرتا ہے۔

سارنگ کے ایک کمرے کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایک بوڑھی لاغر عورت جس کے بال سن کی طرح سفید ہیں، بستر پر لیٹی اس کی طرف تاک رہی ہے۔ کمرے میں گلی کے لیمپ بھر روشنی ہے۔ اندر کی دیوار پر کھڑکی کی سلاخوں کا سایہ زیبرا کیریں بنا رہا ہے۔ کونے میں پکائے ہوئے چمڑے اور سولوشن کے ڈرم رکھے ہیں، کچھ لوہے کے اوزار بھی بکھرے پڑے ہیں۔ دن کے وقت یہ کمرا چپل کے کارخانے میں بدل جاتا ہوگا۔

سارنگ دروازہ بند کر دیتا ہے اور بوڑھی عورت کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگتا ہے۔

"تمہیں نیند نہیں آتی؟" وہ پوچھتا ہے۔

"تمہارے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لئے سو گئی تھی۔" بوڑھی عورت کہتی ہے۔ "رات کیا بہت ہو گئی ہے؟"

"پھر کیا کرو گے۔ تمہیں تو نیند نہیں آتی؟"

"اتنے سوالات مت کرو۔ تم ہمیشہ سوالوں میں بات کرتی ہو۔ تم سو جاؤ۔ میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔"

"تم اگر مجھے دیکھتے رہو گے تو میں سو کیسے سکوں گی؟" بڑھیا مسکرائی۔ "تم مجھے غائب کیوں نہیں کر دیتے؟"

"میں اکیلا رہ جاؤں گا۔"

"اکیلے پن سے بہت ڈر لگتا ہے؟"

"بہت۔"

"ایک دن کسی کو تو اکیلا ہونا ہے؟"

"سو تو ہے۔"

بڑھیا دیوار کی طرف کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرتی ہے۔ سارنگ اسی دیوار کی طرف تاک رہا ہے۔ گلی میں ہوا بند ہے۔ OO

گلاب شہزادے کی کہانی

حیدر قریشی

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کوئی کہانی سنائی جائے۔ سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔

لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:

''میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔ خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا۔میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا۔''

یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔

''میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ باری باری اپنی کہانیاں سنا لیں...میں آخر میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔''

پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

''میری کہانی عام سی ہے۔میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنا دیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔''

تیسرا اور چوتھا...دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے...قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا،گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی...دوڑتی رہی...''

''پھر کیا ہوا؟''

تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر؟'' دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔

''پھر...جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرا دی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہو گیا۔ البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے''۔

اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اس عرصے میں حیرت انگیز طور پر دوگنی ہو چکی تھی اور اب اس میں ننھے ننھے سبز پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہو گئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتہ بھی

ابھر آیا۔ دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے... رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا۔

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی:

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور میرا تعلق بھی آثار قدیمہ سے ہے... تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے... مرا گھر خاصا چھوٹا اور تنگ سا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استعمال کے بعد میں نے غبارہ نالی میں پھینکنے کی بجائے کونے میں پڑی بڑی میز کے پیچھے پھینک دیا۔ میز کے نیچے پڑے ڈھیر سارے کباڑ میں وہ غبارہ چھپا رہتا۔ پھر کبھی خیال آتا تو اسے اٹھا کر نالی میں پھینک دیتا۔''

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بلایا گیا۔ کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سوکھا ہوا مڑا تڑا سا غبارہ مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا.... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی میرے اپنے بیٹے کی ہو۔''

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔

''میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا۔ ''خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی۔'' لیکن بالآخر میرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی... مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی مری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔''

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اب گلاب کے چھوٹے سے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اُسے اُس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔ وہ خوف سے چلایا: ''پانی...!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا۔ اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ ابھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوف زدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا، بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے، رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا:

''یہ کہانی دراصل میری نہیں۔ میرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا۔''

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی... قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔ جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچے نے ڈال دیا تھا... شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اُس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اُڑی اور میرے بھائی کی ناک میں داخل ہو گئی... میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔''

''اچھا۔ پھر کیا ہوا؟؟'' پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفاک تھی۔ وہ اب بھی گلاب کے اُس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

''پھر... پھر...'' چوتھا درویش خوف زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا:

''پھر میرا بھائی بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا... اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا، وہ اس پر سوار ہو گیا۔ جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا، اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔''

''حیرت ہے... حیرت ہے!'' پہلا درویش بڑے مکارانہ انداز میں

بولا۔اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں جو اب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا۔چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔میں نے اسے قتل کر دیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی،اسے کھود ڈالا... وہاں واقعی خزانے تھے...مگر...مگر...''

''مگر کیا؟...'' پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری۔

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت...

''پانی...!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔پانی پیا۔پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔

اس نے خوف سے جھرجھری لی۔

''مگر کیا...؟'' پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''مگر...یہ کہانی میرے دوست کی نہیں...میری اپنی ہے...اپنی...'' اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی۔

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

''ہاہاہا...اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب مری رعایا ہیں... اور میں اس نئے عہد کا حکمران...عظیم حکمران...ہاہاہا...''

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔اس نے کوزے کو دیکھا۔ کوزہ خالی ہو چکا تھا۔وہ گھبرا گیا۔اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا...دوڑتا رہا...

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا...پھیلتا رہا...

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا،کنوؤں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟

پیاس کی شدت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا،

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا۔

اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر اور...لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے تیر رہے تھے۔

اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔

گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا!

OO

دو کہانیاں

ڈاکٹر بلند اقبال

گِدھ

"لے جا... تازہ مال ہے۔ ایک ایک بوٹی مزے دار۔ کراری اور خستہ... دیکھ پُٹ دیکھ... ہے نا سُلگتا ہوا پٹاخہ... سینہ دیکھ... دانتوں میں پھنس جائے ماں قسم ایسی بوٹیاں ہیں... سو بوریوں میں ایک دانہ جو ایسا چوکس مل جائے... اچھا... تو ہی بول کیا دے گا... کیا کہا... سالے چھچھڑے خریدنے آیا ہے کیا... چل نکل یہاں سے..." رجو بائی نے گاہک کو ماں کی گالی دی اور بالا خانے کا دروازہ ایسے زور سے بند کیا کہ چوکھٹ پر بجنے والی آواز گاہک کے کانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

رجو بائی چمن آباد میں پچھلے بائیس سال سے عورتوں کا دھندہ کر رہی تھی۔ کتنے ہی بردہ فروش اس کے سامنے لنگوٹ کس کر اُترے مگر مجال ہے جو کسی بھی پہلوان کے سامنے اُس کی سانس ٹوٹی ہو۔ اُس کا مال ہمیشہ دُھلے ہوئے آلوؤں کی طرح بوری سے چم چم چمکتا ہوا اس طرح سے نکلتا کہ گاہک کے منہ سے گُھلی گُھلی پانی چھلکنے لگتا۔ ایسا میٹھا اور رس بھری شکر قند جیسا مال کہ ذرا سے اُبال سے ہی گاہک کی سوکھی مری انتڑیوں میں بھی جیسے آگ دہک جاتی اور جو اگر ایک ادھ آلو سڑا گلا نکلتا بھی تو مجال ہے جو بائی گاہک کے سامنے بھی اُسے لاتی۔ وہ تو بس اُسے اپنی ہی تقدیر کا کھوٹا مال سمجھ کر یا تو یتیم بے سہارا عورتوں کے کسی بھی دارالامان میں پھینک آتی یا پھر اوپر کے کاموں کے لیے بالا خانے میں ہی روک لیتی۔ رجو بائی دھندا کرنے بیٹھی تھی تو ایک ہی نظر میں گاہک کی آنکھوں سے ٹپکتی بھوک سے اُس کی جیب کے بھرے ہوئے پیٹ کا اندازہ لگا لیتی تھی مگر پھر بھی جو کبھی اس کی نظر چوکتی اور کوئی سڑے ہوئے مال کی طرح کا گاہک بالا خانے پر منڈلاتا تو پھر وہی ہوتا... ایک ماں کی گالی زور سے گونجتی اور پھر چوکھٹ پر دروازہ بجتا۔

اُس لڑکی کا نام لاجی تھا۔ پٹھان کوٹ کی تھی۔ گال قندھاری سیب اور ہونٹ لال انگور جیسے تھے۔ چال جنگلی ہرنی جیسی، محلے بھر میں قلانچے بھرتی پھرتی تھی۔ جوانی سولہ سال۔ چھوئے بغیر ہی کسی بپھرے ہوئے بھینسے کی طرح رسیاں تڑا کر لڑنے مارنے کو سینگیں اچھالتی تھی۔ مگر لاجی صرف لڑکی تو نہیں تھی وہ تو ایک دہکتی ہوئی آگ تھی جس کی آنچ سے بھیگی ہوئی لکڑیوں میں بھی دھواں اُٹھنے لگتا تھا۔ اور پھر لاجی کی کجراری آنکھیں... ایسی آنکھیں... جو نہ صرف دیکھتی تھیں بلکہ بولتی بھی تھیں۔ دھلی دھلی شفاف آنکھیں... جو دیکھنے والوں کے دل کا سارا حال چپکے سے اُنھیں کہہ ڈالتی تھیں... بلوری بلوری چمکتی ہوئی آنکھیں... جو دیکھنے والوں کے عکس کو اُس پیار سے اپنے آپ میں سما لیتیں کہ کچھ دیر کے لیے تو اُن کے دل کی دھڑکن ہی تھم جاتی اور پھر وہ خود کو اُس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوبتا پا کر شرما شرما جاتے۔ ایسے میں لاجی خوب ہی کھلکھلا کر ہنستی... اور اُس کی سریلی آواز پہاڑوں پر گرتے جھرنے کی طرح ایسے سریلے نغمے بن کر گنگناتی کہ مسافر بھی گھروں کے راستے بھولنے لگیں۔

پھر نہ جانے کیسے کب کیا ہوا۔ بس آنکھ کھلی تو لاجی رجو بائی کے بالے خانے پر پڑی سسک رہی تھی۔ زبان گنگ، چہرہ فق اور آنسو جیسے ساون کی جھڑی کی طرح اُس کے گالوں کو دھو رہے تھے۔ رجو بائی سامنے کھڑی ہوئی اُس کو للچائی نظروں سے تک رہی تھی۔ "ہائے یہ تو ریشم جیسا مال ہے رے" رجو بائی منہ میں پانی بھر کر بولی... پھر منہ بولی رقم دلال کو تھما کر اُس کو چلتا کیا اور دروازہ بند کر کے لاجی کے سامنے اکڑوں ہی بیٹھ گئی۔ "اے یہ تو پورا سونے کا لڈو ہے"... "گاہکوں کے لیے جیسے چکن روسٹ"... رجو بائی نے لاجی کے سرخ دہکتے گالوں کو کسی قصاب کی طرح سے چھوا۔

لاجی کو لگا جیسے رجو بائی نے اپنے زہریلے ناخن اُس کے گالوں میں اُتار دیے ہو۔ وہ کسی حلال ہوتے ہوئے بکرے کی طرح اپنے نرخرے سے دردناک آوازیں نکال کر چیخنے لگی۔ رجو بائی نے جھلا کر لاجی کی گردن ایک ہاتھ سے پکڑی اور دوسرا ہاتھ اُس کے منہ پر رکھ کر اُس کی وحشت ناک چیخیں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ لاجی کو لگا جیسے رجو بائی اُس کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اُس نے اپنی روتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھوں سے کچھ اس طرح سے رجو بائی کو دیکھا کہ نہ جانے کیوں رجو بائی لمحے بھر کے لیے کانپ سی گئی۔ پل بھر کے لیے رجو بائی کو لگا جیسے لاجی کی آنکھوں میں ایک زندہ گوشت کھانے والا گدھ ہے جو لاجی کی بوٹیاں نوچنے کے لیے اپنی چونچ اُس کے جوان جسم میں گاڑ رہا ہے... رجو بائی نے ڈوبتے ہوئے دل سے لاجی کی آنکھوں سے اپنی نظر ہٹائی اور اُس کی گردن چھوڑ کر خود کو زور سے ماں کی گالی دی اور پھر بالا خانے کا دروازہ جھٹکے سے کھول دیا۔

فرشتے کے آنسو

چھت کے کونے پہ مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی ایک مکھی اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہی تھی اور فرش پر بیٹھا ہوا ایک فرشتہ جس کا کل وجود محض ایک قلم اور دوات تھا، اُسے تک رہا تھا۔ میز کے کونے پہ پڑی دوات اور اُس میں ڈوبا ہوا قلم۔ کمرے کے کسی مکیں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک فرشتہ کسی استعارے کی شکل میں وہاں موجود انسانوں کی سر نوشت کو پڑھ رہا ہے اور اپنے رب الجلیل کے لیے قرطاس کی جبیں پہ اُن کی تقدیر لکھ رہا ہے۔ کچھ دیر بعد فرشتے نے اُکتا کر چھت سے نظر ہٹائی اور پھر خالی خالی نظروں سے کمرے کو تکنے لگا۔

کمرے میں دوائیوں کی کھٹی کھٹی بساند پھیلی ہوئی تھی، دیواروں کا چونا پپڑیاں بن کر اُتر رہا تھا، دروازے کھڑکیوں کے باریک جال دار پھٹے ہوئے پردے ہوا کے جھونکوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے، کمرے کے کونے میں ایک پُرانی سنگار میز رکھی تھی جس میں جڑا زنگ آلود آئینہ گزرے ہوئے وقت کی چغلی کھا رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک لکڑی کی الماری تھی جس کا آدھا ٹوٹا ہوا پٹ الماری کے اندر کا کچھ کچھ حال دکھا رہے تھے۔ دواؤں کی نئی پُرانی بوتلیں، سرنجوں کی تھیلیاں، گرم پانی کا مرتبان، چھوٹے بڑے تولیے اور سفید سوتی چادریں۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک پُرانی وضع کی مسہری تھی جس کے اصل نقش و نگار محض دیمک کی غذا بن کر رہ گئے تھے مسہری پر لیٹی ہوئی ایک اَدھ مری لڑکی بے بس نگاہوں سے مکڑی کے جال میں پھنسی مکھی کو آہستہ آہستہ مرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

فرشتے نے خالی خالی نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا جو پچھلے اکیس سال سے جان کنی کی حالت میں بستر پہ پڑی تھی... لمحے بھر میں فرشتے کو لگا جیسے ہوا کا ایک تیز جھونکا، کھڑکی کے پردے کو اُڑاتا ہوا آیا اور لڑکی کی نوشت کو ماضی میں دھکیل گیا۔ قرطاس کے پنے پلٹتے چلے گئے، کمرے کی نگارش بدلتی چلے گئی۔

ایک خوب صورت سی چھ سال کی بچی اپنی ماں کی گود میں سر رکھے بخار میں پُھنک رہی تھی۔ اُس کی رنگ برنگی مسہری پہ کڑھے خوش نما پھول اُداس نظروں سے اُسے تک رہے تھے۔ وہ ڈری ڈری خوف زدہ نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی اور تتلا تتلا کر منتیں کر رہی تھی۔ "اماں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مجھے اکیلا نہ چھوڑنا" اور اُس کی سہمی ہوئی ماں اُسے روتے ہوئے گلے سے لگا کر کہہ رہی تھی "نہیں میری بچی... کبھی نہیں۔" اور پھر فرشتے نے دیکھا کہ جان کنی کی حالت میں پڑی بیٹی جیسے وہی ٹھہر سی گئی۔ جن سانسوں کو اُکھڑنا تھا وہ نہیں اُکھڑی۔ وہ زندہ تو رہی مگر چپ چاپ آنکھیں موندے ایک انجان گہری نیند میں چلی گئی۔ ماں نے روتے ہوئے اپنی پیاری بیٹی کے کانوں میں کتنا ہی چیخا تھا مگر آوازیں جیسے بازگشت بن گئی اور پھر ہر آواز اُسی گونج سے لوٹ کر اسے واپس آنے لگی... اُس کے آس پاس کھڑے ہوئے طبیب اُسے سمجھاتے تھے۔ تمھاری بیٹی Locked-in syndrome میں ہے کہ وہ زندہ تو ہے مگر اُس کا دماغ مر چکا ہے... عجیب موت تھی وہ۔ جس میں دل بھی دھڑکتا تھا، سانس بھی چلتی تھی، آنکھیں دیکھتی بھی تھیں، روتی بھی تھیں اور ہنستی بھی تھیں مگر... ہونٹ چپ تھے اور جسم بے جان تھا۔ فرشتے نے خالی خالی نظروں سے اپنے اندر کو ٹٹولا مگر وہاں سوائے قلم دوات کے کچھ بھی نہیں تھا..... اُس نے چپکے سے مصلحتِ رب الکریم کے آگے سرنگوں کر لیا اور سرنوشت کے پنے پلٹنے لگا۔

دن مہینوں میں بدلنے لگے اور اور مہینے سالوں میں۔ ماں روز صبح اُٹھتی، اپنی بیٹی کا منہ گرم پانی کے تولیے سے صاف کرتی، اُس کے بال سنوارتی، پیٹ میں لگی مصنوعی نالی سے اُس کے جسم میں غذا اُتارتی، انسولین کے ٹیکے لگاتی، ہر دو دو گھنٹے بعد اُس کی کروٹ بدلتی، روزانہ اُس کا بدن دُھلاتی۔ کپڑے بدلتی، بستر ٹھیک کرتی۔ اکیس سال سے وہ اسی طرح روزانہ صبح سے شام کرتی مگر جب رات ہو جاتی تو کھڑکی میں کھڑے ہو کر نہ جانے اندھیرے میں کیا ڈھونڈتی رہتی اور جب اُس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو خود سے بڑبڑانے لگتی... "وعدہ تو وعدہ ہے... وعدہ تو وعدہ ہے۔" پچھلے اکیس سال سے فرشتہ ماں کے ان ہی لفظوں کا کاتبِ تقدیر بنا ہوا تھا۔

مگر سرنوشت کا حال تو سوائے رب الجلیل کے کسی کے بھی علم میں نہ تھا تو اچانک ایک دن۔ فرشتے کے ہاتھ کانپ سے گئے۔ عجیب صبح تھی وہ کہ ماں جو روز صبح اُٹھتی تھی، اُس دن صبح نہ اُٹھی۔ ہوائیں کھڑکیوں کے پردوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی، قرطاس کے پنے ایک کے بعد ایک پلٹ رہے تھے مگر... صفحے سادہ تھے، لفظ گم ہو گئے تھے۔ فرشتے نے حیران نگاہوں سے قلم کو دیکھا مگر سیاہی خشک تھی۔ اُس نے بے چینی سے نظر گھما کر بیٹی کی طرف دیکھا جو بے بس آنکھوں سے مکھی کو مکڑی کا شکار ہوتے دیکھ رہی تھی مگر ابھی تک اپنی ماں کا انتظار کر رہی تھی جو اکیس سال کی طویل تھکن کے بعد اچانک گہری ابدی نیند میں سو گئی تھی۔

فرشتے نے لرزتے ہاتھوں سے دوبارہ قلم اُٹھایا اور لکھنے کی کوشش کی مگر اُسے لگا جیسے اُس کا بنایا ہوا ہر لفظ اُس کے آنسوؤں میں بھیگ کر اُس کے روتے ہوئے دل کی تصویر بنتا جا رہا ہے۔ آہ... کیا فرشتے رو نہیں سکتے۔ اس نے خداوند تعالیٰ کے آگے سرنگوں کیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ OO

کوئلہ

ابن اسماعیل

''قدوس نے خودکشی کرلی''

یہ سن کر میں ملول اور رنجیدہ تو ہوگیا لیکن متعجب ذرہ بھر بھی نہیں ہوا۔ قدوس جس راہ پر چل نکلا تھا میرے منطقی ذہن کے لحاظ سے اس کا یہ بالکل صحیح انجام تھا۔ اسے کافکا کے 'کایا کلپ' کا کا کروچ پہلے پہل کافی پسند تھا۔ ہر وقت کامیو، کافکا، ژید کے شاہ کاروں کی باتیں کرتا، اس نے فرانسیسی نہیں پڑھی تھی لیکن انگریزی کے ذریعے فرانس کے ادب عالیہ کا بھرپور مطالعہ کیا تھا۔ وجودی فلسفے، دہری اور مذہبی، دونوں کو کسی مقدس تعویذ کی طرح گھول کر پی گیا تھا۔ برسوں سارتر، یاسپر، اور کامیو جیسے الحاد پسند وجودی مصنفوں کا مداح رہا۔ پھر کیر کیگارڈ سے گذرتے ہوئے ابن عربی کے دام میں پھنس گیا اور میرے نزدیک یہی دوڑ اس کے اخلاقی زوال کی سیڑھی ثابت ہوئی۔

ابن عربی اور اسی کے قبیل کے متصوفین کا سارا الم غلم پڑھ ڈالا اور پھر شروع ہوگئیں عجب وغریب غیر انسانی ریاضتیں اور مشقتیں۔ میں نے بھرپور احتجاج کیا۔ لاکھ اعتراضات اس کی نئی راہ پر کر ڈالے۔ حقیقت کیا ہے؟ لاکھ سمجھایا، الٹا کہا۔

''حقیقی چیز تو میرے ہاتھ آگئی ہے۔'' فتوحات کی دوسری کی جلد کے اوراق کو تاش کے پتوں کی طرح انگلیوں سے چھوڑتے ہوئے ''تمہارا فرانسیسی ادب بلکہ سارے جہاں کا ادب انسان کے منفی جذبوں اور رویوں کو ابھارتا، اچھالتا اور ہوا دے کر انسان کو اس عرفان سے برگشتہ کر دیتا ہے جو انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے۔ اس کے علی الرغم یہ کتابیں... ''فتوحات، طواسین وغیرہ کی طرف اشارہ کرکے'' انسان کے مثبت اور منفی دونوں جذبوں اور رویوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے بیچ ایک متوازن اور متناسب فرق پیدا کرکے انسان کے مقصد تخلیق کے تصور کو پہنچتی اور پختہ کرتی ہیں۔ یہ انسان کا کیا سے کیا بنا دیتی ہیں... میں... میں بہت عجیب کر رہا ہوں۔ بہت ہی عجیب... بوڑھے کھوسٹ لوگوں کی جوان اور خوش شکل بیویوں کی تاک میں رہنا اور ان کے ساتھ وقت گزارنا کس قدر ہیجان انگیز اور خوش کن لگتا تھا۔ اس کے خیال سے ہی وجود میں کیا ہوک اٹھتی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو شرم آجاتی ہے۔ کہیں آلودگی میں گھرے رہتے تھے؟ یہ چیز انسانی زندگی کی معنویت اور اہمیت کی اس قدر دشمن ہوگی کبھی گمان بھی نہ کیا تھا... تم ہنسو گے... مذاق اڑاؤ گے میرا... لیکن میں پھر کہتا ہوں میرے دوست! کبھی کبھار لگتا ہے کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا ہوں... یہ خلا... یہ خلا جو تمہیں خالی نظر آتی ہے بالکل خالی نہیں ہے میں اس میں کچھ محسوس کرتا ہوں...'' کسی ایکٹر کی طرح خلا میں گھورتے ہوئے اور اپنی انگلیوں سے خلا کو کسی ٹھوس شے کی طرح ٹٹولتے ہوئے... ''ایک بے حد نرم وجود...... تصور کی حد سے بھی زیادہ نرم شے۔ ہلکی سی آنچ کے ساتھ... کیا یہ ہے؟ میں ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ کیا یہ میرا واہمہ ہے؟ اگر یہ واہمہ ہے تو یہ ساری کتابیں جھوٹی ہیں، بنڈل ہیں اور ان میں جن پاک نفوس کے حیران کن تذکرے ہیں وہ سراسر لپاڑ گی ہے۔ بے شک میرا عقلیت پسند دماغ ان ساری کتابوں کے علم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔ لیکن میرا جذبات پسند دل اس علم کے سلسلے میں کسی شک و شبے کا شکار نہیں، اور... اور پھر خلا میں موجود یہ عجیب ناقابل بیان وجود کیوں مجھ میں میرے وجود کی موجودگی کے احساس کو بے پناہ یقین کی طاقت بخشتا ہے، جب بھی میں اسے اپنی انگلیوں سے چھوتا ہوں...''

میری طبیعت منغض ہوگئی۔ قدوس نے مجھے سچ مچ بور کر دیا تھا۔ یہ مجھے گھسنے کی کوشش تو نہیں کر رہا؟ لیکن اس کی سنجیدگی، جوش، حرکات، آنکھوں سے جھانکتی دیوانگی آخر کیا معنی رکھتی ہیں یہ سب چیزیں؟

خلا میں سونگھتے ہوئے ''گوشت جلنے کی بو آرہی ہے۔ معلوم تو کرنا نیچے جاکر...''

مجھے کسی قسم کی کوئی بو محسوس نہیں ہوئی۔ نیچے اس کے گھر والوں سے

معلوم کیا، انہوں نے کہا کہ گھر میں تو نہیں البتہ دور پڑوس میں بکری کے سری پائے بھونے جارہے ہیں۔

میں نے کامیو کے عظیم مابعد الطبیعاتی شاہکار 'طاعون' کا دوسرا باب ختم کیا۔ بار بار قدوس کی باتیں یاد آتی رہیں۔ اس کا معاملہ بھی تو مابعد الطبیعاتی قسم کا ہے۔ خلا میں عجیب شے ...آخر کیا نظر آتا ہے اسے خلا میں؟ ساری کائنات تو خلا ہی خلا ہے اور ہر محسوس اور مرئی شے اسی خلا کی شکل اور صورت۔ پھر کیا خلا کا کوئی غیر مرئی وجود بھی ہے؟ جو قدوس کی آنکھوں اور انگلیوں نے پکڑ لیا؟...ماجرا کیا ہے؟ تذبذب اور تشکیک کے باعث کتاب کے ساتھ میں انصاف نہیں کر پا رہا تھا۔

آخری ملاقات پر بھی اس کی باتوں کا رنگ وہی تھا۔

''کوئی چیز میرے اندر جل رہی ہے۔ سرتاپا شعلۂ جوالا خود کو محسوس کرتا ہوں۔ سارا وجود کرب کا سمندر بنا ہوا ہے۔ میرا کیا ہونے والا ہے میں ٹھیک طرح سمجھ نہیں پا رہا۔ لیکن.....لیکن میں خوف زدہ بھی نہیں ہوں بلکہ ایک اندھی آندھی جیسی خواہش میرے پورے وجود میں لہریں مار رہی ہے کہ میں کسی آگ کی سرنگ سے گزر جاؤں۔ آگ...آگ...آگ ...میں ہر جانب آگ محسوس کر رہا ہوں۔ کبھی اسے اپنے سر کے اندر۔ بہت اندر جلتا ہوا پاتا ہوں تو کبھی دور افق میں اسے ایک بڑے دائرے کی شکل میں دیکھتا ہوں۔ خلا بھی آگ کی صورت دھار لیتی ہے...دیکھو! آگ کی آغوش میری طرف بڑھ رہی ہے مجھے اپنے گلے سے لگانے کے لئے۔ میں کرب کے بحرِ عمیق کو باضابطہ ایک ہیئت اور صورت میں دیکھتا ہوں جس میں میرا وجود ڈوبتا جاتا ہے...میرا سارا وجود۔ کرب اور بلا کی ایک متشکل کائنات...''

میں گھبرایا۔ یہ سچ مچ پاگل تو نہیں ہو گیا؟ اس لمحے میں نے دنیا کی تمام کتابوں سے گہری نفرت محسوس کی۔ کتابوں نے ہی تو اسے اس حال کو پہنچایا تھا۔ میں نے خود کو اس بار بیمار محسوس کیا۔ اس رات گھر آکر خلاف عادت کوئی کتاب نہیں پڑھی۔

قدوس نے خودکشی نہیں کی۔

قدوس کے گھر والوں نے حلفاً کہا کہ آدھی رات کو وہ یکا یک چیخنے چلانے لگا کہ رات کو گھر میں گوشت کیوں بھونتے ہو؟ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ آدھی رات کو کون گوشت بھونتا؟ گھر والوں کے دیکھتے دیکھتے اس نے کپڑے پھاڑے اور کمرے سے بھاگ کر صحن میں آ گیا۔ الف ننگا ہو کر کسی ان دیکھی چیز سے جیسے لڑنے لگا۔ پھر اچانک اس کا سارا بدن سرتاپا ایک بے دھویں کے شعلے میں تبدیل ہو گیا اور آسمانی بجلی کی طرح یک لخت بجھ بھی گیا۔

کوئلے کا بت...میرے سامنے کوئلے کا بت رکھا تھا۔ کوئلہ...یہ لفظ میرے دماغ کے ہر گوشے سے ٹکرا کر واپس آ گیا۔ میں اس انسانی کوئلے کا مفہوم نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ کوئلہ...انسانی کوئلہ...کاش میں کٹھ پھوڑ ہوتا تو اپنی سخت چونچ سے اس لفظ کے سخت ترین خول کو توڑ کر جان پاتا کہ قدوس نے سچ مچ خودکشی ہی تو نہیں کی تھی؟ ؟ ؟

OO

شبنمی آگ

جمیل عثمان

جب روبینہ سے مجھے محبت ہوئی تو ہم دونوں کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس کی شیخ توصیف مرزا سے اور میری ناجیہ ہمدانی سے جو میرے ماموں میاں سہراب احمد ہمدانی کی بیٹی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں دوسری شخصیات سے منسوب ہیں، میں اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا تھا اور حالات یہ بتاتے ہیں کہ شاید اس کا بھی یہی حال تھا۔

یہ قصہ شروع ہوا تھا روٹ نمبر 5C کی ایک بس سے۔ میں دفتر جانے کے لئے گلبرگ سے بس پر سوار ہوا اور بولٹن مارکیٹ کے اسٹاپ پر اتر کر نظریں نیچی کئے دفتر کی طرف چلنے لگا۔ پھر میری نظر ان پیروں پڑی جو میرے برابر چل رہے تھے۔ گورے گورے، خوبصورت، نازک گلابی ایڑیوں والے پیر۔ ناخنوں پر سرخ نیل پالش لگی ہوئی۔ سنہری سینڈلز میں یہ پیر ایسے لگ رہے تھے جیسے دو سفید کبوتروں کو سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو۔ ان سنہری سینڈلوں کو میں نے جوتوں کے ایک شوروم میں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سینڈلز بہت پسند آئے تھے۔ اور میں نے ان میں گورے گورے پیروں کا تصور کیا تھا۔ یہ پیر جو اس وقت میرے برابر چل رہے تھے بالکل میرے تصور کے مطابق تھے۔ میری نظریں پیروں سے ہٹ کر اوپر... اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا جو میرے برابر چل رہی تھی۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ساری تشبیہیں دھری رہ گئیں، سارے استعارے مفقود ہو گئے، تمام مثالیں ناپید ہو گئیں۔ میں یہی سوچتا رہ گیا کہ خدا نے اس مجسمے کو بڑی محنت اور محبت سے تراشا ہوگا اور جب اس میں روح پھونکی ہوگی تو اپنی تخلیق پر خود اترایا ہوگا۔

اس دن کے بعد سے میں روزانہ اس بس کا انتظار کرنے لگا جس سے وہ آتی تھی۔ بس سے اتر کر وہ چلنا شروع کرتی تو میں اس کے پیچھے ہوتا۔ پھر میں تیز تیز چلتا ہوا اس کے برابر پہنچ جاتا۔ چند ثانیوں کے لئے ہم دونوں کے قدم ساتھ ساتھ اٹھتے۔ وہ گردن گھما کر میری طرف دیکھتی کہ یہ کون گستاخ ہے جو قدم سے قدم ملا کر چلنے کی جسارت کر رہا ہے۔ ہماری نظریں چار ہوتیں اور پھر میں اس سے آگے نکل جاتا کہ زیادہ دیر تک ساتھ چلنا آداب کے خلاف تھا۔ اور دنیا جو ساتھ چل رہی ہوتی تھی ضرور چونکتی۔ ہم دونوں کے دفاتر سڑک کے ایک ہی جانب برابر برابر دو عمارتوں میں تھے۔ میرا دفتر پہلے آتا تھا پھر اس کا۔ اپنے دفتر کے قریب پہنچ کر میں اپنی رفتار کم کر دیتا تا کہ وہ مجھ سے آگے نکل جائے اور میں اسے ایک نظر اور دیکھ سکوں۔ میرے برابر سے گزرتے ہوئے وہ پھر مجھے گردن موڑ کر گہری نظروں سے دیکھتی۔ ہماری آنکھیں ملتیں اور وہ جلدی سے آگے بڑھ جاتی۔ تب میں اپنے دفتر میں داخل ہو جاتا۔ یہی روز کا معمول تھا۔ ان دو لمحوں کے انتظار میں ساری رات میں بے چینی میں کاٹا کرتا۔

ایک روز جب میں گلبرگ سے بس پر سوار ہوا تو اسے خواتین کے حصے میں ایسی جگہ بیٹھا دیکھا جہاں سے وہ مجھے صاف نظر آسکتی تھی۔ میں بس میں سب سے آگے والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور وہ ڈرائیور کے بائیں جانب والی سیٹ پر جو دروازے اور ونڈ شیلڈ کے درمیان ہوتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد میں کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے کے بہانے دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں گردن گھماتا اور اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیتا۔ کبھی کبھی اسے بھی اپنی طرف دیکھتا ہوا پاتا۔ اس دن کے بعد سے میں صرف اسی بس میں سوار ہوتا جس میں وہ ہوتی۔ سامنے سے آتی ہوئی بس میں خواتین کے حصے میں بیٹھی ہوئی وہ مجھے نظر آجاتی اس لئے کہ صبح کے وقت اس حصے میں بھیڑ نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ابھی اسکول اور کالج کا رش شروع نہیں ہوا ہوتا تھا۔ ہمارا وقت معین تھا۔ نو بجے سے دفتر شروع ہوتا تھا اس لئے ہمیں پونے آٹھ بجے والی بس لینی پڑتی تھی۔ اگر وہ کسی بس میں نہ ہوتی تو میں اسے چھوڑ دیا کرتا تھا اور دوسری بس کا انتظار کرتا۔ اگر کسی روز وہ دفتر کا ناغہ کرتی تو اس چکر میں مجھے دیر ہو جاتی۔ مگر میں آٹھ بجے سے زیادہ دیر تک اس کا انتظار نہیں کرتا۔ اس طرح مجھے دفتر پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ دیر نہیں ہوتی جس کی اجازت تھی۔

یوں تو میں بہت ساری لڑکیوں کو جانتا تھا مگر ان سے یک گونہ تعلق جو تھا

وہ صرف اس وجہ سے کہ وہ ہونا ہی تھا۔ رشتہ دار لڑکیاں یعنی ماموؤں، خالاؤں، چچاؤں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں، کالج اور یونیورسٹی کی کلاس فیلوز، میری بہنوں کی کالج کی سہیلیاں یا پڑوسن لڑکیاں جن کا ہمارے گھر آنا جانا ہوتا۔ مگر روبینہ وہ واحد لڑکی تھی جس سے کسی قسم کا ربط نہیں تھا۔ وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ نہ تو رشتہ دار، نہ کلاس فیلو اور نہ ہی پڑوسن۔ اس سے میں نے خود رسم و راہ پیدا کی، اپنی طرف متوجہ کیا، آزادی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

میرا دفتر شام کے پانچ بجے بند ہوتا تھا اور اس کا چار بجے۔ کسی کسی روز میں کچھ لینے کے بہانے باہر نکل آتا تو اسے فٹ پاتھ پر بس کے انتظار میں کھڑا پاتا۔ وہی حسن، وہی وقار، وہی دلآویزی، وہی نکھار، پیشانی پہ وہی چمک، آنکھوں میں وہی خوابیدگی، پیرہن کی وہی رنگینیاں، چہرے پر وہی سنجیدگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے صبح سے شام تک کام کا اس پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا ہو۔ میں اس کے سامنے سے گزرتا تو وہ مجھے ایک بار... صرف ایک بار دیکھتی اور پھر نظریں چرا لیتی تھی۔

دفتر سے واپسی پر وہ پبلک بس کی بجائے ایک خاص کنٹریکٹ بس لیتی تھی۔ ایک روز میں نے آفس سے ایک گھنٹے پہلے چھٹی کرنے کی اجازت لی اور شام کو اسی کنٹریکٹ بس میں سوار ہوا جس سے وہ جایا کرتی تھی۔ چونکہ بس میں جتنی سیٹیں تھیں اتنے ہی مسافر تھے اس لئے دروازے کے قریب والی سیٹ پر بیٹھنے کے باوجود میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ گلبرگ میں جس اسٹاپ پر وہ اتری وہیں میں بھی اتر گیا۔

"سنیئے" میں تیز تیز چلتا ہوا اس کے برابر آ گیا۔ شاید اسے میرے ارادوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے گورے گال گلابی ہو گئے تھے اور کنپٹیاں سلگ اٹھی تھیں۔ کان کی لو سے چمٹا ہوا ایک سفید موتی والا بندہ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اگر اجازت ہو تو میں تھوڑی دور آپ کے ساتھ چلوں؟"

"کیوں؟"

"دراصل میں ایک فری لانس صحافی ہوں۔ ملازمت پیشہ خواتین کے بارے میں ایک سروے کر رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑا وقت مجھے دیں۔" تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے تھی۔

"مگر میں ہی کیوں؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مگر اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"ارے... آپ اتنی بڑی فرم میں ملازمت کرتی ہیں اور اس قدر ہچکچاہٹ...؟"

"ملازمت کرنے کا یہ مطلب تو نہیں..."

"اچھا... یہ لیجئے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ چند اخبارات اور رسائل ہیں جن میں میرے مضامین اور انٹرویوز شائع ہوئے ہیں۔" میں نے بزنس ریکارڈر اور پاکستان اکنامسٹ کی چند کاپیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے کیا معلوم کہ کون سے مضامین آپ کے ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"آپ لیجئے تو سہی۔" میں نے وہ براؤن لفافہ، جس میں اخبارات اور رسائل تھے، اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ لفافہ لے لیا۔

"اس لفافے پر میرا نام، پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے فون کر لیں۔"

وہ بغیر کچھ کہے آگے چلتی رہی اور میں بھی اس کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ نہ جانے کب اس کا گھر آ جائے اور وہ چلی جائے۔

"فون کریں گی نا؟"

"معلوم نہیں!" وہ نظریں نیچی کئے مسکرائی۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" میں نے دوسرا سوال کر دیا۔ ایک شرم آگیں مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلتی رہی اور وہ زمین پر نظریں گاڑے آگے چلتی رہی۔ میں نے پھر ایک کوشش کی۔

"آپ کے آفس کا نمبر تو ڈائرکٹری سے مل جائے گا۔ صرف ڈپارٹمنٹ یا ایکسٹینشن نمبر بتا دیجئے۔"

"پے رول ڈپارٹمنٹ۔" اس نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ پھر بولی

"اچھا میرا گھر آ گیا۔ آپ جائیں۔"

"چلا جاتا ہوں..... مگر..... نام تو بتا دیں؟" میں نے گویا التجا کی

"روبی۔"

"پورا نام؟"

"کچھ نہیں....!" وہ ہنس دی۔ مدھر گھنٹیوں کی آواز مجھے مدہوش کر گئی۔ میں لڑکھڑاتے بچا۔ اور اس سے پہلے کہ میرے حواس بحال ہوتے وہ "خدا حافظ" کہہ کر ایک مکان کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ میں رکا نہیں۔

میں اپنے اس اقدام پر خود حیران تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس سے خود تعارف حاصل کر کے بات کی ہے۔ میں نے اکثر لڑکوں کو دیکھا تھا کہ محبت میں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں مگر دل کی بات کہنے کا حوصلہ نہیں

رکھتے۔ کسی بچے کے ہاتھوں خط بھیجتے ہیں تو کسی پیام بر کی زبانی پیغام۔ میں خوش تھا کہ اس نے مجھ سے بات کی، اپنا نام بتایا، میری دی ہوئی کتابیں اور اخبار قبول کیئے۔ اسے میں کیا سمجھتا۔ شاید میں نے جو کچھ سمجھا تھا وہ صحیح تھا۔ شاید میرا اندازہ غلط بھی ہو؟... شاید...!!

دوسری صبح حسب معمول ہم ایک ہی بس میں بولٹن مارکیٹ پہنچے۔ ویسے ہی پہلے میں اس سے آگے نکل گیا، پھر دفتر کے قریب پہنچ کر وہ مجھ سے آگے نکل گئی اور دونوں مرتبہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ براؤن لفافہ تھا جو گذشتہ روز میں نے اسے دیا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ہولے سے مسکرائی مگر پھر سنجیدہ ہوگئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں نے کانپتے ہاتھوں سے اس کے دفتر کا نمبر ملایا اور پے رول ڈپارٹمنٹ کی روبی کا ایکسٹینشن آپریٹر سے مانگا۔

"یو مین روبینہ؟" اینگلو انڈین آپریٹر کی تیز آواز میرے کانوں میں چبھ گئی۔

"یس۔"

"ہیلو..." اس کی آواز نے آپریٹر کی آواز کی کرختگی کو دور کر دیا۔

"ہیلو..." میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

"کون صاحب؟"

"پہچانیئے؟"

"کون بول رہا ہے بھئی؟" اس کی آواز میں اب کے جھنجلاہٹ تھی۔

"میں...... حسیب احمد ہوں۔"

"اوہ!"

پھر طویل خاموشی رہی۔ کچھ کہنے کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے اور شاید دوسری طرف اس کا بھی یہی حال تھا۔ میں اب سوچتا ہوں کہ نہ جانے اس وقت وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ کیونکہ نہ تو اس نے کچھ کہا اور نہ ہی لائن ڈس کنکٹ کی۔ آخر چند ثانیوں کے بعد وہ بولی۔

"ایسا کیجئے آپ مجھے ڈھائی بجے فون کرلیں۔ اس وقت لوگ ہیں۔"

"بہت بہتر۔"

ڈھائی بجے میں نے پھر فون کیا۔

"مضامین پڑھے آپ نے؟"

"ہاں۔"

"کیسے لگے؟"

"اچھے ہیں۔"

"تو آپ کا کیا خیال؟"

"کس بارے میں؟"

"کہیں بیٹھ کر گفتگو نہ کریں؟"

"نہ!"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے آپ کا مقصد وہ نہیں ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔"

"چلئے یہی سمجھ لیجئے۔"

"اس سے قبل کہ کوئی غلط فہمی پیدا ہو... میں یہ بتادوں کہ میں کسی سے منسوب ہوں۔" اس نے دھماکہ کیا۔

"اچ... چھا...!" میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ پھر بھی میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"ہے ایک شخص!"

"کہاں؟"

"امریکہ میں۔"

"پھر آپ بھی چلی جائیں گی؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے اسی سال... ہوسکتا ہے اگلے سال۔"

"پھر بھی ہم میں دوستی تو ہوسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"تو آپ کب مل رہی ہیں؟"

"یہ بعد میں طے کریں گے۔"

"ابھی کر لیجئے نا!"

"نہیں۔ ابھی کچھ لوگ آرہے ہیں... خدا حافظ"

"خدا حافظ۔"

اس دن طبیعت کچھ مرجھائی سی رہی۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہر دم اس کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور ہر لمحے یہ خیال آتا تھا کہ وہ کسی اور کی ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ میں بھی تو کسی اور کا ہوں۔ یا اللہ، پھر یہ پاگل پن کیوں ہے؟

میں ایم اے کا پرائیوٹ امتحان دے رہا تھا جو ایک ہفتے بعد شروع ہونے والے تھے۔ چونکہ میں ملازمت بھی کرتا تھا، اس لئے امتحان دینے کے لئے پندرہ دنوں کی چھٹی لے لی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ دو ہفتے آفس نہیں جاؤں گا اور نہ ہی اسے دیکھ سکوں گا۔ دل تھا کہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اسے پھر فون کیا۔

"آپ نے نسبت والی غلط بات کیوں کی؟" میں نے ایک موہوم امید کے سہارے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

"نہیں...وہ بات بالکل صحیح ہے" اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے گویا اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا...

"آپ کئی دنوں سے بس میں نظر نہیں آئے؟" گویا اسے بھی میرا انتظار رہتا تھا۔

"ایم اے کا امتحان دے رہا ہوں۔ اس لئے چھٹی لی ہوئی ہے۔ مگر کل صبح میں چلوں گا...5C نمبر بس سے۔"

اس کی ہنسی معنی خیز تھی۔

"مگر آپ تو چھٹی پر ہیں؟"

"ہوں تو سہی، مگر کیا کروں؟ پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ لگتا ہے فیل ہو جاؤں گا۔"

"خدا نہ کرے!" اس نے جلدی سے کہا۔ اس جملے میں اتنی اپنائیت تھی، اتنا لگاؤ تھا اور میری اتنی فکر تھی کہ میں اس کے اثر سے سرشار ہو گیا۔

دوسرے روز اگرچہ میرا دفتر نہیں تھا لیکن میں دفتر کے وقت ہی گھر سے نکلا اور اس کے ساتھ ہی دفتر پہنچا۔ بس سے اتر کر ہم دونوں حسب معمول ساتھ ساتھ دفتر کی طرف چلے۔ میں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستگی سے کہا:

"آج میں آپ کے ساتھ آپ کے دفتر چلوں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ گئی۔ راہ چلنے والوں کے جم غفیر میں ہم پھر الگ ہو گئے۔ آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم اس کے دفتر کے قریب پہنچے تو میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی تا کہ وہ میرے برابر آ جائے۔ جب وہ آئی تو میں نے پوچھا:

"تو میں چلوں آپ کے آفس؟"

"چلئے!" وہ مسکرائی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتفاق سے قریب کوئی نہیں تھا۔

عمارت میں داخل ہو کر ہم لفٹ کے قریب کھڑے ہو کر اس کے نیچے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ بیس منزلہ عمارت تھی اور اس کی چاروں لفٹیں اس وقت اوپر گئی ہوئی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اور لوگ نہ آ جائیں۔ میں بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ایک لفٹ آئی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ اس نے 15 نمبر والا بٹن دبا دیا۔

"کاش آپ کا دفتر بیسویں منزل پر ہوتا!" میں نے حسرت سے کہا۔

"زیادہ اوپر جانے کی کوشش مت کیجئے۔" اس نے کھنکتی ہنسی کے ساتھ کہا۔ لفٹ میں صرف ہم دونوں تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ دور سے سیاہ نظر آنے والی پتلیاں اس وقت کتھئی لگ رہی تھیں۔ آنکھوں کی سفیدی میں نرم ریشمی گلابی ڈورے تیر رہے تھے، جنھیں پلکوں کی لمبی جھالر کبھی چھپا لیتی اور کبھی عیاں کر دیتی۔ ان جھالروں کے اوپر ابروؤں کی کمانیں محافظوں کی طرح تنی کھڑی تھیں۔ اس کے کانوں کی لویں عارض سے جڑی ہوئی تھیں۔ دہکتے ہوئے گال کو ایک آوارہ گھنگھرالی لٹ بار بار چوم رہی تھی۔ نرم و گداز اور بھرے بھرے ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی سنہری روئیدگی بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی کے عین درمیان ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جیسے ساکت جھیل میں بارش کا پہلا قطرہ گر کر دائرہ بن جائے، اور پھر وہ پھیلنے کی بجائے سمٹ کر رہ گیا ہو۔ اس کی ٹھوڑی کے ٹھیک نیچے گردن پر ایک سیاہ تل تھا۔

لفٹ رکی تو وہ باہر نکل کر چند لمحے کھڑی رہی۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں بند نہ ہو جائے۔

"آیئے؟"

"واقعی.....آؤں؟"

"نہیں" وہ مسکرائی۔ "میں تو رسماً کہہ رہی تھی۔"

"مجھے بھی اس وقت ذرا جلدی ہے۔ لائبریری جانا ہے۔"

"خدا حافظ۔" اس کا ہاتھ کپکپاتا ہوا آہستہ سے اٹھا تھا۔

"خدا حافظ۔" میں نے دروازے سے ہاتھ ہٹا لیا اور آٹومیٹک دروازہ بند ہو گیا۔ بند ہوتی ہوئی دراڑ سے میں نے دیکھا کہ وہ وہیں کھڑی تھی۔ لفٹ تیزی سے نیچے جانے لگی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے مجھے بلندی سے دھکیل دیا ہو۔

دن بھر میں لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہا۔ گھڑی پر نظر پڑی تو چار بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس کا دفتر چار بجے ختم ہوتا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو دفتر میں کام کرنے والے مرد اور عورتیں غٹ کے غٹ باہر آ رہے تھے۔ میں اس کی راہ دیکھتا رہا۔ جیسے ہی وہ باہر آئی میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے برابر پہنچ گیا۔

"آج واپسی بھی آپ کے ساتھ ہو گی۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر میرے جملے کا کوئی تاثر نظر آیا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"روبینہ؟" میں نے پھر آواز دی۔ کوئی جواب نہیں ملا تو میرے قدم آہستہ پڑ گئے۔

دوسرے روز اسی مخصوص وقت میں اسے فون کیا۔ یعنی ڈھائی بجے۔ دوسری طرف وہی تھی۔

''ہیلو... کیا میں اس حسین مجسمے سے بات کر سکتا ہوں جو چل پھر تو سکتا ہے لیکن حسن کا چہرہ ہر جذبے سے عاری ہے؟''

''کہاں سے سیکھی ہیں یہ باتیں؟'' اس کی کھنکتی ہنسی دلکش تھی۔

''سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم...''

''بہت باتیں بناتے ہیں...!'' بناوٹی غصے سے کہا گیا۔

''ہم باتیں بنا لیتے ہیں مگر 'آپ کو بات کرنی نہیں آتی'۔''

''کیوں نہیں؟''

''تو کل شام میری بات کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟''

''راہ چلتے گفتگو اچھی نہیں۔ اتنے سارے لوگ آس پاس چل رہے ہوتے ہیں۔ کیا کہیں گے؟'' اس کی سرزنش میں بھی پیار تھا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری بات کا جواب آپ وہاں دیں گی جہاں کوئی نہ ہو۔''

اس کی ہنسی نے میری رگ و پے میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

''جہاں کوئی نہ ہو؟ یہ تو ایک ریڈیو پروگرام ہے... ویران جزیرے میں''۔ اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ دیر تک اس کی ہنسی میرے کانوں میں گونجتی رہی۔

جب تک امتحان ہوتے رہے میں نے اسے فون نہیں کیا اور نہ ہی اس سے ملاقات ہوئی۔ پندرہ دنوں تک میں دنیا و مافیہا سے بے خبر امتحان میں مصروف رہا۔ چھٹی کے بعد دفتر کا پہلا دن معمول کے مطابق رہا وہی 5C کی بس وہی ساتھ چلنا، وہی ایک دوسرے کو دیکھنا مگر اس طرح جیسے انجان ہوں۔ دن کے ڈھائی بجے میں نے فون ملایا۔

''آج صبح یوں لگ رہا تھا جیسے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔''

''نہیں تو!''

''تو پھر ایسی لاتعلقی چہ معنی دارد؟ پندرہ دنوں کے بعد ملے ہیں اور آپ کا چہرہ ویسا ہی سپاٹ کا سپاٹ۔''

''میں نے کہا تھا نہ کہ راستے میں بات چیت کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا ایک بات بتایئے۔''

''کیا؟''

''کچھ لوگ نظروں کو اتنے اچھے کیوں لگتے ہیں؟ جی چاہتا ہے بس دیکھتے ہی رہو!''

اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ خاموشی... طویل خاموشی... اور پھر ٹیلی فون بند ہو گیا۔

دوسرے روز پھر فون کیا۔ اس کا ''ہیلو'' سنتے ہی میں نے خوشگوار لہجے میں کہا: ''کل نہ جانے کیوں آپ نے فون بند کر دیا تھا۔ آیئے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے منقطع ہوا تھا۔'' اس نے کوئی جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔ تیسرے دن پھر فون کیا مگر میری آواز سنتے ہی فون بند کر دیا گیا۔ اس دن کے بعد میں نے اسے پھر کبھی فون نہیں کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی نسبت طے ہو چکی تھی اور یہ دن آنا ہی تھا مگر اس طرح؟ اگر اسے ایسا کرنا ہی تھا تو پہلے ہی روز جب میں نے اسے مخاطب کیا تھا جواب نہ دیتی۔ اس نے مجھ سے باتیں کیوں کی تھیں؟ میری حوصلہ افزائی کیوں کی تھی؟ مجھے اپنا نام کیوں بتایا تھا؟ فون پر خوش گپیاں کیوں کی تھیں؟ پہلے ہی روز جب میں نے فون کیا تھا تو منع کر دیتی!

اس کے بعد میں نے دفتر جانے کا وقت اور راستہ بدل دیا۔ اگلے سال میری شادی ناجیہ ہمدانی سے ہو گئی۔

بیس برس گزر گئے۔ مجھے سعودی عرب میں نوکری مل گئی اور میں اپنی بیوی اور چار بچوں (دو بیٹوں اور دو بیٹیوں) کے ساتھ جدہ جا کر بس گیا۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی، مشینی زندگی۔ ایک آدھ سال بعد پاکستان کا چکر ضرور لگتا تھا۔ اب کے برس بھی میں جب پاکستان آیا تو قدم خود بخود ان راستوں کی طرف اٹھ گئے جن پر تھوڑی دور، تھوڑی دیر میں اور روبینہ ساتھ ساتھ چلے تھے۔ آج بھی مجھے وہ گھر اچھی طرح یاد ہے جہاں وہ اس روز داخل ہوئی تھی جس روز میں نے پہلی بار اس سے شناسائی پیدا کی تھی۔

میں اس گھر کے گیٹ پر سگریٹ سلگانے کے بہانے چند ثانیوں کے لئے رکا تھا کہ ایک نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''حسیب صاحب؟'' میں نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں روبینہ کھڑی تھی۔ بیس سالوں میں تبدیلی تو لازمی تھی۔ تھوڑی موٹی ہو گئی تھی، بالوں میں سفیدی آ گئی تھی اور آنکھوں پر چشمہ لگ گیا تھا۔

''آیئے!''

میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا۔ ہم دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچے اور آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''عجیب اتفاق ہے! آپ کو کیسے معلوم میں یہاں آؤں گا؟''

''مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں تو بس جب بھی امریکہ سے آتی ہوں، ہفتہ دس دن اس ویران گھر میں ضرور گزارتی ہوں اور روزانہ شام کو گیٹ پر دیر تک کھڑی... رہتی ہوں۔''

''کمال ہے! اور میں بھی جب آتا ہوں، ایک آدھ بار اس گلی کا چکر

ضرور لگاتا ہوں۔"

"بیس سالوں میں آج پہلی بار یہ اتفاق ہوا ہے کہ جب میں راہ دیکھ رہی تھی اسی وقت آپ آئے۔"

"آپ یہاں تنہا کیسے رہتی ہیں؟"

"ایک نوکرانی ہے کھانا پکانے کے لئے اور ایک نوکر ہے سودا سلف لانے کے لئے۔ یہ گھر تو بند ہی پڑا رہتا ہے۔ امی، بابا اللہ کو پیارے ہو گئے، بھائی بہنوں نے اپنا اپنا گھر بسا لیا۔ میں ویسے تو اپنے سسرال ہی ٹھہرتی ہوں۔ مگر چند روز یہاں قیام ضرور کرتی ہوں۔ ماں باپ اور بچپن کی یادیں اور... کچھ... چند دوسری یادیں اس گھر سے وابستہ ہیں۔"

"آپ کے شوہر اور بچے؟"

"وہ لوگ امریکہ میں ہیں۔ ابھی آئے تھے۔ بچوں کے کالج کھلنے والے تھے اور ان کی چھٹی زیادہ نہیں تھی، اس لئے وہ لوگ چلے گئے۔ میں چند دنوں کے لئے رک گئی۔ اور آپ سنائیے؟"

"کیا سناؤں؟ بس وہی رام کہانی ہے... شادی ہوئی، بچے ہیں، نوکری کر رہا ہوں اور جئے جا رہا ہوں۔"

"میں آپ کے لئے چائے منگواتی ہوں۔" وہ اٹھ کر اندر گئی اور نوکرانی کو چائے کے لئے کہنے لگی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں براؤن رنگ کا ایک لفافہ تھا۔ اس نے وہ لفافہ میری طرف بڑھایا۔

"آپ کی امانت۔" میں حیرانی کے عالم میں کبھی اسے اور کبھی لفافے کو دیکھ رہا تھا۔ لفافہ لے کر میں نے کھولا تو اس میں بزنس رکارڈر اور پاکستان اکنامسٹ کی بیس برس پرانی کاپیاں تھیں۔ لفافے پر میرا نام اور میرے پرانے آفس کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

"یہ...؟ یہ...؟" میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"بیس برس تک میں نے اسے سب سے چھپا کر رکھا، مگر اب نہیں رکھ سکتی۔ بڑھاپا آ گیا اور نہ جانے کب موت آ جائے۔"

"مگر... مگر اس سے کسی کو کیا پتہ چلے گا؟ اگر کسی کے ہاتھ لگ بھی گیا تو وہ یہی سمجھے گا کہ چند پرانے اخبارات اور رسالے ہیں؟"

"ٹھیک ہے... لیکن اگر کوئی دیکھ لیتا تو ضرور سوچتا کہ میں نے اسے اتنی حفاظت سے کیوں رکھا ہے۔ اور لفافے پر آپ کا نام پتہ بھی ہے۔"

"تو اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت۔ پھینک دیا ہوتا یا جلا دیتیں؟"

"کیسے جلا دیتی؟" وہ ترش روئی سے بولی۔ "کس دل سے جلا دیتی؟" اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ نوکرانی چائے لے کر آ گئی تھی اس لئے اس نے اپنے آنسو پی لئے۔

"ایک سوال میرے ذہن میں آج تک کھٹکتا ہے۔" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"آپ نے بغیر کچھ کہے فون بند کیوں کر دیا تھا؟"

"میرے اندر ایک کشمکش تھی ان دنوں۔ آپ کا فون آتا تو میں آپ کی باتوں میں بہہ جاتی۔ پھر خیال آتا کہ ماں باپ نے جہاں شادی طے کی ہے وہاں اگر نہ ہوئی تو کتنی بدنامی ہوگی۔ خاص طور سے میرے بابا اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے کو ختم کر دوں ورنہ آپ کی بھی حوصلہ افزائی ہوتی اور میں بھی بہک جاتی۔ میں نے اپنے دل پر بہت جبر کیا حسیب صاحب! بہت!!"

وہ رو پڑی۔

"اگر آج بھی ہماری ملاقات نہ ہوتی تو؟"

"تو شاید میں اس لفافے کو جلا دیتی۔"

"آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟"

"لیجئے! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ آپ بدلے تو نہیں ہیں۔ بس سر کے بال ذرا کم اور سفید ہو گئے ہیں اور چھوٹی سی توند نکل آئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"آپ نے کبھی اس تعلق کا، جو ہم دونوں کے درمیان رہا تھا کسی سے ذکر کیا؟"

"کسی سے نہیں۔ اپنی عزیز ترین سہیلی سے بھی نہیں۔"

"اور میں نے بھی کسی کو نہیں بتایا۔ اپنے خاص دوست کو بھی نہیں۔"

میں تھوڑی دیر اور بیٹھا اور اس دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری فلائٹ پرسوں ہے۔" اس نے کہا۔

"اور میں کل واپس جدہ جا رہا ہوں۔ اس طرح یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

"اللہ حافظ۔" آنسو اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

میں لفافہ لئے ہوئے اس کے گھر سے باہر نکلا۔ تھوڑی دور چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ گیٹ میں کھڑی تھی۔ تھوڑی دور اور آگے جا کر ایک کوڑے دان میں جلتی آگ دکھائی دی۔ میں نے لفافہ آگ میں ڈال دیا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی گیٹ میں کھڑی تھی۔ میں نے زیر لب کہا:

"روبینہ! اس محبت کے صرف ہم تین شاہد ہیں۔ میں تم اور...!!" OO

مٹّی

قیصر اقبال

جسیم بھائی اتنے بوڑھے ہو گئے ہوں گے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میں ان کی سفید داڑھی اور سفید ٹوپی کے پیچھے جھرّیوں والے چہرے میں اس جواں سال خوب صورت چہرے کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا جسے میں نے چالیس پینتالیس سال قبل ہمیشہ روشن اور رواں دواں دیکھا تھا۔ اس وقت میں خود بارہ تیرہ سال کا رہا ہوں گا۔ وہ پاس کے کسی شہر میں نوکری کرتے تھے اور سنیچر کی شام کو بھاگتے ہوئے گاؤں آتے جہاں ان کے والدین، بیوی بچے، بھائی بہن سب ہی لوگ رہ رہے تھے۔ گاؤں میں تعلیمی اور ادبی ماحول تھا۔ اکثر سنیچر کی شام کو کسی باذوق کے بنگلے پر شعری نشست منعقد ہو جایا کرتی تھی۔ جسیم بھائی بھی شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا کیا معیار تھا، یہ سمجھنے کا شعور مجھے اس وقت نہیں تھا، ہاں مگر ان کے احبابِ مجلس اور سامعین کرام بڑی بے چینی سے ان کی آمد کا انتظار کرتے اور مجلس جم جانے کے بعد جسیم بھائی نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہاتھ میں اپنی بیاض لئے وارد ہوتے جس سے حاضرینِ مجلس اور دیگر شعرا حضرات کے چہرے کھِل اٹھتے اور پھر ان کے بیشتر اشعار پر واہ واہ کی داد بھی ملتی۔ دُبلے پتلے چھریرے بدن والے دراز قد جسیم بھائی سفید کرتا اور علی گڑھ پائجامہ میں ایک جاذبِ نظر شخصیت کے مالک نظر آتے۔ ان کی چال اور گفتگو میں ایک وقار اور دل کشی ہوتی جو ہر کسی کو متاثر کرتی۔ میں بھی دور کھڑا انھیں دیکھتا اور ان جیسا بننے کی تمنا مجھ میں جاگنے لگتی۔

وقت اپنی رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ قدریں بدلنے لگیں۔ نئے تقاضے سامنے آئے اور احبابِ شعر و سخن، گرفتارِ مسائلِ روزگار ہونے لگے۔ اب شعری محفلیں بھی سونی پڑنے لگیں اور خال خال کوئی محفل سجتی بھی تو اس میں قبل جیسی رونق اور گرمی باقی نہیں رہی۔ صورتِ حال بدلنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ 1960 کی دہائی کے شروع ہوتے ہی ایک بار پھر سے ملک کے مختلف علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہونے لگے۔ کلکتہ، درگا پور، راوڑ قلعہ، جمشید پور، رانچی، جبل پور، بنارس، لکھنؤ، کانپور، احمد آباد... غرض وہ صنعتی اور کاروباری مرکز جہاں مسلمانوں کے قدم کسی حد تک جم چکے تھے اور معاشی پیش رفت کے آثار نظر آنے لگے تھے، فرقہ وارانہ فسادات نے ان پر کاری ضرب لگا دی جس سے چہار جانب فضا گرم رہنے لگی اور تقسیمِ وطن کے زمانے کی ہجرت اور ترکِ وطن کا سلسلہ نئے سرے سے شروع ہو گیا۔ ملک کا پڑھا لکھا اشرافیہ طبقہ جو اب تک اپنے وطن کو عزیز اور محترم جان کر یہاں ٹکا ہوا تھا، اس کے قدم بھی اُکھڑنے لگے۔ انھوں نے اپنے سامنے کی نسل کے مستقبل کو خطروں میں گھرا ہوا محسوس کیا جس کے نتیجے میں شہر کے شہر، قصبات اور بہت سارے گاؤں ایسے لوگوں سے خالی ہونے لگے جو کبھی رونقِ محفل ہوا کرتے تھے اور جنھیں دیکھ کر معاشرے میں تعینِ قدر کا معیار طے کیا جاتا تھا۔ جسیم بھائی بھی اپنے بہت سارے ہم خیال اور ہم عمر لوگوں کے ساتھ اُس وقت کے مشرقی پاکستان کو کوچ کر گئے اور وہاں چٹا گانگ، ڈھاکہ، کھلنا اور جیسور کی خاک چھانتے رہے مگر قدم کہیں جما نہیں پائے۔ آخر میں کراچی پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔

چالیس سالوں پر محیط جسیم بھائی کی خانہ بدوشی اور مشقتیں جھیلنے کی خبریں ملتی رہی تھیں۔ کراچی پہنچ کر وہ کسی کنارے لگ گئے تھے اور جواں سال بچوں کی مدد سے معاش کی صورت بہتر ہو گئی تھی۔ یہ بھی خبر ملی تھی کہ گردشِ پا نے ان کے تمام شعری ذوق ختم کر ڈالے تھے۔ اس کے باوجود میرے دل میں یہ دبی دبی خواہش تھی کہ وہ جسیم بھائی جنھیں میں نے اپنے بچپنے میں ایک آئیڈیل نوجوان کی شکل میں دیکھا تھا، کسی طور ایک بار پھر انھیں دیکھ لیتا اور ان کی زندگی کے سفر کا حال ان کی زبانی سُن لیتا۔

میری دیرینہ خواہش اس وقت پوری ہوئی جب ایک بار ہفتے عشرے کی فرصت میں، میں اپنے گاؤں پہنچا۔ کسی نماز کے بعد میں نے مسجد میں ایک

اجنبی ضعیف کو دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ جسیم بھائی ہیں اور مرض الموت میں مبتلا اپنی والدہ سے آخری ملاقات کے لئے کراچی سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے آنے کا نوٹس اس لئے بھی لیا جا رہا تھا کہ وہ تقریباً چار دہائیوں کے بعد اپنے وطن لَوٹے تھے۔ اس درمیان بچے جوان ہو کر بڑھاپے کی حد میں داخل ہو چکے تھے اور نہ جانے کتنے بوڑھے لقمہ اجل بن گئے تھے۔

میں بڑھ کر ان سے ملا اور انھیں اپنا نام بتایا۔ کچھ غور کرنے کے بعد مسکرائے اور کہنے لگے:

''یہ کیا بات ہے کہ یہاں کے سب بچے بوڑھے ہو گئے''

میں نے برجستہ کہا'' آپ بھی تو وہ نہ رہے جیسا میں نے دیکھا تھا۔''

وہ کچھ توقف کے بعد بولے:

'ہاں! وقت ہمارے درمیان سے اس قدر جلد نکل جائے گا، اس کا مجھے گمان نہیں تھا''

کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ بہت سارے پرت کھلے اور ہم دونوں کچھ کھونے اور کچھ پانے کا احساس لئے جدا ہوئے۔

چند روز بعد ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ کے ساتھ میں بھی قبرستان گیا۔ قبر تیار ہو چکی تھی۔ کچھ کام باقی رہ گیا تھا۔ اس درمیان میں نے محسوس کیا کہ جسیم بھائی اپنی والدہ کی آخری زیارت اور تدفین کے مرحلے میں شریک ہو کر کچھ مطمئن تھے۔ وہ چند لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر قبرستان کے تمام حصوں کو پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر کچھ بچوں والی خوشی کے انداز میں بولنے لگے...

''دیکھو! وہاں میرے دادا جان کی قبر ہے اور ان کے دائیں جانب میرے بڑے ابا اور رحیم چچا دفن ہیں۔ اور اس آم کے درخت کے نیچے میری پھوپھی آرام فرما ہیں۔'' پھر وہ بتانے لگے کہ اماں کی قبر یہاں پر اس لئے بنائی گئی کہ وہ ابا کے بالکل بغل میں دفن ہونا چاہتی تھیں۔

ہم لوگ ابھی ان کی باتوں پر غور کر ہی رہے تھے کہ وہ اچانک بول پڑے۔

''کاش! مجھے یہاں کی مٹی نصیب ہو جاتی''

پاس کھڑے ان کے بچپن کے ایک دوست نے کہا:

'اس میں مشکل کیا ہے، تمھارے سب بچے بارو زگار ہو گئے ہیں، تم اب وطن واپس آجاؤ''

''وہ لوگ مجھے آنے دیں تب نا!'' وہ حسرت بھری آواز میں بولے۔

تدفین کے بعد دعا پڑھ کر سب لوگ لوٹ آئے۔

دو روز بعد جسیم بھائی گھر میں لیٹے لیٹے اپنے چھوٹے بھائی حلیم سے کہنے لگے:

''دیکھو! گھر کے تمام پایوں میں نمک لگ گئے ہیں۔ اینٹیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔ میں سیمنٹ لا کر انھیں درست کر دیتا ہوں''

سب لوگوں کے روکنے کے باوجود وہ بازار گئے، وہاں سے سیمنٹ اور بالو لے کر آئے اور پھر خود ہی گارا تیار کر کے اندر سے جھڑی ہوئی اینٹوں میں مسالہ بھرنے لگے۔ بازار جانے اور آنے میں کچھ تھک گئے تھے، اس لئے انھوں نے حلیم کی بیوی سے کہا:

''دلہن! میرے لئے ایک کپ لال چائے تیار کر دو۔'' گرم چائے کی چسکی لیتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی کی بیوی سے کہنے لگے:

''یہ سب کمزور پائے بہت قیمتی ہیں''

''وہ کیسے؟'' دلہن نے سوال کر دیا۔

''وہ اس طرح کہ جب میں شام کو کھیل چکنے کے بعد دیر سے گھر لوٹتا تھا تو اماں کی پٹائی کے ڈر سے ان ہی پایوں کے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔'' اس پر گھر میں موجود بھی لوگ ہنس پڑے۔

چائے پی لینے کے چند منٹ بعد جسیم بھائی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر بمشکل قریب کے بستر پر لیٹ پائے۔ کسے پتہ تھا کہ یہ ان کا آخری لیٹنا ہے۔ دل کے آخری دورے کی ہچکی آئی اور روح پرواز کر گئی۔ جسیم بھائی کے انتقال کی خبر پا کر چہار جانب سے اپنے پرائے آنے لگے۔ صلاح ومشورے کے بعد حلیم اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقامی تھانہ میں موت کی خبر دینے گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ غیر ملکی مردے کو دفن کرنے کا اجازت نامہ ضلع ہیڈ کوارٹر سے ہی مل سکتا ہے۔ چنانچہ حلیم پھر شہر کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں سے رات بھر نہیں لوٹے۔ یہاں جنازہ تیار ہو چکا تھا۔ برف کی سل لگا دی گئی تھی۔ قبر بھی تیار ہو چکی تھی۔ صبح کے نو بجے پولس کی ایک جیپ دروازے پر آکر رکی جس سے کچھ پولس والوں کے ساتھ حلیم بھی اترے پولس والوں نے مرنے والے کی تصویریں لیں اور ان کا پاسپورٹ طلب کیا۔

پھر کچھ کاغذی کاروائی کر کے چلے گئے۔

سرگوشیوں میں یہ بات گشت کرنے لگی کہ موٹی رقم لے کر ہی مردے کو دفن کرنے کی اجازت دی گئی ہے ورنہ یہ کہا جا رہا تھا کہ لاش پاکستان جائے گی۔

خدا خدا کر کے ہم سب جسیم بھائی کے جنازے کو لے کر قبرستان پہنچے جہاں ان کی والدہ کی تازہ قبر کے بغل میں ان کی قبر تیار کی گئی تھی۔ جنازے کو قبر میں اُتارا گیا اور آخری دیدار کے لئے چہرے پر سے کفن کو ذرا سر کایا گیا۔ میں نے بغور دیکھا۔

جسیم بھائی کے روشن اور پُرسکون چہرے کو دیکھ کر ایسا لگا وہ داخل جنت ہو گئے ہیں۔

OO

رات کتھا

اشہر ہاشمی

رات کتھا۔1

اس نے ٹیبل لیمپ بجھایا، سگریٹ کا لمبا سا کش لیا، پیٹھ کرسی سے لگالی اور میز کے نیچے ٹانگیں پھیلا لیں جیسے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر اپنے مضمحل پٹھوں کو تھوڑا سا سکون دینا چاہتا ہو۔ پھر اچانک سمٹ کر اسی طرح بیٹھ گیا۔ لیمپ پھر جلا لیا۔ سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں ڈالی۔ فٹ کشن پر پاؤں جمائے اور پھر سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ صفحات سیاہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ پھر اس نے میز پر پڑی ہوئی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکالی۔ لائٹر سے سگریٹ کو سلگایا۔ ٹیبل لیمپ بجھایا، لمبا سا کش لیا، پیٹھ کرسی سے لگالی اور میز کے نیچے ٹانگیں پھیلا لیں جیسے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر مضمحل پٹھوں کو تھوڑا سا سکون دینا چاہتا ہو۔ پھر اچانک سمٹ کر اسی طرح بیٹھ گیا، ٹیبل لیمپ پھر جلا لیا۔ سگریٹ بجھا کر ایش ٹرے میں ڈالی۔ فٹ کشن پر پاؤں جمائے اور پھر سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ صفحات سیاہ ہوتے گئے۔ یہاں تک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ملگجے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا مضافات شہر کا منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کچھ دیر کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ کثیر منزلہ عمارتوں کی قطاریں، ان کے پیچھے جھانکتے ہوئے پیڑ پودے، جسم کو چھو کر لطف کا احساس بھر دینے والی ہوا کے نرم جھونکے، ندی اور ندی کے پار بسا ہوا شہر، بجلی گھر کی چمنیاں، اسٹیڈیم، سکریٹریٹ، ٹاور۔ وہ کھڑکی سے لگا کچھ دیر کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ باہر اور اندر میں زیادہ فرق نہ تھا، لیکن تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ سناٹا تھا۔ گھٹن تھی۔ جکڑن تھی۔ باہر ملگجا ہی سہی اجالا تھا۔ آواز بھی، کھلا پن تھا، ہوا تھی۔

کھڑکی کے کھلنے سے اندر اور باہر کے ماحول میں تھوڑی بہت مطابقت پیدا ہونے لگی۔ باہر کا ملگجا اجالا کھڑکی سے اندر پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے اندھیرے کو بہار کر ایک طرف کر رہا تھا۔ ہوا کی سرسراہٹ اندر تک آواز کا لمس لے کر آ رہی تھی۔ جھونکے اپنے ساتھ ایک فرحت بخش احساس لے کر داخل ہو رہے تھے۔

اس نے ایک لمبی سانس لی جیسے اس ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتا ہو مگر پھر اچانک کھڑکی سے ہٹ گیا۔ میز پر آیا۔ لیمپ جلایا جو صفحات لکھ لکھ کر سیاہ کیے تھے انہیں پھاڑ کر میز کے نیچے پڑی ردی کی ٹوکری میں ڈالا۔ ٹوکری میں پھٹے ہوئے کاغذوں کا انبار اور بڑھ گیا۔ فٹ کشن پر پاؤں جمائے اور پھر سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔ صفحات سیاہ ہوتے گئے!

رات کتھا۔2

اس نے خلاف معمول چھوٹا پیگ منگوانے کی بجائے لارج پیگ منگوا لیا۔ یہ اس کا تیسرا لارج پیگ تھا۔ کم پانی اور زیادہ سوڈا گلاس میں ڈال کر اس نے برف کی کئی کیوبس اس میں ڈال دیں۔ گلاس چھلک اٹھا۔ چھلکتے ہوئے گلاس کو اٹھا کر ہونٹوں تک لانے کی بجائے اس نے اپنا سر نیچا کیا اور ہونٹ گلاس سے لگا کر چسکی لی۔ اب گلاس چھلکنے کے مرحلے سے نکل آیا مگر لبالب ضرور تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں سوڈا اور پانی میں ملی ہوئی پوری وسکی غٹک گیا۔

"سر بل لاؤں"

"ایک اور لارج پیگ"

یہ اس کا چوتھا لارج پیگ تھا۔ کم پانی اور زیادہ سوڈا گلاس میں ڈال کر اس نے برف کی کئی کیوبس بھی اس میں ڈال دیں۔ گلاس چھلک اٹھا۔ سر نیچا کر کے ہونٹ گلاس سے لگا کر چسکی لی۔ پھر گلاس اٹھایا اور ایک سانس میں پوری وسکی غٹک گیا۔

"سر"

"ایک اور لارج پیگ"

یہ پانچواں لارج پیگ تھا۔ گلاس میں کم پانی اور زیادہ سوڈا ڈالنے کے بعد اس نے برف کی کیوبس بھی ڈالیں۔ گلاس چھلکا۔ ہونٹ گلاس سے لگا کر چسکی لی پھر گلاس اٹھایا اور وہسکی غٹک گیا۔

"سر"

"بل لے آؤ"

بیرا بل لایا۔ اس نے پرس کھولا۔ تین بڑے نوٹ ٹرے میں رکھے۔ اور اٹھ گیا۔ آٹو لے کر گھر کی جانب چلا۔ راستہ میں ٹھیکے سے وہسکی کی ایک بوتل خریدی۔ سوڈے کی ایک بوتل بھی لی۔ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت اسے صرف اس بات کی جلدی تھی کہ کسی طرح اپنی میز تک پہنچ جائے۔

دروازے کا تالا کھولا۔ اندر آیا۔ تالا فریج پر رکھا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ کچن سے گہرا لمبا گلاس نکالا۔ فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل لی۔ اندر اپنے کمرے میں پہنچ کر میز پر وہسکی، سوڈا، پانی کی بوتل اور گلاس رکھ کر اس نے ٹیوب کا سوئچ آن کر دیا۔

کرسی پر بیٹھتے وقت اس کی زبان سے نکلا "آ۔ہا"

بوتل سے وہسکی گلاس میں انڈیلی۔ سوڈے کی دھار ماری۔ تھوڑا پانی ملایا اور گلاس ہونٹوں تک لے جا کر لمبی سپ لگائی۔

ہونٹوں سے گلاس ہٹا کر میز پر رکھا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ایک لمبی سپ لی۔ پھر بیٹھ گیا۔ پھر ایک سپ لی، گلاس خالی۔ اپنے اندازے سے اس نے گلاس آہستہ سے میز پر رکھا مگر گلاس کا پیندا ٹیبل کی ٹاپ سے ٹکرایا۔ کھٹ کی آواز ہوئی۔ وہ مسکرا اٹھا۔

پھر گلاس میں وہسکی انڈیلی، سوڈا ملایا، تھوڑا سا پانی ملایا اور لمبی سپ لی۔ ہونٹوں سے گلاس ہٹا کر میز پر رکھا۔ بیٹھا رہا۔ پھر ایک سپ لی۔ پھر بیٹھ گیا۔ پھر سپ لی۔ پھر بیٹھا رہا۔ پھر سپ لی۔ گلاس خالی۔ گلاس میز پر رکھا مگر اس بار گلاس زیادہ زور سے ٹیبل ٹاپ سے ٹکرایا۔ زیادہ زور کی آواز ہوئی۔ وہ مسکرا اٹھا۔

پھر گلاس میں وہسکی انڈیلی، سوڈا ملا، تھوڑا سا پانی ملایا اور ایک سانس میں گلاس خالی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر ٹیبل ٹاپ سے ٹکرایا۔ وہسکی بہہ گئی۔ گلاس ٹیبل سے نیچے فرش پر گرا۔ چھناکا ہوا۔ وہ مسکرایا نہیں کیوں کہ میز پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ دونوں ہاتھ نیچے جھول رہے تھے۔ OO

پناہ گاہ

سعید ریاض

ایک بار پھر لوگوں نے ایک بوڑھے برگد کو پناہ گاہ بنالیا تھا۔ درخت بوڑھا ضرور تھا مگر اس کا سایہ بہت گھنا تھا۔ اس کی شاخیں بھی بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں، جنھوں نے زمین کے ایک بہت بڑے علاقہ کا احاطہ کرلیا تھا۔ لوگوں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ یہ بوڑھا درخت ضرور انھیں اپنے سائے میں محفوظ کرے گا، کسی مہاپرش کی پھیلی ہوئی باہوں کی طرح۔ اس درخت کی شاخیں انھیں اپنی باہوں میں سمیٹ کر حالات کے ہر طوفان سے محفوظ رکھیں گی...

یہ سب کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ ان واقعات سے گذر چکے تھے جب جب بھی اس زمین پر... درخت کے بے رحم عفریت نے اپنے خوف ناک سائے پھیلائے اور انسانوں کی گردنوں پر اس کی گرفت مضبوط ہونے لگی تو لوگوں نے کسی مضبوط تحفظ گاہ کی تلاش کی ۔ جب بھی حالات کی تیز دھوپ نے انھیں جلایا تو انھوں نے کسی گھنے سایہ دار درخت کو اپنی پناہ گاہ بنایا۔ مگر اکثر انھیں مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ کئی بار ایسا ہوا۔ جب بھی حالات کے سورج نے انسانی جسموں کو جھلسایا لوگ دھوپ کی شدت سے گھبرا اٹھے تو انھوں نے گھنے سایہ دار درختوں ہی کے سائے میں سکونت تلاش کی۔ لیکن ان کی یہ تلاش ہمیشہ ناکامیوں کے صحرا میں بھٹکتی رہی۔ کیوں کہ انھوں نے جس درخت کو پناہ گاہ سمجھا۔ انھیں دھوکہ ہوا۔ کیوں کہ دور سے گھنے نظر آنے والے درخت کے نیچے آکر انھیں احساس ہوا کہ اس درخت کی بکھری بکھری شاخوں کے روزن سے آنے والی دھوپ ان کے جسموں کو جلانے کے لئے کم نہیں ہے۔ پھر بھی وہ دھوپ کی شدت اور تیزی سے وقتی طور پر محفوظ رہے، لیکن.... یہ درخت تناور ہونے کے باوجود دیرپا نہ تھا۔ اس کی جڑیں ایسی نرم مٹی میں پیوست تھیں جو ہلکی سی آندھی میں اکھڑ گئیں۔

بہت پہلے جب وہ ایک بڑی آندھی اور خطرناک طوفان سے گذر کر کھلی فضا میں آئے تھے تب انھوں نے ایک ایسے درخت کا انتخاب کیا تھا جو دور سے آنے والے ہر خطرے اور طوفان، ہر آندھی اور تیز دھوپ میں انھیں اپنے نرم سائے میں سمیٹے رہا۔ مگر جب وہ تمام خطرات سے نکل کر آزاد ماحول میں آئے تو... انھیں احساس ہوا کہ وہ کتنے ہی خطروں سے آزاد ہو گئے ہوں، کتنے ہی طوفانوں سے محفوظ ہو گئے ہوں، مگر حالات کی تیز دھوپ سے نہیں بچ سکتے۔ کیوں کہ جب تک وقت کا سورج پگھلتا رہے گا دھوپ برقرار رہے گی۔ دھوپ جو ہر آنے والے لمحوں میں کسی بہروپیے کی طرح رنگ بدلتی رہے گی۔ کبھی سرد ہواؤں میں اپنی کرنوں سے انسانی جسموں کو راحت بخشے گی، کبھی ان ہی کرنوں سے جسموں کو جھلسائے گی۔ اس لئے ایک گھنے سایہ دار درخت کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے پیش نظر انھوں نے اپنے اس دیرینہ ہمدرد کو اپنی پناہ گاہ بنالیا تھا۔ لیکن ایک دن موت کی تیز آندھی آئی اور وہ سایہ دار درخت جڑوں سے اکھڑ گیا۔ لوگوں نے اس کی جدائی کا بہت دکھ کیا۔ اس کی شاخوں کو جلا کو اس کی راکھ ساری زمین پر بکھیر دی تا کہ اس کی مہربانیوں کا حق ادا کرسکیں کہ جس زمین کو اس نے اپنے سائے میں رکھا، اس کی راکھ اسی زمین پر بچھا دی تا کہ اس کے بعد زمین سے اس کا تعلق ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے۔

اس درخت کی موت نے زمین کے باسیوں کو اور سخت حالات سے دوچار کردیا، تو انھوں نے پھر ایک سایہ دار درخت کی تلاش کرلی۔ مگر یہ سایہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوسکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کبھی کوئی سایہ دار درخت تیز طوفان میں جڑوں سے اکھڑ گیا، کسی کو جڑوں سے کاٹ دیا گیا اور کوئی کسی تیز دھماکے سے گر گیا۔

لیکن اب ان واقعات نے لوگوں کو بے شمار سوالوں کے دائرے میں قید کردیا تھا۔ ہر ذہن میں بے شمار سوال گردش کر رہے تھے۔ جن میں کچھ سوال ان کے ذہنوں میں چبھتے رہتے تھے۔ انھوں نے ان سوالوں کے جواب بہت تلاش کیے مگر ان کی تلاش مایوسی اور ناکامی کی شاہراہوں پر بھٹکتی رہی۔ ہر سوال ان کی ناکامی پر قہقہے لگاتا۔ کئی سوال ہر لمحہ ان کی فکر کو چھیدتے رہتے۔

کیا بزرگوں کے تجربات غلط تھے؟ کیا تاریخ بھی جھوٹ بولتی ہے؟ کیا انھوں نے اسلاف سے جو سنا تھا وہ سب غلط تھا... یا فریب؟ OO

سونامی کو آنے دو

اختر آزاد

میں نے جب تک سمندری قبر گاہ میں اپنے اس خدا کو اتار کر لہروں سے ڈھک نہیں دیا، اس وقت تک سمندر نے مجھے قبول نہیں کیا۔

وہ یقیناً میرا خدا تھا۔ اس نے مفلسی کی غلاظت سے نکال کر میرے سر پر امیری کا تاج رکھا تھا اور وہ سب کچھ دیا تھا جس کی تمنا میں نے نہیں کی تھی۔ لیکن اس روز جب اچانک سمندری لہریں پاگل ہو اٹھی تھیں اور میں اپنے خدا کو بچا سکتا تھا، نہ جانے کیا ہو گیا کہ میں لہروں کی اونچائیوں کو کیمرے میں قید کرنے اور اس کے استقبال میں اتنا محو ہو گیا کہ میرا خدا مجھ سے جدا ہو گیا۔

نام اس کا کیا تھا کسی کو نہیں معلوم۔ لیکن سب اسے مسٹر کلین کے نام سے جانتے تھے۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ گوری رنگت، سفید سلجھے ہوئے بال، پُرکشش آنکھیں اور باتوں میں اس کی بلا کا جادو تھا۔ دُھلے دُھلائے سفید لباس اور سفید جوتے اس کی شخصیت میں چاند ستارے ٹانکنے کے لئے کافی تھے۔ کوئی بھی ایک نظر دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ غریبوں کا مسیحا اور امیروں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ ہر کسی کو خوش رکھنے کا ہنر وہ جانتا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ ہر کسی کے کام آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس پر برا وقت آیا، ہر کسی نے اسے کلین چٹ دے دی۔ اس طرح روز بہ روز اس کی ترقی کا گراف اوپر اٹھتا رہا اور وہ مسٹر سے مسٹر کلین بن گیا۔

پیدا تو وہ جھونپڑ پٹی میں ہوا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ساری جھونپڑی پٹی اس کی ہو گئی تھی۔ پہلے ایم ایل اے بنا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں منسٹر ہو گیا۔ جھونپڑی پٹی سے ایم ایل اے کے سفر کے دوران وہ اپنا مٹ میلا لباس تبدیل کر کے دودھ میں ایسا دُھلا کہ سفید لباس اس کے وجود کا حصہ بن گیا۔ پھر کیا تھا؟ کرسیوں پر بیٹھے سفید پوشوں نے اس کی اس قابلیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے عزت کے سارے ستارے اس کے کاندھے پر ایک ایک کر کے ٹانک دیئے۔

مجھے وہ خود جھونپڑ پٹی سے اٹھا کر لایا تھا۔ دوستی کا فرض نبھانا اسے خوب آتا تھا۔ میرا گھر گھر گھومنا، مانگنا اور بچا کچھا کھانا کھانا اس کو پسند نہ تھا۔ اس لئے ایک دن اس نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ مانگنے کھانے والا ایک خوبصورت کار کا ڈرائیور بن گیا۔ یہ ایم ایل اے بننے سے پہلے کی بات ہے۔ ایم ایل اے کے بعد جیسے جیسے اس کا قد اونچا ہوتا گیا۔ میں بھی ترقی پر ترقی کرتا گیا۔ منسٹر بنتے ہی اس کے ذاتی ہیلی کوپٹر کا پائلٹ بن گیا۔

وہ تھا تو انگوٹھا چھاپ۔ لیکن ایم ایل اے بننے کی چاہت میں اس نے کئی رم کاغذ برباد کئے۔ دستخط کرنا کیا سیکھا کہ شہر کے تمام کالجوں کی سربراہی اس کے ہاتھوں میں چلی آئی۔ پھر کالج کے تمام فیصلے اس کے دفتر میں ہونے لگے۔ اسٹوڈنٹس کے داخلے سے لے کر لکچرز، ریڈر اور پروفیسر کے سلیکشن میں بھی اس کا 'اہم رول' ہوا کرتا۔ جس کی سفارش وہ کر دیتا اس کی نیا پار ہو جاتی، اور جس کی نیا وہ پار کرتا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی گڈ بک میں آ جاتا اور پھر اس سے جب چاہتا من مانی کرواتا۔ انتظامیہ اور یونین لیڈروں کو کبھی اپنی طاقت، کبھی اپنے اثر رسوخ اور کبھی تحفے دے کر اپنی جیب میں رکھتا۔ ایک بار کالج کے ایک پرنسپل نے اس کے خلاف آواز اٹھانے کی غلطی کی اور مسٹر کلین نے ہمیشہ کے لئے اسے ہی اٹھا دیا۔ شواہد کی موجودگی میں وہ پولس کی گرفت سے آزاد رہا۔ اس کی اس نمایاں کارکردگی کو دیکھتے ہوئے چیف منسٹر نے اسے وزیرِ تعلیم بنا دیا۔

پھر تعلیمی سند اس طرح بانٹی جانے لگیں جیسے سڑکوں پہ گپت روگ کے 'ڈاکٹر سے ملئے' کا پمفلٹ بانٹا جاتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کے سارے عزیز و اقارب ڈگریاں پا کر نوکری کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔ یہ انگوٹھا چھاپ بھی خوش تھا کہ اسے بھی میٹرک سے بی اے تک سارے

سرٹیفکیٹ بغیر امتحان میں بیٹھے ہی مل گئے۔

ایک بار جعلی ڈگریوں کے عوض بھاری رقم گھوس میں لیتے ہوئے وہ ایک خاتون صحافی کے ہاتھوں رنگے ہاتھ پکڑا گیا تھا۔ اُس گدھ کی نظر کا کیا کہنا۔ کیمرے پر پڑ ہی گئی۔ اس نے اسی وقت خاتون صحافی کو ننگا کر کے اس کے ہی کیمرے سے اس کی تصویر اتار لی اور انٹرنیٹ پر ڈال کر اسی رات اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر کافی ہنگامہ ہوا۔ لیکن معاملہ خودکشی کا ٹھہرا۔ اس لئے کوئی اس کا بال بھی بانکا نہیں کر سکا۔ مخالف پارٹیوں کے دباؤ میں آ کر چیف منسٹر نے بس اتنا کہا کہ اسے وزیر تعلیم سے برطرف کر کے وزیر صحت بنا دیا۔

وزیر صحت بنتے ہی نقلی دوا سازوں کی چاندی ہوگئی۔ تھوک کے بھاؤ میں جعلی لائسنس بننے لگے۔ نقلی ڈاکٹر تو اس نے پہلے ہی پیدا کر دیے تھے۔ لیکن نقلی مریض کہاں سے پیدا کرتے۔ مریض تو اصلی تھے۔ اس لئے بے موقع و محل چھوٹی چھوٹی بیماریوں سے مرتے رہے۔ موت کا یہ سلسلہ سالہا سال جاری رہا۔ جب خود بیمار پڑتے تو موت کا خوف اسے بھی ستانے لگتا۔ اس وقت مجھے تاکید کرتے کہ اس ڈاکٹر کو بلا کر مت لانا اور اس کمپنی کی دوا مت خریدنا جسے سند اس نے دی ہے۔

ایم ایل اے سے منسٹر بننے تک جو بھی شعبہ اسے ملا، اس شعبے میں چار چاند لگانے کے لئے اس نے اس سے ملحق ایک اور شعبہ 'عشق' کا اپنے دفتر میں کھول رکھا تھا۔ ہر رات پلنگ کی چادر کی طرح اسے لڑکی بدلنے کی عادت تھی۔ گھر اور دفتر کی تو بات چھوڑیے۔ کار کی پچھلی سیٹ کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ یقین نہ آئے تو کار کے بلیک شیشے جو چشم دید گواہ ہیں ان سے پوچھ لیجیے۔

لیکن ایک روز غضب ہوگیا۔ جب اسٹیٹ لیول کے بیوٹی کانٹیسٹ میں خطاب جیتنے والی کو تاج پہنانے کے لئے انتظامیہ نے مسٹر کلین کو مدعو کیا گیا۔ پروگرام کے بعد کھانے کا دور چلا۔ پارٹی ختم ہوتے ہی مسٹر کلین بیوٹی نمبرون کا خطاب جیتنے والی دوشیزہ کے بیڈ روم میں مبارکباد دینے پہنچا۔ عین اس وقت لوڈ شیڈنگ ہوگیا۔ اس لوڈ شیڈنگ کے نتیجے میں جب وہ ماں بن گئی تب بغیر پوچھے اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے مسٹر کلین نے مجھ سے کروا دی۔ رات گواہ ہے کہ اس نے کبھی اسے میرے کمرے میں رہنے نہیں دیا۔ ضرورت رہی تو استعمال کیا۔ نہیں تو اپنے بیڈ کے برابر میرا بستر بچھوا دیا۔ اکیلے نہیں چھوڑا کہ جوٹھن ہو جائے گی۔

بیوٹی نمبرون نے ایک بچی کو جنم دیا اور میں باپ بن گیا۔ بچی بڑی ہونے لگی۔ وہ مجھے اپنا باپ سمجھنے لگی۔ اب میرے پاس ایک بنگلہ بھی تھا۔ جو مسٹر کلین کا ہی دیا ہوا تھا۔ یہ بنگلہ ٹھیک اس کے بنگلے کے سامنے تھا۔ وہ اکثر آتا جاتا وہاں مس بیوٹی کے ہاتھوں چائے کی چسکیاں لیا کرتا۔ مس بیوٹی بھی بغیر کسی روک ٹوک کے مسٹر کلین کے پاس جایا کرتی۔ کبھی کبھی اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے جاتی۔ مسٹر کلین ہمیشہ اس کا گال چھوتا۔ پیار کرتا۔ اپنی گود میں بٹھاتا۔ چپی لیتا اور ڈھیر ساری مٹھائیاں دیا کرتا۔ ماں، باپ اور بیٹی کے اس پیار کو دیکھ کر عش عش کر اٹھتی۔ لیکن بیٹی یہ نہیں جانتی تھی کی مسٹر کلین اس کا باپ ہے۔ وہ تو باپ اسے جانتی تھی جو مسٹر کلین کے ذاتی ہیلی کوپٹر کا پائلٹ تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اس کا باپ اسے کہیں گھمانے نہیں لے جاتا۔ لیکن مسٹر کلین انکل ہوتے ہوئے بھی فرصت کے اوقات میں اسے سیر و تفریح کے لئے لے جایا کرتے ہیں۔ ایک دن اس نے اپنی ماں سے کہا۔

"ممی جانتی ہیں کلین انکل مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے آدمی کے احسانوں کا بدلہ کیسے چکاؤں؟"

وہ مس بیوٹی کی بیوٹی تھی۔ اس کی بیوٹی تب نکھر کر سامنے آئی جب جوانی کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی اس کی جسمانی ساخت میں ظاہری تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ مس بیوٹی اپنی بیٹی کی خوب صورتی کو دیکھ کر اسے ہیروئن بنانے کے سپنے دیکھنے لگی۔ لیکن مسٹر کلین اس کے حق میں نہیں تھا۔ اسکول کی دہلیز پھلانگ کر وہ کالج کیا گئی کالج کے لڑکے اس پر مر مٹے۔ مسٹر کلین نے غنڈے بھجوا کر لڑکوں کی دھلائی کروا دی۔ پھر اس کے بعد وہ اسے کالج چھوڑنے اور لانے خود جانے لگا۔ اس وقت وہ ڈرائیور کا استعمال نہیں کرتا۔ اس کی ضرورت کی تمام خریداری وہ خود کرتا۔ بیوٹی پارلر بھی ساتھ لے جاتا۔ یہاں تک کہ دورے میں بھی اب وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے لگا تھا۔

ایک بار بغیر سرکاری دورے کے ایک ہفتہ کے لئے جب وہ باہر گیا تو اسے بھی ساتھ لے لیا۔ اس دورے میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ہیلی کوپٹر سے اترنے کے بعد وہ سیدھے اپنی بیٹی کو لے کر ہوٹل چلا گیا اور پھر یہ پہلی بار ہوا کہ میرے ٹھہرنے کا انتظام دوسرے ہوٹل میں کیا گیا۔

مس بیوٹی خوش تھی کہ مسٹر کلین نے بھلے ہی اس سے شادی نہ کی ہو، رکھیل کی طرح زندگی بھر رکھا ہو۔ لیکن بیٹی کے ساتھ ایک باپ کا فرض بخوبی نبھا رہا ہے۔ بیٹی بھی خوش تھی کہ مسٹر کلین اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ لیکن ایک دن مس بیوٹی جب اچانک مسٹر کلین کے خواب گاہ

میں پہنچی تو اپنی بیٹی کے سینے پر مسٹر کلین کے الجھے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔

"کمینے! کیا کر رہے ہو تم...؟"

"اب دیکھ ہی لی ہو تو سن لو میں اس سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔ زبان کھولی تو بہت برا ہوگا۔"

ٹرٹر...ٹر...ٹر

تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ اس وقت گولی کی آواز سن کر میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ مسٹر کلین ریوالور کی نوک میری طرف کرتے ہوئے چیخا۔

"آج سے یہ میری بیوی ہے۔ کوئی کچھ نہیں بول سکتا۔ سمجھے؟"

اور میں سمجھ گیا۔ سمجھ تو میں پہلے بھی رہا تھا۔ لیکن موت کو دعوت کون دیتا؟ اپنی کاغذی بیوی کو جس کے سینے میں تین گولیاں لگی تھیں، مسٹر کلین کے حکم پر ایک بورے میں بھر کر کار کی ڈکی میں رکھا اور دور نہر میں پھینک آیا۔

بیٹی، ماں کی موت کی چشم دید گواہ تھی۔

ایک شوہر اپنی بیوی کے قاتل کو جانتا تھا۔

لیکن وہ بیٹی جو ماں کو کھو چکی تھی، مسٹر کلین کے ڈر سے اپنے باپ کو یعنی مجھے کھونا نہیں چاہتی تھی اور ایک شوہر جو کبھی اپنی بیوی کا شوہر تھا ہی نہیں، قاتل سے بدلہ کیا لیتا۔ لیکن ایک بیٹی کی یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی ماں کی موت کے بعد اس کا باپ مسٹر کلین کے ساتھ اب بھی پہلے کی طرح کیسے رہ رہا ہے۔

ایک دن مسٹر کلین جب تھک ہار کر اپنے خواب گاہ میں آرام فرما رہا تھا تب چپکے سے وہ میرے پاس آگئی اور رونے لگی۔

"ڈیڈ مجھے اس نرک سے نکال لو۔ میں صرف نام کی اس کی بیوی ہوں۔ ہر رات نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے کمرے میں ہوتی ہیں۔ میرا بس چلے تو اسے جان سے مار ڈالوں۔ لیکن مجھے اپنی نہیں۔ تمہاری فکر ہے ڈیڈ۔ ڈیڈ اس سے ہوشیار رہنا، وہ حرامی کس کا نہیں ہے۔"

لیکن میں اسے کیا بتاتا کہ میں ہی ہر روز دلالوں سے مل کر لڑکیاں اس تک پہنچاتا ہوں۔ اور ایک باپ جب خودگرا ایک بن جائے تو پھر صرف نام کا ایک باپ اس نرک سے کیسے نکال سکتا ہے؟

ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر غیر سرکاری دورے پر مسٹر کلین کو جانا ہوا۔ اسی دورے میں اس کے ساتھ ایک ٹین ایجر لڑکی تھی جو اس کی بیٹی سے بھی بہت چھوٹی تھی۔

ہیلی کاپٹر سمندر کے کنارے ایک عالی شان ہوٹل کے سامنے بنے ہیلی پیڈ پر اترا۔ اس رات مجھے سامنے والے ہوٹل میں ٹھہرنا نہیں پڑا۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی کمرے میں رہنا پڑا۔ میں اس وقت اس کی اس ادا پر حیرت زدہ تھا کہ جب لڑکی اس کے ساتھ ہے تو پھر اسی کمرے میں مجھے ٹھہرانے کا جواز کیا ہے؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا اس نے میرے ہاتھ میں ویڈیو کیمرہ تھما دیا۔

دوسرے روز طے شدہ پروگرام کے تحت سمندری کناروں پر شوٹنگ ہونی تھی۔ پائلٹ کے بعد فوٹوگرافر کے طور پر میرا پرموشن ہوگا یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وقت پر ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ دونوں ایک سے ایک پوز بناتے رہے اور میں زاویہ تبدیل کرتا ہوا کیمرے کا لینس گھٹاتا بڑھاتا رہا کہ اچانک سمندری سائرن کی زوردار آواز فضا میں گونجنے لگی۔

میں نے دیکھا کہ سائرن کی آواز پر ساحلی مچھوارے سب کچھ چھوڑ کر زمینی سطح کی طرف بھاگنے لگے۔ سیر و تفریح کے لئے آئے لوگ بھی مچھواروں کے پیچھے پیچھے سمندر کے مخالف سمت دوڑنے لگے۔ اس دوران کچھ اونچے اونچے پیڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ پھر یکایک لہروں کی ایک زوردار آواز ابھری اور تیز ہوتی چلی گئی۔ تب کہیں جا کر یہ پتہ چلا کہ سمندری لہریں پاگل ہوا ٹھی ہیں اور ہزاروں کلومیٹر کی رفتار سے ساحل سے سر ٹکرانے آرہی ہیں۔ تب ہم سب بھی بھاگنے لگے۔ ہوٹل کی جانب چاروں طرف ایک عجیب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لہریں بڑھتی جارہی تھیں۔ لیکن یہ ہم لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ اس سے پہلے طوفانی لہریں ہیلی پیڈ تک پہنچتیں ہم تینوں ہیلی کاپٹر پر سوار ہوگئے تھے۔

جب میں نے ہیلی کاپٹر اسٹارٹ کیا اس وقت لہریں پہیے کو چوم رہی تھی اور اب بس ہیلی کاپٹر زمین چھوڑنے ہی والا تھا کہ مسٹر کلین ایک بہت اونچی لہروں کو اپنی جانب آتے دیکھ کر پاگلوں کی طرح چلایا۔

"حرام خور... جلدی اڑان بھرو... جلدی کرو... جلدی..."

جب وہ پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا اس وقت اونچی سر پٹکتی ضدی لہریں بالکل نزدیک آگئی تھیں۔ وہ خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ ٹین ایجر لڑکی کے ساتھ ننگا چپکا ہوا تھا۔

اس پوز میں نہ جانے کیوں وہ آج مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا اسٹارٹنگ بٹن آف کیا اور ایک یادگار آخری تصویر اتارنے کے لئے فوراً کیمرہ سنبھال لیا۔

OO

قسم

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

صبح کے اجالے ابھی زمین پر اپنے اجلے پاؤں نہیں رکھ پائے تھے۔ پورے ماحول پر فی الحال اندھیروں کا ہی قبضہ تھا۔ لندن کی ایک پرانی کالونی کے فلیٹ کے ڈرائینگ روم میں بوڑھے ڈاکٹر عثمان اور ان کی اہلیہ زبیدہ نماز سے فارغ ہو کر دیوار سے پشت لگائے کھڑے تھے اور تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔ ان دونوں کے بالکل سامنے صوفے پر ایک یوروپی نوجوان ہاتھ میں پستول لئے نیم دراز تھا۔ نوجوان کے سنہرے بال کافی الجھے ہوئے تھے۔ وہ قمیص کے بغیر ہلکی نیلی جینز پہنے ہوئے تھا۔ اس کے بائیں بازو پر بندھی ہوئی پٹی سے لگ رہا تھا کہ وہ کافی زخمی ہے۔ نوجوان ان دونوں کو برابر گھورے جا رہا تھا۔ عثمان اس سے اس کی زبان سے مخاطب ہوئے۔

''ہم دونوں نے!... صبح کی نماز پڑھ لی، اپنے خدا کو یاد کر لیا۔ وعدے کے مطابق ہم اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتے ہیں۔ اب تم ہمیں کسی بھی لمحہ قتل کر سکتے ہو! اور ہاں! تمہارے پہلو میں ایک پیکٹ رکھا ہے یہ ہمارے بیٹے انجم کی شرٹ ہے۔ ہمیں قتل کرنے کے بعد باہر نکلنے میں کام آئے گی۔''

نوجوان نے سینٹرل ٹیبل پر پھیلائی ہوئی ٹانگوں کو سمیٹا، وہاں پڑی سگریٹ کی ڈبیہ اور لائٹر اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور ایک دو لمبے کش کھینچ کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ دفعتاً زبیدہ نے آنکھیں کھولیں اور بولی۔ ''ایک گزارش ہے تم سے...!''

نوجوان نے پستول والا ہاتھ جھٹکا کر اسے گھورا۔

وہ کہہ رہی تھی ''جس خدا کو بھی تم مانتے ہو تمہیں اس کا واسطہ، پہلے مجھے قتل کرو گے۔ میں بیوگی کے چند لمحے بھی جینا نہیں چاہتی! پلیز پہلے مجھے گولی مار دو۔ میں اپنے شوہر کی موت نہیں دیکھ پاؤں گی... پلیز مجھے گولی مار دو... پلیز...''

فلیٹ میں صرف عثمان اور زبیدہ رہتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا انجم اپنی بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ لندن سے کافی دور برمنگھم میں مقیم تھا۔ وہ ہر سنیچر شام ڈھلے آ جاتے تھے، ان کے ساتھ مل کر چھٹی مناتے، کبھی کبھی سب مل کر پکنک پر بھی چلے جاتے تھے۔ پیر کی صبح بچے دونوں کو ایک ہفتہ تنہا رہنے کے لئے چھوڑ جاتے۔ عثمان ریٹائیرڈ ڈاکٹر تھے۔ میاں بیوی کی اولڈ ایج پینشن سرکار سے اتنی مل جاتی تھی کہ ان کی اپنی ضرورتیں اس کے سامنے بہت کم تھیں۔ دو سال ہوئے حج بھی کر آئے تھے۔ اب عبادت کرنا اور ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرنا ہی ان کا معمول تھا۔

عشا سے فارغ ہو کر زبیدہ نے ڈرائینگ روم میں جھانکا۔ عثمان بی بی سی لندن کی خبریں سن رہے تھے۔ وہ تھوڑا اونچی آواز میں بولی۔ ''سنتے ہیں، آپ بھی نماز پڑھ لیں دس بج گئے۔ میں کچن میں جا رہی ہوں۔ کچھ برتن پڑے ہیں دھونے کو۔''

عثمان سفید کرتے پاجامے میں ملبوس، سر پر جالی دار ٹوپی، بڑی بڑی ذہین آنکھیں، سفید داڑھی، سنہری چشمہ پہنے بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلے ''کم بخت ایسی حرکتیں کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ قوم پر کیا گزرے گی۔'' وہ بیڈ روم میں چلے گئے جہاں دونوں نے ایک کونا نماز پڑھنے کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ گھر سے مسجد بہت دور واقع تھی اسی لئے عثمان بھی نماز گھر پر ہی ادا کرتے تھے۔ کچن میں زبیدہ کے برتن دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عثمان نماز میں مشغول ہو گئے۔ ماحول ایک دم پرسکون تھا۔ کوئی دس منٹ بعد کال بیل بجی، زبیدہ چونک کر بڑبڑائی ''اللہ خیر کرے... اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ آج بدھ ہے، بچے تو سنیچر کو آتے ہیں۔'' وہ دھلے ہاتھ چھوٹے تولیہ سے خشک کرتی ہوئی کچن سے نکلی ''ضرور ہماری پڑوسن مسز فلپ ہوگی!'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی اس نے کنڈی کھولی ہی تھی کہ آنے والے نے دروازے پر ایک زوردار لات جمادی زبیدہ ہلکی سی چیخ مار کر لڑکھڑاتی ہوئی منھ کے بل گر پڑی۔ آنے والے نے اندر آ کر بڑی پھرتی سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ یوروپین نوجوان تھا۔ اس کے سنہری بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور بایاں بازو خون سے تر تھا۔ چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری

صاف نظر آرہی تھی۔ زبیدہ فرش پر پڑی کراہ رہی تھی۔ وہ اپنی زبان میں چیخا۔

"تم... مسلمان دہشت گرد... قاتل... اور ظالم ہو...!"

زبیدہ کے سفید بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ماتھا پکڑے کراہ رہی تھی۔

نوجوان پھر چلایا۔ "گھر میں اور کون ہے؟"

اس نے اپنے چہرے سے بال ہٹائے اور بڑی مشکل سے بیٹھتے ہوئے، کانپتی آواز میں بولی "میں اور میرے شوہر۔" وہ دائیں ہاتھ میں پستول لے کر نفرت سے ناک سکیڑ کر بولا "تمہیں مرنا ہے..."

زبیدہ نے آنکھیں موند لیں اور دل ہی دل میں آیت کریمہ پڑھنے لگی۔ نوجوان نے ٹریگر پر دباؤ بڑھایا ہی تھا کہ سامنے سے عثمان تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے آگئے۔ کسی خوف کا مظاہرہ کئے بغیر زبیدہ کی طرف بڑھے اور اسے بازو سے پکڑ کر سہارا دیا۔ آنکھیں کھول کر وہ بڑی مشکل سے کھڑی ہو پائی۔ عثمان سب کچھ سمجھ چکے تھے۔ اس ملک میں مقامی لوگ ایشین کو طرح طرح سے تنگ کرتے ہی رہتے تھے۔ حالیہ بم دھماکوں نے ماحول زیادہ خراب کر دیا تھا۔ عثمان نے زبیدہ کو قدم دو قدم چلایا۔ نوجوان پستول کا رخ عثمان کی طرف کر کے چلایا "او بوڑھے دہشت گرد اپنا موبائل فون مجھے دو..."

عثمان نے اس کی طرف گھورتے ہوئے اس کی زبان میں جواب دیا۔ "ہمارے پاس موبائل فون نہیں ہے..."

نوجوان کی حالت کافی خراب تھی۔ موسم گرم نہیں تھا پھر بھی وہ پسینے میں تر تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ بار بار ان پر زبان پھیر رہا تھا اور کھڑا کھڑا چکرا رہا تھا۔

اس نے سر جھٹک کر پھر سوال کیا "کوئی دوسرا فون...؟"

عثمان بے دلی سے بولے "ہاں ادھر ہے۔ ڈرائنگ روم میں۔"

نوجوان تقریباً لڑکھڑاتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے عثمان اور زبیدہ بھی آہستہ آہستہ آگئے نوجوان نے ٹیلی فون کے تار اکھاڑ پھینکے جو صوفے کے قریب تپائی پر پڑا تھا۔ پھر عثمان کی طرف پستول تان کر قدرے اونچی آواز میں کہا "تم دونوں کو... مرنا ہے، تم دہشت گرد ہو۔ قاتل ہو..."

وہ اچانک چکرایا اور صوفے پر گر گیا مگر جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ عثمان نے اس کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کہا "دیکھو، تم زخمی ہو تمہاری حالت ٹھیک نہیں، زیادہ خون بہنے سے چکر آرہے ہیں اور شاید تم بھوکے اور پیاسے بھی ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔"

"کمینے بوڑھے دہشت گرد! چپ رہو۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ اور مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ..."

عثمان مسکرائے "دیکھو بیٹے ضد نہ کرو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ نہ طاقت ہے جو تمہارا مقابلہ کر سکیں۔ فون کاٹ کر تم نے باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ بھی ختم کر دیا۔ پھر تم ایک مہمان ہو، ہمارا مذہبی فرض بھی ہے کہ گھر آئے زخمی اور بھوکے پیاسے مہمان کی خدمت کی جائے..."

اس کو ہلکا سا چکر آیا مگر وہ سنبھلتے ہوئے بولا "خاموش۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا مذہب جو صرف ظلم، تشدد اور دہشت گردی سکھاتا ہے..."

نوجوان کو پھر چکر آگیا اس نے کراہ کر اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔ عثمان نے زبیدہ کو اشارہ کیا۔

"جاؤ تم ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آؤ..."

وہ تھوڑا لنگڑاتی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔ چوٹ اس کے کولہے کی ہڈی پر آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد زبیدہ ٹرے میں پانی کی بوتل اور گلاس رکھے کمرے میں داخل ہوئی اور ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی۔ عثمان نے گلاس میں پانی بھر کر نوجوان کی طرف بڑھایا۔ اس نے مشکوک نظر سے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ پانی دیکھ کر اس کی پیاس کی شدت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ عثمان نے اس کا شک بھانپ لیا تھوڑا پانی چلو میں لے کر خود پیتے ہوئے کہا "اس میں کچھ نہیں۔ پی لو..."

نوجوان نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا، اس نے بوتل اٹھائی منھ لگا کر تھوڑا اور پانی پیا، باقی اپنے سر پر انڈیل لیا۔ اسے تھوڑی راحت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ جلا کر دو چار لمبے کش لئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"میں آج تمہارے جیسے تین دہشت گرد مسلمانوں کو قتل کر کے آرہا ہوں۔ ایک مسلمان میں نے برینٹ روڈ پر مارا۔ دوسرا ایلنگ ایریا میں اور تیسرا ایک پاکستانی مسلمان میرے ہاتھوں سمیڈن مارکیٹ میں قتل ہوا۔ میں نے آج صبح قسم کھائی تھی کہ میں آج چار دہشت گرد مسلمانوں کو ختم کروں گا۔ خوش قسمتی سے ایک کی بجائے تم دو میرے ہاتھ لگ گئے ہو..."

ڈرائنگ روم میں تھوڑی دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ عثمان نے ایک گہری سانس لے کر سوال کیا "تم نے ایسی گھناؤنی قسم کیوں کھائی..."

وہ سنتے ہی بھڑک اٹھا "مجھ سے کوئی سوال مت پوچھو اپنے خدا کو یاد کر لو، تمہیں مرنا ہے..."

اس کے بازو سے برابر خون ٹپک رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بھی کانپنے لگا تھا۔ سگریٹ کا ٹکڑا میز پر رکھ کر کراہتے ہوئے اس نے سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا مگر پستول کا رخ برابر عثمان کی طرف رہا

”تم کافی زخمی ہو، خون زیادہ بہہ چکا ہے۔ اپنی شرٹ اتار دو۔ میں زخم صاف کر کے پٹی کر دیتا ہوں میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے یہ کام آتا ہے...“

نوجوان کم زور آواز میں غرایا ”میں جانتا ہوں تم ڈاکٹر ہو۔ باہر نیم پلیٹ پر تمہارا نام لکھا ہے۔ کیا سمجھتے ہو۔ ہمدردی دکھا کر بچ جاؤ گے؟ نہیں، تمہیں مرنا ہے...“

اس بار عثمان کو غصہ آ گیا ”میں مسلمان ہوں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہم دونوں تمہارے ہاتھوں ہی قتل ہوں گے۔ ایک مسلمان کا یقین کرو۔“

نوجوان گردن جھٹک کر بولا ”میں نہیں مانتا، تمہارا مذہب تمہیں صرف دہشت گردی کا سبق دیتا ہے...“

عثمان زبیدہ سے مخاطب ہوئے ”تم گرم دودھ لاؤ کچھ سینڈوچ اور پھل بھی۔ اس کے بعد دواؤں والا بریف کیس اور تھوڑا گرم پانی اور کاٹن...“

زبیدہ پھر کچن کی طرف چل دی۔ نوجوان مارے درد کے کراہنے لگا تھا عثمان نے اپنا سوال پھر دہرایا ”آخر تم نے ایسی قسم کھائی کیوں...“

نوجوان جذباتی ہو اٹھا ”چند دن پہلے میرا ایک چھوٹا سا ہنستا کھیلتا کنبہ تھا۔ ایک خوب صورت اور ٹوٹ کر چاہنے والی بیوی اور ایک پھول سی بچی جسے ہم دونوں اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔ میری بیوی بچی کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہی تھی بم بلاسٹ ہوا اور ان دونوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ میں بدنصیب ان کی آخری دیدار بھی نہ کر سکا اپنے ہاتھوں سے ان کو مٹی کے سپرد نہ کر سکا۔ انہیں مار ڈالا تم لوگوں نے تم مسلمانوں نے تم دہشت گردوں نے...“ اس کا گلا رندھ گیا۔ عثمان افسردہ ہو گئے اور بولے ”معصوم انسانوں کا خون بہانے والا نہ انسان ہو سکتا ہے نہ مسلمان۔ بڑا دکھ ہوا سن کر۔ ان حیوانوں نے تمہاری بیوی اور بچی کو مار ڈالا خدا ان کو ہدایت دے اور تمہیں صبر...“

وہ فرش کو گھورتے ہوئے بولا ”میڈین مارکیٹ میں جب میں نے تیسرے آدمی کو مارا تو میرے ہی ملک کی فورس مجھ پر ٹوٹ پڑی، میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگا مگر پھر بھی پولیس کی ایک گولی میرے بازو میں لگ گئی...“

زبیدہ نے دودھ سینڈوچ اور کچھ پھل میز پر لگا دئے تھے۔ نوجوان نے پھر سوالیہ نظروں سے دیکھا عثمان مسکرائے ”کھاؤ کھاؤ اس میں کچھ نہیں۔ وہم نہ کرو...“

نوجوان کھانے میں مصروف ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب کچھ کھا گیا اور غٹاغٹ دودھ پی گیا، ایک لمبا سانس لے کر اس نے میز پر رکھی پستول پھر سے سنبھال لی۔ تھوڑی دیر بعد زبیدہ ایک ہاتھ میں گرم پانی کا برتن، دوسرے ہاتھ میں دواؤں کا بکس اور روئی لے آئی۔ نوجوان نے اپنی قمیص اتار کر فرش پر پھینک دی۔ عثمان نے پانی میں کوئی لوشن ڈالا۔ پھر روئی کو بھگو کر نچوڑا اور اس کا بازو پکڑ کر زخم صاف کرنے لگے اور بڑبڑائے ”کافی گہرا زخم ہے...“

زخم صاف کرنے کے بعد انہوں نے پٹیوں کا بڑا رول نکالا دوائی لگا کر پٹی کر دی نوجوان کراہتا رہا۔ عثمان نے دو انجکشن نکالے اور سرنج میں بھر لئے۔ نوجوان گھبرا اٹھا۔

”او بوڑھے ڈاکٹر خبردار جو مجھ انجکشن دیا۔ تمہارا کیا بھروسہ ... آخر ہو تو ان دہشت گردوں کے ہم مذہب...“

عثمان مسکرائے اور بولے ”تم ان شیشیوں کے لیبل پڑھو، ایک انجکشن اینٹی سیپٹک ہے دوسرا درد کو کم کرنے والا ہے۔ ان دونوں کی تمہیں ضرورت ہے...“

اس نے لیبل پڑھے اور اپنا بازو عثمان کی طرف بڑھا دیا۔

”نہیں... یہ ران پر لگے گا...“ عثمان نے دفعتاً کہا۔

زبیدہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ نوجوان نے انجکشن لگوا لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا درد کم ہو گیا اس نے راحت محسوس کی پیٹ بھر کھانے اور درد کی کمی کے باعث اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ بارہ بجنے کو تھے نوجوان صوفے کی پشت پر گردن ٹکا کر سو گیا۔ عثمان اور زبیدہ اس کی حالت پہلے سے بہتر دیکھ کر مطمئن ہو گئے۔

...دونوں اپنی آنکھیں بند کئے گولی چلنے کا انتظار کر رہے تھے کہ نوجوان نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر عثمان سے سوال کیا۔

”ڈاکٹر... میں کئی گھنٹے لگاتار سویا، میرا پستول بھی ٹیبل پر پڑا رہا تم بڑی آسانی سے مجھے قتل کر سکتے تھے مگر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا... کیوں...“

عثمان نے تسبیح پھیرتے ہوئے اپنے پپوٹوں کو حرکت دی، آنکھیں کھول کر انہوں نے نوجوان کو دیکھا اور مسکرائے ”رات پٹی کرنے سے پہلے میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم دونوں تمہارے ہی ہاتھوں سے قتل ہوں گے، سو ہمیں پستول کا خیال ہی نہیں آیا۔ ابھی ابھی ہم نے صبح کی نماز پڑھی تھی کہ تمہاری آنکھ کھل گئی...“

نوجوان جواب تک اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ ایک دم بھڑک اٹھا وہ عثمان اور زبیدہ کے قریب آ کر چیخا۔ ”تم دونوں جھوٹے ہو... جھوٹ بولتے ہو تم۔ جھوٹ۔ تم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ مسلمان ایسے نہیں ہوتے۔“ وہ بے ساختہ دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے چیخا ”وہ صرف دہشت گرد ہوتے ہیں۔ دہشت گرد...“

وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد گولی چلنے کی آواز کے ساتھ نوجوان کی چیخ ابھری اور فضا میں تحلیل ہو گئی۔ عثمان نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرا، اور زبیدہ سے مخاطب ہوئے جو حیرانی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”دیکھا تم نے... آخر اس نے اپنی قسم پوری کر لی.....“ OO

پیلا دیواری کاغذ

شارلٹ پرکنس گلمن
ترجمہ: بلقیس ظفیر الحسن

شارلٹ پرکنس گلمن (Charlotte Perkins Gilman 1860-1935) امریکہ میں تحریک آزادیٔ نسواں کے نمایاں مفکروں میں تھی۔ اس ترجمے میں قدرے آزادی برتی گئی ہے۔ جو میرے خیال میں مصنفہ کی تحریر کی روح کو اجاگر کرنے کے لیے ضروری تھی۔ بلقیس

ہم جیسے متوسط طبقے کے لوگ کسی صحت افزا مقام پر چھٹیاں گزارنے ایسے تو جاتے نہیں۔ اشد ضرورت پڑنے پر ہی ایسا کیا جاتا ہے۔

پراسرار نوابوں کے زمانے والی حویلی اور اتنے کم کرائے پر! شبہ تو ہوگا ہی۔ میرے دل میں شک نے جگہ بنالی ہے تو تعجب کی کیا بات ہے۔ ہو نہ ہو کوئی فتور ہے یہاں۔ نہیں تو اتنے دنوں سے بند کیوں پڑی تھی؟ میں نے یہ بات جان سے کہی تو میرا مذاق اڑانے لگ گیا۔ خیر، شوہر تو سب کے سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور یہ جان! یہ کیوں ماننے لگا میری بات۔ ڈاکٹر ہے! اس کا سائنس زدہ دماغ آسیب وغیرہ کاہے کو مانے گا! اس کے خیال میں تو یہ سب ضعیف الاعتقادی کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ ”کیا بے وقوفی ہے۔ کیسے کیسے وہموں میں پڑی رہتی ہو۔“ اس نے کہا۔

ہاں بھئی۔ مشہور ڈاکٹر ہے! یہ الگ بات کہ کب سے بیمار پڑی ہوں میں اور اچھی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ مگر وہ میری بیماری کو اہمیت ہی کب دیتا ہے! ذرا سوچئے! میرا شوہر! میرا ڈاکٹر شوہر! میرے رشتہ داروں اور دوستوں کو یقین دلاتا پھرتا ہے کہ میرا معاملہ ذرا بھی تشویش ناک نہیں ہے۔ عارضی ڈپریشن ہے اعصاب کم زور ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی ہسٹریا کا ہلکا سا دورہ... بس! یہی کہتا رہتا ہے وہ سب سے۔ وہ تو وہ میرا بھائی! وہ بھی ڈاکٹر ہے۔ جان کی طرح ایک مستند ڈاکٹر۔ اس کا بھی یہی کہنا ہے کہ طاقت بخش دوائیں، ہلکی پھلکی ورزش اور آب و ہوا کی تبدیلی۔ یہی ہے میرا علاج۔ میرا اپنی طرح کے لوگوں سے ملنا جلنا لکھنا پڑھنا، سب بند! ان کا خیال ہے کہ یہ سب مجھے اور زیادہ بیمار کر دیتا ہے۔ تکان ہو جاتی ہے! ہاں۔ ہو تو جاتی ہوں میں تھک کے چور! مگر اس طرح چھپ چھپ کے لکھنا کیسے نہیں تھکا دیگا بھائی! مگر کیا کروں۔ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان کی مخالفت، ان کی ڈانٹ سننے کی تاب مجھ میں رہی ہی نہیں۔ خیر۔ مجھے اپنے بارے میں اتنا نہیں سوچنا چاہئے۔ جان کہتا ہے کہ اس سے ڈپریشن بڑھ جاتا ہے۔ یہ تو وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے... چھوڑیئے... یہ میں اپنی بات کہاں لے بیٹھی۔ میں تو گھر کے بارے میں بتانے چلی تھی۔

گھر! بہت اچھا تو ہے گھر۔ سڑک سے کٹا ہوا بالکل اکیلا۔ تنہا۔ آبادی سے تقریباً تین میل دور۔ پرانے وقتوں کی حویلی ہے۔ باڑھ دار دیواروں سے گھری۔ دروازے دروازے مضبوط تالے! بالکل محفوظ گھر! اچھا بھلا باغ بھی ہے خوش بودار پھولوں والا۔ روش روش گھنیرے سائے۔ انگور کی بیلیں۔ گھنی چھاؤں میں بیٹھنے کی آرام دہ جگہیں۔ ملازموں کے لئے شاگرد پیشہ بھی ہے۔ کسی زمانے میں یہاں ”پودا گھر“ یعنی گرین ہاؤس بھی ہوا کرتا تھا مگر اب شکستہ حالت میں ہے۔ برسوں بند پڑا رہا ہے نا یہ گھر! شاید وراثت وغیرہ کے قضیے کی وجہ سے! جو بھی ہو۔ گھر اچھا ہی نہیں بہت اچھا ہے۔ مگر وہ کیا ہے جو مجھے ڈرائے جا رہا ہے۔ کچھ تو ہے!

کل پورے چاند کی رات تھی۔ مگر مجھے ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب طرح کی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے جان کو بتایا تو وہ اٹھ اٹھ کے کھڑکیاں بند کرنے لگ گیا۔ ”ہوا بہت تیز ہے۔“ کہہ رہا تھا۔ میں بھی خواہ مخواہ بگڑنے لگتی ہوں اس پر۔ اتنی تنک مزاج تو میں کبھی نہیں تھی یہ سب میری بیماری کی کارستانی ہے۔ جان کا بھی یہی خیال ہے۔ کہتا ہے مجھے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جو میں نہیں کر رہی ہوں۔ کرتی تو ہوں! کتنی کوشش کرتی ہوں اور کتنی کروں؟

یہ کمرہ مجھے پھوٹی آنکھ نہیں سہاتا۔ سیڑھیوں کے نیچے والے کمرے میں کیا برائی تھی؟ چاروں طرف گلاب کی باڑیں ہیں کھڑکی سے صاف نظر آتی ہیں۔

پرانے فیشن کی چھینٹ کے پردوں والا وہ کمرہ مجھے پسند آ گیا تھا مگر جان نہیں مانا۔ کہنے لگا چھوٹا ہے۔ دو بستر یہاں کیسے لگائیں گے۔ اور کھڑکی بھی ایک ہی ہے۔ اب کیا وہ اپنا انتظام کسی دوسرے کمرے میں کرے؟ مجھ سے دور رہنا اسے بالکل پسند نہیں۔ کتنا چاہتا ہے مجھے۔ میری ہر بات کا کتنا خیال رکھتا ہے۔ میرے لئے تو پورا ایک ہدایت نامہ تیار کر رکھا ہے اس نے۔ ہر دن کا ہر لمحہ میں کس طرح گزاروں کیا کیا کروں وغیرہ وغیرہ... سخت ناشکرا پن ہوگا میرا جو اس کی بات نہ مانوں۔ صرف اور صرف میرے لئے وہ یہاں آ گیا۔ صرف اس لئے کہ پورا آرام اور مناسب آب و ہوا مجھے میسر ہو سکے۔ "جان من۔ کھانا تو تم بھوک کے مطابق ہی کھا سکتی ہو اور ورزش بھی جتنی کر سکو گی کرو گی۔ مگر ہوا... الغارون ہوا ہے یہاں۔ جتنی چاہو لے لو۔ الغارون ہوا یہاں ہے بھئی... الغارون..." اس نے کہا تھا۔

ہم نے گھر کی سب سے اوپری منزل پر بچوں کے کمرے کا انتخاب کر لیا اپنے لئے۔ ہوادار کشادہ کمرہ ہے تمام کھڑکیاں ہی کھڑکیاں۔ روشنی اور ہوا سے بھرا ہوا۔ کسی زمانے میں بچوں کا کمرہ یعنی نرسری رہا ہوگا۔ پھر شاید کھیل کود کا کمرہ بنا دیا گیا۔ پھر ورزش کا کمرہ۔ یہ گمان میں نے کھڑکیوں پر مضبوطی سے لگائی گئی سلاخوں کو دیکھ کر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چھت میں حلقے بھی گڑے ہیں۔ ورزش کا سامان دیواروں پر لٹکا ہے۔ پھر دیواروں کا رنگ و روغن اور یہ وال پیپر! دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جگہ مدتوں اسکولی بچوں کا تختۂ مشق بنی رہی ہے۔ دیواری کاغذ جگہ جگہ سے اُدھڑا پڑا ہے۔ خاص طور پر مسہری کے اوپر والا حصہ! کس بے دردی سے نوچا گیا ہے! دوسری دیواروں کا بھی یہی حال ہے۔ اتنا واہیات دیواری کاغذ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ یہ اس کے بے ہنگم چیختے چلاتے بیہودہ رنگ والے نقش و نگار! آرٹ کے نام پر یہ گناہِ عظیم پتا نہیں کس سے سرزد ہو گیا ہے! اوندھا سیدھا کچھ بھی بنا کے رکھ دیا! انہیں غور سے دیکھنا شروع کروں تو نگاہ الجھ کر رہ جاتی ہے۔ رنگ، کہیں بے حد شوخ کہیں اتنا ہلکا پھیکا کہ طبیعت بے لطف ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ ایک طرف نگاہ جما کے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک کچھ اور ہی نظر آنے لگتا ہے اور آپ گھبرا کے سوچنے لگتے ہیں کہ ابھی ابھی آپ نے کیا دیکھا تھا۔ بدمزاقی کی انتہا تو اس کا رنگ ہے۔ مکروہ! گندا، غلیظ، پیلا۔ بجھتی دھواں دیتی آگ جیسا۔ کہیں پر اڑا اڑا نارنجی بن جاتا ہے تو کہیں گندھک کی رنگت اختیار کر لیتا ہے۔ بچوں نے نوچ کھسوٹ کے رکھ دیا تو کیا برا کیا۔ مجھے زیادہ دن یہاں رہنا پڑ جائے تو شاید میں بھی ایسا ہی کر دوں... لو۔ جان آ رہا ہے۔ مجھے کاغذ قلم چھپانا ہوگا۔ لکھتے دیکھے گا تو آگ بگولا ہو جائے گا۔

••• ••• •••

یہاں آئے دو ہفتے ہو چکے ہیں۔ اس دوران مجھے کچھ لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آج اس تاب کار نرسری کے ٹھیک سامنے بیٹھ گئی ہوں۔ آج مجھے لکھنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ تھک کے خود ہی لکھنا بند کر دوں تو اور بات ہے۔ جان سارے دن کے لئے باہر گیا ہوا ہے۔ کسی مریض کی حالت تشویش ناک ہو گئی ہے۔ کتنی اچھی بات ہے کہ میری بیماری ذرا بھی تشویش ناک نہیں۔ ذرا سا ڈپریشن ہی تو ہے!... مگر کیوں ہے یہ ڈپریشن؟ جان بھی حیران ہے۔ ہاں کوئی وجہ بھی تو ہو ڈپریشن کی۔ کوئی وجہ ہے ہی نہیں۔ تبھی تو جان سمجھتا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ کہتا ہے میرے اعصاب کمزور پڑ گئے ہیں۔ طاقت آ جانے پر بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی... یہ تھکن تو کمزوری کی وجہ سے محسوس ہوتی ہے... ہاں! اسی کمزوری کی وجہ سے تو میں کچھ کرنے دھرنے کے قابل نہیں رہی ہوں ہائے!... میں نے تو جان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلنے کے خواب دیکھے تھے۔ اسے ہر طرح سے مطمئن اور خوش رکھ سکوں یہی تو میری سب سے بڑی آرزو تھی۔

اور دیکھئے۔ کیا ہو گیا! جان کے کندھوں پر بوجھ بن کے رہ گئی ہوں۔ معمولی معمولی کام تک نہیں ہوتے مجھ سے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہمیں میری مل گئی۔ نہیں تو بچے کا کیا ہوتا۔ میرا بچہ... میری جان سے پیارا میرا بچہ... کچھ بھی تو نہیں کر سکی میں اس کے لئے۔ اب میری کر رہی ہے۔ اس کی نگہداشت۔ اور بہت اچھی طرح کر رہی ہے... میرے ہونے نہ ہونے سے بچے کو کوئی فرق نہیں پڑا یہ کتنی اچھی بات ہے... میں تو اسے تھامتے ہی نروس ہو جاتی تھی!... جان کبھی نروس نہیں ہوتا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط ہیں... میری وال پیپر والی پریشانی پر کتنا ہنستا ہے!

شروع شروع میں تو وہ اسے بدل دینے پر رضامند ہو گیا تھا مگر پھر کہنے لگا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔ تم نے خواہ مخواہ اپنے اعصاب پر سوار کر رکھا ہے انہیں۔ اعصاب کے مریضوں کے لئے اس سے بری کوئی بات نہیں کہ ان کے اوہام کو قبول کر لیا جائے۔ آج دیواری کاغذ بدلنے کی بات کہہ رہی ہو کل مسہری ہٹانے کو کہو گی... پھر دروازہ بدلنے پر اصرار کرنے لگو گی خواہ مخواہ کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں آ کر تمہاری صحت بہتر ہونے لگی ہے۔" وہ اپنی بات پر زور دینے کے لئے کہنے لگا۔ "اس کے علاوہ یہ بھی تو سوچو کہ ہمیں یہاں آئے کتنے دن ہوئے ہیں۔ صرف تین مہینوں کے لئے ہی تو آئے ہیں۔ یہ سب کیوں کرنا چاہیے ہمیں..."

"ٹھیک ہے"۔ میں بھی بغیر بولے نہیں رہ سکی۔ "مگر اس کمرے میں تو نہ رہیں۔ نیچے اور بھی کمرے ہیں۔"

اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ "ہشت! پگلی کہیں کی" کہہ کے مجھے پیار کرنے لگا۔ پھر بولا "تم کہو تو میں نیچے تہہ خانے میں جا کے رہ جاؤں۔ مگر پہلے وہاں پتائی تو کروانی ہی ہوگی۔" وہ ہنسنے لگا۔ میں شرمندہ ہو کر

سوچنے لگی کہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ اس کمرے میں کیا خرابی ہے۔ اتنا ہوادار اتنا روشن۔ اور کیا چاہیے۔ فضول اپنا دماغ خراب کرتی رہتی ہوں۔ نہ صرف اپنا بلکہ جان کا بھی! اب تو اسے اور نہ پریشان کروں۔ مجھے لے کر اس کی پریشانی ویسے ہی کیا کم ہے۔

••• ••• ••• •••

میں اپنے آپ کو اس کمرے سے مانوس کرنے میں لگ گئی ہوں۔ مگر اُف یہ وال پیپر!!

یہاں ایک کھڑکی باغیچے کی طرف کھلتی ہے۔ باغیچہ! جہاں درختوں کے گھنے سائے ہیں، دل فریب دل آویز خوش بو دار پھول پودے ہیں، سرسبز جھاڑیاں ہیں۔ دوسری کھڑکی سے دور والے بندرگاہ کا نظارہ دکھائی دیتا ہے اور سڑک کا، جو بندرگاہ کو جاتی ہے۔ گھنے درختوں والی سڑک! کبھی کبھی اس سڑک پر مجھے بڑی چہل پہل بھی دکھائی دیتی ہے۔ آتے جاتے لوگ، گہما گہمی۔ پتا نہیں سچ کہ جھوٹ! جان کہتا ہے میری تصور آفرینی پتا نہیں کیا کیا دکھاتی رہتی ہے مجھے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے میں کچھ بھی فرض کر لینے کی عادی ہو گئی ہوں۔ اپنے چاروں طرف ایک خیالی دنیا گڑھ رکھی ہے میں نے۔ اور اس سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتی۔ جان مجھ سے بزور کہتا رہتا ہے کہ مجھے اس سے باہر نکلنا ہی ہوگا۔ اور اس میں کوئی میری مدد نہیں کر سکتا۔ میرے سوا! یہ کام صرف میں کر سکتی ہوں۔ صرف میں... لیکن میں کیا کر سکتی ہوں بھلا... اپنا لکھنا پڑھنا تک تو آزادی سے نہیں کر سکتی۔ ہاں لکھتی تو ہوں مگر چھپ کر۔ پکڑے جانے کا خوف مجھے نڈھال کر کے رکھ دیتا ہے اور میں بستر پر پڑ جاتی ہوں۔ ویسے جان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں جب اچھی ہو جاؤں تو وہ مجھے کسی بات سے نہیں روکے گا۔ اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی مجھے پوری پوری آزادی ہوگی...

"جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ پھر میں خود لے جاؤں گا تمہیں۔ تمہارے لوگوں سے ملاؤں گا۔ ہنری اور جولیا سے بھی..." مگر ساتھ ہی ہنستے ہنستے یہ بھی کہنے سے نہیں چوکتا کہ ان لوگوں سے ملوانے سے تو بہتر ہے کہ وہ میرے تکیے میں پٹاخے بھر کے رکھ دے۔ دھماکے کے ساتھ پھٹ جانے والے بڑے بڑے بٹانے! شریر کہیں کا! مجھے چڑھانے میں اسے کتنا مزا آتا ہے! ہائے! کیسا جی چاہتا ہے میرا کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور میں ایک دم سے بھلی چنگی ہو جاؤں۔ بیمار پڑے رہنا کس کو اچھا لگتا ہے!... بس بہت ہوا۔ کب سے سوچے جا رہی ہوں صرف اپنے بارے میں... اور یہ دیواری کاغذ!... کس طرح گھورے جا رہے ہیں مجھے... خوب جانتے ہیں یہ اپنی زہرنا کیوں کو... کہیں کہیں کیسے بھیانک نظر آتے ہیں... ایک جگہ تو بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کٹی ہوئی گردنیں ہوں!... اپنے حلقوں سے اُبلی اُبلی آنکھوں سے نہارتی ہوئی... ڈھٹائی سے پلکیں جھپکائے بغیر... کبھی اوپر جاتی ہیں کبھی نیچے... کبھی اِدھر کبھی اُدھر... یہاں سے وہاں گشت کرتی ہوئی۔ قطار در قطار... بے جان تصویریں اتنی جان دار کیسے ہو سکتی ہیں؟... یا شاید... ہو سکتی ہیں!...

••• ••• ••• •••

یوں تو بچپن سے در و دیوار سے باتیں کرنا، ان سے لپٹ کے رونا ہنسنا مجھے خوب آتا ہے۔ اپنی تصور آفرینی سے پہروں بہلایا ہے میں نے اپنے آپ کو... جیسے بچے بہلتے ہیں کھلونوں سے۔ اپنے گرد و پیش کے سامانوں سے ہمیشہ میری دوستی ہو جاتی ہے۔ الماریاں، کرسیاں، برسوں میرے ہم دم اور ہم راز رہے... آج بھی یاد ہے مجھے وہ بڑی آرام کرسی! کتنی شفیق تھی! میں ذرا بھی گھبراتی یا ڈرتی تو بھاگ کے اس میں چھپ جاتی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھے پناہ مل گئی ہے۔ مگر اس کمرے کا فرنیچر ایسا نہیں ہے۔ کیسا اجنبیوں کی طرح پڑا ہے!... کیوں نہ ہو... اسے نیچے سے اٹھا کے یہاں لایا گیا ہے نا! یہ یہاں کا ہے ہی نہیں۔ یہ کمرہ تو خالی تھا۔

جبھی تو میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ کمرہ رہنے کے لئے نہیں بچوں کے کھیلنے کودنے کے لئے رکھا گیا ہوگا۔ یہ نُچے کھسوٹے وال پیپر... بالکل جیسے بچے کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے کو کاٹا پیٹا کرتے ہیں... کبھی بے حد محبت سے کبھی شدید نفرت کے ساتھ... کہیں کہیں پر اسے پھر سے چپکانے کی کوشش بھی نظر آتی ہے مگر بے دل کوشش... فرش خراشوں سے بھرا پڑا ہے۔ دراڑیں صاف نظر آتی ہیں... اور یہ مسہری!... بادا آدم کے وقت کی! دنیا بھر کی جنگیں جھیل کر آن پڑی ہو یہاں جیسے... خیر! جو ہے سو تو ہے ہی۔ ان سے مجھے کوئی خاص شکوہ نہیں... مگر یہ وال پیپر!... اُف!... چلی آ رہی ہے وہ... جان کی بہن!... اسے تو بالکل معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں لکھ رہی ہوں... نیک عورت ہے۔ بڑی سلیقہ مند پوری گرہستن؟ جس کی زندگی صرف اس کا گھر ہوتا ہے جہاں سے باہر جھانکنے کی نہ اسے کبھی ضرورت پڑتی ہے نہ خواہش ہوتی ہے... میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ بالکل اپنے بھائی کی طرح! وہ بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس منحوس لکھنے کی عادت نے ہی ستیاناس کر دیا ہے میرا... کاغذ قلم چھپائے دیتی ہوں! اس کے جانے کے بعد لکھوں گی۔ ابھی دور پر ہے۔ کھڑکی سے ادھر آتی دکھائی دے رہی ہے... اسی کھڑکی سے، جس سے وہ راستہ نظر آتا ہے۔ خوشنما سایوں سے ڈھکا، مخملیں جھاڑیوں سے ہم آغوش، گاؤں کی طرح جاتا ہوا راستہ!... گاؤں، جہاں پیپل کی چھاؤں ہے۔ شاداب کھیتوں والا گاؤں!... مگر کاغذ چھپانے سے پہلے میں اتنا تو لکھ ہی سکتی ہوں کہ یہ دیواری کاغذ، یہ وال پیپر، ہرگز صرف وہی نہیں ہے جو نظر آتا ہے... اس کے نقش و نگار کے پیچھے کا چھپا ہوا جو ہے وہ صرف الگ زاویے سے روشنی پڑتے ہی نظر آتا ہے۔ نمایاں ہو کے تو

نہیں...مگر نظر آجاتا ہے۔ خاص طور پر ان جگہوں پر جہاں دھوپ سیدھی پڑنے لگے۔ اور وہاں جہاں دھندلاہٹ کم ہے۔ پھر صاف دکھائی دینے لگتے ہیں...ہیولے!...عجیب وغریب ہیولے!...طرح طرح کے چہرے بناتے... منہ چڑھاتے ہیولے!...جیسے ان بیہودہ نقش ونگار کے تلے دبا کے رکھے جانے پر تلملا رہے ہوں! آگئی وہ...جان کی بہن!

••• ••• ••• •••

آج چلی گئی وہ!...جان کی بہن!...اللہ تیرا شکر اب کچھ بعافیت گزر گیا۔ جان نے اپنے گھر والوں کو بلا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ان میں رہ کے بھلی رہوں گی...نیلی...ممی...بچے...سب گئے...چلے گئے...اور میں تھک کے نڈھال پڑی ہوں...نہیں، میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ کچھ بھی نہیں کیا میں نے۔ سب کام تو جینی کر رہی تھی...پھر میں تھک کے چور کیوں ہو رہی ہوں...؟ کتنی کمزوری لگ رہی ہے۔ جان میرا یہ حال دیکھ کے گھبرا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ تمہیں پہاڑوں پر بھیجنا پڑے گا مائیکل کے پاس!...مگر میں نہیں جانے والی وہاں۔ میرا بھائی مائیکل! وہ بھی تو جان کی طرح ایک ڈاکٹر ہے۔ وہ کون سا تیر مار لے گا۔ میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔ کوئی تک ہی نہیں۔ اتنی دور... پہاڑوں پر؟ ایک تو یہ لوگ! مجھے کام کرنے سے کیوں روکتے رہتے ہیں؟ کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ الٹے میں اور جھگڑالو ہوتی جا رہی ہوں، بدمزاج! ہر وقت روتی رہتی ہوں...سارا وقت روتی رہتی ہوں...یہ بات الگ کہ ایک بھی آنسو دکھائی نہیں دیتا کسی کو...کیوں دکھاؤں میں کسی کو اپنے آنسو؟ اور جان! وہ کہاں دیکھنے والا ہے میرے آنسو... سخت نفرت ہے اسے آنسوؤں سے...یہ تو اچھا ہوا کہ ان دنوں اسے زیادہ تر گھر سے باہر رہنا ہوتا ہے اور جینی بے چاری محض ایک نیک ملازمہ ہے۔ سب کہنا مانتی ہے میرا...مجھے اکیلا چھوڑ دیتی ہے۔ مگر ایک بات ہے۔ اب میرا دل اس کمرے میں لگنے لگ گیا ہے اس وال پیپر کے باوجود!...یا شاید اسی کی وجہ سے!...اب میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہونے والی مسہری پر پڑی پڑی گھنٹوں اس دیواری کاغذ کی چھان بین میں لگی رہتی ہوں...کیا بتاؤں کیسی کیسی قلابازیاں کھاتی ہے میری نگاہ...نیچے سے اوپر...اوپر سے نیچے...کونوں کھدروں میں...جو واضح ہے وہاں اور جو مبہم ہے وہاں بھی...ٹھان لی ہے میں نے۔ اس نامعقول تصویر کو سمجھ کے ہی رہوں گی...مصوری کے بنیادی اصولوں سے تھوڑی بہت واقفیت مجھے ہے لیکن یہاں تو کوئی اصول، کوئی قاعدہ کوئی طریقۂ کار ملحوظ نظر رکھا ہی نہیں گیا ہے۔ نہ ہی کوئی موزونیت پائی جاتی ہے۔ ایسا ڈیزائن تو میں نے نہ کبھی دیکھا ہے نہ سنا۔ ڈیزائن دہرائے گئے ہیں مگر صرف چوڑائی میں... ایک طرف تو چوڑائیاں الگ پڑی دکھائی دیتی ہیں احمقانہ انداز میں، تو دوسری طرف سب کچھ ایک دوسرے سے گتھا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ گویا زاویۂ قائمہ بن رہا ہو افقی طور پر۔ پتہ نہیں کس ہذیانی کیفیت میں بنائی گئی ہے یہ تصویر۔ سب کچھ گڈمڈ ہوتا رہتا ہے۔ امنڈتی گھمنڈتی لہروں میں بے آسرا بہتی گھاس کی طرح!...انہیں ترتیب سے دیکھنے کی کوشش مجھے توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ آرائشی پٹی کے طور پر چوڑائیوں کے افقا استعمال نے اسے اور بھی گنجلک بنا کے رکھ دیا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں یہ ڈیزائن بڑی حد تک واضح دکھائی دیتا ہے، مگر صرف اس وقت جب دن کی روشنی پھیکی پڑنے لگے اور ڈھلتے سورج کی دم توڑتی کرنیں اس پر سیدھی پڑنے لگیں۔ اس وقت یہاں کا ڈیزائن اچانک تاب ناک ہو اٹھتا ہے۔ اور وال پیپر کی ساری مکروہیت تمام کی تمام یہاں جمع ہو جاتی ہے۔ پھر بڑی سرعت سے ایک ساتھ الگ الگ سمتوں کو دوڑنے لگتی ہے۔ اب کوئی تمام سمتوں کو ایک ساتھ دیکھے تو کیسے؟ ہلکان ہو گئی میں ان کا پیچھا کرتے کرتے...اب ذرا سو رہوں...

••• ••• ••• •••

مجھے نہیں معلوم میں کیوں لکھ رہی ہوں۔ ذرا جی نہیں چاہ رہا پھر بھی...بے وقوفی! جان تو یہی کہے گا۔ مگر جو محسوس کرتی ہوں جو سوچتی ہوں کیسے نہ لکھوں! ذرا سی تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر کس قیمت پر؟ تھک کے چور ہو جاتی ہوں۔ سارا دن پڑی رہتی ہوں اس پر یہ حال!...جان کہتا ہے یہ سب میری کمزوری کی وجہ سے ہے۔ اتنی دوائیاں دیتا رہتا ہے۔ وٹامن کی گولیاں...مچھلی کا تیل...اور پتہ نہیں الم غلم کیا کیا...مگر وہ دوا جس سے میں بھلی چنگی ہو جاؤں وہی تجویز نہیں کر پایا اب تک اور یہ ابلا ابلا کھانا!...اغ...گلے سے اتارنا مشکل ہو جاتا ہے... مگر وہ بھی کیا کرے۔ بیچارا...میری صحت یابی کے لئے ہی تو...میرا شوہر، میرا پیارا شوہر، میرا اپنا جان...کتنا، چاہتا ہے مجھے۔ کس قدر پریشان ہے میرے لئے۔ اور میں ہوں کہ جب نہ تب لڑ پڑتی ہوں اس سے۔ غصہ مجھے اس پر تھوڑا ہی آتا ہے۔ اپنی حالت پر آتا ہے اور اس بات پر آتا ہے کہ آخر وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔ ہر وقت میری نگرانی...جولیا اور ہنری سے ملنے تک نہیں جا سکتی۔ کتنی بار کہا مگر سنتا ہی نہیں۔ کہتا ہے میں بہت کمزور ہوں اور بیمار ہو جاؤں گی۔ میری کہاں چلتی ہے اس کے آگے...بس رو پڑتی ہوں...کیسے بگڑ گئے ہیں میرے اعصاب! ذرا بھی قابو نہیں رہتا مجھے اپنے آپ پر۔ بے چارا جان! میرا رونا وہ سہہ ہی نہیں سکتا۔ کیسے بانہوں میں سمیٹ کے اٹھا لیا۔ تکیہ وکیہ لگا کے آرام سے لٹایا۔ سر سہلا سہلا کے سلانے کی کوشش کرتا رہا...کہتا رہا۔ کہتا ہی رہا۔ بار بار کہتا رہا کہ میں اس کی زندگی ہوں اس کا سرمایۂ حیات ہوں اس کے دل کی ٹھنڈک ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ اپنے مرض کا علاج تو صرف میرے پاس ہے۔ مجھے ہی اپنے اندر چھپی طاقت کو ڈھونڈ نکالنا ہوگا۔ یہ جو بے کار کے واہمے بھرے بیٹھی ہوں اپنے دماغ میں، ان سے مجھے میرے سوا کوئی نجات نہیں

دے سکتا... ٹھیک ہے۔ مگر مجھے کوئی بتائے تو سہی کہ میں یہ کیسے کروں۔ میں کب چاہتی ہوں بیمار پڑے رہنا... کوئی نہیں چاہتا... خدا کا شکر، ہزار ہزار شکر کہ میرا بچہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے محفوظ ہے! ان دیواری کاغذوں کی زد میں نہیں ہے۔ یہاں رہتا تو... سوچ کے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں... یہ تو میں ہوں جو برداشت کر رہی ہوں۔ وہ کیسے سہہ سکتا تھا... نازک پھول سا میرا بچہ...! روشنی بدلتے ہی یہ نقش و نگار کیا سے کیا بن جاتے ہیں، یہ میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور میں کسی کو کبھی معلوم ہونے بھی نہ دوں گی۔ روز بروز کیسے نمایاں ہوتے چلے جا رہے ہیں!... یہ ان کے اندر چھپے ہیولے ہیں کہ جاندار روحیں! ہیئت تو ان کی جیسی تھی ویسی ہی ہے مگر مقدار بہت بڑھ گئی ہے۔ اتنی کہ میں اب انہیں گن بھی نہیں پاتی... اور یہ ہیولے! کم بخت... بالکل ایسا لگتا ہے جیسے عورتیں رینگتی پھر رہی ہیں... اپنا سر اوندھائے... اُف!... ناقابلِ برداشت ہے یہ سب کچھ!... کاش جان میری بات مان لے اور مجھے یہاں سے کہیں اور لے چلے...

*** *** *** ***

میں جانتی تھی کہ جان سے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں، مگر اور کس سے کہوں... اس کے سوا کون ہے اتنی صلاحیت والا... اور پھر اتنا چاہتا ہے مجھے... اسی لئے اس سے کہہ ہی بیٹھی۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دن کے سورج کی طرح چاند بھی عادتاً اپنی کرنیں بکھیرے جا رہا تھا... کبھی کبھی کتنی بری لگتی ہے یہ چاندنی! گھسی چلی آتی ہے کمرے میں دراتی ہوئی۔ کبھی اس کھڑکی سے کبھی اس کھڑکی سے... جان سوئے چلا جا رہا تھا اور میں اسے جگا کے سب کچھ اسے بتا دینے کی ہمت بٹورنے میں لگی ہوئی تھی دیواری کاغذوں پر نظر جمائے۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے... وال پیپر میں حرکت ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کے اندر سے نکلنے کے لئے مچل رہا ہو... پہلے تو میں بے حس و حرکت پڑی دیکھتی رہی پھر ہمت کر کے اٹھی اور پاس جا کے دیکھنے لگی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ناکام لوٹی تو جان جاگ پڑا...

''جانم! کیا ہوا... اس طرح کیوں پھر رہی ہو؟ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''... اس نے کہا تو میں نے دل پکا کر کے سب کچھ اسے بتا دیا۔ سب کچھ! اور اس سے التجا کی کہ اس سے پہلے کہ کوئی ان ہونی ہو جائے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ''یہاں رہ کر میں ٹھیک نہیں ہو سکتی۔'' میں نے اس سے کہا اور بار بار کہتی رہی... مگر جان کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ وہ کہنے لگا ''بالکل پاگل ہو۔ چلے جائیں؟ کیسے چلے جائیں؟ ابھی کرائے کی مدت باقی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں جو میرا کام ہے ادھورا ہے۔ تم جو کہہ رہی ہو، خدانخواستہ سچ ہوتا تو اور بات تھی... ارے بھائی میں ڈاکٹر ہوں مجھے معلوم ہے کہ یہاں تمہاری صحت بہتر ہو رہی ہے۔ رنگت نکھر آئی ہے۔ جسم بھرنے لگا ہے۔ بھوک بھی بڑھ گئی ہے... خوامخواہ کے وہم کرتی ہو... حد ہے!''

''ذرا بھی نہیں۔'' میں نے احتجاجاً کہنا شروع کیا۔ ''ذرا بھی نہیں بڑھا ہے میرا وزن۔ کھانا تو میں صرف تمہاری خاطر کھا لیتی ہوں تمہارا دل رکھنے کو...''

''خدایا! اس عورت کو تھوڑی سی عقل تو دے دی ہوتی!'' اس نے ہنس کے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ''اپنی مرضی سے جب چاہے، جتنا چاہے اپنے آپ کو بیمار کر لیتی ہے! اچھا ایسا کرتے ہیں، ابھی سو جاتے ہیں۔ صبح کریں گے باتیں!''

''تو... نہیں جائیں گے...؟'' میں نے ڈوبتے دل سے مردہ آواز میں پوچھا تو کہنے لگا۔ ''کیسے جائیں ڈارلنگ! کیسے جا سکتے ہیں۔ صرف تین ہفتے رہ گئے ہیں یہاں کی مدت ختم ہونے میں... اتنے دن صبر کر لو... اس کے بعد چلیں گے۔ میں لے چلوں گا تمہیں پہاڑوں پر۔ تب تک ہمارے گھر کی مرمت کا کام بھی ختم ہو جائے گا۔ جینی سب صاف صفائی کروا لے گی تب ہی تو جا سکتے ہیں... مگر تم میری بات کا یقین کرو۔ یہاں رہ کر تمہاری صحت یقینی طور پر سدھر رہی ہے...''

''ہاں... جسمانی طور پر شاید... مگر...'' میں نے کہنا ہی شروع کیا تھا کہ ایک دم سے میری آواز بند ہو گئی۔ جان نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مجھ میں آگے کچھ کہنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی۔

''میری جان!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''خدا کے لئے... میرے لئے... ہمارے بچے کے لئے... یقین کرو یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں اعصاب کی کمزوری کے مریض کے ساتھ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں... میرے ڈاکٹر ہونے پر تو تمہیں کوئی شک نہیں؟ یا ہے؟''

اب کیا کروں چپ نہ ہو جاؤں تو۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ مجھے سوتی سمجھ کے وہ بھی سو گیا۔ میری آنکھوں میں تو وال پیپر کی ہلچل بھری تھی۔ نیند کیسے آتی۔ ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزر گئی کہ کون ہلا رہا تھا وال پیپر کو! اوپر والے نقش و نگار، یا وہ جو ان کے اندر دبے پڑے ہیں؟ یا پھر دونوں؟ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے؟ یہ گھناؤنا رنگ روغن، یہ جان لیوا قماش!... ٹھیک تب جب آپ کو لگنے لگتا ہے کہ آپ انہیں سمجھنے لگے ہیں یہ ایسا بن جاتا ہے کہ آپ کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ یہ جان کر کہ نہیں آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ اور آپ اپنا سر پکڑ کے بیٹھ جاتے ہیں اور یہ بات آپ کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیتی ہے کہ آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم... یہ اقلیدسی قماش والی گل کاریاں... جگہ جگہ سے پھوٹتی ہوئی کُکرمتے کی طرح لامتناہی سلسلے میں پھیلی ہوئی پیچ در پیچ... کوئی بھی اور چھور ہے ہی نہیں... ناقابلِ یقین سرعت کے ساتھ روشنی بدلتے ہی کس طرح

تبدیل ہو جاتی ہیں!...یہ تو صرف میں ہی دیکھ سکتی ہوں۔ تبھی تو ہر وقت ان پر نظر رکھنی ہوتی ہے مجھے۔ چاندنی، رات بھر اس کمرے میں بھری رہتی ہے اور کیا کیا دکھاتی ہے مجھے! ناقابلِ یقین!! روشنی، کسی بھی طرح کی کیوں نہ ہو، شفق کی، چراغ کی، موم بتی کی، خاص طور پر چاند کی، وال پیپر پر پڑتے ہی اوپر کا پیٹرن سلاخیں بن جاتا ہے۔ مضبوطی سے جڑی ہوئی سلاخیں۔ مگر ایسا صرف اوپری قماش کے ساتھ ہوتا ہے۔ اندر جو عورت ہے وہ ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ پہلے مجھے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا کہ آخر ان سلاخوں کے پیچھے جو دکھائی دیتا ہے وہ دراصل کیا ہے؟ لیکن اب مجھے یقین ہے۔ پورا یقین۔ کہ یہ اور کچھ نہیں کوئی عورت ہے۔ دن کی روشنی میں چپ چاپ پڑی رہتی ہے گردن ڈالے... وہ بھی کیا کر سکتی ہے اس کے سوا... پیٹرن ہی ایسا بنایا گیا ہے۔! اس معمائی قماش میں الجھی گھنٹوں پڑی رہتی ہوں اور جان سمجھتا ہے کہ میں آرام کر رہی ہوں۔ اور بہت خوش ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ چپ چاپ پڑے رہنا میرے لئے مفید ہے اور سوتی رہوں تو اور اچھا۔ کہتا ہے کہ کھانے کے بعد سو لیا کرو۔ مجھے کھانے کے بعد سونا بالکل پسند نہیں۔ کتنی بری بات ہے! اگر میں سوئی ہوئی نہیں ہوں اس کا پتا کسی کو نہیں لگنے دیتی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں جان سے بہت ڈرتی ہوں۔ ہمیشہ ہی ڈرتی ہوں مگر ان دنوں کچھ زیادہ ہی... کیسا عجیب سا ہوتا جا رہا ہے ان دنوں وہ! اور وہ کیوں جینی بھی!... ہو نہ ہو وہ بھی ان وال پیپرز کے اثر میں آ گئے ہیں۔ کئی بار میں نے خود دیکھا ہے جان کو ان کاغذوں کو گھورتے ہوئے!... اور جینی! وہ تو اس دن ان پر ہاتھ بھی پھیر رہی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اور جب میں نے پوچھ لیا ڈانٹ کر کہ کیا کر رہی ہے، تو خفا ہو گئی۔ پھر کہنے لگی کہ وہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ ان کاغذوں سے رنگ تو نہیں چھوٹتا۔ "آپ کے کپڑوں پر پیلا پیلا رنگ لگا ملتا ہے۔ جب میں کپڑے دھوتی ہوں۔" اس نے کہا۔ پھر بولی۔ "ان دیواری کاغذوں سے بچ کے چلا کریں۔ ان کا رنگ لگ جاتا ہے۔" بکواس! مجھے بیوقوف بنا رہی تھی! بڑی آئی ان کا بھید جاننے والی۔ میں کسی کو پتہ چلانے ہی نہیں دوں گی۔ کوئی کبھی نہیں جانے گا کہ دراصل یہ کیا ہیں۔ میرے سوا!

*** *** ***

یقیناً میری صحت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔ سب کچھ اچھا اچھا لگنے لگا ہے۔ زندگی پہلے سے کہیں زیادہ متحرک نظر آنے لگی ہے۔ میرا حوصلہ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ پہلے کی نسبت زیادہ پر سکون بھی رہنے لگی ہوں۔ اچھی طرح کھانے پینے بھی لگی ہوں۔ جان بہت خوش ہو رہا ہے۔ ہنس کے کہنے لگا "پھولوں کی طرح کھل رہی ہو۔ ان دیواری کاغذوں کے باوجود!" میں بھی ہنس پڑی۔ بے چارہ! اسے کیا پتا کہ ان وال پیپرز کی وجہ سے ہی... مگر میں

اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنے والی۔ اپنا مضحکہ اڑانے کا موقع کیوں دوں کسی کو۔ جان کو بتاؤں تو شاید مجھے وہ یہاں رہنے ہی نہ دے۔ اب تو میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ اپنی تفتیش پوری ہونے تک تو بالکل نہیں! یہاں کی مدت کا ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ ایک ہفتہ! کافی ہے!

*** *** ***

میری طبیعت اور بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ اب میں رات کو بالکل نہیں سوتی۔ دن بھر جو سوتی رہتی ہوں! کیوں نہ سوؤں، دن میں کچھ کرنے کو ہے ہی نہیں... لگر متوں کی نئی نئی شاخیں پھوٹتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ مسلسل!... اور یہ پیلا رنگ! کتنی طرح کے رنگ دکھانے لگا ہے۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا۔ انہیں پہچاننے اور شمار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ کیے جا رہی ہوں کتنا عجیب رنگ ہے! اسے دیکھ کر سورج مکھی یا چمپا کا تو خیال ہی نہیں آتا۔ یاد آتی ہیں تو صرف گندی غلیظ، گھناؤنی چیزیں۔ اور تو اور یہ رنگ اب بُو بھی دینے لگے ہیں۔ عجیب وغریب سی مہک! ویسے اس بو کا احساس تو مجھے اس گھر میں داخل ہوتے ہی ہوا تھا مگر تب میں نے اس پر کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کمرے میں اتنی ہوا اور دھوپ ہوتی ہے اڑ جاتی ہو گی یہ بو ان کے ساتھ... مگر پچھلے دنوں ایک ہفتے کی بارش اور دھند کی وجہ سے کھڑکیاں بند رہیں تبھی یہ مہک ایک دم سے بڑھ گئی۔ جگہ جگہ سے پھوٹتی ہوئی۔ نہ صرف اس کمرے میں بلکہ سارے گھر میں گھومتی پھر رہی ہے۔ ڈرائنگ روم میں منڈلاتی، برآمدے میں بھنبھناتی، سیڑھیوں پر، مجھے اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے کھڑی مل جاتی ہے۔ اب تو میرے اپنے بالوں سے نکلنے لگی ہے۔ میرے کپڑوں میں گھسی جا رہی ہے۔ کس قدر واہیات اور عجیب ہے یہ مہک! اس بدلے ہوئے موسم میں تو ناقابلِ برداشت ہوئی جا رہی ہے۔ رات کو سوتے سوتے جگا دیتی ہے۔ جھنجھوڑ کے اٹھا دیتی ہے مجھے۔ شروع شروع میں تو اس نے مجھے اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ جی میں آتا تھا کہ آگ ہی لگا دوں اس گھر کو۔ مگر اب اس کی بھی عادی ہوتی جا رہی ہوں... وال پیپرز کے رنگ کی طرح یہ مہک بھی پیلی ہے... گھناؤنی پیلی!... اور وہ بے مطلب سا ایک داغ! جو نیچے کی طرف پڑا ہوا ہے دیوار پر! نیچے کو سرکتا ہی چلا جاتا ہے... بدتمیزی سے ہر گوشے گوشے کو چھیڑتا، چومتا... پتا نہیں یہ داغ کیسے پڑ گیا یہاں اور کیوں۔ مگر ہے! گول گول دائروں میں گھومتا... اسے غور سے دیکھتی رہوں تو میرا سر چکرانے لگتا ہے...

*** *** ***

معلوم ہو گیا... ہاں مجھے معلوم ہو گیا... حرکت... صرف اوپری قماش میں ہوتی ہے!... رات رات بھر جاگنے کا صلہ مل گیا۔ ہاں! یہ ہلچل صرف اسی ڈیزائن میں ہوتی ہے جو روشنی پڑتے ہی سلاخوں کی صورت اختیار کر لیتا

ہے...وہی خطوط ملتے ہیں زور زور سے...اور کیوں نہ ملیں...ان کے پیچھے جو عورت پڑی ہے، وہ جھنجھوڑتی رہتی ہے انہیں...!اور اس میں وہ ہمیشہ اکیلی نہیں ہوتی اس کے ساتھ اور عورتیں بھی آجاتی ہیں...ان ہی کے تیز تیز رینگنے کی کوشش میں وال پیپر ڈانواں ڈول ہونے لگتا ہے...روشن جگہوں پر ان کا یہ عمل دھیرے دھیرے ہوتا ہے مگر جیسے ہی مدھم مقام آتے ہیں وہ ان سلاخوں کو زور زور سے ہلانے لگ جاتی ہیں۔ سلاخوں پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہیں...کتنی بے وقوف ہیں! بھلا پیٹرن سے کوئی نکل سکا ہے کبھی! سلاخوں میں پھنسالیں گی اپنے سر اور کیا۔ پھر دم گھٹ جائے گا ان کا...اچھا!...تبھی!...تبھی جہاں تہاں پڑی ہیں یہ لڑھکی گردنیں! پھٹی پھٹی سفید آنکھوں والے یہ ڈھلکے ہوئے سر!... پیٹرن کی وجہ سے ہی تو...مگر انہیں اس طرح دکھانے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں چھپا کے بھی تو رکھا جاسکتا تھا! روغن کے استعمال سے چھپا کے انہیں؟ ایسے یہ کتنے ڈراؤنے لگتے ہیں!...

... ...

میرا خیال ہے کہ دن کو یہ عورت پینٹنگ سے باہر نکل جاتی ہے۔ کیسے پتا چلا مجھے؟ میں نے دیکھا اور کیا! جی نہیں۔ مجھے کوئی مغالطہ نہیں ہوا ہے۔ وہی ہے! اور کون اس طرح رینگ سکتا ہے اس کے سوا؟ عام طور پر عورتیں دن میں کبھی نہیں رینگتیں۔ اور وہ! صاف نظر آتی ہے رینگتی ہوئی سامنے سڑک پر۔ کوئی گاڑی آتی نظر آئے تو جھاڑیوں میں چھپ جاتی ہے۔ چھپے نہیں تو کیا کرے؟ عورتیں بھلا دن میں رینگتی ہیں کہیں؟ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا...میں تو دروازہ بند کرلیتی ہوں...رینگتے وقت!...کیا کروں۔ مجھے تو دن میں ہی رینگنا پڑتا ہے۔ رات میرے ساتھ جان ہوتا ہے نا! ویسے بھی اس کا رویہ میری طرف سے عجیب ہوتا جارہا ہے ان دنوں۔ بات بات پہ چڑھ جاتا ہے...وہ کسی دوسرے کمرے میں سوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کہیں کسی رات اس نے بھی دیکھ لیا ان عورتوں کو تو؟ نہیں دیکھنا چاہئے! کسی کو نہیں دیکھنا چاہئے انہیں۔ میرے سوا! وہ جو نظر آتی ہے۔ ساری کھڑکیوں سے۔ ایک ساتھ کیسے دیکھوں اسے؟ بجلی کی تیزی سے بھی لپک کر دوسری کھڑکی تک پہنچوں، وہ آگے سرک جاتی ہے۔ اس جیسی پھرتی کہاں ہے میرے پاس!...باہر کھلی فضا میں ہواؤں کے دوش پر بادلوں کی طرح پھرتے اسے بس دیکھا کروں، اس کے سوا میں اور کر ہی کیا سکتی ہوں۔

... ...

اب نکالنے ہی پڑیں گے مجھے۔ ان کاغذوں کے نیچے دبا کے رکھے گئے یہ نقش و نگار!۔ نکالنے ہی ہوں گے...اپنی طرف سے کوشش تو میں کر رہی ہوں...کئے ہی چلی جارہی ہوں...ایک نئی بات اور مجھے معلوم ہوگئی ہے مگر بتاؤں گی نہیں۔ ہر بات بتا دینے والی تھوڑی ہی ہوتی ہے۔ کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ سب کچھ مجھے جلد از جلد کرلینا چاہئے...ان دنوں جان میری طرف سے کچھ مشکوک نظر آنے لگا ہے...جس طرح سے وہ مجھے دیکھتا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ جینی سے بھی پوچھ کچھ کررہا تھا پورا ڈاکٹر بن کے! جینی غریب کیا بتاتی بھلا۔ دن بھر مجھے آرام سے سوتی دیکھتی ہے...مگر جان تو مجھے خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں راتوں کو جاگتی پڑی رہتی ہوں سونے کا بہانہ کرکے...پھر مجھ سے بھی سوال کرنے لگا...سوال پر سوال!... بڑی محبت سے۔ پیار جتا جتا کے...کیسا ہوشیار بنتا ہے! جیسے میں تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ مگر وہ بھی کیا کرے۔ تین مہینوں سے لگا تار وہ بھی تو سو رہا ہے...ان دیواری کاغذوں کے بیچ!...ان کاغذ کی زہر ناکیوں کا علم کہاں ہے اسے...ان کے بارے میں نہ جان کچھ جانتا ہے نہ جینی ...صرف میں جانتی ہوں۔ صرف میں!!

... ...

اہا...آگیا...یہاں کا آخری دن! آگیا...جان رات کو باہر رہے گا اور کل بھی شام سے پہلے لوٹنے والا نہیں ہے...جینی میرے کمرے میں سونے کو کہہ رہی تھی مگر میں نے اس سے کہہ دیا...مجھے ڈسٹرب نہیں کرے۔ مجھے رات کو تنہا سونا اچھا لگے گا...اسے یہ کیسے بتاتی کہ میں اس کمرے میں تنہا کبھی رہتی ہی نہیں...ہا!...اب کرنا ہے مجھے...بہت کچھ کرنا ہے...

... ...

جیسے ہی چاندنی بڑھنے لگی اندر والی ناتواں جدوجہد شروع ہوگئی۔ زور زور سے رینگنا! سلاخوں کو ہلانا، اور ہلائے ہی چلے جانا۔ میں ان کی مدد کو فوراً لپک پڑی اندر سے وہ ہلائیں باہر سے میں کھینچوں۔ صبح ہوتے ہوتے ہم نے مل کر گزوں وال پیپر نکال ڈالے۔ وہ دیکھو!...آدھا کمرا ابھر گیا ان سے!... پڑے ہوئے ہیں مگر ہنسے جارہے ہیں!...ہذیانی انداز میں... پاگلوں کی طرح! ہنسو ہنسو...خوب ہنسو! میں نے بھی تہیہ کرلیا ہے۔ آج تو مجھے یہ کام انجام دے ہی دینا ہے...اب کمرے میں سورج کی پہلی کرنیں داخل ہو رہی ہیں...کل ہماری روانگی ہے...آج سارا سامان بھیج دیا جائے گا...یہ کمرہ خالی کردیا جائے گا...اس لئے...مجھے اپنا کام آج ہی کرنا ہوگا...آج ہی!

جینی کمرے میں داخل ہوئی تو حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ یہ کیا کر ڈالا میں نے!...مگر میں نے اسے سمجھا دیا۔ اس کو بتایا کہ رات کو مجھے بے حد غصہ آرہا تھا۔ وہ غصہ میں نے ان کاغذوں پر اتار دیا ہے...وہ میری بات سن کے ہنس پڑی کہنے لگی۔ "ہاں بی بی جی۔ غصہ ٹھنڈا کرنے کا اچھا طریقہ ڈھونڈا آپ نے جو ان کاغذوں پر نکال لیا۔ مگر اس طرح اپنے آپ کو ہلکان نہیں کرنا تھا... مجھے بلا لیا ہوتا...میں کردیتی آپ کی مدد..." دیکھا! کیسے آگئی اس کے دل کی بات اس

کے منہ پر!... کتنی مکار ہے!... جیسے میں اسے ہاتھ لگانے ہی تو دوں گی!... مجھے نیچے لے جانے کی کوشش کر رہی تھی... مگر میں نے ایک نہیں سنی اس کی... صاف کہہ دیا کہ یہ کمرہ اب اتنا صاف ستھرا ہو گیا ہے کہ آج تو میں یہیں رہوں گی...... سوؤں گی لمبی تان کے!... خبردار جو مجھے جگانے کی کوشش کی۔ کھانے کے لئے بھی نہیں... "جب میری آنکھ کھلے گی میں خود بلا لوں گی تمہیں۔"...

جینی ہار کے چلی گئی... دوسرے ملازم بھی گھر سے جا چکے ہیں۔ سامان نیچے پہنچایا جا چکا ہے۔ کمرے میں اب کچھ نہیں ہے اس مسہری کے سوا۔ اور اس کاگدا۔ جو اس سے چپکا پڑا ہے۔ کمرہ خالی ہو کر کتنا اچھا لگ رہا ہے! خالی کمرے میں تو دوڑتے پھرتے ہوں گے وہ بچے! گول گول گھومتے ہوں گے پھرکیاں لے لے کے!... اُف!... کیسی کائی پٹی ہوئی ہے... یہ مسہری!... جیسے دانتوں سے نوچی گئی ہو... اب مجھے لگ جانا چاہئے اپنے کام سے...

دروازہ بند کر کے میں نے چابی باہر پھینک دی ہے۔ کون سا اب باہر نکلنا ہے مجھے۔ جان کے آنے سے پہلے یہاں کسی کو اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں آنے ہی نہیں دوں گی... جان آ کے دیکھے گا تو حیران کھڑا کا کھڑا رہ جائے گا... اسے حیران، ششدر دیکھنا چاہتی ہوں میں!...

وہ رسی جو میں نے سب سے چھپا کے یہاں رکھی تھی باہر نکال لی ہے۔ وہ عورت باہر نکل کے بھاگنے پر آمادہ ہو گئی تو؟ باندھ کے رکھ دوں گی اسے! ارے اب کیا کروں... سب سامان تو چلا گیا... یہاں ایسی کوئی چیز تو رہی نہیں جس پر چڑھ کر اونچائی تک پہنچا جا سکے... مسہری!... مگر یہ کمبخت تو فرش پر جمی پڑی ہے۔ اسے تو میں ہلا بھی نہیں سکتی... اُف... کم بخت! ٹس سے مس نہیں ہو رہی ہے اپنی جگہ سے... میں اس کی کھینچا تانی کرتے کرتے لنگڑانے لگی ہوں ایک بار تو مشتعل ہو کر اسے کاٹ بھی کھایا... مگر کیا فائدہ ہوا... الٹے میرے دانت کڑک کے رہ گئے... فرش پر کھڑے کھڑے جتنے کاغذ میں نکال سکتی تھی۔ اکھاڑ ڈالے ہیں۔ پھر بھی کتنا سارا لپٹا پڑا ہے اکھیڑنے کو!... پیٹرن! ڈھیٹ کہیں کا! میری حالت دیکھ کے کیسے مزے لے رہا ہے!... قہقہے لگا رہی ہیں مجھ پر، اس کی ساری ڈھلکی ہوئی لڑھکی گردنیں، ابلی ابلی آنکھوں والی! اور ان پر جمی کبھی کائی!... استہزائی انداز میں ہنسے جا رہی ہیں... کس قدر اشتعال انگیز ہے... یہ سب کچھ!... میرا غصہ اب اپنی حدوں سے نکلنے لگا ہے۔ کچھ نہ کچھ کر بیٹھوں گی میں! مگر کیا کروں؟... کھڑکی سے باہر کود جاؤں؟ نہیں... نہیں کود سکتی...؟ ان پر سلاخیں بہت مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں۔ میں تھوڑا ہی توڑ پاؤں گی انہیں... اس کے علاوہ... یہ کرنا صحیح بھی تو نہیں ہوگا... لوگ کیا کہیں گے... لوگوں کا کیا ہے... کچھ بھی سوچ لیتے ہیں، کچھ بھی کہہ دیتے ہیں... کھڑکی کی طرف مجھے دیکھنا بھی نہیں... باہر کتنی تعداد میں جمع ہو گئی ہیں... عورتیں!... اور کتنی تیزی سے رینگنے میں لگی ہوئی ہیں!... دیواری کاغذ سے نکل کے آئی ہیں... میری طرح!... مگر... میں نہیں رینگ رہی ہوں ان کے ساتھ... نہ ہی اس بھیڑ میں شامل ہوں... ہو ہی نہیں سکتی... میں نے تو باندھ لیا ہے مضبوط رسی سے اپنے آپ کو... اسی لئے تو چھپا کے رکھی تھی اتنے دنوں سے... اب کیا کروں؟ کیا رات کو واپس چلی جاؤں؟... اس پیٹرن میں؟... دیوار سے چپکا منتظر نگاہوں سے تکے ہی چلا رہا ہے مجھے... کم بخت!... کتنا اچھا لگ رہا ہے اس کشادہ کمرے کا خالی پن!... پیٹرن سے باہر اپنی مرضی سے رینگنا!... اب نہیں نکلنے والی میں اس کمرے سے... قطعی طور پر نہیں... جینی کی ایسی کی تیسی!... کمرے سے باہر نکل گئی تو زمین پر رینگنا پڑے گا کہ نہیں؟... زمین!... جہاں ذرا بھی پیلا نہیں، سب ہرا ہرا ملتا ہے... مگر زمین... سخت ہوتی ہے... یہاں اس فرش پر۔ اس چکنے فرش پر رینگنا کتنی آسانی سے عمل میں آ رہا ہے... اور دیوار کے حصار میں ہونے کے باعث کوئی اندیشہ نہیں کہ راستہ بھول جاؤں گی...

اچھا...! لو، آ گیا جان... زور زور سے آوازیں لگا رہا ہے، پیٹے جا رہا ہے دروازہ... ہم نہیں کھولیں گے... بے کار کیوں چلا رہے ہو... لو... اب کلہاڑی منگوا رہا ہے... چچ چچ... اتنا اچھا دروازہ!... توڑ ڈالے گا؟...

"جان... مائی ڈیر جان" میں بے حد پرسکون اور بہت ہی میٹھے لہجے میں کہہ رہی ہوں "چابی باہر پڑی ہے۔ وہاں سیڑھی پر... پتوں کے نیچے..."

میری آواز سن کر جان ٹھٹھک گیا ہے۔ اب بڑی نرماہٹ بھری آواز میں بڑے پیار سے کہنے لگا ہے... "دروازہ کھول دو جانم!... دراوزہ کھول دو۔"

"میں نہیں کھول سکتی..." میں جواب دے رہی ہوں "جاؤ... سامنے پڑی ہے پتوں میں چابی۔" اور میں یہ کہے ہی چلی جا رہی ہوں۔ بار بار... اتنی بار کہ اسے جا کے لانی ہی پڑی... اب وہ دروازہ کھول رہا ہے... دیکھو... دیکھو... کیسا ٹھٹھکا کھڑا رہ گیا!" خدا کے لئے... کیا کر رہی ہو... کیا ہو گیا ہے تمہیں..." وہ پاگلوں کی چیخ رہا ہے... اور میں... سنی، ان سنی کئے رینگے ہی چلی جا رہی ہوں... رینگتی ہی جا رہی ہوں... صرف ایک بار گردن گھما کے اس کی طرف دیکھا تھا یہ کہنے کے لئے کہ آخر کار! میں آ ہی گئی نا باہر... تمہاری اور جینی کی تمام تر کوششوں کے باوجود! اکھیڑ ڈالا ہے میں نے... سارا کاغذ... اب دیکھوں کیسے ڈالتے ہو تم مجھے اس کے پیچھے... اب کیسے ڈالو گے..."

کیا بے وقوف آدمی ہے!... اب اسے کیا ہوا... بے ہوش ہو کے گر گیا ہے... وہ بھی ٹھیک میرے راستہ میں دیوار کے پاس... بھلا بتائیے... اپنے رینگنے کا عمل جاری رکھنے کے لئے مجھے اس کے بدن کے اوپر سے گزرنا پڑے گا کہ نہیں؟... OO

بابِ نظم

ڈاکٹر وزیر آغا

کی نذر

وزیر آغا

لا شے

وہ شے جو فقط لامسہ تھی
عجب لج لجے پن کی مظہر
وہ بس ایک ہی تند خواہش میں
لتھڑی پڑی تھی
کہ "لا شے" بنے
اور بجلی کے کوندے کی صورت
کڑکتی پھرے
اور چھڑکتی پھرے آگ
ساری زمیں پر
وہ شے منقلب ہو کے "لا شے" میں
اب سامنے آچکی ہے
تجھے اس کے آنے کی شاید
خبر ہی نہیں ہے!

کھلونے

کھلونے ہی کھلونے ہیں
کبھی بچوں کے ہاتھوں میں
کبھی بچوں کی صورت میں

کبھی جب ڈور مالا کی
معاً دولخت ہوتی ہے
تو لمحے، دانہ دانہ دور تک
ہر سو بکھرتے ہیں
زماں کو دائرے کی قید سے آزاد کرتے ہیں
منور کہکشاں کے طشت میں
گھی کے دیے بن کر نکلتے ہیں
معطر روشنی تقسیم کرتے ہیں

کھلونے ہی کھلونے ہیں
دیے، لمحے، پتنگے، سرخ تارے
ابر کی قاشیں
تری آنکھوں کے اندر پتلیوں کا رقص
میرے دل میں پاگل دھڑکنوں کا شور
کیسا کھیل ہے نت کھٹ کھلونوں کا

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
زمیں اور آسماں میں فاصلہ باقی نہیں رہتا
تو یوں لگتا ہے جیسے
ہست... اک ٹوٹا کھلونا ہے
سجا کر میں جسے، اپنی ہتھیلی پر
دکھاتا پھر رہا ہوں
نیستی کی بند آنکھوں کو

رفعت سروش

پگھل گیا نیلم

ڈھلا تھا وقت کی ٹکسال میں عجب سکہ
رُبل، نہ پونڈ، نہ ڈالر، نہ یان اور نہ ریال
نہ تھا کوئی بھی مقابل وہ بیش قیمت تھا
نہ سیم وزر نہ جواہر اسے خرید سکے
مگر وہ مفت میسر تھا کام گاروں کو
کسان اس کو لگاتے تھے اپنے سینے سے
سخن وروں میں وہ رائج تھا اور بہت مقبول
ہوا جو وقت کی بدلی وہ چلتے چلتے رکا
پھر احترام سے وہ میوزیم میں رکھا گیا
اور ایک دن چلی آندھی جو حرص ولالچ کی
چرا کے لے گئے اس کو ادب کے ٹھیکے دار
اب اپنی منڈی میں کرتے ہیں روز اسے نیلام
اور اپنی جیبوں میں بھرتے ہیں شہرت و دولت
مگر پسند نہیں اس کو اپنا استحصال
وہ آب دیدہ ہے جیسے پگھل گیا نیلم

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

رش ت ا

اک رسی کو ہاتھ میں پکڑے
ڈانواڈول سے... سرک سرک کر
ہم اس کے آخر تک جاکر
دم لینے کی حامی بھرتے ہیں
اک اک لمحہ
رک رک کر، ہم احتیاط سے
انچ انچ آگے بڑھتے ہیں
ہاتھوں سے رسی کو مضبوطی سے تھامے
رہتے سانسوں کی دوری تک
رسی کی لمبائی طے کرتے کرتے ہم
خود بھی رسی بن جاتے ہیں
لیکن میں اک مختلف مخلوق ہوں شاید
مجھ کو پتہ ہے

ہر رسی کے آخر میں اک
پھانسی کا پھندا ہوتا ہے
اس رسی کو
برسوں سے پکڑے پکڑے میں آگے بڑھتا
شاید اس پھندے تک آخر پہنچ گیا ہوں
دیکھنا یہ ہے
کب میں پھندا اپنے گلے میں
ڈال کے مضبوطی سے رسی کو کس دوں گا
رسی، رشتہ
تیرا میرا
رشتہ... رش ت ا
کب میری گردن کے گھٹ جانے سے پہلے
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا!

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

گرداب

ساٹھ برس کی عمر سے جیسے پاؤں پلٹ کر
پیچھے کی جانب لوٹا، تو
آٹھ برس کا ننھا بچہ
ڈر کے مارے چیخ اٹھا
...''ماں'' مجھے بچاؤ
میں دریا میں ڈوب رہا ہوں!
اس کے چاروں سمت بھنور تھے
لہروں کا ایک جال بچھا تھا
اٹھتے، بڑھتے، چکر کھاتے،
گردابوں میں گھرا ہوا تھا
ہاتھ پاؤں میں سکت نہیں تھی

سر پانی سے اوپر رکھنا
اک دو سانس برابر لینا
آٹھ برس کے بچے کو مشکل لگتا تھا
پھر اک بار ابھر کر پانی سے اوپر آیا
تو زور سے چیخا
''او ماں میری، مجھے بچاؤ
میں دریا میں ڈوب رہا ہوں!!''
تند بپھرتے دریا کی لہریں،
جیسے کچھ شانت ہوئیں، تو

اس کو یوں محسوس ہوا، جیسے پانی نے
اپنے جھاگ کی نرمی سے
اس کے گالوں کو سہلایا ہو
سر ماتھے کو چوم لیا ہو
جیسے لہروں کے سرگم نے
ماں کی لوری سی، آواز میں تھپکی دی ہو
''سو جاؤ! لہروں کے نیچے گم ہو جاؤ!''
پاؤں پلٹ کر پھر لوٹا، تو
اس کے بوڑھے چہرے پر ڈر کے سائے کو
نور کی چادر ڈھانپ چکی تھی
سانس کا سرگم ٹوٹ چکا تھا

پرتپال سنگھ بیتاب

میرا ایک اپنا روپ ہے تو سہی

میں بہروپیا نہیں ہوں مگر پھر بھی
ہر صبح ایک نیا روپ بنا کر نکلتا ہوں
اور پھر قدم قدم پر
نئے سے نئے روپ دھار لیتا ہوں
شام تک کئی کئی بھیس بدل کر
اس رنگی برنگی دنیا میں
کسی نہ کسی طرح گذارہ کرتا ہوں
ہاں یہ تمام روپ دھارتے ہوئے
مجھے یہ احساس بھی رہتا ہے
کہ میرا اصل روپ تو کچھ اور ہی ہے
جو میرے اندر ہی اندر رہتا ہے
اور جو میں کسی کو دکھاتا ہی نہیں
یا شاید میرے اس روپ کو
کوئی دیکھنا ہی نہیں چاہتا
لہٰذا میں دنیا کو اپنے وہی روپ دکھاتا ہوں
جو دراصل میرے نہیں ہیں
لیکن اس سب کے بیچ
اس سب سے الگ
میرا ایک اپنا روپ ہے تو سہی

ابھی تو میں زندہ ہوں

حیات و کائنات سے سبک دوش ہو کر
میں اپنی قبر میں پچک گیا ہوں
کار دراز میں اتنے آرام کی فرصت کہاں تھی
عادت کہاں تھی
لہٰذا کوفت اور بوریت سے اکتایا ہوا
تنگ آیا ہوا کبھی کبھار صبح ہوتے ہی
اپنی قبر سے باہر نکل آتا ہوں
اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے جہان میں
خواہ مخواہ گھس جاتا ہوں
کل تک جو میرے رفقائے کار تھے
ان سے مل ملا کر
اپنے آپ کو زندہ و جاوید
سمجھنے کی کوشش کرنے کے لئے
لیکن شام ہوتے ہوتے
ان لوگوں کے رویوں سے ہارا ہوا
تھکا ماندہ میں
اپنے شبستان میں واپس آجاتا ہوں
اور بادلِ ناخواستہ
آرام سے دفن ہو جاتا ہوں

جیسا بھی ہوں تمہارا ہی ہوں

بچتا بچاتا
کسی دیوار کی اوٹ میں
کسی درخت کے پیچھے چھپ کر
میں ہمیشہ چپ چاپ کھڑا رہا ہوں
جب تو کہہ رہا تھا
"سر دھر تلی گلی موری آؤ
جے تو پریم کھیلن کا چاؤ"
لوگ تیرے ایک ایک اشارے پر
دھڑا دھڑ اپنے اپنے سر پیش کر رہے تھے
میں سب سے پیچھے کھڑا تھا ڈرا ہوا سہما سا
جب تو کہہ رہا تھا
"چو کار از ہمہ حیلتے در گذشت
حلال است بردن بہ شمشیر دست"
میں کسی نہ کسی کے پیچھے منہ چھپاتا ہوا
تجھ سے نظر بچا رہا تھا
مگر تمہارے پیروکاروں میں شامل رہا ہوں
تمہارے راستے پر چلتا رہا ہوں
بے شک سب سے پیچھے
سب کے بعد
سب کی اوٹ میں
تیری آنکھ سے اوجھل مگر تیرے ساتھ ساتھ
تیرے پیچھے پیچھے

اسنیٰ بدر

نایافت

تمہاری قبر پر جانے سے کیا ہوگا
تمہاری قبر مٹی کا گھروندہ
ہڈیوں کا ڈھیر
اور اس کے سوا کیا ہے
وہاں وہ جسم
وہ آنکھیں
وہ چہرہ مل نہیں سکتا
جو میری اختراع کرنے کو آیا تھا

وہ آنکھیں
رعب سے بھرپور آنکھیں
کہ اٹھتی تھیں مری جانب
تو میرے منہ میں کانٹے سے اگتے تھے
وہ آنکھیں
جن کے ابرو کے اشارے پر
مرے دن رات کٹتے تھے
مری مرضی کہاں چلتی تھی
اپنی سوچ کے کپڑے پہنتی تھی
نہ بالوں کو کھلا رکھ کر
کسی شادی میں جاتی تھی
نہ کوئی فلم کا پرچہ
نہ افسانہ
نہ چھت پر چائے کی پیالی
نہ تکیے پر کوئی رضیا
عجب ماں تھیں
مری کتنی الگ ماں تھیں
کہ مجھ کو ہاتھ پکڑے بن
نہ چلنا ہی سکھایا
اور نہ ملنا ہی سکھایا مجھ کو لوگوں سے
کہ میرے لفظ تم پہلے سے طے کر کے
مرے ہونٹوں پہ رکھتی تھیں

اور اب رنگوں سے عاری میں
اور اب اک چپ کی عادی میں
اور اب سڑکوں پہ خالی میں
بتاؤ اب تمہاری قبر پر جانے سے کیا حاصل
تمہاری قبر سے اب کچھ بھی حاصل ہو نہیں سکتا
سیاہی میں کوئی بھی رنگ شامل ہو نہیں سکتا

مرے بچے

مرے بچے، تمہاری ماں عجب ماں ہے
کہ اکثر رات کے خاموش حصے میں
پڑے سوتے ہو تم
اور سو رہی ہوتی ہے سب دنیا
تمہاری ماں نکل جاتی ہے اک تاریک جنگل میں
جہاں جگنو اسے رستہ دکھاتے ہیں
کبھی بارش کے پانی میں نہاتی ہے
ہوا کے دوش پر آنچل سکھاتی ہے
سمندر میں کوئی کشتی اسے رک کر بٹھاتی ہے
کبھی ساحل پہ اپنی مٹھیوں میں ریت بھرتی ہے
کئی چہرے بناتی ہے مٹاتی ہے
مگر جب صبح ہوتی ہے
تو تم کو ڈھونڈتی ہے اپنے بستر پر
کہ تم ہو یا نہیں ہو
اُسے ڈر ہے
کسی شب تم بھی رستے میں نہ مل جاؤ

ذراسی کوشش کرلو

آدھی رات سے تھوڑا اوپر اور جاگ لو کہ تم
بیچ رات میں خود سے جو کچھ کہہ لیتی ہو
وہ بچی کو پتا ہوتی ہے
اور بچے لفظوں کی کو پتا
سارا دن لوگوں کے جھوٹے ہونٹوں پر روتی ہے

عبدالاحد ساز

آخری آہنگ

زندگی اک دور تک سنگیت تھی، اب شور ہے

ہاں مگر اس شور کے بکھراؤ میں
بے محابا صوت کے ٹکراؤ میں
شاید ابھی اندوختہ کچھ زیر و بم ہوں

آؤ ہم تم
کوئی زیر و بم تلاشیں
کوئی پیچ و خم تراشیں
اور اس ترتیب کاری کی شعوری کوششوں کو
لاشعوری نغمگی کی آخری مٹتی ہوئی سی گونج سے
انگیز کر کے
کوئی اک آہنگ دے دیں

اس سے پہلے کہ یہ شورِ ناتمام
صورِ اسرافیل کے اتمام میں کھو جائے
حشر اٹھے اور قیامت آئے
اور ہم کو جھونک دے آواز کے اک منقطع رشتے
کے دوزخ میں
فیصلہ کر دے ہمارے درمیاں
اک دائمی خود شناسی کے جہنم کا...

...اس سے پہلے.....،
آؤ ہم تم
اس خلیج نارسائی پر صدا کے پل بنا دیں
بے نشاں ہونے سے پہلے
اس زمیں پر آخری پہچان کی دنیا بسا لیں!

سرایت

نہ جانے کیوں کچھ دنوں سے یوں ہے؛
وہ ایک ڈھانچہ جو مدتوں سے
زمیں کی تہ میں دبا ہوا ہے؛
میں اس کے بچھڑے ہوئے لہو کی دھمک کو
اپنی رگوں میں ہر وقت سن رہا ہوں
وہ گوشت جو اس سے چھوٹ کر نذرِ خس و خاک
بن چکا تھا؛
میں اس کے نرم و گداز ریشوں کو
اپنے اعضا و استخواں کی رگوں میں پیوست پا رہا ہوں
ہوائیں انفاس گم شدہ کی؛
کبھی جو تحلیل ہو گئی تھیں یہیں کسی لحظہ فضا میں
وہ میرے سینے کے جوف میں سرسرا رہی ہیں
حواس اس کے؛
جو وقت نے سلب کر لئے تھے
مرے بدن کی نسوں میں تحریک کر رہے ہیں
دماغ جو اس کے کاسۂ سر میں سوچتا تھا؛
اب اس کے اعصاب جیسے کھنچ آئے ہیں
میرے گردن اور سر میں
(میں اس کے خواب و خیال و احساس جی رہا ہوں)
میں اس کے ہڈیالے زرد چہرے کے خالی حلقوں میں
اپنے دیدے گھما رہا ہوں
میں اس کے دانتوں کو اپنے ہونٹوں میں گھیر کر
مسکرا رہا ہوں!

علی ظہیر

ساحل اور سمندر

سمندر کے بوسوں نے ساحل کو چمکا دیا
ایسے چمکیلے ساحل پہ ابھرے ہوئے
تیرے میرے قدم پر قدم کے نشاں
مٹ بھی جائیں اگر تو کوئی غم نہیں
کیوں کہ اب تو یہ ساحل کا حصہ ہیں
پھیلا ہے جو کہکشاں کی طرح
یہاں سے وہاں تک
ہوائیں کبھی چپ
کبھی شور کرتی رہیں گی
اور وہاں آسماں
وہ تو سر کو جھکائے
کھڑا ہی رہے گا۔

تتلی

تتلی اُڑی ہوا میں
اس کو خبر نہیں کچھ
پیدا کیا ہے اس نے
رنگین اک زمانہ
صدیاں پڑی ہوئی ہیں
اک پل کی اس خوشی میں

سورج

ہو ساتھ جس کے سورج
پھر انتظار کس کا
ہر رات کی طرح سے
یہ رات منتظر ہے۔

خودنوشت

گزرتے گزرتے یہاں تک تو پہنچے
پُچھا کب مدینہ
بغداد سے کب چلے
خراسان پہنچے تھے کب؟
اور وارد ہوئے ہند میں کس گھڑی
یہاں آ کے کیا کیا ہوا؟
دلّی، اودھ اور دکن
نہیں ملتا کچھ بھی پتا
مگر ایک خوشبو سی آتی ہے اب بھی
پسینے کی خوشبو
محنت کی خوشبو
مشقت کی خوشبو.....

موت

موت اک آگہی کی منزل ہے
موت بے خواب خواب نا کی ہے
موت کچھ بھی نہیں اندھیرا ہے
جو بھی ہے، موت اک حقیقت ہے
وہ جو زندہ ہیں اُن کی نظروں میں
موت بے معنی خامشی بھی ہے
اک اچانک جدائی کی سرحد
ایک مجبوری ہے نہ ہونے کی
وقت کا ساتھ چھوڑ دینے کی
جس طرح سوتے جاگتے کے بیچ
ایک رشتہ ہے مثبت و ثابت
ویسے ہی زندگی و موت کے بیچ
ایک رشتہ ہے دیرپا و طویل.....

شین کاف نظام

دھوپ، خواب اور سویٹر

معصوم بچے کے نرم گرم گالوں سی
دھوپ
بیٹھی بنتی خواب
سویٹر کے نام

خواب...
ایسے خواب
اس سے پہلے دیکھے نہیں کبھی
کسی آنکھ نے

سنتی رہتی ہے
دھن
ایسی جسے اس سے پہلے
سنا نہیں کسی کان نے کبھی

چل سکے گی؟
راہ پر
جس پر نہیں ہے نقشِ پا

سوچنا چلنا
چلتے چلتے سوچنا
یا سوچ کر چلنا
ممکن نہیں جس راستے پر

کس لئے
کس کے لئے، پھر بُن رہی ہے
خواب
سویٹر کے نام

آتے جاڑے کی دھوپ

بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی ہے
آرام کرسی پر
جاڑے کی سرد زرد
دھوپ

کھلی پڑی ہے سینے پر
(پھڑ پھڑاتی)
کتاب... جس کے اوراق
پلٹ رہی ہے ہوا

چھت کی الگنی پر السا رہی ہے
کپڑوں میں بسے کپور کی
خوش بو

اکرام خاور

نظم

میرے لئے چند باتیں طے کر لینا
نہایت ضروری ہے
مثلاً یہ کہ حاملہ بیوی کو
'ستیہ میو جیتے' اور
'مریادا پرشوتم رام'
کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا بہتر ہے یا
گولی مار دینا

یہ بھی کہ
اس جسمِ نازک کے
کس نازک اور مہلک حصے پر
مارنی ہوگی!

گولی مارنے سے پیش تر
اس آخری گھڑی میں
کیا اسے چومنا بھی ہوگا!
اس گرتے ہوئے جسم کو
زمین پر گرنے سے پہلے
کیا سنبھالنا بھی ہوگا
کمرے کی بند فضا یا
کھلے آسمان کے نیچے!

کیا مرے پاس ایک فالتو گولی بھی ہوگی؟

بالفرض! میری بیوی اگر حاملہ نہ ہو
بالفرض!! اگر وہ نئی نویلی بیاہتا ہو
ویسی صورت میں
میرے لئے یہ طے کر لینا بھی
نہایت ضروری ہے کہ
اپنے ہونے والے بچے کے لئے
میں کیا نام تجویز کروں

اس ملک اور
اس کال میں!!

شاہد عزیز

لوٹ جاؤ تم

پرندے ان
گھنی آبادیوں میں
کیوں چلے آئے
یہاں تو سانس لینے کو
ترستی ہے حیاتِ نو
اگر ممکن ہے پھر سے لوٹنا
تو لوٹ جاؤ تم
یہاں کے دق زدہ ماحول میں
تم رہ نہ پاؤ گے
یہاں کے سورجوں کی دھوپ کو
تم سہہ نہ پاؤ گے

یہاں کے ان درختوں میں
کہیں شاخیں کہیں پتے نہیں ہوتے
تمہارے واسطے شاید
یہاں کچھ بھی نہیں باقی
اگر ممکن ہے واپس لوٹنا
تو لوٹ جاؤ تم
اور اپنی ہی زمینوں پر
کسی خوش آب دریا کے
کنارے گھر بناؤ تم
پرندو لوٹ جاؤ تم

کیا یہ ممکن ہے

بہت سہمی ہوئی دھرتی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں
کیا ہوا تجھ کو
مرے اجداد
تیرے پیٹ سے پیدا ہوئے
اور مر گئے سارے
مگر تجھ سے بچھڑنے پر
مرے ہونے نہ ہونے کے
کوئی معنیٰ نہیں رہتے
میں اپنی روح
اپنے جسم سے
کیسے الگ کر دوں
مرے اجداد اب تک
مجھ میں زندہ ہیں
بہت سہمی ہوئی دھرتی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں
اس طرح مجھ سے الگ ہو کر
تمہارا زندہ رہ پانا
کیا ممکن ہے

جینت پرمار

ماں کی موت پر تین نظمیں

1

ٹین کی چھت سے ٹکرائے
آخری لفظ
سیاہ بادل کی مانند
کانپ اٹھی تاریک ہوا
گم صم کھڑکی کے پردے
بدن برف
پتھر کے پاؤں
آسمان، تارے چاند
آخر کار
لفظ نے اپنے معنی کو آزاد کیا
آنگن میں تلسی نے پتوں کو مرجھایا

2

فجر میں لیکن
نیند کو تہ کر کے رکھا الماری میں
اور برامدے میں
جلتی بتی کو بجھایا
چولہا پھونکا
چائے بنائی
شرٹ پہ ٹوٹا بٹن لگایا
لنچ بکس رکھا چولہے میں
ٹیبل سے گم
پیکٹ اس نے ڈھونڈ نکالا

اور آخر میں
چارپائی پر اس نے پھینکی
تن کی پھٹی ہوئی چادر

3

جلتی دھوپ میں
بانس کے جنگل نے اس کو
سینے سے لگایا
آگ نے چومے کھردرے پاؤں
دھیرے دھیرے خاک ہوا
اک ٹکڑا آکاش

شام ہوتے ہی
گھر کے اک کونے میں پایا
گدڑی پر پیوند لگاتا
اک سایہ
چٹنی پیسنے والے
پتھر آئینے میں
میں نے دیکھا
بجھا بجھا سا اک تارا

گلشن کھنہ

زندگی کی صداقت

کتنی دل کش وہ اک رات تھی
خواب تھی
چاند کی جھیل میں مسکراتی ہوئی
چاند کی چاندنی گنگناتی ہوئی
پھول، پھل، پیڑ، پتے، زمیں
گل فضا!
چاند کی چاندنی میں تھے لپٹے ہوئے
میری روح میرے اندر تڑپنے لگی
اپنے خالق کو پہچاننے کے لئے
چل پڑی
اور میرا بدن کھوکھلی کوٹھری بن گیا
میری روح! کیا کہوں محو پرواز تھی
زندگی کا عجب موڑ تھا کہ جہاں
ایسی حالت پہ میں آج رونے لگا
اور روتا رہا

اپنی تنہائی سے مجھ کو ڈر بھی لگا
چاندنی ماند پڑنے لگی
اور پھر ہر طرف
یہ سحر مسکرانے لگی
شب کی خاموش باہیں سمٹنے لگیں
شور ہونے لگا
اور پھر میری بے چین روح
زندگی کے جھمیلوں سے بچتی ہوئی
مجھ میں داخل ہوئی
اور میرا بدن!
اک کنول کی طرح مسکرانے لگا
اور مہکنے لگا
زندگی کی صداقت ہے کیا؟
آج سمجھا ہوں میں

جگدیش پرکاش

پیٹونیا کے مرجھائے پھول

کون ہو تم جو میری خاموشی کو
اتنی باریکی سے پڑھ رہے ہو
کچھ کہو تو اس تحریر کا عنوان بن جائے
نظریں ملاؤ تو اس شام کی پہچان بن جائے
دریچے پر ابھرتا ہوا آدھا چاند کر رہا ہے کچھ سوال
جن کا جواب نہیں ہے مری خاموشی کے پاس

ہواؤں کی نازک انگلیاں
میری میز پر گل دان میں لگے
پیٹونیا کے پھولوں کو سہلا رہی ہیں
ان کے پاس بھی شائد کوئی جواب نہیں ہے
اس کمرے میں سسکتے ہوئے اداس لمحوں کے
پیچیدہ سوالوں کا جواب

کل یہ پھول میری میز پر نہیں ہوں گے
لیکن ادھ کھلے دریچے سے آتی ہوئی ہوا
انہیں تلاش کرنے ضرور آئے گی
اور دریچے پر ٹکے آدھے چاند سے گفتگو کر کے
کہیں دور نکل جائے گی
پھر کیا ہوگا، کسے پتہ؟

لیکن آج جب تم میرے قریب ہو
تو اپنی آواز کی خوش بو بھر دو
ان مرجھائے ہوئے پیٹونیا کے پھولوں میں
جو شائد تمہارے انتظار میں پھینکے نہیں گئے مجھ سے
ابھی تک!

اشہر ہاشمی

سفر نئی منزلوں کی جانب

گھنے اندھیروں میں
جنگلوں سے ابھرتی
سرگوشیوں کے اسرار کھل گئے ہیں
تو سوچتا ہوں، مرا تجسس
گھنے اندھیروں کے خارزاروں پہ بے تحاشہ
برہنہ پائی سے آبلوں تک
نہ جانے کتنے برس چلا ہے
تو جنگلوں کی فضا سے مانوس ہو سکا ہے۔
یہ سرسراہٹ
خود اپنی سانسوں کے آنے جانے کی آہٹیں تھیں
ابھرتی سرگوشیاں خود اپنے اجاڑ باطن میں اٹھنے والی
اداس لہروں کی گونج بن کر ابھر رہی تھیں
یہ سارے جنگل، گھنے اندھیرے
مری ہی راتوں کے لاحقے تھے
تمام سرگوشیاں
مرے ہی افق کی لاختم وسعتیں تھیں
مرا تجسس
مرے ہی اندر کے خارزاروں میں بے تحاشہ
برہنہ پائی سے آبلوں تک
سفر کی ساری صعوبتیں بے سبب اٹھاتا رہا تھا اب تک
کہاں کوئی چیز اجنبی تھی
مگر یہ کیا جب تمام اسرار کھل گئے ہیں
تو پوچھتا ہے مرا تجسس
کہ اب میاں آپ کیا کریں گے؟

پیچ در پیچ

اندر کمرے میں وہ لوگ بیٹھے رہے
چائے پی
زیست کے پیچ در پیچ پھیلاؤ پر بات کی
رسم دنیا پہ طعنے کسے
رام رحمٰن کے نام پر
لڑنے والوں کو الّو کہا
افراط زر میں گراوٹ کی خبروں
ٹیکس کی بدلی شرحوں
تیل کی قیمتوں میں اضافے کے امکان پر
تبصرہ بھی کیا
دیر تک ساتھ بیٹھے رہے
دوسری بار بھی چائے پی
زیست کے پیچ در پیچ پھیلاؤ پر بات کی
پھر بھی اک بات کہنی جو تھی
تم نہیں سن سکے میں نہیں کہہ سکا

خموشی میں لپٹے ہوئے ہونٹ لے کر جئے
آمنے سامنے بیٹھ کر
فون پر،
یا کہ کاغذ کے ٹکڑے کی ترسیل سے
یا اشاروں یا کنایوں میں ہی
بات کرنے کی تھیں صورتیں ڈھیر سی
پھر بھی دونوں
خموشی میں لپٹے ہوئے ہونٹ لے کر جئے
ان کی آنکھوں نے سیکھا نہ تھا جیسے چغلی کا فن
دن کو ہفتوں میں
ہفتوں کو برسوں میں
تبدیل ہونے سے روکا نہیں
وقت نے جیسے دونوں کو
اک بار بھی رک کے ٹوکا نہیں
وہ خموشی میں لپٹے ہوئے ہونٹ لے کر جئے
اور آنکھوں کو چغلی کا فن بھی سکھایا نہیں
ایک دن پھر بھی سب کچھ اچانک ہوا
روح نے روح کو لمس سے اپنے آگاہ کر ہی دیا
قلب نے قلب کو بھی چھوا
ہاں! مگر
جسم پہلے ہی کی طرح محتاط تھا

جعفر ساہنی

آج پھر مجھ سے

آج پھر مجھ سے
مرا کمرہ مخاطب ہے
دراڑیں وہ کبھی
چھت کی دکھاتا ہے
کبھی دیوار میں پڑتے شگافوں کو،
نشاں جھلسے ہوئے رنگوں کا مجھ کو
مبتلا کر دیتا ہے ہیبت میں
مکڑی کے سبک جالے
ہوا کے دوش پر لہرانے لگتے ہیں
زوالِ زندگی کا وہ پتہ دینے بھی لگتے ہیں
زمیں کمرے کی
بوسیدہ کہانی جب سناتی ہے
کواڑوں سے صدا اٹھتی ہے
رونے اور سسکنے کی
کبھی آہیں سی بھرنے کی
ان ہی لمحوں کے سائے میں مگر
کچھ جھانکتی انگور کی بیلیں
دریچے سے
تبسم کا شگفتہ عکس
دکھلاتی ہیں آنکھوں کو

نظر اس کی

نظر اس کی
کبھی اوپر نہیں جاتی
ہمیشہ رہتی ہے مرکوز
قدموں پر
کہ قدموں میں
تمنا اس کی جیتی ہے
ان ہی سے آس بندھتی ہے
ان ہی سے رزق کا پرچم بھی
لہراتا ہے آنکھوں میں
نظر اس کی کبھی اوپر نہیں جاتی
کہ اوپر ہے خلا سا
اس کے مذہب میں
نظر کی اس کی وسعت میں
جھکا کر وہ نظر اپنی
ہمیشہ خواب بنتا ہے
کرن سے گھر سجاتا ہے
تبسم میں نہاتا ہے
نظر اس کی
سدا قدموں کی
ہم دم بن کے رہتی ہے

نیا نقشہ
(نیوٹن کے نام)

ہوا کے درمیاں اک دن
بہت شاداب لمحے میں
ثمر، پختہ وصالِ شاخ سے
ہو کر کے آسودہ
زمیں کے رخ پہ گر کر
کر گیا زخمی کسی کا سر
مگر اس زخم سے سر میں
نہیں آزردگی کوئی
نہ کوئی درد ہی جاگا
ہتھیلی پر خیالوں کی
نئی اک سوچ البتہ
تصور میں ابھر آئی
کہ آخر یہ ثمر پختہ
گرا سر پر ہی کیوں اس کے
زمیں کی دل نوازی میں؟
ہوا کے پنکھ کو تھامے
فلک کی سمت میں کیوں کر
نہیں وہ جا سکا اڑ کر؟؟
'کشش ارضی'
اسی اک سوچ کے ہاتھوں
زمانے پر ہوئی افشا
'جہاں کا پھر بنا بالکل نیا نقشہ'

ارشد کمال

سُنامی

مزہ تھا زندگی کا
جب زمیں پر
آشتی کا بول بالا تھا،
کبوتر کی غٹرغوں
فاختہ کی ہم زباں ہو کر
سبھی کو امن کا پیغام دیتی تھی،
زمانہ چین کی تب بانسری
ہر پل بجاتا تھا،
مگر افسوس،
غارت ہو گیا سب کچھ،
کبوتر کی جگہ 'ترشول' نے لی
اور 'غوری' فاختہ کے آشیاں پر
ہو گیا قابض،
یہ مصنوعی پرندے جب سے آئے ہیں،
کشاکش اور تشدّد سے
فضا ہر پل رہا کرتی ہے آلودہ،
زمیں پژمردہ رہتی ہے
فلک آنسو بہاتا ہے،
اب ایسے میں کوئی قطرہ جب اس آنسو کا
گرتا ہے سمندر میں
تو پھر اُس پل
بپھر کر اک
'سُنامی'
سر اُٹھاتی ہے

سعیٔ رائیگاں

نڈھال ہو کر
اُداس لہجے میں
چاند سورج
یہ کہہ رہے تھے :
'نہ جانے کب سے
ہم اس جہاں میں
اُجالے برسا رہے ہیں، لیکن
فصیلِ ظلمت
ہنوز قائم ہے اس زمیں پر'
پھر اس نتیجے پہ دونوں پہنچے کہ
'ذہنِ انساں کے طاق پر
جب تلک نہ ہوگا
چراغ روشن،
ہماری کوشش کا ماحصل تو
صفر ہی ہوگا'

دھوپ چھاؤں کے درمیاں

یہ زندگی
گلوں کی ایک سیج ہے
نہ خار و خس کا ڈھیر ہے
بس ایک امتحان کا
لطیف سا سوال ہے
.....سوال کا جواب تو محال ہے،
بس اتنا ہی سمجھ لیں ہم
کہ زیست دھوپ چھاؤں ہے
کہیں پہ یہ نشیب تو کہیں پہ یہ فراز ہے،
جہاں بٹھائے یہ ہمیں
وہیں پہ ہم
بساطِ ذات ڈال کر
کرن کرن سے
کچھ نہ کچھ حرارتیں نچوڑ لیں
تمازتیں سمیٹ لیں... کچھ اس طرح
کہ چھاؤں کی
عنایتوں، بشارتوں
کا اک یقیں بھی ساتھ ہو!

پروین شیر

بہت مرتی ہوں، لیکن...

میں ننگے پاؤں سارا دن انہی راہوں پہ چل چل کر
برہنہ سر، سلگتی دھوپ میں جل کر
کئی چہروں کی پرتوں میں
نقابوں کے تلے گھٹ کر
فسانوں سے نہیں
اپنے حقائق سے نبرد آزما ہو کر
بہت تھک کر
بہت تھک کر نہیں بے انتہا تھک کر
مسلسل ہار ہار کر
ہمیشہ آخرِ شب
پھر سے جی اٹھتی ہوں میں اک بار
کہ میں پھر نیند کی آغوش میں سر رکھ کے سونے کی
سعی میں اونگھ جاتی ہوں
اسی کے نرم آنچل میں ذرا سی دیر کو چھپ کر
جو اک ماں کی طرح مجھ کو
محبت سے تھپکتی ہے
مرے تلووں کے چھالوں سے
وہ ان خاروں کو چنتی ہے
جو ننگے پاؤں چلنے پر مجھے راہوں نے بخشے تھے
مرے رستے ہوئے زخموں کو اکثر صاف کرتی ہے
مرے دم توڑتے خوابوں کو وہ ایسے جلاتی ہے
کہ میں پھر سانس لیتی ہوں
دوبارہ زندہ ہونے کا ارادہ کر کے اٹھتی ہوں
میں ہر اک آنے والی صبح مر جانے کی حسرت میں
ہمیشہ آخرِ شب جیسے تا پائندہ ہوتی ہوں
بہت مرتی ہوں لیکن .
کچھ ذرا سی زندہ ہوتی ہوں!!

عراق

چار سو پھیلے ہوئے موت کے گہرے سائے
شہر بے خواب، در و بام سیہ پوش و ملول
سر نگوں گنبد و محراب، شکستہ ایوان
ہر طرف ملبے ہیں ٹوٹی ہوئی دیواروں کے
آتش و خوں کے ہیں پیوند ردائے شب پر
ہر طرف سیلِ بلا، ڈوبتی سانسوں کی کراہ
درد کی دھند میں ڈوبی ہیں فضائیں ساری
شعلے لہراتے ہوئے اٹھے چمن زاروں سے
شاخساروں کے جھلسنے کی صدا آتی ہے
اور فلک دیکھتا رہتا ہے بہ چشمِ حیراں
ابنِ آدم کے زمیں زاد کرشمے جن کا
رنگ بدلا ہے نہ بدلیں گی روایات کبھی!

خود فریبی

خشک بیاباں میں لوگوں کا
اک جمگھٹ سا
سوکھے ہونٹ لئے پھرتا ہے
اور پھر آخر...
آب نہ پا کر
ریت چبا کر
اپنی پیاس کو دھوکہ دے کر
جینے کی کوشش کرتا ہے!

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

دو نظمیں

1

بیوی کے لئے واشنگ مشین
بچے کی فرمائشیں انوکھی
ماں کے لئے کچھ
بہن کے لئے کچھ اور
اس 'چاہنے' کی صلیب پر
ساری زندگی لٹکتی ہے
کون کسے یاد کرے
کسے چاہے کسے اپنائے
تناؤ بھرے دن رات
اور تھکے ہوئے وجود سے
ندی سمندر میں سمائی ہے
سمندر لہروں میں ڈوب جاتا ہے
صبح دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود
اجنبی چہرہ سامنے آجاتا ہے
صدی کے ابتدائی سالوں میں
ایسی زندگی جیتے ہیں ہم!

2

جینے کا انداز کبھی اتنا بڑا لگا
اسے مٹھی میں باندھنے کے
اپنے خیال پر ہنسی آگئی
اور کبھی اتنا چھوٹا لگا کہ
ریت کی طرح مٹھی کے بیچ سے
کھسکتا چلا گیا ہوا کی طرح سرکتا ہوا
پرت در پرت تب بھی
یہی خواہش جاگتی رہی
گلاب کی مہک بکھرتی رہے!
اندھیرے کو ہاتھ بڑھا کر
ایک کرن میں کھینچ لینا چاہا اس نے
جب بھی کہرے سے ڈھک گیا وجود
مسکان سے من بھر لینا چاہا!
بانجھ شروعات کا اختتام
درد کا سہلانا تاریخ کا دہرانا
لوٹتے پرندے، اگتا سورج
تازہ دم چہچہاہٹ

رئیس الدین رئیس

بدن کہانیاں

1

بدن کہانی کو لکھنے والو
بدن کہانی کو کیا لکھو گے
زمیں پہ جب تک اُگے گا گندم
بدن کہانی بھی ہے ادھوری
کئی مورخ ہوئے ہیں مدفون
کئی مورخ بھی جا چھپیں گے
اسی زمیں میں
جہاں سے گندم اگا رہے ہو
یہی بدن ہے
یہی مورخ
یہی کہانی ہے بس بدن کی

2

ابھی مسلسل سفر ہے جاری
طلوعِ حد سے
غروبِ حد تک
یہ اپنی منزل پہ جب رکے گا
بدن کتھائیں بھی ختم ہوں گی
وگرنہ اس لحظۂ ابد تک
نہ پوری ہوگی بدن کہانی

3

نہیں وہ آنکھیں جو دیکھ پائیں
نہیں وہ الفاظ بھی
جو اس کے رموزِ پنہاں کا
اور حقیقت کا
برملا انکشاف کر دیں
بدن کہانی کو لکھنے والو

قلم ہیں جھوٹے
کہ رنگ ان میں
بہت ہی پھیکے بھرے ہوئے ہیں
یہ حق نگاروں کے خون کی
سرخیوں سے محروم ہیں سراسر

4

عشا ساعتوں کے
بعد افلاک سے
طلوعِ فجر کی پاکیزہ
ساعتوں سے ذرا سا پہلے
بدن کہانی کو لکھنے والو
لکھو، مگر یہ کہانی پوری نہ ہوگی ہرگز
کہ بعد ازاں کی ہر ایک ساعت
تمہارے جسموں پہ خود کہانی
کوئی نہ کوئی رقم کرے گا

جمشید علی

ناتمام جستجو

بھٹک رہی ہے زندگی
غبار ہی غبار ہے
نہ راستے نہ حوصلے
عجیب انتشار ہے

خدا کی ذات معتبر وہ خار دے کر پھول دے
قدم قدم پہ منزلیں کہ راستوں کی دھول دے
امیر پہ ہو مہرباں تو دے عروج اور بھی
غریب کے سنے تو اس کی موت ہی قبول دے
یہ منصبی اسی کی ہے
اسی کو اختیار ہے
بھٹک رہی ہے زندگی
غبار ہی غبار ہے

یہ اپنی بستیوں سے دور ہم کہاں پہ آ گئے
جھلس گئی ہے روح بھی وجود تلملا گئے
گلے میں پیاس بھر گئی زبان اینٹھنے لگی
پڑے جہاں قدم لہو سے نقش پا بنا گئے
سروں میں دھول بھر گئی
لباس تار تار ہے
بھٹک رہی ہے زندگی
غبار ہی غبار ہے

ہر ایک صبح زیست کو نئے دکھوں سے کام ہے
ہر ایک شام دوستوں کی یاد کو سلام ہے
کبھی نہ ختم ہونے والی اک ادھیڑ بن لئے
ہر ایک رات زندگی کی تلخیوں کے نام ہے
بلا کی ایک بے خودی
غضب کا اک خمار ہے
بھٹک رہی ہے زندگی
غبار ہی غبار ہے

یہ اپنی شکل اجنبی سی لگ رہی ہے آج کیوں
یہ ذہن و دل میں اک عجب سی بے کلی ہے آج کیوں
کہ اب سے پہلے بھی ہزار بار ہم تو مر چکے
ہماری جاں لبوں پہ آ کے رک گئی ہے آج کیوں
اے ناتمام جستجو
یہ کس کا انتظار ہے
بھٹک رہی زندگی
غبار ہی غبار ہے
نہ راستے نہ حوصلے
عجیب انتشار ہے

شارق عدیل

دانائے بدن

جسموں کی ضرورت بھی تابندہ حقیقت ہے
جسموں کی ضرورت میں کیا راز ہے پوشیدہ
سوچا ہی نہیں ہم نے
احساس کی بیداری جذبات کی گرماہٹ
پوشیدہ نہیں کچھ بھی جب اپنی نگاہوں سے
پھر کیوں نہ محبت کا مفہوم سمجھ پائے
دانائے بدن ہو کر
ہم لوگ نہ کیوں اب تک
جسموں کی ضرورت کے
گھیرے سے نکل پائے

ہجرتوں کے خواب مت بننا

صدائے حق پہ لبیک کہنے والے انسانو!
کبھی تم شہر کے ان وحشیوں کے
ظلم سے ڈر کر
بدن سے
ہجرتوں کے خواب مت بننا
بدن سے ہجرتیں کرتے ہی یہ دنیا
تمہارے جسم آتش زار کر کے
راکھ کو روپوش کر دے گی

مشرف خطیب

دیباچہ

کتاب حیات
غیر یقینی حالات کا مجموعہ
جب زندگی کا ایک دن گزر جاتا ہے
تبھی ایک صفحہ پڑھ پاتا ہوں
آگے کیا ہے؟ نہیں جان پاتا ہوں
تجربے کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے
حالات کی پابند وقت میں مقید
اتفاقات کی مرہون منت
کتاب حیات پڑھنے کی رفتار
زندگی بیتنے کی رفتار کے برابر ہے
کاش! میں کچھ آگے پڑھ سکتا
وقت سے آگے نکل سکتا
جب بھی کتاب کا پنا الٹتا ہوں
تقدیر کا صفحہ پلٹتا ہوں
کورے کاغذ کو انتظار کرتے پاتا ہوں
حالات کی انگلیاں قلم تھام لیتی ہیں
میں تحریر میں ڈھلتا جاتا ہوں
حالات کی انگلیاں
لمبا چوڑا حاشیہ چھوڑ جاتی ہیں
معاشرہ بے چین و بے بس
فقروں کو کس کر حاشیوں میں گاڑ دیتا ہے
میں تذبذب چہرے پر سجائے
کبھی تحریر تو کبھی حاشیے کو تکتا ہوں
اور یقین کرنے لگتا ہوں
میں حاشیہ ہی ہوں
پھر تو اگلا ورق پلٹتے ہوئے ڈر لگتا ہے
میں جس کو گمان تھا
عمر بھر جیوں گا
خوف کی صلیب پر لٹکا سوچنے لگتا ہوں
کہیں حاشیے کے نیچے ہی نہ لکھا ہو
ختم شد

وش کنیا

تم سفید پوش ناگوں سے
اپنے ہونٹوں پر ڈسواتی ہو
اختلافات کا سارا زہر پی کر
تب کہیں سیاست کہلاتی ہو

جمہوریت

بہت سارے پنچھی جال میں پھنس جائیں
سب مل کر زور لگائیں
جال کو لے کر اڑ جائیں
چند آزاد پرندے
ان سے بے نیاز ہو کر
آگے آگے اڑتے جائیں

ثریاں تاردی

ہولڈرلن کا مزار

ترجمہ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

دن بڑبڑاتا ہے گالیاں
رات شکوے کرتی ہے
بغیر سمجھائے کہ کیوں کرتی ہے ایسا

ہم سے باپ کی طرح باتیں کرتا ہے
اُگتا ہے سورج
لیکن نہیں مانتے ہم اس کی صلاح

اُس جگہ ڈھیری آگ ہے جو
بھیجتی ہے ہم تک نہ سمجھ میں آنے والے اشارے
اور وقت ایک عرصے تک
ہماری یاد کے لئے پریشانی کا باعث بنتا ہے
اُس چہرے کی مانند جسے ہم تلاش نہیں کر پاتے
کئی دنوں تک چلنے کے بعد
میں پیدل ہی پہنچتا ہوں اکثر سایہ دار اسٹیج کی سمت
اور خاموش نظارے کے سامنے
جاگتا ہوں بجھا سا دل لئے
پکارتا ہوں یوں کہ گونج نہ ہو
آوازیں دیتا ہوں ان عظیم اداکاروں کو جو
ہزاروں سال سے
ہماری نمک حرامی کے باوجود زندہ ہیں
اور بولتے ہیں اس طرح کہ کچھ نہ سنا جا سکے

کیوں چپ ہو اب تک تم اے جنگل
جاگو اور چل پڑو!
آسمان کیوں کر لیتا ہے بند
اپنی آنکھیں بھرے پُرے دن میں؟

سورج کی سنہری لڑی میں پرو لو
اپنی راتوں کا چھپا خزانہ!
لوٹ آؤ ہمارے پاس اے بھولی بسری راہ!
کہ وقت گھل مل پاتا آپس میں اور سب کچھ
ماضی حال اور مستقبل ہوتے ایک ساتھ
اس لامحدود دماغ میں
جس کا تم تصور کرتے ہو
جس کا انتظار ہے تم کو

(ثریا تاردی 1903 میں سیں ژہر میں ڈژوم میں پیدا ہوئے۔ والد مصور تھے اور ماں موسیقار تھیں۔ تعلیم پیرس میں مکمل کی۔ 1927 میں پہلی بار نظمیں شائع ہوئیں۔ 1939 تک آشیت اور میوژے ماسیونوں میں کام کیا۔ پھر مزاحمتی تحریک میں شامل ہو گئے۔ لیکن زمین دوز اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی اہم کتابیں ل فلو کا شے 1933 آکسوں 1939 کوم سی کوم سلا 1959 لے پارت ژ توال 1949 وغیرہ ہیں۔ ہرگانوی)

اور اگر اس سرنگ سے
طوفان بردوش ڈھیرے سے
ایک آواز نکلے
اور وہ فلسی چیزوں کی
چند لمحے کی جنگ سے کہیں زیادہ مضبوط ہو
تو شاید ہم پہچانیں
اس امن کو جو
پہلے ہی دن سے سناجاتا ہے لوگوں کے دلوں میں
لیکن کسی کو بھی اپنے اندر دوسرا جواب نہیں ملتا
فقط اس کے دل کی آواز ہوتی ہے
اور دنیا کی خاموشی
بولتی سی لگتی ہے
(فقط الفاظ بولتے ہیں)
اور ہمارے اندر کم زور ہوتی جاتی ہیں
وسیع آوازیں
وعدے کی یادوں کے ساتھ ساتھ
ٹھیک اسی طرح جیسے تھما جاتا ہے کوئی طوفان!

مخمور سعیدی

رباعیاں

ہر لمحہ اک افتاد نئی لاتا ہے
اک سانحہ ہر قدم پہ پیش آتا ہے
ہر چند بچاتا ہوں نگاہیں غم سے
رہ رہ کے مگر سامنا ہو جاتا ہے

دم، ابرِ گُل افشاں کا کہاں تک بھرتی؟
سیراب ہوئی لہو سے پیاسی دھرتی
ان فصلوں کو آنسوؤں نے سینچا آخر
جو رہ گئیں انتظارِ باراں کرتی

تحفۂ مصلحت پیا ہے میں نے
رازِ غمِ دل چھپا لیا ہے میں نے
اک شخص جو ہم زاد تھا میرا شاید
مخمور اسے قتل کر دیا ہے میں نے

بدلے ہوئے خال وخد سے گھبراتا ہوں
آنکھوں کی گواہیوں کو جھٹلاتا ہوں
ہے ذہن میں کچھ اور ہی تصویر اپنی
آئینے میں کچھ اور نظر آتا ہوں

مہمل سا اک اسم بن گیا ہوں کب سے
اپنا مفہوم کھو چکا ہوں کب سے
مخمور کسی اور کا کیا ذکر، کہ میں
خود اپنے بغیر جی رہا ہوں کب سے

تقدیر کا یہ کھیل ہے کوئی بتلائے
یا صرف اک اتفاق؟ اتنا سمجھائے
مٹی پہ رکھوں پاؤں تو سونا نکلے
سونے کو لگاؤں ہاتھ، مٹی ہو جائے

خود پیشِ نظر مآل آ جاتا ہے
لمبا ہے سفر، خیال آ جاتا ہے
قدموں کی تھکن جو رہنما بن جائے
رفتار میں اعتدال آ جاتا ہے

رمزِ ذات و صفات روشن ہو جا
ظلمت کدۂ حیات روشن ہو جا
اے جہلِ خرد کی رات ڈھل جا اک بار
اے معنیِ کائنات روشن ہو جا

شاداب فضاؤں میں بھی مرجھاتے ہیں
پھول آتے ہیں پھر ان پہ نہ پھل آتے ہیں
جنگل، کہ سدا ہرا بھرا رہتا ہے
کچھ پیڑ مگر سوکھ کے جل جاتے ہیں

رشید کوثر فاروقی

رباعیاں

چلتا تو جہان میں ہے سب سے مل کے
لیکن کچھ فاصلے ہیں دل سے دل کے
مجبور ہے آدمی کہ سوچے یہ بھی
ساتھی یہ سفر کے ہیں کہ ہیں منزل کے

دنیا سے غیورانہ کریمانہ گزر
دریوزہ طلب نہیں فقیرانہ گزر
مل بانٹ کے کھالے جو کہیں کچھ مل جائے
اور کچھ نہ ملے تو بے نیزانہ گزر

کس کام کی دور بینی و دیدہ وری
کیا کنج مقابر میں اذانِ سحری
رشک آنے لگا ہے اب تو دنیا پہ مجھے
دے دے کوئی مجھ کو بھی یہی بے خبری

لے لیتی ہے محصول مشیت کہ نہیں
سکھ پاتی ہے ایثار سے فطرت کہ نہیں
اغراض و مفادات کے اس دور میں بھی
ہے ہر کوئی مجبور محبت کہ نہیں

قندیل جلایئے تو جلتی ہی نہیں
کچھ بویئے تو سوئی نکلتی ہی نہیں
اس قوم کا درجۂ برودت کیا ہے
یہ برف کسی طرح پگھلتی ہی نہیں

جب کوئی نئی چوٹ لگی گانے لگے
دیکھا جس نے ہم اس کو دیوانے لگے
کیا یہ بھی کوئی قسم ہے مایوسی کی
رونے کے مقام پہ ہنسی آنے لگے

کردے گا اشارہ تو جدھر ہو لوں گا
میں نامہ سیاہ خاک منھ کھولوں گا
گونگے کے حال پر ترس کھا مالک
کچھ پوچھ لیا تو نے تو کیا بولوں گا

ناکام تو ہر حال میں صیاد رہا
کب صید اسیر حکم و ارشاد رہا
کرلا چکا جب اس کے جی میں آئی
پنچھی پنجرے میں تھا اور آزاد رہا

دنیا ہے کہ فتنہ پیشگاں کی جنگاہ
بندوں سے خدا کے بس خدا ہی کی پناہ
جنگل میں نگل رہے ہیں سانپوں کو سانپ
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اوروں کو جتاتا ہوں کہ اونچا ہوں میں
کہہ لیتا ہوں دل میں بھی کہ اچھا ہوں میں
یہ بھی دھوکا ہے اور وہ بھی دھوکا
میں خوب سمجھتا ہوں کہ کیسا ہوں میں

یہ جابر و قاہر بھی تو بچہ ہو گا
یہ بھی تو کسی سے پیار کرتا ہو گا
ہو گا کبھی شیر خوار اور اول بار
ماں کے پہلو میں مسکرایا ہو گا

ہر گام کو شوق نے دکھائی منزل
لگتا تھا کہ اب آئی اب آئی منزل
بچپن سے یہ حسرت تھی افق تک چلتے
چلتے رہے عمر بھر نہ پائی منزل

کعبہ کس کا خدا کا ساری دنیا
سرچشمۂ خلق دو جہاں کون خدا
ہے کوئی مسلمان جو کہہ دے کہ کیا
ہندو کو کسی اور خدا نے پیدا

جس گھر میں گھسی وہاں محبت نہ رہی
اللہ کا ڈر گیا دیانت نہ رہی
دولت آئی اور آدمی مست ہوا
نشہ نہ چڑھا اگر تو دولت نہ رہی

رئیس الدین رئیس

رباعیاں

افکار میں خورشید و قمر پاؤگے
اشعار میں جادو سا اثر پاؤگے
اردو کا میں وہ شاعرِ بے کس ہوں جسے
بے خانماں و خاک بسر پاؤگے

محرومِ کرم فیض سے میں خالی ہوں
نادار ہوں مورد بد حالی ہوں
ہاں غیب سے آتی ہے مگر ایک صدا
مایوس نہ ہونا میں ترا والی ہوں

جب بزمِ سخن میں مری باری آئی
تب کام مری جادو نگاری آئی
اے میری غزل تیری بدولت مجھ تک
اعزاز کی شہرت کی سواری آئی

دریا پہ مکاں اپنا بناؤں کیسے
تعمیر یہ پانی پہ اٹھاؤں کیسے
جس ہاتھ میں قسمت کی لکیریں ہی نہیں
وہ دست شناسوں کو دکھاؤں کیسے

قطعات

کتنے ہی ابرِ رواں گزرے زمیں کے سر سے
قطرے قطرے کو مگر پیاس کے مارے ترسے
ذرّے ذرّے سے صدا ابھری کہ پانی! پانی!
پھر بھی تپتے ہوئے صحرا پہ نہ بادل برسے

پتھروں کے شہر میں اے شخصِ آئینہ صفت
تجھ سے ہر آواز تیری اس طرح ٹکرائے گی
ذرہ ذرہ ٹوٹ کر ہوگا ترا اپنا وجود
اس دیارِ سنگ کی آندھی تجھے کھا جائے گی

دیارِ سنگ میں حیرت فزا سا ہے منظر
ضمیرِ اہلِ یقیں وہم نے جھنجھوڑ دیا
تمام شہر میں بے چہرگی کا عالم ہے
طلسمِ شیشہ گری پتھروں نے توڑ دیا

ہر اک رنگِ شہرِ جنوں خواب تھا
کہیں کیا کہ ہر گوں نہ گوں خواب تھا
فضا رات کی سحر انگیز تھی
کھلی آنکھ تو ہر فسوں خواب تھا

کاوش پرتاپ گڑھی

دوہے

دھوپ نگر میں آگئے، برف نگر کے لوگ
بچہ بچہ کھل اٹھا، خوب ہوا سنجوگ

آیا تھا بھیتر کہیں، ذروں کا طوفان
دل کے ریگستان میں، گیا کہاں مہمان

شہرت کی چڑیا اڑی، اڑ کر گئی بدیس
کھیل کھیل کر آگئی، پھر وہ اپنے دیس

غصہ کیوں آتا نہیں، سکھی ملن کی رات
کہی نہ اس نے رات بھر، کہنے والی بات

کتنا دوشت ہوگیا، دھرتی کا پری ویش
آسمان پر لے چلیں، کیا ہم اپنا دیش

ضدی دل کو کیا کہیں، بانک سے اطوار
کھیل کھلونہ دیکھ کر، مچلے بارمبار

بھیتر صورت اور کچھ، باہر صورت اور
صورت صورت دیکھ کر صورت بدلیں ٹھور

تمہیں ملی ہے سلطنت، ملا ہمیں کشکول
اس کا ہم سمجھے کہاں، گنت اور بھوگول

حیدر قریشی

ماہیے

گل عشق کی شان کی تھی
لٹ پٹ ہونا تھا
یہ فصل ہی دھان کی تھی

کچھ من کی خرابی تھی
کچھ اس چہرے کی
رنگت بھی گلابی تھی

دکھ حق تھا غریبوں کا
تم سے گلہ کوئی
نہ ہی شکوہ نصیبوں کا

اس پیار کی زنجیریں
دل کا ہیں سرمایہ
یہ درد کی جاگیریں

زخموں سے بھرا سینہ
عشق کی دنیا میں
جینا ہے یہی جینا

مسجد ہے نہ مندر ہے
دل یہ ہمارا تو
اک دکھ کا سمندر ہے

تو کس کا سوالی تھا
دامنِ دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

سب دکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں

سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ
اس کی مثال کہاں
آپ اپنی نظیر ہے وہ

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مچ ہی
وہ آنکھ نشیلی تھی

جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دیئے ڈیرے

کچھ قید سنا دیتے
عشق کے مجرم کو
کوئی تو سزا دیتے

مونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہلے ہلیے
جب آنکھ لڑائی تھی

بیروں سے لدی بیری
جو مرضی اس کی
اب مرضی وہی میری

کوئی وہم یا جادو تھا
رنگ ہوا اُس کا
جسم اُس کا خوشبو تھا

اظہار ضروری ہے
پیار اگر ہو تو
اقرار ضروری ہے

لمحاتِ حضوری میں
فرق نہیں رہتا
قربت اور دُوری میں

دل شہر مدینہ ہو
نورِ محبت سے
روشن ہر سینہ ہو

سورج ان ہاتھوں میں
اور ستاروں کے
اسرار ہیں باتوں میں

گلشن کھنہ

ماہیے

سوچوں کے شرارے ہیں
من میں سہانے سپنے
پلکوں پہ ستارے ہیں

اک جھلک دکھا جا تو
کاجل بن کر ہی
آنکھوں میں سما جا تو

ندیا میں روانی ہے
تجھ بن او سجنا
برباد جوانی ہے

برہا کا دکھ بھاری
تو جب چھوڑ گیا
اس دل پہ چلی آری

پریت اپنی پرانی ہے
یہ ٹوٹا ہوا دل تو
تیری ہی نشانی ہے

ہے آگ ہواؤں میں
ڈھونڈوں تجھے بھی
لندن کی فضاؤں میں

پھولوں میں کانٹے ہیں
مذہب والوں نے
انسان بھی بانٹے ہیں

ساون کی پھواریں ہیں
پیار کے گلشن میں
جنت کی بہاریں ہیں

شاذ رحمانی

ماہیے

کچھ تو ہے ہواؤں میں
شعلہ سا اٹھتا ہے
رہ رہ کے فضاؤں میں

لمحوں کو بڑھا دینا
ہوں گے ہمیں مجرم
سولی پہ چڑھا دینا

پر درد فسانہ ہے
کس کو سنائیں ہم
مصروف زمانہ ہے

مخمور نہیں ہوں میں
کیفِ تخیل سے
لمحے میں کہیں ہوں میں

الفت کی ہتھیلی میں
یادوں کے جگنو ہیں
تاریک حویلی میں

کچھ ایسے بھی تھے گیانی
پیار محبت کو
کہتے رہے نادانی

سوہن راہی

گیت

وہ مرے سپنے سجانے آئے
روح میں ڈھلنے لگے کتنے سنہرے سائے
وہ مرے سپنے سجانے آئے

شمع یادوں کی جلی روشنی مجھ میں آئی
گیت پھر بننے لگی میرے لئے تنہائی
وہ سیہ راتوں میں تاروں کا گلستاں لائے
وہ مرے سپنے سجانے آئے

وہ مہکتا ہوا اک چاند ہے کرنوں کی غزل
یا مرے سانسوں کی جمنا میں نیا تاج محل
رات اور دن کے جھروکوں میں وہی لہرائے
وہ مرے سپنے سجانے آئے

گنگناتا سا اداؤں سے بھرا شوخ بدن
نور چھلکاتا ہوا حسن کی لہروں کا چمن
مدھ بھرے بولوں سے وہ دل میں اترتا جائے
وہ مرے سپنے سجانے آئے
روح میں ڈھلنے لگے کتنے سنہرے سائے
وہ مرے سپنے سجانے آئے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

ہائیکو

تتلی جب آئی
گل دستے کا خنداں گل
بن بیٹھا یہ دل

پاس نہ آئی
لاج کی ماری گوری
اپلا تھاپے ہے

شام اتری ہے
سامنے پیڑوں پر
گھونسلا سوتا

کوئی اجگر سا
اپنا شہر دبائے
چوہا سا گاؤں

شہر بے خبر
خلقتیں سوئی ہوئیں
کھوئی سی نظر

وہ پاشکستہ
خود ہی کھو گیا
لمبا سفر تھا

شام رہنے دے
قمقمے بجھنے لگے
جام رہنے دے

زندگی کی زمیں
اونگھتے بلبلوں جیسی
سایہ بھی سویا نہیں

گلستاں ہوں میں
سوکھے پیڑوں کی طرح
خوں چکاں ہوں میں

ڈالیوں کے گیت
بیتے لمحوں کے کھنڈر دیکھو
بچھڑے کتنے میت

چاہت کی گگن
سورج دہکتا نکلا
یہ کیسی لگن

اونچے ٹیلے پر
بیٹھی پھدکی اڑ گئیں
میری امنگیں

ڈرامہ

مسیحا

ساگر سرحدی

کردار

ہربنس: (ایک ہندوستانی سپاہی)
افضل: (ایک پاکستانی سپاہی)
سنت رام: (ایک رفیوجی)
کپتان: (ہندوستانی کیپٹن)
سیتا: (سنت رام کی بہن)
گم نام آدمی:

یہ ڈرامہ پہلی بار دی کرٹین The Curtain' کی طرف سے پاٹکر ہال بمبئی میں 29 جون 1965 کو کھیلا گیا۔

کشمیر کی سرحد — سورج ابھی نہیں نکلا — سامنے کانٹے دار تار ہیں۔ دائیں طرف فٹ لائٹس کے پاس ہندستانی فوج کی چوکی ہے اور خاردار تاروں کے پیچھے پاکستانی فوج کی چوکی ہے۔ آگے فٹ لائٹس کے پاس ہی بائیں طرف ایک جھونپڑی سی بنی ہے۔ جھونپڑی بھی کیا، ایک دو پرانے فوجی کمبل ٹینٹ کی طرح باندھ دیئے گئے ہیں۔ Balance کا واحد سہارا ایک کھمبا نظر آرہا ہے جو صلیب نما ہے۔ یہ اسٹیج کی طرف ہے اور ٹینٹ کو Balance کرتا ہے۔ دھند ابھی صاف نہیں ہوئی ہے۔

پردہ اٹھنے سے پہلے ہربنس کے گانے کی آواز آرہی ہے:

جندڑی دا بھا کوئی نا
اُے ویری مل وے چناں
جندڑی دا وسا کوئی نا

گانے کے ساتھ ساتھ پردہ کھلتا ہے۔

افضل: اے بے ہربنس۔
ہربنس: اوئے فضلو۔
افضل: یار سویرے سویرے درد ورد کی بات کرتے ہو، مروادو گے کیا؟
ہربنس: پیارے دھند دیکھ، اپنا ہاتھ تک دکھائی نہیں دیتا، جب کچھ نہیں دکھائی دیتا نا، دل کی یاد آتی ہے۔ اور ایسے میں جو میں تیرا نشانہ باندھ دوں تو کل صبح خبر دوڑ جائے گی۔ ایک پاکستانی سپاہی ہلاک۔
افضل: اوئے بنسے دے پتر۔
ہربنس: اُچروی۔
افضل: اور میرا نشانہ بھول گیا، بچپن میں غلیل سے بیر گرایا کرتا تھا۔
ہربنس: اسی دن سے تو یہ حسرت ہے کہ تیری اسی آنکھ کا نشانہ کروں۔
افضل: بچو ادھر بھی امریکی اسلحہ ہے۔
ہربنس: یار فضلو۔
افضل: بول ماں دیا یارا
ہربنس: دیکھ تیرے پاس بھی امریکی اسلحہ ہے نا؟
افضل: ہاں
ہربنس: میرے پاس بھی امریکی۔
افضل: پھر؟
ہربنس: یار
افضل: بول جانِ یار۔
ہربنس: امریکی کیا مدد کر رہے ہیں، سب کو اسلحہ دیتے ہیں، لڑو، خوب لڑو، بڑھیا سے بڑھیا، اسلحہ لو اور ایک دوسرے کو بھون کر رکھ دو، نفرت کو دھرم سمجھو اور اپنے اور پرائے دوستوں اور غیروں کو قتل کر دو۔
افضل: اوئے بھیم پلاسی دا پترا۔
ہربنس: ہاں۔
ہربنس: کبھی کبھی میں سوچتا ہوں۔
افضل: اوئے سوچا نہ کر، دیکھ تو دھوپ نکل آئی ہے۔ اوئے، اوئے کتنی

مزے دار ہے؟

ہربنس: فضلو۔

افضل: ہاں۔

ہربنس: تمہاری ایک بہن بھی تھی نا؟

افضل: ہاں

ہربنس: کیا نام ہے اس کا؟

افضل: مراداں۔

ہربنس: اب تو جوان ہوگئی ہوگی؟

افضل: ہنسیا۔

ہربنس: ہاں۔

افضل: وہ تمہاری بھی بہن لگتی ہے۔

ہربنس: ہاں یار، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا، او دیکھ اوئے استاد جی اٹھ گئے نا؟

افضل: استاد جی، السلام علیکم استاد جی۔

ہربنس اور افضل دونوں ہنستے ہیں

ہربنس: بچارے، بہن کا انتظار کر رہے ہیں۔

افضل: یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرف کوئی مرد نہیں رہا۔

پھر دونوں ہنستے ہیں۔

سنت رام کی عمر چالیس سال کے قریب ہے، بال کھچڑی ہو گئے ہیں، چہرے سے پریشانی ظاہر ہوتی ہے، نسیں تنی رہتی ہیں بولتے ہوئے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے وہ نہایت تکلیف سہہ رہا ہے۔ وہ عاجزی کے ساتھ ہندستانی سپاہی کے پاس جاتا ہے۔

سنت رام: بھائی صاحب! آج دن کیا ہے؟

ہربنس: اوئے فضلو، استاد جی دن پوچھ رہے ہیں۔

افضل: بول مرنے کا دن ہے۔

ہربنس: استاد! کس پھیر میں ہو۔ بادشاہو، نکل آؤ دنوں اور تاریخوں کے جھمیلے سے۔ آپ کا اسکول نہیں ہے، فرنٹ ہے، بارڈر۔ سامنے فضلو ہے میرا جگری یار، لیکن معلوم نہیں کب میرے سینے میں گولی داغ دے گا، یا اس کے پہلے ہی اُس کے سینے میں میں یہ امریکی عرف ہندستانی گولی پار کردوں۔

سنت رام: وہ آپ کا جگری یار ہے؟

ہربنس: ہاں، بچپن میں ایک ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی ماں بہن کو یاد کیا کرتے تھے۔

سنت رام: تو آپ اسے گولی مار دیں گے؟

ہربنس: گولی مارنا تو ہمارے لئے آنکھ مارنے کے برابر ہے۔

سنت رام: کیوں؟

ہربنس: اوئے فضلو، استاد پوچھتے ہے، ہم لوگ گولی کیوں چلاتے ہیں؟

افضل: بول یار، مجبوری میں۔

سنت رام: کاہے کی مجبوری؟

ہربنس: استاد جی پوچھتے ہیں کاہے کی مجبوری؟

افضل: استاد جی! ہمارے لیڈر منہ چلاتے ہیں اور ہمیں گولیاں چلانی پڑتی ہیں۔ جب فصلیں خراب ہوتی ہیں، اکال پڑتے ہیں، آدمی بھوکے ننگے مرنے لگتے ہیں تو لیڈر لڑائی شروع کردیتے ہیں اور ہم لوگوں کو فرنٹ پر بھیج دیا جاتا ہے۔

ہربنس: فضلو! بڑے پتے کی بات بول دی یار۔

افضل: بس اور سوال نہ کرنا، ایسی غلطی کبھی کبھی کرتا ہوں۔

ہربنس: استاد جی۔

سنت رام: کہو بھائی۔

ہربنس: ایک بات عرض کروں؟

سنت رام: جی۔

ہربنس: کاہے کو یہاں پڑے ہو، خواہ مخواہ گولی ووٹی لگ جائے گی؟

سنت رام: برخوردار! میں استاد ہوں، ساری عمر اسکول میں کاٹی ہے۔ بھیا ہم تو ہمیشہ پڑھایا کرتے تھے، آدرش کے لئے جان دے دو، آج کل استاد کو لوگ پرانا آدمی سمجھتے ہیں، یہ پروفیشن گھٹیا اور نیچے درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن میں تو پرانی صدی کا آدمی ہوں۔

ہربنس: لیکن یہاں کیوں پڑے ہیں، ہندستان میں جائیے، کوئی کام دھام مل جائے گا، بچوں کو پڑھاؤ۔

سنت رام: بھائی آدرش، میرا آدرش اور میری بہن۔

ہربنس: بہن آجائے گی آپ کی۔

سنت رام: روز سنتا ہوں، روز سنتا ہوں۔ لیکن کہاں ہے میری بہن؟ میں نے اسے بچی کی طرح پالا تھا۔ وہ میری بہن، وہ میری لاڈلی۔ شادی کرانے کا ارمان تھا۔ میرے سپنے میں دیکھو لوریاں سوئی ہوئی ہیں، دعائیں سوئی ہوئی ہیں، میں کس پر قربان کروں، میں کس پر قربان کروں اپنی یہ مٹی سی جان۔

پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا ہے

ہربنس: استاد جی! یہ کیا، دھیرج رکھئے، اس عمر میں بھی آپ روتے

ہیں۔

سنت رام: میرا دل روتا ہے بھائی، میری آتما روتی ہے، جگر لہو ہو رہا ہے۔ ہائے کہاں لے گئے اسے، کون چنگیز ہے، کون کافر ہے؟ ہائے مٹی میری چھوٹی سی لاڈلی۔

وہ واپس پتھر پر بیٹھ جاتا ہے، کیپٹن مگ میں چائے لے کر آتا ہے۔ سپاہی سلام کرتا ہے اور اٹینشن کی حالت میں کھڑا رہتا ہے۔

کیپٹن: لیجئے استاد جی چائے پی لیجئے۔

سنت رام: کیوں تکلیف کرتے ہو تم روز؟

کیپٹن: استاد کی خدمت کرنا آپ ہی نے پڑھایا تھا۔

سنت رام: پرانی باتیں ہیں لڑکے، بہت پرانی باتیں ہیں۔

کیپٹن: استاد جی اچھی باتیں کبھی پرانی ہوتی ہیں؟

سنت رام: سب جھوٹی ثابت ہو رہی ہیں، میں پڑھایا کرتا تھا اپنے وطن سے پیار کرو، اپنی مٹی کو چومو اور جہاں پیدا ہوئے ہو اس جگہ کے گیت گاؤ۔ کہاں ہے وہ وطن؟ کس کا وہ وطن؟ آج پاکستان، کل ہندستان ہے۔ آج امریکہ ہے، کل جارج ٹاؤن ہے۔ آج جرمنی ہے کل پولینڈ ہے۔

کیپٹن: آپ کو سوچنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔

سنت رام: ہاں بھیا، سوچنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔

کیپٹن: چائے۔ دو گھونٹ پی لیجئے۔

سنت رام چائے پیتا ہے، کیپٹن ٹہلتا ہے۔ سنت رام چائے کا مگ رکھتا ہے۔

کیپٹن: آپ کو یاد ہے استاد جی؟

سنت رام: کیا؟

کیپٹن: بچپن، میرا بچپن۔

سنت رام: مجھے اپنے ایک طالب علم کا بچپن یاد ہے۔

کیپٹن: آپ سنیچر کی شام کو گھر چلے جایا کرتے تھے نو میل پہاڑی سفر طے کر کے، اور سویرے پھر نو میل کا سفر طے کر کے ٹھیک ساڑھے دس بجے اسکول پہنچ جاتے تھے۔

سنت رام: وہ دن، ہاں ان دنوں میں جوان تھا۔

کیپٹن: آپ کو ہم دیکھتے تھے تو کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے۔

سنت رام اٹھ جاتا ہے، جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

سنت رام: جب میں گھر سے نکلا کرتا تھا تو اندھیرا ہوتا تھا۔ ہوا ٹھنڈی، گدگدانے والی، شریر، تنگ کرنے والی ہوا۔ آپ بے شک رونی صورت بنا رہے ہوں، وہ ہوا میرے وطن کی وہ ہوا آپ کو ہنسا دے گی۔ پھر میں اس پہاڑی دریا میں نہایا کرتا تھا، میرے جسم کا خون میری رگ رگ میں دوڑ کر اور سرخ ہو جایا کرتا تھا اور میں راستے سے شیو جی کے مندر سے ہو کر گھاٹی اترتا تھا تو سورج کی کرنیں، پہلی پہلی، ہلکی ہلکی معصوم کرنیں میرے ماتھے کو چوم لیتی تھیں۔ ہائے میرا وطن، جہاں نظر بھاگتی تھی سبزہ بھاگتا تھا، جہاں نظر ٹھہرتی تھی پھول اگتے تھے، جہاں دل سنبھلتا تھا گھاٹیاں لہراتی تھیں، جہاں دل مچلتا تھا دریا لپکتا تھا۔

کیپٹن: آپ کو کیسے یاد ہے سب کچھ؟ مجھے تو اتنا یاد نہیں، ہم تو سب کچھ بھول گئے، وطن بھول گئے، نام بھول گئے، ذکر ایسے آتا ہے جیسے پریوں کی کہانی ہو۔

سنت رام: برخوردار، میں استاد تھا، آدرش ہمارا جیون تھا اور جب کوئی گاؤں شروع ہوتا تھا تو چاروں طرف سے آوازیں آتی تھیں استاد جی سلام! دور سے، ٹیلوں سے، مکانوں کی چھتوں سے لوگ پکارتے استاد جی ناشتہ کرتے جائیے، استاد جی دودھ پیتے جائیے۔ اور میری جہاں طبیعت چاہتی تھی ناشتہ کرتا، دودھ پیتا۔ میں ہندو تھا اور میرے تقریباً سارے طالب علم مسلمان تھے۔ جان چھڑکتے تھے، آنکھ کے اشارے پر جان دیتے تھے۔

کیپٹن: مجھے یاد ہے اسکول میں پہنچتے ہی ہم سب لڑکے آپ کے پاؤں داب تے تھے۔ سرفراز، غنی، عبدالسلام، انور خاں، پولاد خاں اور میں۔ ہندوؤں میں میری صحت ہی اچھی تھی۔ ان کی جوڑی کا میں ہی تھا اور آپ ہم لوگوں کو لطیفے سنایا کرتے تھے، ہماری کلاس سب سے اچھی کلاس تھی، سب سے زیادہ نمبر ہمیں ملتے تھے، آپ کی بدولت ہمارا سارا گاؤں آپ کو پوجتا تھا۔

سنت رام: اب ہم رفیوجی ہوگئے ہیں۔

کیپٹن: جی۔

سنت رام: برخوردار۔

کیپٹن: جی۔

سنت رام: میں نے جو کچھ بھی پڑھا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم رفیوجی کیوں بنے ہیں۔

کیپٹن: پتا نہیں استاد جی، شاید سیاست۔

سنت رام: یہ لفظ رفیوجی اتنا گھٹیا، قابل رحم اور قابل نفرت۔

کیپٹن: جی ہاں۔

سنت رام: میں انکار کرتا ہوں کہ میں رفیوجی ہوں، مجھ پر رحم کیوں کرتے ہو؟ میں نے تو سہارا نہیں مانگا تھا۔

کیپٹن: لیکن آپ رفیوجی ہیں۔

سنت رام: یہی تو میں پوچھتا تھا۔ میرے گھر پر تھانے دار صاحب آئے، بولے استاد جی گاؤں چھوڑ دیجئے، یہاں سے چلے جائیے نہیں تو ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکیں گے۔

کیپٹن: جی ہاں، تقریباً سب لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے، کچھ لوگ تو گھر لٹا آئے ہیں اور کئی لوگوں کے ماں، بہن بھائی سب قتل ہو گئے ہیں۔

سنت رام: اور ہماری یہاں حفاظت ہوگی؟

کیپٹن: جی۔

سنت رام: کس چیز کی حفاظت؟

کیپٹن: آپ کی۔

سنت رام: برخوردار میں کیا ہوں، رفیوجی کی حفاظت، میرے پاس میری روح ہی نہیں، آتما ہی نہیں، کیا کرو گے مجھے بچا کر، رفیوجی بنا کر ہمارا کیا کرو گے؟

کیپٹن: جی۔

سنت رام: میری زبان کوئی بولتا ہے؟ میری زبان کا کوئی گیت گاتا ہے۔ میرے دریا کا ترنم کس دریا میں ہے؟ میرے سبزوں کی شادابی کس سبزے میں؟ میرے آسمان کا رنگ کس آسمان میں ہے اور میرے پہاڑوں کی اونچائیاں اور رعنائیاں کن پہاڑوں میں ہیں؟ ان کے بغیر میں کیا ہوں۔ کس کی حفاظت کرو گے؟ پہلے اجاڑتے ہو پھر بساتے ہو۔ اجاڑتے وقت نہیں دیکھتے کیا اجڑتا ہے اور بساتے وقت تو دیکھ لو کیا بسے گا۔

کیپٹن: بھول جائیے سب، خواہ مخواہ یاد کر کے اپنی جان کو تکلیف دیتے ہیں اذیت دیتے ہیں۔

سنت رام: خوب سیاست ہے آج کل، دنیا بھر میں رفیوجی۔ برما، سیلون، جرمنی، امریکہ اور افریقہ — رفیوجی، رفیوجی۔ ہندستان، پاکستان — رفیوجی نہیں چاہتا کہ اس کے ماتھے پر لیبل لگا دو۔

کیپٹن: ایک بات مانیں گے آپ؟

سنت رام: ہاں، کہو برخوردار۔

کیپٹن: آپ کا مجھ پر وشواش ہے؟

سنت رام: تم میرے عزیز ہو، میرے طالب اور میرے بھائی کی طرح۔

کیپٹن: یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

سنت رام: تو —؟

کیپٹن: میرے یہاں ہوتے ہوئے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔

سنت رام: اس مٹی کو لے کر کہاں جاؤں گا؟

کیپٹن: پاس کے گاؤں میں چلے جائیے، میں رہنے کا بندوبست کروا دوں گا۔

سنت رام: عزیز ابھی نہیں۔

کیپٹن: مان لیجئے۔

سنت رام: نہیں، ابھی نہیں جب تک میں سرحد پر ہوں، میں رفیوجی نہیں ہوں۔ جس دن میں نے یہاں سے ایک قدم بڑھایا تو میرے ماتھے پر رفیوجی کا لیبل لگ جائے گا۔ ابھی میری روح بے قرار ہے ابھی وہ مری نہیں، جس دن روح نہ رہی، جہاں مرضی ہو مجھے لے جانا پھر سارے ملک، ساری فضائیں میرے لئے برابر ہیں۔

کیپٹن: اتنی ہٹ تو کوئی پاگل آدمی بھی نہیں کرتا۔

سنت رام: تم بھیا، بس اتنی مہربانی کرو۔

کیپٹن: کہئے۔

سنت رام: میری بہن آجائے تو فوراً مجھے خبر کر دو۔

کیپٹن: اس کی چنتا آپ نہ کریں، کچھ رفیوجی آرہے ہیں مجھے یقین ہے آپ کی بہن بھی آجائے گی۔

سنت رام: بس اس کے بغیر من نہیں لگتا، دل بیٹھتا رہتا ہے، ہر وقت اس کا خیال رہتا ہے، کبھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی، اور میرا اتنا خیال رکھتی تھی، چھوٹی سی عمر میں گھر کا سارا بوجھ.....

آواز بھر آتی ہے۔

کیپٹن: اس طرح سوچنا چھوڑ دیجئے۔ بیٹھ جائیے، آرام کیجئے، میں جا کر تفتیش کرتا ہوں، اُس کے آتے ہی یہاں لے آؤں گا۔

کیپٹن مگ لے کر چلا جاتا ہے۔ افضل گاتا ہے

کوٹھے اتے کاں بولے

چٹھی میرے ویری دی

وچ میرا اوی ناں بولے

وے چٹھی میرے ویری دی

دھوپ آہستہ آہستہ بڑھ جاتی ہے۔ گم نام آدمی داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک پرانا فوجی کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ دھوپ کے ہٹ جانے سے سردی بڑھ گئی ہے۔ گم نام آدمی نے بے حد پی رکھی ہے۔ ایک تھیلے میں ڈھیر ساری خالی بوتلیں ہیں۔

گم نام آدمی: ماسٹر جی۔
سنت رام: آؤ بھائی۔
گم نام آدمی: آپ مرے نہیں ابھی تک؟
سنت رام: بدقسمت ہوں، بچا ہوں۔
گم نام آدمی: بڑے افسوس کی بات ہے۔
سنت رام: میرے مرنے سے تمہیں کیا سکھ ملے گا؟
گم نام آدمی: مجھے، مجھے ملا کیا ہے جو ملے گا۔ میں نے مکتی پراپت کر لی ہے نروان اور اور نجات۔
سنت رام: شراب پی کر؟
گم نام آدمی: شراب پی کر نہیں، شراب پی پی کر۔
سنت رام: بڑی جلدی مکتی پراپت کر لی ہے۔
گم نام آدمی: اس کے لئے من کو مارنا پڑتا ہے، سنیاسی لوگ جو مندروں میں کیرتن کرتے ہیں اور جنگلوں میں بھٹکتے ہیں وہ کمزور ہوتے ہیں اور من کو نہیں مار سکتے ہیں۔
سنت رام: تو پھر تم شراب کس لئے پیتے ہو؟
گم نام آدمی: شراب تو اس لئے پیتا ہوں کیوں کہ مل جاتی ہے۔
سنت رام: تمہارے نروان کا جواب نہیں۔
گم نام آدمی: آپ کو یقین نہیں ہے؟
سنت رام: ہیں۔
گم نام آدمی: اس 'ہیں' سے ظاہر نہیں، آپ مجھے گالی دیجئے۔
سنت رام: کیوں؟
گم نام آدمی: ویسے ہی۔
سنت رام: نہیں۔
گم نام آدمی: آپ کسی کام کے نہیں، دیکھئے میں خود اپنے آپ کو گالی دیتا ہوں غور سے سنئے۔ "میں الو کا پٹھا ہوں۔" اب دیکھئے مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ اس کو نروان کہتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ابھی نروان اتر رہا ہے۔

وہ نیچے بیٹھ جاتا ہے، تھیلے سے شراب کی خالی بوتلیں ایک ایک کر کے نکالتا ہے، سب خالی ہیں۔ پھر وہ ایک ایک گھونٹ دو تین بوتلوں سے نچوڑتا ہے۔

سنت رام: اب کیا کرو گے؟
گم نام آدمی: نروان پراپت کرنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔
سنت رام: وہ کیا؟
گم نام آدمی: اپنے کو گولی مار دو۔
سنت رام: دیر کس بات کی ہے؟
گم نام آدمی: مجھے بندوق چلانی نہیں آتی۔
سنت رام: کسی سپاہی سے کہو تو تمہاری مدد کرے۔
گم نام آدمی: میں نے ایک سپاہی سے بنتی کی تھی، کہتا تھا سگریٹ کون لائے گا۔ اب دیکھئے کتنی خودغرضی ہے، اپنے سگریٹ کے لئے مجھے نروان پراپت کرنے نہیں دیتا۔
سنت رام: افسوس کی بات ہے۔
گم نام آدمی: آپ کو بندوق چلانی آتی ہے؟
سنت رام: بندوق ہے تمہارے پاس؟
گم نام آدمی: میں چوری کر لوں گا۔
سنت رام: نروان کے لئے؟
گم نام آدمی: آدرش کے لئے چوری بھی کرنی چاہئے۔
سنت رام: مجھے تو بھائی بندوق تو کیا، غلیل چلانی بھی نہیں آتی، اور اگر آتی بھی ہو تو، میں ہتیا نہیں کر سکتا۔
گم نام آدمی: آپ تو میرا کوئی کام نہیں کرتے۔
سنت رام: لیکن میرے پاس ایک طریقہ ہے۔
گم نام آدمی: جلدی بتاؤ؟
سنت رام: وہ پاکستانی سپاہی ہے نا، اس سے کہو۔
گم نام آدمی: اس سے بھی کہہ چکا ہوں۔ میں نے اس سے کہا پاکستانی سپاہی بہت بہادر ہوتے ہیں تو وہ ہنسنے لگا۔
سنت رام: کیوں؟
گم نام آدمی: کہنے لگا کوئی سپاہی بہادر نہیں ہوتا۔
سنت رام: فلاسفر ہے!
گم نام آدمی: فلاسفر نہیں، شاعر ہے۔ کہتا تھا ہر سپاہی خوف زدہ ہوتا ہے اور اس لئے گولی چلاتا ہے کہ خود نہ مارا جائے۔
سنت رام: پھر؟
گم نام آدمی: میں نے ایک پتھر اٹھایا، میں نے کہا خوف زدہ ہو جاؤ اور اپنی جان بچانے کے لے مجھے گولی مار دو۔
سنت رام: اچھا؟
گم نام آدمی: وہ پھر ہنسنے لگا، بس ہنسے جا رہا تھا، میں بھی پتھر اٹھائے تھک چکا تھا، میں نے پتھر پھینک دیا۔ پھر اس نے مجھے رم پلائی۔

سنت رام: تم کھانا وانا نہیں کھاتے، بس پیتے رہتے ہو؟
گم نام آدمی: کھانا تو سنیاسی کھاتے ہیں، تبھی تو انہیں نروان نہیں ملتا۔

وہ اٹھتا ہے

گم نام آدمی: اب میں کیا کروں، مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے، میں ڈرتا ہوں، میری یادوں کے بھوت میرا پیچھا نہ کریں۔
سنت رام: تمہیں کچھ کھانا چاہئے۔
گم نام آدمی: میں رو پڑوں گا۔

وہ کوٹ اتار کر پھینک دیتا ہے، ایک پھٹی ہوئی تار تار قمیص، ایک پھٹا ہوا تار تار پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔

سنت رام: کیا کر رہے ہو، ٹھنڈ لگ جائے گی۔
گم نام آدمی: ٹھنڈ وہیں ہے ماسٹر جی جہاں میں نے کوٹ پھینک دیا ہے، اب میں کیا کروں، مجھے ہوش آ رہا ہے۔

وہ بوتلوں کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کانپ رہا ہے۔ ایک ایک بوتل دیکھتا ہے اور پھینکتا جاتا ہے۔

گم نام آدمی: مجھے ہوش آ رہا ہے، اب میں کیا کروں۔ میری یادوں کے بھوت مجھے دبوچ رہے ہیں۔ دیکھو چیلیں اور گدھ، کتے اور ہڈیاں، پنجر، لاشیں، کیڑے، سب کے سب مجھے کھا رہے ہیں۔
سنت رام: (اس کی طرف بڑھتا ہے) کیا ہو رہا ہے تمہیں، کیا تکلیف ہے؟
گم نام آدمی: مجھے ہاتھ نہ لگایئے گا، میرے سارے جسم پر چھالے ہیں، پھپھولے ہیں۔
سنت رام: تمہیں اسپتال جانا چاہئے۔ چلو کیپٹن کے پاس لے چلوں، وہ میرا شاگرد تھا۔ تمہیں دوا دلوا دے گا۔
گم نام آدمی: (رو کر) میں ہوش بیچ دینا چاہتا ہوں، میں ہوش کھو دینا چاہتا ہوں، دیکھو بٹوارے کے دن! یہ کشتی — میرا بچہ، میری بیوی، میری بوڑھی ماں — اور کئی بچے، کئی بیویاں، کئی مائیں — اور کنارے سے لوگ پتھر مار رہے ہیں۔ میرے بچے کا سر پھٹ گیا، میری بیوی کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے، میری ماں مر گئی ہے اور وہ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ پتھروں کی بوچھاریں ہیں، پتھروں کی بارش ہے اور ادھر دریا میں ہماری کشتی ہے، کوئی ڈر کے مارے دریا میں چھلانگ لگا رہا ہے اور ڈوب رہا ہے — کوئی راستہ نہیں، کوئی راستہ نہیں، اور کشتی ڈوب رہی ہے، کشتی ڈوب گئی ہے۔

(وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے)

سب مر گئے، سب ڈوب گئے اور میں بچ گیا — اپنی یادوں کے بھوت لئے — آپ ایک بہن کے لئے روتے ہیں، میں کئی بہنوں کئی ماؤں، کئی بچوں کے لئے روتا ہوں — میں چاہتا ہوں ہوش بیچ دوں، میں چاہتا ہوں میں سب کچھ بھلا دوں، اتنی بربرتا، اتنی حیوانیت کہاں، کس دور میں تھی — کہیں نہ تھی — کہیں نہ تھی۔

روتے روتے باہر نکل جاتا ہے۔ ذرا سی تاریکی اور بڑھ جاتی ہے۔ درختوں کا سایہ ہے۔

سنت رام ادھر ادھر ٹہل رہا ہے۔ ہر بنس گاتا ہے

آج آکھاں وارث شاہ نوں
قبراں وچوں بول
نے آج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا کھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی
تو لکھ لکھ مارے بین
اج لکھاں دھیاں روئیاں
تینوں وارث شاہ نوں کہیں

اتنے میں سیتا کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ سیتا اور کیپٹن داخل ہوتے ہیں، سیتا باقاعدہ ہنس رہی ہے۔

سیتا: بھائی، کتنی دیر کا بھائی اور تھوڑی دیر میں میرا مرد۔
(ہنستی ہے)
سب ایک جیسے ہیں، کوئی بھائی کہتا ہے کوئی رشتہ دار اور کوئی باپ۔ کوئی فرق نہیں۔
کیپٹن: ماسٹر جی! صبر سے کام لیجئے، اس کے دماغ پر شدید گہری چوٹ آئی ہے، نہایت نرمی اور پیار سے یاد دلایئے اور اگر میری ضرورت ہو تو فوراً بلا لیجئے۔

کیپٹن چلا جاتا ہے۔
سنت رام سیتا کی طرف دیکھتا ہے۔

سیتا: کہاں جانا ہوگا؟ تمہارا گھر نزدیک ہے نا، دیکھو میں بہت دور نہیں جا سکوں گی، چلتے چلتے میں تھک چکی ہوں اور تھوڑی دیر مجھے سو جانے دینا، کتنے دن، کتنی راتیں ہو گئی ہیں کہ میں سو نہ سکی۔
سنت رام: سیتا۔
سیتا: سیتا، کس کا نام سیتا؟ ہاں میری ایک سہیلی تھی، اس کا ایک بھائی بھی تھا، چاند سا بھائی، وہ اپنے بھائی کی لاڈلی تھی لیکن بیچاری کا پتا نہیں۔
سنت رام: سیتا!

سیتا: کمال ہے، پاگل تو نہیں ہو گیا۔

سنت رام: مجھے نہیں پہچانتی؟

سیتا: یہ لو، ابھی تو ملے ہو ابھی کیسے پہچان لوں۔

سنت رام: سیتا میری بہن۔

سیتا: نہ جان نہ پہچان، بھئی میرا نام سیتا نہیں ہے، میرا کیا نام ہے ٹھہرو بتاتی ہوں، کمال ہے مجھے اپنا نام یاد نہیں، تمہیں کوئی ایسا پاگل آدمی ملا ہے جسے اپنا نام یاد نہ ہو؟

سنت رام: تمہارا نام سیتا ہے۔

سیتا: نہیں۔

سنت رام: میں سچ کہہ رہا ہوں، دیکھو ہمارا خون سانجھا ہے، ذرا غور سے دیکھو۔

سیتا: دیکھو سیتا میری سہیلی کا نام تھا، وہ میری بڑی اچھی سکھی تھی، اس کی یاد نہ دلاؤ مجھے، میں رو پڑوں گی۔ اچھا میں تمہیں اپنا نام بتاتی ہوں شاداں، مراداں، شبنم، نزہت، رخسانہ، کمال ہے کتنے نام ہیں میرے۔ ایسا کوئی آدمی ملا ہے تمہیں جس کے بہت نام ہیں؟

زور زور سے ہنستی ہے۔

سنت رام: سیتا! تم میری بہن ہو، ذرا غور سے سنو، بہن لفظ کتنا پوتر ہے، گنگا کے پانی کی طرح، میری طرف دیکھو۔

سیتا: میں بہت تھک گئی ہوں۔

سنت رام: یہاں بیٹھو۔

بیٹھ جاتی ہے اور اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہے۔

سیتا: تم کون ہو؟

سنت رام: میں تمہارا بھائی ہوں، ابھاگا بھائی، جس سے تو بچھڑ گئی تھی۔

سیتا: میرا بھی ایک بھائی تھا۔

سنت رام: کہاں ہے وہ؟

سیتا: پتا نہیں

سنت رام: یاد کرو۔

سیتا: مجھے چھوڑ گیا، نہیں مجھ سے چھین لیا گیا، میں نے بہت ڈھونڈا اُسے۔

سنت رام: تم اپنے بھائی سے بہت پیار کرتی تھیں؟

سیتا: تم بھی کیسے ہو۔ کون بہن، اپنے بھائی سے پیار نہیں کرتی؟

سنت رام: کیسا تھا وہ؟

سیتا: چاند سا۔

سنت رام: نام کیا تھا؟

سیتا: نام ––– نام یاد نہیں۔ یہ لو، ایسا آدمی آپ کو ملے گا جسے اپنے بھائی کا نام یاد نہ ہو۔

سنت رام: یاد کرو۔

سیتا: یاد کروں، اچھا۔

سنت رام: بتاؤ؟

سیتا: بھول رہی ہوں۔

سنت رام: کوشش کرو۔

سیتا: دیکھو میرے یہاں درد ہو رہا ہے۔

ماتھے پر ہاتھ پھیرتی ہے۔

سنت رام: میں دبا دوں۔

سیتا: نا، تم کیوں ہاتھ لگاؤ جی، اور آنکھوں کے سامنے مکڑی کے جالے ہیں۔

سنت رام: ادھر دیکھو۔

سیتا: ہاں۔

سنت رام: میرا نام یاد ہے؟

سیتا: تمہارا نام، ہاں۔ فیروز، عثمان، دلاور، عباس، کمال ہے کتنے نام ہیں تمہارے۔

سنت رام اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نہایت اذیت میں ہے۔

سنت رام: کیا بنا دیا ہے تمہیں، تم اپنے جسم پر لوگوں کے گناہوں کی کہانیاں لیے گھومتی ہو، گنگا جل میں میل آ گیا، گدلا ہو گیا ہے گنگا جمنا کا پانی۔

سیتا اس کے پاس آتی ہے۔

سیتا: تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں کیا؟

سنت رام: ہاں وہی روگ مجھے ہے جو تمہیں ہے۔

سیتا: اب کیا کرو گے؟

سنت رام: تم اپنے بھائی کا نام پکارو تو میں جان تک دے سکتا ہوں۔

سیتا: یاد کرتی ہوں اور بھول جاتی ہوں۔

سنت رام: اور اگر تم پہچان نہ سکیں تو مر جاؤں گا، یہ گناہ جو لوگوں نے تمہاری جھولی میں ڈالے ہیں ان کا کفارہ میں بھگتو گا، اپنے جسم میں زخم بھر دوں گا، پیپ اور خون کی دھاریں بہا دوں گا اور کہوں گا لوگو! دیکھو میں اپنی بہن کے گناہوں کا کفارہ بھگت رہا ہوں، وہ پوتر ہے، وہ گنگا جل ہے، میری حالت

دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔

سیتا: ایک بات بتاؤں؟

ست رام: کہو۔

سیتا: تم جیسا اچھا آدمی مجھے کہیں نہیں ملا۔

ست رام: تم جب اسی طرح دیکھتی ہو تو سیتا لگتی ہو، وہی سیتا جو مجھ سے بچھڑ گئی ہے۔

سیتا: میں بتاؤں سیتا کہاں ہے؟

ست رام: ضرور بتاؤ۔

سیتا: سیتا کا ایک بھائی تھا چاند سا، وہ سیتا سے بچھڑ گیا اور سیتا اسی دن مرگئی۔

ست رام: نہیں نہیں، ایسا نہ کہو بھگوان کے لئے ایسا نہ کہو۔

سیتا: میں نے بری بات کہی کیا؟ اچھا اب کچھ نہیں کہتی۔ کیا بات ہے میں جب کوئی بات کہتی ہوں تو تم دکھی ہو جاتے ہو؟

ست رام: اے بھگوان۔

سیتا: روؤمت۔

ست رام: میرا دل پھٹ جائے گا۔

سیتا: چپ ہو جاؤ۔

ست رام: اب میں کیا کروں؟ میرا آدرش بھی نہیں رہا، میری بہن بھی نہیں رہی۔

سیتا: بھگوان کے لئے روؤمت۔

ست رام: کیا بنا دیا ہے انہوں نے میں کہاں سے لاؤں، پہلے میرا جسم رفیوجی تھا، اب میری روح — لاؤ میری روح لاؤ، تہذیب اور زمانے کے خداؤ میری روح لاؤ۔

وہ خاردار تاروں والے کراس نما کھمبے پر چڑھ جاتا ہے۔

سیتا: روکو اسے، بھگوان کے لئے روکو اسے۔

ہربنس: استاد جی! نیچے آجائیے، میں کہتا ہوں نیچے آجائیے نہیں تو گولی ماردوں گا۔

افضل: اے پاگل آدمی! واپس آجاؤ نہیں تو چھلنی کردوں گا گولیوں سے۔

ست رام: سیاست، تہذیب اور زمانے کے خداؤ میری روح لاؤ، میری بہن اور میری ماں کی روح، میرے گاؤں اور میرے گھر کی روح، رفیوجی بنانے والو جواب دو — سنتے ہو؟

ہربنس اور افضل دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھار کرتے ہیں۔

کیپٹن داخل ہوتا ہے، گم نام آدمی بھی داخل ہوتا ہے، شام ہو چکی ہے، سورج کی سرخی سے مغرب روشن ہو چکا ہے، ست رام یسوع کی طرح خاردار تاروں والے کے ساتھ لٹکا ہے، چرچ کا آرگن بجتا ہے۔

سیتا رو رہی ہے دھاڑیں مار مار کر۔ کیپٹن سیلوٹ کرتا ہے۔

سیتا: یہ صرف میرا بھائی ہو سکتا ہے، یہ صرف میرا بھائی ہو سکتا ہے، میرا ویر، میرا......

اس کے قدموں میں روتی ہے۔

پردہ گرتا ہے

OO

زیارت نامہ: زیرِ طبع سفرنامے سے

میری کاپی کوری تھی...

مستنصر حسین تارڑ

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے
نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
.. کہ میری کاپی کوری تھی

ہمیں مجبوراً مسجد نبوی سے باہر آنا پڑا..

اور یہ مجبوری دل کو بھاتی تھی کہ روضۂ رسول تک پہنچنے کے لئے مسجد سے باہر آنا پڑتا ہے اور باہر آ کر باب السلام سے داخل ہونا ہوتا ہے..

یہ سلام کرنے والوں کا دروازہ ہے..

بس خدشہ سا تھا کہ کہیں یہ بندہ نہ ہو..

کیسا پرشکوہ مرصع اور عالی شان بلند دروازہ تھا یہ کون دیکھتا تھا..

اس کی جگہ اگر ایک بوسیدہ شکستہ در ہوتا.. ایک معمولی.. چنیوٹ یا سوات کے کاریگروں کا تراشا.. پھول بوٹوں والا.. آہنی کوکوں سے مزین ایک دروازہ ہوتا اور ایک زنگ آلود کنڈی ہوتی اور ہم وہ پہلے مسافر ہوتے جو اس کنڈی کو کھول کر اس کے کواڑ کھولتے اور اندر داخل ہوتے.. تو ہمیں اچھا لگتا..

ویسے حاضری کے شیدائی نہ اس شاندار دروازے کو دیکھتے ہیں اور نہ کسی بوسیدہ سواتی دروازے پر نظر کرتے کہ ان کی آنکھیں بالکل ہموار سطح پر سفر کرتی.. زائرین کے ہزاروں سروں پر سے گزرتی آخر اس مقام پر جا ٹھہرتی تھیں جہاں ایک جالی تھی.. یہاں سے کہاں دکھتی تھی.. پر تھی..

لوگ ہیجان میں ہوتے ہیں گھبراہٹ میں ہوتے ہیں ان کے اعصاب جواب دے رہے ہوتے ہیں جب وہ باب السلام کی جانب جا رہے ہوتے ہیں لیکن جوں ہی اندر قدم رکھتے ہیں تو یک دم چپ ہو جاتے.. ہیں شانت ہو جاتے ہیں.. ایک گہرے امن میں چلے جاتے ہیں.. کہ اب باری آ جائے.. دھیمے ہو جاتے ہیں..

جو کچھ کہتے ہیں زیر لب کہتے ہیں.. آواز بلند نہیں کرتے..

خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتے جو پکارتے ہیں فریاد کرتے ہیں دہائی دیتے ہیں وہ یہاں مدھم اور بے آواز ہو جاتے ہیں..

درود شریف جو مدینہ میں داخل ہوتے ہی سانس کے آنے جانے کی لے میں شامل ہو جاتا ہے یہاں اس کی گونج میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اندر ہی اندر.. بدن کے اندر.. برابر چلنے والے کو بھی خبر نہیں ہوتی..

یوں بھی ہر کوئی بے خبر ہو چکا ہوتا ہے اگر کوئی ایک فریاد کی لے بلند بھی کر دے.. تو بھی خبر نہ ہو.. ہرگز نہ ہو..

ایک طویل راہ داری ہے جس میں پہلو سے پہلو ملائے پانچ سات لوگ چل سکتے ہیں بلکہ رکتے تھمتے پاؤں گھسیٹے چل سکتے ہیں.. نہ آپ آگے چلنے والوں کو دیکھتے ہیں اور نہ جو آپ کے پیچھے ہیں وہ کسی مضطرب کیفیت سے لاچار ہوتے ہیں بائیں ہاتھ پر مسجد نبوی کی محرابیں قطار اندر قطار تا حد نظر چلی جاتی ہیں.. قرآن پاک کے شیلفوں کے برابر میں ریاض الجنۃ کا سفید قالین بچھا ہے.. منبر رسول ہے جہاں ابھی ہم تھے اور وہاں سے باہر نکل کر باب السلام میں داخل ہو کر پھر اس کے پہلو میں آ گئے تھے..

اور دائیں ہاتھ پر مسجد نبوی کی آخری دیوار ہے..

چنانچہ قرآن کے شیلفوں اور جالیوں کی دیواریں ایک جانب اور دوسری طرف مسجد نبوی کی دیوار اور ان کے بیچ یہ راہ داری جس میں ہجوم میں بھنچے ہوئے آپ سرکتے جاتے آگے ہوتے جاتے ہیں..

آخری دیوار ترکوں کی مزین کردہ گل بوٹوں اور مختصر آرائشی محرابوں والی ہے اور چھت سے عثمانی طرز کے فانوس لٹکتے ہیں جن کی روشنی چکا چوند والی نہیں دھیمی اور اثر انگیز ہے..

جیسے سلام کرنے والے اس راہ داری میں داخل ہو کر دھیمے اور اثر انگیز ہو جاتے ہیں.. یہ سجاوٹ اور فانوس اسی بناوٹ میں ہیں جس سے استنبول کی مسجدیں مزین ہیں.. مسجد نبوی کا یہ حصہ ترکوں کا تعمیر کردہ ہے اور ان کے ذوق جمال کے دھیمے لیکن اثر انگیز ہونے کی گواہی دیتا ہے..

سلجوق مجھے بار بار سہارا دیتا تھا کہ میں لاچار سا ہو گیا تھا.. یک دم بوڑھا ہو گیا تھا..

میں ایک مرتبہ پھر پوچھنا چاہتا تھا کہ یار ہمیں کچھ دکھائی دے جائے گا.. جو ہم دیکھنے آئے ہیں وہ دکھائی دے جائے گا.. ہم وہاں پہنچ جائیں گے..

"مسجد کے پاس ہی رسول اللہ نے دو حجرے تعمیر کروائے.. ایک ام المومنین حضرت سودہ کے لئے اور ایک حضرت عائشہ صدیقہ کے لئے.. ہر حجرہ دس فٹ چوڑا اور پندرہ فٹ لمبا تھا اور دیواریں کچی اینٹوں سے چنی گئی تھیں.. اور ان پر کھجورے کے پتوں کی چھتیں ڈالی گئی تھیں.. دروازوں کی بجائے کمبل کے پردے لٹکائے گئے تھے.."

بس ان ہی میں سے ایک حجرے کی جانب ہم سرکتے.. درود بھیجتے بڑھتے تھے.. اگرچہ مجھے روضہ رسولؐ کی جالی کی ایک ایک تفصیل یاد تھی.. اس کی پُر پیچ بناوٹ اور وہ بوند نما شگاف جو نشان دہی کرتے تھے کہ ان کے پیچھے جو خلا ہے اس میں آپ کا کون دفن ہے.. اس کے باوجود اب کچھ یاد نہ آتا تھا کہ آگے کیا ہے.. جس منزل کی جانب ہم بڑھ رہے ہیں اس کی شکل کیسی ہے.. اس کی بناوٹ کے کیا رنگ ہیں.. بس یہی خدشہ تھا کہ پتہ نہیں وہاں تک پہنچ بھی پاتے ہیں کہ نہیں..

جس گاڑی میں سوار ہونا ہے اس کا گارڈ اعلان کر دیتا ہے کہ بس اب مزید مسافروں کی گنجائش نہیں.. اور گاڑی بھی ایسی کہ دوبارہ نہیں آنے والی.. اور اگر پہنچ جاتے ہیں تو کچھ دکھائی بھی دیتا ہے کہ نہیں.. یوں ہی بے مراد.. جس منظر کو دیکھنے کے لئے آنکھیں تخلیق ہوئی تھیں اسے دیکھے بغیر دوسرے دروازے سے.. باب جبریل سے باہر دھکیل دیئے جاتے ہیں.. یہاں خانہ کعبہ کی مانند مدافعت تو نہیں کی جا سکتی تھی کہ نہیں میں نہیں دھکیلا جاؤں گا.. مزاحمت کروں گا اور دیکھ کر جاؤں گا.. دھکیلے جاتے ہیں تو بس چپ چاپ دھکیلے جاتے ہیں:

میرے ساتھ ایک شدید گڑبڑ ہو گئی تھی.. جو ہوتا چلا آیا تھا وہ نہیں ہو رہا تھا.. کچھ اور ہو رہا تھا.. جو طے شدہ ردعمل ہے اس کے برعکس سب کچھ ہو رہا تھا.. طے شدہ ردعمل.. جس سے انحراف شاید کفر کے دائرے میں آتا ہے.. یہی ہے کہ خانہ کعبہ میں داخل ہوتے ہی ایک ہیبت رُعب ڈر اور جلال کا احساس ہوتا ہے جب کہ مدینہ میں روضہ رسولؐ کے سامنے کچھ اور ہی موسم ہیں.. خوش گوار پرسکون اور ٹھہراؤ والے.. جمال والے.. بے ڈر..

لیکن یہاں تو معاملہ الٹ ہو رہا تھا..

میں وہاں بے خطر اور نڈر رہا.. جلال تو تھا لیکن کسی دہشت کا احساس نہ ہوا.. بلکہ تمام تر دعائیں مانگنے کے بعد خانہ کعبہ سے باہر آتا ہوں تو یاد آیا ہے کہ میں نے تو دشمنوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ مانگا ہے لیکن اپنے گناہوں کا نہ اقرار کیا ہے اور نہ انہیں بخش دینے کی کوئی التجا کی ہے تو بے خطر اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر میں نے کہا.. اب میں نے اتنے بھی گناہ نہیں کیے کہ تیرے سامنے گڑگڑاؤں.. معافیاں مانگوں.. بلایا ہے تو بخشش کے لئے ہی تو بلایا ہے تو معاف کر دے..

لیکن جب میں باب السلام میں داخل ہو کر پہلا قدم رکھتا ہوں.. اس ہجوم کا ایک ذرہ بن جاتا ہوں جو روضہ رسولؐ کی جانب سرک رہا ہے تو میں ایک شدید خوف کی لپیٹ میں آ جاتا ہوں.. نہ ٹھہراؤ ہے.. نہ خوش گواری ہے اور نہ سکون ہے.. ڈر جاتا ہوں..

جیسے ایک بچہ پہلے دن سکول جانے سے خوف زدہ ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں وہاں کیا ہوگا.. امی تو نہیں ہوں گی تو کیا ہوگا.. میں نے اسکول نہیں جانا، وہ دہائی مچا دیتا ہے..

میں ایسے ڈر جاتا ہوں..

روضہ رسولؐ پہلے دن کا اسکول ہے اور میں نے وہاں نہیں جانا..

میں فرار ہو جانا چاہتا ہوں.. لوگوں کو دھکیلتا یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں.. لیکن فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی ہیں..

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے..

آگے تو جانا ہی نہیں چاہتا.. اور پیچھے زائرین کی ایک دیوار دھیرے دھیرے سرکتی چلی آ رہی ہے.. کوئی ایک اینٹ سرکے تو میں اس میں سے راستہ بنا کر نکل جاؤں..

کوئی ایک اینٹ کیسے سرکے تو میں مجبوری کی حالت میں ہوں اور آگے سرکتا جاتا ہوں..

میری ٹانگوں میں جان نہیں رہتی.. میرے حواس جواب دے چکے ہیں.. لیکن کیا کروں.. مجبور ہوں.. ایک عجیب سی گھبراہٹ میرا دم گھونٹتی ہے..

میرے بھی.. اور ہر شخص کے لب ہل رہے ہیں..

مدینہ منورہ کے نواح میں کھجوروں کے جھنڈ پر نظر پڑتے ہی جوں ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم اس کی بستی میں داخل ہو رہے ہیں تو چاہنے نہ چاہنے کا اختیار ختم ہو جاتا ہے اور لب حرکت میں آ جاتے ہیں..

درود وسلام کا دور شروع ہو جاتا ہے.. اور ایسا مسلسل رہتا ہے کہ اس کے بعد.. اٹھتے اٹھتے.. چلتے پھرتے.. کھاتے پیتے.. سوتے جاگتے.. غسل خانے میں چہرے پر چھینٹے مارتے.. باتیں کرتے.. یہاں تک کہ دکان داروں سے بھاؤ تاؤ کرتے بھی.. بے آواز لب ہلتے چلے جاتے ہیں:

یہ دستور ہے..

نہیں دستور میں تو کسی حد تک پابندی کا شائبہ ہوتا ہے..

یہ بس کی بات نہیں.. بے اختیاری کی مجبوری ہے..

مجھ سے چلا نہیں جا رہا.. میرے پاؤں ایک بوڑھے خچر کی مانند بوجھل ہو رہے ہیں.. اتنے بھاری ہو رہے ہیں جیسے ان کے گرد لوہے کے من من کے باٹ بندھے ہیں..

لیکن فرار کا کوئی راستہ نہیں.. کوئی صورت نظر نہیں آتی..

اگر زائرین کو دھکیلتا چیرتا آگے چلا جاؤں تو وہاں ایک چیک پوسٹ ہے.. جس میں سے میں گزرنا نہیں چاہتا کہ پکڑا جاؤں گا..

پیچھے چلا جانا بھی امکان سے باہر ہے..

تو محض مجبور ہو کر آگے بڑھتا جا رہا ہوں..

لیکن میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے..

میں ایسا دہشت زدہ ہوں کہ حبِ رسول کی سرشاری بھی معدوم ہو رہی ہے.. نہ دیوانہ وار آگے بڑھتا ہوں اور نہ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں اور آنکھیں بھی صحرائی لکڑی کی طرح خشک اور سوکھی ہیں.. کہاں ہیں سکھ کے وہ دھارے جو بدن کو بھگو کر راحت عطا کرتے ہیں.. سکون کسے کہتے ہیں اور حاضری کا سودا جو سمایا ہوا تھا کہاں ہے..

تو ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

میرے لئے تو یہاں کچھ قرار نہیں.. گھبراہٹ ہی گھبراہٹ ہے جو مجھے مفلوج کئے جاتی ہے.. ابھی کچھ دیر پہلے جب سفید چھتریاں صحن مسجد کو ایک مصنوعی شجر کی طرح ڈھک رہی تھیں تو روپوش ہوتے سبز گنبد پر میری جو نظر گئی تھی واپس نہ آئی تھی وہیں ٹھہر گئی تھی تو اس لمحے تو مجھ میں خوف کا کچھ سایہ نہ تھا.. گھبراہٹ تھی تو صرف اس خدشے سے کہیں میں وہاں تک پہنچ نہ پاؤں.. دیکھ نہ سکوں.. سلام نہ کر سکوں.. چاؤ تھا، اشتیاق تھا.. تو پھر یہ پل بھر میں کیا سے کیا ماجرا ہو گیا.. اور ماجرا میری سمجھ میں آنے لگا..

میرے بدن کی کھڈی جو حاضری کے چاؤ میں کھٹ کھٹ چلتی جاتی تھی یار کی چاہت کا رانگلا کیس بنتی جاتی تھی یک دم جو اٹک رہی ہے تو ایسا کیوں ہو رہا ہے.. اگر تانے پیٹے کے دھاگے ایک دوسرے میں الجھ گئے ہیں تو یہ کیا معاملہ ہے..

یہ تو کوئی اور ہی معاملہ تھا..

قابل گردن زدنی معاملہ تھا لیکن سمجھ میں آ گیا..

کہیں سے کوئی اشارہ تو ہوا تھا.. کوئی امداد تو پہنچی ہوگی ورنہ میں کہاں دانا تھا.. اللہ تعالیٰ کا تصور نہیں کیا جا سکتا.. اس کی کوئی تصویر نہیں بنتی..

یہ ایک موہوم موجودگی ہے جسے ہاتھ تو نہیں لگایا جا سکتا.. چھو کر تو نہیں دیکھا جا سکتا کہ یہ ہے کہ نہیں ہے.. بتا دیا جاتا ہے کہ ہے.. اور ہم سر تسلیم خم کر دیتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہے.. میدان عرفات میں وہ محسوس ہوتا ہے.. کہیں آس پاس ہے.. اس کی موجودگی میں کچھ شبہ نہیں رہتا.. آپ اس سے ہم کلام ہوتے ہیں اور وہ سنتا ہے آپ کو یقین ہوتا ہے.. نہ ہو تو آپ کا ہے کو اتنی گریہ زاری کریں..

ایک کرن آپ کی سرخ آنکھوں میں بھرے پانی کے پردے میں سرایت کر کے اس کے اپنے جدا اور انوکھے رنگ کیسے بکھیر دے.. اس کے باوجود یہ خیال تو آتا ہے کہ کہیں یہ پچیس لاکھ لوگ تو نہیں جو اس کی موجودگی کو تخلیق کر رہے ہیں.. آپ اسے مانتے ہیں تبھی تو اتنے دور کے شہروں سے آئے ہیں.. اور اس کے باوجود.. گنجائش رہتی ہے.. اور یہاں..

باب السلام میں داخل ہوتے ہی ایک تضاد ایک فرق سامنے آنے لگتا ہے.. اس کی موجودگی برحق لیکن موہوم ہے.. نہ ہاتھ لگا کر اطمینان کر سکتے ہیں نہ ذہن میں اس کی کچھ شباہت بنتی ہے.. اس کی پورٹریٹ کی ایک لکیر بھی انسانی تصور سے ماورا ہے.. کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیسا ہے.. کوئی تصویر نہیں بنتی لیکن.. چند قدم کے فاصلے پر جو شخص محو خواب ہے، وہ موجود تھا.. ہزاروں نے اس کے انسانی بدن کو جو ہم جیسا تھا اسے چھوا تھا.. ابوعبیدہ کی مانند اس کے رخساروں پر اپنے لب رکھے تھے.. ان کا پیٹ چوما تھا.. سلمان فارسی نے مہر رسالت کو بوسہ دیا تھا اور کس کس نے ان کی انگلیاں اپنے لبوں سے نہیں لگائی تھیں.. سب نے اطمینان کر لیا تھا کہ وہ ہے اور ہم جیسا ہے.. اور اس نے خود کہا تھا کہ میں بھی تم جیسا ہوں اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وحی اترتی ہے..

اس کی مکمل پورٹریٹ آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے.. تصویر بن جاتی ہے آنکھیں کیسی گھنیری سیاہ ہیں.. زلفیں کندھوں تک.. کہاں تک آتی ہیں.. بالوں کی ایک لکیر ناف تک جاتی ہے.. شانے کیسے چوڑے اور شاندار ہیں.. کسی نے کہا کہ جب وہ اونٹنی پر سوار ہونے لگے تو چادر ان کے پیٹ سے ذرا کھسک گئی اور وہ ریشم ایسا ملائم اور خوش نظر تھا.. چلتے تھے تو ایسے جیسے اترائی سے اتر رہے ہوں.. بیٹھتے کس انداز سے تھے.. قد درمیانہ تھا.. سیاہ کمبل میں لپٹے کیسے لگتے تھے.. ان کی حیات کا ایک ایک لمحہ.. ہر مسکراہٹ.. ہر زخم ہر اداسی.. ہر پژمردگی اور ہر مسرت درج تھی.. وہ تھے.. موجود تھے..

ان کے وجود میں کوئی ابہام نہ تھا.. وہ جتنے برس جیئے جتنے سانس لئے وہ سب کے سب درج تھے.. یہاں تک کہ گرمی کی حدت کم کرنے کے لئے مدینے کے جس کنوئیں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی درج ہے کہ پانی ان

کی پنڈلی پر کہاں تک آتا تھا..

چنانچہ ان کی تو مکمل تصویر سامنے آتی ہے.. آپ انہیں دیکھ سکتے ہیں..

جیسے میں.. میرے جیسا بھی.. انہیں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنے حجرے کے دروازے پر بڑا کمبل ہٹا کر اصحاب صفہ کے تھڑے کی جانب آ کر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اے مستنصر.. مجھ سے بھی پوچھتے ہیں..

تو بس یہی ماجرا تھا.. دراصل موہوم اور موجود کا معاملہ تھا..

تو پھر؟

موہوم کے ساتھ آپ کچھ فریب کر سکتے ہیں کہ وہ تو دکھائی نہیں دے رہا.. جانے ہے کہ نہیں.. یعنی فریب کرتے ہوئے آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کے فریب کو نہیں سمجھتا.. کہ جو بھی چال آپ چلتے ہیں وہ آپ سے بڑھ کر چال باز ہے کہ قرآن یہی کہتا ہے.. بے شک آپ کو بتایا جاتا ہے کہ وہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور وہ ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ اس کی تصویر نہیں بنتی وہ تصور میں نہیں آتا آپ اس سے سولا پروائی برت جاتے ہیں..

لیکن وہ تو موجود تھا..

موجود کے ساتھ آپ کیسے فریب کر سکتے ہیں.. کہ وہ تو دکھائی دیتا ہے..

آپ اس کے ساتھ تو چال نہیں چل سکتے جس کی مکمل تصویر آپ کے سامنے ہے.. چنانچہ جو موجود تھا.. ایک شباہت ایک تصویر والا تھا اس کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے بس وہی کچھ ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہو رہا تھا..

میں اسی لئے فرار ہو جانا چاہتا تھا.. پلٹ جانا چاہتا تھا کہ وہ تو ہے..

اور اس نے میرے لئے کچھ حدود متعین کی تھیں کہ دیکھو حیات کو اس طور پر بسر کرنا ہے.. اپنے شب و روز یوں گزارنے ہیں.. جہاں بے انت آزادیاں عطا کی تھیں وہاں کچھ پابندیاں بھی عائد کی تھیں..

اور میں نے حیات کو اس کے کہنے کے مطابق بسر نہیں کیا تھا..

اس کی پابندیوں پر عمل نہیں کیا تھا..

اپنے شب و روز ویسے نہیں گزارے تھے جیسے اس نے ہدایت کی تھی..

اور آج پیشی ہو گئی تھی..

اُس کے ہاں تو روز حشر پیش ہونا تھا اور اس کے ہاں اسی دنیا میں پیشی ہو گئی تھی..

تو کیا جواب دوں گا؟

بے شک وہاں تو میرے ہاتھ میری آنکھیں بدن کے سب حصے گواہی دیں گے لیکن یہاں تو میری خاموشی سب سے بڑی گواہی ہوگی..

اسی پیشی کا ڈر میری گھبراہٹ کا منبع تھا..

جو جانتا ہو کہ میں نے جرم کیا ہے وہی کچہری میں داخل ہوتے ہوئے وہاں سے فرار ہو جانے کے منصوبے بناتا ہے..

بچپن میں.. چوتھی یا پانچویں جماعت میں ماسٹر صاحب گھر کا کام دیا کرتے تھے کہ یہ سوال نکالنے ہیں، یہ جواب مضمون کل لکھ کر لانا ہے.. اور میں اکثر کھیل تماشے میں محو ہو کر گھر کا کام بھول جاتا تھا.. اور اگلے روز سزا کے ڈر سے اپنی کلاس کے سب سے پچھلے بنچ پر سر جھکائے کبڑا سا ہو کر یوں بیٹھ جاتا تھا کہ شاید ماسٹر صاحب کی نظر مجھ پر نہ پڑے اور ان کی نظر ہمیشہ مجھی پر پڑتی تھی اور وہ کہتے تھے "آ جاناں مستنصر اور دکھا مجھے گھر کے کام کی کاپی.."

اور میری کاپی کوری ہوتی تھی.. اور میں اس کوری کاپی کو سنبھالتا تھا.. ایک ہاتھ سے گرتی ہوئی نیکر کو اڑستا.. زرد خوف سے نچڑتے چہرے کے ساتھ پچھلی نشست سے اٹھ کر تخت پوش پر کھڑے ماسٹر صاحب کی جانب جاتا تھا تو میرے پاؤں من من کے ہو جاتے تھے.. چلنے سے انکاری ہو جاتے تھے اور میں وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا.. یہاں بھی وہی ماجرا تھا.. معاملہ وہی تھا..

میری ٹانگوں میں جان نہ رہی تھی کہ آگے چیکنگ ہونی تھی اور میں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا..

میری کاپی کوری تھی..

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
پاویں گا دیدار صاحب دا..

تو میری کاپی کوری تھی..

میں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا..

اس لئے میرے پاؤں بوجھل ہو رہے تھے..

جو اس نے ہدایت کی تھی اس پر عمل نہیں کیا تھا اور پیشی ہونے کو تھی..

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے..

...میں حسب معمول سلجوق اور سمیر کے بلند قامت رومی ستونوں کے درمیان میں.. ان کی عافیت کی گود میں آگے بڑھتا جاتا تھا، بار بار سلجوق کے کندھے کو تھام کر اس کندھے کے پار دیکھنے کی سعی کرتا تھا، وہ 'کچھ' دیکھنے کی کوشش کرتا تھا جو 'کچھ' میں دیکھنے آیا تھا.. کچھ دکھائی نہ دیتا تھا 'یار کتنی دور ہے؟'"

اور وہ کچھ جواب نہیں دیتا.. اس کے چہرے پر جو سنجیدگی ہے میں اس سے ڈر جاتا ہوں.. وہاں رشتوں کی کوئی پہچان نہیں ہے، وہ مجھ سے منقطع ہو چکا ہے اور کہیں اور جڑ چکا ہے..

میں پھر اس سے مخاطب ہوتا ہوں "مجھے بتا دینا کہ کدھر دیکھنا ہے جالی

میں کون سا روزن ہے، جس کے اندر دیکھنا ہے یہ نہ ہو کہ ہم یوں ہی چلتے جائیں اور گزر جائیں۔ پلیز بتا دینا"

وہ کچھ جواب نہیں دیتا۔۔ پتہ نہیں کچھ سن بھی رہا تھا یا نہیں۔۔

میری گھبراہٹ میں کچھ کمی ہو رہی تھی۔۔فرار ہو جانے کے خیال میں کچھ خلل آرہا ہے۔۔ٹھیک ہے میری کاپی کوری ہے لیکن میں پیشی کے خیال سے ہراساں نہیں رہا۔ زیادہ سے زیادہ ڈانٹ پڑ جائے گی، اور کیا ہو گا۔۔

۔۔۔ یہ ایک بہت مختصر سفر تھا، چند سو قدموں کا، باب السلام میں داخل ہو کر روضۂ رسول تک کا، شرمندگی، ڈر اور گھبراہٹ کا، لیکن چند قدموں کا جو اگرچہ میں نے اس روز پہلی بار ایک ہی بار اختیار کیا۔۔

لیکن یہ کیا ہے کہ میں نے اسے بار بار اختیار کیا۔۔

بعد میں جو متعدد حاضریاں ہوئیں وہ کچھ یاد نہیں۔ ان کے سفر یادداشت سے اترتے جاتے ہیں لیکن یہ جو پہلا سفر تھا اسے میں اب بھی اختیار کرتا ہوں۔ کہ وہ ثبت ہے میرے بدن اور احساسات پر۔۔ اس کا ایک ٹھپہ لگ چکا ہے۔۔ یہ پہلا رنگ ہے جو ہاتھ سے چلنے والی پرنٹنگ مشین سے میرے کورے کاغذ پر لگا۔ اس کے بعد بھی بہت سے رنگ اس کے اوپر لگے لیکن یہ پہلا رنگ ہی نمایاں رہا۔۔ یاد رہا۔۔

یہ چند سو قدم حرفوں، عقیدت اور دانش کے احاطے میں تو آنے سے رہے۔ تو پھر کیوں نہ انہیں بار بار اختیار کیا جائے۔۔

یہ چند سو قدم کا فاصلہ ایسا تو نہیں کہ اسے بس ایک بار بیان کیا جائے۔۔

۔۔۔ وطن واپس ہوا اور جب میں اپنی نارمل حیات یا ابنارمل زندگی کے قرینوں میں پھر سے سما جانے کی سعی کر رہا تھا تو مولانا حسرت موہانی کی ایک عاشقانہ اور فاسقانہ غزل کے کچھ بول میرے کانوں میں اترے۔۔ یاد رہے کہ یہ وہی مارکسی مولانا ہیں جنہوں نے 'ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے' اور 'دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے' ایسی فاسقانہ غزل کہی تھی۔ کاش کہ آج کے مولانا بھی ایسے مولانا ہوتے۔۔ تو یہ غزل عابدہ پروین اپنی اکثرا کتا دینے والی ایک ہی دھن اور لے میں گائیگی سے جدا ہو کر کسی اور ہی رنگ میں گا رہی تھیں کہ:

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

میں اس شعر کو سنتا ہوں تو یک لخت منقطع ہو جاتا ہوں۔۔

گلبرگ کے اپنے مختصر گھر میں دنیا سے جڑ جانے اور صلح صفائی کے عمل میں مصروف ہوں حج کے فوراً بعد تو مجھ پر یہ افتاد آن پڑتی ہے۔۔

میں پھر سے باب السلام میں داخل ہو رہا ہوں۔۔

روضۂ رسول کی جانب بڑھ رہا ہوں۔۔

اور جو بھی چہرے میرے آس پاس ہیں اور ان میں ایک میرا چہرہ بھی ہے تو یہ سب کے سب جمال یار سے روشن ہو رہے ہیں۔۔

یہ جو انجمن ہے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے چہروں کی کیسی روشن ہوتی جاتی ہے۔۔ نہ صرف روشن ہے بلکہ سنہری جالیوں میں جو گل روپوش ہے اس کی آتش سے یہ چمن تمام دہک رہا ہے۔۔ رخساروں پر جو آنسو گرتے جا رہے ہیں ان کو بھی چھوا نہیں جا سکتا کہ وہ اس آتش گل سے دہک رہے ہیں۔۔

میں اس لمحے اخبار پڑھ رہا تھا، اطمینان سے دنیا سے جڑا ہوا، مولانا کی غزل کا مقطع سنائی دیا تو سب خبریں اور اخبار میں چھپے ہوئے حرف بے معنی لگنے لگے۔۔

کون سا یار۔۔ کس کا جمال۔۔ انجمن کون سی۔۔

وہی یار ہے۔۔ وہی جمال ہے۔۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں اور انجمن بھی وہی ہے۔۔ میں پھر سے اس یار اس کے جمال اور اس کی انجمن میں چلا جاتا ہوں۔۔

میں جو بمشکل دنیاوی کھڈی پر بیٹھ کر خواہش، آسائش اور ہوس کے تانے بانے سے اپنے لئے ایک چادر بن رہا تھا تو اس مقطع نے وہ تانا بانا الجھا دیا۔۔

جمال یار کی کنڈی پانیوں میں اتری اور میرے بدن میں کھب گئی۔۔ میں منقطع ہوا اور اس خانہ جمال کی جانب بڑھتے ہوس کاروں میں ہو گیا۔۔

آس پاس جتنے چہرے تھے۔۔ سب کے سب جمال یار سے روشن ہو رہے تھے۔۔ ایسے کہ ان کی نسل کے نقش اور رنگ اس میں معدوم ہو رہے تھے اور وہ سب کے سب ایک ہی رنگ کے۔۔ پیا کے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ ان کے نین نقش بھی ایسے ہو گئے کہ ان کی الگ الگ پہچان باقی نہ رہی۔۔

یہ جمال یار کا کرشمہ تھا کہ ان کے نین نقش رنگ اور چہرے ایک سے ہو گئے تھے۔۔ ایک ہی شکل کے ہو گئے تھے۔۔

۔۔۔ دریا پار رانجھن کا ڈیرہ تھا اور دل اس ڈوبنے دریا میں ڈوبتا تھا۔۔ ایسے ڈوبتا تھا کہ سطح آب پر آتا تھا، تو خون کی ترسیل رک جاتی تھی کہ پتہ نہیں میں وہاں تک پہنچ پاؤں گا یا نہیں۔۔

۔۔۔ یہ ہم شکل چہرے نہ صرف روشن ہو رہے تھے بلکہ آتش گل سے بھی دہک رہے تھے۔۔ وہ گل جو اقرأ کی آگ میں دہکنے لگتا ہے۔۔ یک دم اس آتش کے آگاہ ہونے پر جان نہیں پاتا کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے ایک چادر اوڑھا دو۔۔ ایک سیاہ کمبل اس دہکتے ہوئے گل کے گرد لپیٹا جاتا ہے لیکن وہ آتش مزید بھڑکتی ہے بجھتی نہیں۔۔ ابھی تک نہیں بجھی۔۔ اسی آتش گل سے وہ آنسو دہک رہے تھے جو ان ہم شکل سودائیوں کے رخساروں پر گرتے چلے جاتے ہیں۔۔

حیرت، غرور حسن پہ شوخی سے اضطراب

دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

کیسے کیسے چلن حیرت کے تھے..وہ دہکتا گل، کسی ایک حیرت کا بیان بھی ممکن نظر نہیں آتا..آج تک جو لکھا گیا ہے جو لکھا جائے گا اسے ایک اقرأ کی صدا کے بعد پڑھ لینے کی حیرت، ہر مروجہ اور روایت سے بغاوت کی حیرت، اور کل تخلیق کردہ مخلوق میں سے اعلیٰ اور برتر ہونے کے باوجود سادگی، انکساری اور دکھ سہہ جانے کی حیرت..اور کیسا غرور حسن کہ معیار ٹھہر گیا اور کوئی بھی اس پر پورا نہ اتر سکا کہ وہ صرف اسے ہی عطا کیا گیا تھا..

شوخی بھی ایسی کہ کھجور کی گٹھلیاں ن کی، بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی..اونٹ کے بچے کی بات، اماں صفیہ کی ڈھارس کیسے مسکراتے ہوئے بندھاتے ہیں اور اماں عائشہ کیسے اپنے رخسار ان کے بدن کو چھوتے ہوئے ایک گیت سنتی ہیں..

اور اضطراب بھی کیسا کیسا!

وحی نازل ہونے پر اضطراب اور پھر ایک عرصہ نہ نازل ہونے پر اضطراب..اپنی امت کے لئے نواسوں کے لئے اور فاطمہ کے لئے کیسے کیسے اضطراب..

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

جسم یار کی خوبی کیسی انوکھی ہے کہ اس پر جو پیراہن ہے جو اسے ڈھکتا ہے جس کے رنگ سبز بھی ہیں اور شوخ سرخ بھی ہیں..اس کے مرقد کو ڈھکتا ہے سنہری آیات سے کاڑھا ہوا تو کیسی عجب رنگ ریزی میں ڈوبا ہوا ہے وہ پیراہن تمام..صرف اس لئے کہ اس کے تلے جو زمین ہے، جس میں جسم یار ہے اس کی خوبی ہے کہ وہ اوچھاڑ، غلاف، چادر وہ پیراہن رنگینیوں میں ڈوب چلا ہے..

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

یہ سب کے سب ہم شکل چہرے، جن میں سے ایک میرا چہرہ بھی ہے تو یہ ہوش میں کب ہیں..یہ تو اس یار کی چشم کی جادو نگاہیاں ہیں کہ صرف ایک نگاہ اس کے پیراہن کی جانب ڈالی ہے تو ہوش رخصت ہو گئے اور یہ وہ سودائی تھے کہ اگر انہیں ہوش آ جاتا تو پکار اٹھتے کہ بے ہوشی ہی اچھا تھا ناحق مجھے ہوش آیا..

چند قدموں کا ایک مختصر سفر میرے لئے حیات کی طویل ترین مسافتوں سے کہیں بڑھ کر طویل ہو گیا..صرف ایک فرق کے ساتھ کہ وہاں ان مسافتوں کے دوران ہر لمحے قدم گنتے تھے..شب و روز شمار کرتے تھے اور حساب کرتے تھے کہ کب یہ سفر ختم ہو گا اور یہاں یہ ڈر کہ کہیں یہ سفر ختم ہی نہ ہو جائے..اس سفر نے شاید اپنے پرانے پاپی من کو تو نہیں بدلا لیکن ایک عجیب عنایت ہوئی کہ عبادتوں اور شعروں میں جو مفاہیم نظر آتے تھے وہ بدل گئے..پہلے کچھ اور نظر آتا تھا اور اب کچھ اور ہی نظر آنے لگا..جیسا کہ حسرت کی اس غزل کے سلسلے میں وارد ہوا..

وہ جو یک طرفہ ٹریفک تھی وہ رک گئی..

ہر عبادت اور ہر شعر میں کچھ اور ہی پوشیدہ نظر آنے لگا..

میری حالت جواب تک رہی تھی وہ حالت بدل گئی..

میں شاید نہ بدلا لیکن مفاہیم ایک نئے پیراہن میں ملبوس نظر آنے لگے جواب تک میری نظروں سے اوجھل تھے اور یہ سب روضہ رسول کی جانب بڑھتے ہوئے بدلا..بلھے شاہ، بھٹائی، شاہ حسین اور عثمان فقیر اس رنگ میں نظر آئے جس میں دنیا کے رنگ تھے..ایک اور رنگ میں رنگے نظر آئے..یہ عشق کے ستائے ہوئے لوگ تھے اور میں بھی ان کی مانند کچھ مغلوب ہو رہا تھا..وہ معتوب لوگ تھے اور شاید میں بھی معتوب ہو جاؤں..یہاں تک کہ عام سے قسم کے فلمی گانے بھی کچھ اور معانی رکھنے لگے..سیونی میرا دلبر جانی..مکھ موڑ گیا ہے..دل توڑ گیا ہے..یا پھر، گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے..تو وہ کون ہے، جس کے بغیر گلشن کا کاروبار نہیں چل سکتا..

تو مفاہیم بدل گئے..یک طرفہ ٹریفک رک گئی اور سوچ کی ٹریفک کسی اور سمت چل نکلی..مغلوب ہو گئی..

شیرینی نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

بیشک میر کے سوز و گداز میں شیرینی نسیم ہے لیکن..

حسرت کے سخن پہ لطف سخن میرے لئے یوں تمام ہوا کہ اس میں تصوف کے سوا یار کے روشن جمال کے تذکرے تھے..آتش گل سے دہکتے ہوئے چمن تھے..اس کی جادو نگاہیاں تھیں..

میں روضۂ رسول کی جانب بڑھتے ہوئے ہم شکل روشن چہروں کے ساتھ تو نہیں چلتا تھا واپس وطن میں، اپنے گھر میں اخبار پڑھتے اس مارکسی مولوی کی غزل سنتا تھا اور اس کے لطف سخن کی اثر انگیزی سے آنکھیں بھگوتا پھر سے باب السلام میں داخل ہو کر جمال یار کی روشنی میں جاتا تھا اور میرے گھر والے ذرا تشویش اور حیرت میں آئے ہوئے مجھے تکتے تھے..کہ یہ ابھی یہاں تھا اور ابھی کہاں چلا گیا ہے..

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا
میں اسے دیکھوں، بھلا کب دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہم نے تقریباً نصف مسافت طے کرلی تھی..اور اب منبر رسول کے علاقے میں سے گزر رہے تھے..چنانچہ منزل قریب ہو رہی تھی..

اور ہم منزل نہ کر قبول والوں میں سے نہیں تھے..

لاہور سے روانگی کے وقت میمونہ کے بھائی آفتاب نے اپنی سفید ریشمی ریش سہلاتے ہوئے جو اگلے دو چار برسوں تک ان کے گھٹنوں کو چھونے والی تھی سہلاتے اسے سنوارتے ہم رشک کرتے کہا تھا کہ بھائی جان آپ جتنی دیر مکہ میں قیام کریں تو دوسرا کلمہ لگاتار پڑھتے رہیں اور جتنا عرصہ مدینہ میں نصیب ہو تو وہاں ہر سانس کے ساتھ درود شریف کا ورد کرتے رہیں اور ہم کر رہے تھے..

درود شریف کے سوا بھی تو بہت کچھ من میں آتا ہے اسی من میں جو پرانا پاپی ہے..شب بھر میں مسجد تو بنا سکتا ہے لیکن نمازی نہیں بن سکتا..تو اس من میں بہت کچھ آتا تھا..

میں نے اس من کو ڈھیل بھی بہت دے رکھی تھی..کہ جو جی میں آئے کر..اور اس کے جی میں پنجابی کی صوفی شاعری آتی چلی جاتی تھی..عجیب پہلے کبھی گمان میں نہ آنے والے معنی ظاہر ہوتے چلے جاتے تھے..

اور میں درود شریف کے علاوہ حضور کو مخاطب کر کے جو شعر بھی یاد آتا تھا انہیں سناتا چلا جاتا تھا..

مولانا حالی آگئے اپنی گردن کے گرد مفلر لپیٹے..

"وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا"

اگرچہ اس سے پرے بھی مجھے، مرادیں غریبوں کی بر لانے والا، اپنے پرائے کا غم کھانے والا یاد تو آتا تھا لیکن میں اس مصرعے پر اٹک گیا، ہکلا گیا، کہ وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا..

میں اس نبی کو سلام کرنے جاتا تھا..سرکتا ڈرتا..جاتا تھا..

پھر مجھے نہیں معلوم کہ ثریا کہاں سے آگئیں..ایک اداکارہ ایک گلوکارہ..

انہیں تو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ آگئیں..چونکہ میں گانٹھ کا پکا، ہوشیار اور کھچر اعتقیدت مند تو نہیں تھا کہ عوام انسان کو رلانے کے لئے صرف وہ بیان کرتا جو سننا چاہتے تھے..ثریا کو سنسر کر دیتا..

ثریا آئیں اور اپنے اونچے دانتوں اور پنجابی پکار میں صدائیں دینے لگیں..

"بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے دل کا سفینہ، شاہ مدینہ"

مجھے نہیں معلوم کہ ثریا کبھی شاہ مدینہ کے دربار میں حاضر ہوئیں یا نہیں..

لیکن ان کی یہ نعت حاضری کے مترادف ہے..میں گواہی دے سکتا تھا کہ دل کا سفینہ بھنور میں آن پھنستا ہے اور فریاد صرف شاہ مدینہ سے کی جا سکتی ہے..

پھر حفیظ میرے لبوں پر آ گیا..

نہ تو کبھی اس جالندھری کی شاعری کو پسند کیا اور نہ اس کی شخصیت کو..

لیکن اس نے روضۂ رسول پر میری ناپسندیدگی کو روند کر میری ترجمانی کی..

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی..

حفیظ زیادہ دیر نہیں ٹھہرا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کا شعر لبوں پر ناگہاں آیا جو شاعر نہ تھا..تنگ بند مسخرہ ایک تخول تھا اور اس کے باوجود اس کے نصیب میں ایک ایسا شعر آگیا جس نے اسے باشعور عالم فاضل شعراء سے ممتاز کر دیا..یہاں تک کہ اقبال سے بھی بڑا ہو گیا..

نبی کا جس جگہ پہ آستاں ہے

زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

نبی کے آستاں کی جانب چلتے سرکتے اور جھجکتے استاد امام دین گجراتی کا یہ شعر کیا اور کیسے کہا جائے کہ کیسے اثر کر رہا تھا..جس جگہ پہ..وہ جگہ قریب آرہی تھی..جس جگہ پہ آستاں ہے..زمین کا جتنا ٹکڑا آسماں ہو گیا تھا میں اس کے قریب ہو رہا تھا..سلجوق کے کندھے پر ہاتھ رکھے اپنا پرانا پاپی من جانے کیا کیا الاپ رہا تھا قابو میں نہ تھا، کوئی تمیز نہ تھی اسے کہ یہ کون سا مقام ہے اور یہاں کے آداب کیا کیا ہیں..کیا کہنا ہے اور کیا کہنے سے اجتناب کرنا ہے..اس من کے من میں جو آرہا تھا کہے جا رہا تھا اور حضور سے مخاطب ہو کر کہے جا رہا تھا..

میرے لب ایسے ہل رہے تھے جیسے عرضیاں ٹائپ کر رہے ہیں..ڈیئر سر میں نے گھر کا کام نہیں کیا کاپی کوری ہے شفاعت کی التجا ہے حشر دہاڑے بے حساب لوگوں میں سے مجھے ضرور پہچان لیجئے گا میرا ہاتھ پکڑ کر سفارش کر دیجئے گا کوری کاپی پر کہیں صفر نہ لگ جائے کچھ نمبر دلوا دیجئے گا..بے شک تھرڈ ڈویژن میں سہی لیکن پاس کروا دیجئے گا..میں ایسی دعائیں بھی مانگتا جو ضابطہ تحریر میں لانے سے گریز کر رہا ہوں کہ آپس کا معاملہ تھا جس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا کہ شرک بھی تو گناہ ہے..

ہم تھے تو زمین پر لیکن آسمان کے ایک ٹکڑے کے قریب ہو رہے تھے..

نبی کا جس جگہ پہ آستاں ہے جس جگہ آیا ہے بلاوا مجھے..

مجھے بچپن سے ایک بلاوا آ گیا..

یادداشت میں کچھ باقی نہ بچا تھا سوائے ایک بیٹھی ہوئی پرسوز آواز کے..متروک آواز کے ہمراہ اتنے ہی پرسوز رکتے رکتے متروک ہو چکے سازوں کی سنگت..پیغام صبا لائی ہے گلزار نبی سے: آیا ہے بلاوا مجھے دربار نبی سے: دربار نبی سے: (گلوکارہ: شمشاد بیگم۔ ان ظ) نہ لفظوں میں کوئی شان و شوکت اور نہ اظہار میں کچھ شدت جیسے کوئی اپنی مسرت پوشیدہ کرنے کی خاطر خود سے باتیں کرتا ہو..سرگوشیاں خود سے ہو رہی ہوں کہ کوئی اور نہ سن

لے.. پیغام آ گیا ہے: بلاوا آیا ہے تو بس چپکے سے رخت سفر باندھ لو.. جلدی کرو.. اور اس باتیں کرتی دھیمی نعت کی یاد سے جو پر بہار اثر ہوا ایسا ہوا کہ بدن گلزار ہوا.. گلزار نبی کی قربت سے کیسا گلزار ہوا کہ سو رنگ کے گل بوٹے میرے اندر گھنے اور مہک آور ہوئے ایسے ہوئے کہ میرے پاؤں مزید الجھنے لگے.. الجھنے لگے.. جیسے جوش گل بہار میں اڑتے ہوئے مرغ چمن کے پاؤں الجھتے ہیں: پیغام صبا لائی ہے گلزار نبی سے: آیا ہے بلاوا..

لیکن یہ جو ہلتے لبوں سے عرضیاں ٹائپ ہوتی چلی جا رہی تھیں، ڈھیر سر کی درخواستوں کے ڈھیر لگ رہے تھے ایسے کہ راستے میں حائل ہو رہے تھے، التجائیں اور سفارشیں ناکافی تھیں، اس کی مدح میں لکھے گئے حرف جو مجھ پر برابر اثر کرتے جا رہے تھے یہ ایسے نہ تھے کہ مجھے پار لے جاتے..

ان سے ڈھارس نہ بندھتی تھی، دل میں خوف کم تو ہوا تھا پر سراسر زائل نہ ہوا تھا، یہ عرضیاں اور شعروں کی یہ کشتیاں ایسی نہ تھیں کہ ان کے سہارے پار اترا جا سکتا، دریا پار رانجھن کے ڈیرے تک جایا جا سکتا..

اور آس پاس اس آس میں نظر کرتا تھا کہ کوئی ہے جو میرے ساتھ چلے.. اپنے ساتھ مجھے بھی اس کے ڈیرے تک لے جائے.. کوئی نہ تھا.. کیسے ہو سکتا تھا کہ ہر کوئی سہارے کی تلاش میں تھا کسی اور کو سہارا کیا دے..

اور کاغذ کی یہ درخواستیں اور شعروں کی کشتیاں تو ڈوب ڈوب جاتی تھیں ان میں سے کسی میں مجھے پار تک لے جانے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ صلاحیت..

بھیڑ گھنی ہونے لگی، لب جو ہلتے تھے بکل ہونے لگے پھڑکنے لگے اور میں محسوس کر سکتا تھا کہ پاؤں تلے جو قالین بچھا تھا اس کے گل بوٹے نمی سے نمایاں ہو رہے ہیں.. وہ رخساروں سے گرنے والے آنسوؤں کو کہاں تک جذب کر سکتا تھا.. نبی کا جس جگہ پہ آستاں تھا یہ اس کی قربت کے نرم کرشمے تھے جو پاؤں تلے بچھے جاتے تھے..

پھر جیسے غیب سے مدد آ گئی..

ایک کشتی صرف میری خاطر ساحل تمنا کے ساتھ آ لگی..

عثمانی گنبدوں کی نیلاہٹ میں ایک لمبی رنگین دم والا اغشپ پرندہ تیرا اور ایک ایسے مصرعے کی صورت میں مجھ پر وارد ہوا کہ مجھے پار لے گیا..

میری بے بسی اور بے دھیانی میں اترا اور نہ صرف گلزار نبی میں بلکہ بدن کے گلشن میں بھی چہکنے لگا: کتھے مہر علی، کتھے تیری ثنا..

بس یہی تو عرض کرنا چاہ رہا تھا اور عرض کے لئے ہر حرف ناکافی ہو رہا تھا.. تو بس میں تو فارغ ہو گیا.. اطمینان سے سکون میں ہو گیا کہ جو عاجز تھا اس نے عجز کا ایسا اظہار کیا کہ ایک لمحے کے لئے پر تکبر ہو گیا کہ بابا جی ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں.. یہی ہماری اوقات ہے جو مہر علی نے بیان کر دی ہے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے.. کہاں میں اور کہاں تیری ثنا.. کیا یہ کافی نہیں ہے حضور.. کہ کتھے میں مستنصر تے کتھے تیری ثنا..

بس اس مصرعے کا ورود اس لمبی دم والے رنگین پرندے کی چہکار مجھے پار لے گئی.. میں اس مصوکے سے آگے.. گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں.. تک بھی نہیں گیا.. اس مرغ گلزار نبی کے پاؤں تو پہلے مصرعے میں ہی الجھ گئے.. ایسے کہ کسی اور بیان کے گلزار میں جانے جوگا ہی نہ رہا.. حاجب ہی نہ رہی.. اسی میں پاؤں الجھائے چلتا رہا..

اس ایک مصرعے کا ورود مجھے پار لے گیا..

کتھے مہر علی..

... اقرار کے اس اظہار نے مجھے بے خوف اور آزاد کر دیا.. شدید ڈر اور اضطراب کو پل بھر میں رخصت کر دیا..

اس ایک مصرعے نے میری کوری کاپی کے ہر صفحے کو بھر دیا.. گھر کا کام جو میں نے نہیں کیا تھا وہ اس نے کر دیا اب بے شک چیکنگ ہو جائے میں فیل ہونے والوں میں سے نہیں تھا اور پہلی بار جو آنکھیں صحرا کی خشک لکڑی کی مانند چٹختی تھیں.. ان میں کبھی نمی کا ایک ذرہ نمودار ہوتا بھی تھا تو سوکھ جاتا تھا ان آنکھوں نے پلکیں جھپکائے بغیر جھڑیاں لگا دیں.. آج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں..

... ان جھرنوں کے گرنے سے شاید اس گلزار نبی میں بچھے قالین کا کوئی ایک بوٹا ہرا ہو گیا ہوگا.. کسی ایک گل کا رنگ ذرا شوخ ہو گیا ہوگا..

قربت مزید ہوئی تو ایک تغیر رونما ہوا..

تبدیلی ایک عجب ہوئی..

ایک ساعت میں جو مجھ ایسے حاضری کے تمنائی اور آس میں لوگ تھے اور ان میں ظاہر ہے میں بھی تھا.. وہ وہی تھے جو وہ تھے.. اگرچہ ہم شکل اور ہم شبیہ ہو چکے تھے لیکن وہی تھے اور ایک ساعت اس مسافت میں ایسی آئی کہ وہ مختصر ہو گئے..

سمٹ گئے.. ان کے قد مختصر ہو گئے.. چھوٹے ہو گئے.. میرا قد بھی گھٹ گیا..

سب کے قد و قامت تحلیل ہو رہے ہیں.. گھٹتے جاتے ہیں.. صرف ان کے بکل لب پھڑکتے جنبش کرتے اور جھکے ہوئے سر باقی ہیں..

یہ کون سا ایسا مقام آ گیا ہے..

جو پل بھر میں قد و قامت اور انا کو گھٹا دیتا ہے..

بی بی فاطمہ کے گھر کی دیوار آ گئی تھی.. اور ان کے برابر رسول کے حجرے

کے آثار آ گئے تھے..

جب مجھے ایسا لگتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نہ صرف میں بلکہ آس پاس کے لوگوں کا قد بھی مختصر ہو گیا ہے تو یہ ہرگز نہیں کہ ہم سب بونے ہو گئے ہیں.. سچ مچ مختصر ہو گئے ہیں..نہیں ہرگز نہیں..

روضہ رسول سے وصال کی جو ساعت قریب آتی ہے..وہاں کا موسم جوں ہی پیاسے بدن پر ہولے سے بادنسیم کے ایک جھونکے کی مانند..اسے چھوتا ہے..تو اس کی خوش گواری اور کیف ایسے مست کرتے ہیں کہ سر تو جھکے ہوتے ہیں.. کندھے بھی جھک جاتے ہیں.. جتنا جھکا جاسکتا ہے اتنا ایک انسان جھک جاتا ہے..جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جاتا ہے..لیکن یہ یہاں ایک وجہ ہوتی ہے یوں ہی بے وجہ قرار نہیں آتا..انہیں اس وجہ کے طفیل جس وجہ کے لئے وہ یہاں آئے ہیں اس کی قربت انہیں قرار دیتی ہے..

سرگوشیاں مزید مدھم ہوتی جاتی ہیں..لب ہلنا بھول جاتے ہیں..

ایسا قرار آتا ہے کہ کچھ مانگنا..جھولی پھیلانا بھی بھول جاتا ہے..

کہ جو کہنا تھا وہ کہہ چکے..جو مانگنا تھا وہ مانگ چکے اب صرف دیکھنا تھا اسے جس سے مانگ رہے تھے..جس کے واسطے سے مانگ رہے تھے..بس اسے دیکھنا ہے..

اسے جسے محبوب قرار دینے والوں دلوں کے حال جانتا ہے تو وہ بھی جانتا ہوگا جو اس کا محبوب ہے کیونکہ ان کے درمیان کوئی پردہ تو تھا نہیں..جو اس نے جانا وہ گویا اس نے بھی جانا..تو اصل میں دونوں ایک ہیں..

ڈر میرے بدن سے کب کا رخصت ہو چکا تھا اس جگہ اشتیاق دھونی رمائے شانت بیٹھا تھا..میں ایک اعتماد اور یقین کے ساتھ چلتا تھا کہ میری کاپی اب کوری نہیں رہی..کتنے مہر علی کتھے تیری ثنا سے بھر چکی ہے..نہ وہاں کچھ سرزنش ہوگی اور نہ کوئی پرسش..نہ سزا ملے گی..دس کے دس نمبر دے کر مجھے پاس کر دیا جائے گا..

البتہ اس شانتی اور سکون میں ایک گھبراہٹ ایسی تھی جو مجھے حواس باختہ کرتی تھی..دو چار ہاتھ لب بام رہ گیا تھا..کہیں اب میں گر نہ جاؤں..کہیں گرایا نہ جاؤں..وہاں تک پہنچ نہ پاؤں اور اگر پہنچ بھی جاؤں تو ڈاچی والا انجن چل نہ دے..اپنے حجرے سے کوچ نہ کر جائے..یا پہرے دار اعلان کر دیں کہ بس حاضری کا وقت تمام ہوا..جس نے سلام کرنا تھا سو کر لیا..جو نہیں کر سکا وہ پھر کبھی قسمت آزمائے..

یہ کوئی انوکھی گھبراہٹ نہ تھی..ہر مسافر ہر کوہ نورد اسی کیفیت میں سے گزرتا ہے..لمبی اور دشوار مسافتوں کے بعد جب منزل قریب آتی ہے تو یہی کھد بد کھلبلی مچاتی ہے کہ جانے میں پہنچ پاؤں گا یا نہیں..

بتاتے ہیں کہ سنولیک اس برف کے انبار کے پار ہے تو کیا میں اسے عبور کر کے اس تک پہنچ پاؤں گا یا نہیں..راستے میں کوئی دراڑ آ گئی تو کہیں اس کی اتھاہ گہرائیوں میں گر نہ جاؤں..

ہر مسافر اسی کیفیت میں سے گزرتا ہے..

پھر وہ جھیل آ گئی جس کے نیلے پانیوں میں میرا سفید کنول تیرتا تھا..

بائیں جانب اس جھیل کی سنہری جالیاں تھیں جن پر کشیدہ کاری کے منظر دکھتے تھے..یہاں سے میں اس کشیدہ کاری میں کاڑھے ہوئے حروف پڑھنے سے تو قاصر تھا..

البتہ یہ تو خوب آگاہ تھا کہ آگے کچھ نہ کچھ کشید ہو رہا ہے..

مے خوروں کی پیاس بجھانے کی خاطر کچھ بندوبست کیا جا رہا تھا..

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے..بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے..

یہ شیشہ تو ہمیشہ بھرا رہتا تھا اور اس میں جو مے تھی اس کے کم ہو جانے کا امکان ہی نہ تھا کہ بہ قدر ظرف مے خوار جتنی پیتے تھے اس قدر..اتنی ہی کشید ہو کر پھر سے اس شیشے کو بھر دیتی تھی..

تو شیشے میں مے بہت باقی تھی..

کیا میرے ایسے پیاسے مے خوار کے لئے بھی بہت باقی تھی..

اب ایک اور مسئلہ در پیش ہو گیا..

جس جھیل کے نیلگوں پانیوں میں میرا سفید کنول تیرتا تھا وہ سنہری جالیوں کے عقب میں روپوش تھا..

سنہری جالیوں میں سے جھانکنے کے لئے اندرون کے سحر کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ایک نہیں تین چار روزن تھے اور وہ بھی بالشت بھر کے..تو اس مختصر لمحے میں جب میں سامنے سے گزروں گا رک نہیں سکتا..چلتا چلتا نگاہ کروں گا تو کس روزن میں جھک کر جھانکنا ہے اور نہ جھانک سکا یوں ہی گزر گیا تو کیا ہوگا..

میں پہلا روزن آنے سے پیش تر ہی ذرا جھک گیا..

"رکیں نہیں ابو..چلتے جائیں..آہستہ آہستہ"

"بیٹے کس روزن میں سے جھانکنا ہے..کس میں..کس میں بیٹے؟"

"پہلے کے اندر کچھ نہیں..ستون کے بعد جالیوں میں گول دائرہ سا ہے اس میں..وہی ہے..پہلے دو روزن نہیں.."

اور اب اضطراب ایسا طاری ہوا..ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ سلجوق نے دھیمے لہجے میں جو کچھ کہا ہے، کیا کہا ہے..پتہ نہیں کون سا روزن ہے اور میں

کیا سمجھا ہوں.. سنہری جالیوں میں جو چار روزن ہیں وہ گڈمڈ ہو رہے ہیں آؤٹ آف فوکس ہو کر دھندلا رہے ہیں.. آگے پیچھے ہوتے جاتے ہیں.. ایک مقام پر ٹھہرتے ہی نہیں اور سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان میں کس کو فوکس میں رکھنا ہے..

میں نے ڈرتے ڈرتے کہ سلجوق برا نہ مان جائے کہ وہ بھی تو ایک کیفیت سے دوچار تھا اور میں اسے بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا، پھر پوچھا "بیٹے ایک مرتبہ پھر بتا دو.. کون سا؟"

اور اس کے جواب دینے سے پیشتر میں جان گیا.. میں مزید مختصر ہو گیا.. بدن ہر گنجائش کی حد عبور کرتا اور جھکنے لگا..

سونے کی ایک گھنی بوند.. جو ٹپکنے سے پیشتر ابھی گول حالت میں ساکت ہوئی ہے سنہری جالی میں ٹھہری ہوئی اور اس بوند کے اندر وہ تھا.. وہی تھا..

میں اس سے آنکھیں لگا تو نہیں سکتا تھا کہ راستے میں ریلنگ تھی جو مجھے روکتی تھی.. میں ریلنگ تھام کر اپنے حواس، محبت اور اشک اور آنکھیں اس روزن کے قریب کر دیتا ہوں.. اندر نگاہ کرتا ہوں..

اندر تو ایک گھپ اندھیرا ہے.. کچھ دکھائی نہ دیتا تھا..

یہ پہلی نظر تھی جس نے سوائے تاریکی کے اپنے سامنے اور کچھ نہ پایا..

اور ایک نظر کچھ نہ دیکھنے کے بعد جب میں نے پلکیں جھپکیں تو جالیوں میں ٹھہری ہوئی گھنی بوند کے اندر.. کچھ نظر آیا.. یہ نہیں کہ صاف نظر آیا اور کوئی پہچان ہوئی.. نہیں.. بس تاریکی کے پردے ذرا ہلکے ہوئے تو ان میں کچھ دکھائی دیا..

جیسے رات کے وقت یک دم بجلی چلی جانے سے ہر جانب نابینائی راج کرنے لگتی ہے.. پھر آہستہ آہستہ اس کی عادت ہونے لگتی ہے کچھ کچھ غیر واضح اور بغیر پہچان کے سجھائی دینے لگتا ہے.. لیکن یہاں نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے کہ اشتیاق اور جذب کی لہریں مجھے پیچھے سے دھکیلتی تھیں کہ کیا بت بنا کھڑا ہے.. چل.. راستہ دے اور بھی تجھ سے بڑھ کر ڈوبے ہوئے منتظر ہیں چنانچہ یہاں آہستہ آہستہ عادت ہونے کی کچھ گنجائش نہ تھی اور نظر بھی جانتی تھی اسی لئے پہلی نظر کے بعد دوسری نظر ہی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کچھ کچھ دیکھنے لگی.. ایک نظر اس سنہری بوند کے پیچھے زمیں کا جتنا ٹکڑا آسمان تھا اس پر معلی منبر گنبد تک گئی تھی تو وہیں رہ گئی تھی اور یہ دوسری نظر بھی جو بوند کے اندر گئی ہے تو وہاں سے نہیں لوٹی..

اندر ایک نیم تاریک صدیوں سے ٹھہرا ہوا سکوت تھا..

میں جھکا ہوا اپنے بدن پر پیچھے سے دھکیلتی اشتیاق اور جذب کی لہریں سہارتا ریلنگ پر ہاتھ رکھے سنہری جالیوں کی کشیدہ کاری میں جو روزن تھا.. اک چھوٹی سی کھڑکی تھی.. واحد کھڑکی جو دو جہان پر کھلتی تھی کہ وہاں آقا کا بسرام تھا میں اس میں سے جھانکتا تھا..

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
تانکنا جھانکنا کبھو نہ گیا

بس یہی وہ تانکنا جھانکنا تھا.. شوقِ رخِ نکو دل سے کیسے جاتا..

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں..

نقشِ قدم تو کیا اس کے سراپے کو ہم دیکھتے ہیں..

اندر ایک نیم تاریک صدیوں سے ٹھہرا ہوا سکوت تھا..

تاریکی میں بینائی آتی جاتی تھی..

ایک سبز پیراہن واضح دکھائی دے رہا تھا جس پر آیات قرآنی کے گل بوٹے لالہ و گل کی مانند نمایاں ہو رہے تھے.. خاک میں یہ صورت تھی کہ جو پنہاں ہو گئی.. سبز پیراہن کے بالائی حصوں پر کناروں پر شوخ سرخ رنگ کی ایک پٹی.. صحرا میں غروب آفتاب کے بعد کے افق کی مانند سرخ اور زندہ جس پر کاڑھے ہوئے مقدس حرف اس نیم تاریکی میں بھی دمکتے تھے.. رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام..

اور ہاں یہ تاک جھانک صدیوں یا پہروں پر محیط نہ تھی..

محض دو چار ثانیے تھے..

ایسے ثانیے جو دو چار بار آنکھیں جھپکنے سے گزر جاتے ہیں..

محض ایک آدھ جھانک تھی..

صرف ایک آدھ جھات تھی.. پل دو پل کی پنجابی 'جھاتی' تھی.. لیکن اس ایک جھاتی سے دل کے ایسے بوہے اور باریاں کھل گئے جن کے بارے میں.. جن کی موجودگی کے بارے میں اب تک لاعلم تھا..

یہ دروازہ یہ کھڑکیاں کہاں سے آ گئے.. میں تو ان کے وجود سے آگاہ تھا.. میرا تو یہی گمان تھا کہ اس دل میں کوئی دروازہ نہیں کوئی کھڑکی نہیں..

یا ایک گنبد بے در کی مانند صرف اپنی گونج سنتا ہے.. سوائے اپنے اور کسی کی نہیں سنتا اور اب یہ ہے کہ ان دروازوں اور کھڑکیوں میں سے ایک ایسی ہوا چلی ہے کہ یہ میری بھی نہیں سنتا.. مجھ سے ایسا باغی ہوا ہے کہ یہ پروا بھی نہیں کر رہا کہ وہ جو دھڑکنا بھول رہا ہے تو اس کے نتیجے میں میں مر جاؤں گا..

ایسی ہوا چلی کہ بہت سے تنکے شک شبہ کے یہ ہوا اڑا لے گئی..

(زیرِ اشاعت تصنیف منہ ول کعبے شریف سے)

ادیبوں کے خط

جوگندر پال کے نام

مشہور ادیبوں کے نام لکھے گئے خطوط کے انتخاب کا یہ سلسلہ اس نیت سے شروع کیا جا رہا ہے کہ خطوط کی مدد سے ادیبوں کے نہاں خانوں کی سیر کی جا سکے، اور ان پڑھی ان سنی باتیں ریکارڈ پر آ جائیں۔ کسی کی بے جا تعریف یا دل آزاری یا خود ستائی قطعی مقصود نہیں۔ ایسے خطوط کی واضح زیروکس نقل بھیجنا ضروری ہو گا۔ تعداد میں اتنے ضرور ہوں کہ انتخاب کیا جا سکے۔ (ادارہ)

زاہدہ حنا

گلشن اقبال، کراچی، پاکستان

16 جون 1986

جوگندر جی   آداب

چند دن پہلے آپ کا ناول 'نادید' پہنچا۔ آپ کی محبت ہے کہ آپ نے مجھے اس قدر یاد رکھا۔ پہنچانے والے تک یہ ناول شاید کافی پہلے آ گیا تھا لیکن مصروفیات کے سبب وہ مجھ تک تاخیر سے پہنچ سکے۔ 'نادید' کے بارے میں گفتگو اس وقت رہے گی جب میں اسے پڑھ لوں گی۔ اس خط کو لکھنے کی تقریب تو یہ ہے کہ میں نے ایک سہ ماہی پرچے کا ڈول ڈالا ہے۔ یہ ایک علمی، ادبی، تہذیبی اور فکر پرچا ہوگا۔ اس کا افسانوی حصہ آپ کے افسانے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات میں رواتیاً نہیں، حقیقتاً لکھ رہی ہوں۔ پہلا شمارہ مئی میں شائع ہو جائے گا اور پہلے شمارے میں آپ کی تحریر ضرور بالضرور ہونی چاہئے۔

جمیل زبیری آپ کے بے پناہ چاہنے والوں میں سے ہیں۔ ان سے آپ کا اکثر یوں ذکر ہوتا ہے جیسے میری بھی آپ سے پرانی جان کاری ہے۔ وہ وقت بھی آئے جب ہم تحریراً آشنا ہونے کے ساتھ ہی صورت آشنا بھی ہو سکیں۔

جون ایلیا آپ کو یاد کرتے ہیں اور سلام لکھواتے ہیں۔

نیاز مند، زاہدہ حنا

جمیل جالبی

کراچی یونی ورسٹی کراچی، پاکستان

17 جون 1986

محترمی جوگندر پال۔ آداب

''کتھانگر'' (افسانے) کا ایک نسخہ موصول ہوا۔ جس کے لئے شکرگزار ہوں۔ افسانچے لکھ کر آپ نے فکر، احساس اور مشاہدے کے جگنوؤں کو پکڑ کر کتاب کے رومال میں اس طور پر محفوظ کر دیا ہے کہ ان کی چمک سے زندگی کے تنوع، رنگارنگی کی ایک خوب صورت تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب۔

مخلص، جمیل جالبی

انور سدید

مکتبہ 'اردو زبان' 58۔ ریلوے روڈ سرگودھا، پاکستان

23 مئی 1987

برادر گرامی! تسلیمات

گرامی نام موصول ہوا۔ میں ان دنوں سرگودھا آیا ہوا ہوں۔ لہٰذا یہیں سے جواب لکھ رہا ہوں۔ آپ کی دعوت پر اورنگ آباد جانے کا پروگرام تقریباً طے ہو چکا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ سو کوئی بات نہیں۔ آپ سے ملاقات تو تقریباً ہر روز ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی رسالے میں آپ کا افسانہ نظر آ جاتا ہے۔ پھر یہ نشہ طاری کر دیتا ہے۔ آپ دل و دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے بعد آپ نے اردو افسانے کو سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ افسانے دیئے۔

آپ کے فن پر بحث ہماری محفلوں کا مستقل موضوع ہے۔ کل شام

بھی 'اوراق' میں آپ کے نئے افسانے 'آگے پیچھے' پر بات چیت ہو رہی تھی، سب لوگ اس کی داد دے رہے تھے۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے 'ذکر اس پری وش کا' کی اشاعت کی بات دہلی میں طے کروا دی، یہ کتاب اب یہاں دستیاب نہیں۔ میں اس کی فوٹو کاپی آپ کو بھجوا سکوں گا۔ یہ مختصر سی ضخامت کی کتاب ہے (کل 112 صفحات) اور دیباچہ 36 صفحات پر مشتمل ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ دیباچہ نکال دیا جائے اور اس کی جگہ نئے انشائیے شامل کر دیئے جائیں۔ کچھ افسانے میں نے انگریزی سے بھی ترجمہ کئے تھے۔ یہ بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ سب ناشر کے صوابدید اور آپ کی رائے پر ہے۔ اس صورت میں عنوان بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کشور ناہید کو بتایا تھا کہ آپ نے تو مجھے جوگندر پال پر لکھنے کی دعوت ہی نہیں دی۔ چنانچہ میں نے اپنا مضمون اوراق کو بھجوا دیا اور وہ چھپ بھی گیا ہے۔ محترمہ نے الزام اٹھا میرے حافظے پر لگا دیا اور میں نے تسلیم کر لیا امن عام کی خاطر۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مضمون لکھنے کی دعوت دے دی۔ اب انشاءاللہ لاہور جا کر یہ کام کروں گا گویا مزید... سمیٹوں گا۔

میں نے امروز میں ایک چھوٹا سا مضمون آپ پر لکھا تھا۔ کیا اس کا تراشہ آپ کو مل گیا ہے۔ آپ کے خط کا وہ جملہ بہت اچھا لگا کہ "ادب ہم فقیروں کی عبادت ہے"

معلوم ہوا ہے کہ بعض لوگ اس میں خلل ڈالنے کے درپے ہیں۔ مخالفانہ تحریریں پڑھ کر مجھے تو مزید لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کسی دوست کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور وہ بربنائے شرافت بولنے پر بھی آمادہ نہ ہو۔ یہاں 'جواز' اور 'بلٹز' نہیں آتے۔ کیا آپ یہ پرچے یا ان مضامین کی فوٹو کاپی بھجوا سکتے ہیں۔

جاوید شیخ صاحب نے ٹیلی فون پر آپ کی خیریت اور آپ کی خیر سگالی کے جذبات کی اطلاع دی۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

میں نے حال ہی میں 'مختصر تاریخ ادبیات اردو' مکمل کی ہے۔ اب اس کی کتابت ہو رہی ہے۔

میں کل 24 مئی کو واپس لاہور چلا جاؤں گا۔

کرشنا بھابھی کو میرا اسلام کہیے۔

بچوں کو پیار

مخلص، انور سدید

شہزاد احمد

31۔ڈی آفیسرز کالونی غازی روڈ، لاہور چھاؤنی، پاکستان

21 نومبر 1987

مکرمی جوگندر پال صاحب

چند روز ہوئے آپ کا خط ملا۔

یہ جان کر تشویش ہوئی کہ آپ کئی روز تک صاحب فراش رہے اور شاید آپ پر ایک آپریشن بھی گزر گیا، اس بیماری کی تفصیل تو آپ نے لکھی نہیں مگر یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اب آپ روبہ صحت ہیں۔ خدا آپ کو مکمل شفا دے، اردو زبان اور افسانے کو تو آپ کی ضرورت ہے ہی! ہمیں بھی آپ کی بے حد ضرورت ہے۔ میں بہت کم ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اپنے تخلیقی کام سے ایسا لگاؤ رکھتے ہوں۔ یہ لگاؤ شخصی اور فنی دونوں سطحوں پر بہت گہرا ہے۔

آپ نے میری کتاب دیکھ لی مگر جس عالم میں دیکھی وہ بھی ایک مجاہدہ ہی تھا، ایک طویل بیماری سے نبرد آزما ہونے کے بعد مرا ذاتی تجربہ تو یہی ہے کہ بیماری سے نکلنے کا بہترین طریقہ شاید یہ ہے کہ اسے قبول نہ کیا جائے اور اس کے آگے ہتھیار نہ پھینکے جائیں۔

جو کتاب میں نے آپ کو ارسال کی تھی وہ اپنی نوعیت کی شاید پہلی کتاب ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی ہے اس لئے اس میں بہت سے ایسے پہلو ہو سکتے ہیں جن کی نشان دہی سے مجھے آئندہ لکھنے میں مدد مل سکے۔ اگر کبھی فرصت ہو تو قدرے تفصیل سے مجھے بتایئے گا۔

وزیر آغا صاحب لندن سے واپس آنے کے بعد چند روز کے لئے لاہور آئے تھے، آج کل سنا ہے تنقیدی اصولوں پر کوئی طویل مضمون یا کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے اب کے ملاقات دیر کے بعد ہو۔ انور سدید صاحب سے ملاقات وزیر آغا کے لاہور آنے پر ہی ہوتی ہے۔

میں آج کل اردو غزل کے آزادی کے چالیس برس بعد کا انتخاب کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کر سکیں تو مناسب ہوگا۔ مجھے خصوصی طور پر ہندوستان میں لکھی گئی غزل کے سلسلے میں مشکلات کا سامنا ہے۔

بھابھی کا کیا حال ہے، ان کو بہت بہت آداب!

نیاز مند، شہزاد احمد

نثار احمد فاروقی

بطلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

26 جولائی 1988

بھائی جوگندر پال صاحب۔ سلامت باشد۔ آج آپ کا 20 جولائی کا نوازش نامہ اور پانچ کہانیوں کا تحفہ رجسٹری سے ملا۔ بے حد ممنون و مسرور کیا۔ ابھی ایک کہانی بھی نہیں پڑھی ہے یہ رسید ہے مگر انتخاب آپ ہی پر چھوڑ دیا گیا تھا اس لئے اب "غور" کرنے والا مسئلہ نہیں ہے۔

آپ نے دو کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے انگریزی تراجم ہو چکے ہیں۔ کیا آپ ان انگریزی ترجموں سے مطمئن ہیں؟ اگر ہاں، تو وہ ترجمے مجھے بھیج دیجئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے بعض بہت اچھے مترجم انگریزی سے اچھا ترجمہ کر لیتے ہیں، اردو سے ترجمہ کرنے والے اتنے sharp نہیں ہیں کہ وہ کہانی کی لطافتوں کو احتیاط سے محفوظ کر سکیں۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں یہ بات کسی حد تک ممکن ہوگی۔

نثار فاروقی

رام لعل

شانتی نکیتن، اندرا نگر، لکھنؤ-16

12 اگست 1988

ڈیئر جوگندر پال

تمہارا افسانہ 'عفریت' اوراق میں پڑھا۔ جی خوش ہو گیا۔ دسہرے کی تقریب کے ساتھ افسانہ بیان کرنے والے کی ذاتی زندگی کا ماجرہ ہی اچھا لگتا تھا اور وہ تم نے بڑی خوبی سے کر دیا اور زندگی میں بورڈم ختم کرنے کے لئے ایک نئے فلسفے کو پیش کر دیا کہ "کوئی میری مانے تو عورت سے شادی کرنے کے بجائے اسے نوکر بنا کر اپنا گھر سونپ دینا چاہئے" بہر کیف ایک عرصے کے بعد تم نے ایک ایسا افسانہ لکھا ہے جسے میں یاد کروں گا اور اس کا ذکر اکثر کرنا چاہوں گا۔ کسی دوسرے کے نطفے کو اپنانے کا عمل اگر چہ 'ممی لال' ناول کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کیفیت کا ذکر 'عفریت' کے اپنے کرب کی آزاد اور ذمہ دار پیداوار ہے۔

میرے افسانے 'جلتا ٹائر' میں سے وزیر آغا نے چند جملے پاکستان کے ماحول کے پیش نظر حذف کر دیئے تھے۔ شاید تمہیں ان کی کمی محسوس بھی نہ ہوتی ہوگی۔ انشا کلکتہ میں یہ افسانہ پورے جملوں کے ساتھ موجود ہے۔ وزیر آغا نے لکھا بھی تھا کہ میں ہندوستان میں یہ جملے چھپوا سکتا ہوں۔ اتفاق سے دونوں جگہ یہ افسانہ ایک ہی مہینے میں چھپ کر آیا بلکہ اوراق کو میں نے گذشتہ سال بھجوایا تھا اور انشا کو دو ماہ پہلے۔

تمہارے منہ سے دانت مسلسل غائب ہوتے دیکھ کر مجھے بھی 'ریس' کرنے کا خیال آیا۔ چند ڈاڑھیں پہلے ہی گر چکی تھیں اب چار مزید (معدود ہمسایہ دانتوں کے) اسی ماہ میں نکلوا دوں گا۔ ادھر منہ کے خراب ذائقے سے بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ تین ہفتے پاؤں کے ایک پھوڑے اور ایک زخم کی وجہ سے بھی disabled محسوس کرتا رہا۔ اب چل پھر سکتا ہوں لیکن میرا راستہ اگست میں دانتوں کے اسپتال کی جانب ہوگا۔

ایک ناولٹ کا ڈول ڈالا ہے' چاچی کا ڈھابہ' پہلا باب مکمل ہو گیا ہے۔ پورا خاکہ بھی سامنے رکھا ہے۔ لیکن ہمہ وقت نئے نئے خیال سوجھتے ہیں اور قطع و برید میں لگا رہتا ہوں۔

تم کیسے ہو؟ کیا تمہاری صحت کا اندازہ تمہارے افسانوں کے ہی لگانا ٹھیک رہے گا۔

بھابی کو پرنام۔ بچوں کے لئے دعائیں۔

تمہارا، رام لعل

اسد محمد خاں

شہر بانو پلازا C-14 ایف بی ایریا۔ کراچی۔ 15950

24 مئی 1991

پال جی، زندہ و سلامت باش

29 مارچ 1991 کا آپ کا محبت نامہ بھائی محمد علی صدیقی نے پہنچوایا۔ بہت خوشی ہوئی۔ (یہ فقرہ غریب ہے اس لئے رسمی اور بے جان لگتا ہے۔ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ اظہار حال ہے) روز مرہ کی یک رنگی میں کسی 'واقف حال' کی چند سطریں نصیب ہو جائیں اس کی خوشی ہی کچھ اور کرے۔

آپ کراچی آئے تھے۔ نہ معلوم میں کہاں تھا۔ میرا زندگی گذارنے کا ڈھب وہی ہے جو شہر سے بولائے ہوئے کسی بھی دیہاتی کا ہو سکتا ہے۔ زندگی کے mundane تقاضوں کو صبح کے سات بجے سے پورا کرتے کرتے شام کر دیتا ہوں۔ شام میں گھر کی عافیت میں بیوی بچوں میں پناہ لیتا ہوں، نہ پڑھنے لکھنے کا کوئی وقت مقرر ہے نہ سونے جاگنے کا۔ اس ڈھب سے وقت گزارتا ہوں جبھی آپ کے محبت نامے کا جواب دو یا شاید تین ہفتہ بعد دے رہا ہوں۔ میری جان کو دوسرے احباب ادب کے مقابلے میں ایک چیز

(علت) زیادہ لگی ہوئی ہے۔ وہ ہے کمرشل رائٹنگ۔ کبھی کبھی ٹیلی ویژن سے کبھی ایک آدھ پاپولر فکشن کے رسالے کے لئے لکھتا ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں بازار کے تقاضے لکھنے والے کو دوڑائے رکھتے ہیں۔ کمرشل کو زیادہ اپنی جان کا آزار نہیں بناتا۔ جب بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے پیسوں کی تو لکھتا ہوں۔

خیر! برادرم احمد سہیل دلی بھی جا رہے تھے اس لئے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا میں نے۔ نارنگ صاحب کو اور محمود ہاشمی کو بھی کتاب مل گئی۔ شارب ردولوی صاحب کو احمد سہیل نے واسطہ بنایا ہوگا۔ احمد سہیل بہت اچھا دوست ہے۔ میں کراچی میں جما بیٹھا رہا وہ اسلام آباد، لاہور، دلی بمبئی اور پشاور میری کتاب پہنچا آیا۔ اب تو شاید واپس امریکہ چلا گیا ہو۔

کہتا تھا آپ کے صاحب زادے بھی شاید امریکہ میں ہیں۔ یہ عجب سلسلہ ہے۔ امی گریشن اور دور دور رہائشوں کی اس صورت حال سے میں بھی متاثر ہوں، پچھلے اکتالیس سال سے۔ لڑکا ہی تھا تو بھوپال سے لاہور پھر کراچی آ گیا۔ ماں باپ بہن بھائی وہیں رہ گئے۔ پھر بھوپال میں شادی کر لی۔ ایک بیٹا ہوا جو اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہ گیا۔ (اس وقت ہندوستانی شہریت کے ساتھ دوہا قطر میں ہے) دوسرے setup کے بعد یہاں خوش ہوں مگر دور دور رہائش اور امی گریشن کا اثر در جان کو لپٹا ہوا ہے۔ بھوپال میں بہنیں ہیں اور دوسرے عزیز ہیں اور جب نوکری سے چھٹی پر آیا ہوا ہوتا ہے تو بیٹا بھی بھوپال میں رہتا ہے۔ اور میری یادیں ہیں بچپن کی لڑکپن کی۔ میں کراچی میں رہتا ہوں اور زیادہ تر گھر میں گھسا رہتا ہوں۔ باہر بھی اکیلا ہی رہنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ کے لوگ یا مجھ سے کچھ بڑے گزرتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک بہت دل چسپ فقرہ پڑھا تھا۔ غور کرتا ہوں تو خود کو اس Loneliness میں گرفتار پاتا ہوں کس نے تنہائی کی ایک شکل 'ہم یاد' لوگوں سے دوری کو بھی بتایا ہے کہتے ہیں:

One form of Loneliness is to have a memory of no one to share it with.

میں اس تنہائی کو یوں دور کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ 'دکھس بیٹھیا' جیسی کہانیاں لکھ لکھ کر اپنی memory میں share کرنے والے لوگوں کی تعداد بڑھا رہا ہوں اور جب آپ ایسے واقف حال اور صاحب دل لیکھک سے اپنی اس کوشش کی داد پاتا ہوں تو نہال ہو جاتا ہوں۔ خدا سلامت رکھے آپ نے چند سطور لکھ کر مجھے rich اور مصروف کر دیا۔

دعائیں دیتے رہئے۔ مجھے بہت ضرورت رہتی ہے۔

آپ کا، اسد

منشا یاد

362 ای اسٹریٹ 75، جی 6/4 اسلام آباد۔ پاکستان

26 اگست 1991

پیارے بھائی جوگندر پال۔ آداب

آپ کا کارڈ ملا اور 'درخت آدمی' کے بارے میں آپ کی رائے اور رسید بھی۔ کتاب اور افسانوں کے بارے میں اتنی خوب صورت باتیں آپ نے لکھی ہیں کہ بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ اگر آپ کبھی ان باتوں کو مختصر ہی سہی مضمون کی شکل دے دیں تو میرے بہت کام آئے۔ آپ نے پہلے بھی اسی طرح میری کتابوں کے حوالے سے حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ 'درخت آدمی' یا میرے افسانوں کے بارے میں کوئی چھوٹا سا مضمون لکھ کر بھیج دیں گے۔

اندر والوں کو میں نے آپ کا پتہ دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ افسانوں کا معاوضہ اگر دینا چاہیں تو آپ کو بھیج دیں۔ ان کا خط یا جواب مجھے نہیں ملا ہے۔

آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ بھابی کیسی ہیں اور بیٹے اور بیٹی کا کیا حال ہے۔ آپ کی بھابی سلام کہتی اور یاد کرتی ہیں۔ آپ کی مصروفیات کیا ہیں ادبی؟ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا، منشا یاد

احمد ندیم قاسمی

فنون، گاباچیمبر 19-A، ایبٹ روڈ، لاہور (پاکستان)

30 اگست 1993

محب مکرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ دل پر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ دراصل غلطی فنون کے دفتر سے ہوتی رہی۔ ان کی طرف سے پرچہ آپ کو 32 اے، بے ایف ایس الکنندہ کالکاجی کے پتے پر بھجوایا گیا جو واپس آ گیا۔ ظاہر ہے پھر اسی پتے پر بھجوایا۔ پھر واپس مل گیا۔ میں اس پر اس لئے بضد تھا کہ برادرم بل راج کومل آپ کے عزیز ہیں۔ اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے قریب رہتے ہیں۔ اور انہیں بھی Kalkaji کے پتے پر جاتا ہے۔ اب آپ کے نئے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کا تو پتہ ہی بدل چکا ہے۔ اور میں حیران تھا کہ آپ کا سا پیارا انسان اور فن کار مجھ سے گلہ مند کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں آپ کے دعا گوؤں میں شامل ہوں۔

برادرم بل راج کومل سے فون کا گذشتہ شمارہ (38) منگا کر اس کا اداریہ (حرف اول) ضرور پڑھ لیجئے گا۔ آپ کے گرامی نامے کے دوسرے حصے کے مندرجات کا جواب اس میں موجود ہے۔

میں بہت خوش ہوں کہ آپ کا سراغ مل گیا۔ خدا آپ کو صحت مند رکھے۔

خیر اندیش، احمد ندیم

شکیل الرحمٰن

مدھوبن۔ اے 267 ساؤتھ سٹی گوڑگاؤں، ہریانہ

20 فروری 1994

پیارے بھائی جوگندر پال جی، اتنے دنوں بعد آپ کی تحریر اور پیارے پیارے جملوں کو پا کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ساؤتھ سٹی آتے ہی میں نے آپ کو اپنا نیا پتہ بھیج دیا تھا حیرت ہے نہیں ملا۔

بھائی آپ سب بھی نئے سال کی نیک خواہشات قبول کیجئے، دعا ہے کہ نیا سال آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ پچھلے دنوں اچانک آپ کو ٹیلی ویژن پر دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی ایسا لگا آپ براہ راست مجھ سے باتیں کر رہے ہیں (آپ کی باتوں کو سمجھنے والا صرف میں ہی تو ہوں) افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ ان لمحوں میں آپ کو چھیڑنے والا کوئی نہ تھا، چلئے میری ملاقات تو ہوئی۔

دلی آتا رہتا ہوں، فون نہ ہونے کی وجہ سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ ایک ہی صورت ہے کسی دن اچانک آجاؤں یا آپ اور شریمتی پال یہاں اچانک آجائیں۔ درویش سائیں ہر وقت اپنے آشرم میں ہی پایا جاتا ہے آپ بھی میری نئی پرانی حکایتیں پڑھتے ہیں اور پسند کرتے ہیں یہ سن کر خوش ہوں۔

جناب غور فرمائیے میں نے اردو میں اتنی نئی پرانی حکایتیں جمع کر دی ہیں، اتنی حکایتیں کب کس نے جمع کی تھیں؟ یہ بھی سچ ہے کہ یہ ہندوستان کی نئی سیاست کا ایک ڈاکومنٹ ہے۔ اس میں تلخ، ترش اور شیریں کارٹون بھی ہیں اور کیری کیچر بھی۔ اتنے کارٹون لفظوں میں اب تک کسی نے نہیں بنائے جو طنز مزاح اور وٹ کو لئے ہوئے ہوں اور سیاست کی زہرناکی کو نمایاں کر رہے ہوں۔ ہندوستان کے بڑے بڑے سیاست داں اس حمام میں ننگے ہیں ان کی ستر پوشی کوئی نہیں کر سکتا۔ ان میں کہانی بھی ہے کردار بھی ہیں اور سچ پوچھئے تو ہر واقعہ ایک تمثیل اور ڈراما ہے۔ میں اپنی تعریف اس طرح بھی کروں گا کہ میری تکنیک ایشیائی اور ہندوستانی ہے۔ جو ایک منفرد تشخص رکھتی ہے، مانگے کا اجالا نہیں ہے۔

آپ اس پر کچھ لکھ سکیں۔ اور رحمٰن نیر مدیر بیسویں صدی کو بتائیں (تحریر میں) کہ "یہ سیاسی تبصرے بڑے شوق سے پڑھتا ہوں اور بڑا خوش ہوں کہ اس کے ذریعے عوام کی نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور تہذیبی تربیت کا سامان کرنے کے لئے بڑے انوکھے اور تیکھے انداز کو اختیار کیا گیا ہے۔"

(جوگندر پال کے الفاظ ہیں جو میرے خط میں ہیں) تو میں سمجھوں گا واقعی ایک بہتر سوچنے والے نے ان حکایتوں کی قدر کی ہے۔ یہ محض سیاست اور صحافتی کالم نویسی نہیں ہے یہ افسانہ بھی ہے۔ یہ دنیا کے اردو والوں میں اتنا مقبول ہے کہ حیرت ہوتی ہے، ہر ماہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا کالم ہو جو اتنے شوق اور انہماک سے پڑھا جاتا ہے۔

دیکھا آپ نے میں اپنی تعریف بھی کتنے خوب صورت انداز سے کرتا ہوں۔ یہ فراق صاحب سے نہیں مرزا غالب سے سیکھا ہے ان کی تربیت کا نتیجہ ہے۔

کہنا یہ ہے کہ جو شخص اپنی تعریف اس طرح کر سکتا ہے وہ ایک اور اچھے لکھنے والے کی تعریف کیوں نہیں کر سکتا۔ آپ کے پانچ منتخب افسانوں پر لکھنے کا ارادہ ہے۔ میں تو منتخب کروں گا ہی آپ کے پانچ افسانے، آپ بھی براہ کرم مجھے بتائیں کہ آپ کی اپنی پانچ تخلیقات کون سی ہیں کہ جنھیں موضوع، کردار اور تکنیک وغیرہ کے اعتبار سے چیلنج تصور کرتے ہیں۔ یوں آپ کے افسانے پڑھ چکا ہوں۔ ایک بار پھر پڑھوں گا۔ اس مطالعے کے بعد ہی قلم پکڑوں گا۔

شریمتی پال کی خدمت میں ہم لوگوں کا آداب۔ عصمت آپ لوگوں کو یاد کر رہی ہیں، ماسکو سے چھوٹی بیٹی آئی ہوئی ہے۔ میرے پوتے عرنی نے 18 فروری کو اپنی پہلی سالگرہ منائی ہے۔ پوتے کے ساتھ میری سال گرہ بھی منائی گئی۔ اس لئے کہ میں نے بھی 18 فروری کو جنم لیا تھا۔ میرے پوتے نے میری تاریخ پیدائش لے لی ہے اتنا خوش ہوں کہ کیا بتاؤں۔ ایسا نیا جنم کس کا نہ ہوا ہوگا، زندہ ہوں اور نیا جنم لے لیا ہے!! دعا کیجئے اللہ اسے سلامت رکھے اور وہ مجھ سے بھی بڑا شنکر ثابت ہو (اس کی پیدائش بھی شیوراتری کے روز ہوئی ہے میری طرح!)

آپ کا اپنا، شکیل الرحمٰن

وزیر آغا

سرگودھا اور لاہور، پاکستان

7 جون 1995

برادرم جوگندر پال جی آداب!

آپ کا خط ملا۔ اپنے افسانوں کے بارے میں آپ کے تاثرات پڑھ کر سلیم نہال ہو گیا۔ اس نے خط اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ کہتا ہے کہ ان

افسانوں پر یہ بہترین تبصرہ ہے جو اسے موصول ہوا ہے۔ اس کی بہت حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ توقع ہے کہ تھیسس سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوبارہ افسانہ گاری کی طرف متوجہ ہو جائے۔

'یہ آواز کیا ہے' پر آپ کے تاثرات پڑھے تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا:

مٹھی رسیاں جگندر پال دیاں

یہ آپ کے خاص الخاص نعرے یعنی تیئں ریساں لہور دیاں کے جواب میں تھا۔

میری دو اور کتابیں آرہی ہیں۔ یعنی چھپ گئی ہیں۔ بس جلد کا مسئلہ ہے۔ میں لاہور گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ہفتے عشرے میں دونوں کتابیں شائع ہو جائیں گی۔ ایک تو انگریزی کے مضامین اور انٹرویوز پر مشتمل The Symphony of Existence ہے اور دوسری میرے انشائیوں کی کلیات۔

علاوہ ازیں جے رتن صاحب نے میرے انشائیوں کے جو تراجم کئے تھے وہ بھی کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔ بس وہی جلد کا مسئلہ ہے۔ انھیں مطلع کر دیں۔ اسی ماہ کے دوران انہیں کتاب مل جائے گی۔

آپ کو کتابیں الگ بھیجوں گا۔

لکھنے پڑھنے کا کام جاری ہے مگر تہتر ویں برس کو عبور کرنے کے بعد اب سکت روز بروز کم ہو رہی ہے۔ ادھر گرمی نے بے حال کر رکھا ہے۔ پہلا چھینٹا پڑے تو واپس اپنے بدن میں آؤں۔

کرشنا بہن کو میرا سلام کہہ دیں۔ دیکھئے آپ لوگوں سے کب ملاقات ہوتی ہے؟

والسلام مخلص، وزیر آغا

آصف فرخی

بی 155 بلاک 5 گلشن اقبال کراچی، پاکستان

6 دسمبر 1995

ڈیئر جوگندر پال جی آداب!

کل آپ کا خط ملا، اور اس سے قبل احمد سہیل صاحب کے ذریعے سے سکریتا جی کی کتاب بھی آخر کار مل ہی گئی۔ اس کتاب کا مجھے بہت بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ چنانچہ کتاب ملتے ہی بے صبری کے ساتھ رات بھر میں پڑھ ڈالی۔ جیسے گرما گرمی ناول پڑھے جاتے ہیں۔ یہ رسمی اور روائتی انٹرویوز کے بجائے مکالمے ہیں، بلکہ جدیدیت کے موضوع پر پورا سمپوزیم۔ اس میں جدیدیت کے حوالے سے فکشن اور تنقید پر جو گفتگو ہوئی ہے وہ نہایت ہی خیال افروز ہے۔ میرے لئے دل چسپی کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ نامور سنگھ اور نرمل ورما جیسے ہندی ادیبوں کے خیالات بھی معلوم ہوئے، ورنہ ہمیں تو پتہ نہیں چلتا کہ ہندی میں کیا ہو رہا ہے۔ سکریتا جی کو اتنی عمدہ اور بھرپور کتاب پر میری طرف سے بے حد مبارک باد۔

آپ کے اس خط سے پتہ چلا کہ آپ کو نیوز لائن والا انٹرویو مل گیا۔ مجھے آپ کا جوابی خط نہیں ملا تھا۔ اس لئے میں سمجھ بیٹھا تھا کہ راستے میں گم ہو گیا اور آپ کو دوبارہ اس کی نقل بھیجنے والا تھا۔

میرے والد دلی جانے کے لئے نکلے اور لاہور سے لوٹ آئے۔ ان دنوں حالات سفر کے لئے سازگار نہیں تھے۔ اگر دلی آئے تو وہ خود آپ سے رابطہ قائم کرتے۔

آپ کے نئے افسانے کی خبر بھی ملی۔ یہ افسانہ کہاں شائع ہو رہا ہے؟ مجھے ضرور بتائیے تاکہ میں اس کو پڑھ سکوں۔ اب آپ اور کیا لکھ رہے ہیں؟ یہ افسانہ یا کوئی اور ناول؟ امید ہے کہ آپ اپنے تنقیدی مضامین بھی جمع کر رہے ہوں گے۔ آپ نے اپنے تخلیقی تجربے کو بنیاد بنا کر جو تحریریں لکھی ہیں، ان سے بہت عمدہ کتاب بن جائے گی۔

میرا امریکہ کا سفر خوش گوار رہا لیکن بے حد مصروف۔ میں نے اپنے شعبے یعنی International Health سے متعلق کانفرنس میں مقالہ پڑھا۔ یہ کانفرنس واشنگٹن میں تھی۔ اس میں ہندوستان سے بھی دو لوگ شریک ہوئے تھے۔ اس سے قبل میں نے ایک افسانہ لکھا تھا جو غالباً اوراق کے تازہ شمارے میں آئے گا۔ چند دن پہلے ایک مختصر تاثراتی مضمون لکھا ہے جو کہانی، داستان وغیرہ کے حوالے سے ہے حسن کا خیال 'فسانہ عجائب' پڑھ کر آیا (بالآخر میں نے یہ کتاب پڑھ ہی ڈالی!) یہ مضمون انجمن ترقی اردو کے رسالے قومی زبان میں شائع ہوگا۔ کیا قومی زبان آپ کے پاس آتا ہے۔ اگر نہیں آتا تو پھر یہ شمارہ آپ کو بھجواؤں گا۔

کومل جی کیسے ہیں؟ ان دنوں کیا لکھ رہے ہیں؟ ان سے میرا سلام کہئے۔

آپ کا، آصف فرخی

اکبر حمیدی

اسسٹنٹ پروفیسر پنجاب کالج آف کامرس اسلام آباد، پاکستان

13 مارچ 1997

برادر محترم جوگندر پال صاحب آداب!

آپ کے افسانوں کے انتخاب کی جلدیں مجھے مل گئی ہیں۔ حسب ارشاد

برادرم منشایاد، رشید احمد، جمیل آزر صاحبان کو بھیج دی تھیں یہ سب افسانے پہلے سے آپ کے قارئین نے پڑھے ہیں مگر اب قندِ مکرر اور اس لطف انگیز پرائے میں کہ ہونٹ سلتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ میں نے ان پر اپنے تاثرات 'اوراق' کے لئے آغا جی کو بھیج دیئے ہیں۔ آج ہی بھیجے ہیں۔ اگر کسی اور دوست نے پہلے سے بھیج نہیں دیئے تو یہ چھپ جائیں گے۔ تاہم ان کی نقل آپ کی خدمت میں بھی ارسال ہے۔

لیکن گذشتہ سال مارچ میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گیا تھا اب ایک اور کالج میں ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ پہلے والے میں بیٹی رہ رہی ہیں۔ اسی ایڈریس پر آپ کی کتابیں آئی تھیں اور مل گئی تھیں۔ آئندہ اوپر کے نئے ایڈریس پر خط لکھئے۔ دہلی دیکھنے اور آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ کوشش کروں گا کہ اس سال کے آخر ماہ دسمبر کی چھٹیوں میں اس خواہش کی تکمیل کر سکوں۔

کیا آپ اپنی سوانح لکھ رہے ہیں؟ اگر نہیں تو ضرور لکھئے۔ میں آپ کی سوانح کا منتظر ہوں۔ اسے ایک بڑی کہانی سمجھئے۔

کیا آپ نے پنجابی میں کہانی لکھی ہے؟ میری پنجابی غزلوں کا مجموعہ چھپا ہے۔ آج کل میں آنے والا ہے۔ یہ مجموعہ گذشتہ 30 برس کی بے قاعدہ سخن طرازی کا نتیجہ ہے۔ مگر میرا خیال ہے یہ سعی رایگاں نہیں ہوگی۔

آپ کیسے ہیں۔ محترمہ بھابی صاحبہ کی خدمت میں آداب کہیئے۔

آپ کا، اکبر حمیدی

پروفیسر آل احمد سرور

سر سید نگر، علی گڑھ

13 جون 1998

برادرم جوگیندر پال

آپ کا 9 جون کا خط مجھے کل 12 کو ملا۔ مجھے خیال یہ تھا کہ بلراج کومل نے شاید میری علالت کا آپ سے ذکر کیا ہو۔ وہ غالباً دو مہینے پہلے مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھول گئے۔ 28 مارچ 1996 کو بائیں ہاتھ اور پاؤں پر فالج کا اثر ہوا۔ اسوا دو سال ہو گئے ابھی تک دواؤں کا اور ورزشوں کا سلسلہ جاری ہے۔ میری عمر بھی چھیاسی سے تجاوز کر گئی ہے درد کے اس مصرعے پر عمل ہے:

جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آپ کے محبت بھرے خط نے متاثر کیا۔ کتاب کی رسید بھیج چکا ہوں۔ اس گرمی میں پڑھنے کی ہمت نہیں ہے۔ جولائی میں اپنے تاثرات مختصر طور پر بھیج سکوں گا۔ کرشنا اور سکریتا کو دعا۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

خیر طلب، آل احمد سرور

گلزار

191اے، کوزی ہوم سوسائٹی، 251 پالی ہل باندرا، بمبئی 50

21 دسمبر 1999

محترم جناب جوگندر پال جی! آداب!

آپ کا خط 23 اکتوبر کا لکھا، 20 نومبر کا پوسٹ کیا، بالآخر 21 دسمبر مجھے مل گیا۔ لفافے کو داد دیتا ہوں کہ پھٹا نہیں۔ بڑی ہمت ہے۔

بھائی صاحب، چند روز کے لئے باہر گیا تھا کل رات ہی لوٹا ہوں۔

'راوی پار' کے انتخاب کے لئے شکریہ!

آپ کی ایک کتاب ملی ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی مرتب کی ہوئی۔ سرسری طور پر دیکھی ہے ابھی پڑھی نہیں۔ 'نادید' پر تبصرہ تو ہے، لیکن کہانی شاید کتاب میں نہیں ہے۔ کوئی کاپی مل جائے تو ضرور بھجوا دیجئے۔ نوازش ہوگی۔

کوئی خدمت میرے لائق؟

بھائی کو نمسکار

گلزار

شفیق احمد شفیق

ترسیل

ڈی ٹی 81/78 سمن آباد، کراچی

29 فروری 2000

برادرم جوگندر پال، محبتیں

17 فروری کا لکھا ہوا خط آج یعنی 29 فروری کو ملا۔ اس کے ساتھ افسانہ 'مقامات' موصول ہوا۔ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا ایک بار پھر ممنون ہوں۔ آپ نے جس ذمہ داری، محبت اور توجہ سے ترسیل کے لئے افسانہ ارسال کیا ہے اس کے لئے بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

زیر نظر افسانہ 'مقامات' پڑھ کر ایک عجیب سا کرب رگ و پے میں دوڑ گیا۔ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایسی حقیقت ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہی سچائی نسل در نسل چلی آ رہی ہے اور آگے دیکھتا ہوں تو تصویر اس سے مختلف

دکھائی نہیں دیتی بلکہ ماضی سے بدتر صورت حال کا احساس دلاتی ہے۔ آپ کے قلم میں جادو ہے، آپ کا فن آپ کی ہر کہانی میں بولتا ہے، آپ کے الفاظ زندہ ہیں اور آپ کے افسانوں کے کردار احساس کے آنگن میں جیتے جاگتے اور روتے ہنستے بلکہ بعض اوقات تھرکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ موضوع کوئی آسمانی نہیں ہوتا بلکہ اسی زندگی کے روز وشب سے کشید کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تو فن کار کی تخلیقی فعالیت ہے جو فرسودہ اور گھسے پٹے موضوع کو بھی تازگی، توانائی اور انفرادیت عطا کرتی ہے۔ آپ کی تخلیقی فعالیت بھی پارس کی سی خصوصیت رکھتی ہے اور جس موضوع کو چھو لیتی ہے اسے سونا بنا دیتی ہے۔ آپ کی شخصیت، موضوع، اسلوب اور لفظیات جب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو آپ کی کہانی کو اچھوتے پن سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔

میں نے آج سے دو تین سال پہلے آپ کے فن پر ایک تفصیلی مقالہ لکھا تھا۔ جسے اپنے ایک شناسا کے ذریعہ آپ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے جاتے وقت تو کہا تھا میں دہلی بھی جاؤں گا مگر شاید کسی وجہ سے نہ جاسکے۔ جب وہ واپس آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے بھیا جوگندر پال سے ملاقات کی تھی؟ جس پر انھوں نے بتایا کہ وہ پروگرام کے مطابق دہلی نہ جاسکے۔ لیکن بقول ان کے انھوں نے میرا مضمون کلکتے سے آپ کے پتے پر بذریعہ ڈاک بھیج دیا۔

چونکہ آپ کی طرف سے کوئی رسید نہیں ملی اس لئے یہ یقین ہو گیا کہ مضمون ڈاک کی نذر ہو گیا ہے۔ بہر حال مذکورہ مضمون کی ایک کاپی اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ہندوستان کے کسی مناسب رسالے میں شائع کروا دیں عنایت ہوگی۔ مضمون ملنے کی بھی اطلاع ضرور دیجئے گا ورنہ تشویش میں مبتلا رہوں گا۔

ترسیل پریس میں ہے۔ میں نے آپ کا ایک بہت پرانا افسانہ 'بھرم' جو بھارت کے رسالے میں شائع ہوا تھا ترسیل کے پہلے شمارے میں آپ کی اجازت کے بغیر شامل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کچھ خیال نہ کریں گے۔ مجھے اس کتاب کا بے چینی سے انتظار ہے جو ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے آپ کے فن پر مرتب کی ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ بھابی اور دیگر احباب کو سلام عرض ہے۔ جنوری کا ماہنامہ شاعر ممبئی سے آج ہی پہنچا ہے۔ اس میں بھی اس کتاب کا مختصر ترین تعارف دیکھا۔ کتاب کے مطالعے کی للک اور بڑھ گئی ہے۔

اگر آپ کی کوئی تازہ کتاب آئی ہو تو از راہ عنایت ضرور عنایت کیجئے گا۔ دوستوں اور دیگر اہل خانہ کو میری جانب سے سلام عرض کر دیں۔

آپ کا شفیق احمد شفیق

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

گرچھی نگر جموں توی

22 نومبر 2001

برادر عزیز آداب

''تا اگر مکتوب ننوشتیم عیب ما مکن

دربیان راز مشتاقاں قلم نامحرم است''

میں شرمندہ ہوں کہ کن الفاظ میں معذرت پیش کروں۔ پہلے افسانوی مجموعہ موصول ہوا (بستیاں) اور پھر اس کے بعد پرندے۔ شکریے کا خط تو ایک طرف رہا میں محض رسید تک نہ دے سکا اس وقت تو: 'ندامت کا احساس ہے اور میں ہوں'

'بستیاں' کی پہلی کہانی پڑھی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دینے والے نے آپ کو مطالعے کی دولت بھی عطا کی ہے اور مشاہدے کی بھی۔ مطالعے سے میری مراد کتابی مطالعہ نہیں ہے بلکہ وہ مطالعہ جو ماورائے علم کتابی ہے۔ واقعات پر گرفت تو اوروں کی بھی ہوتی ہے لیکن آپ کی گرفت فن کارانہ گرفت ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل جسے محض چھوٹی ہونے کی بنا پر اور اہل قلم نظر انداز کر دیں فن پارہ بن کے آپ کی تحریر میں آتی ہے۔ نفسیات پر بھی آپ کی گرفت ایک آرٹسٹ کی گرفت ہے۔ مبارک باد۔

اگرچہ بول چال کی زبان ہمیشہ ادبی زبان نہیں ہوتی لیکن ادبی زبان بعض دفعہ بول چال کی زبان کے ساتھ ہم رشتہ ہو کر بلند تر ادبی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ آپ جہاں کہیں بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں افسانے کی دل کشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اکثر افسانہ نگاروں بلکہ تجریدی افسانہ نگاروں کے افسانوں سے جو افسانویت ختم ہوتی جا رہی تھی یعنی کہانی سے کہانی پن غائب ہوتا جا رہا تھا وہ آپ افسانے کے فن میں واپس لے آئے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا فنی کارنامہ ہے۔ ایک اور خوبی جو قاری کو متاثر کرتی ہے وہ آپ کے افسانے میں عصری آگہی کی روایت کا تسلسل ہے۔ میں فکشن کا نقاد نہیں لیکن اپنی کم علمی کے باوجود کہہ سکتا ہوں کہ:

دامان نظر تنگ و گل حسن تو بسیار

گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

'پرندے' افسانوں کی کتابوں میں بھی ایک اونچے مرتبے کی حامل ہے

اور لائبریری میں Window of the East Series میں بھی رکھی جاسکتی ہے۔ بہ آسانی۔

میں ہر کام میں دیر کر دیتا ہوں۔ ان دنوں حافظہ بھی پورا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ ہر کام میں تاخیر کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

'بستیاں' ابھی تک میں نے بنجارہ صاحب کے حوالے نہیں کی۔ چاہتا یہی تھا کہ آپ کو معذرت لکھوں تو کتاب انھیں دوں۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں بھول ہی نہ جاؤں۔

جگر صاحب مرحوم ایک شعر اکثر گنگنایا کرتے تھے:

جب سے کھویا گیا ہے دل اپنا
چیز رکھتا ہوں بھول جاتا ہوں

یہاں صورت یہ ہے کہ کھویا ہوا دل تو واپس آ گیا ہے لیکن اس کے باوجود بھول جانے والا معاملہ روز افزوں ترقی پر ہے۔ خداوند کریم رحم کرے!

امید کہ گھر میں ہر طرح سے خیریت ہوگی۔

والسلام خیر اندیش

پس نوشت: 'بستیاں' دو تین روز تک امین بنجارہ صاحب کو موصول ہو جائے گی۔

جیلانی بانو

بنجارہ ہلز، حیدرآباد (بھارت)

27 نومبر 2001

محترم پال صاحب۔ آداب!

آپ کا خط دیکھ کر ہم دونوں بہت خوش ہوئے۔

خدا کرے آپ صحت و سلامتی کے ساتھ اسی طرح لکھنے پڑھنے پر مصروف رہیں۔

گذشتہ سال میں دو تین بار دہلی آئی۔ بھابی سے فون پر بات ہوئی انھوں نے بتایا کہ آپ کو پورے آرام کی ضرورت ہے۔

آپ کی بیماری سے پریشانی ہوئی۔ دعا کرتے رہے کہ آپ جلدی سے صحت مند ہو جائیں۔

آپ نے مجھے اپنی دونوں کتابیں دی تھیں۔ آپ کی کتابیں تو ہمارے لئے بہت بڑا تحفہ ہوتی ہیں۔

میں نے ان کے بارے میں خط لکھے تھے۔ ایک خط کے جواب میں بھابی نے جواب بھی دیا تھا کہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ اب یہ خوش خبری سنائیے کہ نئی کتاب کب آ رہی ہے۔

میں آپ کی مختصر کہانیوں کا انتظار کرتی ہوں۔

بہت اچھی کہانیاں آپ نے لکھی ہیں۔

اگست میں ہم بھی اورنگ آباد گئے تھے۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے فکشن پر ایک سیمنار کیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ سفر کر سکیں گے۔ ورنہ اس سیمنار میں ضرور آپ کو بلایا جاتا۔

اب آپ دونوں حیدرآباد میں آئیے۔ بہت اچھا لگے گا۔

آپ نے میری کتاب پڑھی۔ پسند کی۔ شکریہ!

میں جانے کیوں لکھے جا رہی ہوں۔ کوئی اچھی کہانی لکھنے کی تلاش میں ہوں۔

انور اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔

آپ کو سلام کہہ رہے ہیں۔

ہم دونوں کا سلام کرشنا بھابی کے لئے۔

مخلص، جیلانی بانو

عابد سہیل

22-ایس پی، جرنلسٹ کالونی، سیکٹر 'سی' علی گنج لکھنو-24

بہت پیارے جوگندر پال بھائی۔ خدا آپ کو خوش و خرم اور صحت مند رکھے۔ دہلی کی واپسی کے بعد آپ کو خط لکھا تھا لیکن پورا پتہ نہیں لکھا تھا اس لئے واپس آ گیا۔ بعد میں شارب صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے مکان تبدیل کر دیا ہے اور نیا پتہ مجھے معلوم نہیں۔ اس لئے یہ خط قمر رئیس صاحب کے C/o بھیج رہا ہوں۔

اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ کاغذات میں سولہ سترہ غیر مطبوعہ کہانیاں ملیں۔ جب بھی طبیعت ٹھیک ہوتی ہے بظاہر نظر ثانی کرتا ہوں۔ ایسی ہی ایک کہانی 'آج کل' کے اپریل یا مئی کے شمارے میں آ رہی ہے۔ وقت نکال سکیں تو اسے پڑھ کر مجھے اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیں۔

کانپور کے ایک ہندی ماہنامہ نے اردو کہانیوں کا انتخابات بھی کیا ہے۔ اس انتخاب کی تحریک مجھے آپ کی محبتوں کے سبب ہی مل گئی ہے۔ لیکن میرا خیال تھا کہ آپ کی نظر انتخاب 'اندھیرے کا کرب' پر پڑے گی کیوں کہ اس کی تعریف آپ زبانی اور تحریری طور پر کئی بار کر چکے ہیں لیکن شاید یہ کہانی آپ حاصل نہ کر سکے۔

زریں دبئی میں ہیں۔ چند دنوں کے لئے آنے والی ہیں۔ آپ کا فون نمبر مل جائے تو رابطہ قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ گھر میں

آپ کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے اور زریں تو آپ کو سب سے زیادہ یاد کرتی ہیں۔

'فکشن پر تنقید' کا پہلا ایڈیشن تو ایک سال کے اندر اندر ختم ہو گیا تھا۔ اب دوسرا ایڈیشن بھی امید ہے اگلے سال تک ختم ہو جانا چاہئے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ 'سب سے چھوٹا غم' کا دوسرا ایڈیشن فروخت ہو چکا ہے۔ صرف تیس کاپیاں رہ گئی ہیں۔

'عفریت' کئی بار پڑھ چکا ہوں اور اسے آپ کی ہی نہیں دورِ حاضر کی بہترین کہانیوں میں شمار کرتا ہوں۔ فکشن کی تنقید کا دوسرا حصہ (مختلف نام سے) بشرطِ صحت شائع کیا تو اس میں اس کہانی کا تجزیہ ضرور ہوگا۔ ابھی لکھا نہیں ہے لیکن نوٹس کئی سال قبل ہی بنا لئے تھے۔ آپ کا چھوٹا بھائی۔

عابد سہیل

(پس نوشت): اقبال متین خاصے بیمار ہیں۔ ان کو خط لکھ دیجئے۔ آپ کے خط سے انہیں بیماری کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملے گا۔ پتہ درج ذیل ہے۔

معرفت ایس ایم سعدی، جہاں نما، حیدرآباد 53

اقبال متین

15 مئی 2003

اوے پالاں۔ دیکھا، میرے آپریشن اور لمبی بیماری نے میرے دوستوں کو کیسی تہذیب وتمیز سکھا دی ہے۔

"میرے یار تیرے لئے" لکھ کر اپنی کتابیں بھیجنے والا جوگندر پال سارے کے سارے خط میں "آپ، آپ" کہہ کر مخاطب ہے۔ مزہ آگیا۔ جی چاہا پھر بیمار پڑوں تا کہ تو پاؤں پکڑ لے کہ سیاں نہ جاؤ ہمیں چھوڑ کے۔

جی خوش ہو گیا کہ کس قدر پیار سے تم نے اور بھابی نے تسلی دی اور حوصلہ دیا۔

ایک لطیفہ سنو۔ انشا کے سرورق پر تمہاری پیاری تصویر دیکھ کر میں نے اپنے بیٹے اور اس کے ایک دوست سے جو گھر پر اچھے موڈ میں موجود تھے، تمہاری تصویر بتا کر میں نے پوچھا کہ یہ بڑے میاں میرے دوست ہیں۔ عمر میں یہ بڑے ہیں یا میں بڑا ہوں۔ ان لوگوں نے غور سے دیکھ کر کہا کہ میں بڑا ہوں۔ سارا موڈ غارت ہو کر رہ گیا۔ جون 2004 میں میری بھتیجی نے فون سے باتیں کرتے کرتے ایک تصویر کھینچ لی تھی۔ کیا بتاؤں کیا جوانی ہے میری۔ اور اب گیارہ مہینے میں کیا میری صورت انشا کے بوڑھے سے بدتر ہو گئی ہے۔ سچ یہ ہے کہ تمہاری وہ تصویر اتنی معصوم اور ہنس مکھ ہے کہ رسالے سے جدا کر کے اس کو محفوظ کر لیا ہے۔

کہانیاں ساری کی ساری پڑھوں گا اور لکھوں گا۔

ایک کرم کرو۔ قمر رئیس کو فون کرو کہ وہ شرافت سے میرے خط کا جواب فوراً دے۔

مجھے ایس ایم سعدی کے توسط سے ہی نے یاد کرنا۔ ابھی زندگی بکھری بکھری سی ہے۔

محترم بھابی کی خدمت میں تسلیم عرض

میرا خط تمہیں مل گیا ہوگا۔

تمہارا، اقبال متین

شمس الرحمٰن فاروقی

9 مارچ 2004

پیارے بھائی جوگندر پال، تسلیمات وآداب۔

ہولی مبارک۔

کچھ دن ہوئے آپ کے پبلشر نے آپ کی دو کتابیں مجھے بھیجیں۔ ایک تو آپ کا نہایت عمدہ ناول 'پار پرے' اور دوسری آپ کے افسانوں کے انگریزی ترجموں کی کتاب۔ افسانوں کی مترجم ہماری صاحب زادی سکریتا اور نغمہ ظفیر الحسن ہیں۔ طبیعت خوش ہوگئی کہ اتنے عمدہ افسانے اس عمدگی سے ترجمہ ہوئے اور اس خوبی سے شائع کئے گئے۔

ناول کا موضوع مجھے نیا معلوم ہوا۔ تکنیک کے لحاظ سے یہ بات توجہ انگیز لگی کہ انجام اور آغاز دونوں میں یکساں کیفیت ہے۔ افسانے میں دائرے کی سی شکل بنتی ہے۔ کہانی انسان کا دکھ بھی ہے اور انسان کا مقدر بھی ہے۔ نہ یہ پورا ہوتا ہے نہ وہ پوری ہوتی ہے۔ آپ کے اسلوب میں اب ایسا ارتکاز اور خاموش زور ہے جو ناول کے ختم ہو جانے کے بعد قاری کو دیر تک مسحور کئے رہتا ہے۔

کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ہندوستانی ادیبوں کا وفد جو پاکستان جا رہا ہے یا جانے والا ہے، اس میں آپ بھی شامل ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ یقین ہے آپ کا سفر بے حد کامیاب ہوگا۔

اب آپ کی صحت کیسی ہے؟ پاکستان کب جانا ہوگا؟ یا آپ جا کر واپس آگئے؟ فرصت ہو تو کسی دن آئندہ خط میں تھوڑا سا حال لکھئے گا۔ اور 'شب خون' بھی بہت دن سے آپ کی تحریر کو ترس رہا ہے۔ براہ کرم توجہ کریں۔

بھابی کو سلام وآداب۔ آپ کا،

شمس الرحمٰن فاروقی

OO

ایک یادگار مکالماتی خاکہ

اقبال کی برکتیں

پروفیسر عاصی کرنالی

مولوی عبدالصمد نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

''میاں، خدا تمہاری خیر کرے، علم و فضل کی جیسی ناقدری اس زمانے میں دیکھی، کبھی کاہے کو ہوگی۔ نوکری چاکری کا ہر دروازہ بند ہو گیا۔ سفارش کہاں سے لاتا۔ کام نکالنے کے لئے چاہئے تھا پیسہ، وہ میرے پاس کہاں۔ کسی مسجد کی امامت تک نہ مل سکی۔ میں بھوکوں مرنے لگا۔ آخر میں نے سوچا علم کو تین طلاق دوں اور ادب کو اپنے حبالۂ عقد میں لے آؤں۔ تم جانو بد قسمت ہونا اور بات ہے، کند ذہن ہونا اور چیز ہے۔ میں نے ذہانت کی تیز چھری سے بد قسمتی کی رسیاں کاٹنی شروع کر دیں اور آج خدا تمہاری خیر کرے میاں، کوٹھی ہے، کار ہے، جائیداد ہے، عزت ہے، شہرت ہے، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔''

''مولوی صاحب! آپ کو الہ دین کا چراغ مل گیا جو چٹکی بجاتے یہ کایا پلٹ ہوگئی۔'' میں نے ازرہِ تحیر پوچھا۔

مولوی عبدالصمد نے اسکواش کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔ میاں خدا تمہاری خیر کرے، تم جانو، میں مکار نہیں ہوں۔ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ ہر معاملے میں سونے کی طرح کھرا ہوں، یہ سب ہوت جوت جو تم دیکھ رہے ہو، یہ نیت کا پھل ہے۔ میری نیت اور ذہانت دونوں گویا جڑواں بچے ہیں۔ میں اُڑتی چڑیا کے پر گنتا ہوں۔ زمانے کی ہوا پہچانتا ہوں۔''

''مولوی صاحب پہلیاں نہ بجھوائیے۔ دولت مند بننے کا گر بتائیے۔'' میں نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

''بتاتا ہوں۔ میاں خدا تمہاری خیر کرے تم جانو ہماری قوم مردہ پرست ہے۔''

''مردہ پرست یعنی؟'' میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

''مردہ پرست یعنی مرنے کے بعد قدر کرنے والی، یعنی..... خیر چھوڑو اس بات کو، بس یوں سمجھو کہ جب تک اقبال زندہ رہے، میں ان کے مخالفین میں شامل رہا، ان کے خلاف جن علما نے کفر کا فتویٰ دیا، ان میں یہ حقیر پر تقصیر بھی شامل تھا۔ توبہ ہے توبہ.....'' مولوی عبدالصمد خاں نے اپنے دونوں رخساروں پر ہلکے ہلکے چپت لگائے، جیسے خود کو سزا دے رہے ہوں۔ ''توبہ ہے توبہ... خیر یہ بحث بھی چھوڑو۔ پھر اقبال مر گئے، میں پھر بھی مخالف رہا۔ پھر جس مسجد میں امامت کا خواست گار تھا، وہاں مولوی غلام غوث، خدا اس کا بیڑا غرق کرے، قابض ہو گیا۔ میں بھوکا مرنے لگا تو میاں، خدا تمہاری خیر کرے۔ میں اقبال پرست بن گیا۔ یہ ادب میں میری پہلی مداخلت تھی، میں نے چندول والوں کو جمع کیا اور کہا۔

''اقبال ہمارا شاعر، ہمارا محسن، پاکستان کے تصور کا خالق، اور ہم اسے زندہ رکھنے کے لئے کچھ نہیں کر رہے لعنت ہے ہم پر....

ہمیں کیا کرنا چاہئے مولوی صاحب، ایک سیٹھ نے دریافت کیا

ارے بھئی، جلسے کرو، اس ولی قلندر کا عرس کرو، کچھ تو کرو۔

جزاک اللہ مولوی صاحب، ایک دوسرے امیر کبیر نے کہا، آپ جو چاہیں کریں، پیسہ ہم سے لے لیں، ہم آپ کو کنوینر بناتے ہیں۔

منظور ہے، منظور ہے... سب نے یک آواز ہو کر کہا۔

تو میاں خدا تمہاری خیر کرے، یہ لو پیو اسکواش۔ لونا بھئی ایک گلاس اور، میری خاطر سے، اچھا چلو اقبال کے صدقے میں، ہاں شاباش پیو، پی لو، تو میاں، میں نے ایک بڑا بھاری جلسہ کیا۔

خرچ اخراجات کے لئے ایک ہی سیٹھ نے دس ہزار تھما دیے، بھئی لوگ بڑے اہلِ دل ہیں۔ جلسہ کامیاب رہا۔ اخباروں میں بڑی دھوم ہوئی۔ میری اور سیٹھ عبدالسلام کی تصویریں خوب خوب چھپیں۔ چار ہزار روپیہ بچا جسے حق

محنت کے طور پر اس خادم نے اپنے پاس ہی رہنے دیا...''

''سب نیت کا پھل ہے مولوی صاحب۔'' میں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو میاں، جلسہ کامیاب رہا۔ میرا دل کھل گیا، چھ ماہ بعد میں نے مشاعرے کی تجویز رکھی۔ مجلسِ عاملہ نے قبول کی، مجھی کو کنوینر بنا دیا، ارکانِ عاملہ نے حسبِ توفیق چندہ جمع کیا۔ دو سو روپے اس حقیر پر تقصیر، خادمِ اقبال نے بھی پیش کیے۔ اسی نشست میں پانچ ہزار اکٹھے ہو گئے۔ پھر میں نے عطیہ مہم شروع کی، پھر خیرات مہم، پھر چندہ مہم اور آخر میں ٹکٹ مہم۔ ایک مہینے کی محنتِ شاقہ سے پچاس ہزار کی ڈھیری لگ گئی۔ روحِ اقبال کے فیض کے قربان جایئے۔ پھر میں نے شعرا کو دعوت نامے لکھے، پہلے ان شاعروں کو مدعو کیا، جن سے دوستی یا جان پہچان تھی۔ بدیں مضمون کہ چند سوختہ ساماں قلندروں نے اپنی اپنی کشتیاں جلا کر اقبال کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کارِ خیر میں آپ بھی جذبہ قربانی سے کام لیتے ہوئے ازراہِ اقبال نوازی بلا معاوضہ تشریف لایئے۔ کھانا اور چائے بذمہ منتظمین۔

دس شاعروں کی طرف سے قبولیت نامے وصول ہو گئے۔

بعض شاعروں کو دعوت نامے اس انداز میں لکھے گئے گویا یہ بزمِ اقبال نہیں یتیم خانہ ہے۔ مقامِ عبرت ہے ازراہِ کرم، معاوضے کے بجائے حقیر سا نذرانہ قبول کیجئے۔ نذرانے کی رقم پچاس سے سو روپے تک کے درمیان لکھ دی گئی پندرہ شاعروں نے دعوت قبول کر لی۔

اب بڑے شاعروں کی باری تھی، بعض منتظمین چاہتے تھے کہ حضرت غیظ، اور جناب قسیم نادی اور جناب خروش ملیح آبادی اور حضرت حافظ جالندھری جیسی بڑی توپوں کو بلوائیں۔ میں نے اس موقع پر حکمتِ عملی لڑائی۔ میں نے عرض کیا، ایک صاحب تو نام کے بڑے ہیں۔ درشن تھوڑے۔ ڈھول ہی ڈھول ہیں، اندر سے خالی۔ زبان اور گرامر تک کی غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک اور صاحب بیمار رہتے ہیں۔ پچھلے ہفتے سے تخمہِ معدہ میں مبتلا ہیں۔ اور ابھی دو تین ماہ انشاءاللہ مبتلا رہیں گے۔ ایک اور صاحب ساری دنیا کو مے خانہ سمجھتے ہیں، آئیں گے اور مشاعرے کو غرقِ شراب کر دیں گے اور اقبال جیسے مردِ مومن کے مشاعرے میں ایسوں کو بلانا گناہِ کبیرہ ہے۔ پھر ان لوگوں کے معاوضے لمبے چوڑے ہیں۔ ہم سب نیلام بھی ہو جائیں تو ان کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ان اول درجے کے نمائشی ہاتھیوں کی بجائے متوسط درجے کے محنتی اور معقول شعرا کو بلوایئے جن میں اخلاص بھی ہے اور ایثار بھی۔

''آہو جی، پیسے کا کھیال رکھنا جروری ہے...'' ایک رکن نے کہا.... مشاعرہ ہی کرانا ہے کوئی ساعروں کا 'مکابلہ حسن' تو نہیں کرانا ہے۔

اس اخلاقی تائید کے بعد میں نے کہا۔ اب یوں دیکھئے حضرات، ایک بڑا شاعر فرض کریں ایک ہزار لیتا ہے، دو سیکنڈ کلاس شاعر پانچ پانچ سو پر راضی ہو جائیں گے۔ پانچ تھرڈ کلاس شاعر دو دو سو پر خوش ہو کر آئیں گے۔ دس شاعر جن کی مارکیٹ ویلیو ابھی مقرر نہیں ہوئی۔ سو سو پر آ کر زندگی بھر ہمارے ممنون رہیں گے۔ دیکھئے اسی طرح خرچ ہوا وہی ہزار اور آ گئے ایک کی بجائے دس۔ سب نے میری ذہانت کی داد دی۔ ایک رکن نے جوش میں آ کر کہا۔

آفرین ہے مولوی عبدالصمد خان پر۔ یہ نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے۔ الغرض بڑے دھوم دھڑکے سے مشاعرہ ہوا۔ تیسرے اور چوتھے اور پانچویں اور چھٹے درجے کے تمام شاعروں نے وہ تانتا باندھا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا، اور میرا اعتقاد ہے کہ روحِ اقبال تمام رات قبر میں خوش ہوتی رہی ہوگی۔

تب ہی تو روحِ اقبال کی برکت سے اس مشاعرے میں مجھے تیس ہزار ساڑھے تیرہ آنے حقِ محنت اور حق الخدمت کے طور پر بچے۔

میاں خدا تمہاری خیر کرے، زیادہ کیا کان کھاؤں، مختصر یوں سمجھو کہ خدمتِ اقبال کے سبب کیا عزت اور کیا شہرت اور کیا پبلسٹی نہ تھی جو اس حقیر فقیر، کم ترین خادمِ اقبال کو نصیب نہ ہوئی اور خدا نے میرے حسنِ نیت کے صلے میں وہ خوش حالی دی، وہ فارغ البالی دی کہ دو لڑکیوں کے جہیز تیار کر لئے۔ دو لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر گئے ہیں۔

پری خانم۔ یہ میری بیوی ہیں، اصل نام تو غفورن بی بی ہے، میں پیار سے پری خانم کہتا ہوں۔ ہاں تو پری خانم کو خدا نے اتنا زیور دیا ہے کہ سر سے پاؤں تک لدی پھندی رہتی ہے۔

تو میاں، خدا تمہاری خیر کرے، پھر میں نے اقبال کو زندہ رکھنے کے لئے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اقبال میموریل لائبریری میں نے قائم کی، اقبال پبلک سکول میں نے جاری کیا۔ اقبال عرس فنڈ میں نے کھولا۔ ایک مسجد بنوا دی، اوپر لکھوا دیا ''بہ یادگارِ اقبال بناشد'' الغرض بہت کچھ کیا اور کر رہا ہوں اور اللہ بہت کچھ دے رہا ہے اور دے گا۔ سبحان اللہ کیا تھے علامہ اقبال، جیتے تب فیض، مرے تب فیض، گویا فیض کا سمندر موج زن ہے...

''ارے میاں ضرب کلیم، بھئی کہاں ہو ضرب کلیم''
ایک لڑکا آ کھڑا ہوا... ''جی ابا جی؟''
''میاں ضرب کلیم ابھی تک زبور عجم کو سکول لے کر نہیں گئے؟ جاؤ جلدی جاؤ اور پیام مشرق کو میرے پاس بھیج دو''
''مولوی صاحب یہ کیا؟'' میں نے حیرت زدگی کے عالم میں پوچھا... ''یہ ضرب کلیم، یہ زبور عجم...''
''ہاں میاں۔'' مولوی عبدالصمد خان نے اپنی گنجی چندیا کھجاتے ہوئے کہا۔
''مجھے اقبال سے بڑی عقیدت ہے، وہ میرے محسن ہیں۔ میرے رازق ہیں۔ انہوں نے میرا گھر بھر دیا ہے۔ میں ان کا معتقد ہوں میاں۔ میں نے اظہارِ عقیدت کے طور پر اپنے سب بچوں کے نام ان کی تصانیف پر رکھ دیئے ہیں۔ ضرب کلیم چھٹی میں پڑھتا ہے۔ بی بی زبور عجم دوسری کی طالبہ ہے۔ پیامِ مشرق گھڑی ساز کی دکان پر کام دیکھ رہا ہے۔ بالِ جبریل قرآن پاک حفظ کر رہا ہے۔ اسرارِ خودی کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ بلکہ میں نے پری خانم یعنی غفورن بی بی کا نام بانگِ درا رکھ چھوڑا ہے۔''
تبھی اندر سے دستک ہوئی۔ ''ذرا سنتا مولوی صاحب۔''
مولوی صاحب دروازے کی طرف لپکے۔
''ہاں پھوپھی فاطمہ کوئی خوش خبری ہے کیا؟''
''ہاں مولوی صاحب، مبارک ہو۔ خدا نے آپ کو جڑواں بچے دیئے ہیں، دونوں لڑکے ہیں۔''
''اللہ تیرا شکر ہے، اللہ پاک تیرا شکر ہے۔''
مولوی صاحب آ کر بیٹھ گئے، خوشی سے ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔
''خدا نے دو جڑواں بچے عطا کیے ہیں میاں۔''
''مبارک باد قبول کیجیے مولوی صاحب۔''
''ہاں میاں، خدا کا احسان ہے۔ اچھا میاں خدا تمہاری خیر کرے، ان کے نام تو بتاؤ۔ اقبال کی کتابوں کے نام تو قریب قریب ختم ہو گئے۔ تاہم دماغ لڑاؤ، اچھے سے دو نام سوچو...''
''سوچ لئے مولوی صاحب سوچ لئے۔''
''ہاں ہاں بتاؤ''
''پہلے کا نام شکوہ، دوسرے کا جواب شکوہ۔''
کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولوی صاحب کس طرح لوٹ پوٹ ہو گئے۔

OO

پیروڈی

ڈاکٹر گیان چند جین

برخوردار... کے نام

(علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

کسی رئیس کے گھر میں قیام پیدا کر
دیارِ عشق میں اونچا مقام پیدا کر
عمائدین کے مَل صبح و شام روغنِ قاز
جو کوئی کام نہ ہو تو یہ کام پیدا کر
شجر کے نیچے ترنم سے شعر پڑھ کھوجا
جنابِ حسن میں اپنا مقام پیدا کر
کسی وزیر کی لڑکی جو ہم سبق ہے تری
تو اس سے راہِ سلام و پیام پیدا کر
جہاں سے جھانک سکے گرلز ہوسٹل کے بیچ
بلند اور بلند ایسا بام پیدا کر
ترے طمنچے سے لڑکے بھی ماسٹر بھی ڈریں
اسمبلی کے الیکشن میں نام پیدا کر
یقیں ہو جیسے ہی، اب وارڈن نہ آئے گا
پسِ کتب سے تو مینا و جام پیدا کر
یہ شغلِ ویڈیو، راتوں کو جاگ دن کو سو
نئی صدی میں نئے صبح و شام پیدا کر
چرس میں ڈال لے تھوڑا سا آب ہیروئن
چلم کے واسطے تازہ قوام پیدا کر
شِواس[1] گر نہ ملے، گڑ میں نیلا تھوتا ڈال
کشید کر کے مئے نیل فام پیدا کر

لکھنؤ، اپریل 1986

1۔ اسکاچ وہسکی شِواس ریگل Chivas Regal، ایک مہنگی شراب

(ماہنامہ شگوفہ کے 25 سالہ شعری انتخاب مطبوعہ اپریل 1994 سے)

حیدرآباد بدل رہا ہے

ڈاکٹر عابد معز

مجھے حیدرآباد سے بھائی کا خط آیا۔

یہ بھائی آج کل والا بھائی نہیں ہے جس کو یاد کرنے سے پسینہ چھوٹنے لگتا ہے۔ یہ بھائی آج سے پچیس تیس سال پرانا بھائی ہے جب بھائی واقعتاً بھائی ہوا کرتا تھا۔

تقریباً ہر محلّہ اور بستی میں ایک بھائی ہوتا تھا۔ جگ بھائی۔ محلّہ کے سبھی لوگ بشمول چھوٹے اور بڑے اسے بھائی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ بھائی دوسروں کے کام آتا اور ہر کسی کا ہمدرد ہوتا تھا۔ آج جب کہ بھائی کے معنی بدل گئے ہیں چند پرانے بھائی اب بھی باقی ہیں۔ ایسے ہی ایک بھائی نے مجھے خط لکھا:

''میاں عابد معز۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ امید ہے کہ تمھارا مصری ساتھی خیریت سے ہوگا۔ تمھارا کالم پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم سعودی عرب میں رہتے ہوئے بھی حیدرآباد کے بارے میں فکرمند ہو۔ تم حیران اور پریشان ہو کہ امریکی صدور حیدرآباد کیوں آرہے ہیں۔ ہم بھی مسلسل یہی سوچ رہے ہیں اور اب تک ہمیں بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ لیکن اب مل کر سوچنا شروع کیا ہے تو کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔ فی الحال ہم ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں کہ خدا ہمیں اور ہمارے شہر کو نظر بد سے بچائے رکھے!

امریکی صدور کی دیکھا دیکھی دنیا تمام سے وی وی آئی پی، وی آئی پی، آئی پی اور دیگر معززین حیدرآباد آرہے ہیں۔ بل گیٹس، جان کیری، مہاتر محمد جیسے اہم ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو ہمارے شہر کا دورہ کرچکے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ ہماری مہمان نوازی مثالی رہی ہے۔ سابق میں دوسرے مقامات سے اہل علم اور دانش ور حضرات حیدرآباد آکر سرفراز ہوئے۔ مہمانوں کا خیال رکھنے اور ان کی خاطر مدارت کے لیے ایک علیحدہ محکمہ فراش خانہ عامرہ ہوا کرتا تھا۔ اسی روایت کی پاسداری موجودہ دور کی حکومتیں بھی کررہی ہیں۔ بلا مبالغہ ہر دن کوئی نہ کوئی وی وی آئی پی، وی آئی پی یا صرف آئی پی حیدرآباد کی سڑکوں پر دکھائی دیتا ہے۔ اب تمھارے شہر کو موتیوں، محلوں اور نوابوں کے شہر کے ساتھ مہمانوں کا شہر بھی کہا جانے لگا ہے۔

ہمارے شہر میں مہمانوں کی آمد و رفت کے سبب ائرپورٹ تنگیِ داماں کا شکوہ کرنے لگا ہے۔ تم نے بھی پچھلی چھٹی پر شکایت کی تھی کہ ہمارا ہوائی اڈہ چھوٹا ہے۔ باہر سے دو چار جہاز ایک ساتھ آجائیں تو ہنگامہ بپا ہوجاتا ہے۔ بچے چھوٹ جاتے ہیں۔ سامان گم ہوجاتا یا ادل بدل جاتا ہے۔ سامان سمیٹنے کے لیے ٹرالی نہیں ملتی۔ اور پھر بڑے جہاز ہمارے چھوٹے ایرپورٹ پر اتر نہیں سکتے۔ بڑے جہازوں کو بے موسم بادلوں کی طرح برسے بغیر حیدرآباد کے اوپر سے اڑ کر چلے جانا پڑتا ہے۔

اب حیدرآباد آنے والوں کی یہ شکایت دور ہوجائے گی۔ آنے والے مہمانوں کا کشادہ دل کے ساتھ کشادہ ایرپورٹ پر استقبال کرنے کے لیے ہم نیا ہوائی اڈہ بنا رہے ہیں۔ تمھیں علم ہوگا ہی، شہر سے چند کلومیٹر دور نیا ہوائی اڈہ تعمیر ہو رہا ہے۔ دو یا تین سال بعد تم نئے ایرپورٹ پر اتر سکو گے۔ نئے ہوائی اڈہ کی تعمیر سے حیدرآباد شہر وہاں بلکہ اس سے آگے تک وسعت پائے گا اور ہمارے درمیان فاصلے مزید بڑھ جائیں گے۔

تم جو باہر کی سڑکوں کا نقشہ ہمارے سامنے کھینچا کرتے تھے کہ سڑکیں ایسی ہونی چاہئیں جس میں تین چار lanes ہوں، فٹ پاتھ ہو، اطراف پودے اور سبزہ ہو اور سڑکوں کے بیچ dividers بھی ہوں۔ ہو بہو ایسی سڑکیں اب ہمارے اطراف اور درمیان وجود میں آرہی ہیں۔

سڑکیں چوڑی ہو رہی ہیں تو ان پر دوڑنے کے لیے بڑی گاڑیاں ہمارے شہر آرہی ہیں۔ میرے بچپن میں آج سے تیس چالیس برس پہلے

سڑکوں پر دو ایک قسم کی کاریں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی ایک بڑی کار نظر آجاتی تھی جس میں دولھا اور دلہن کو منتقل کیا جاتا تھا۔ وہ دور تمھیں بھی یاد ہوگا۔ اب سڑکوں پر ہمہ اقسام کی کاریں دھواں چھوڑتی پھرتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر میں اکثر کسی نادیدہ بچہ کی طرح کاروں کو دیکھتا ٹھہر جاتا ہوں۔ شہر میں اتنی کاریں ہو چکی ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔ وہ تمام برانڈ کی گاڑیاں دکھائی دیتی ہیں جن کے نام تم نے اپنی پہلی چٹھی میں گنائے تھے۔

مہمانوں کے قیام وطعام کے لیے فلک بوس ہوٹل اور رستوراں وجود میں آئے ہیں۔ چار، پانچ، چھ اور سات ستاروں والے ہوٹل آسمان میں تاروں کو چھو رہے ہیں۔ تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ ہوٹلوں کے معیار کا اندازہ ان کی اونچائی سے کیا جاتا ہے۔ وہ آسمان میں اونچا اٹھ کر کتنے ستاروں سے پینگیں بڑھاتے ہیں۔ ستاروں والے ہوٹل میں مجھے کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میرے لیے گلی کے نکڑ کا چائے خانہ کافی ہے۔ مجھے تو ان ہوٹلوں کے پاس سے گزرنے سے تک خوف محسوس ہوتا ہے۔ چھٹی پر جب تم آؤ گے تب مجھے کسی دو چار ستاروں والے ہوٹل میں ایرانی چائے پلانا!

تم باہر کی سوپر اور ہائپر مارکٹ اور شاپنگ مال کا جو حال سناتے تھے وہ اب میری سمجھ میں آرہا ہے۔ اس وقت تو میں تمھاری باتیں سن کر گردن ہلایا کرتا تھا۔ شہر میں چند بڑی اور بہت بڑی مارکٹس وجود میں آنے سے مجھے ان مارکٹس کا اندازہ ہوا۔ ایک چھت کے نیچے ہر چیز مل جاتی ہے۔ دو اک مرتبہ بچے زبردستی مجھے شاپنگ مال لے گئے۔ حیدرآباد میں ہر سال کے آغاز پر لگنے والی نمائش کا سا سماں تھا۔

آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ جوتوں کی ڈوری سے لے کر ٹی وی تک، قلم سے لے کر کمپیوٹر تک اور چائے کی پتی سے لے کر تازہ گوشت تک، ہر شے دستیاب ہے۔ پھر یہ بھی قید نہیں کہ اشیا صرف ہمارے ملک کی بنی ہوئی ہوں۔ دنیا کے کئی ممالک کی چیزیں بھری پڑی تھیں۔ بچوں کے کھیلنے کا علاقہ مختص ہے۔ بچے کھیلتے رہیں گے اور آپ دل جمعی سے شاپنگ کرتے رہیے۔ شاپنگ سے تھک گئے تو چائے یا کافی نوش فرمائیے اور بھوک لگی تو کھانا بھی تیار ہے۔

پھیلتے اور بڑھتے شہر میں فاسٹ فوڈز کی دکانیں بھی کھل گئی ہیں۔ شہر میں برگر، پیزا، فرائیڈ چکن، مٹن اسٹیک، آئس کریم وغیرہ کے نامی گرامی outlets نظر آتے ہیں۔ تمھارے بچے چھٹیوں میں جن کھانوں کا مطالبہ کرتے تھے، وہ ملتے ہیں۔

اب تمھیں پردیس کو یاد کرنے اور بچوں کو ڈانٹ کر خاموش بٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ انھیں پیزا چاہیے تو ہر قسم کا پیزا ملے گا اور برگر درکار ہے تو ہمہ اقسام کے برگر دستیاب ہیں۔ بچوں کو میری جانب سے دعائیں دینا اور انھیں بتانا کہ حیدرآباد میں اب ان کے کھانے ملتے ہیں۔ چھٹی پر آؤ تو بچوں کے ساتھ میں بھی فاسٹ فوڈ رستوراں چلوں گا اور باہر کے تیز کھانوں کا مزا چکھوں گا!

میاں عابد، ایک اہم بات یہ ہے کہ مہمان ہمارے شہر خالی ہاتھ نہیں آرہے ہیں۔ خالی ہاتھ اپنے ہی شہر میں چلنا پھرنا دوبھر ہوتا ہے۔ خالی ہاتھ باہر بھلا کیسے جاسکتے ہیں۔ مہمانوں کے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہیں اور وہ ہمارے شہر میں سرمایہ لگا رہے ہیں۔ بڑے بڑے ادارے کھول رہے ہیں۔ فیکٹریاں لگا رہے ہیں۔ ہوٹل اور تفریح گاہیں بنا رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح ہم ان کی راہ میں بچھے جارہے ہیں اور انھیں من مانی کرنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ نتیجے میں شہر بہت پھیل گیا ہے۔ اصل شہر کے اطراف چھوٹے چھوٹے شہر اُگ آئے ہیں۔ پچھلی چھٹی پر تم سائبر آباد دیکھ چکے ہو، وہ علاقہ جہاں کمپیوٹر سافٹ ویر کمپنیاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ اس علاقہ میں تمھاری آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ اب ایسے کئی علاقے وجود میں آرہے ہیں۔ ہارڈویر پارک بن رہا ہے۔ فیب سٹی قائم ہو رہا ہے۔

شہر کی ترقی کے نتیجہ میں زمین کی قیمتیں آسمان کو چھو کر خلا میں جارہی ہیں۔ زمین کا سودا ڈالر، اسٹرلنگ پاؤنڈ اور یورو میں ہو رہا ہے۔ روپیوں کی اہمیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ویسے بھی ڈالر اور پاؤنڈ کی موجودگی میں روپیوں کو کون پوچھتا ہے۔ مکان اور دکان کے کرائے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اب وہ سیٹھ ساہوکار کے بس میں بھی نہیں رہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں منہ مانگا کرایہ ادا کر رہی ہیں۔ مہنگائی بے تحاشہ بڑھ گئی ہے۔ گرانی کا اس بات سے اندازہ کرو کہ اب ہم تھیلہ بھر پیسہ لے کر بازار سے تھیلی بھر اشیا لاتے ہیں!

یوں تو دل ابھی بہت کچھ کہنا اور سنانا چاہتا ہے لیکن سوچتا ہوں کہ تم پہلے ہی سے فکرمند ہو، تمھیں مزید پریشان کیوں کروں۔ جب تم چھٹی پر آؤ گے تو اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھیں یقین نہیں آئے گا کہ کیا یہ وہی تمھارا اپنا حیدرآباد ہے!

میاں عابد بات صرف امریکی صدور کے دوروں تک محدود نہیں ہے۔ غیر ممالک اور ہندوستان بھر کے لوگوں کی نظر حیدرآباد پر ہے۔ شاید ہمارا اور تمھارا حیدرآباد اب سب کا پیارا اور دلارا شہر بن رہا ہے۔ خدا رحم کرے!"

(بشکریہ شگوفہ حیدرآباد)

چاند پاشا

سید نصرت آرکیٹیکٹ

آپ دنیا کے کسی بھی حصہ میں چلے جائیں۔ جہاں کہیں بھی حیدرآبادی رہتے بستے ہیں وہاں چاند پاشاؤں کی ایک قابل لحاظ تعداد ان کے درمیان اپنی موجودگی کا احساس دلائے گی۔ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا جہاں تک تعلق ہے اس کے ہر محلے میں آپ کو ایک محتاط اندازے کے مطابق بیس پچیس چاند پاشا ضرور مل جائیں گے۔ حیدرآباد چاند پاشاؤں کے بغیر اور چاند پاشے حیدرآباد کے بغیر ادھورے اور نامکمل سے لگتے ہیں۔ چاند پاشا آپ کو حیدرآباد کے کسی بھی محلے میں گھروں کے باہر بنے چبوتروں پر، ہوٹلوں میں، پان کے ڈبّوں پر، گلیوں کے نکڑ پر یا چار مینار کے آس پاس کثیر تعداد میں دکھائی دیں گے۔ بعض چاند پاشاؤں کا اصلی نام (پاسپورٹ اور اسکول سرٹیفکیٹ کے لحاظ سے) کچھ اور ہوتا ہے اور چاند پاشا محض ان کی عرفیت ہوتی ہے جو انہیں گھر والوں کی طرف سے بطور لاڈ پیار عطا کی جاتی ہے تو اکثر چاند پاشاؤں کا اصلی نام چاند پاشا ہی ہوا کرتا ہے جو یا تو ان کے خاندان کے کسی مرحوم بڑے بزرگ کی یاد کو باقی رکھنے کے لیے رکھا جاتا ہے یا اُن کی ظاہری خوب صورتی اور رنگ و روپ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے دیا جاتا ہے (یہ اور بات ہے کہ ان میں بہت سے چاند رنگ و روپ میں کولتار سے بھی حسین نظر آتے ہیں)۔ ماں باپ اپنی اولاد کو دنیا کی سب سے خوبصورت اور حسین مخلوق سمجھتے ہیں اور اسی لئے وہ انہیں (بلالحاظ جنس) چاند سے تشبیہ دیتے ہیں حالاں کہ امریکہ نے چاند سر کرنے کی مہم کے بعد ساری دنیا کو اس کی حقیقت سے آگاہ کردیا ہے کہ وہاں صرف ٹیلے، پہاڑ اور گرد کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے مگر لوگوں نے اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا اور وہ چاند کو خوبصورتی کا روشن مینار ہی تصور کیا کرتے ہیں۔ اب اگر چاند پاشاؤں کا بطور خاص معائنہ کیا جائے تو اکثر چاند پاشا صاحبان اسم بامسمیٰ (چاند کی اصلی حقیقت سامنے آنے کے بعد) نظر آتے ہیں۔ چاند پاشاؤں کے نام اُن کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ضروری ترمیم کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ جھولے اور پالنے میں وہ چندا کا ٹکڑا ہوتے ہیں اور جب ذرا بڑے ہوتے ہیں تو چاند، چاند بیٹا یا چاند بٹیا کہلاتے ہیں پھر وہ آہستہ آہستہ چاند میاں، چاند بانو، چاند بی یا چاند پاشا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی کے بعد چاند بھائی، چاند آپا یا چندو بھیا پکارے جاتے ہیں اور جب وہ خاصے عمر والے ہو جاتے ہیں تو چاند انکل، چاند خالو، چاند خالا، یا چاند ماموں بن جاتے ہیں اور پھر اپنی پوری آب و تاب دکھا کر غروب ہو جاتے ہیں۔ ہمارے محلے میں ایک چاند پاشا رہتے تھے۔ جن کی کرانہ شاپ تھی جس کا نام تھا چاند کرانہ اسٹور۔ ان کی شادی ہوئی تو شومئ قسمت کہ ان کی بیوی کا نام چاند بی نکلا۔ چاند پاشا بڑے خوش ہوئے اور جب ان کے ہاں پہلی لڑکی تولد ہوئی تو انہوں نے اس کا نام قمر النساء رکھا۔ دوسرے سال ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو اسے مہتاب خاں نام دیا گیا۔ اسی طرح تیسرے سال پیدا ہونے والے لڑکے کو ہلال بلایا گیا۔ اب وہ چوتھے مہمان کی آمد سے پریشان ہیں کہ اسے چاند فیملی کا کون سا نام دیں۔ ایک اور چاند پاشا سے ہم واقف ہیں جن کے خاندان میں سب کے سب پاشا ہیں جہاں اُن کے والد صاحب کا نام خواجہ پاشا ہے تو وہیں ان کی بیوی کا نام بی پاشا ہے اور بچوں کے نام جہانگیر پاشا، اکبر پاشا اور محبوب پاشا ہیں اور پاشاؤں کی یہ فیملی اتنی امیر کبیر ہے کہ روزانہ سخت محنت مزدوری کرنے کے بعد بھی وہ پیٹ بھر کھانا نہیں کھا سکتے۔

کچھ عرصہ قبل ہمارے گھر بچوں کے عقیقہ اور تسمیہ خوانی کے سلسلے میں ایک تقریب تھی اور ہمیں اس سلسلے میں پکوان کے لیے ایک اچھے باورچی کی تلاش تھی۔ ایک دوست نے ایک چاند پاشا نامی باورچی کا پتہ بتایا اور ہم ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تو دیکھا کہ تقریباً ایک ہی وضع کے چند مکانات گلی کے سرے پر واقع ہیں ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اُن چار پانچ گھروں میں کون سا گھر چاند پاشا باورچی کا ہے۔ چنانچہ ایک اندازہ قائم کر کے ہم نے ایک گھر کے آگے آواز دی "چاند پاشا... چاند پاشا صاحب!" تو کچھ دیر بعد

تین مکانوں سے تین عدد چاند پاشا برآمد ہوئے اور ہم کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ہم نے اُن میں سے ایک چاند پاشا کو مخاطب کر کے استفسار کیا" کیا آپ ہی چاند پاشا باورچی ہیں؟" تو وہ بولے" نہیں، چاند پاشا استاد تو وہاں رہتے ہیں" یہ کہہ کر اس نے چوتھے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کو بڑا تعجب ہوا کہ یہاں تین چاند پاشاؤں کے بعد بھی ایک چاند پاشا اور موجود ہیں جن کی ہمیں تلاش تھی۔ ہم نے قدرے اشتیاق سے پوچھا" آپ کی تعریف؟" تو وہ قدرے جھینپ کر بولے" میں ذرا یونہی سا چاند پاشا ہوں اور عرصہ سے بے روزگار ہوں" ہم نے باقی چاند پاشاؤں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا" یہ کس قسم کے چاند پاشا ہیں تو ایک صاحب قدرے مسکرا کر بولے بندے کو بکر خصاب چاند پاشا کہتے ہیں" پھر دوسرے شخص کی طرف اشارہ کر کے بولے" یہ چاند پولٹری شاپ کے مالک چاند پاشا ہیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی تقریب ہے تو ہم دونوں بھی حاضر ہیں تقریب میں گوشت اور چکن سپلائی کرنے کے لئے۔" ہم نے ان چاند پاشاؤں کا شکریہ ادا کیا اور مطلوبہ چاند پاشا کے گھر کی طرف بڑھے۔ داخلی دروازے کی طرف پہنچے تو دیکھا کہ سامنے کے حصے میں خاصہ بڑا چبوترہ بنا ہوا ہے۔ گھر کے سامنے کا حصہ سیمنٹ کی چھت کا بنا ہوا ہے نظر آیا جس کے پیچھے سارا گھر کھپریل سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے کے حصہ میں عین باب الداخلہ کے اوپر ایک بانس پر ہرے رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے سرے پر ٹین کا بنا ایک ہلال نما چاند اور تارہ فٹ تھے دروازے کے دائیں بازو لکھا تھا" ہم سے ہر تقریب اور ہر قسم کے پکوان کے سلسلے میں ملئے بہ چھلّہ چھٹی، بسم اللہ، شادی بیاہ اور چہلم کے لذیذ کھانوں کے ماہر" استاد چاند پاشا" شاہی باورچی۔ تحریر کے نیچے ایک بڑی دیگ کی تصویر بنی تھی جس کے بازو استاد کی تصویر (خاصے بگڑے انداز میں) پینٹ کی ہوئی تھی جس میں استاد لنگی بنیان میں ملبوس سر پر کروشیا کی ٹوپی اوڑھے اور ہاتھ میں کفگیر پکڑے نظر آرہے تھے۔ چہرے پر بلاوجہ کی مسکراہٹ چسپاں تھی دروازے کے دوسری جانب ذرا دوری پر ایک چورن بنانے والی کمپنی کا بوسیدہ پوسٹر چسپاں تھا جس پر چورن کی تعریف میں لکھا تھا" بد ہضمی، کھٹی ڈکاریں اور پیٹ کے درد میں آرام دیتا ہے۔" چبوترہ خاصا اونچا تھا جس کے ایک کونے میں بوریا بچھا ہوا تھا۔ غالباً استاد موسم گرما کی شامیں اُسی بوریے پر گذارتے ہوں گے کیونکہ بوریے پر دیوار سے لگا ایک میلا اُچٹ گاؤ تکیہ بھی نظر آیا جس پر دو چھوٹی عمر کے لڑکے اپنے پیدائشی لباس میں ملبوس مست چڑھے آپس میں لڑ رہے تھے۔ استاد نے انہیں ڈانٹ پلائی اور گھر کے اندر جانے کا اشارہ کیا اور داخلی دروازہ کھول کر دونوں کو گھر کے اندر دھکیلا دروازہ سے ایک مریل سا کتا برآمد ہوا اور کھوں کھوں کی آواز نکال کر عین استاد کی تصویر کے نیچے اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ استاد نے ایک پارلیمانی قسم کی مروجہ گالی دے کر اسے بھگایا اور ہمیں رُکنے کا اشارہ کر کے گھر کے اندر داخل ہوگئے اور کچھ دیر بعد ہاتھ میں ایک شولاپور مار کہ بیڈ شیٹ لیے برآمد ہوئے۔ پھر بوریے کو اسی بیڈ شیٹ سے جھاڑ کر بیڈ شیٹ بوریے پر بچھائی اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیڈ شیٹ کسی لپسا ہوئے سپاہی کا زربکتر لگتی تھی جو کناروں سے تارتار تھی اور اس میں سے ایک ناگوار سی بدبو آتی تھی۔ ہم نے کھڑے کھڑے ہی ان سے پکوان کا معاملہ طے کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اتنے میں ایک دبلا پتلا اور لاغر سا لڑکا ایک بڑی رکابی میں دو چائے کی پیالیاں اور سموسے رکھ کر لایا اور ہماری تواضع کرنے لگا ہم نے از راہ مروت ایک سموسہ اٹھایا اور ساتھ ہی چائے کی پیالی بھی لی جس سے خوش بو کے بجائے کچے اُپلے اور دھوئیں کی بو آرہی تھی۔ استاد چاند پاشا سے پکوان کی اُجرت وغیرہ طے کر کے ہم گھر واپس ہوئے تا کہ تقریب کے دوسرے انتظامات کو قطعیت دی جاسکے۔

تقریب کے دن جب بکروں کو ذبح کرنے کا وقت آیا تو ہم سے کہا گیا کہ بہ حیثیت سربراہ خاندان بکروں کے گلوں پر چھری پھیریں۔ ہم کسی بھی بکرے کی گردن کے گوشت، زبان اور نرخرے کا سالن تو بڑے مزے لے لے کر کھاسکتے ہیں لیکن اس کے گلے پر چھری پھیرنا ہمارے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ امریکی قید سے صدام حسین کی رہائی اور پھر اس میں اس بات کا بھی احتمال تھا کہ بہ وقتِ ذبح اگر ہمارے ہاتھ کانپ جاتے اور بکروں کو تڑپتا دیکھ کر ڈر کے مارے ہم تھر تھر کانپنے لگتے تو اس طرح نہ صرف افراد خاندان کے سامنے شرمندہ ہونے کا خدشہ تھا بلکہ ذبح ہونے والے بکرے کے سامنے بھی ہماری مردانگی پر حرف آتا اس لیے ہم نے حیلے بہانے کر کے اس کام سے نجات حاصل کر لی۔ لیکن بکروں کو تو بہر صورت ذبح ہونا تھا ان کی ماں کب تک خیر مناتی۔ اگر ہم گجرات میں ہوتے تو ذبح کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا کیونکہ وہاں بکرے تو بکرے انسانوں کو بھی انتہائی بے رحمی اور صفائی سے ذبح کرنے والے قصائی آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ بہر حال ہم فنکشن ہال سے باہر نکلے کہ کسی مناسب گلے کاٹنے والے کو پکڑ سکیں تو یکا یک ہی ہماری نظر محلے کی ایک مشہور و معروف شخصیت چاند بھائی پر جا پڑی اور ہمیں اپنی تقریب میں چار چاند لگتے نظر آنے لگے۔ چاند بھائی کا نام تو ویسے کچھ اور ہے لیکن وہ چاند بھائی کے نام سے اتنے زبانِ زد عام و خاص ہیں کہ ان کے والدین بھی انہیں چاند بھائی کہہ کر ہی بلاتے ہیں اور تو اور اکثر مرتبہ ان کی بیوی بھی انہیں غلطی سے چاند بھائی سے مخاطب کر جاتی ہے۔ ہم نے چاند بھائی کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا تو بولے" مجھے گلے کاٹنے کا ویسے تو کوئی خاص تجربہ نہیں ہے البتہ اس ضمن میں کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔" ہم خوشی خوشی انہیں فنکشن ہال میں لے آئے اور تین عدد تنومند بکروں سے اُن کا تعارف کروایا۔ بکرے دم اور دم

سادھے چپ چاپ اپنی آنے والی موت کے خوف سے گھبرائے بے دلی سے جگال کررہے تھے چاند بھائی کو دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے کیونکہ چاند بھائی لنگی اور صدری میں ملبوس تھے اور اُن کے ایک ہاتھ میں وہ بڑا سا چھرا چمک رہا تھا جو ہم نے ابھی ابھی انہیں تھمایا تھا اور جس سے ہمارے گھر والے اکثر ناریل توڑنے کا کام لیا کرتے تھے۔ چاند بھائی نے کپکپاتے ہاتھوں سے اس کی دھار دیکھی اور قدرے مطمئن ہو کر پہلے بکرے کے قریب پہنچے۔ بچوں نے بکرے کو زمین پر لٹا کر مضبوطی سے اس کی ٹانگیں پکڑیں اب چاند بھائی آگے بڑھے اور بکرے کے گلے پر چھری رکھ دی۔ بکرے نے میں....میں...کی مردہ سی آواز نکالی اور نیم وا آنکھوں سے چاند بھائی کو دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو"اس موقعہ پر پڑھی جانے والی دعا آپ کو یاد ہے بھی یا نہیں؟" چاند بھائی نے بہ مشکل تمام پہلے بکرے کا کام تمام کیا اور پھر لرزتے قدموں سے دوسرے بکرے کی طرف بڑھے ۔دوسرا بکرا پہلے بکرے کا انجام دیکھ کر آدھا مرچکا تھا۔ چاند بھائی نے اس کے نرخرے پر چھرا رکھا لیکن ان کے کپکپاتے ہاتھوں نے چھرے کو آگے پیچھے کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی نے صلاح دی" چاند بھائی آپ صرف مضبوطی سے چھرا پکڑے رہیں ہم بکرے سے التجا کر کے کہ اسے اپنی گردن آگے پیچھے کرنے کو کہیں گے۔" یہ سن کر چاند بھائی کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے پوری قوت سے گلے پر چھرا اچلا دیا۔ پھر تیسرا بکرا بھی جوں توں کر کے ذبح ہوا۔ سب نے خوشی کا نعرہ لگایا" چاند بھائی، زندہ باد۔" اس دن کے بعد سے وہ" چاند بھائی مسلّخی" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اب بکروں کی کھالیں کھینچنے کا وقت آیا تو اس کام کے لیے بلائے گئے ماہر نے کچھ اتنی صفائی سے تینوں بکروں کی کھالیں کھینچ لیں کہ اس پر انکم ٹیکس آفیسر ہونے کا گمان ہونے لگا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اس کا نام چاند پاشا نہیں تھا۔ بکروں کی تینوں کھالیں چاند بھائی مسلّخی کی نذر کی گئیں۔ ہمارے چھوٹے لڑکے نے پوچھا" چاند انکل کیا آپ ان کھالوں کو ان کے سر سمیت اپنے ڈرائینگ روم کی زینت بنائیں گے جیسے شیر کے شکاری کیا کرتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد استاد چاند پاشا یعنی باورچی صاحب مع اپنی رعیت بڑے طمطراق سے فنکشن ہال میں وارد ہوئے اور ایک بڑا سا بوریا بچھا کر اپنے تمام چھوں کو مختلف کاموں پر لگا دیا۔ پھر اُن کے لکھائے ہوئے تمام مسالوں اور اشیا کو انہوں نے ایک ایک کر کے چیک کیا اور ہر ایک آئٹم میں سے تھوڑا تھوڑا حصہ الگ کرنے لگے۔ ہم نے جب استفسار کیا کہ کیا وہ یہ ساری اشیا استعمال نہیں کریں گے تو بولے ان الگ کیے ہوئے مسالوں کا استعمال بعد میں ہوگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ساری اشیا استاد چاند پاشا کے گھر چلی جاتی ہیں۔ استاد کے چھٹے تندہی سے اپنے اپنے کام میں جٹ گئے۔ کوئی مسالے پیسنے لگا تو کوئی گوشت اور مرغ کی صفائی کرنے لگا۔ کوئی ترکاری کاٹ چھانٹ کرنے لگا تو کوئی چاول کی تیاری میں لگ گیا۔ اس دوران استاد چاند پاشا چھٹے زردے کا پان منہ میں دبائے اور مٹھی کی آخری دو انگلیوں کے بیچ جکڑے کوئی ثقیل قسم کے سگریٹ کے فرحت بخش کشوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ٹہلتے رہے۔ جوں توں کر کے جب سارا پکوان ختم ہوا اور بریانی کی دیگ کے کھلنے کا وقت آیا تو استاد چاند پاشا اچانک ہی کہیں غائب ہو گئے۔ ہم نے اُن کے ایک چھٹے سے ان کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا" استاد ہمیشہ ایسے موقعوں پر غائب ہو جاتے ہیں۔ مبادا کہ کہیں کھانا خراب نہ ہو جائے اور صاحب تقریب ان کا گریباں پکڑ لے۔ چنانچہ جب ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ کھانا اچھا پکا ہے تو موبائیل فون سے انہیں اس کی اطلاع کرتے ہیں اور استاد اچانک ہی خوش خوش واپس چلے آتے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس پکوان اچھا ہی ہوا تھا اس لئے کچھ ہی دیر بعد چاند پاشا مسکراتے ہوئے دیگوں کے پاس پھر سے دکھائی دیئے۔ کھانے کا دور شروع ہو چکا تھا اور مہمان کھانے میں مشغول تھے اور بریانی و دوسرے لوازمات کی سپلائی خاطر خواہ طریقے سے جاری تھی کہ اچانک ہی ہمارے ایک دوست نے ہمیں یہ تشویش ناک اطلاع دی کہ پکوان کی جگہ جو دروازہ باہر سڑک پر کھلتا ہے وہاں کے کمپاؤنڈ کی چھوٹی سی دیوار کے اوپر سے کئی توشہ دان کھانا بھر بھر کر باہر جارہے ہیں۔ ہم بھاگے بھاگے اُدھر گئے تو دیکھا کہ استاد کا ایک چھٹا دو توشہ دانوں کو دیوار پر رکھ رہا ہے ہم نے فوری رنگے ہاتھوں اسے پکڑ لیا اور سختی سے اس پر جرح کی تو وہ ڈرتے ڈرتے بولا" ہم لوگ اسی طرح توشہ دان بھر بھر کر باہر گاہکوں کو سپلائی کرتے ہیں اور ہر توشہ دان کے عوض 300 روپے حاصل ہوا کرتے ہیں"۔ ہم نے سخت غصہ کے عالم میں پوچھا توشہ دان کس کو سپلائی کیے جاتے ہیں تو وہ بولا" یہ تو مجھے نہیں معلوم البتہ کچھ لوگ نئے شہر سے اپنی کاروں میں آیا کرتے ہیں اور اپنے ساتھ توشہ دان لا کر اُستاد سے کھانا خرید لے جاتے ہیں۔" قبل اس کے کہ ہم استاد چاند پاشا سے اس سلسلے میں باز پرس کرتے استاد فنکشن ہال سے رفو چکر ہو چکے تھے۔ اس طرح فنکشن ہالوں کی افادیت کا ایک روشن پہلو ہمارے سامنے آ گیا۔ اُس دن کے بعد ہم نے نہ تو کوئی فنکشن ہال میں تقریب رکھی اور نہ ہی استاد چاند پاشا کو زحمت پکوان دی

چلتے چلتے آپ کو ایک راز کی بات بتادیں کہ ہم بھی اپنی پیدائش کے بعد کچھ عرصہ تک چاند پاشا کہلائے گئے ہیں۔ ہماری نانی صاحبہ ہمیں چاند پاشا کہہ کر ہی بلاتی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تک تو ہم چاند پاشا رہے پھر جیسے جیسے اپنی عمر کی منزلیں طے کر کے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگے ہماری جسمانی ساخت اور چہرہ مہرہ چاند کی روایتی خوب صورتی کا منہ چڑانے لگا اور ہم نے لوگوں کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ ہمیں چاند پاشا پکار کر چاند کا مذاق نہ اُڑائیں۔ OO

(شگوفہ، حیدرآباد)

بھولنے کی بیماری

نصرت ظہیر

ہمارے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ یادداشت بہت خراب پائی ہے۔ عوام جو ہیں نا! حضرت کارل مارکس نے کہا تھا کہ عوام کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ اگر وہ ہمیں دیکھ لیتے تو کہتے، بہت کمزور ہوتی ہے۔ ہم تو جو صبح کو سوچتے ہیں وہ دوپہر تک بھول جاتے ہیں۔ دوپہر کو جو سوچتے ہیں وہ شام تک ذہن سے نکل جاتا ہے۔ اور شام کو... معاف کیجیے ہم شام کو کچھ نہیں سوچتے!

خود سے زیادہ بھلکڑ ابھی تک ہمیں صرف ایک صاحب ملے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ محض یادداشت کی خرابی کی وجہ سے ان کے کھانے پینے کا معمول گزشتہ چالیس برس سے بگڑا ہوا ہے۔ لنچ کے وقت ڈنر کھاتے آرہے ہیں اور ڈنر کے وقت لنچ۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے، پچھلے چالیس سال سے دوپہر کے وقت پچھلی رات کا اور رات کو پچھلی دوپہر کا کھانا کھا رہا ہوں۔

ہم تب بھی نہیں سمجھے۔ پوچھا، کیا آپ کے یہاں تازہ کھانا نہیں پکتا، اور کیا ہمیشہ ریفریجریٹر میں رکھا ہوا ہی کھانا کھاتے ہیں؟

فرمایا، یہ بات نہیں بھائی صاحب۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کھانا تو تازہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ہوتا ہے دراصل گزرے ہوئے وقت کا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ کو پورا قصہ سننا پڑے گا کہ کس طرح ایک معمولی سی غلطی نے میری زندگی کا پورا حساب گڑبڑ کر دیا۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔

ہم بھی فرصت سے تھے۔ ہمہ تن گوش ہو گئے۔

موصوف سرد آہ بھر کر بولے، ''آپ کہتے ہیں تو سناتا ہوں۔ مگر سننے سے پہلے یہ سن لیجیے کہ شاعر کیا خوب کہہ گیا ہے:

دکھ بھری ہے یہ داستاں چچ چچ

سن کے بجنے لگیں گے کاں چچ چچ

کہہ اٹھے گی زمین بھی اف اف

جب کرے گا یہ آسماں چچ چچ

دکھ بھری ہے یہ داستاں چچ چچ

صاحبو! چالیس سال پہلے کی ایک منحوس صبح کا ذکر ہے۔ درختوں پر طیور یادِ خدا میں مصروف تھے۔ قمریاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ تیتر سبحان تیری قدرت کی رٹ لگا رہے تھے۔ مرغیاں حق ہو حق ہو کی صدائیں بلند کرتی پھر رہی تھیں۔ مینڈک یا غفور کی گردان کر رہے تھے۔ اور میں کم بخت نا ہنجار اسی درخت کے نیچے لیٹا، ٹرانزسٹر پر ودودھ بھارتی سے پرانے فلمی گانے سن رہا تھا۔ استغفر اللہ! یہ دیکھ کر قدرت کو دفعتاً جوش آ گیا۔ یک بیک درخت ہلنے لگا اور غیب سے ایک صدا آئی۔ ابے او نا معقول، یہ کیا حرکت ہے؟ بیٹری کیوں نہیں بدلتا اس منحوس ریڈیو کی۔ دو ماہ سے وہی پرانے سیل رگڑے جاتا ہے۔

آواز کچھ کانوں سنی تھی۔ چنانچہ میں تڑپ کر اٹھا اور پلٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والد صاحب کھڑے غصے سے کانپ رہے ہیں۔ یعنی، عرض کیا ہے:

میں غیب داں جسے سمجھا تھا عیب داں نکلا

یہ دیکھ کر میں نے انہیں آداب کیا اور کورنش بجا لایا۔ مگر ان کا غصے سے کانپنا بند نہ ہوا۔ تب میں نے کچھ اور کورنش بجائی اور تب تک بجاتا رہا جب تک ان کا غصہ تو سا درو کافور نہیں ہو گیا۔

آخر کار بزرگوار مسکرائے اور جیب سے دس کا نوٹ نکال کر بولے۔ جا، بازار سے چاروں نئے سیل ڈلوا کے آ اور باقی روپے مجھے لا کر دے۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر سہگل کے گانے سنیں گے جو آدھے گھنٹے بعد آنے والے ہیں!

سزا چونکہ یہ سخت تھی اس لئے حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے انہیں بتایا کہ اے پدرِ من، سہگل کے گانے تو میں اس ریڈیو پر ہر وقت سنوا سکتا ہوں۔

والد نے پوچھا اے پسرِ عزیز یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سیل کمزور ہونے کی وجہ سے ٹرانزسٹر کی آواز بھرّانے لگی ہے چنانچہ گانا اگر لتا منگیشکر کا بھی ہو تو محسوس ہوتا ہے سہگل صاحب نغمہ سرا ہیں۔ یہ سنتے ہی والدِ محترم کا غصہ پھر بیدار ہونے لگا اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کانپنے کی حد میں داخل ہوتے میں نے کھسک لینے میں عافیت جانی۔

وہ دس کا نوٹ ہاتھ میں دبا کر میں نے بازار کا رخ کیا۔ چار کی بجائے دو سیل بدلوائے اور جو رقم باقی بچی اس سے فلم چودھویں کا چاند دیکھ کر شام کو گھر آگیا۔ والد صاحب کا غصے سے برا حال تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً آداب بجا کر کورنش بجائی اور مزید احتیاط کے طور پر ریڈیو بھی بجا دیا۔ اتفاق دیکھئے کہ ریڈیو پر اس وقت بھی کے ایل سہگل کا مشہور گیت آرہا تھا، جس میں چار کہار، سسرال اور بابل و نینوا کی نہر وغیرہ کا ذکر تھا۔ ادھر میں تو یہ سوچ کر حیران تھا کہ ایک شخص مرد ہو کر بھی بوقتِ نکاح اپنے والدین سے اس قدر اظہارِ افسوس کیوں کر رہا ہے، ادھر والدِ محترم بڑے جذباتی انداز میں سر ہلا ہلا کر ایسے جھوم رہے تھے کہ مجھ پر غصے ہونا تو کیا باقی رقم واپس لینا بھی یاد نہ رہا۔ مگر تبھی احقر کو... یعنی مجھے یاد آیا کہ میں تو فلم کے چکر میں دوپہر کا کھانا ہی بھول گیا ہوں۔ جیسے ہی یہ بات یاد آئی، یک لخت بھوک سے میرا برا حال ہو گیا۔ باورچی خانے سے مرغ بھوننے اور مچھلی تلے جانے کی قیامت خیز خوشبو آرہی تھی جس سے میں مرغِ بسمل اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ میری یہ حالت دیکھ کر گھر والے قطعی نہیں گھبرائے کیوں کہ ایسا میں بارہا کرتا رہتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے آناً فاناً دسترخوان بچھایا اور جو کچھ گھر میں پکایا ادھ پکا موجود تھا مختلف قابوں میں سجا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور جب کھا چکا تو احتیاطاً کچھ اور کھا لیا! عین اس وقت جب میں دسترخوان سے اٹھ کر ہاتھ دھو رہا تھا پیچھے سے والد کا قہقہہ استہزائیہ سنائی دیا۔ وہ کہہ رہے تھے... آج تم نے ڈنر کے وقت لنچ کھایا ہے، اب اس کی سزا زندگی بھر بھگتو گے۔

اس وقت تو میں دس گیارہ سال کا بچہ تھا چنانچہ ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ مگر بزرگوں کا کہا آگے آتا ہے۔ اگلے روز میں لنچ پر جب انواع و اقسام کے چرند اور پرند نوش فرما رہا تھا تو دفعتاً والدِ بزرگوار کی بات یاد آگئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ جو میں لنچ کھا رہا ہوں تو یہ دراصل کل رات کا ڈنر ہے، جس کی جگہ میں نے کل دوپہر کا کھانا کھایا تھا! بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں لنچ کے وقت پر پچھلا ڈنر اور ڈنر کے وقت پچھلا لنچ کھا رہا ہوں۔ نہ لنچ پر لنچ کر سکتا ہوں نہ ڈنر پر ڈنر! میرے شب و روز بدل کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ سب اس لئے کہ میں ایک دن... صرف ایک دن، ایک وقت کا کھانا بھول گیا تھا۔ آہ میں!"

یہ کہہ کر وہ صاحب کھلکھلا کر رو پڑے اور سننے والے زار و قطار ہنسنے لگے۔

ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ جناب آپ بس ایک وقت، صرف ایک وقت، پورے دو وقت کا کھانا ایک ساتھ کھا لیجئے آپ کے شب و روز فوراً سیدھے ہو جائیں گے۔ یہ سنتے ہی ان کی آنکھیں حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس سے چمکنے لگیں اور 'یاہو' کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ ایک زور کی چھلانگ لگا کر وہ ہمارے قدموں میں گر گئے جب کہ ہم ڈر کے مارے اچھل کر پہلے ہی پیچھے گر چکے تھے۔ انہوں نے عقیدت سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ واللہ آپ جیسے پہونچے ہوئے بزرگ باراں دیدہ سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو اب تک میں نہ جانے کب کا اس خفقان سے نجات پا چکا ہوتا۔

آخر ہم نے انہیں اس تنبیہ کے ساتھ رخصت کر کے اپنی جان چھڑائی کہ دو وقت کا کھانا صرف ایک بار ہی کھانا، بار بار کھا کر اس کی عادت اختیار مت کر لینا ورنہ جلد ہی تم آنے والے وقتوں کے ڈنر اور لنچ قبل از وقت کھا کر اپنی عمرِ طبیعی اور مرگِ حقیقی سے عہدہ برا ہو چکے ہو گے۔

ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے۔ یہ لیجئے اپنی ہی بات بھول گئے۔ ٹھیک ہے یاد آگیا۔ دراصل ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہمیں بھی بھولنے کی بیماری ہے۔ بات بات پر کچھ نہ کچھ بھول جاتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو ہمیں یہ بھی یاد نہیں آتا کہ کیا بھول گئے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

گھر کے اہم کاغذات، مثلاً ٹیلی فون اور بجلی کے بل، بنک کی رسیدیں، ریڈیو اور ٹی وی کے کنٹریکٹ لیٹر وغیرہ اپنے کمرے میں ہم بھی یہاں وہاں پڑے نہیں چھوڑتے۔ ہر کاغذ کو سنبھال کر کسی محفوظ جگہ پر حفاظت سے رکھ دیتے ہیں، کہ جب ضرورت پڑے گی اس جگہ سے اٹھا لیں گے۔ لیکن بھلا ہو بری یادداشت کا، جس کی وجہ سے ہمارا ہر کاغذ اس درجہ محفوظ ہو جاتا ہے کہ دوسروں کے تو کیا خود ہمارے بھی ہاتھ نہیں آتا۔ ضرورت پڑنے پر ایک دم بھول جاتے ہیں کہ کون سا کاغذ کہاں محفوظ کیا تھا۔ ہزار ڈھونڈنے پر بھی وہ نہیں ملتا۔

اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تب ہم دیکھتے ہیں کہ "غالب کے خطوط" سے "بجلی کا بل برآمد ہو رہا ہے، (جو ان کا نہیں ہمارا ہوتا ہے) ماچس کی ڈبیہ سے بنک کی رسیدیں نکل رہی ہیں، جوتے کے اندر ٹیلی فون کا بل دبکا پڑا ہے۔ اور عید کی ٹوپی میں پرانے موزے نہایت محفوظ حالت میں دھلے دھلائے رکھے ہیں! اور یہ وہی عید کی نماز والی ٹوپی ہوتی ہے، جو ہمیں عید کے سوا ہر روز اپنی محفوظ جگہ رکھی ہوئی دکھائی دیتی رہتی ہے۔ بس عید کے روز اسے پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ ایسے غائب ہو جاتی ہے جیسے خود بھی سلیمانی ٹوپی پہنے ہوئے ہو۔

کئی بار صبح کا اخبار پڑھتے پڑھتے جب ہم اونگھنے لگتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ ابھی ابھی اخبار پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ دوبارہ جاگنے پر جب دوبارہ اخبار پڑھتے ہیں تو یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ دہلی میں اسی جگہ پر

اُسی وقت پھر ایک بم دھماکہ ہو گیا ہے جہاں کل ہوا تھا۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دھماکے سے وہ دو بے قصور راہ گیر پھر زخمی ہو گئے ہیں جو کل زخمی ہوئے تھے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں یہ کیسے بے قصور راہ گیر ہیں جو ہر دھماکے پر زخمی ہونے پہونچ جاتے ہیں۔ خاص طور سے نامعلوم راہ گیروں کی اس بات پر ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے کہ حادثوں کی بو یہ لوگ کیسے سونگھ لیتے ہیں۔ کہیں بھی دیکھ لیجئے۔ حادثہ ابھی ہوا نہیں اور یہ پہلے ہی جائے حادثہ پر موجود ہیں۔ کسی نے بتایا کہ دراصل ان لوگوں کو ایکس گریشیا کھانے کی عادت پڑی ہوئی ہے جس کا اعلان ہر حکومت ہلاک شدگان اور زخمیوں کے ضمن میں کرتی رہتی ہے۔ واقعی صاحب۔ دنیا عجیب لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔

خیر۔ ذکر چل رہا تھا صبح کی اخبار بینی کا۔ یہ بُری خبریں پڑھنے کے بعد جب صفحہ پلٹتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وزیرِ اعلیٰ صاحبہ نے اس اسکول کا دوبارہ سنگِ بنیاد رکھ دیا ہے جس کا کل بھی رکھا تھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شائد محترمہ کی یادداشت بھی ہمارے جیسی ہے چناں چہ بھول سے دوبارہ سنگِ بنیاد رکھ دیا ہوگا، صفحۂ آخر پر پہونچتے ہیں۔ وہاں یہ جاں کاہ اطلاع ملتی ہے کہ پرانی دہلی میں محلہ گشن گنج کی معزز ہستی شیخ خلیل کا نوے برس کی عمر میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے ایک بار پھر انتقال پر ملال ہو گیا ہے۔ تب ہمیں شبہ سا ہونے لگتا ہے کہ یقیناً دال میں کچھ کالا ہے۔ ورنہ ایک ہی آدمی دو مرتبہ داعیِ اجل کو لبیک کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس کے لئے تو داعیِ اجل کو یقینی طور پر بہرا ہونا چاہئے کہ سنتا نہیں ہے بات مکرر کہے بغیر!

بالآخر میز پر رکھا ہوا دودھ کا خالی گلاس دیکھ کر یاد آتا ہے کہ اوہو، یہ تو آج ہی کا اخبار ہے جسے پڑھتے پڑھتے ہم اونگھنے لگے تھے۔ اور آج کی پڑھی ہوئی خبریں پڑھ کر انہیں خواہ مخواہ کل کی پڑھی ہوئی سمجھ رہے تھے۔ سارا قصور ہماری اپنی ہی یادداشت کا نکل آتا ہے۔

یادداشت خراب ہونے کے کئی فائدے اور کئی نقصانات ہیں جن کا ذکر ہم پھر کسی مضمون میں کریں گے۔ بشرطیکہ یاد رہا۔ فی الحال یہ سن لیجئے کہ ایک مرتبہ ہمیں صبح کے اخبار میں کچھ جانی پہچانی خبریں پڑھ کر شبہ ہوا کہ ہو نہ ہو ہم اونگھ چکے ہیں اور تھوڑی دیر پہلے پڑھی ہوئی خبروں کو بھول سے کل کی پڑھی ہوئی خبریں سمجھ رہے ہیں۔ مگر سامنے دیکھا تو دودھ کا گلاس بھرا ہوا رکھا تھا! آخر جب چھان بین کی تو پتہ چلا کہ وہ واقعی کل کی خبریں تھیں۔ بلکہ کچھ تو پرسوں کی بھی تھیں۔ مثلاً کئی کالونیوں میں بجلی نہیں ہے۔ راشن میں گھٹیا چاول پایا گیا۔ لوکل بس سے ٹکرانے پر سائیکل سوار ہلاک۔ فلاں پارٹی کے لیڈر نے اپنے بیان کی تردید کر دی۔ اسمبلی میں ہنگامہ۔ پارلیمنٹ سے واک آؤٹ۔

اس روز ہمیں اندازہ ہوا کہ اکیلے ہماری ہی یادداشت خراب نہیں۔ واقعات اور حالات کو بھی بھولنے کی بیماری ہے اور وہ اکثر بھول سے خود کو دوہراتے رہتے ہیں۔

OO

(مصنف کی عنقریب زیرِ اشاعت کتاب 'گول مول' سے)

پیروڈی

عزیز قیسی

او، دیس سے جانے والے سن!

او، دیس سے جانے والے سن
کس حال میں یارانِ وطن

پہلے تو یہ سن لے گھر تیرا، کس رنگ میں ہے کس حال میں ہے
اب کتنا دودھ ہے پانی میں اور کتنا کالا دال میں ہے
پھر سننا یاروں کی منڈلی کس سُر میں ہے کس تال میں ہے

کیا تجھ کو بتائیں گھر تیرا، اب کس صوبے میں آیا ہے
دالان تو تیرا اپنا ہے، لیکن بڈ روم پرایا ہے
دو صوبوں نے آنگن پہ ترے، کہتے ہیں کہ حق جتلایا ہے

اب سارے نواب اور شہزادے، سوشل ورکر کہلاتے ہیں
جو مرغ لڑایا کرتے تھے، اب مرغے انہیں لڑاتے ہیں
دکھ سہہ کے دیئے تھے جو انڈے، وہ انڈے کوّے کھاتے ہیں

اب تیری گلی کا ہر بالک، اسکول کے باہر رہتا ہے
جیبوں میں پٹاخے ہوتے ہیں، اور ہاتھ میں پتھر رہتا ہے
اولاد کے ہاتھوں کا سایہ، ماں باپ کے سر پر رہتا ہے

اب غم میں نگر کے ڈھلنے کے، ہر ماں چھپ چھپ کے روتی ہے
اب بیٹا بھائی کہلاتا ہے، اور بٹی سسٹر ہوتی ہے
دن اٹھ کر وہسکی پیتا ہے، شب گولی کھا کر سوتی ہے

لیڈر چوروں کے ساجھے میں، ووٹوں کی تجارت کرتے ہیں
ہر روز نئے اک ریزر سے، جنتا کی حجامت کرتے ہیں
زندوں سے ہر اک کو نفرت ہے، مردوں سے محبت کرتے ہیں

کچھ لوگ یہاں بازاروں سے، داماد خرید کے لاتے ہیں
اور ان کو ریپئرنگ کی خاطر، لندن وندن بھجواتے ہیں
اکثر بے چارے بٹی کو، اب تک زندہ دفناتے ہیں

او، دیس سے جانے والے سن
اس حال میں ہیں یارانِ وطن!

دسمبر 1970

(شگوفہ کے 25 سالہ شعری انتخاب مطبوعہ اپریل 1994 سے)

شوکت جمال

کہہ رہے ہو

مجھے محبت میں جان دینے کو کہہ رہے ہو
یہ کیا مرے مہربان دینے کو کہہ رہے ہو

رقیب جس دل میں ایک عرصے سے رہ رہا ہے
اُسی میں مجھ کو مکان دینے کو کہہ رہے ہو

جو گھونٹ پی کر لڑھک گیا ہے اسے ہی ساقی
تم اپنی ساری دکان دینے کو کہہ رہے ہو!

یہ حال کس نے کیا تمہارا، بتاؤ مرغو
کہ مرغیوں سے اذان دینے کو کہہ رہے ہو

ہے عید قرباں یہ کیا پڑوسن سے تم کو مطلب
اُسے جو بکرے کی ران دینے کو کہہ رہے ہو

کبھی نبھائی نہیں ہیں تم نے وفا کی قسمیں
مجھے مگر تم زبان دینے کو کہہ رہے ہو

ہمہ تن گوشت

مری جانب ہی کیوں خونخوار نظریں ہیں تری ظالم
اکیلا میں نہیں کہتا ترے سب دوست کہتے ہیں

کبھی وہ دن تھے ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی کمر تیری
اور اب یہ حال ہے تجھ کو 'ہمہ تن گوشت' کہتے ہیں

بھوک ہڑتال

ہر طرف ہڑتالیوں کے دم سے رونق تھی مگر
دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال خالی ہو گئے

اس طرح برسی ہیں ان پر لاٹھیاں اور گولیاں
سارے ہڑتالی بچارے ہسپتالی ہو گئے

آلونامہ

کریں کیا ذکر آلو کا یہ کتنے کام آتا ہے
اسے ہر شخص دنیا میں بڑی رغبت سے کھاتا ہے

ہیں آلو چپس دیکھو کس قدر مرغوب بچوں کو
کہ صبح و شام ہوتے ہیں یہی مطلوب بچوں کو

یہ مستورات کا جو آئے دن بازار جانا ہے
تو نیت یہ بھی ہوتی ہے کہ آلو چاٹ کھانا ہے

نوابی ناشتے کا جب کبھی چسکا ضروری ہو
چنے آلو کی کھٹی سی ہو بھاجی، اور پوری ہو

کوئی خاتون آلو کو جو چھوٹے گوشت میں ڈالیں
ٹپک جاتی ہیں خوشبو سے ہماری آپ کی رالیں

میسّر ہوں اسے کٹلس آلو کے اگر یارو
تو سمجھے خود کو مس نیری، جو ہو دیو داس کی پارو

عجوبہ ہے کہ آلو اور قیمہ یوں بھی پکتا ہے
کبھی قیمے میں آلو ہے کبھی آلو میں قیمہ ہے

پکی ہو گھر میں گر کھچڑی بہاری طرز کی، پتلی
نہ ہو آلو کا بھرتہ تو ہے باورچی کی کم عقلی

اگر افرنگیوں کے ہاں پٹاٹو چپس ہے فش ہے
ہمارے ہاں بھی آلو اور مچھلی کی کری ڈش ہے

یہی بھرتہ اگر آٹے کی لوئی میں رکھا جائے
پراٹھا لاجواب اس کا بنے، چھوٹا بڑا کھائے

ہو سادہ ہی پراٹھا یا اگر نازک چپاتی ہے
تو پھر کیا چٹپٹی آلو کی بھجیا گل کھلاتی ہے

پکے جب ساتھ بینگن کے تو آلو کیا مزا دے ہے
جو گوبھی کی ہیں دو قسمیں، یہ دونوں کو جلا دے ہے

جو ساتھ اس کے مٹر گاجر ہو اور کوئی پھلی بھی ہو
تو ہانڈی پھر کہاں، جو خوش نما بھی ہو بھلی بھی ہو

کسی دن گھر میں بنتے ہیں اگر قسمت سے دم آلو
تو پھر خوابوں میں آتے ہیں کئی شب دم بدم آلو

کچوری میں بھی آلو ہے، پکوڑے میں بھی آلو ہے
سموسے کو اگر کھولو، گھوڑے میں بھی آلو ہے

اگر کھالو کسی دن تم ذرا سی کھیر آلو کی
تمہارے دل پہ چھپ جائے میاں تصویر آلو کی

مسالے دار بریانی کا آلو جزوِ لاینفک
کسی بی بی سے بھی پوچھو کہے گی ہاں بدیں چہ شک

میاں آلو بچارے یوں تو گورے ہیں نکالے ہیں
کشش لیکن غضب کی ہے، کبھی تو ترنوالے ہیں

اثر آلو پہ موسم کے تغیر کا نہیں پڑتا
پڑا رہتا ہے عرصے تک، مگر پھر بھی نہیں سڑتا

کئی گُن ہیں اس آلو میں اسے سب پیار کرتے ہیں
کبھی تو سبزیوں کا ہم اسے سردار کہتے ہیں

فرید انجم

عشق میں...

عشق میں چت ہوئے سب یہاں
سورماں ، پہلواں ، شیر خاں
پی کے گرنے کے ہیں یہ مقام
کنڈیاں ، موریاں، نالیاں
لیڈری کا یہ انعام ہے
گاڑیاں ، کوٹھیاں ، کرسیاں
مفلسی ڈھونڈتی رہ گئی
روٹیاں ، دھوتیاں ، گرسیاں
اُن کی معصوم فرمائشیں
چوڑیاں ، دستیاں ، بالیاں
ویری سمپل ہے مرشد کا فوڈ
مچھلیاں ، مرغیاں ، بکریاں
وصل کی شب کا حاصل یہ ہے
جھڑکیاں ، دھمکیاں ، گالیاں
پھر سے بیگم لگیں چاٹنے
چٹنیاں ، کیریاں ، املیاں
کچھ بھی انجم سلامت نہیں
ہڈیاں ، بوٹیاں ، پسلیاں

سوچ رؤں

اپنا اب فیوچر بناتا سوچ رؤں
شہر میں رکشا چلاتا سوچ رؤں
عید جاکو عید پھر سے آ گئی
اب کے کیسا بھی نہاتا سوچ رؤں
منہ زبانی بول رئیں دیدو خلع
بانڈ پیپر پو لکھاتا سوچ رؤں
اس قدر گستاخ بیوی ہوگئی
اسے کے فنی سکس لاتا سوچ رؤں
کیا بگاڑ لیتی مرا اُن دیکھوں
آج کھاتا نئیں پکاتا سوچ رؤں
پیٹ کر بیٹھا ہے سسرا ساس کو
شیر کو پھولاں پناتا سوچ رؤں
بڑھ گیا ہے کام بیگم آپ کا
آپ کو سوکن دلاتا سوچ رؤں
میں فری ڈم فائٹر کہلاؤں گا
چوری کر کے جیل جاتا سوچ رؤں
دھمکی؟ چوہیاں چیں کو پی جاؤں گی
آج ہی چوہیاں دلاتا سوچ رؤں
وہ کلب جانے کی انجم دھن میں ہے
گھر کے سب ائے چھپاتا سوچ رؤں

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سنجیدہ شاعر

ناز غمزہ حیا ادا کیا ہے
کیا بتائیں غزل میں کیا کیا ہے

شعر پورا ابھی پڑھا ہی نہیں
صرف مصرع پہ واہ وا کیا ہے

جدید شاعر

مجھ کو کانوں سے سوچتا کیا ہے
ناک سے دیکھ سونگھتا کیا ہے
مرغ کی چونچ میں ہے کمپیوٹر
خود ہی دے بانگ اونگھتا کیا ہے

آزاد شاعر

یہ ردیف اور قافیہ کیا ہے
میری گردن پہ یہ چھرا کیا ہے
میں ہوں آزاد مجھ کو کیا معلوم
مدعی کیا ہے مدعا کیا ہے

کنوارا

مجھ کو حسرت سے دیکھتا کیا ہے
ہوں کنوارا تو یہ برا کیا ہے
تو نے شادی کی دی دعا مجھ کو
یہ دعا ہے تو بد دعا کیا ہے

ڈاکٹر

قبض کیا شئے ہے ہاضمہ کیا ہے
گھر سے مرقد کا فاصلہ کیا ہے
اُلٹے سیدھے سوال مت کرنا
میں کیا جانوں نمونیہ کیا ہے

دو سال سے کینسر میں مبتلا فرید انجم کا 21 اگست 2006 کو انتقال ہوگیا۔ آبائی وطن عادل آباد میں دفنائے گئے۔ خالص مزاح کے شاعر تھے۔ حیدرآباد کی ملی جلی دکنی زبان میں شعر کہنے کا خاص ملکہ تھا اور مشاعروں میں منفرد انداز سے کلام سناتے تھے۔ انجمن زندہ دلان حیدرآباد سے ابتدا سے جڑے ہوئے تھے۔ اردو طنز و مزاح کی پوری برادری ان کے غم میں سوگوار ہے۔

فلم

لگے رہو... باپو

مقبول احمد سراج (بنگلور) عارف وقار (لاہور)

کتنا حیران کن ہے یہ! کوئی کمرشیل فلم... وہ بھی ٹھیٹھ بمبیا کامیڈی فلم... معاشرے میں اتنا روشن ذہنی انقلاب لاسکتی ہے! بیسویں صدی، لگتا تھا کہ جاتے جاتے اپنی سب سے بڑی ہستی کو بھی تاریخ کے نہاں خانوں میں ساتھ لے گئی ہے۔ وہ 'ننگا فقیر' جسے ایک ونسٹن چرچل کو چھوڑ کر باقی تمام دنیا باپو اور مہاتما کے نام سے پکارتی تھی، لگتا تھا صدیوں کا مر چکا ہے۔ لیکن 'لگے رہو منا بھائی' نے جیسے جادوگر کی چھڑی کی طرح لہرا کر گوشت پوست کے اس وجود کو آج کی ضرورت، آج کا نظریہ اور آج کا انسان بنا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ وہ کام جو آٹھ آسکر پانے والی سر رچرڈ ایٹن برا کی 'گاندھی' بھی نہیں کر پائی تھی! 'منا بھائی' ترسیل، تاثیر اور تعلیق کے کئی سبق سکھا رہی ہے، جنہیں سمجھنا شائد ادب کے تخلیق کاروں کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کے لئے۔ یہاں ہم بی بی سی اردو سروس کی مدد سے اس phenomenon کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے ایک نوسکھیے ہدایت کار نے 'گاندھی گیری' کا ایک نیا اور کھردرا سا نام دیا ہے اور جس نے گاندھی کو آج کے ہندوستانی نوجوان کا رول ماڈل بنا دیا ہے! (ادارہ)

بنگلور کی بے نظیر بیگ شہر کی ایک متوسط آمدنی والے محلے میں کم سن مزدوروں کے لیے اسکول چلاتی ہیں۔ انہوں نے سات ماہ قبل اسکول سے ملحق زمین سولہ لاکھ روپوں میں خریدی تھی تاکہ پانچ سو پر مشتمل طلبا کے اس اسکول کی عمارت میں توسیع کی جاسکے۔

لیکن اس زمین پر استادہ ایک گودام کو مشہور فرنیچر فرم 'میتھو ڈیکس' نے مدت کرایہ ختم ہونے کے باوجود خالی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے نظیر اور ان کے 'ایکسیلنٹ اسکول' کے منتظم رضا ایجوکیشنل سوسائٹی کے مطالبے کو مسلسل نظر انداز کرتے ہوئے اس فرم نے کورٹ سے یہ احکام بھی حاصل کر لئے تھے کہ ان کے گودام میں بے نظیر اور ان کے اسٹاف ممبر داخل نہ ہو سکیں۔

یہ صورت حال بہت تکلیف دہ تھی کیوں کہ بے نظیر کا اسکول ان بچوں کے لئے مختص ہے جو یا تو ماضی میں ورک شاپوں، ہوٹلوں یا فیکٹریوں میں کام کرتے تھے یا پھر آوارہ گردی کرتے ہوئے پولیس کے ہتھے چڑھتے ہوئے یہاں لائے گئے تھے یا بہت ہی غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

بے نظیر نے یہ اسکول 1993 میں قائم کیا تھا اور پانچ سو بچے فی الحال بارہ سو مربع فٹ کی ایک عمارت میں تعلیم پا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی مکان کو بینک میں رہن رکھ کر اسکول سے ملحق چھ سو مربع فٹ زمین اپریل میں خریدی مگر کرایہ دار فرم نے وعدہ کے برخلاف اسے خالی کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ گزشتہ پانچ ماہ سے کرایہ بھی بند کر رکھا تھا۔

22 ستمبر کو جب بے نظیر اور ان کے اسکول کی 18 استانیوں نے فلم 'لگے رہو منا بھائی' دیکھی تو انہیں خیال گزرا کہ کیوں نہ اس ناجائز کرایہ دار کو گاندھی گیری کے ذریعے زیر کیا جائے۔

بس پھر کیا تھا استانی شمیم کو اہم کردار سرگٹ بنایا گیا۔ فون ڈائریکٹری سے میتھو ڈیکس فرم کے شہر میں واقع تیرہ شوروموں کے محل وقوع متعین کئے گئے اور آخر میں شہر کے پوش علاقے سی ایم ایچ روڈ پر واقع شوروم کو پرامن احتجاج کا ہدف مقرر کیا گیا۔

25 ستمبر کو تین آٹو رکشوں میں 25 طلبا کے ساتھ کئی استانیوں نے اس فرم کے شوروم پر ہلہ بول دیا اور شوروم اور فرم کے جنرل منیجر نائن چاکو پر گل دستوں کی بارش کر دی۔ گل دستوں پر مودبانہ انداز سے گودام خالی کرنے کی گزارش بھی تحریری تھی۔

نائن چاکو کے لئے یہ صورت حال غیر متوقع تھی۔ دو روز کے ناکام احتجاج کے بعد بے نظیر اور شمیم نے وہیں بچوں کے لئے کلاسیں بھی منعقد کرنا شروع کر دیں۔ اس پر نائن چاکو نے پولیس کو خبردار کیا اور بے نظیر کو پولیس اسٹیشن جا کر بھی اپنی فریاد سنانا پڑی۔

پولیس انسپکٹر نے مسائل کا ہمدردانہ جائزہ لے کر چاکو کو رام کیا اور اس طرح پورے ایک ہفتے کے گاندھیائی پرامن احتجاج کے بعد فرم نے 29 اکتوبر کو قطعی طور پر اس گودام اور سائٹ کو اسکول کے حوالے کر دینے کی حامی بھر لی۔

شہر کی فیشن ایبل شاہراہ پر ایک پوش شوروم میں اس ڈرامے کو دیکھ کر شام نامہ 'مڈ ڈے' نے اس احتجاج کو مہمیز عطا کی۔ اس کے بعد جب مقامی ٹی وی چینلوں کے عملے نے شوروم پہنچنا شروع کیا تو چاکو اور ان کے عملے نے شوروم مقفل کر کے راہ فرار اختیار کی۔

بالآخر 29 ستمبر کو پورے ہنگامہ خیز ہفتے کے بعد دونوں فریقین نے یہ تصفیہ کیا کہ 25 اکتوبر کو اس سائٹ کو اسکول کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تائن چاکو کا یہ جملہ کہ آپ نے مجھے خود اسٹاف کے درمیان ولین بنا دیا، غالباً اس پورے ہنگامے کا سب سے معنی خیز جملہ تھا جسے قارئین نے گاندھیائی احتجاج پر سب سے مناسب ریمارک قرار دیا ہے۔

بے نظیر بیگ ہندی میں ایم اے ہیں۔ ان کی رضا ایجوکیشن سوسائٹی غریب طلبا کی تعلیم کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ بسم اللہ نگر میں واقع ان کا اسکول نیشنل چائلڈس پروگرام کے تحت متعدد بچوں کو تعلیم اور دوپہر کا کھانا بھی دیتا ہے۔ بے نظیر کی مستقل مزاجی اور لگن دیکھ کر مقامی روٹری کلب نے پرانے گودام کو منہدم کر کے نئی عمارت تعمیر کرنے کی پیش کش کی ہے۔

بے نظیر اپنی اس جدوجہد کی کامیابی کے لئے فلم 'لگے رہو منا بھائی' کے ڈائریکٹر راجکمار ہیرانی اور اداکار سنجے دت کا شکریہ ادا کرنا نہیں بھولتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس فلم نے ان کو پرامن احتجاج کا راستہ دکھایا ورنہ عدالتی چارہ جوئی انہیں برسوں ایک پیچیدہ بھول بھلیوں میں پھنسائے رکھتی۔

مقبول احمد سراج

دادا گیری سے گاندھی گیری تک

ستمبر 1906 میں گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کی جس تحریک کا آغاز کیا تھا اسے ایک صدی ہو چکی ہے اور بھارت میں سرکاری طور پر اس کی صد سالہ تقریبات کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک حالیہ اجلاس میں سو سالہ جشن کے لئے یوں تو بہت سی تجویزیں زیر بحث آئیں مثلاً یہ کہ سال بھر جاری رہنے والی ان تقریبات کے دوران گاندھی جی کی تمام تصنیفات کے نئے ایڈیشن مختلف زبانوں میں شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں کے آسان اور مختصر ایڈیشن بھی انگریزی اور ہندی میں شائع کئے جائیں اور یہ کہ مختلف عالمی یونی ورسٹیوں میں گاندھی چیئر قائم کی جائے۔

لیکن ان گھسی پٹی تجویزوں سے مختلف اور انوکھا مشورہ راجیہ سبھا کی رکن محسنہ قدوائی نے دیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے پہلے تو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سب ارکان کو سنجے دت کی فلم 'لگے رہو منا بھائی' دیکھنی چاہئے تا کہ وہ یہ جان سکیں کہ آج کے بھارتی نوجوان کو فلسفۂ گاندھی سے کس طرح روشناس کرایا جا سکتا ہے۔

محسنہ قدوائی نے کہا کہ اس فلم کے منظر عام پر آتے ہی نئی نسل میں گاندھی جی کی شخصیت اور نظریہ حیات کی جانکاری کا ایسا جوش و جذبہ بیدار ہوا ہے کہ لائبریریوں اور بک اسٹالوں میں وہ سب شیلف خالی ہو گئے ہیں جہاں گاندھی جی کے بارے میں لٹریچر رکھا جاتا تھا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں چھتیس گڑھ کے سابق وزیر اعلی اجیت جوگی نے بھی اس مشورے کی تائید کی کہ گاندھی جی کی تعلیمات کو عام کرنے کا طریقہ منا بھائی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا انھوں نے فلم دیکھی ہے تو اجیت جوگی نے کہا کہ میں دیکھنے گیا تھا لیکن اسٹارش تھا کہ مجھے ٹکٹ ہی نہیں ملا۔

اجیت جوگی کی طرح لاکھوں فلم بین ابھی تک ٹکٹ حاصل نہیں کر سکے کیونکہ 'لگے رہو منا بھائی' کو حقیقی معنوں میں گھڑکی توڑ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

بھارتی فلم انڈسٹری میں سلسلہ وار فلم کا رواج نہیں ہے اور اب تک چند مشہور فلموں کے جو سیکوئل بنے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہوئے ہیں (جیسے جیول تھیف کی واپسی) 'منا بھائی ایم بی بی ایس' نے تین برس پہلے کافی کامیابی حاصل کی تھی لیکن اس کی دوسری قسط بنانے کا خیال بڑا عجیب و غریب تھا کیونکہ پہلی فلم اپنے آپ میں مکمل تھی اور کہانی کی کوئی کڑی ایسی نہ تھی جسے آگے چلا کر ایک نئی قسط کا جواز پیدا کیا جاتا۔

تاہم راج کمار ہرانی کا خیال اس سے بالکل مختلف تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ پہلی فلم میں سنجے دت کا کردار ہٹ ہو چکا ہے لیکن وہ اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ دادا گیری کے زور پر اس کردار کو مزید آگے نہیں چلایا جا سکتا چنانچہ انہوں نے اس کے بالکل متضاد قدر گاندھی گیری کا سہارا لیا یعنی فلسفۂ گاندھی کا وہ روپ جو ایک عام آدمی کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

اس عوامی فہم و فراست کی ایک مثال اس منظر میں نظر آتی ہے جہاں ایک گارڈ سے تھپڑ کھانے کے بعد منا بھائی دادا گیری دکھانے کی بجائے

گاندھی گیری کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا دوسرا گال بھی گارڈ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ گارڈ دوسرے گال پر بھی ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کرتا ہے تو منا بھائی پلٹ کر اس پر حملہ کرتا ہے اور مار مار کے اس کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے کیوں کہ اس نے گاندھی کا یہ مسیحی فلسفہ تو سن رکھا ہے کہ کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو۔ لیکن کوئی دوسرے گال پر بھی تھپڑ جڑ دے تو پھر کیا کرنا ہے؟

اس سلسلے میں چونکہ منا بھائی کے پاس گاندھی کی کوئی گائیڈ لائن نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے فطری ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے حملہ آور کا بھرکس نکال دیتا ہے۔ اس منظر سے فلسفۂ گاندھی کی تضحیک نہیں بلکہ منا بھائی کی سادگی اور خلوص دکھانا مقصود ہے۔

ہدایت کار راجکمار ہرانی فلم ڈائریکشن کی دنیا میں نسبتاً نئے ہیں۔ انہوں نے اپنے کیرئیر کا آغاز 1988 میں فلم 'ہیرو ہیرا لال' کے ایڈیٹر کے طور پر کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے 'جذبات' اور 'مشن کشمیر' بھی ایڈٹ کیں۔ 2003 میں انہوں نے ہدایت کاری کا اولین تجربہ فلم منا بھائی ایم بی بی ایس میں کیا اور تبھی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ان کا اصل میدان یہی ہے۔ یعنی فلم ڈائریکشن۔

ان کی موجودہ فلم کو اگرچہ گذشتہ فلم منا بھائی ایم بی بی ایس کا دوسرا حصہ یا سیکوئل کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک نئی کہانی ہے اور اس میں سوائے منا بھائی سنجے دت اور سرکٹ ارشد وارثی کے اور کوئی چیز پہلی فلم سے تعلق نہیں رکھتی۔ فلم کی کہانی پروڈیوسر ودھو ونود چوپڑا (جو خود بھی ایک مانے ہوئے فلم ڈائریکٹر ہیں) اور ہدایت کار راج کمار ہرانی نے مل کر لکھی ہے۔ منظر نامے اور مکالمات میں ایک تیسرے رائٹر ابھی جیت جوشی نے ان کی مدد کی ہے جو کہ قبل ازیں فلم 'فریب' اور 'مشن کشمیر' کی رائٹرز ٹیم میں شامل رہے ہیں۔

'لگے رہو منا بھائی' میں مرکزی نسوانی کردار ودیا بالن نے ادا کیا ہے جن کی فن کارانہ زندگی کا آغاز اگرچہ ہم پانچ نامی ٹی وی سریل سے ہوا تھا لیکن انہیں اصل شہرت اپنی پہلی فلم 'پرینیتا' سے ملی جو کہ پچھلے برس ہی ریلیز ہوئی تھی اور سبھی مبصرین نے ودیا بالن کو بالی وڈ کی گھٹی ہوئی فضا میں تازہ ہوا کا جھونکا قرار دیا تھا۔ ان مبصرین کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ محض ایک اتفاقی جھونکا نہیں تھا کیونکہ 'لگے رہو منا بھائی' میں اس بادِ صبا کا تسلسل جاری نظر آتا ہے۔

اس دوران میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی بھی تعلیمات گاندھی کی صد سالہ تقریبات منعقد کرتی رہے گی لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کمیٹی کے تمام فرائض 'لگے رہو منا بھائی' کی ٹیم پہلے ہی بطریقِ احسن ادا کر چکی ہے۔

عارف وقار

(بشکریہ بی بی سی اردو ڈاٹ کام)

سردار ملک: ایک منفرد فلمی موسیقار

چار دہائیوں تک ہندوستانی فلم انڈسٹری پر اپنی موسیقی سے حکومت کرنے والے موسیقارِ اعظم نوشاد علی کا انتقال (5 مئی 2006) یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جسے ہندوستانی فلمی موسیقی شائد ہی بھلا پائے۔ لیکن ان سے بمشکل سوا تین مہینے پہلے انتقال کر جانے والے ایک منفرد موسیقار کو جس طرح بھلا دیا گیا اسے دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے افسوس بھی۔

طلعت محمود کی گائی ہوئی اسرار الحق مجاز کی مشہور نظم 'آوارہ' کی موسیقی ترتیب دینے اور 'میں غریبوں کا دل ہوں وطن کی زباں' جیسے دل کش نغموں کی دھنیں تخلیق کرنے والے منفرد فن کار سردار ملک کا 28 جنوری 2006 کو ممبئی میں جوہو کے ایک ہسپتال میں 81 برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ وہ کئی برس سے پارکنسن کے عارضے میں مبتلا تھے، اور دو روز پہلے ہی انہیں اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ آخر جمعہ کی شب کو انہوں نے آخری سانس لی۔ پس ماندگان میں تین بیٹے موسیقار انو ملک، گلوکار ڈبو ملک اور ابو ملک ہیں۔

سردار ملک نے تقریباً 600 گیتوں کی دھنیں ترتیب دی تھیں اور پچاس کے عشرے میں فلم سارنگا، آبِ حیات، بچپن، ٹھوکر، چور بازار اور ماں کے آنسو کے نغموں سے انہوں نے کافی شہرت پائی۔ ان کے کئی نغمے کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں اور آج بھی گنگنائے جاتے ہیں۔ مثلاً: ہاں دیوانہ ہوں میں، سارنگا تیری یاد میں (سارنگا) میں غریبوں کا دل ہوں (آبِ حیات) اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں (ٹھوکر) چلتا رہے یہ کارواں (چور بازار) مجھے کچھ ہوش نہیں (بچپن) فلم 'ماں کے آنسو' کے لئے ان کی دو نعتیں 'مری جھولی کو بھر دے اے خدا صدقے محمد کے' اور 'میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے' آج بھی دلوں کو جذبۂ عقیدت سے سرشار کر دیتی ہیں۔

سُروں میں سادگی، سازوں کا موزوں استعمال، اور کلاسیکی راگوں پر مبنی لے کاری اور مختصر سے سازینے پر استادانہ گرفت ان کی میوزک کمپوزنگ کی خصوصیات تھیں، اور انہوں نے کبھی کسی کی نقل نہیں کی۔ اس کے باوجود فلمی موسیقی میں انہیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کے فرزند انو ملک نے چلتی پھرتی دھنیں بنا کر ان سے کہیں زیادہ نام پیدا کیا، لیکن دوسرے موسیقاروں کی مقبول دھنوں کی ندیم شرون کی طرح کھلی چوری کی عادت یا مجبوری نے انہیں اس عزت و احترام سے محروم رکھا ہے جو سردار ملک کی جینوئن دھنوں کے لئے فلمی موسیقی کے شائقین کے دلوں میں ہے۔ ن ظ

موسیقی

مرگِ بسم اللہ خاں

وجاہت مسعود، حسن مجتبیٰ

سُروں میں الوہیت کا متلاشی

26 جنوری 1951 آزاد ہندوستان کا پہلا یوم جمہوریہ تھا پنڈت جواہر لال نہرو، راجندر پرشاد، سردار پٹیل اور مولانا آزاد لال قلعے کی تقریبات میں شریک تھے۔ کوئی 15 برس کا ایک فن کار شہنائی ہاتھ میں لئے اسٹیج پر نمودار ہوا اور راگ کافی کی دھن چھیڑ دی۔ شہنائی کے واضح اور بھرپور سر فضا میں پھیل گئے۔ لال قلعے کی فصیلوں پر ابابیلیں اترنے لگیں۔ قریب ہی ہمایوں کے مقبرے کی سیڑھیوں پر سے وہ تلچھٹ ڈھلنے لگی جو میجر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو یہاں گرفتار کر کے ہندوستان پر تھوپی تھی۔ شہنائی کے یہ جادوگر فن کار بسم اللہ خان تھے۔

مندروں کے شہر بنارس میں گنگا کنارے بسنے والے بھارت رتن استاد بسم اللہ خان کا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے تن تنہا شہنائی کی سیتا کو ڈوم ڈھاریوں کے نرغے سے نکال کر موسیقی کے بلند ترین معیار سے روشناس کرایا۔ شہنائی فٹ بھر کی نرسل ہی تو ہے مگر لکڑی کا یہ بے جان ٹکڑا بسم اللہ خاں کے ہونٹوں سے چھو جاتا تو نرت سمراٹ ہو جاتا۔ شہنائی کے ساز پر بسم اللہ خان انگلیاں رکھتے تو کاشی دوار میں مندروں کے کلس سنہری ہو جاتے دلوں میں مسرت آمیز نیکی کا وفور ہونے لگتا۔

1937 کا برس تھا۔ کلکتہ میں کل ہند موسیقی کانفرنس میں استاد بسم اللہ خاں نے شہنائی بجائی۔ تو راگ ودیا کے پارکھ اس ساز کے امکانات سے آگاہ ہوئے۔

بسم اللہ خاں نے تب سے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ممبئی میں سر سنگار سمیلن ہر برس اپریل میں منعقد ہوتا ہے۔ کوئی 10 برس اس سنگیت کا آغاز استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی سے ہوا تھا۔ بھارت کا کون سا رہنما ہے جس نے بسم اللہ خاں کو شہنائی نہیں اٹھائی۔ پدم شری، پدم بھوشن اور پھر پدم وی بھوشن سے لے کر بھارت رتن تک ہندوستان کا کون سا اعزاز تھا جو بسم اللہ خاں پر نچھاور نہیں کیا گیا۔

استاد عبدالکریم خاں اور پنڈت اوم کار ناتھ ٹھاکر کے بعد استاد بسم اللہ خاں تیسرے فن کار تھے جنہیں سر میں الوہی کیفیت کی جستجو تھی۔ استاد بسم اللہ راگ میں ڈوب جاتے تو وارفتگی اور عبودیت میں فاصلہ نہیں رہتا تھا۔ سُر ورشا سننے والوں پر یوں اترتی تھی جیسے کوئی عارف اپنے پیروکاروں میں گیان کے موتی بانٹتا ہے۔ شہنائی سے کھیلتی انگلیاں اور کہیں دور تکتی آنکھیں راگ کے وسیلے سے زندگی کے اس گیان کو پانا چاہتی تھیں جو فن کے بندھے ٹکے قاعدوں کی جکڑ میں نہیں آسکتا۔

استاد فرماتے تھے کہ سُر ایسا سچا موتی اور صاف جل ہے کہ اس میں کھوٹ اور کپٹ نہیں ہو سکتی۔ چاہو تو سُر کے گھاٹ ہی پہ رہو اور چاہو تو اس کے ساگر میں اتر جاؤ۔ حلال اور حرام کی جکڑ بندیوں میں الجھے کسی کٹ حجتی نے استاد کو دق کیا تو قدرے جھلا کے کہا "سات شدھ اور پانچ کومل سروں کی یہ مالا ہمارے لئے تو مالک تک پہنچنے کا وسیلا بن گئی۔ اگر یہ حرام ہے تو اور حرام کرو اور حرام کرو۔ چرچل نے بھی تو کہا تھا کہ اگر جمہوریت میں خرابیاں ہیں تو جمہوریت تھوڑی زیادہ کر دو۔"

سادھارن روپ میں جیون کرنے والا یہ کبیر پنتھی نئے بھارت میں مذہبی رواداری اور رنگا رنگ کشادگی کا نشان تھا۔ فجر کی نماز ادا کئے بغیر ریاض نہیں کرتے تھے اور ریاض برسوں بنارس کے وشوا ناتھ مندر میں کیا۔

ریکارڈنگ کے لئے چپکے سے کہہ دیتے کہ نماز سے پہلے ختم کر لی جائے۔ بنارس کے اہل تشیع مسلمان آئندہ محرم میں امام بارگاہ کے صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ کے نیچے آنسوؤں میں بھیگا وہ باریش چہرہ نہیں دیکھیں گے جو سفید براق کرتا پہنے زمین پہ بیٹھا ہولے ہولے پڑھتا تھا" آیا ہے کربلا

میں غریب الوطن کوئی"

فن کے اعلیٰ ترین امکانات فن کار میں کیسے تجسیم پاتے ہیں یہ جاننے کے لئے استاد بسم اللہ خاں کو دیکھنا کافی تھا۔ وضع قطع میں بانک پن مگر بانکا پن نہیں۔ رویے میں معصومیت مگر لاعلمی نہیں۔ رکھ رکھاؤ میں رعونت نہیں۔ بس اپنے مقام کا ان کہا احساس۔ دنیا بھر کی یونی ورسٹیوں سے اعلیٰ ترین اعزازی ڈگریاں پانے والے بسم اللہ خاں سائیکل رکشہ پر سفر کرتے تھے۔ سستے سگریٹ کا رنج کھینچتے تھے۔ شہر سے باہر جانا ہوتا تو ریل کے دوسرے درجے میں سفر کرتے۔ مگر بسم اللہ خاں کی انگلیوں کا جادو بھارت ہی نہیں دنیا کے ہر اس کونے میں بول رہا ہے جہاں ہندوستانی موسیقی سنی جاتی ہے۔

استاد نے 21 مارچ 1916 کو بہار کے گاؤں دمراؤں ضلع بکسر میں جنم لیا تھا۔ 21 اگست 2006 کی صبح وارانسی کے Heritage ہسپتال کے پیڑوں پہ چڑیاں چہچہا رہی تھیں اور دور کہیں بھیرویں کے بول جوگی مت جامت جا۔ ابھی ہوا میں رچ رہے تھے کہ استاد نے آنکھیں موند لیں۔ شہنائی خاموش ہوگئی۔

(اس مضمون کے مصنف وجاہت مسعود انسانی حقوق، صحافت اور تعلیم کے شعبوں میں وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ ادبی اور سیاسی موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور آج کل برطانیہ میں بین الاقوامی قانون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔)

عناصر میں ظہور موسیقی کا خالق

کیا آپ نے دیکھا ہے وارانسی میں گنگا کے پانیوں کو ہنستے روتے اور گاتے؟ یہ سب بسم اللہ خاں کی ہی شہنائی میں تھا۔ صرف پانی ہی کیا سارے عناصر مٹی آگ اور ہوا بھی ان کی شہنائی میں گانے، ہنسنے، ناچنے اور رونے لگتے تھے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

"نماز، سُر اور موسیقی یہ تینوں ایک ہی چیز ہیں" بسم اللہ خان نے کہیں اپنے کسی انٹرویو میں کہا تھا۔ یہ بچہ قمرالدین ایک ایسے انسان تھے جن کے اس دنیا میں آنے پر ان کے دادا کی طرح ہر کوئی کہہ سکتا تھا بسم اللہ۔

کہتے ہیں بسم اللہ خاں نے شہنائی وارانسی کے شوناتھ مندر سے جڑے اپنے پرکھوں میں سے بخشے خان سے سیکھی تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر موسیقی اور شہنائی کے حوالے سے انڈیا کا نہرو سے بھی بڑا نام تھے۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جنہوں نے نہرو کا نام نہیں سنا ہوگا لیکن بسم اللہ خان کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔ میں نے میراثیوں اور محرم کے ماتمیوں سے ان کا ذکر ایسے سنا جیسے وہ اماموں کا ذکر کر رہے ہوں۔ ایک میراثی نے مجھ سے کہا بسم اللہ خان استاد دھمالی فقیر سے بھی بڑا شہنائی نواز ہے۔ علن فقیر کے والد سندھ میں مانے اور منجھے ہوئے شہنائی نواز تھے۔

آیا ہے کربلا میں غریب الوطن کوئی
سب کچھ ہو اس جہان میں لیکن مرے کریم
بھائی کو ذبح ہوتے نہ دیکھے بہن کوئی

آٹھ محرم کو بنارس میں بسم اللہ خاں کی شہنائی سے روتے پانیوں، آگ ہوا اور مٹی کی وہ آواز تو نیم کی گھنی چھاؤں تلے اب کے ساون خاموش ہوگئی لیکن بنارس میں گنگا کا پانی اسے صدا روتا رہے گا۔

اگر واقعی آسمانوں یا زمین پر آدمی کے مرنے کے بعد کہیں کوئی جنت ہے تو پھر آج سے وہاں اس بڑے شہنائی نواز کی بڑی جگل بندیاں اور سر سنگھار شمشاد لگ رہے ہوں گے۔

حسن مجتبیٰ، سان ڈیگو، امریکہ۔

گنگا کنارے بجنے والی شہنائی خاموش ہوئی

مشہور عالم شہنائی نواز استاد بسم اللہ خاں نے پیر (21 اگست 2006) کی صبح تقریباً دو بجے دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ استاد بسم اللہ کی شہنائی کی گونج دنیا کے کونے کونے میں سنی جا چکی ہے اور انہی کی دھنوں نے موسیقی کی دنیا میں شہنائی کو ایک نئی پہچان دی ہے۔

استاد بسم اللہ خاں سے قبل شہنائی صرف شادی بیاہ کی تقریبات اور مندروں تک ہی محدود تھی لیکن انہوں نے شہنائی کو ستار سرود اور طبلے جیسے موسیقی کے سازوں کے درجے تک پہنچا دیا۔

موسیقی کی دنیا میں اہم کردار ادا کرنے کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت نے انہیں سنہ دو ہزار ایک میں ملک کے اعلیٰ ترین باشندے کے اعزاز، بھارت رتن سے نوازا تھا۔

خاں صاحب کی پیدائش 11 مارچ 1916 کو بہار کے ڈمراؤں ضلع میں ہوئی تھی۔ بچپن سے ہی موسیقی میں دل چسپی رکھنے والے والے بسم اللہ خاں نے اپنے ماموں علی بخش سے شہنائی بجانے کی تعلیم حاصل کی۔ بعد میں بسم اللہ خاں ان کے ساتھ کاشی کے وشوناتھ مندر میں شہنائی بجانے لگے۔

خاں صاحب موسیقی کو ہی اپنا مذہب مانتے تھے اور بنارس کے گھاٹوں پر گھنٹوں تک ریاض کرتے۔ ہر برس بنارس میں گنگا کنارے محرم کی آٹھویں تاریخ کو بسم اللہ خاں کی شہنائی سننے تقریباً سبھی مذاہب کے ماننے والے

پارلیمنٹ میں شہنائی

7 مارچ 2006 استاد بسم اللہ خان نے بھارتی پارلیمان کے احاطے میں واقع جی ایم سی بال یوگی ہال میں جمعرات کو اپنے سروں کا جادو بکھیرا۔ جگل بندی میں ان کا ساتھ ڈاکٹر سوما گھوش نے دیا۔ استاد بسم اللہ خان کی خواہش تھی کہ وہ پارلیمان میں اپنی شہنائی کے سر پیش کر سکیں۔ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے جمعرات کی اس محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔

اپنے فن کے اس مظاہرے سے ایک روز قبل بدھ کو جب استاد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرنے کی غرض سے ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کے سامنے نمودار ہوئے تو ماحول کی خاموشی اچانک کیمرے کے شٹرز کی آواز میں تبدیل ہو گئی۔

وہاں موجود ہر فوٹوگرافر ان کی تصویر اپنے کیمرے میں قید کر لینا چاہتا تھا۔ مگر گفتگو کے دوران استاد بسم اللہ خاں کا لہجہ اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ان نمائندوں کے شور وغل پر خاصا شکایتی تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا کہ "بس دیکھ لیں اور اب ہم بول چکے، اب ہم نہیں بولیں گے، بے سُرا طریقہ ہے اب ہم نہیں بولیں گے۔"

مسلسل علالت کے سبب استاد نہایت کمزور ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بھارتی پارلیمان میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ خاں صاحب کی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے اس گفتگو کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے میڈیا والوں کو سوالات کا موقع ہی نہیں دیا اور ان سوالوں کے جوابات بھی دے گئے جن کا کسی کو گمان بھی نہ تھا۔

مثلاً بنارس شہر سے اپنی دیرینہ محبت پر انہوں نے کہا کہ "ہم کیسی جگہ پر رہتے ہیں میں آپ کو بتاتا ہوں، جب ہم امریکہ، فرانس، برطانیہ، جرمنی، گھومے تو سب نے ہم سے پوچھا کہ کیسا لگا؟ تو ہم نے کہا کہ سب اچھا ہے بس ایک چیز کی کمی ہے۔ سب نے پوچھا کہ خاں صاحب وہ کیا؟ تو ہم نے کہا کہ بنارس نہیں ہے۔"

خاں صاحب طویل عرصہ سے علیل تھے اور علاج کے لئے انہیں دوسروں کی مدد پر انحصار بھی کرنا پڑا۔ تاہم ذرائع ابلاغ کے نمائندوں سے گفتگو کے دوران انہوں نے مالی امداد کرنے والے تمام افراد کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ "جس جس نے ہمیں پیسہ دیا، چاہے ایک روپیہ دیا یا ایک لاکھ روپیہ دیا ہم سب کے شکرگزار ہیں۔ ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اللہ ان سب کو تندرست رکھے ہم بہت کمزور ہو گئے تھے ہم سے اٹھا نہیں جاتا تھا۔ اب تو ہم اٹھتے ہیں۔ یا علی مدد، پہلے تو ہماری حالت یہ تھی کہ ہم اٹھ تو سکتے نہیں تھے۔"

پھر جمعرات کو جب بسم اللہ خان صاحب نے ضعیف العمری کے باوجود بھارتی پارلیمانی میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو سیاست داں حضرات پانچ برس قبل لتا منگیشکر کے فن کے اس مظاہرے کو بھی بھول گئے جو انہوں نے بھارت کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر کیا تھا۔

آتے تھے۔

اپنے آپ کو شیعہ کہنے والے بسم اللہ خاں ہندو مذہب میں موسیقی اور تعلیم کی دیوی 'سرسوتی' کی پوجا بھی کرتے تھے۔

استاد بسم اللہ خاں نے ہی پندرہ اگست انیس سو سینتالیس کی نصف شب لال قلعہ پر شہنائی بجا کر ہندوستان کی آزادی کا خیر مقدم کیا تھا اور یوں آزادی کی بسم اللہ ہوئی تھی۔

اعلیٰ درجے کے شہنائی نواز ہونے کے ساتھ ساتھ بسم اللہ خاں اپنی سادگی کے لئے بھی کافی مشہور تھے۔ موسیقار کے طور پر انہوں نے جو کچھ بھی کمایا اسے یا تو اپنے لواحقین پر خرچ کر دیا یا غریبوں کی مدد میں۔ اسی کے سبب ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ وہ پائی پائی کے لئے محتاج ہو گئے۔ اس وقت ریاستی حکومت نے انہیں مالی مدد فراہم کی۔

ایک عرصے سے بیمار استاد بسم اللہ کی خواہش تھی کہ وہ دلی کے انڈیا گیٹ پر شہنائی بجائیں لیکن ان کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی۔

(بشکریہ بی بی سی اردو ڈاٹ کام)

متنازع فیہ/ گیان چند جین کی تصنیف

...جیسے بنیے کی کتاب

ڈاکٹر اطہر فاروقی

ہندو فرقہ واریت کے لسانی زاویے کو محیط اور نہایت ہی پھکڑپن کے ساتھ لکھی گئی پروفیسر گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی 2005) پر شمس الرحمان فاروقی صاحب کے تبصرے کے بعد ایک طوفان برپا ہو گیا ہے۔ فاروقی صاحب کا تبصرہ بلاشبہ عالمانہ ہے مگر اس پر ردِ عمل کا اظہار وہ تمام لوگ بھی کر رہے ہیں جو کسی کتاب کا مطالعہ تو دور کی بات ہے، رسائل میں شائع ہونے کے بعد مذکورہ رسالے میں ہی دوسروں کی تخلیقات بھی نہیں پڑھتے۔ تاریخ ادب اور تاریخ زبان بھی ان میں سے اکثریت کی علمی دل چسپی کے موضوعات کبھی نہیں رہے۔ اردو دنیا اس کتاب سے فاروقی صاحب کے تبصرے کے بعد ہی واقف ہوئی۔

میں نے کم سے کم 200 لوگوں کو اس کتاب پر بات کرتے اور غصے کا اظہار کرتے دیکھا مگر جس سے بھی یہ سوال کیا کہ کیا آپ نے یہ کتاب پڑھی تو 99 فی صد سے زیادہ کا جواب تھا کہ ابھی نہیں، پڑھیں گے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ فاروقی صاحب کے علاوہ اب اس قسم کے موضوعات پر لکھنے کا اردو میں کوئی بھی اہل نہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہوا کہ جب فاروقی صاحب کا اتنا بھرپور تبصرہ موجود ہے یا رہ نمائی کے لیے خود فاروقی صاحب موجود ہیں تو پھر کتاب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ مشہور افسانہ نگار انتظار حسین نے بھی یونی ورسٹی آف وسکانسن، میڈیسن، امریکہ کے سالانہ مجلے Annual of Urdu Studies کے 2006 کے شمارے میں اس کتاب پر ایک مضمون بہ عنوان A Linguistic Study of Urdu ص ص 308-310 (یہ مضمون اولاً پاکستانی روزنامہ Dawn کے 13 نومبر 2005 کے انٹرنیٹ ایڈیشن کے میگزین سیکشن میں شائع ہوا تھا) میں فرمایا ہے کہ انھوں نے بھی کتاب سے متعلق فاروقی صاحب سے ٹیلی فون پر گفتگو کی تھی۔ یعنی فاروقی صاحب سے فون پر گفتگو کر کے جو سمجھ میں آیا وہ انتظار حسین نے لکھ دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اس کتاب پر ردِ عمل کا اظہار کرنے والوں میں سے اکثر نے، اغلب ہے کہ جین صاحب کی کبھی کوئی تحریر نہیں 'دیکھی' ہو گی۔ مختصراً اس کتاب پر بغلیں بجانے والوں میں اکثریت اردو کے ان 'برائے نام' مسلم اہلِ قلم کی ہے جنھیں کسی سنجیدہ موضوع سے قطعی کوئی دل چسپی نہیں۔

اردو کی لسانی اور ادبی تاریخ کے موضوعات پر گیان چند جین کی کتابوں اور ان کے تحقیقی کام کے بڑے قصیدے پڑھے جاتے ہیں مگر مجھے ان میں کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جسے اضافہ مان کر اُن سے منسوب کیا جا سکے۔ کہا جا سکے کہ یہ کام صرف گیان چند جین نے کیا ہے۔ وہ ایک عمومی نوعیت کے مصنف اور محقق ہیں اور ان سے بھی اعلیٰ پائے کے اردو ادیب ان جیسے غیر مسلموں میں موجود تھے اور ہیں۔ خاص طور سے پروفیسر گوپی چند نارنگ۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں ساختیات اور مابعدِ جدیدیت کے نظریے خاص ان ہی سے منسوب ہو کر رہ گئے ہیں جو ہزار اختلافات کے باوجود اردو تنقیدی ادب میں اضافے کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور ستم ظریفی دیکھیے کہ حضرت نے اپنی مسموم کتاب ان سے ہی موسوم کر دی ہے۔

خیر عرض یہ کرنا تھا کہ راقم الحروف گیان چند جین کے معتقدین تو دور ان کے حامی معترفین میں بھی کبھی نہیں رہا۔ اپنی یادداشت کے مطابق میں نے انھیں صرف ایک مرتبہ اس وقت خط لکھا تھا جب میں رشید حسن خاں صاحب مرحوم (وفات 25 مارچ 2006) پر ایک کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ غالباً 1992 کی بات ہے۔ جین صاحب کا جواب آیا کہ چوں کہ رشید حسن خاں نے کبھی ان پر کچھ نہیں لکھا یوں وہ بھی رشید صاحب پر مضمون نہیں لکھیں گے۔ میں نے ان کا خط رشید صاحب کو بھیج دیا تھا۔ کچھ روز بعد مجھے جین صاحب کا مضمون بہ عنوان 'رشید حسن خاں: خدائے تدوین' موصول ہو گیا جو اس کتاب میں شامل ہے جسے مکتبہ جامعہ نے 'رشید حسن خاں: حیات اور ادبی خدمات' کے نام سے جولائی 2002 میں شائع کیا۔ یہ میرا جین صاحب سے

واحد براہ راست رابطہ تھا۔ اور اس سے ان کی شخصیت کا یہ نقش بنا کہ وہ صرف اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے کے فلسفے میں یقین رکھتے ہیں۔

2003 میں جین صاحب نے ماہ نامہ 'شب خون' اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' دونوں میں ایک ہی مضمون بہ عنوان 'مہاتما گاندھی اور اردو رسم الخط شائع' کرایا۔ اس وقت ہماری زبان کے تمام متعلقہ شمارے تو سامنے نہیں مگر شب خون کا مارچ 2003 کا شمارہ نمبر 266 میرے پاس ہے، جس میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔ اور اب شب خون کے آخری شمارے میں بھی یہ مضمون ص ص 56-1654 پر موجود ہے۔ میں واقعتاً شب خون میں اس مضمون کو اتنی اہمیت دینے کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں، اور مجھے حیرت ہے کہ اسے شب خون کے انتخاب میں کیوں شامل کیا گیا۔

یہ مضمون جین صاحب کی کتاب کے تیرہویں باب 'اہل اردو اور مہاتما گاندھی' ص ص 246-229 کی تلخیص ہے۔ فاروقی صاحب کے تبصرے میں بھی اس باب پر علاحدہ سے کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں ہے۔ یہ نہایت واہیات مضمون تھا جس میں صرف جین صاحب کی ہندو فرقہ وارانہ ذہنیت کی جلوہ گری کے سوا اور کچھ بھی قابلِ ذکر نہ تھا۔ تقسیم کے محرکات کو نظر انداز کر کے گاندھی جی کے 'ہندستانی' سے متعلق دفاع کی یہ بے حد بھونڈی کوشش بھی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ہندستانی کو ہندی کا اسلوب قرار دے دیا گیا جسے ہندو اکثریت کے زعم اور فسطائیت کے سوا اور کسی محرک سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں اور گاندھی جی کے دفاع میں جین صاحب کی جہالت آمیز معصومیت غضب کی ہے اور بہ ظاہر انھیں یہ معلوم ہی نہیں کہ آئین ہند کی دفعہ 351 شمالی ہند کی دوسری زبانوں کے ساتھ ہندستانی کو بھی ہندی کی شیلی کہہ کر آئینی طور پر ہضم کر گئی اور گاندھی جی خاموش رہے۔

جین صاحب کی پوری کتاب میں آئین کی دفعہ 351 کی روح سے بے خبری ظاہر ہے۔ جین صاحب کے مذکورہ مضمون کی اشاعت کے بعد میں نے ہماری زبان اور شب خون دونوں کو خط لکھا تھا اور صاف لفظوں میں یہ کہا کہ گیان چند جین زبان کی سیاست کے معاملے میں بدنیت آدمی ہیں۔ میں نے بغیر کسی تکلف کے قارئین کو یاد دلایا کہ یہ وہی بے ایمان ہے، جس میں خود اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ وہ اپنے نام سے اردو کی تاریخ سے متعلق وہ کچھ لکھ سکے جسے وہ صحیح سمجھتا ہے، اس لیے، اس نے پریم چند کے بیٹے امرت رائے کو ان کی کتاب A House Divided کے لیے وہ تمام مواد فراہم کرایا جو اردو زبان کی اس معلوم تاریخ سے مختلف ہے جو اردو والوں میں رائج ہے۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ وہ مواد مستند ہو سکتا ہے مگر اس سے اختلاف ضرور تھا اور ہے کہ ایسا کرتے وقت گیان چند کی نیت ٹھیک تھی۔

بہر حال میرے خط کی اشاعت کے بعد 'ہماری زبان' اور 'شب خون' میں میرے خلاف جو خطوط (سوائے احمل کمال کے خط کے، جو شب خون میں شائع ہوا تھا) شائع ہوئے وہ سب ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے مصداق تھے۔ شب خون میں سب سے زیادہ جاہلانہ اور غیر متعلق باتیں تسلسل کے ساتھ برطانیہ کے کسی شہر میں آباد ایک مبینہ افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ نے لکھیں۔ اسی طرح 'ہماری زبان' میں جموں یونی ورسٹی کے پروفیسر ظہور الدین نے حد کی۔ انھیں میرے خط میں صرف یہ بات تحقیق طلب معلوم ہوئی کہ شمس الرحمان فاروقی نے یونی ورسٹیوں میں برسر کار موجودہ اساتذہ کو جہلا کی چوتھی نسل کب اور کس سیاق و سباق میں کہا تھا؟ پروفیسر صاحب کو میں نے جواب تو دے دیا مگر افسوس رہا کہ ہماری زبان اور شب خون کے قارئین میں سے کسی نے بھی کام کی کسی بات کا سرا نہیں اٹھایا۔ امرت رائے کی کتاب شائع ہوئی تھی تو اردو دنیا نے اس کتاب کا برا تو بہت مانا مگر کسی نے کوئی مدلل جواب اس پیمانے پر نہیں دیا جس پیمانے پر ان حقائق کے استرداد کی ضرورت تھی (بہ شرطیکہ وہ حقائق غلط ہوں جو امرت رائے نے بیان کیے)۔

اردو کی تاریخ زبان کے اس دور کے خصوصی مطالعے کا، افسوس کہ مجھے موقع نہیں ملا، جس زمانے سے متعلق A House Divided میں متنازعہ حقائق بیان کیے گئے تھے۔ اس لئے کہہ نہیں سکتا کہ وہ حقائق کس حد تک درست تھے؟ البتہ کتاب کا جو ایڈیشن میں نے پڑھا تھا، اس میں امرت رائے نے اس بات کے لیے گیان چند جین کا شکریہ ادا کیا تھا کہ انھوں نے اردو کی تاریخ سے متعلق متعدد حقائق کی طرف ان کی رہ نمائی کی۔ اپنی موجودہ کتاب میں جین صاحب نے یہ تو کہا ہے کہ امرت رائے کو انھوں نے وہ سب کچھ فراہم نہیں کرایا جو جیہ اختلاف ہے مگر واضح طور پر وہ اس Love's Labour سے اتفاق کرتے ہیں جو امرت رائے کی کتاب میں درج ہے۔ چلیے ایک بات تو طے ہوئی۔ گیان چند جین کی مذکورہ کتاب کا انتساب امرت رائے کے نام بھی ہے اور ایسا کرتے ہوئے جین صاحب نے یہ بھی لکھ دیا ہے، جس کے بعد مزید کسی غلط فہمی کی گنجائش اس ذیل میں نہیں: "دشمنانِ ہندی کے معتوبِ اول امرت رائے (کے نام)۔ کاش کوئی اردو والا تاریخی لسانیات میں ان کی انگریزی کتاب A House Divided کے برابر یا نصف یا کم از کم چوتھائی علمیت کی کتاب لکھ سکتا۔"

میرا آج بھی یہ خیال ہے کہ اگر امرت رائے کے ذریعے بیان کردہ

حقائق درست تھے تو اردو کے طالب علموں کو ان سے واقف ہونا چاہیے۔
میری معلومات کی حد تک شمس الرحمان فاروقی صاحب نے بھی امرت رائے کی کتاب میں بیان کیے گئے حقائق کے خلاف اس وقت کچھ نہیں لکھا تھا مگر وہ بھی اسی خیال کے ہیں کہ یہ کتاب اردو کے خلاف ایک سازش تھی۔ جین صاحب کے خلاف ایک زمانے میں ماہر لسانیات کہے جانے والے مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو کے مرتب (مولف، مصنف؟) مسعود حسین خان نے اولاً اپنی سوانح 'ورودِ مسعود' (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ/ سنہ اشاعت درج نہیں مگر یہ اشاعت 1989 یا 1990 کی ہونی چاہیے) اور پھر شعبۂ لسانیات علی گڑھ میں دیے گئے اور وہیں سے 1988 میں شائع ہونے والے خطبے 'اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر' میں گیان چند جین کی ہندو ذہنیت یا یوں کہیے کہ مسلم مخالف رویوں پر سخت تنقید کی اور یہاں تک لکھ دیا کہ "یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں" (ص 10)

مگر افسوس کہ مسعود صاحب نے یہ سب کسی علمی سبب سے نہیں کہا تھا بلکہ جین صاحب جب سنہ 1962 میں جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر شپ کے امیدوار تھے تبھی مسعود صاحب بھی وہاں امیدوار ہوئے اور سلیکشن بھی مسعود صاحب ہی کا ہوا (ورودِ مسعود ص 96-195) پھر ان میں یہ پروفیسر شپ کا جھگڑا تابعین و تبع تابعین سے ہوتا ہوا جامعہ ملیہ اسلامیہ تک پہنچا جہاں (غالباً 75-1974 میں) مسعود صاحب وائس چانسلر تھے اور جین صاحب امیدوار۔ مسعود صاحب نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو پروفیسر بنایا اور جین صاحب اور پروفیسر محمد حسن دونوں ہمیشہ کے لیے ان کے دشمن ہو گئے۔ 'ورودِ مسعود' کی اشاعت کے بعد، جس میں پروفیسر محمد حسن اور گیان چند جین کے مسترد ہونے کا بھی قصہ مزے لے لے کر (ص ص 28-227) رعونت کے ساتھ درج کیا گیا تھا، محمد حسن صاحب بھی دشمنانِ مسعود کے متحدہ محاذ میں شامل ہو گئے۔ اپنے رسالے عصری ادب میں محمد حسن صاحب نے گیان چند جین کی مدد سے مسعود صاحب سے حساب برابر کرنے کی کوشش کی۔ یعنی یہ جھگڑا بھی ذاتی تھا۔

ہندستان میں لسانیات کے اس طریق مطالعہ میں جس کا خلقیہ اردو کو مرتکز ہے، مسعود حسین خاں نے کوئی چالیس برس ہل چلایا اور اپنے جیسے ہی انانیت پسند سازشی اور ناکارہ شاگرد پیدا کیے۔ ان کے لائق شاگردوں میں ایک جامعۂ اردو کے رجسٹرار انور سعید صاحب تھے جن کی مدد سے ایک بڑی سازش کر کے 1997 میں مسعود صاحب ایسے وائس چانسلر بنے کہ جامعۂ اردو ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا۔ تحریری طور پر خود پروفیسر مسعود حسین خاں اور ان کے شاگردوں نے کوئی قابلِ ذکر رد امرت رائے کی کتاب کا نہیں لکھا۔ مسعود صاحب نے تو اس کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔

ان تمام معروضات کا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے خیال میں حالاں کہ ذہنی طور پر گیان چند جین ہندو فرقہ پرست ہیں مگر ان کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے ذیل میں جو کچھ ان کے خلاف لکھا جا رہا ہے اس کے وجوہ براہِ راست یا بالواسطہ ذاتی ہیں اور جن لوگوں نے اس زمانے میں جین صاحب کے خلاف لکھا ہے ان میں بھی اکثریت ذہنی طور پر مسلم فرقہ پرستوں کی ہے اور جین صاحب کے خلاف لکھی گئی تحریروں کے آئینے میں خود ان کے خالق بھی علمی طور پر قلاش ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ اس کتاب سے متعلق یعنی اس کے خلاف بھی جو کچھ لکھا جا رہا ہے، ان تحریروں کی اکثریت کے دلائل کی بنیاد صرف شمس الرحمان فاروقی کا تبصرہ ہے۔

گیان چند کی اس کتاب میں علمی طور پر کچھ بھی قابلِ ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہ تو طے ہے کہ کتاب میں فرقہ پرستی جتنی بھی ہو، کام کی باتیں کم سے کم ہیں اور نئے حقائق تقریباً معدوم ہیں۔ ان حقائق سے، من مانے ڈھنگ سے، نتائج البتہ نئے اخذ کیے گئے ہیں۔ کتاب کے مصنف ہی نہیں، پیش لفظ تحریر فرمانے والے پروفیسر محمد حسن اور مقدمہ لکھنے والے کمال احمد صدیقی کا رویہ بھی نہایت سرسری قسم کا ہے۔ پروفیسر محمد حسن کے پیش لفظ کا مغز یہ ہے: "سرِ دست اپنے خیالات مختصراً زبان اور رسم الخط کے بارے میں لکھ کر آپ کو بھیج رہا ہوں" (ص 9) اور یہ ڈیڑھ صفحہ بھی کچھ اس انداز میں لکھا گیا ہے جیسے کوئی ریاستی وزیر کسی ہائی اسکول کی سالانہ میگزین کے اردو سیکشن کے لیے اپنا پیغام بھیجے۔

کمال احمد صدیقی نے بھی مقدمہ کچھ اس طرح لکھا جیسے کوئی قصباتی استاد طرح میں طویل غزل کہے اور شاگردوں کو اجازت دے دے کہ وہ پانچ پانچ سات سات اشعار اپنے لیے انتخاب کر لیں اور جو اشعار بچ جائیں انھیں استاد خود پڑھ دے۔ کمال احمد صدیقی نے چوں کہ طویل عمر پائی ہے یوں سینیئر ہیں اور چوں کہ طویل عرصے تک ریڈیو سے اُس دور میں وابستہ رہے، جس دور میں ریڈیو سے اپنا کلام اور نگارشات براڈ کاسٹ کرانے کے لیے بڑے بڑے اہلِ قلم ریڈیو کے حکام ہی نہیں معمولی براڈ کاسٹر تک کی خوشامد کرتے تھے یوں کمال احمد صدیقی صاحب بھی ہمارے تمام بڑے اہلِ قلم کے ہم عصر ہونے کا دعوا تکنیکی بنیادوں پر کر سکتے ہیں۔ سند میں وہ ان اکابرین کی دستی شہادتیں فراہم کرا سکتے ہیں جن میں کمال احمد صدیقی صاحب کے مبلغ علم اور عظمت کا اعتراف کیا گیا ہو۔ مگر اس مقدمہ نامی مضمون میں بہر حال کمال صاحب نے صرف گھاس کاٹی ہے۔ اور جب کتاب کے خلاف ہنگامہ ہوا تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے:

"...گیان چند جین صاحب امریکہ میں ہیں۔ انھوں نے پیغام بھجوایا کہ اردو زبان پر انھوں نے ضخیم کتاب لکھی ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ میں حقیر اس پر دیباچہ لکھوں۔ اور تفصیل سے لکھوں... جب حکم دیباچہ لکھ کر بھجوا دیا۔ حکم آیا کہ اس کو مختصر کر دوں۔ کتنا مختصر؟ چار یا پانچ صفحے۔ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کہلوا دیا کہ خلاصہ اور کسی سے کروالیں..."

(سہ ماہی اردو ادب بابت اپریل، مئی، جون، 2006 ص 53 میں ان کے خط کا عکس)

درست کہ الہامی تحریروں کے خالق کے لیے انھیں مختصر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر علم کے نام پر جھک مارنے کی ایسی مثالیں بھی صرف اردو ہی میں مل سکتی ہیں۔ 'اردو ادب' کے شمارے میں کمال صاحب کے اصل مقدمے کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ جس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا جاسکتا لہٰذا پتا چلنا مشکل ہے کہ انھوں نے واقعتاً جو لکھا تھا علمی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت کیا ہے۔

میں نے جین صاحب کی کتاب تین مرتبہ اس امید پر پڑھی کہ اس میں کہیں تو کوئی بات علمی انداز کی ہوگی مگر افسوس کہ پوری کتاب مصنف کے خیالات کا ایسا عکس معلوم ہوئی جس میں گالیاں بھی کسی علمی ترتیب اور articulation کے ساتھ نہیں دی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نریندر مودی ٹیپ ریکارڈر رکھ کر بیٹھ گیا اور مختلف مواقع پر جو زہر ذہن میں آیا اسے ریکارڈ کر دیا اور پھر اس کا transcript شائع کر دیا گیا۔

مصنف کے خیالات کا اصل مرکز وہ فرقہ وارانہ تعصب ہے جس کے بارے میں انھوں نے معمولی ذہن کے ایک عام فرقہ پرست ہندو کے طور پر جو سوچا اسے کوئی بڑا علمی کارنامہ سمجھ کر شائع کر دیا۔ آر ایس ایس کی مقامی شاکھاؤں میں شہر کے چند بنیوں اور کلرکوں کے ساتھ گیان چند جین جیسے لوگ عرصۂ دراز سے مفروضہ ہندو راشٹر کا سپنا دیکھتے رہے ہیں۔

چوں کہ مذکورہ کتاب کے مصنف نے 50 برس تک اردو ادب میں گھاس کاٹی ہے یوں ان جیسے ہی علما کو کہیں کہیں اس کتاب میں درج کی گئی معمولی اور مبہم باتوں میں تحقیقی حقائق مدفون معلوم ہو سکتے ہیں: "فورٹ ولیم کالج میں اردو، عربی، فارسی وغیرہ کے شعبے تھے۔ نہ تھا تو ہندی کا..."

گیان چند جین نے بین الاقوامی سطح پر فروغ پارہی مسلم دہشت گردی یا ہندستان میں ہی نت نئی شکلیں اختیار کر رہی اور دن دونی رات چوگنی کی رفتار سے ترقی کرتی مسلم فرقہ واریت یا ہندستان ہی میں اردو کے بدلتے ہوئے کردار اور اس کے اسلامائزیشن پر کہیں ایک جملہ بھی سنجیدگی اور تدبر کے ساتھ ایسا نہیں لکھا ہے جس میں فکر کی روشنی دکھائی دے۔ صحیح اور غلط کی بحث سے قطع نظر اسکولوں کی تعلیم کے نظام سے اردو کا صفایا اور دینی مدارس کے اردو کی واحد پناہ گاہ بن جانے کے بعد اردو زبان ہی نہیں بلکہ زوال آمادہ اردو ادب کا کردار بھی جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے، اس پر جین صاحب نے کچھ بھی نہیں سوچا ہے۔ کم از کم اس کتاب کے مطالعے سے ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ آزادی یا تقسیم سے پہلے ہندستان میں اردو پڑھنے اور پڑھانے والے ہندو کی نفسیات کو سمجھا جاسکتا ہے، اس کے فرقہ پرست ذہن کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے، 1980 کے بعد ہندو فرقہ واریت کے فیصلہ کن فروغ اور 90 کے دہے میں ہندستان میں مسلم شناخت کے سوال میں آئی شدت اور بعدہٗ بین الاقوامی سطح پر مسلم شدت پسندی کے تناظر میں اس ہندو (اور غیر مسلم بھی) ذہن کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے جسے 9/11 کے بعد ہر مسلمان دہشت گرد دکھائی دیتا ہے۔ افسوس یہ کتاب ایسے کسی زاویے پر غور کرنے میں ہماری مدد نہیں کرتی۔

آزادی کے بعد سے ہی ہندستان میں (خصوصاً شمالی ہند میں) وہ اردو اشراف جن کے حصے میں اردو کی ٹھیکے داری آئی تھی اور جو اب سکڑ کر یونی ورسٹیوں کے ان اردو شعبوں تک محدود ہو گئے ہیں، شمس الرحمان فاروقی کے خیال میں جہلا کی چوتھی نسل کے نمائندے ہیں۔ فاروقی صاحب نے یہ بات 1993 میں کہی تھی جس کے بعد وہ نسل بھی اب رختِ سفر باندھ چکی ہے یا باندھنے کو تیار ہے۔ فاروقی صاحب کے تجزیے کے مطابق گیان چند کی نسل اردو شعبوں میں بھرتی کی گئی جہلا کی نسلِ اول تھی۔ چوتھی اور موجودہ نسل تک گیان چند جین کے شاگردوں ہی نہیں بلکہ اس نفسیات کا تسلسل بھی جاری ہے جس کا تقسیمِ ہند سے سابقہ پڑا اور جس کے سر پر اردو کی چودھراہٹ کی پگڑی تو باندھ دی گئی مگر جسے سیاست کی کوئی سمجھ نہ تھی۔

اللہ کے ان نیک بندوں نے تقسیم سے قبل اردو پڑھ لینے والے پانچ سات ہندوؤں کے اسمائے گرامی کی قصیدہ خوانی کر کے خوب اپنی روٹیاں سینکیں۔ آنکھ بند کر کے یہ بیان بھی دیے کہ ہندستان میں اردو کی حفاظت ہندو خصوصاً وہ غیر مسلم حضرات کریں گے جو پاکستان سے نقلِ مکان کر کے ہندستان آئے ہیں۔ بے ضرر بے خبر قسم کے ان یونی ورسٹی اساتذہ میں کچھ کے ہاتھ میں اندر کمار گجرال کا گلا آگیا تھا جس میں اپنی انفعالیت کے موتیوں سے پروئے ہوئے ہار وہ ڈالتے رہے اور پڑھے بغیر گجرال کمیٹی رپورٹ زندہ باد کے نعروں میں مگن رہے، تو کچھ آنند نرائن ملا کے ایک بیان "میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں اپنی زبان نہیں" کا کلمہ پڑھتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ آنند نرائن ملا کی اولادیں اپنے مذہب پر تو قائم رہیں لیکن ان کی زبان بدل چکی ہے۔ یہ تو خیر تخیل کی باتیں تھیں۔ زمین کی سطح پر اردو

دینی مدارس میں پناہ گزیں ہوتی رہی اور اردو ادب میں موجود ہندو فطری طور پر اس اسلامی شدت پسندی سے hostile ہوئے۔ جس میں لبرل سرکاری مسلمان (آزادی کے بعد سرکاری مسلمان ہونے کے لیے مخصوص انداز کا اسلامی لبرل ازم بھی ضروری تھا) ایسے فتوے دے رہا تھا:

"...میں نے موجودہ زمانے میں خلقیہ اسلامی (مراد اردو۔اف) سے قریب جن چند ہندو بزرگوں اور دوستوں کو پایا ہے، ان میں پنڈت آنند نرائن ملا، جناب مالک رام، جگن ناتھ آزاد صاحب، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام سرفہرست ہیں۔ اور ڈاکٹر گیان چند جین اردو کے بڑے محقق ہونے کے باوجود میری اس فہرست سے خارج ہیں لیکن مجھے آج مسلمانوں میں ایک بھی صاحب قلم ایسا نظر نہیں آتا جو ہندو خلقیے میں رچ بس گیا ہو۔" (دود سو، ص 295)

یہ جہالت آمیز حماقت اور مسلم فرقہ پرستی دونوں کی حد ہے۔ اور گیان چند کی موجودہ کتاب کا محرک اردو کے مسلم اشراف کا یہی جہالت آمیز اور حماقت بھرا رویہ ہے۔

کتاب پر شمس الرحمان فاروقی کے تبصرے کے بعد گیان چند نے تحریک چلائی کہ ان کی کتاب میں ختم کلام کے تین صفحات 282 تا 284 ان تمام رسائل میں جرائد میں ضرور شائع ہوں جہاں جہاں فاروقی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ جین صاحب کا یہ کہنا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے منھ سے گندگی ضرور کھائی ہے مگر میرے پاؤں اس میں نہیں سنے۔ اس قسم کی باتیں فرقہ پرست اناڑی قصباتی سیاست داں کرتے ہیں۔ ان تین صفحات میں جین صاحب نے اپنے خاندان کے اس 'خلقیے' کی بات کی ہے جس کی روایت فارسی/اردو/مسلم ہے۔ ان صفحات میں اسی منافقت کی لہریں موجزن ہیں جو اشراف کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔

جین صاحب کی یونی ورسٹی اور کالج کے اردو شعبوں سے وابستگی پچاس برس کو محیط ہے یوں بر سر کار اساتذہ کی اکثریت سے ان کا دوستی یا دشمنی کا براہ راست یا بالواسطہ رشتہ ضرور ہے۔ اس لیے اس کتاب پر اردو اشراف خصوصاً یونی ورسٹی کے مسلم اردو اساتذہ نے اپنے ردعمل کا اظہار اپنی روایتی منافقت سے کیا۔ گیان چند جین کے خلاف یونی ورسٹیوں میں درس و تدریس سے وابستہ حضرات کی تحریروں کی ابتدا ان کی عظمت کے قصیدوں سے ہوئی اور اختتام اس دعا پر کہ اللہ انھیں ہدایت دے اور وہ اپنے گناہ کا کفارہ کچھ اور نہیں تو بس اس طرح کر لیں کہ آئندہ ان کی ایسی کوئی تحریر شائع نہ ہو۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو شتر مرغ کی طرح ریت میں گردن دبا کر سوچتی ہے کہ خطرہ ٹل گیا۔

کسی زبان کی تاریخ کتنی ہی عظیم ہو (اردو کی طرح) یا کتنی ہی کم مایہ ہو (اردو والوں کے بہ قول جدید ہندی کے ماضی کی طرح) مگر زبانیں اپنے حال میں جیتی ہیں۔ کسی زبان کے ماضی کی عظیم وراثت اس صورت میں کسی کام نہیں آسکتی جب زمانہ حال میں اس زبان کا ہمہ جہتی فروغ رک گیا ہو اور اس کے نام نہاد ادب کے پرستار اشراف اردو کے موجودہ شیدائیوں کی طرح یونی ورسٹیوں کے اردو شعبوں تک محدود ہو گئے ہوں۔ اس تناظر میں نام نہاد ادب تک محدود ہو جانے والی ہمارے زمانے کی اردو کا مقدر سنسکرت سے مختلف نہیں ہوگا۔ اور جو اردو زندہ رہے گی اور جس کا ہمہ جہتی فروغ ہو رہا ہے وہ اس اسلامی ادب کے مطالعے کی زبان ہے جس کے ماننے والے روز بہ روز بین الاقوامی حالات کے تحت مذہبی شدت پسندی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔

فروعی بحثوں میں مبتلا رہنے والے ان اردو اشراف کی خدمت میں جو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے بجائے گذشتہ ساٹھ برسوں سے اپنا کام دوسروں سے کرانے کے ہنر میں ید طولیٰ حاصل کر چکے ہیں، میری صرف اتنی درخواست ہے کہ آئندہ ان میں ہر آدمی اگر ساٹھ گھنٹے اپنے بچوں کی تدریس پر صرف کرے تو ہندستان میں اردو کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔ شمس الرحمان فاروقی صاحب کی عظمت کے ہم سب معترف ہیں مگر اس کتاب پر فاروقی صاحب کا تبصرہ پڑھ کر بغلیں بجانے والے حضرات سے میرا یہ التماس ہے کہ جس جوش سے آپ نے ان کا یہ تبصرہ پڑھا اور تن من اور سرکاری دھن (براہ راست یا بالواسطہ) سے اس کی تبلیغ کی، اسی جذبے سے فاروقی صاحب کا اتباع بھی کریں کہ اپنے بچوں کو اسی طرح اردو پڑھائیں جس طرح فاروقی صاحب نے پڑھائی ہے۔ جب تک اسکول اردو پڑھانے کو تیار نہیں تب تک آپ خود وقت نکالیں اور ایسے دوسرے کئی فضول کام چھوڑ کر جو آپ عبادت کی طرح کرتے ہیں، اس مصرف کے لیے کچھ وقت کی قربانی دیں۔ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ فاروقی صاحب کے بچے اور ان کے بھی بچے بہت اچھے انگریزی اسکولوں میں پڑھے ہیں۔ یہ لوگ آپ کی طرح اردو نہیں بیچتے مگر تحریری اردو (اور فارسی) کی ان کی اتنی استعداد ہے کہ وہ غالب اور میر پر وہ تمام پیچیدہ علمی تحریریں پڑھ سکتے ہیں، انھیں ہم آپ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں جو فاروقی صاحب نے لکھی ہیں۔ خدا کرے آپ میں سے کچھ لوگ جذباتیت اور شخصی مفادات سے اوپر اٹھ کر اس بارے میں سوچیں اور اپنے حصہ کا وہ کام کریں جس کی ضرورت ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے تبصرے کے بعد گیان چند جین کے خلاف کچھ لکھنے کی ضرورت آپ میں سے کسی کو نہیں اور اردو دنیا میں کسی نے کوئی کام کی بات لکھی بھی نہیں ہے۔ کم سے کم میں نے اس کتاب پر کوئی فکر انگیز تحریر اب تک نہیں پڑھی۔ OO

تنازعے کے دیگر پہلو

کتاب پر فرقہ پرستی

ساجد رشید

اردو کے سب سے معتبر اور معزز تسلیم کیے جانے والے محقق و ناقد گیان چند جین اپنی آخری کتاب 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب' کی اشاعت کے فوراً بعد اردو کی سب سے ناپسندیدہ ہی نہیں مطعون شخصیت بن چکے ہیں۔ بلاشبہ گیان چند جین کی متذکرہ کتاب مسلمانوں کے لیے بے حد دل آزار ہے، کیوں کہ انہوں نے اپنی اس کتاب میں ایسی باتوں اور ایسی کتابوں کے حوالے دیے ہیں کہ جن پر اب تک بالکل توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ جین کی کتاب پر عام اردو قاری میں اتنا شدید ردعمل نہ ہوا ہوتا اگر شمس الرحمان فاروقی نے اس کتاب پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ کر شب خون کے علاوہ مختلف رسائل میں اشاعت کے لیے نہ دیا ہوتا۔ اور شاید میں بھی یہ مضمون نہ لکھتا اگر میں نے بھی فاروقی کا تبصرہ نہ پڑھا ہوتا... اس تبصرے کو پڑھنے کے بعد جو سب سے پہلا تاثر قایم ہوتا ہے وہ یہ کہ جین نے اردو قوم کے خلاف زہر افشانی کی ہے اور انہوں نے عمر کی آخری منزل میں پہنچ کر اسی تھالی میں چھید کر دیا ہے جس میں وہ تاعمر کھاتے رہے۔ بس پھر کیا تھا جین کی کتاب کے خلاف اور فاروقی کے تبصرے کے حق میں مضامین اور خطوط اخبارات اور رسائل میں چھپنے لگے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالے اردو ادب نے تو (شمارہ نمبر 332) کا ایک تنقیدی گوشہ جین کی متذکرہ کتاب کے لیے وقف کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جین کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ہی ان کے خلاف ایسا ماحول تیار کر دیا گیا ہے گویا جین نے اسلام پر حملہ کر دیا ہو اور فاروقی نے حقانیت کا دفاع کیا ہو۔

فاروقی کے تبصرے نے مجھے بھی پریشان کر دیا تھا اور میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ وہ اردو زبان جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کی سب سے روشن مثال مانتے ہیں اس کے اسلاف پر ایک ایسا محقق کیچڑ اچھال رہا ہے جسے اسی زبان نے عزت اور شہرت عطا کی۔ میں نے اپنی اس پریشانی کا ذکر فون پر اردو کے ایک ایسے ناقد سے کیا جو اردو بھاشی نہیں ہیں لیکن اپنے بے باک تنقیدی مضامین کے لیے اردو تنقید میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بزرگانہ مشورہ دیا کہ میں پہلے کتاب کا مطالعہ کروں اور یہ بھی ملحوظ رکھوں کے مبصر کا مذہبی بیک گراؤنڈ کیا ہے نیز صاحب کتاب کا اپنا مذہبی رجحان کیا ہے۔ مجھے یہ بات معقول معلوم ہوئی اور میں نے جین کی کتاب 'ایک بھاشا دو لکھاوٹ دو ادب' کو بڑی توجہ سے پڑھا۔ اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ کتاب کے مصنف اور کتاب کے مبصر دونوں دو متضاد مذہبی اور تہذیبی mindset کے حامل ہیں۔ گیان چند جین اگرچہ دھارمک جینی نہیں ہیں لیکن وہ تہذیبی سطح پر اپنی مذہبی اقدار سے پوری طرح وابستہ ہیں۔ فاروقی مذہبی بھی ہیں اور ان کی ابتدائی ذہنی نشو و نما قدامت پسند مذہبی ماحول میں ہوئی ہے۔ (اس کا اعتراف انہوں نے اپنی کتاب 'شعر غیر شعر اور نثر' کے دیباچے میں کیا ہے) البتہ جین ایسی کسی بات کا اعتراف نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی اسی کتاب میں جب اپنے مذہبی عقیدے کا ذکر کرتے ہیں تو بڑی حد تک agnostic نظر آتے ہیں لیکن ہندو اور جین عقیدے کے لیے ان کے یہاں عقیدت چھپائے نہیں چھپتی۔

پہلے یہ وضاحت کر دوں کہ میں تحقیق اور لسانیات کا طالب علم نہیں ہوں اور متذکرہ کتاب میں اردو کے بارے میں جو لسانی اور تحقیقی بحث کی گئی ہے اس سے مجھے بھی اسی طرح بحث نہیں ہے، جس طرح فاروقی نے اپنے تبصرے میں اس ضروری موضوع پر اپنی علمی لیاقت کے باوجود بحث نہیں کی ہے۔ فاروقی نے ان نکات پر ہی گفتگو کی ہے جو کتاب میں مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ میں اس متنازعہ موضوع کو نہ چھوتا اگر فاروقی کے تبصرے کے بعد پورے اردو معاشرے میں جین کی کتاب کے مطالعے کے بغیر ہی انہیں 'غدار اردو اور متعصب ہندو' قرار نہ دیا گیا ہوتا۔ یہ اتنا ہی خطرناک رویہ ہے جتنا جارج ڈبلیو بش کا یہ رویہ جو اس نے نائن الیون کے بعد یہ کہہ کر اختیار کیا تھا کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں ہے وہ 'ان' کے ساتھ ہے۔"

اردو معاشرے کا یہ انداز فکر اگر اردو کے غیر مسلم ادیبوں میں خود کے alien ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے ہمارا اردو معاشرہ ہی ذمے دار ہوگا۔ جین کی کتاب میں بشمول تمہید، سولہ ابواب ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن کا ڈیڑھ صفحے کا مختصر سا پیش لفظ اور کمال احمد صدیقی کا 6 صفحوں کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ جین نے 31 صفحات کی تمہید میں زبان کے حوالے سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کو ہندو مسلم تنازعے کی روشنی میں دیکھنے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بہت صاف لفظوں میں اپنا عندیہ ظاہر کر دیا ہے کہ ”ہندستان میں اہل اردو کے دو واضح زمرے ہیں: ایک مسلمانوں کا دوسرا ہندوؤں کا۔ مجھے پہلے مسلمانوں کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ بڑا ذکی الحس موضوع ہے۔ اور میں سیاست دانوں کی احتیاط سے نابلد ہوں۔ بالکل کھلی کتاب ہوں۔“ (ص: 24) اس طرح سے انہوں نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ وہ جو کچھ پیش کرنے جا رہے ہیں اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہیں رکھنے والے ہیں۔

اسی تمہید میں جین نے اپنے ہم عصروں اور دوستوں اور شاگردوں کے ایسے بیانات بھی درج کر دیے ہیں جن سے اردو کے ہندو ادیبوں کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ فاروقی، شمیم حنفی اور اسلم پرویز نے اپنے ترکش کے سارے تیر تمہید اور کتاب کے انتساب پر خرچ کر ڈالے ہیں۔ فاروقی نے اپنے تئیں اعتدال میں رہ کر بحث کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن شمیم حنفی کو فاروقی کی یہی بات بہت ناگوار گذری ہے۔ وہ اردو ادب میں لکھتے ہیں ”ہر چند کہ فاروقی صاحب کی طبعی سخاوت اور شخصی معاملات میں چشم پوشی کا عنصر بھی اس تبصرے سے کہیں کہیں صاف جھلکتا ہے۔“ (ص: 85) حنفی شاید فاروقی کی جانب سے جین کے ساتھ سخت سلوک کے متمنی تھے۔ فاروقی نے شب خون کے آٹھ صفحوں کے تبصرے میں تین صفحے کتاب کی تمہید کے رد میں لکھے ہیں باقی کے آٹھ صفحات میں انہوں نے، کتاب کے سولہ ابواب میں سے صرف چار ابواب (تیسرے، ساتویں، دسویں اور گیارہویں) پر ہی بحث کی ہے۔ یہ وہ ابواب ہیں جنہیں اردو ہندی تنازعہ بنام پاکستان اور بنام ہندو بھی کہا جا سکتا ہے۔ فاروقی اور حنفی نے کتاب کے دیگر ابواب پر ایک لفظ بھی کیوں نہ لکھا؟ کیا وہ ان پر جین سے متفق ہیں؟ یا انہیں صرف انتساب اور تمہید ہی کی رد میں لکھنا مقصود تھا!

اگر فاروقی کے تبصرے اور سہ ماہی اردو ادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو فوراً ہی یہ ماجرا عیاں ہو جاتا ہے فاضل مبصروں کا نشانہ جین کی کتاب کم اور اصل نشانہ تو کوئی اور ہے۔ دراصل جین کی کتاب پر اتنا واویلا کبھی نہ ہوتا اگر انہوں نے یہ کتاب گوپی چند نارنگ کے نام انتساب نہ کی ہوتی... جین نے کتاب نارنگ اور امرت رائے کے نام جن القاب کے ساتھ معنون کی ہے وہ سچ مچ بڑی بچکانہ تحریر ہے۔ جین انتساب کے طور پر اگر صرف امرت رائے اور نارنگ کا نام ہی لکھ دیتے تو کافی تھا۔ فاروقی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ امرت رائے کی کتاب پر اردو میں کوئی خاص ردعمل نہیں ہوا تھا اس لیے جین کا انہیں دشمنان ہندی کا معتوب اول لکھنا ہی غلط تھا۔ نارنگ کے نام کے ساتھ انہوں نے پدم بھوشن اور ساہتیہ اکادمی کی چیئرمینی کو جس طرح رقم کیا ہے اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ جین پدم بھوشن جیسی سرکاری پدوی اور ساہتیہ اکادمی کی صدارت کو کوئی بہت بڑا اعزاز سمجھتے ہیں... کیا انہیں نہیں پتہ پدم شری یا پدم بھوشن جیسے اعزازات عام طور پر سیاسی مصلحتوں کے نتیجے میں تفویض کیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وزیر اعظم واجپائی کے گھٹنے کا آپریشن کرنے والے ڈاکٹر تک کو وزیر اعظم نے کسی فیاض بادشاہ کی طرح اپنے گلے کے ہار کی طرح پدم بھوشن کا اعزاز عنایت کر دیا تھا۔ لہٰذا ایسے سرکاری اعزاز کی اب کوئی وقعت نہیں رہی ہے... نارنگ نے اردو ادب میں جتنا غیر معمولی کام کیا ہے اس کے بعد ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے سرکاری اعزازات نہیں بلکہ ان کی کتابیں ہی کافی ہیں...

شمیم حنفی نے 'اردو ادب' میں جین کی کتاب اور بالخصوص ان کی تمہید پر جو مضمون تحریر کیا ہے وہ بغض و عناد کا بدترین نمونہ ہے۔ حنفی نے تو جین کی کتاب کو فسطائیت کا لسانی اور ادبی محاذ (مضمون کا عنوان یہی ہے) کہا ہے انہوں نے اس کتاب کو بی جے پی کی سابقہ حکومت کے وزیر انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے خفیہ ایجنڈے کا حصہ بتایا ہے اور یہ انکشاف بھی فرمایا ہے کہ اگر انتخابات میں بی جے پی کو شکست نہ ہوئی ہوتی تو یہ کتاب ساہتیہ اکادمی یا قومی اردو کونسل سے شائع ہوتی۔ اس طرح حنفی، نارنگ کا نام لیے بغیر قاری کی توجہ نارنگ کی طرف دلانا چاہتے ہیں (کیونکہ ان دنوں نارنگ قومی کونسل کے نائب صدر تھے اور ساہتیہ اکادمی کے صدر بھی منتخب ہو چکے تھے۔) شمیم حنفی تنقید کے ایسے کنفیوزڈ پہلوان ہیں جو ہمیشہ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے اپنا لنگوٹ گھر بھول آتا ہے اور اپنے حریف پر اس احتیاط کے ساتھ حملہ کرتا ہے کہ ستر بھی چھپا رہے اور حریف کو پچھاڑ بھی دے۔ حنفی نارنگ کا نام لے کر صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ نارنگ نے ہی ڈاکٹر جوشی کے مبینہ خفیہ ایجنڈے کے تحت جین سے یہ کتاب لکھوائی ہے۔ متذکرہ مضمون میں حنفی نارنگ کی مخالفت میں اپنی سطح سے بہت نیچے آ کر یہاں تک لکھ گیے ہیں کہ ”انہیں (جین کو) اپنی صلاحیت، منصب، اور خدمات کا صلہ اور معاوضہ کسی بھی سطح پر کم نہیں ملا۔ انعامات، اعزازات، منصب، اعترافات تعریف و تحسین کے ڈونگرے۔ آخر کہاں کوئی کمی دکھائی دیتی ہے؟ ایسی صورت میں جین صاحب کی اس کتاب کا منصۂ شہود پر نمودار ہونا ہمیں اس وہم کی طرف لے جاتا ہے کہ ہو نہ ہو، ان کی اس خدمت (کارنامے) کے ڈانڈے کسی نہ کسی طور پر اس فرقہ پرستی سے جا ملتے ہیں جس کا ایک نتیجہ 2002 کا

گجرات تھا۔" (ص 90) ملحوظ رہے اپنے اس مضمون میں حنفی نے بار بار ہندو فسطائیت بی جے پی اور گجرات کے فسادات کا ذکر کیا ہے۔ حنفی کو میں اس لیے بھی کنفیوزڈ مانتا ہوں کہ انہیں ایک طرف جین کی کتاب (جو ایسے تاریخی حوالوں سے بھری ہے جن سے ہمیں اتفاق نہ کرنے کا پورا حق ہے) کے ڈانڈے ہندو فرقہ پرستی سے ملانے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا ہے لیکن انہوں نے اپنے انتہائی پسندیدہ ہندی کے افسانہ نگار نرمل ورما کے اس بیان کے بارے میں آج تک مذمت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا، جو انہوں نے گجرات کے فسادات کو منصفانہ ٹھہرانے کے لیے دیا تھا۔ نرمل ورما نے اس میمورنڈم پر دستخط کرنے سے صاف منع کر دیا تھا جو گجرات کے فسادات کی مذمت میں دہلی کے فرقہ پرستی مخالف تنظیم نے تیار کیا تھا جس پر سو سے زائد دانش وروں نے دستخط کیے تھے۔ (اردو والوں میں سید محمد عقیل، شمس الرحمان فاروقی علی احمد فاطمی اور جعفر رضا کے نام اہم ہیں) نرمل ورما اتفاق سے اردو کے بیش تر جدیدیوں کے محبوب افسانہ نگار ہیں کیونکہ جدیدیت، ادب اور ادیب کو جس طرح کا غیر سیاسی اور غیر سماجی جانور بنانے کے حق میں تھی نرمل ورما کا ادب اس کے اس موقف کو پورا کرتا تھا۔ یہ نرمل ورما ہی تھے جنہوں نے اپنے مختلف مضامین اور انٹرویوز میں ہندستانی تہذیبی جڑوں کی بازیافت کو ادب کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔ سارا ہندی سماج جانتا ہے کہ نرمل کی تہذیبی جڑیں سنگھ پریوار کے ہندوتو سے جا ملتی ہیں۔ گجرات کے فسادات کے بعد وہ کھل کر مودی اور بی جے پی کے دفاع میں آگیے تھے۔ نتیجے میں وہ ارباب اقتدار کے قریب تو ہوئے لیکن پورے ہندی جگت نے ان کی سخت لفظوں میں مذمت کی تھی اور انہیں تنہا کر دیا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں ہے کہ ہندی ہی نہیں ہندووں میں ایک طبقہ پوری قوت کے ساتھ اپنے اندر کے انتہا پسندوں سے لوہا لیتا ہے افسوس کہ اردو اور مسلمانوں میں ایسے افراد انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں۔ میں شمیم حنفی کو ایک کنفیوزڈ ناقد اس لیے بھی مانتا ہوں کہ وہ مضامین تو لکھیں گے بلیک لٹریچر اور تیسری دنیا کے ادب پر لیکن اردو میں ان کے پسندیدہ ادیب صرف مہمل نگار ماضی پرست ہی ہیں۔ کیا یہ فکر کا تضاد نہیں ہے۔

جین کی کتاب کو خالص فرقہ وارانہ رنگ دینے کی سب سے مذموم کوشش ماہنامہ شاعر کے مدیر افتخار امام صدیقی نے کی ہے۔ شاعر (اگست 2006) میں جین کی کتاب کے مواد پر نہیں ان کی شخصیت پر افتخار کے ذاتی قیاسات پر مبنی اشتعال انگیز تبصرے کے یہ اقتباس دیکھیے:

• حالاں کہ (جین نے) ایک محقق کی طرح حوالے بھی دیے ہیں لیکن تمام تر لوازمہ ایسا ہے گویا ممبئی کا ورلی گٹر (ممبئی شہر کی ساری گندگی ورلی گٹر سے ہو کر سمندر میں جاتی ہے۔ س ر) (ص 48) • جین صاحب کی نفرت نامہ کتابیں تو ردی میں فروخت کرنے یا بچوں کا بول و براز صاف کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں...(ایضاً) • اگر آپ نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے تو خدا کے لئے ہاتھ بھی نہ لگایئے ورنہ ناپاک ہوں گے الگ اور تعفن پورے وجود میں سڑاند بن جائے گا۔ نفرت کی دیمک آپ کو بھی چاٹ جائے گی اور پھر ہوش میں جوش بھر جائے گا اور آپ کا ہاتھ ریوالور یا رام پوری چھرے یا چاقو پر چلا جائے گا تب آپ کا انجام بالخیر نہیں بلکہ بالشر ہوگا (ایضاً) • اب تو پوری دنیا اس پاگل بوڑھے پر تھو تھو کر رہی ہے (ص 49) • اس کتاب کی اشاعت موجودہ مخلوط سیاسی حکومت میں ہی ممکن ہو سکی جہاں کمیونسٹ غالب ہیں اور پورے ملک میں لا مذہبیت کا ماحول چھایا ہوا ہے۔ ایسے میں اردو اور مسلمانوں کے خلاف کسی بھی طرح کا زہر اگلا جا سکتا ہے۔ (ص 8)

شاعر اردو کا قدیم ادبی رسالہ ہے جس کی اپنی ایک صحت مند ادبی روایت رہی ہے۔ جین کے لئے ان کی کتاب کے تعلق سے جس طرح کی زبان کا استعمال کیا گیا اس کا موازنہ صرف پروین توگڑیا کی بھاشا سے کیا جا سکتا ہے۔ جین کی دماغی حالت پر شک کرنے والے مدیر شاعر کو خود اپنے دماغ کی حالت کے بارے میں کسی دماغی امراض کے ماہر سے رائے لینی چاہئے۔ کیوں کہ وہ جن کمیونسٹوں کو کوس رہے ہیں یہ وہی کمیونسٹ ہیں جو بابری مسجد کے انہدام سے لے کر گجرات کے فسادات تک کی قانونی و سیاسی جنگ سڑک سے لے کر سنسد تک اور پھر عدالت تک لڑ رہے ہیں۔ یہ کمیونسٹ پارٹیاں ہی تھیں جنہوں نے بی جے پی کی قیادت والی باجپائی سرکار میں تاریخ اور تعلیم کے بھگوا کرن کے خلاف متعدد بار پارلیمنٹ کی کارروائی کو چلنے سے روکا۔ کمیونسٹ پارٹیوں سے ہزار اختلاف کے باوجود مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں اقلیتوں اور انسانی حقوق کے لئے جس بے جگری سے وہ ہندو فرقہ پرستوں سے مقابلہ کر رہے ہیں ہندوستان کی کوئی سیاسی جماعت ان کے ہم پلہ نہیں ہے۔ کوئی سیکولرزم دشمن ہی کمیونسٹوں کی اس ایمان داری پر شک کر سکتا ہے۔

میں جین کی کتاب کے دفاع میں یا فاروقی اور حنفی کے تبصرے کے خلاف بحث میں نہیں کودا ہوں۔ میرا اعتراض تو صرف اس رویے پر ہے کہ اگر مسلم فاتحین اور مسلم حملہ آوروں پر کوئی تنقید کرتا ہے یا انہیں مطعون قرار دیتا ہے تو بحیثیت مسلمان، ہم حملہ آوروں یا فاتحین کو اپنے اسلاف اور ان کے ناقد کو اسلام کا دشمن کیوں سمجھ لیتے ہیں؟ (کیا سچ مچ یہ منگول، مغل اور ترک فاتحین ہمارے اسلاف تھے یا وہ صوفیائے کرام اور ان کے تابعین ہمارے اسلاف ہیں جن کے حسن سلوک اور عملی اسلامی مساوات نے یہاں کے پسماندہ طبقات کو حلقہ بگوش اسلام کیا تھا!) امرت رائے نے مسلم فاتحین کو تہذیب اور زبان کو مٹانے کا قصوروار ٹھہرایا ہے تو یہ اگر کلیہ نہیں ہے تو پوری طرح غلط بھی

نہیں ہے۔ ایران کی مثال کو ہم کس دلیل کے تحت مسترد کر سکیں گے۔ زرتشت کے ماننے والوں کو مسلم فاتحین کے جبر نے ہی تو ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کیا تھا۔ فلسطینیوں کی بے وطنی کے لیے تو ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لیکن زرتشت کے آتش پرستوں کی دربدری اور ان کے کلچر کا مٹا دیا جانا ہمارے لیے کوئی دردناک واقعہ کیوں نہیں ہے! جزیہ اور ذمی جیسی قانونی شقیں مسلم حکمرانوں نے ہی تو وضع کی تھیں۔ ان کا کتنا منفی اثر غیر مسلمانوں پر ہوا ہے اس کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو صرف انسانی قدروں میں یقین رکھتا ہے اور وہ لوگ تو کبھی نہیں کر سکتے جو کسی فرقے کے وکیل دفاع ہیں۔ مشہور مورخ ٹوائن بی نے بھی A Study Of History میں لکھا ہے کہ فاتحین نے ہمیشہ مفتوح قوموں پر اپنی زبان اور تہذیب مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاتحین کے اثرات سے صرف وہی تہذیبیں محفوظ رہیں جن کے یہاں زبردست قوت مدافعت تھی۔ جین نے اپنی کتاب میں ستیہ پال آنند کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے پاکستان کی تاریخ کی درسی کتابوں میں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ ''ہندستان میں اسلام کے آنے سے پیشتر یہاں کے باشندے جاہل اور غیر مہذب تھے۔ محبوب صدا نے پاکستان کے اسکولی نصاب کی تفصیل دی ہے۔ اس میں اسلام کی ستائش اور غیر مسلموں کی جھوٹی ہجو کے سوا کچھ نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ نصاب طالبان نے تیار کیا ہے۔'' جین نے اس کے بعد یہ بڑا مضحکہ خیز تبصرہ کیا ہے کہ ''ہندستان کے مسلمان طلبا اور اساتذہ کا اہل پاکستان سے کافی رابطہ رہتا ہے اپنے عزیزوں سے ملنے ملانے کے لیے۔ ان پر پاکستان کے طرز نصاب کا اور تعلیم کا اثر ضرور پڑتا ہوگا۔'' فاروقی نے جین کے اس احمقانہ تبصرے پر صحیح گرفت کی ہے کہ ''پاکستان کے لیے عموماً ایک ماہ کا ویزا ملتا ہے اور ہندستان سے پاکستان جانے والے زیادہ تر سن رسیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ نئی نسل نے تو وہاں کے اپنے اعزا کو دیکھا بھی نہیں ہے۔'' یہاں تک تو فاروقی بالکل درست ہیں لیکن ان کی یہ دلیل گلے سے نہیں اترتی کہ ''وہاں یہ سن رسیدہ یا نو عمر (اگر کوئی ہوں) ایک ماہ میں نہ تو اسکول میں کچھ پڑھ سکتے ہیں اور نہ پڑھا سکتے ہیں پھر ان پر پاکستان کا زہریلا اثر کہاں سے اور کتنا پڑے گا۔''

ہر شخص اپنی ترجیحات کے مطابق چیزوں کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ مثلاً ستیہ پال کو وہاں کی نصابی تاریخ کو دیکھنا تھا سو وہ انہوں نے حاصل کر لی۔ گذشتہ سال ایک ادبی اور ثقافتی وفد کے ساتھ میں بھی دو ہفتے کے لیے پاکستان گیا تھا اور میں نے بھی وہاں پر سب سے پہلے نصابی تاریخ ہی کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ پاکستانی نصابی تاریخ کوئی گم شدہ گنجینہ نہیں ہے جس کی تلاش کے لیے برسوں درکار ہوں۔ اسی سفر میں مجھے جہاں دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کے مشن کی کامیابی کے لیے لوگ دعا گو ملے وہیں ایک ایسے مشہور پاکستانی ناقد بھی ملے جو بنگلہ دیش کے حوالے سے ہندستان کی نیت پر شک وشبہے کا اظہار اتنے تلخ لہجے میں کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوستی اور اعتماد کو قایم کرنے کے اس مشن کے سخت خلاف ہوں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ ہندستان نے 1971 میں جو کیا اسے کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ بقول ان کے دوستی کی یہ فضا مصنوعی اور دونوں ملکوں کے ادب اور کلچر کے نمائندوں کے خیر سگالی دورے بے معنی ہیں۔ ہندستان ماضی میں اعتماد شکنی کر چکا ہے اس لیے اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ گفتگو اسلام آباد میں ایک سرکاری ثقافتی ادارے کے صدر جو اردو کے بے حد مقبول شاعر ہیں، کے دفتر میں میرے علاوہ دو ہندستانی شاعروں کی موجودگی میں ہو رہی تھی۔ ان صاحب کی باتیں جب میری برداشت سے باہر ہو گئیں تو مجھے اتنے ہی تلخ لہجے میں کہنا پڑا کہ ''بنگلہ دیش کے قیام سے قبل ہمارے آپ کے تعلقات دوستانہ نہیں دشمنانہ تھے۔ لہذا ہماری طرف سے اعتماد شکنی کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ آپ جمہوریت کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ ایک منتخبہ پارٹی کو آپ نے اقتدار منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں کچلنے پر اتر آئے تو آپ کے خلاف بغاوت تو مشرقی پاکستان کے عوام نے کی اور جب وہ ہماری سرحدوں کو پار کر کے ملک میں داخل ہونے لگے تو ہمارے ملک نے بھی موقعے کا فائدہ اٹھایا۔ اس میں اعتماد شکنی کہاں سے آ گئی۔'' میرا یہ لہجہ ناقد صاحب کے لیے شاید غیر متوقع تھا۔ وہ ہکا بکا سے مجھے تکنے لگے۔ معاملے کو بگڑتا دیکھ کر مقبول شاعر نے گفتگو کا رخ بدل دیا... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں ہوائی تو نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ تو سنیے وہ مقبول شاعر احمد فراز تھے۔ ہندستانی شعرا تھے شہریار اور ش ک نظام۔ پاکستانی نقاد کا نام ہے فتح محمد ملک! اگر ستیہ پال آنند کے ساتھ ایسا ہی کوئی معاملہ پیش آیا ہوگا تو ان کے تاثرات کیا اردو کے مسلم ادیبوں سے قطعی مختلف نہیں ہوں گے؟

جس طرح جین نے تمہید میں خلط مبحث سے کام لے کر blunder کیے ہیں فاروقی نے بھی اپنے تبصرے میں غیر منطقی دلیلوں کے ساتھ اسی رویے کی پیروی کی ہے۔ جین نے اختر حسین رائے پوری کے شکنتلا کے ترجمے کو اصل تخلیق کی حقیقی روح کو نظر انداز کیے جانے پر مایوس کن قرار دیا ہے تو فاروقی کو اس میں بھی جین کی نیت مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شکنتلا کا یہ ترجمہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ شکنتلا کا کہنا، للہ مجھے بچاؤ، للہ اٹھو، امی جان ابا جان، باندی کے لیے مغلانی، یگیہ شالہ کے لیے قربان گاہ، راجہ دشینت کا یہ کہنا دشینت کے بعد کون، فاتحہ پڑھے گا۔ یہ چند مثالیں میں نے جین کی کتاب سے اختر حسین رائے پوری کے ترجمے کے بچکانہ پن کو ظاہر کرنے کے لیے نقل کی ہیں۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ طلسم ہوش ربا کا کوئی ہندی ترجمہ ہو اور اس میں پتا شری، بھراتا شری، ماتا شری جیسے تخاطب ہوں اور عمرو عیار یہ کہے کہ میری موت کے

بعد میری چتا کو کون اگنی دے گا؟ یا بے شری رام مجھے بچاؤ۔ میں سمجھتا ہوں اس طرح کے ترجمے پر سخت اعتراض فاروقی ہی کریں گے۔ کسی بھی فن پارے کا ترجمہ کرتے وقت اس کے لسانی اور تہذیبی مزاج کو ملحوظ رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ (انتظار حسین نے تو افسانے تک میں اس اصول کو ملحوظ رکھا۔ انہوں نے جب ہندو مائتھالوجی اور بودھ جاتک کتھاؤں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا تو ان دونوں تہذیبوں کی روح کو نہ صرف مکالموں میں بلکہ بیانیہ میں بھی برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی) اختر حسین نے تو شکنتلا کو بالکل مشرف بہ اسلام کردیا ہے ،اگر اس پر جین اعتراض کرتے ہیں تو فاروقی حیرت انگیز طور پر شکنتلا کے اس احمقانہ ترجمے کا دفاع کرنے پر اتر آتے ہیں اور جین کے اعتراضات کو "پروفیسر موصوف کی مسلمان دشمنی" لکھنے میں انہیں ذرا بھی عار محسوس نہیں ہوتا ہے۔

جین نے علی گڈھ یونیورسٹی کے ڈریس کوڈ پر اعتراض کیا ہے کہ طلبا کو سرخ ترکی ٹوپی پہننی پڑتی تھی۔ فاروقی نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے۔" کیا سرخ ٹوپی پہننے سے غیر مسلموں کے مذہب پر کوئی ضرب پڑتی ہے؟ دنیا جانتی ہے کہ تعلیمی اداروں میں ڈریس ہندو اور مسلمان کے لیے الگ الگ نہیں ہوتے۔ آج پورے ملک میں انگریزی اسکولوں میں طالب علموں کو ٹائی لگانی پڑتی ہے اور لڑکیوں کو انگریزی لباس پہننا پڑتا ہے۔ ان بچوں میں کثیر تعداد ہندوؤں کے بچوں کی ہے" اسی پیراگراف میں فاروقی یہ بھی لکھتے ہیں کہ نہ کبھی ہندوؤں نے اعتراض کیا کہ یہ عیسائیوں کا لباس ہے اور نہ ہی مسلمانوں نے، پھر یہ سرخ ٹوپی کی شکایت کیوں؟ سرخ ٹوپی اسلام کی علامت تو نہیں۔" فاروقی کی یہ سادگی لاجواب ہے۔ جین تو اسی سال قبل کے ڈریس کوڈ کے مسلمانی ہونے پر معترض ہیں جب معاشرہ قدامت پسندی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر اکیسویں صدی میں پہنچ کر سکھ اور مسلمان اسکولوں میں اپنے مذہبی تشخص کو قایم رکھنے کے لیے صرف ہندستان ہی میں نہیں انگلینڈ اور فرانس میں حجاب، اسکارف اور پگڑی پہننے کے لیے زبردست مہم چلا چکے ہیں یعنی انہیں' عیسائیوں والا اسکول یونی فارم' قطعی قبول نہیں ہے۔ مہاراشٹر کی حد تک بتا سکتا ہوں کہ عیسائی مشنریوں کے اسکولوں میں بھی مسلمانوں نے اسکرٹ کے خلاف احتجاج کیا اور بیش تر اسکولوں سے اپنی بچیوں کے لیے شلوار پہننے کی رعایت حاصل کرلی۔ اب جین کے ترکی ٹوپی پر اعتراض کی وجوہات پر بھی غور کرلیں۔ سرخ ترکی ٹوپی مسلمانوں ہی میں پہنی جاتی تھی۔ اس زمانے کے ہندو بالخصوص کائستھ حضرات شیروانی تو پہن لیتے تھے لیکن ترکی ٹوپی انہوں نے بھی کبھی نہیں پہنی کیونکہ ترکی کی عثمانی خلافت کے خاتمے کے دنوں میں اور ہندستان میں خلافت تحریک کی وجہ سے سرخ ترکی ٹوپی مسلمانوں کے تشخص کا حصہ بن گئی تھی لیکن فاروقی اس تاریخی حقیقت کی طرف سے دانستہ چشم پوشی ہی نہیں کرتے بلکہ جین سے یہ سوال کرتے ہیں کہ" کیا سرخ ٹوپی پہننے سے غیر مسلمانوں کے مذہب پر کوئی ضرب پڑتی ہے؟" تو پھر سنگھ پریوار کے اس سوال کا کیا جواب دیا جائے گا جو وہ اکثر مسلمانوں سے کرتے ہیں کہ آرتی اور تلک کرنا تو ہندستانی سنسکرتی کا جز ہے تو مسلمان اگر آرتی اور تلک کو اختیار کرلیں تو اس سے ان کا دھرم کیوں سنکٹ میں آجاتا ہے؟

جین کی کتاب کا سب سے اہم باب مہاتما گاندھی اور اردو کے تنازعے سے متعلق ہے۔ مولوی عبدالحق کے نام سے یہ مشہور کیا گیا ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر اردو کی مخالفت کی تھی کہ" اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں یا پھیلائیں۔" جین نے تحقیق کرکے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ گاندھی جی کے بارے میں یہ گمراہی مشہور افسانہ نگار حکیم اسرار کریوی نے ایک سازش کے تحت پھیلائی تھی۔ کیوں کہ جس اجلاس کے حوالے سے یہ بات گاندھی جی سے منسوب کی گئی اس روز گاندھی جی کا مون برت تھا اور انہوں نے اپنا مختصر سا بیان تحریری شکل میں دیا تھا جو حاضرین میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ جین نے کافی تفصیل سے اس واقعے اور اس کے پیچھے کی سازش کو تحریر کیا ہے۔ یہ باب ایک تحقیقی مضمون کی شکل میں شب خون میں شایع ہوچکا ہے اور شب خون کے آخری شمارہ کے انتخاب میں فاروقی نے اس مضمون کو شامل کرکے ایک طرح سے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ اپنے تبصرے میں اتنے اہم باب پر حیرت انگیز طور پر خاموش رہتے ہیں۔

جین کی کتاب کی سب سے بڑی کمزوری ان کا تیخ لہجہ ہے۔ تمہید کے کچھ ایسے حصے ہیں جن میں انہوں نے اپنے دوستوں کے ذاتی نوعیت کے خطوط اور گفتگو کو حوالے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان میں سے بیش تر مرحوم ہوچکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مرحومین جین کے بیان کی صحت کی گواہی دینے سے رہے۔ لیکن جین کی کتاب کے معترضین کا ان کے خلاف سب سے طاقتور مقدمہ یہی ہے کہ ذاتی گفتگو اور خطوط کو تحقیقی کتاب کا حصہ نہیں ہونا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر گفتگو اور یادداشتوں اور ذاتی خطوط کو معتبر نہیں مانا جائے گا تو تمام سوانحی کتابیں اور خطوط کے مجموعوں کو بھی ردی کا ڈھیر ہی سمجھنا ہوگا۔ جین کی کتاب میں اردو سے متعلق لسانی بحث تاریخ کے ان واقعات سے الجھ گئی ہے، جو مسلم حملہ آوروں اور فاتحین کے جبر و ظلم اور اردو کو دو قومی نظریے سے جوڑنے کی کوششوں کو آئینہ دکھاتی ہے۔ اب اگر جین نے اپنی کتاب میں ان اقتباسات پر بحث کی ہے جو کسی نہ کسی سطح پر اردو کی تاریخ اور تحقیق کی کتابوں اور مضامین سے ماخوذ ہیں تو ہمیں اتنا چراغ پا نہیں ہونا چاہیے۔ اب ذرا ان اقتباسات کی ایک جھلک دیکھتے چلیں۔

■ اردو رسم الخط ملت ابراہیم کا پرچم ہے بلکہ یہ رسم الخط تو موذن ہے جو ہر

وقت لاالہ الا اللہ پکارتا ہے، منادی ہے جو اللہ اکبر کے نعروں سے تعینات کی فوجوں کو غارت کر کے احدیت کا اقتدار قائم کرتا ہے۔(جامعہ دہلی 1972ص 120)

■ پاکستان کو نہ جناح نے بنایا نہ اقبال نے بلکہ اردو نے بنایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصلی وجہ اردو زبان تھی۔ سارا دو قومی نظریہ اور سارے اختلافات اردو کی وجہ تھے۔ اس لیے پاکستان پر اردو کا بڑا احسان ہے۔(مولوی عبدالحق، قومی زبان کراچی 16 فروری 1961)

■ دوستو ہماری تعلیم اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لاالہ الا اللہ کا تاج سر پر ہوگا۔(سید احمد خاں، بحوالہ حالی)

■ اردو ڈکشنری لکھنے کے لیے دو نہایت ضروری شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ لکھنے والا دہلی کا ہو، دوسرے یہ کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو کیوں کہ خود دہلی میں بھی فصیح اردو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشیل حالت ایسی اردوئے معلی کو ان کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی۔(حالی مضامین حالی ص 58) [فاروقی نے اپنی کتاب 'اردو کا ابتدائی زمانہ' میں بڑی ایمان داری سے حالی کے اس خیال کو دہشت انگیز فقرہ کہا ہے اور ان کی اس فکر کو "اپنے مغربی حاکموں کی فکر کی صدائے بازگشت" سے تعبیر کیا ہے۔]

یہ اقتباسات تقسیم سے قبل کے مضامین سے لیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جو اقتباسات اردو کو مسلمانوں کی زبان اور تحریک پاکستان کی ایک وجہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ سارے ہی پاکستانی ادیبوں کے تحریر کردہ ہیں۔ اس لیے جین بھی اردو کو قیام پاکستان کا ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتے کیوں کہ ہندوستان میں اردو کو یہاں کے مسلم اردو ادیبوں نے بھی کبھی تقسیم سے منسلک کر کے نہیں دیکھا بلکہ اس نظریے کو مسترد ہی کیا ہے۔ میرے نزدیک جین کی کتاب کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انہوں نے اردو کی بحث کو تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اسے خلط ملط کر دیا ہے۔ لیکن انہوں نے مسلم معاشرے پر اثر انداز ہونے والے مسلم فاتحین اور حملہ آوروں کے تعلق سے جن اقتباسات سے بحث کی ہے وہ انہوں نے خالص تاریخ کی کتابوں سے نہیں اخذ کیے ہیں، بلکہ ان کتابوں سے لئے ہیں جو اردو زبان و ادب کی تاریخ اور تحقیق کی متعدد کتابوں میں منقول ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے فرقہ واریت کے پہلو پر اردو کے مسلمان ادیبوں نے کبھی توجہ اس لیے نہیں کی کہ وہ ساری باتیں ان کے لیے اہم نہیں ہیں، لیکن جو مسلمان نہیں ہیں ان کے لیے وہ دل آزار کیوں نہ ہوں گی! مثلاً سومناتھ مندر کا لوٹا جانا اس کی بے حرمتی اور اس کا منہدم کیا جانا مسلمانوں کے لیے محض ایک تاریخی واقعہ ہے۔ جین سومناتھ کے حوالے سے سجاد ظہیر کی کتاب روشنائی سے ایک واقعہ پیش کرتے ہیں کہ سجاد ظہیر 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا مینی فیسٹو لے کر کنہیالال منشی سے اور ان کی بیگم سے ملے تھے۔ سجاد ظہیر نے اس ملاقات کا تاثر روشنائی میں اس طرح رقم کیا ہے۔ "یہ ثابت ہو گیا کہ کنہیالال منشی کا اور ہمارا نقطہ نظر بنیادی طور پر مختلف تھا کنہیالال منشی سومناتھ کے کھنڈروں کو دوبارہ کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہماری نظریں موجودہ انسانی جدوجہد کی فیصلہ کن عظمت پر گڑی تھیں۔"

"اس جملے پر جین تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔" بین السطور میں صاف ظاہر ہے کہ سجاد ظہیر سومناتھ مندر کی باز تعمیر کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے۔" ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی کتاب 'تاریخ اردو ادب' میں صاف لکھا ہے۔ "اسلام بت پرستوں کا نہیں بت شکنوں کا مذہب تھا۔" صدیقی کے اس جملے پر جین کا تبصرہ ہے کہ "اس کا مطلب یہ کہ مسلمان یعنی عام اردو پڑھنے والے محمود غزنوی کے موید تھے۔" جین کی یہ بات بڑی سخت ہے لیکن جھوٹ بھی تو نہیں ہے کیوں کہ سومناتھ مندر کے لوٹے جانے اور اس کی بے حرمتی کا عام مسلمان ہی نہیں اردو کے ادیب بھی جب ذکر کرتے ہیں تو محمود غزنوی کے اس لوٹ کھسوٹ کی مذمت کرنے کے بجائے مختلف دلیلوں سے اسے منصفانہ عمل قرار دیتے ہیں یا اس کے لیے غزنوی کو ذمے دار ہی نہیں مانتے ہیں۔ افسوس فاروقی نے بھی اپنے تبصرے میں یہی کیا ہے۔ انہوں نے رومیلا تھاپر کی اس ایک کتاب کا حوالہ محمود غزنوی کے دفاع میں دیا ہے کہ تھاپر کے موجب "سومناتھ کے مندر کی محمود غزنوی یا کسی بھی مسلمان کے ہاتھوں انہدام کی کوئی معاصر شہادت نہیں ہے۔ رومیلا تھاپر کی کتاب فاروقی کو معتبر لگتی ہے لیکن ان پچاسوں کتابوں کا کیا جو یہ بتاتی ہیں کہ غزنوی نے متعدد بار سومناتھ کے مندر کو لوٹا اور بے حرمتی کی! اگر بابری مسجد کے انہدام کو بھی کوئی محض ایک تاریخی واقعہ قرار دیتے ہوئے رام مندر کے تاریخی تناظر میں اسے ایک بھیڑ کا مذہبی ردعمل کا نام دے لے اور اڈوانی کو اس جرم سے بری الذمہ ٹھہرائے تو مسلمانوں کو کیسا محسوس ہوگا؟ جین کا ایک قصور یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایسے کوڑے کرکٹ کو جسے بیش تر مسلمان ادیب تک اپنے شان دار ماضی کی روایات مانتے ہیں، قالین کے نیچے سے جھاڑ کر باہر نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اگر جین کی کتاب میں ان کا ذکر نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میرے خیال میں جین نے کھل کر ایک اردو کے ہندو ادیب کے ذہن و فکر اور ردعمل کو عیاں کر دیا ہے۔ جنہیں ہم ان کے تعصبات بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس ذہن کو اور اس میں اٹھنے والے ان سوالات کو بہت ہم دردی سے سمجھنے کی ضرورت ہے، جو ہمیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسلمان ادیب اپنے مائناریٹی کامپلیکس میں اس قدر مبتلا رہے ہیں کہ انہوں نے اپنے درمیان کے ان غیر مسلم اردو

ادیبوں کے جذبات اور احساسات کو بھی قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا جو اردو برادری میں اقلیت میں ہیں اور وہ بھی لسانی برادری میں اپنے اقلیت میں ہونے کے مائنارٹی کامپلیکس میں مبتلا ہوں! اس کی ایک چھوٹی سی مثال فاروقی کا ایک مضمون ہے جو انہوں نے ہندی کے ادیب اور ماہنامہ ہنس کے مدیر راجندر یادو کے ایک اداریے کے جواب میں لکھا تھا۔ یادو اپنی روشن خیالی اور دلتوں اور اقلیتوں کے ہم درد کے طور پر سنگھ پریوار میں ملعون سمجھے جاتے ہیں۔ بجرنگ دل نے ان پر ہندوؤں کی دل آزاری کے تین مقدمے مختلف ریاستوں میں دائر کر رکھے ہیں۔ یادو نے پہلی بار اپنے ایک اداریے میں مسلمانوں پر ان کے مذہبی regimentation کے لیے تنقید کی تھی۔ (اس مضمون کا ترجمہ 'نیا ورق' 17 میں شائع ہوا تھا) یادو کے اس اداریے کے جواب میں فاروقی نے ایک مضمون ہندی کے ایک رسالے کو نقل کروایا اور پھر جسے انہوں نے شب خون (جون 2003) میں بھی شائع کیا۔ اس پورے مضمون کا جو لہجہ ہے وہ صرف یادو کے لیے ہی نہیں ہندوؤں کے لیے بھی بے حد تحقیر بھرا ہے۔ اسی مضمون میں یادو کو مخاطب کرتے ہوئے فاروقی لکھتے ہیں۔

"اگر ہم اپنے پڑوسی کا گلا نہیں کاٹ رہے ہیں تو ہماری شریعت تمھارا کیا بگاڑ رہی ہے؟ ہم تو مُردوں کو جلنے بھی نہیں دیتے، زمین میں دفن کرتے ہیں۔ اس پر مقبرے بناتے ہیں جہاں ہندو جاتا ہے، مسلمان جاتا ہے، ماتھا ٹیکتا ہے اور تمھارے لوگوں نے تو ہمارے لوگوں کو گجرات میں زندہ جلا دیا۔ تو کیا شریعت سے جا کر پوچھیں اس معاملے میں، کیا ہماری شریعت نے تم سے کہا ہے کہ لوگوں کو زندہ جلا دو؟"

اس مضمون میں فاروقی نے 'ہمارے' (مسلمان) اور 'تمھارے' (ہندو) کا صیغہ استعمال کر کے اسی فرقہ واریت کو اختیار کر لیا ہے، جس کی شکایت آج انہیں جین سے ہے۔ فاروقی کے اس تحقیر آمیز رویے کا اردو کے ہندو ادیبوں نے کیا اثر لیا ہوگا یہ نہ تو فاروقی نے سوچا اور نہ شب خون کے خطوط کے باب میں اس مضمون پر بے تحاشہ داد دینے والے اردو کے مسلم ادیبوں نے ہی سوچا کہ شب خون کے جو ہندو قاری ہیں ان پر اس کا کتنا منفی ردعمل ہو سکتا ہے!

فاروقی نے اپنے تبصرے میں جین کی کتاب کے حوالے سے بھارتیندو ہریشچندر کا ایک جملہ اس طرح نقل کیا ہے۔ "یہ (اردو) طوائفوں کی زبان ہے، ہندو رئیسوں کے بد چلن لڑکے طوائفوں اور دلالوں سے گفتگو کرنے کو اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔" آگے وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ "جین صاحب نے یہی طوائفوں کی زبان (اردو) نہ صرف پڑھی بلکہ تیس چالیس سال تک یونی ورسٹیوں میں پڑھائی اور پچیسوں کتابیں لکھیں۔" بھارتیندو کا یہ انتہائی اشتعال انگیز جملہ فاروقی نے اپنے تبصرے میں اس صفائی سے نقل کیا ہے جیسے جین خود بھی اردو کو طوائفوں کی زبان مانتے ہوں۔ اب ذرا چلتے ہیں بھارتیندو کے اس جملے کے سیاق و سباق کی طرف۔ ڈاکٹر آلوک رائے کی کتاب 'ہندی نیشنلزم' کے حوالے سے جین لکھتے ہیں "حکومت ہند نے ملک میں تعلیم کی رفتار جاننے کے لیے سر ولیم ہنٹر کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس میں ہندی کی تائید میں 79 میموریڈم دیے گئے جن میں کل 58290 دستخط تھے۔ بھارتیندو نے انگریزی میں لکھی اپنی شہادت میں کہا کہ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ آنریبل سید احمد خاں بہادر C.S.I نے اپنی شہادت میں کہا ہے کہ اردو اشراف کی زبان ہے اور ہندی اجلاف (vulgar) کی۔ یہ ویسی ہی دلیل ہے، جس میں کہا جاتا ہے کہ اردو اگر عدالتوں کی زبان نہ رہی تو سارے مسلمان بے روزگار ہو جائیں گے لیکن در حقیقت کوئی اور وجہ ہے جو اردو کے عابدوں کو اردو سے چپکائے ہوئے ہے۔ یہ طوائفوں کی زبان ہے۔ ہندو رئیسوں کے بد چلن لڑکے طوائفوں اور دلالوں سے گفتگو کرنے کو اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔" جین بھارتیندو کے اس شر انگیز بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "آلوک رائے جیسے منہ پھٹ لکھنے کو مجبور ہو گئے ہیں کہ (بھارتیندو کے) الفاظ بہت غیر معتدل ہو گئے ہیں۔" بھارتیندو نے طوائفوں کی زبان والا لقب بنگال کے لیفٹننٹ گورنر سے سیکھا ہوگا۔ بھارتیندو جیسا تیز و طرار شخص بھول جاتا ہے کہ وہ کس غیر علمی لہجے میں بول رہا ہے۔ غور کیجیے جین نے 'ہندو اردو تنازع اور فرقہ وارانہ سیاست' کے زیر عنوان باب میں بھارتیندو کا حوالہ ایک سرکاری کمیشن میں سر سید کے بیان کے جواب میں پیش کیا ہے۔ لیکن فاروقی نے چالاکی سے اس پورے واقعے کو نقل نہ کرتے ہوئے بھارتیندو کا وہ جملہ نقل کر دیا ہے جسے پڑھ یا سن کر کسی بھی اردو نواز کو طیش آ سکتا ہے۔ اگر ہم ایک عاشق اردو کی حیثیت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ سر سید نے تو اردو کی وکالت میں اپنی دلیل پیش کی تھی، تو پھر ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اگر اردو کو اشراف کی زبان اور ہندی کو اجلاف کی زبان کہنا طریقہ استدلال ہو سکتا ہے تو سر سید کے نازیبا جملے کے ردعمل میں بھارتیندو کا اردو کو طوائفوں کی زبان کہنا محبان ہندی کے نزدیک درست ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ اگر معروضی نقطۂ نظر اپنائیں گے تو آپ ضرور محسوس کریں گے کہ سر سید اور بھارتیندو دونوں ہی کی اپنی اپنی زبان کے حق میں دی گئی دلیلیں دوسری زبان کے لیے حقارت بھری ہی نہیں اشتعال انگیز تھیں۔ جین پر بہت ساری باتوں کو ان کے سیاق و سباق سے کاٹ کر درج کرنے کا الزام فاروقی نے لگایا ہے تو خود فاروقی نے کیا یہی حرکت نہیں کی ہے۔

فاروقی نے اپنے تبصرے کا اختتام ان لفظوں میں کیا ہے۔ "یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کی ہے۔ یہ ادارہ اردو اشاعت کا ایک

معتبر ادارہ ہے۔ اس کے مالک جمیل جالبی کے بھائی ہیں۔ وہی مشہور محقق اور ادبی مورخ جمیل جالبی جن کے معتقد ہمارے فاضل مصنف بھی ہیں اور جن کو انہوں نے اپنی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" یہ لکھ کر معنون کی ہے کہ جمیل جالبی ادبی تاریخ کے سب سے اچھے اہل قلم ہیں۔ حیرت ہے کہ اردو کے صریحاً خلاف جھوٹ اور اغلاط اور تعصب سے بھری ہوئی یہ کتاب ایک اردو ادارہ سے کیسے شائع ہوئی؟" فاروقی جیسے اسکالر سے اس intolarance کی امید کم سے کم مجھے نہیں تھی۔ کیا فاروقی یہ چاہتے ہیں کہ یہ کتاب چھپنا ہی نہیں چاہیے تھی اور جس ادارہ نے شائع کی ہے اس نے کوئی بہت بڑا (جرم نہیں) گناہ کیا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے ادب کسی اسامہ بن لادن یا کسی اسٹالین کی مملکت نہیں جہاں اختلاف رائے کی قطعی گنجائش نہ ہو۔ ادب اور عقیدے میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ادب کا داخلی نظام جمہوری ہوتا ہے جہاں شدید اختلاف کا احترام لازم ہے جبکہ عقیدہ جامد ہوتا ہے اس میں لچک اور گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ (جب کوئی نظریہ بھی جامد ہو جاتا ہے تو وہ عقیدہ بن جاتا ہے) مجھے بھی جین کی کتاب سے مکمل اتفاق نہیں ہے۔ اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان ثابت کرنے کی ان کی تھیسس ہی غلط ہے۔ میرا ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں ہندوؤں کے ساتھ جس ناروا سلوک کی شکایتیں کی ہیں وہ انہوں نے اس وقت کیوں نہیں کیں جب وہ ہندستان میں تھے اور ان کے قویٰ بھی مضبوط تھے؟ میں اپنے ہی اس سوال کا جواب بھی دینا چاہوں گا۔ دراصل کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے 99 فیصد مدرّسوں کی ساری زندگی اپنے تدریسی کیریر اور پرموشن سے جڑی رہتی ہے۔ وہ اس سے اوپر اٹھ کر کچھ سوچ اور کچھ کر ہی نہیں پاتے ہیں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ جین بھی ایسے ہی مفادات کے حصول کے لیے اپنے اطراف کی تلخیوں کو دبائے رہے۔ 'اردو ادب' کے مطابق جین نے اس کتاب کے لیے کمال احمد صدیقی سے مقدمہ لکھوایا جو کہ ان کے لکھے ہوئے 22 صفحات پر محیط تھا۔ لیکن کتاب میں یہ مقدمہ صرف چھ صفحات میں ہی سمیٹ دیا گیا ہے اتنے حساس موضوع پر جین کو کمال احمد صدیقی کا پورا مقدمہ شائع کرنا چاہیے تھا اور اگر انہیں اس کے کچھ حصوں سے اتفاق نہیں تھا تو وہ مقدمہ ہی نہ شامل کرتے۔ اسے میں ان کی بددیانتی پر محمول کرتا ہوں۔ اس کے باوجود میں اس کتاب کو اس لیے بے حد ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ اردو کے ایک ایسے قدآور محقق اور ناقد کی کتاب ہے جو اردو معاشرے کی اقلیت سے تعلق رکھتا ہے اور جس نے اردو ادب کو کئی گراں قدر تحقیقی کتابیں دی ہیں۔ جین اور ان کی کتاب پر اور ناشر پر انتہا پسندانہ حملے شدید قسم کے ایسے intolarance کو پیش کرتے ہیں جو اب اردو معاشرے کا مزاج بنتا جارہا ہے۔

اردو والوں کے intolrance کی سب سے شرمناک مثال گذشتہ دنوں دہلی میں منعقدہ ڈی سی ایم کے ایک مشاعرہ میں پیش کی گئی۔ ندا فاضلی اردو شاعری میں اس انسان نوازی کو پیش کرتے ہیں جو صوفیوں سنتوں اور درویشوں کی تعلیمات کا بنیادی جز ہے۔ ندا فاضلی نے عالمی دہشت گردی کے تناظر میں مذہبی دہشت گردی کے ہاتھوں اسلام کے یرغمال بنائے جانے پر ایک شعر پڑھا۔

اٹھ اٹھ کے مسجدوں سے نمازی چلے گیے
دہشت گری کے ہاتھ میں اسلام رہ گیا

ندا کے اس شعر پر حاضرین میں سے احتجاج بلند ہوا کہ وہ اس شعر پر معافی طلب کریں۔ جہاں تک مشاعروں کے سامعین کا تعلق ہے اس میں ان دنوں کس ذوق کے لوگ شرکت کرتے ہیں اس کی وضاحت فضول ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ اسٹیج پر موجود شعرا بھی ندا کے اس شعر پر جز بز ہو رہے تھے اور کچھ کا اصرار تھا کہ ندا کو اس شعر پر معافی مانگ لینی چاہیے۔ ان ہی ندا نے جب بی جے پی کی حکومت کے دنوں میں لال قلعے کے مشاعرے میں وزیر اعلا کھورانہ کو مخاطب کر کے اڈوانی اور ان کی رتھ یاترا کے خلاف نظم پڑھی تھی تو سامعین کی پرجوش داد نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ندا نے اپنی نظم اور شعر میں دو مختلف مذہبی دہشت پسندوں کو مذہب کا استحصال کرنے والا بتایا ہے۔ جہاں اڈوانی نشانہ بنتے ہیں تو مسلم سامعین داد نچھاور کرتے ہیں اور جہاں مسلمان دہشت گردوں کے ہاتھوں اسلام کے استحصال کو موضوع بناتے ہیں تو ان سے مسلم سامعین ہی نہیں کچھ شاعر بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔ سترہویں صدی کے استاد شاعر قائم چاند پوری کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

ٹوٹا جو کعبہ کون سی یہ جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اردو والوں بالخصوص مسلمانوں کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ تین سو سال قبل جس شعر پر استادوں نے قایم چاند پوری کا دامن داد و تحسین سے بھر دیا تھا اگر انہوں نے یہی شعر آج کہا ہوتا تو یقیناً ان پر مرتد ہونے کا فتوا لگ چکا ہوتا اور شاید انہیں اپنی جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ کہیں اردو والوں کی یہی فرقہ واریت گیان چند جین، کالی داس گپتا رضا اور مانک ٹالہ جیسے اردو کے ادیبوں میں منفی ردعمل اور انہیں اردو معاشرے میں خود کو اجنبی محسوس کرنے کے لیے مجبور تو نہیں کر رہی ہے! اردو والوں کی اس انتہاپسندی کا غیر مسلم اردو ادیبوں پر کتنا برا اثر پڑتا ہوگا؟ کیا اس پر ہمیں ٹھنڈے دل سے غور نہیں کرنا چاہیے؟ آخر وہ بھی تو ہمارے اردو معاشرے کی اقلیت ہیں۔

('نیا ورق' 24 کے اداریے سے ماخوذ)

باب الکتاب

مصنف و تصنیف، رسائل و جرائد، تعارف و تبصرے

تبصرہ و تاثرات

گوپی چند نارنگ کا موقف

ڈاکٹر مشتاق صدف

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نئی کتاب 'اردو زبان اور لسانیات' نے ان کی گزشتہ کتابوں کی طرح شائع ہوتے ہی دھوم مچا دی ہے۔ پروفیسر نارنگ گذشتہ پچاس برسوں سے ادبی تنقید و تحقیق کے دیگر موضوعات کی طرح لسانیاتی موضوعات پر کام کرتے رہے ہیں اور لسانیات ان کی تحقیق و تنقید کا ایک خاص میدان مانا جاتا رہا ہے۔

چھٹی دہائی میں ان کی تین کتابیں 'اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو'، 'اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی' اور 'ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں' شائع ہوئیں جب کہ وسکانسن میں قیام کے زمانے میں انہوں نے Readings in Literary Urdu Prose پر کام کیا۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے دور میں 'املا نامہ'، 'پرانوں کی کہانیاں' اور راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور بلونت سنگھ پر انتھالوجی تیار کیں نیز یک موضوعی بین الاقوامی سیمناروں پر خصوصی توجہ دی۔ اسی عرصے میں ان کی قابل قدر کتابیں 'اردو افسانہ: روایت اور مسائل'، 'انیس شناسی'، 'اقبال کا فن' اور 'لغت نویسی کے مسائل' منظر عام پر آئیں۔ آٹھویں دہائی میں 'امیر خسرو کا ہندوی کلام'، 'سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ' اور 'اسلوبیات میر' کا ڈنکا بجا۔ بعدازیں 'ادبی تنقید اور اسلوبیات' اور 'قاری اساس تنقید' نے اردو تنقید کو ایک نئی جہت بخشی۔ نویں دہائی میں 'ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات' اور 'اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ' نے ایک بار پھر اردو ادب کو نئی کشادگی عطا کی۔ اسی طرح ان کی انگریزی کتاب Urdu Language & Literature : Critical Perspectives نے جو اسٹرلنگ سے چھپی تھی، نئی سوچ کو فروزاں کیا۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی کے جاتے جاتے Let's Learn Urdu کے نام سے انگریزی اور ہندی میں ان کی چار کتابوں کے سیٹ کی اشاعت اہل زبان و ادب کے لیے محیر العقول ثابت ہوئی اور 'اردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب'، 'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' اور 'جدیدیت کے بعد' نے ان کی ادبی فکر و نظر کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

اب گوپی چند نارنگ کی تازہ تصنیف 'اردو زبان اور لسانیات' رضا لائبریری، رام پور کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے جو لسانیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ درحقیقت یہ پروفیسر نارنگ کے اردو زبان اور لسانیات کے زندگی بھر کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ لسانیاتی مضامین کے اس گنج گراں مایہ میں علمی، تاریخی، تجزیاتی اور نظریاتی تحریریں اور لسانی سرمایہ یکجا ہے۔ جس سے اردو زبان کی کے لسانی ارتقا اور اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور جدید لسانیاتی مباحث کا دریچہ کھلتا ہے۔

ان مضامین سے بین الاقوامی شہرت یافتہ نقاد و دانشور گوپی چند نارنگ کے لسانیاتی زاویے اور تخلیقی و تنقیدی فکر و بصیرت سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اردو کو درپیش مسائل سے نبرد آزما ہونے اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے کی سمت میں جدید لسانیات کے بنیاد گزار کی حیثیت سے بھی گوپی چند نارنگ کا واضح موقف سامنے آتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین کے عمیق مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو زبان سے دیوانگی کی حد تک وابستگی اور اردو کے جدید لسانیاتی مسائل و مباحث سے گہری دلچسپی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کا بانگ دہل اظہار اور وہ بھی اس وقت جب گیان چند جین کی متنازع کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' بحث میں ہے اور بعض فرقہ پرست اور فرسٹریٹڈ عناصر اس تصنیف کے انتساب کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کے نام کو گھسیٹنے کی سعی ناکام کر رہے ہیں، اپنی معنی خیزی کو اجاگر کرتا ہے، اور بدنہاد لوگوں کو آئینہ دکھاتا ہے۔

زیر نظر ادبی صحیفہ میں زبان اور لسانیات میں گذشتہ چالیس برسوں کے دوران لکھے گئے مضامین بھی ہیں اور ایک جامع اور مبسوط دیباچہ بھی۔ یوں تو یہ دیباچہ صرف چار صفحات پر مشتمل ہے لیکن گویا کوزہ میں دریا بند کر دیا ہے۔ اس دیباچہ سے ان تمام سوالوں کا جواب مل جاتا ہے جو اردو زبان سے اب تک کیے جاتے رہے ہیں۔ جو لوگ خود کو اردو زبان و ادب کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور دوسروں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کے منہ پر مصنف کا یہ اقتباس

ہی ایک طمانچہ ہے۔ بلکہ ان کے لیے بھی کارگر جواب ہے جو اردو کو غیر سیکولر اور فرقہ وارانہ زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

"اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا بنایا اور سنوارا ہے، یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے، یہ ایک طرز حیات، ایک اسلوبِ زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایسا روشن استعارہ ہے، جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں نہیں۔" (ص11)

جین صاحب نے اپنی کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' کا انتساب امرت رائے اور گوپی چند نارنگ کے نام کیا ہے۔ یہی بنیاد ہے نارنگ صاحب کو گھیرنے کی۔ لیکن گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب میں پہلے کی طرح ایک بار پھر کسی کا نام لیے بغیر تمام فرقہ پرست سوچ رکھنے والوں کو للکارا ہے اور ان کی کجرویوں کو برہنہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ اردو کبھی دلوں کو توڑنے والی زبان نہیں رہی۔ وہ رقم طراز ہیں:

"اردو کا ایک نام سیکولرازم یعنی غیر فرقہ واریت 'اور' بقائے باہم' بھی ہے۔ اردو نے صدیوں سے اس کی معنی خیز مثال قائم کی ہے اور ہر طرح کی تنگ نظری اور دقیانوسیت کے خلاف محاذ باندھا ہے۔ لمحۂ فکریہ یہ ہے کہ کیا کسی ایسے انسانیت پرور تصور کے بغیر ہمارے آزاد جمہوری معاشرے نہ صرف یہ کہ اپنے ترقی پذیر ہونے کا جواز فراہم کر سکتے ہیں بلکہ کیا کسی کشادہ اور روادار تہذیبی تصور کے بغیر وہ زندہ بھی رہ سکتے ہیں؟" (ص11)

گوپی چند نارنگ نے گیان چند جین جیسوں کی باتوں کو مہذب انداز میں رد کیا ہے:

"میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ میرا سفرِ اردو سفرِ عشق ہے۔ عشق اثباتِ خودی کی نہیں تسلیم خودی کی راہ ہے، جس میں 'لین' کچھ نہیں 'دین ہی دین' ہے اور میں نے تو دیا کچھ بھی نہیں، میری بساط ہی کیا، اور لے لیا کتنا کچھ۔ یہ کسر نفسی نہیں کہ میری پہچان جو بھی اور جیسی بھی ہے اردو کی بدولت ہے۔ یہ اردو کی فیاضی نہیں تو کیا کہ میں تو کچھ بھی نہ دے سکا اور اس نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کسی کو بھی کسی نے کیا دیا ہوگا!" ('اردو زبان اور لسانیات'، ص12-11)

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تبصراتی مضمون 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

"دنیا جانتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کو اردو کی ساری دنیا سے جتنے اعزاز، اکرام، ایوارڈ اور انعام ملے ہیں اتنے اردو کے کسی ادیب کو نہیں ملے اور نہ شاید آئندہ مل سکیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ممدوح گوپی چند نارنگ کو اردو کی دنیا میں اپنے بزرگوں، اور معاصروں کے ساتھ کسی دوڑ میں مبتلا بیان کرنا پسند فرماتے ہیں.... دراصل صورت حال تو یہ ہے کہ اردو والے گوپی چند نارنگ کو اپنا 'ہمسر' تو کیا اپنے سے برتر مانتے ہیں۔"

(اردو ادب، شمارہ اپریل، مئی، جون 2006، ص36)

دراصل گوپی چند نارنگ نے اپنے سفرِ اردو کو سفرِ عشق بتا کر، اپنی پہچان کو اردو کی بدولت قرار دے کر اور اردو کی فیاضی کا ذکر کر کے اردو کے تعلق سے اناپ شناپ لکھنے والوں کی خبر بھی لی ہے۔

جہاں تک 'انتساب' کی بات ہے تو اس حوالے سے گوپی چند نارنگ کے خلاف سازش کرنے کی کوشش حد درجہ غیر ذمہ دارانہ اور فرقہ وارانہ ہے۔ جو شخص اردو سے اپنی وابستگی کو دیوانگی کی حد قرار دیتا ہے۔ اپنے سفرِ اردو کو 'سفرِ عشق' بتاتا ہے، اردو کو زبانوں کا 'تاج محل' کہتا ہے۔ اردو کے امتیاز کے لیے اردو رسم الخط پر اصرار کرنے کو نہ صرف فطری بلکہ ضروری سمجھتا ہے بلکہ رسم الخط بدلنے کو زبان کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے اور وہ بھی تحریری شکل میں تو پھر ایسے شخص پر اردو کے تعلق سے بے جا بہتان تراشی کیا گیان چند جیسی شخصیتوں کی فکر کو جلا بخشنا اور ان کی اعتراضات کو سچ ثابت کرنا نہیں ہے؟ گوپی چند نارنگ اردو کو اپنی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی مادری زبان کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی جادوئی کشش کے ساتھ اس کے جنوبی ایشیا کی 'لنگوا فرینکا' زبان ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ کیا ان سب کے باوجود انھیں ایک 'مخصوص عینک' سے دیکھنا ہماری تنگ نظری اور عصبیت پر دال نہیں؟ دراصل یہی سوال سوچنے کا ہے۔ ان کا یہ اقتباس ان کی گہری وابستگی اور صدق دلی کا بین ثبوت ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

"اردو میری مادری زبان نہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائیکی بولی جاتی تھی، میری ماں دہلی ہجرت کے بعد بھی سرائیکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹا دیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی، یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔ تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے، میں اردو کو زبانوں کا 'تاج محل' کہتا ہوں اور اکثر اس لذت کو اپنے خون کی روانی

میں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے خبر و بے خبری میں محسوس کرتا ہوں۔ زبان میرے لیے رازوں بھرا بستہ ہے۔ کیسے ہند آریائی کے بستے میں عربی فارسی ترکی کے رنگ گھلتے چلے گئے اور کیسے ایک رنگارنگ دھنک بنتی چلی گئی کہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک کے طول و عرض میں وہ آج 'لنگوا فرینکا' بھی ہے اور ایک ایسا ادبی اظہار بھی جس کے رس اور بالیدگی کو دوسری زبانیں رشک کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ (ص12)

ہمارے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم جو کچھ نہیں دیکھتے اس پر بعض خود غرض لوگوں کے بھڑکانے پر یقین کر لیتے ہیں، اور خود اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر بھروسہ نہیں کرتے۔ گوپی چند نارنگ کے تعلق سے یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ان کے کچھ 'کرم فرما' ایسے ہیں جو بربنائے حسد و بغض و عناد ان کے خلاف ناکام سازشیں کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ نارنگ صاحب کی تحریروں کو پڑھنے کی بجائے اپنی کج روی کی بنا پر غلط فہمیوں کو ہوا دیتے ہیں، اور جو کچھ نہیں ہے اسے گھڑنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ یعنی جو شخص نصف صدی سے اردو زبان و ادب کا دفاع کرتا آیا ہے، اور جس کا ظاہر و باطن دونوں یکساں ہے اسے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ نہ صرف بددیانتی ہے، گروہ بندی ہے، بلکہ خبث باطن بھی ہے جس کی مذمت کرنا چاہیے۔ یہاں یہ عرض بھی کردوں کہ گوپی چند نارنگ پر انگشت نمائی کرنے والوں کی تعداد ان کے چاہنے والوں کے مقابلے میں چاند پر داغ کی مانند ہے۔ اس قسم کی سازشوں سے بھی وہ کبھی بددل نہیں ہوئے کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ آسمان پر تھوکنے والے خود ہی ذلت اٹھاتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا: ''میں اس معاملے میں سرسید احمد خاں کا قائل ہوں جن کا قول ہے کہ خدا کا شکر ہے اس نے محسود بنایا ہے کسی کا حاسد نہیں۔''

اکثر اخبارات و جرائد اپنے قارئین کی آرا اور خطوط شائع کرنے سے پہلے یہ فقرہ لکھ دیتے ہیں کہ ''مراسلہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں''۔ مطلب یہ کہ قارئین کی رائے سے ایڈیٹر یا جملہ ذمہ داران کا کوئی سروکار نہیں۔ پھر بھی ہم یہ سمجھیں کہ قارئین کی جو رائے شائع کی جاتی ہے اس سے ادارہ جڑا ہوا ہے تو یہ ہماری ناعقلی ہوئی۔ یہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس میں شائع کسی مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ متفق ہو یا چند ایک سے۔ گیان چند جین کی کتاب صفحہ IV پر 'اظہار تشکر' کے عنوان سے مصنف نے واضح انداز میں اپنی ہر تحریر کی ذمہ داری خود قبول کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اظہار تشکر: مندرجہ ذیل اصحاب کا شکر گزار ہوں:

1۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی

2۔ جناب مشفق خواجہ، کراچی

3۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی

4۔ جناب شمس الرحمٰن فاروقی، الہ آباد

5۔ ڈاکٹر ضیاالدین انصاری، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ

6۔ ڈاکٹر محمد انوارالدین، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

مندرجہ بالا حضرات نے مطلوبہ متعدد کتابیں اور رسالے فراہم کیے۔ اگر ان کا کرم شامل حال نہ ہوتا تو میں امریکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب نہ لکھ سکتا۔ لیکن یہ واضح کردوں کہ کتاب میں جو کچھ ہے اس کی پوری ذمہ داری مجھ پر اور صرف مجھ پر عاید ہوتی ہے۔ میری آرا کے لیے یہ لوگ نہیں میں خود پوری طرح ذمہ دار ہوں۔''

گیان چند جین نے نصف درجن افراد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ علاوہ ازیں محمد حسن اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ان کی کتاب پر مقدمہ لکھا ہے جس سے گیان چند جین کے لسانی Thesis کی توثیق ہوتی ہے۔ لیکن حیرت اور استعجاب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ اتنے لوگوں میں صرف گوپی چند نارنگ کے نام کو ہی اچھالا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ ہندو ہیں؟ اب تک جتنے بھی مضامین اس حوالے سے آئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی مندرجہ بالا ناموں میں سے کسی دوسرے نام کا کوئی تذکرہ نہیں آیا۔ آخر کیوں؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اردو میں رواج ہے کہ انتساب کرنے سے پہلے کسی کی اجازت نہیں لی جاتی۔ اگر منسوب سے ہم مواد کو بھی منسوب کرنے لگے تو ایک نئی بحث چھڑ جائے گی۔ اسی لیے اس فرقہ وارانہ حرکت کی شدید مذمت کی ضرورت ہے۔ کیا اس لیے کہ محقق کا لفظ کچھ جید لوگوں کے حلق کا کانٹا بن گیا ہے؟

گوپی چند نارنگ نے اپنی تازہ کتاب میں سیاسی ہنگامہ پروری کے اس عہد میں پھیلنے والی غلط فہمیوں اور اردو رسم الخط کے ساتھ اردو۔ ہندی کے معنی خیز رشتے کا ذکر کرکے تعصب پسند افراد کے سینے کو اور بھی چھلنی کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا خصوصی امتیازی نشان اس کے عربی فارسی اثرات ہیں۔ سیاسی ہنگامہ پروری کے عہد میں غلط فہمیوں کا پھیلنا ایک عام سی بات ہے۔ یوں بھی جذباتی کاروبار، علم سے کم ہی نسبت رکھتا ہے، اس لیے اس عرفان کو عام کرنا ازبس ضروری ہے کہ اردو کی جڑیں اسی سرزمین میں ہیں اور اس کی کشش و دلآویزی اور مٹھاس اور رس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ اس میں کئی زبانوں اور کئی ثقافتوں کا پیوند لگا ہے۔ اردو کا چلن ہندوستان اور پاکستان یعنی پورے

برصغیر میں ہے۔ اردو اور ہندی کی بنیاد ایک ہے یعنی کھڑی بولی لیکن اب یہ دونوں زبانیں الگ الگ آزاد اور مستقل زبانیں ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی طاقت ہیں اور ایک کے بغیر دوسری مکمل نہیں۔ اردو ہندوستان اور پاکستان کی متعدد بولیوں اور زبانوں کے درمیان ایک سماجی لسانی اور تہذیبی پل اسی لیے بناتی ہے کہ برصغیر کی بیس پچیس زبانوں میں سے کوئی دو زبانیں ایک دوسرے سے اتنی قریب نہیں جتنی کہ اردو اور ہندی۔ ہندوستان میں اردو کی بقا کے لیے اس رشتے پر زور دینا بے حد ضروری ہے۔" (ص13)

مذکورہ تمام حقائق سے پردہ پوشی کرتے ہوئے وہ حضرات جو پہلے گونگے اور بہرے دونوں تھے، ان کی تربیت نارنگ صاحب نے کی اور انھیں قوت گویائی اور قوت سماعت عطا کی اور ممکنہ حد تک ان کی مدد بھی کی لیکن اگر وہ ان کے خلاف لب کشائی کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ افراد جن کی پوری تنقیدی بساط نارنگ صاحب کی مرہون منت ہے، تو تعجب ہوتا ہے۔ حقانی القاسمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

"نئی نسل نارنگ کے تنقیدی فرہنگ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ پائی۔ وہی نارنگ کی ساختیات، پس ساختیات، تصور اسمیت و فعلیت، وہی نحوی واحدے، طویل مصوتے، وہی حرفی نحوی امتیازات، نارنگ کے جملے، ان کی اصطلاحات، لفظیات نئی نسل اپنے مضامین میں کچھ اس طرح استعمال کرتی ہے کہ لوگ نارنگ کی گہرائی و گیرائی کو نئے نقادوں کے ذہن کی گہرائی و گیرائی سمجھنے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں اور المیہ یہ ہے کہ نارنگ کی وضاحت فکر اور سلاست زبان کی جگہ نئے نقادوں کے ذہن اور زبان کی ژولیدگی تحریر کو چوں چوں کا مربہ بنا دیتی ہے"۔

(ٹوٹی رسی سے بندھا کوا ز، حقانی القاسمی، استعارہ، شمارہ 22)

میں خود گیان چند جین کی متعصبانہ آرا کو رد کرتا ہوں اور فرقہ واریت خواہ کسی کی ہو اس پر لعنت بھیجتا ہوں لیکن یہ بات گلے سے نہیں اترتی کہ صرف 'انتساب' کا بہانہ بنا کر نارنگ صاحب کی شش جہت شخصیت پر چھینٹا کشی کی جائے اور ان کی جملہ خصوصیات پر پردہ ڈالا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جملہ فرقہ پرستوں بلکہ سازشیوں پر گوپی چند نارنگ کی یہ کتاب نہ صرف بہت بھاری ہے بلکہ زبردست طمانچہ بھی۔

اس کتاب میں شامل ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی، افسر بکار خاص، رام پور رضا لائبریری کے 'حرف آغاز' اور مشہور ماہر لسانیات و صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے عالمانہ 'پیش لفظ' نے تو اردو زبان اور اس کے رسم خط سے نارنگ صاحب کے والہانہ لگاؤ اور ان کی گراں قدر خدمات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے کچھ تیرہ نہادوں کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔

پچیس مضامین سے آراستہ زیر نظر تصنیف پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں سات، دوسرے میں تین، تیسرے میں پانچ، چوتھے میں پانچ اور آخری حصے میں پانچ کے علاوہ انگریزی کے دو مضامین بھی شامل ہیں جو ہر اعتبار سے منفرد، یکتا اور معلوماتی ہیں۔ پہلے حصے میں اردو ہماری اردو، اردو کی ہندوستانی بنیاد، اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہ، اردو کے افعال مرکبہ پر ایک نظر، اردو اور ہندی کا لسانی اشتراک (اول و دوم) اور قصہ اردو زبان کا' کے عنوانات سے مجموعی طور پر اردو اور ہندی کے لسانی رشتوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور اردو کے تاریخی تناظر میں موجودہ درپیش مسائل کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے نارنگ صاحب کی اردو سے گہری مطابقت اور سچی محبت کا اندازہ ہوتا ہے نیز برصغیر کے تناظر میں اردو کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی غرض و غایت کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ درحقیقت پہلا حصہ اردو-ہندی کے معنی خیز رشتے کی مختلف جہتوں کو واضح طور پر اجاگر کرتا ہے۔

دوسرے حصے کے تحت 'اردو رسم الخط — ایک تاریخی بحث، اردو رسم الخط: تہذیبی و لسانیاتی مطالعہ' اور 'اردو املا اور لسانیات' کے عنوانات سے مضامین شامل کیے گئے ہیں جن سے روایت اور اجتہاد پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ ان تینوں مشمولات کا محور و مرکز اردو رسم الخط ہے اور جو انتہائی علمی اور سائنسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کا شوشہ لسانی کی بجائے خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے صاف صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا ہے کہ اردو اور ہندی کے لیے ایک ہی رسم خط کا اختیار کیا جانا دونوں کے حق میں نقصان دہ ہے۔

زیر نظر کتاب کے تیسرے حصے میں تین ممتاز شخصیتوں دتا تریہ کیفی، احتشام حسین اور فرمان فتح پوری کی ادبی اور لسانیاتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے زبان سے متعلق بڑے اہم موقف کو بیان کیا گیا ہے جبکہ چوتھے حصے میں 'کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ، اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی، انجمن ترقی اردو کی کل ہند اردو کانفرنس، بہار کا تاریخی اقدام اور کل ہند غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس' سے متعلق مضامین ہیں۔ کربل کتھا پر ان کا مضمون جامع اور پرمغز ہے اور اردوئے دہلی کی کرخنداری بولی کا جائزہ بھی کافی بھرپور ہے جو نارنگ صاحب کی ایک اہم

لسانیاتی تلاش وجستجو ہے۔ اس طرح اردو کانفرنسوں میں شرکت کر کے اردو کے درپیش مسائل سے اہل زبان وادب کو آگاہ کرنے کی بے حد ادبی گفتگو نے اس حصے کو معنی خیز بنادیا ہے۔ اسی طرح بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے سے متعلق تاریخی اقدام پر پروفیسر نارنگ کی تحریر نے بھی معنویت کو بڑھایا ہے۔

پانچویں اور آخری حصے میں پانچ مضامین 'اردو زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت، ہمزہ کیوں؟، ن یا ن، اردو آوازوں کی نئی درجہ بندی اور اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی کے عنوانات سے ہیں۔ یہ تمام مضامین تکنیکی انداز میں خالص لسانیاتی نوعیت کے ہیں۔ یہ بیش تر وہ مضامین ہیں جن پر خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں۔ اردو آوازوں اور اردو مصوتوں کی نئی درجہ بندی کے حوالے سے شامل مضامین امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں لکھے گئے۔ آخر میں انگریزی کے دو مضامین اردو اور ہندی کی Generative Phonology کے مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ یہ وہ مضامین ہیں جو مختلف یونیورسٹیوں میں لسانیات کے کورسوں میں حوالہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

'اردو زبان اور لسانیات' گوپی چند نارنگ کے اردو سے متعلق موقف کا واضح اظہاریہ ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ نارنگ صاحب نہ صرف ایک ممتاز اور بلند پایہ نقاد اور نظریہ ساز ادیب ودانشور ہیں بلکہ ماہر لسانیات بھی ہیں۔ ان کے دلائل اتنے مربوط اور دل کش ہیں کہ ان کی تخلیقی وتنقیدی اور لسانیاتی فکر وبصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ پھر گیان چند جین جیسے منفی سوچ رکھنے والوں کے ذریعہ پیدا کی گئی تند فضا میں بروقت اس کتاب کی اشاعت سے اس کی معنی خیزی اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ اگر معاشرے کا کوئی ایک شخص ذہنی عدم توازن کا شکار ہو جائے تو پورے معاشرے کو عدم توازن کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ 'اردو زبان ولسانیات' جیسے ہتھیار اور تصنیف کی ضرورت ہے۔ رہی بات فرقہ پرستی کے توڑ کی تو گوپی چند نارنگ جیسے جید عالم کا ایک صفحہ ہی کافی ہے۔

'اردو زبان اور لسانیات' میں ہی نہیں نارنگ صاحب کی اکثر تصانیف سے اردو زبان کے بارے میں بار بار ان کا جو موقف سامنے آتا ہے جسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

1۔ اردو زبان ہندو اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئی اور اس کی حیثیت دو فرقوں کے درمیان ایک لسانی اور تہذیبی پل کی سی ہے۔

2۔ اردو گنگا جمنی تہذیب یعنی مشترک تہذیب کی بہترین ترجمان ہے۔

3۔ جمہوری ہندوستان میں سیکولرازم کا کوئی تصور اردو کے بغیر مکمل نہیں۔

4۔ ادبی اور جمالیاتی حسن کاری کے اعتبار سے ہندستانی زبانوں میں اردو کی حیثیت تاج محل کی سی ہے۔

5۔ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنا اردو کی شخصیت کے قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اردو کا تحفظ اس کے اپنے رسم الخط کے ساتھ ہونا چاہیے۔

6۔ اردو اور ہندی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں جو لسانی اور تعلیمی حقوق ہندی، بنگالی، گجراتی، مراٹھی وغیرہ کو حاصل ہے وہ اردو کو بھی مساویانہ طور پر ملنے چاہئیں۔ اردو علاقوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اسکولوں میں اردو تعلیم کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔

تقریباً پچاس برسوں سے پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے مندرجہ بالا Thesis کے ساتھ اردو کے دفاع میں سینہ سپر رہے ہیں۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی اردو کے سیکولر کردار اور حقوق کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ (ان کی 64 سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں چالیس پینتالیس اردو میں اور دس گیارہ ہندی اور انگریزی میں۔) اس موضوع پر بلاشبہ انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے ہوں گے۔ دنیا کے کونے کونے میں انہوں نے اردو کا پرچم بلند کیا۔ انھیں بیرونی دنیا میں بالعموم 'سفیر اردو' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں بلا مبالغہ نہیں کہ موجودہ عہد میں بشمول اردو کے دیگر ادیبوں کے کسی دوسرے جید ادیب نے اردو کے لسانی اور تہذیبی موقف کو سائنسی اور معروضی دلائل کے ساتھ اتنے موثر پیرائے میں بیان نہیں کیا ہوگا جتنا گوپی چند نارنگ نے کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنی مثال آپ ہیں اور ان کی خدمات بے مثل ہیں۔

قرآن کریم کی آیت ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَلَّا تَعْدِلُوْا (کسی قوم کی دشمنی میں عدل وانصاف سے منحرف ہوجانا، نہ اہل ایمان کا طریقہ ہے اور نہ ہی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔) تمام معاملات میں عدل وانصاف شرط ہے چاہے نظریاتی، لسانی، فکریاتی مسائل ہوں یا دیگر معاملات حزم، عدل واحتیاط برتنا ضروری ہے۔ گوپی چند نارنگ پر بہتان تراشی کرنے والے جن میں اکثر 'اہل ایمان' بھی شامل ہیں ذرا سوچیں کہ کہیں وہ قرآن کریم کی اس آیت یا فرمان کو مسترد کرنے کا گناہ تو نہیں کررہے ہیں۔

خدا انھیں توبہ کی توفیق دے!

اردو زبان ولسانیات، صفحات: 440 قیمت: 450 روپے
ناشر: رام پور رضا لائبریری قلعہ رام پور، رام پور یو پی۔ 244901

تبصرہ و تاثرات

شب خون کا آخری شمارہ اور انتخاب

عین تابش

دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اپنے آپ پر نازاں ہوں کہ میں ان فقیران جنوں میں ہوں جنھوں نے ادب وشاعری کو جزو ایمان ویقین بنا کر زندگی بسر کی ہے۔ میرے لئے ادب سامان تفریح اور وسیلۂ تکمیل شوق نہیں رہا ہے بلکہ یہ میری زندگی کی بنیادی ضرورتوں میں شامل رہا ہے۔ میں نے ادب سے عشق کیا ہے۔ اس کی خاطر مسکرایا اور رویا ہوں اور اس کی خاطر جاگا اور سویا ہوں۔

آج تو فضا میں بڑی آلودگی پھیل چکی ہے، ماحول زہریلا ہو چکا ہے۔ ان دنوں جب میں نے اور میرے دوستوں نے اس وادی الفت میں قدم رکھا تھا، یعنی آٹھویں دہے کا آغاز، ستر اکہتر کا زمانہ، تو ادب وفن سے رشتہ رومانی اور روحانی ہوا کرتا تھا۔ جدیدیت کا دور شباب تھا اور آج جو بات کہی جا رہی ہے کہ جدیدیت ترقی پسندی کی ضد کے طور پر سامنے آئی تھی تو یہ محض ایک بہتان ہے ورنہ حقیقت واقعہ یہ تھی کہ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند قدروں کے اثرات بجا طور پر ادبی وشعری ماحول پر موجود تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ایک زریں دور اپنا کارنامہ انجام دے کر ٹھہر رہا تھا اور ایک دوسرا ادبی دور اپنا آغاز کر چکا تھا اور اس دور کا تنہا اہم ترین ترجمان اور نمائندہ جو ادبی صحافت کی سطح پر تحریک کی شکل اختیار کر رہا تھا وہ شب خون تھا۔

ان دنوں ہماری صبحیں ادب کے نام سے شروع ہوتی تھیں اور شامیں ادبی گفتگو پر ختم ہوتی تھیں۔ ان کا محور مرکزی طور پر شب خون تھا اور اس کے علاوہ آہنگ، کتاب، تحریک، پیکر، سوغات، مورچہ، صبح نو، عصری ادب، شعر وحکمت، معیار، سطور اور غبار خاطر رسائل وجرائد تھے جو ہمارے ادبی سفر کے رفیق تھے۔ ان میں شب خون کو کلیدی حیثیت حاصل تھی اور وہ ایک طرح سے ہمارا ذہنی وادبی رہنما بن رہا تھا اور ہمارا سب سے پیارا دوست بھی جو ہمارے ادبی خوابوں کو مہمیز کرتا تھا اور اگر آپ ادب وشاعری کی روحانیت میں یقین رکھتے ہوں تو روحانی طور پر البتہ رشد وہدایت کے فریضے انجام دیتا تھا۔

یقیناً شب خون کے آغاز میں کچھ ایسی چیزیں ضرور سامنے آئیں، شعری اور نثری دونوں ہی، جو رائج ادبی مزاج سے یا روایت سے انحراف کا پتہ دے رہی تھیں اور بنے بنائے راستے پر چلنے والوں کو پریشان کر رہی تھیں اور تب سے زیادہ اب ان کے سائے پریشان کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے دراصل ان کے درمیان سے ہی راستہ نکالا۔ ادیب وشاعر کی حیثیت سے اعتبار حاصل ہونے کے مراحل سے گذرتے ہوئے اس رسالے نے کس کس طرح ہمارا ساتھ دیا ہمارے احساسات وافکار کی تہذیب کی اور ہمیں ادب لکھنے، ادب سوچنے اور ادب جینے کے مواقع فراہم کئے۔ ہمارے بہت ہی محترم نادیدہ بزرگ اسلم فرخی صاحب نے ایک جگہ مرحوم ضمیر نیازی صاحب کے حوالے سے لکھتے ہوئے حضرت سلطان جی سیدنا نظام الدین اولیا کی آرام گاہ کے قریب ایک مجذوب بزرگ شیخ شمس الدین اوتاداللہ کے مزار پر سایہ کئے ہوئے لیسواں درخت کا تذکرہ کیا ہے جو اوپر بڑھنے کے بجائے اطراف میں پھیلا ہوا ہے، اور لکھا ہے کہ "میں نے صحافت کے مرد بزرگ نیازی صاحب کو پہلے پہل دیکھا تو میرے ذہن میں اس بزرگ مہربان لیسواں پیڑ کا تصور فوری طور پر ابھرا۔" جی چاہتا ہے کہ میں موصوف کے اس خیال کو ادھار لوں اور کہوں کہ اس زمانے میں 'شب خون' کی حیثیت ہمارے لئے اسی لیسواں درخت کی تھی۔

کیا ملا ہمیں 'شب خون' سے، اس کا دیانت دارانہ محاکمہ اگر اب تک نہیں کیا جا سکا تو کل ضرور کیا جائے گا۔ لیکن اپنے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے یہ محسوس کرنے کی کوشش تو کرنی چاہئے کہ آخر وہ کون سی بات تھی جس نے چالیس برسوں سے زیادہ عرصے تک جدید ترقی پسند اذہان کو اپنے آپ میں باندھے رکھا اور وہ کون سا جادو تھا جس نے ایک تحریک ورجحان کے تنہا مضبوط نمائندے کی حیثیت سے ایک رسالے کو تازہ دم اور اس سے وابستہ اذہان وقلوب کو دنیا کے بڑے اور زندہ رہنے والے ہم عصر ادب کے شانہ بہ شانہ چلنے کا حوصلہ دیا۔ آپ عصر حاضر کی اردو غزل کو اگر ناصر کاظمی، ظفر اقبال، احمد مشتاق، منیر نیازی، حسن نعیم، مظہر امام، بانی، خلیل الرحمٰن اعظمی، عزیز حامد مدنی، ناصر شہزاد، شہریار، مظفر حنفی، مخمور سعیدی، توصیف تبسم، سلطان اختر، پرکاش فکری، عرفان صدیقی، افتخار عارف، سید امین اشرف اور اسعد بدایونی سے الگ کر کے اگر دیکھ سکتے

ہیں، اردو نظم کو میراجی، ن م راشد، اختر الایمان، عمیق حنفی، قاضی سلیم، بشر نواز، منیر نیازی، عادل منصوری، محمد علوی، ندا فاضلی، شفیق فاطمہ شعریٰ، جیلانی کامراں، زبیر رضوی، بلراج کومل، مغنی تبسم، وہاب دانش اور صلاح الدین پرویز کے بغیر احاطہ تصور میں لاسکتے ہیں، اردو افسانے کا ذکر انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، سریندر پرکاش، جیلانی بانو، غیاث احمد گدی، کلام حیدری اقبال متین، اقبال مجید، انور عظیم، احمد ہمیش، احمد یوسف نیر مسعود رشید امجد، خالدہ حسین، نابدہ حنا، شفق، عبد الصمد، شوکت حیات، حسین الحق، انور خاں اور سلام بن رزاق کے بغیر کر سکتے ہیں اور اردو تنقید پر کوئی گفتگو شمس الرحمان فاروقی، وزیر آغا، محمد حسن، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، وارث علوی، قمر رئیس، فضیل جعفری، عتیق اللہ، قاضی افضال حسین، ابوالکلام قاسمی، مہدی جعفر، انیس اشفاق اور خورشید احمد کے بغیر فرماسکتے ہیں تو پھر میں اپنی باتیں واپس لیتا ہوں۔

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام

میرے بھائی علی احمد فاطمی اور میرے دوست قاسم خورشید کہیں گے کہ تم یاد کر رہے ہو جدیدیت اور شب خون کے سفر کو اور تمہارے ذہن میں ترقی پسندی کی بجلیاں کوندرہی ہیں۔ تو میں ان کی جناب میں اپنی محبتیں پیش کرتے ہوئے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے بار بار اردو ادب کی تاریخ میں جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا ہے۔ ہمارا ادبی منظر نامہ ترقی پسندی کی یاد سے الگ ہو کر ایک ادھورا منظر نامہ ہوگا اسی طرح آج کا ادبی و شعری منظر نامہ جسے آپ مابعد جدید یا جدید تر یا کچھ اور کہہ لیں بہر صورت جدیدیت کی ہی توسیع ہے۔ بات تو دراصل اہم یہ ہے کہ جدیدیت نے شب خون کے ذریعہ جس طرح ادب و شعر کو نئے عالمی تناظر، ادبی افکار اور شعری و نثری سرمائے سے مالا مال کیا اس کی مثال ڈھونڈنی مشکل ہے۔ رسائل تو بہت نکلے اور انہوں نے لمبی عمریں بھی پائیں لیکن کسی رسالے نے ادبی نظریاتی اسکول قائم نہیں کیا۔

مجھے 1975 کے آس پاس کا وہ زمانہ یاد آرہا ہے جب میری اور میرے کئی دوستوں مثلاً اسعد بدایونی، صفدر، آشفتہ چنگیزی، شہپر رسول، کرشن کمار طور، فاروق شفق اور مہتاب حیدر نقوی وغیرہم کی غزلیں شائع ہونے لگی تھیں تو ہم ایک عجیب طرح کے ادبی سرور کا احساس کرنے لگے تھے۔ وہ ایک بڑا ہی دردمند اور انسانی قدروں سے خود کو جوڑتا ہوا ادبی قافلہ تھا۔ بہت سارے ایسے نام جو ہم سے ذرا پہلے سے شب خون میں شائع ہو رہے تھے اور بعد میں جن کی کم چیزیں شائع ہوئیں وہ بھی ہمارے اس جذباتی کارواں کا حصہ تھے۔ مثلاً وقار واثقی، کاوش بدری، ظفر غوری، عشرت ظفر، غلام مرتضیٰ راہی، سمیع آہوجہ، وقار ناصری، اکرام باگ، م ناگ، احمد سلیم، فخر رضوی، شمیم ہاشمی، سیف سہرامی، بدنام نظر، احتشام اختر، اختر یوسف، اعجاز احمد، حمید الماس عبدالرحیم نشتر، عقیل شاداب، عین رشید، منظور ہاشمی مدحت الاختر اور مصحف اقبال توصیفی وغیرہم۔ یہ تمام وہ قلم کار اور فن کار ہیں جنہوں نے اردو ادب و شاعری میں گراں قدر اضافے کئے اور جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کچھ ایسے اہم نام بھی ہیں جو بعد کے دنوں میں شب خون میں کم شائع ہوئے لیکن جو جدید ادیب و شاعر کی حیثیت سے ادبی منظر نامے پر چھائے رہے۔ مثلاً ظفر اوگانوی، علیم اللہ حالی، لطف الرحمٰن، فرحت قادری، شاہد احمد شعیب، شکیب ایاز، چندر پرکاش شاد، رونق شہری، ارمان نجمی، شمس ندیم اور بہت سارے دوسرے۔ شعر و ادب کا یہ دل کش اور ارتقا پذیر سفر جاری رہا اور وہ تمام ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ناقد اس ادبی کہکشاں میں شامل ہوتے گئے جن سے کل سے آج تک کا ادبی اعتبار موسوم اور موصوف ہے۔ خاص طور سے 1980 کے بعد کے تمام اہم نام شب خون کے قافلے کا حصہ ہیں۔ خواہ وہ عالم خورشید، شاہد اختر، راشد طراز، شفق سوپوری، بلقیس ظفیر الحسن، احمد محفوظ، سراج اجملی، اکرم محمود، پرتپال سنگھ بیتاب، جمیل الرحمٰن، جینت پرمار، ذیشان ساحل، خالد عبادی، عنبر بہرائچی، اکرام خاور، نعمان شوق اور صدیق عالم ہوں یا سکندر احمد، اکبر معصوم، صہبا وحید، عبدالجید اور فرحت احساس ہوں یا چودھری محمد نعیم، حبیب حق، خورشید اکبر اور رشید کوثر فاروقی ہوں۔ شب خون صرف ایک رسالہ نہیں تھا عصر حاضر میں اردو یا ہندوستانی زبان کا ادبی کلچر تھا۔

یہ سفر اپنی پوری تب و تاب کے ساتھ جاری تھا کہ اچانک محترم شمس الرحمان فاروقی نے اسے بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ضخیم آخری شمارے کا اعلان بھی ہوا جو چند ماہ بعد منظر عام پر آگیا۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

شب خون کا آخری شمارہ بعنوان سرمایہ بہاراں دو ہزار صفحات پر مشتمل سامنے آیا اور اس نے ثابت کر دیا کہ جس طرح شب خون کا آغاز اور اس کا پورا ارتقائی سفر غیر معمولی تھا ٹھیک اسی طرح اس کا آخری شمارہ بھی غیر معمولی اور تاریخی اور دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا سب سے اہم ہے کہ اس شمارے کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اسے اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز رکھیں گی اور جنہیں اس کی انفرادیت کے زمرے میں رکھا جائے گا۔ جب میں نے اس نظر سے اسے دیکھنا شروع کیا تو چند ایسے خصائص مجھے نظر آئے جن کو اس رسالے سے یا اس کے بانی مدیر مرتب شمس الرحمان فاروقی سے ہی منسوب کیا جاسکتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں (میرے علم کی حد تک) شائد کسی رسالے نے ایک ضخیم شمارے یا اپنے آخری شمارے میں ایسی ہنرمندی کے ساتھ اپنے طویل ادبی اور صحافتی (وہ بھی چالیس سالہ) سفر کا عملی محاکمہ اس طرح نہیں پیش کیا ہے کہ مستقبل کے لئے وہ اپنے عہد کی تاریخی دستاویز بن جائے۔ سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسے رسالے کے ساتھ ہونے والا معاملہ ہے جس کے مدیر نے کبھی کوئی اداریہ نہیں لکھا، ہدایت نامہ نہیں قائم کیا اور شماروں میں اپنی طرف سے کوئی رائے مشورہ نہیں دیا کہ یوں لکھو اور یوں نہ لکھو۔

یہ کسی رسالے کا پہلا ایسا وقیع انتخاب اور آخری شمارہ ہے جس کی ایک جھلک یہ بتا دینے کے لئے کافی ہے کہ چالیس برسوں کے بے حد طویل عرصے میں اس رسالے کے قلمی معاونین، شاعر، افسانہ نگار، ناقد اور مضمون نگار یہاں تک کہ مراسلہ نگار بھی رسالے کے مزاج اور طرز فکر سے ہم آہنگ رہے لا ماشا اللہ۔ اس کا اندازہ آخری شمارے کے حصہ اول میں احمد مشتاق کی غزل سے عرفان ستار کی غزلوں (خصوصی پیش کش) تک میں ہوتا ہے۔ یہ حصہ آخری شمارے میں شامل کی گئی تازہ تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اس حصے میں ترجمے، اور دو رسم الخط پر اہم تحریریں، شب خون از اول تا آخر، کے جائزے کے تحت تین مختصر مضامین، کتابوں پر تبصرے، خطوط، اخبار واذکار اور اس بزم میں کے تحت قلم کاروں کا تعارف اور مصورین و خطاطان کی فہرست شامل ہے۔

حصہ اول جیسا کہ عرض کیا گیا تازہ تخلیقات پر مشتمل ہے۔ اپنے آپ میں بھرپور اور قابل مطالعہ ہے۔ اس میں شب خون کے اہم شاعر، افسانہ نگار، ناقد اور دیگر نوعیتوں کے قلم کار شامل کئے گئے ہیں۔ اگرچہ اس میں کئی مستقل اور منہمک قلم کار چھوٹ گئے ہیں اس کے باوجود اس کی وقعت واہمیت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے بلکہ بعض ایسے بزرگ اور جید ناقدین و محققین کی شمولیت اس کی وسعت و ہمہ گیری پر دال ہے، جن کو عموماً شب خون کے مشن اور مزاج سے الگ سمجھا جاتا رہا ہے۔ مثلاً، پروفیسر مختار الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، فرمان فتح پوری، پروفیسر جعفر رضا، عبدالماجد دریابادی، باقر مہدی اور کرامت علی کرامت۔ اپنے وسیع دائرۂ عمل اور دائرۂ ادب کی طرف اس حصے کے پیش لفظ میں ادارے کی طرف سے چند بہت قابل مطالعہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ جن کا روئے سخن فطری طور پر ان معترض دوستوں کی طرف ہے جنہوں نے ہمیشہ شب خون اور جدیدیت کو ترقی پسندی کی ضد سمجھا اور اس سے زیادہ معصوم ادب دوستوں کو سمجھایا۔ ملاحظہ ہو۔

"یہ بات اکثر کہی گئی کہ شب خون دراصل ترقی پسندی کی دشمنی میں نکالا گیا تھا۔ لیکن اس رسالے میں شروع ہی سے متعدد بڑے ترقی پسند ادیبوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ شب خون کا سروکار اچھے ادب سے تھا۔ ترقی پسند دشمن ہونے سے اچھا ادب نہیں پیدا ہوتا۔"

اور پیش لفظ کی آخری سطر بھی دیکھ لی جائے جو اس طرح ہے۔

"شب خون کے پہلے مدیر ڈاکٹر سید اعجاز حسین تھے۔ اس کے دفتر کا اجرا پروفیسر سید احتشام حسین کے دست مبارک سے ہوا تھا۔ شب خون کا یہ آخری شمارہ ان کے اسمائے سامی سے معنون کیا جاتا ہے۔"

حصہ دوم دراصل اس آخری شمارے کی روح ہے۔ اگر کسی بندۂ خدا نے اس پورے عرصۂ اشاعت کے شمارے نہیں دیکھے ہیں تو وہ آئے اور اس شمارے کا دیدار کر لے۔ اس میں وہ گراں بہا شعری تخلیقات جلوہ کرتی ہیں جن کو بجا طور پر چالیس برسوں کا بہترین انتخاب کہلانے کا حق حاصل ہے۔ وہ افسانے اس میں منتخب ہیں جن کے ذریعہ جدید اردو افسانے کے چالیس سالہ سمت و رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ایسے پر مغز، فکر انگیز اور عہد آفریں مضامین، مباحث اور تبصرے اس میں چن لئے گئے ہیں جنہوں نے جدیدیت اور شب خون کی بزم تو سجائی ہی جدید ادب کی رجحانی اور نظری کلاسکیت کو بڑے تزک و احتشام اور ادبی مجتہدانہ التزام کے ساتھ پیش کرنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یہ تمام منتخب تخلیقات اور تحریریں اگر ایک طرف اردو ادب کے ایک اہم دور اور عہد ساز تحریک و رجحان سے متعارف کرا دیتے ہیں تو دوسری طرف جدیدیت اور شب خون کے قافلہ سالار، ناقد، شاعر اور فکشن نگار شمس الرحمان فاروقی کی فکری اور ادبی و علمی وسعت و وقعت سے بھی روشناس کراتی ہیں۔ انہوں نے جدیدیت کو ایک ممتاز رجحان بنانے، اسے ایک تحریک کی شکل دینے اور شب خون کے ذریعہ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت بلکہ ذہن سازی میں جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اس ضخیم آخری شمارے کے انتخاب سے اس کی توثیق و تائید ہوتی ہے اور اس سے پردہ پوشی یا انکار کتمان حق اور ادبی ناقدری کے مترادف ہے۔ موصوف جدید ادب و شاعری کے اس قافلے میں شامل ہر کبیر و صغیر کے شکریے کے مستحق ہیں۔ بیگم جمیلہ فاروقی نے جس قلبی انہماک، ادب دوستی اور بے لوث جذبے کے ساتھ چالیس برسوں تک پردہ اخفا میں رہ کر شب خون کو اسپانسر کیا تو وہ بلاشبہ اس رسالے کی ریڑھ کی ہڈی کہی جا سکتی ہیں اور جب تک علم و ادب کی گفتگو قائم رہے گی انہیں یاد کیا جاتا رہے گا۔ شب خون کے قلم کار اور قارئین بصمیم قلب انہیں سلام کرتے ہیں۔

شب خون حصۂ اول اور شب خون حصۂ دوم (سرمایۂ بہاراں) صفحات: 1984 (1 تا 608 اور 609 تا 1984) قیمت (مکمل دو جلدیں): 750 روپے،
ناشر: ماہنامہ شب خون 29 جی ہیسٹنگز روڈ الہ آباد-211001

تبصرہ

اطہر رضوی: گر ہم برا نہ مانیں...

ڈاکٹر ستیہ پال آنند

کچھ اصناف نثر ایسی ہیں، جن کی حدود فاصل متعین نہیں ہیں، اور کئی بار ایک صنف اپنی حدود کو پھلانگ کر دوسری میں وارد ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ حد تک مشابہت رکھنے والی اس دوسری صنف میں گل افشانی کرنے کے بعد یہ اپنے حصار میں واپس آجاتی ہے۔ یہ چند تمہیدی جملے لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جناب اطہر رضوی کی کتاب 'گر ہم برا نہ مانیں...' پڑھنے کے بعد اسے کس ایک صنف کے زیر تحویل محبوس کرنے میں مجھے دقت پیش آئی۔ یہ کتاب بیک وقت سفر نامہ بھی ہے، رپورتاژ بھی ہے، تاریخ، ثقافت اور سیاسیات کے میدانوں میں کھوج اور تحقیق کی بیانیہ تفصیل پر مبنی مضامین کا مجموعہ بھی ہے، اور ذاتی، بلکہ وارداتی واقعات کا لیکھا جوکھا بھی ہے۔ اگر نہیں ہے، تو یہ کتاب فکشن نہیں ہے، اور یہ کمی وہ تاریخی واقعات پوری کر دیتے ہیں، جنہیں مصنف نے ایک کہانی کار کی طرح قلم بند کیا ہے، اور جنہیں پڑھنے میں قاری کو وہی لطف ملتا ہے، جو کسی الف لیلوی داستان کو پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اطہر رضوی صاحب کے کچھ دیگر سفر ناموں میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں، لیکن 'گر ہم برا نہ مانیں...' میں ان خوبیوں کا بدرجہ اتم ہونا ان کی فعال اور ہمہ جہت شخصیت کے اس رخ کو ظاہر کرتا ہے، جو اس کتاب کا خاصہ ہے کہ سفر نامہ صرف سفر نامہ نہ ہو کر اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ شرط اس باریک بینی کی ہے جو سیاح اپنے ذہنی کیمکارڈر میں محفوظ رکھتا ہے۔

''گر ہم برا نہ مانیں...' اطہر رضوی صاحب کے حالیہ سفر ہندوستان کی داستان ہے۔ اس داستان کے درجنوں پہلو ہیں۔ کیونکہ مصنف کا قلم اپنی تیز روی میں اس سرعت کے ساتھ قدم زن ہے کہ کسی پہلے سے طے شدہ مقالے کی سی 'آؤٹ لائن' یا دائرے کے اندر کسی مدار و حصار کا تصور ہی غیر ممکن ہے۔ البتہ ان ابواب میں ایک اسٹرکچرل مضبوطی ہے، جو تاریخی شہروں یا شہروں کی تاریخ کے بارے میں ہیں۔ دہلی، بھوپال، لکھنو، علی گڑھ، رام پور کے شہروں کی مسلم تہذیب، ان کے اسلامی معاشرے، مختصر تاریخ، عمارات، مساجد، خانقاہوں، باغات، جھیلوں اور تالابوں یا بلدیاتی منظر ناموں کو ان کا ذہنی کیمکارڈر نہ صرف 'لوکل کلر' کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ تاریخی پس منظر بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ کچھ دیگر ابواب میں البتہ مصنف کا قلم ایک طرح کی شعوری رو کا وطیرہ اپناتا ہے، اور شخصیات سے تاریخ، تاریخ سے سیاست، سیاست سے ادب اور اس سے متعلقہ مسائل۔ ادب سے اردو کی صورت حال، اردو سے ہندوستان اور پاکستان کی باہمی رنجش یا دوبارہ دوستی کے اقدام، اس منظر نامے سے پاکستان میں وہابیت کے زیر اثر، طالبان کا سا دل و دماغ رکھنے والے مسلمانوں کے عورتوں کے ساتھ نازیبا سلوک تک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک گل چیں کی طرح مصنف مختلف کیاریوں سے مختلف رنگوں کے پھولوں کو چنتا چلا جا رہا ہے، اور ان سب کو گوندھنے اور گلدستے کی صورت میں باندھنے کے عمل میں وہ انہیں Organic Unity دے رہا ہے۔ کسی مبتدی کے ہاتھوں میں اتنی سکت شاید نہ ہوتی کہ وہ ان مختلف النوع موضوعات کو یک جا کر سکتا، مگر اطہر رضوی صاحب ایک منجھے ہوئے قلم کار ہیں اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی قاری کے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیتے، انگلی پکڑے ہوئے ساتھ لئے چلتے ہیں اور ایک ٹورسٹ گائیڈ کی طرح کسی عمارت، منظر، تاریخی شخصیت کے اوصاف گنوائے چلے جاتے ہیں۔

راست گوئی اطہر رضوی صاحب کا اصول اول ہے۔ اگر وہ 'لکھنو کی ذیلی تہذیب' میں محرم اور اس سے متعلقہ تعزیہ داری کے اصولوں، ضابطوں اور گذشتہ کچھ صدیوں میں بدلتے ہوئے رواجوں کا ذکر کرتے ہیں، وہاں وہ یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ "بہ حیثیت مجموعی، مجھ ناچیز کی نظر میں عصر حاضر کی مجالس محرم امام حسین کی عظیم قربانی اور ان کے پیغام کی کما حقہ صورت گری نہیں کرتی ہیں۔"

اب ایک طائرانہ نظر ان ابواب پر ضروری ہو جاتی ہے، جو اردو زبان و ادب اور اس سے متعلقہ مسائل سے منسلک ہیں۔ اس کی شروعات 'اردو کی نئی بستیاں' سیمنار سے ہے۔ یہ سیمنار دہلی میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ چیرمین ساہتیہ اکادمی کی زیر نگرانی منعقد ہوا۔ (راقم الحروف کچھ انکسار کے

ساتھ اس بات کا داعی ہے کہ 'اردو کی نئی بستیاں' اس کی اختراع ہے اور پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی کے رسالے 'کتاب نما' میں ایک مہمان اداریہ کے عنوان کے طور پر راقم الحروف نے استعمال کی جو سات برس پہلے شائع ہوا۔ بعد میں یہ سکہ رائج الوقت ہوگئی) سیمنار کی اس رپورٹ میں جہاں دو یا تین دل چسپ واقعات یا نوک جھونک کے نمونے ملتے ہیں، وہاں ہمیں مصنف کے اپنے مقالے 'کناڈا میں اردو' کی تفصیل ملتی ہے، جو بشمولیت ایک درجن سے زائد ناموں کے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ بہر حال اس کا فوکل پوائنٹ 'ٹورنٹو یا اس کے گرد نواح میں شائقین اردو کی سرگرمیاں ہیں۔ اطہر رضوی صاحب کا دولت کدہ اپنے آپ میں ان سرگرمیوں کا منبع اور محور ہے اور اس کی تفصیل کماحقہ طور پر موجود ہے۔ کاش اس باب میں ان دیگر مقالوں کے بارے میں کچھ واقفیت مہیا کی جاتی جو وہاں پڑھے گئے۔ یا کم از کم ان کی ایک فہرست ہی پیش کردی جاتی، مگر فاضل مصنف نے یہ مناسب نہیں سمجھا۔

'بھوپال، شہر اقبال' جہاں اقبال کے بھوپال سے تعلق اور اس سے وابستہ کڑیاں آپس میں جوڑتا ہے وہاں بھوپال کی مختصر تاریخ، عمارات، تالابوں، مسجدوں، مدرسوں کی واقفیت بھی دیتا ہے۔ مصنف کا یہ کہنا بجا ہے کہ اسلام اور ہندوستان کے تناظر میں اقبال بیسویں صدی کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ لیکن یہ کم افسوس کی بات نہیں ہے کہ ان کے پیدائشی وطن پاکستان میں انہیں وہ درجہ یا رتبہ نہیں دیا گیا جو ایران میں خمینی کو یا ترکی میں اتاترک کو دیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ غالبیات کے بعد اقبالیات پر سب سے زیادہ تحقیقی کام ہوا ہے۔ لیکن راقم الحروف کی رائے میں اگر اس کام کے ذخیرے میں غالب پر مالک رام اور کالی داس گپتا رضا، اور اقبال پر کام میں سے جگن ناتھ آزاد کا نام منہا کردیا جائے تو باقی جو کچھ بچتا ہے وہ نا کافی ہے اور یہ تینوں محقق غیر مسلم ہیں اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھوپال کے حوالے سے بشیر بدر کے بارے میں بھی دو جملے ہیں۔ یہ راقم الحروف کے کانوں سنی بات ہے کہ بشیر بدر نے کہا تھا کہ دور حاظر میں ان کے قد کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ ان کے قد کا موازنہ تو میر اور غالب سے کیا جانا چاہئے۔ ایک 'بونے' شاعر کی اپنے ادبی قد کے بارے میں یہ ڈینگ سن کر، مرحوم مشفق خواجہ نے اپنے ایک مضمون میں طنزیہ لہجے میں کہا تھا: ''میر اور غالب تو کیا اگر شیکسپیر بھی بشیر بدر کے ادبی قد کے بالمقابل کھڑا ہو جاتا، تو بونا کہلاتا!''

'سرسید اور علی گڑھ' بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں سرسید کی زندگی اور ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت کو نفاست سے ابھارا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے لوگ انہیں صرف ماہر تعلیم ہونے یا مسلمانوں میں جدید تعلیم کا جذبہ پیدا کرنے کی وجہ سے جانتے ہیں، یا برٹش سرکار کو یہ باور کرانے کے تاریخی رول کی وجہ سے کہ مسلمان بھی ہندوستان کے ایسے ہی شہری ہیں، جیسے کہ دوسرے مذہب کے لوگ ہیں۔ مگر یہ فراموش کردیتے ہیں کہ وہ ایک اسکالر، ماہر تاریخ داں اور فلسفی بھی تھے۔ اطہر رضوی صاحب نے سرسید کی ابتدائی تصنیفات 'جام جم' اور 'آثار الصنادید' کا جائزہ لیا ہے۔ تحقیق کے میدان میں آئین اکبری کی تصحیح، تہذیب الاخلاق، تصحیح تاریخ فیروز شاہی وغیرہ تاریخی اور تحقیقی مقالوں کو لوگ اب بھلا چکے ہیں۔ سر ولیم میور کی بدنام زمانہ کتاب The Life of Mohammad کا جو دنداں شکن جواب سرسید نے دیا اس کا ذکر مصنف نے جلی حروف میں کیا ہے۔ اطہر رضوی مولانا حالی سے اس بارے میں اختلاف رکھتے ہیں کہ ''سرسید کو انگریزی نہیں آتی تھی۔'' ثبوت کے طور پر وہ درجنوں انگریزی الفاظ پیش کرتے ہیں جو سرسید نے اپنی تصانیف میں اردو رسم الخط میں یا کہیں کہیں انگریزی ہجوں کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔

اس مجموعے کا سب سے زیادہ فکر آمیز مضمون 'ہندوستانی جمہوریت اور مسلمان' ہے۔ اس میں کوئی لاگ لپیٹ رکھے بغیر اطہر رضوی صاحب نے تقسیم وطن سے پہلے کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اطہر رضوی میرے پسندیدہ اہل قلم میں سے ہیں۔ ان کی سبھی کتابیں خدا کے منتخب بندے، ہر ملک ملک ماست، تاریخ کا سفر، کون عبث بدنام ہوا؟ میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ کچھ ایسے حقائق کی توثیق و تعریف کے لئے میں ان کتابوں سے اکثر استفادہ کرتا ہوں، جو درس و تدریس یا مضمون نویسی میں میرے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔ وہ ایک دانش ور محقق ہیں جو تاریخ، فلسفہ، اسلامیات، سبھی شعبوں میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ راست گوئی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ لاگ لپیٹ کے بغیر حقائق کو بعینہ پیش کرتے ہیں۔ اور ان حقائق کی روشنی میں اندرون ملک یا بین الاقوامی واقعات پر ان کا تبصرہ سچا ہوتا ہے۔ سفر ناموں میں ان کا ذوق تجسس ذوق علمی سے مملو ہے اور اسی لئے وہ نہ تو کنکر کو ہیرا سمجھتے ہیں اور نہ ہی ہیرے کو کنکر۔ یہی ایک ایمان دار جوہری کی پہچان ہے۔

گر ہم برا نہ مانیں...، صفحات: 226، قیمت: 200 روپے، ناشر: اطہر رضوی، **5164 Hidden Velley Court Ontario**، **Canada**، ملنے کا پتہ: (ہندوستان) شاہد پبلی کیشنز 2253 ریشم اسٹریٹ کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی۔110002 (پاکستان) احمد پبلی کیشنز انار کلی بازار لاہور؛ بختیار اکادمی، گلشن اقبال، کراچی

تبصرہ

اردو سیاست: ڈاکٹر اطہر فاروقی

ڈاکٹر محمد کاظم

Redifining Urdu Politics in India اطہر فاروقی کی اسی سال اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس سے انگریزی میں شائع ہونے والی وہ کتاب ہے جسے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اس غریب الوطن زبان کے تمام تر مسائل کو سمجھنے کے لئے یقیناً ایک حوالے کی کتاب کے طور پر برتا جائے گا۔ اطہر فاروقی نے اردو کے سیاسی و سماجی محرکات کا مطالعہ ایک اردو صحافی کے طور پر کرنا شروع کیا تھا۔ اردو صحافت سے ان کی ابتدائی وابستگی ظلمت پسند اور شمال ہند کی سیاست کے تابع مسلمانوں کے زخموں کی تجارت کرنے والی اس جذباتی اور تخریب کارانہ صحافت کے ذریعے ہوئی جس کا مرکز دہلی میں تھا۔ اردو صحافت سے اس وابستگی نے اطہر فاروقی کو اردو اور مسلمانوں کے رشتوں کے اس پیچیدہ موضوع کو سمجھنے کی بصیرت بھی عطا کی۔ اطہر فاروقی نے اردو زبان کے ان تمام زاویوں پر لکھا جن پر پہلے کبھی نہیں لکھا گیا تھا۔ انہوں نے لکھا بھی اس مہارت کے ساتھ کہ موضوع کو پانی کر دیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ آج بھی اس موضوع پر اردو میں لکھنے یا اس موضوع کو سمجھنے والا اطہر فاروقی کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ مغرب اور خود ہندستان میں بھی انگریزی میں ان کی تحریروں کے زیر اثر بہت سی علمی تحریریں اردو زبان کے سیاسی و سماجی زاویوں پر لکھی گئیں۔ اطہر فاروقی نے ہی ہندستان میں پہلی بار اردو تعلیم کے اعداد و شمار جمع کیے۔ ان کی بنیاد پر پہلے خود لکھا اور پھر دوسروں سے بھی لکھوایا۔ اطہر فاروقی کے ذریعے اخذ کیے گئے نتائج بھی بار بار بدلتے رہے۔ اطہر فاروقی نے کئی بار جب خود اپنے لکھے ہوئے ہی کو مسترد کیا تو اس میں ایک عالم کی شان دکھائی دی۔ اول اول اطہر فاروقی نے اس امر پر زور دیا تھا کہ اردو کا تحفظ صرف دینی مدارس اس لیے کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس دوسرا کوئی عملی ذریعہ اردو کے تحفظ کا نہیں بچا ہے۔ بعد میں ان کا یہ خیال تبدیل ہوا اور انھوں نے اس امر پر مدلل طریقے سے زور دیا کہ وہ بچے جنھیں اپنے خراب اقتصادی حالات کے سبب کسی طرح کی تعلیم بھی پرائیویٹ اسکولوں میں مل ہی نہیں سکتی اس لیے سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنا ان بچوں کے لیے مدرسے کی کل وقتی تعلیم سے کہیں بہتر متبادل ہے۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے نظم کے لیے اطہر فاروقی نے ایک Activist کے طور پر ہر وہ کام بھی کیا جو اردو تعلیم کے احیا میں معاون ہو سکتا تھا۔ وہ غالباً اردو کے پہلے Activist ہیں جنھوں نے کبھی اپنے لیے کوئی لیڈر شپ رول تلاش نہیں کیا۔ حکومت کے اداروں کی رکنیت کے لیے بھی گداگری نہیں کی۔ حکومت کے ہر طرح کے اردو اداروں اور اردو کے اشراف سے بھی وہ مکمل طور پر دور ہی رہے۔

جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے کی تحریر کے مرحلے میں انہوں نے اس صورت حال کا مطالعہ جو اردو زبان اور اردو تعلیم کا منظر نامہ ترتیب دیتی تھی، تقریباً دس برسوں تک پورے انہماک کے ساتھ ایک بے حد سنجیدہ طالب علم کے طور پر کیا۔ آہستہ آہستہ اردو زبان کے مسائل کے سیاسی و سماجی مطالعے اور اردو تعلیم کے اس منظر نامے میں جو علمی افق پر نمودار ہوا اطہر فاروقی کی شخصیت منارۂ نور کی طرح تھی۔ 1996 میں مشہور برطانوی اسکالر رالف رسل نے ہندستان میں اردو تعلیم پر اپنا مشہور مضمون Urdu in India Since Independence لکھا جس کی بنیاد ہی اطہر فاروقی کی تحریروں پر تھی۔ یہ مضمون متعدد اردو اور انگریزی اخبارات و جرائد میں شائع ہوا اور رالف رسل کی کتاب How Not to Write the History of Urdu Literature and Other Essays میں شامل ہے جسے اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس نئی دہلی نے 1996 میں شائع کیا تھا۔ اطہر فاروقی کے علمی نظریات کی اساس پر مباحثہ ہی رالف رسل کے مضمون کے بیش تر دلائل کا مرکز تھا۔

زیر تبصرہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ کتاب میں اکثریت ان مضامین کی ہے جو اُس بین الاقوامی اردو کانفرنس میں پڑھے گئے جس کا انعقاد 2002 میں اطہر فاروقی نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں دنیا بھر کی دانش گاہوں سے سماجی علوم کے مقتدر علما نے شرکت کی تھی اور ان کے ساتھ ہندستان کے ماہرین تعلیم اور دانش ور بھی اس کانفرنس میں شریک تھے۔ اپنے انعقاد کے اعتبار سے یہ ہندستان کی حد تک اردو کی سب سے بڑی کانفرنس تھی۔ پہلی مرتبہ کسی رضا کار ادارے کی طرف سے منعقد کی گئی

کانفرنس میں ہر ریاست کا ایجوکیشن سکریٹری شریک ہوا۔ اس کانفرنس کے مباحث اس درجہ سنجیدہ، بلیغ اور معروضی تھے کہ بغیر کسی مبالغے کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ ہندستان کی حد تک اردو کے معاملات میں یہ کانفرنس اور اس میں پڑھے گئے مضامین سنگ میل ثابت ہوں گے۔ اس بات کی بھی پوری امید ہے کہ اس کانفرنس کے مباحث ہی آئندہ اردو زبان اور تعلیم کے اس علمی ایجنڈے کا تعین کریں گے جو پالیسی سازوں کو Input فراہم کر سکے۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں (اس وقت) کی اپوزیشن لیڈر اور کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے الوداعی خطبہ پڑھا تھا۔ یہ خطبہ ان معنوں میں اہم تھا کہ اس میں کانگریس کے اس روایتی نظریے کی جھلک کہیں نہیں تھی جو اردو اور مسلمانوں سے متعلق کانگریس کی Populist اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کی معروف پالیسی کا حصہ ہے۔ سونیا گاندھی نے بھی اپنے خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم ہی اردو کی ترقی کا اسمِ اعظم ہے۔ کتاب میں سونیا گاندھی کے خطبے کا متن ضمیمہ نمبر 2 میں شامل ہے۔

جب دو برس بعد 2004 میں کانگریس برسر اقتدار آئی تو اس نے 2005-6 کے سالانہ بجٹ میں اردو تعلیم کے لیے 800 کروڑ روپے مختص کیے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ رقم اردو تعلیم پر اس لیے بالکل ہی خرچ نہ ہو سکی کیوں کہ اردو تعلیم دینے کے لیے کوئی انفراسٹرکچر infrastructure موجود ہی نہیں ہے۔ اردو اور مسلم سیاست کو نہ تو اس رقم کے مختص ہونے کی خبر ہوئی اور نہ ہی اس کے Lapse ہو جانے کی۔ بہر حال اس رقم کا مختص کیا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ پالیسی سازوں نے سنجیدگی سے اس مسئلے پر (وقتی طور پر ہی سہی) توجہ تو کی۔ اس کانفرنس کی قراردادیں بلاشبہ ہندستان میں اردو سے متعلق ایسا دستاویز ہیں کہ ان کا سہارا لیے بغیر اردو کے لیے کوئی پالیسی پلاننگ ممکن نہیں۔ بہ شمول دیگر باتوں کے یہ قراردادیں اول تو گجرال کمیٹی کی ان انتہائی لچر قسم کی Populist پالیسیوں کے اس سب سے ناکارہ حصے کی پول کھولتی ہیں جس میں سہ لسانی فارمولے میں اردو مادری زبان والے بچوں پر بڑے منظم طریقے سے ہندی کو زبان اول کے طور پر مسلط کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ دوم یہ قراردادیں سہ لسانی فارمولے کے صحیح طرز پر نفاذ کی سفارشات عام فہم تشریح کے ساتھ کرتی ہیں۔ ان قراردادوں کی سب سے بڑی خصوصیت حکومتِ ہند کی معروف احمقانہ اور Populist مدرسوں کی جدید کاری کی اسکیم ہے جس کا مقصد دینی مدارس کو چند ٹکے دے کر سرکاری خزانے کے دروازے آر ایس ایس کی تنظیموں پر وا کرنا ہے۔ ان قراردادوں میں مدارس کی جدید کاری کی اس اسکیم کو فوراً بند کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور پہلی دفعہ اردو والوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی بھی طرح کے مذہبی اداروں کو دی جانے والی حکومت کی امداد چوں کہ مکمل طور پر غیر آئینی ہے یوں حکومت کے ذریعے مدارس کی جدید کاری ہندستان کے سیکولر جمہوری نظام کے لیے سم قاتل ہے۔ یہ قراردادیں کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر 1 میں شامل ہیں۔

کتاب میں خصوصاً ہندستان کے جن مقتدر علما کے مضامین شامل ہیں وہ قومی تعلیمی اور لسانی تناظر میں اردو کے لیے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً ہندستان میں دوسری نسل کے سوشولوجسٹ پروفیسر یوگیندر سنگھ اور مشہور سیاسی مفکر اور دانش ور پروفیسر پرتاپ بھانو مہتا (جو مقتدر نظریہ ساز ادارے سینٹر فار پالیسی ریسرچ، کے صدر ہیں) کے مضامین بلاشبہ اب تک اردو سے متعلق لکھی گئی ہندستان کے ان تمام اردو داں دانش وروں کی تحریروں پر سبقت رکھتے ہیں جنھوں نے اردو سے متعلق کسی ایسے موضوع پر لکھا جو علمی نظریہ سازی میں معاون ہو سکتا تھا۔

کتاب کا پیش لفظ مشہور سیاست داں سلمان خورشید نے لکھا ہے جو کانگریس کے اہم لیڈر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے نواسے ہیں۔ آزادی کے بعد پہلی دفعہ کانگریس کے کسی رہنما نے اردو سے متعلق کوئی ایسی تحریر لکھی ہے جس کا کانگریس کے Centrist سیاسی کردار سے کچھ تعلق نہیں۔ نہ صرف یہ کہ یہ مضمون Populist نہیں ہے بلکہ اردو کے تناظر میں مسلم سیاست کی تفہیم کے نئے زاویوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ دینی مدارس سے متعلق بھی سلمان خورشید نے بڑی بے باک باتیں عالمانہ انداز میں کہی ہیں۔ نہرو کے بعد کسی کانگریسی سیاست داں کی اردو کے مسئلے پر یہ پہلی عالمانہ تحریر ہے۔ کاش کانگریس کی سیاست اور اعلا قیادت کو اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کر سکے۔ سلمان خورشید کے اس مضمون کا فائدہ کانگریس کو براہ راست ان معنوں میں ہوگا کہ اب تک اس کے مسلم رہنما اردو سے متعلق اپنی تحریر و تقریر میں جس طرح کے جوکر نظر آتے ہیں، اس مضمون سے (کانگریس کے مسلم رہنماؤں کی) وہ امیج بدلے گی۔

کتاب کے پہلے حصے کا عنوان 'اردو کے سیاق و سباق کا تعین' Contextualizing Urdu ہے جس میں شامل مضامین اردو کا مطالعہ معاصر تاریخ کے پس منظر میں کرتے ہیں۔ پرتاپ بھانو مہتا کا مضمون ہندستان کے معاصر سیاسی و سماجی تناظر میں اور عمومی سطح پر زبانوں کے مقام اور ہندستان میں اردو کے حوالے سے ایسے سوالات قائم کرتا ہے جو اب تک ناشنیدہ ہی رہے ہیں۔ اس مقالے میں اردو کے مستقبل کو سیاسی نظریے کے مخصوص مسائل سے وابستہ کر کے دیکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

مشہور مورخ، مستشرق اور بہشتی زیور کے شہرۂ آفاق انگریزی ترجمے کی خالق باربرا میٹکاف اردو کو تاریخ کے آئینے میں دیکھتے ہوئے خصوصاً ان اسباب کی

نشان دہی کرتی ہیں جو برِ صغیر کی تقسیم کے سبب اردو کا مقدر بن گئے اور اردو ایک ایسی زبان میں تبدیل ہوئی جس کا کوئی (سیاسی) جغرافیائی علاقہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس تاریخی حقیقت کے باوجود کہ پاکستان اردو کا سیاسی طور پر جغرافیائی علاقہ قرار پایا، یہ بہر حال ہونا چاہیے تھا کہ آئینی طور پر ہندستان کے ان شہریوں کے لیے اردو کی تعلیم کا التزام کیا جاتا جو اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے ہیں۔

یوگیندر سنگھ اردو کو مسلم تشخص کا ایک نہایت اہم عنصر تسلیم کرتے ہوئے اپنے مضمون کے مباحث میں تشخص اور قانونی جواز کے مسائل اٹھاتے ہوئے، پالیسی نفاذ کے تناظر میں ہندستان میں مسلم فرقے کے ساتھ اردو کے رشتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلم فرقے کی تہذیبی شناخت ایک ایسی سمت میں ارتقا پذیر ہے، جو تہذیبی تکثیریت، بے تعصب جمہوریت اور سماجی و اقتصادی جدید کاری کی اقدار کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ پھر بھی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں میں جزو اجزو افرقہ سازی (Ethnicization) کا رجحان ملتا ہے۔

تھیوڈر پی رائٹ جونیر سیاسیات کے مشہور امریکی پروفیسر ہیں۔ پچاس برس سے بھی زیادہ عرصے سے وہ ہندستان میں مسلم سماج کے مختلف زاویوں کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور مسلم سیاسی اشراف پر ان کا کام اعلا درجے کا ہے۔ انھوں نے ہندستان کے تمام مشہور سیاسی خاندانوں کے شجرے اس طرح ترتیب دیے ہیں کہ ان خاندانوں کے سماجی رجحان ان کے سیاسی رویوں کے غماز بن جاتے ہیں۔

دوسرے حصے کا عنوان 'اردو اور تشخص کی سیاست' Urdu and Identity Politics ہے۔ اس حصے میں مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی شناخت کے حوالے سے چار مضامین شامل ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں اردو ادب کی استاد ڈاکٹر ارجمند آرا کا مضمون مسلم تشخص کی تشکیل میں مدرسوں کے کردار کے حوالے سے ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مدرسے دراصل اس سابق جاگیردارانہ سماج کی باقیات ہیں جن سے مسلمان اپنی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کے سبب آج بھی اپنا دامن نہیں چھڑا سکے ہیں جب کہ ہندستان ایک جدید سرمایہ دار جمہوریت کے طور پر ترقی کی راہ میں بہت آگے بڑھ گیا ہے۔

لندن یونی ورسٹی کے مشہور زمانہ — 'اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز' میں اردو کی لیکچرر ڈاکٹر آمنہ یقین نے اپنا مطالعہ انیتا ڈیسائی کے انگریزی ناول In Custody کے تجزیاتی مطالعے کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس ناول کا موضوع اردو سے متعلق تو ہے لیکن اس میں اردو فرقے کی بڑی ناقص تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول میں ایک بوڑھا ہوتا ہوا شاعر اردو فرقے کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اول تو فنی اعتبار سے بھی ناول معمولی درجے کا ہے پھر مصنفہ کی اردو معاشرے کے بارے میں کج فہمی کے سبب اردو اور اردو معاشرے کی عکاسی کرنے کی حد تک بھی یہ ناول کوئی اچھا تاثر اپنے قارئین پر نہیں چھوڑتا۔ انیتا ڈیسائی اردو کو ایک زندہ اور متحرک زبان کے بجائے گئے دنوں کی ایسی شے سمجھتی ہیں جس کی تہذیب اشراف تک محدود تھی۔ اسی لیے اردو کے تعلق سے انھوں نے ناول میں اردو معاشرے کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بالکل غیر حقیقی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس مضمون کی بنیاد ایک معمولی درجے کے ناول پر ہے آمنہ یقین کا تجزیہ اچھا ہے۔

ڈاکٹر کیلی پیمبرٹن مسلم تصوف سے دل چسپی رکھنے والی امریکی اسکالر ہیں اور ڈاکٹر ڈینیلا بریڈی اٹلی کی ایک یونی ورسٹی میں اردو ادب کی استاد۔ ان دونوں ہی کے مضامین میں زبان، فرقے، تشخص اور اقتدار کے حوالے سے اردو کے مستقبل پر غور کیا گیا ہے۔ پیمبرٹن یہ مانتی ہیں کہ اردو ہندستان کے مختلف فرقوں کے بیچ رابطے کی ایک بہت ہی اہم کڑی ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے — 'سماجی مقام، تعلیم اور اردو' Civic Space, Education, and Urdu میں بہت سے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ اطہر فاروقی کے مضمون میں ہندستان کے نمائندہ صوبوں میں اردو تعلیم کی زبوں حالی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ اطہر فاروقی کا وہ مشہور زمانہ مضمون ہے، جس کی اردو میں اولین اشاعت 1990 میں ہوئی اور انگریزی میں یہ ممبئی سے نکلنے والے مقتدر علمی مجلے Economic and Political weekly میں 1994 میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں ہندستان کے نمائندہ صوبوں اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں اردو تعلیم کی صورتِ حال کا جائزہ ان اعداد و شمار کی روشنی میں لیا گیا تھا جو خود اطہر فاروقی نے جمع کیے تھے۔ بدقسمتی سے اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی کسی اور نے اردو تعلیم کے اعداد و شمار جمع نہیں کیے اور اردو تعلیم کی جو بھی تصویر آج ہمارے سامنے ہے وہ ان ہی اعداد و شمار کی بنیاد پر ہے۔ کتاب میں شامل تقریباً ہر مضمون نگار نے اطہر فاروقی کے اس مضمون سے استفادہ کیا ہے سید شہاب الدین نے ہندستان کے سماجی و سیاسی نقشے پر اردو تعلیم کو درپیش حقائق اور سخت مشکلات پر نظر ڈالی ہے۔

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ 'یونی ورسٹی آف ہائڈل برگ' میں اردو ادب کی استاد ہیں۔ اپنے مضمون میں انھوں نے ہندستان کے آئین کی روشنی میں ہندستان میں اردو تعلیم کی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر کیرین گریفین شورین کے مضمون سے ایک ماہرِ تعلیم کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ کیرین نے کوئی چالیس برس پہلے اردو ہندی تنازعے پر علمی کام اس وقت کیا تھا جب وہ بہ طور طالبِ علم جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے وابستہ تھیں۔ ان کا تعلق جرمنی

سے ہے اور بنیادی طور پر وہ مورخ ہیں۔ انھوں نے تعلیم کی واردھا اسکیم یا 1937 کی نئی تعلیم کی پالیسی کی روشنی میں پرائمری تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے جس کا ڈرافٹ گاندھی جی کے ایما پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں تیار کیا گیا تھا۔ اسکیم کے تحت مادری زبان کے طور پر اردو کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر کیرین اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ: "اردو، جو ہندستان اور پاکستان سے باہر ہندستانیوں اور پاکستانیوں کے روز مرہ استعمال کی زبان (Lingua franca) ہے دنیا کے لسانی نقشے سے اس لیے مٹ نہیں سکتی کیونکہ ادب اور زبان کے طور پر لوگ اس کی قدر کرتے ہیں اور اسے اہمیت دیتے ہیں"۔

ہندستان میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے حسن عبد اللہ کئی اہم سوال قائم کرتے ہیں۔ وہ سماج کے مختلف طبقات کے ساتھ اردو کے تعلق پر غور کرتے ہیں، مختلف زبانوں کے ارتقا اور اردو زبان کے مقام پر بات کرتے ہوئے جدید زبان کے طور پر اس کی اہمیت، اردو داں اشراف اور ہندستانی دانشوروں کے رول، اردو داں لوگوں کے سماجی، معاشی اور تعلیمی پس منظر کا تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں۔

پروفیسر جے ایس گاندھی سوشولوجسٹ ہیں اور عرصۂ دراز تک جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مضمون میں 1947 میں برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندستان کی قومی زندگی سے ختم ہوتی ہوئی اردو کی مرکزیت کے سوال پر غور کیا ہے۔ ذاتی نوعیت کا ان کا یہ پُر اثر بیانیہ مضمون ان کی زندگی کی نجی تجربات سے شروع ہوتا ہے جو ہمیں ان کی بہت سی یادوں اور تجربوں کے گلیاروں کی سیر کراتا ہوا اس اداس سی فضا میں لے جا کر چھوڑ دیتا ہے جہاں مختلف فرقوں کے لوگوں کو آپس میں جوڑنے والا ایک بڑا طاقت ور سرچشمہ اب نظروں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

کتاب کا چوتھا اور آخری حصہ "اقلیتی زبان اور اقلیت: قانونی پیچیدگیاں" Minority Language and Community Legal Concerns ہے۔ اس میں ماہرینِ قانون کے مضامین شامل ہیں۔ مشہور ماہرِ آئین فالی ایس نارِیمن نے آئین اور قانونی فریم ورک کے دائرے میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی تعلیم کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اقلیتی اور اکثریتی فرقوں کے مابین تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز رکھی ہیں۔ انھوں نے آگاہ کیا ہے کہ "زبان کو مذہب کے ساتھ کبھی خلط ملط نہیں کرنا چاہیے"۔ جیسا کہ ڈاکٹر سیمول جانسن نے کہا تھا: "زبانیں کسی بھی قوم کا شجرۂ نسب ہوتی ہیں"۔ ہندی اور اردو جو آئین ہند کے آٹھویں شیڈیول میں شامل ہیں، ہندستانی لوگوں کا شجرۂ نسب ہیں۔ سابق اٹارنی جنرل فار انڈیا سولی جے۔ سوراب جی نے بھی اپنے مضمون میں اقلیتوں کی حیثیت، ان کے مذہب، تعلیمی اداروں سے ان کی زبان اور تہذیب کے متعلقات پر گفتگو کی ہے۔ البانیہ کی مثال دیتے ہوئے سوراب جی نے ایک اہم نکتے پر اصرار کیا ہے۔ سوراب جی بتاتے ہیں کہ البانیہ میں ایک بار ایک عدالتی فیصلے میں یہ کہا گیا کہ اقلیتوں اور اکثریت کے مابین اس صورت میں حقیقی مساوات پیدا ہو ہی نہیں سکتی اگر اقلیت کو اس کے اداروں سے محروم رکھا جائے گا۔

جواہر لال یونی ورسٹی میں بین الاقوامی قانون اور ڈپلومیسی کے پروفیسر یوگیش تیاگی کا مضمون دراصل ہندستانی اقلیتوں کے قانونی پہلوؤں پر ایک کمینٹری ہے۔ ان کے مضمون کا آغاز اقلیتی زبانوں کے تصور، اقلیتی زبانوں کے ذمے داروں کے گھریلو خانگی قانون کی بنیاد پر اقلیتی زبانوں کے حوالے سے بین الاقوامی قانونی فریم ورک پر ہے۔ آخر میں انھوں نے سفارش کی ہے کہ ایک ملک گیر ڈاٹا بیس لسانی اقلیتوں کے بارے میں تیار کیا جائے تاکہ اقلیتی زبانوں کی حفاظت اور فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کو مزید موثر بنایا جا سکے۔

انگریزی میں اس نوعیت کی کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ان کی تدوین بھی بڑی مہارت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ کتاب بھی اطہر فاروقی نے نہ صرف بڑی عالمانہ مہارت کے ساتھ مرتب کی ہے بلکہ تمام مضامین کی اشاعت کے پیچھے نظریاتی اور فکری تسلسل کی منطق بھی کارفرما ہے جس کی جلوہ گری بڑی محنت سے مرتب کی گئی فرہنگ اور اشاریے تک میں دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً خلافت تحریک کے سیاق و سباق میں فرہنگ میں اطہر فاروقی نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ محمد علی جناح نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی اور اسے مسلمانوں کا استحصال کرنے والی تحریک کہا تھا۔ یہ بڑی اہم تاریخی حقیقت ہے جسے ہم بھولتے جا رہے ہیں کہ محض Populist نظریات کے تابع گاندھی جی خلافت تحریک کے حامی تھے۔ یعنی مسلمانوں کے تئیں کانگریس کی پالیسی روزِ اول سے ہی Populist رہی ہے۔

امید کہ یہ کتاب اردو سے دل چسپی رکھنے والی دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس بھی خاص شکریے کی مستحق ہے جس نے ایک انتہائی اہم مگر ایسے موضوع پر علمی کتاب شائع کی جس اب تک علمی دنیا میں بھی سیاست کے شقاوت پسندوں کی اجارہ داری تھی۔

ری ڈیفائننگ اردو پالیٹکس ان انڈیا Redifining Urdu Politics in India (انگریزی)، صفحات: 326، قیمت: 595 روپے، ناشر: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس انڈیا، ملنے کا پتہ: YMCA لائبریری بلڈنگ، جے سنگھ روڈ، نئی دہلی۔1

تبصرہ

غلام مرتضیٰ راہی: لاشعور

عبدالاحد ساز

غلام مرتضیٰ راہی عصری اردو غزل میں خاص حد تک اپنا مقام بھی حاصل کر چکے ہیں اور اپنے گزشتہ شعری مجموعوں، لامکاں، لاریب، حرفِ مکرر اور لاکلام کے ساتھ اپنی انفرادیت کو بھی نمایاں کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے اس منزل پر شاعر کی قادر الکلامی، کہنہ مشقی یا موضوعی و معنوی اعتبار سے اس کی شاعری میں عصری احساس و آگہی کے تقاضوں سے تو بحث نہیں کی جائے گی کہ یہ اوامر تو از بس مسلّم ہی ہیں۔ ساری توجہ طرزِ اظہار اور طریقۂ ترسیل پر ہی مرکوز کی جائے گی۔

ہر تخلیقی فن کار کے لئے اپنے تخلیقی سفر کا ایک حصہ طے کر چکنے کے بعد وہ موڑ ضروری ہوتا ہے جسے نقطۂ رخصت یا Point of Departure کہا جاتا ہے۔ جہاں سے وہ خود کو اپنے معاصرین سے الگ پہچنوانے لگے۔ اس تلاش کے ساتھ اگر غلام مرتضیٰ کے تازہ شعری مجموعے 'لاشعور' کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے اشعار اچھے تناسب میں ملیں گے جو مذکورہ شرط پر پورے اترتے ہوں۔ مثال کے طور پر ان اشعار میں عرضِ مدّعا کی طرف شاعر کے اپروچ پر غور کیجئے:

پل پل کی میں روداد رقم کرتا چلا جاؤں
صدیوں کے لئے خود کو بہم کرتا چلا جاؤں

دریا کی خوشامد نہ کروں پیاس کے ہوتے
ہونٹوں پہ زباں پھیر کے نم کرتا چلا جاؤں

جب تک نہ کسی کی نیند ٹوٹے
میں خواب، مجھے ثبات کتنا

گھر آگئے ہم نقطۂ سیری کو پہنچ کر
دنیا کو ابھی ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا

پتھروں کا وہ پہاڑوں سے سرکتے رہنا
میرا رک رک کے وہ منہ راہ کا تکتے رہنا

کوئی آہٹ، کوئی سن گن رہ رہ کر ملتی رہتی تھی
آیا جایا کرتے تھے ہم اک دوجے کے سونے پن میں

کام اب بیٹھے بٹھائے میرا چلنے کا نہیں
جس کے در پر ہوں وہ اب گھر سے نکلنے کا نہیں

کچھ ایسے دیکھتا ہے مجھ کو وہ کہ لگتا ہے
دکھا رہا ہے مجھے میرا آئینہ کچھ اور

فنونِ لطیفہ کے کسی بھی شعبے میں اظہار کا تقاضہ آرٹ اور کرافٹ کی یکجائی کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ شاعری محض وہبی عمل نہیں ہے۔ شعری اکائی، جذبۂ و فکر کو زبان کے برتنے کے قرینوں اور الفاظ کی دروبست اور امتزاج کے امکانات میں روشن کرنے ہی سے قائم ہوتی ہے۔ خیال و احساس کی تعریف کرافٹ کی گرفت اور ذہانت ترسیل کے بغیر متاثر نہیں کرتی۔ خصوصاً فی زمانہ جب کئی شاعر ہم عصر شعری کردار کو اجتماعی طور پر بھی ادا کر رہے ہیں، اندازِ ترسیل کے اچھوتے پن کا معاملہ اور بھی ذہانت طلب ہو گیا ہے۔ راہی نے اس چیلنج کو باریکی سے سمجھا بھی ہے اس پر محنت بھی کی ہے اور اس سے نبرد آزما ہونے میں انھیں خاص کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ ترسیلی ذہانت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہماری شہرتوں کا وقت بھی کہاں ٹھہرا
ندی کا زور، پہاڑوں کے درمیاں ٹھہرا

نکالا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے
چھپے تو دونوں، مگر ایک مہرباں ٹھہرا

جیسے چلتا ہوا آرا ہو، وہ دھارا دیکھوں
کٹ کے گرتا ہوا دریا میں کنارا دیکھوں

اب سنبھالے سے سنبھلتا نہیں انسان کا بوجھ
اب کھسکتی ہے زمیں پاؤں جہاں رکھتا ہے

لکھے ہوئے کا اعادہ کب تک
ورق نہ چھوڑو گے سادہ کب تک

جو تاب بیاں تجھ میں نظر آتی ہے اس سے
کچھ واقعہ دیکھا ہوا تیرا نہیں لگتا

آگ کے تیزی پکڑنے سے دھواں مدھم ہوا
روشنی پا کر حقیقت کی گماں مدھم ہوا

ان ترسیلی ذہانتوں سے انگیز ہوتی ہوئی یا ان کے ادراکی تحریکی پس منظر میں نمود کرتی ہوئی خیال و احساس کی تازگیاں راہی کے کلام کو کچھ اور ہی ندرتیں اور لطافتیں بھی دے جاتی ہیں اور شعری معنویت کی کچھ نئی دشائیں بھی...

نکالیں اشک مرے اس کے دل میں گنجائش
نکل کے آپ بناتی ہے جھیل اپنی جگہ

میں تصویر بن کر اسے دیکھتا ہوں
جو دیوار میں کیل خالی گڑی ہے

تلاش و تجسس کے دیوانو ہشیار
مری خاک بھی چھاننے کو پڑی ہے

زہر کب ہوتا تھا اس میں جل بھی
پیاس کو امرت تھا گنگا جل بھی

اڑ کے تجھ کو یہ بتانے آئے ہیں
چل کے آجاتے تھے ہم پیدل بھی

ہم نے منزل کی طلب میں، مڑ کر کبھی یہ نہ دیکھا
نقشِ قدم پر ہمارے، اک رہ گزر آ رہی ہے

کھینچ لیتی ہے مجھے اس کی کشش اپنی طرف
دور ہو پاتی نہیں میری کمی میرے یہاں

اس کے احساس سے یہ ظاہر ہے
ہو رہی ہے مری نگہداری
مشرق و مغرب و شمال و جنوب
میری خاطر چہار دیواری

اپنے طویل شعری سفر کو طے کرتے ہوئے راہی کے پاس مشکل کو آسان کرنے اور پتھر کو پانی کرنے کا فن آگیا ہے۔ زیر تبصرہ تصنیف میں گزشتہ تصانیف کی بہ نسبت جہاں لفظیات آسان ہیں، وہاں معنوی پیچیدگی کو لفظوں کے انتخاب و امتزاج میں سیال کر دینے کی قدرت فزوں تر ہے۔ موضوعات میں حیرت ناک تنوع ہے۔ موضوعات کے تعلق سے خاص وصف یہ بھی ہے کہ موضوعات چاہے شخصی ہوں یا تعلقاتی، معاشرتی ہوں یا سیاسی، جذباتی ہوں یا نفسیاتی بیش تر عملی زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں سے اخذ کردہ فہم و حکمت پر مبنی ہیں۔ بلکہ جہاں ماورائی یا آفاقی موضوعات کی طرف اڑان بھری گئی ہے۔ وہاں بھی رن وے runway کے طور پر عملی زندگی سے حاصل کیے ہوئے خطوط ہی استعمال کیے گئے ہیں۔ اس تنوع کے کچھ مرتکز نمونے دیکھئے:

یادوں نے میری راہ میں دیوار کھینچ کر
مشہور کر دیا کہ مجھے سایہ چاہئے

سب اپنے اپنے عدم اعتماد سے مجبور
سب ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے

تنگ دستی میں کئی بار وہ موسم آیا
جس میں پھل پھول پرائے تھے، شجر میرا تھا

لاکھ میں نے نہیں چلائے مگر
تیر میری کماں سے آئے ہیں

جب اس کا وعظ توجہ طلب نہیں ہوتا
ہم اس کے منبر و محراب دیکھ لیتے ہیں

سمائی جا رہی ہے کائنات اس میں
ہے ذرہ تنگ اپنی بیکرانی سے

'لاشعور' میں شامل کئی غزلیں طویل بھی ہیں۔ دس گیارہ بارہ اشعار تک کی بھی۔ شاعر کے ذہن کی زرخیزی مسلّم اور کچھ مزید کہہ لینے کی خواہش اور توانائی مصدق۔ مگر ایک منصب تک پہنچ جانے کے بعد شاعر کو What to say کے علاوہ What not to say کو بھی بہر حال ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کم از کم اشاعت کے مرحلے میں بعض غزلوں سے ایک ایک دو دو اشعار کم کر لئے جاتے تو جامعیت کا احساس زیادہ ہوتا۔ یہ بہر حال ایک فروعی سی نشان دہی ہے۔

اس میں دو رائے نہیں کہ لاشعور سال رواں کی ایک اہم شعری سوغات ہے، جو ہم عصر اردو غزل کے نئے امکانی زاویوں کا اشاریہ بھی فراہم کرتی ہے، جسے غلام مرتضیٰ راہی نے اہل ادب کے سامنے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایک ایسی خود اعتمادی جس میں یہ بے نیازانہ خود اکتفائی بھی شامل ہے:

رکھئے راہی کام اپنے کام سے
نام ہونا ہوگا جب ہو جائے گا

لاشعور (شعری مجموعہ)، صفحات: 144، قیمت: 150 روپے، 10 امریکی ڈالر (غیر ممالک)، ناشر: راہی پبلی کیشنز، فتح پور، ملنے کا پتہ: راہی منزل، نئی، فتح پور، یوپی۔ 212601

تبصرہ

رئیس الدین رئیس: آسماں حیران ہے

عشرت ظفر

"آسماں حیران ہے" رئیس الدین رئیس کے طویل و بسیط شعری سفر کا ایک روشن پڑاؤ ایک تھما، داستان، اس میں ان نا آفریدی جہانوں کی مٹی کی خوش بو بھی ہے جو ہر چند ابھی وجود پذیر نہیں ہوئے لیکن ان کے تار و پود رنگ و آہنگ سب پوری طرح نمایاں ہیں، تمام تر پہلو اور زاویے ایک جاوداں تابنا کی کا سرمایہ خود میں سمیٹے ہوئے ہیں اور احساس دلاتے ہیں کہ ان کی بساط لامحدود پر ان بے نہایت رنگوں کی پھوار پڑ رہی ہے جو ماضی و حال کی حلاوتوں اور تلخیوں سے مملو ہیں۔

رئیس الدین رئیس بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں انہوں نے نئی غزل میں نیا لہجہ نیا اسلوب اور بڑی حد تک نیا لفظی نظام اپنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جدید غزل کے ایوان میں ان کی آواز ایک منفرد ارتعاش رکھتی ہے۔ بات شعری نظام کی آتی ہے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایک ایسے شاعر کے لئے جس کی فکر اس کے اپنے معاصرین میں منفرد ہو لازم ہوتا ہے کہ وہ نیا لفظی نظام تشکیل کرے اور تہہ در تہہ معانی کا ایک جہان تازہ آباد کرے کیوں کہ الفاظ کی چمک دمک کا انحصار صرف معانی پر ہے اگر لفظوں میں کثیر الجہت معانی نہیں ہیں تو وہ بے آب ہیں خذف ریزوں کی طرح بے رنگ کم سواد اور حقیر! بڑے شاعر کی شناخت الفاظ سے نہیں معانی کی کثیر الجہتی سے ہوتی ہے اور یہ بات رئیس کے یہاں بہت نمایاں نظر آتی ہے اسی لئے میں آسماں حیران ہے کو ایک روشن عظیم شعری پڑاؤ مانتا ہوں اس پڑاؤ میں لمحاتی قیام دراصل ماندگی کا وقفہ نہیں ہے بلکہ دم لے کر آگے چلنا ہے۔ بلکہ اس پڑاؤ پر ٹھہر کر مقصود ہے محاسبہ کرنا ان نا آفریدہ تخلیقی جہات کا جو ابھی افکار کے نا قابل عبور سمندروں کی بے چین اور مضطرب گہرائیوں میں پڑی سو رہی ہیں۔

رئیس کے اس شعری مجموعہ میں نیا لفظی نظام تو ہے ہی غزلوں کی منفرد آہنگ کی ردیفیں وضع کرنے میں بھی انہوں نے ندرت سے کام لیا ہے اس طرح ایک سحر انگیز فضا خلق ہوتی گئی ہے جس سے انسانی نسل کی کرب انگیز کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے معانی کی کثیر الجہتی کا ایک خاص نظریہ ہے کہ آسمان کے حوالے سے جو مناظر فطرت وجود پذیر ہوتے ہیں وہ بے حد تخلیقیت آمیز ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آسماں کی بے کنار فضاؤں میں لہلاتے ہوئے آئینوں نے تمام ارضی منظروں کو اس طرح خود میں محفوظ کیا ہے کہ متحرک تصویروں کا ایک جہاں غیر فانی عکس ریز نظر آتا ہے یہ آئینے خود کو حیرانی کے غبار کے سپرد ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ آنکھوں پر آبشار حیرت بھی گراتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ اشعار قابل توجہ ہیں:

تری ہی ذات تو محور ازل ابد کا ہے
تمام نقطے ترے دائرے بھی تیرے ہیں

غبار اشک مری چشم بے خطا سے نکل
مرے تیمم کریں گے یہاں وضو تجھ سے

تمام شہر میں ہے عام کاروبار ہوس
کہ چہرے چہرے پہ چسپاں ہے اشتہار ہوس

تری طلب پہ تو حیران آسماں ہے رئیس
کہ تو نے چاند نہیں اس کا داغ مانگا ہے

ان اشعار میں ایسی آہٹیں موجود ہیں جو احساس دلاتی ہیں کہ ایک بڑی شاعری رفتہ رفتہ پردۂ وجود پر اپنا اظہار کر رہی ہے الفاظ کی ہمہ گیری معانی کی کثیر الجہتی کا ایک خاص منظر ہے۔

خلاق اعظم کی ذات ہی ازل اور ابد کا محور ہے اس میں ہم سب نقطوں دائروں قوسوں اور زاویوں کی طرح متحرک ہیں گویا ایک چاک ہے جو مسلسل گردش میں ہے یعنی خلاق اعظم نے یہ سب کچھ ہمارے لئے بنایا ہے چاک محور پر گھوم رہا ہے تخلیق کا عمل جاری ہے کئی نا آفریدہ پیکر باہر آنے کے لئے بے قرار ہیں یہاں غالب کے اس شعر کی طرف ذہن جاتا ہے:

ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطۂ ما دور ہفت پرکار است

اسی طرح دیگر اشعار میں غبار اشک کا چشم بے خطا سے باہر آنا پھر تیمم کا اس غم آمیز غبار میں وضو کرنا پھر چاند سے اس کا داغ طلب کرنے پر آسمان کی حیرانی یہ سب ایسی سوچ ہے جو براہ راست اشارہ کرتی ہے کہ شاعر کا فکری

ارتضاع کیا ہے اور اس کی شریانوں میں کیسی آتش سیال بہہ رہی ہے۔ رئیس کے یہاں لفظ معنی کا ایک طلسم ہے انہوں نے اپنے معاصرین کے مزاج سے ہٹ کر الفاظ کو نئے معنیاتی تفاعل میں رکھا ہے حالانکہ الفاظ کی یکسانیت تقریباً سارے جدید شعرا کے یہاں یکساں ہے مگر جس طرح رئیس نے غزل کے کلاسیکی لہجے سے اپنے شعر کا خمیر تیار کیا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔ ان کے یہاں طائر پرندہ، چاند، بادبان، آسمان، سحر، کھنڈر، داغ، رات، معانی کی ندرت سے مالا مال ہیں۔ کچھ نمونے یوں ہیں۔

بوڑھے برگد کی سلگتی شام نے مجھ کہا
اب ہر اک طائر مری شاخوں سے اڑ جانے کو ہے

پلٹ رہے ہیں پرندے بھی دن تمام ہوا
نمود شام ہے اب تو سفر سے واپس آ

دریا دریا ریت تھی جب خشک سالی میں رئیس
پھر شکستہ ناؤ چھلنی بادباں کیسے ہوا

میں کہ ہوں شرمندۂ نقش ونگار زندگی
اب تری سمت میں اے سبز شجر کیا دیکھوں

یہ الگ ہے بات سارے مٹ چکے ہیں رنگ ونقش
تو ابھی ویراں نہیں میرے کھنڈر زندہ ہوں میں

خراش چہرۂ شب یک بیک ہوئی روشن
کہ تیرگی میں نہاں ماہ نو کی قاش ملی

رئیس کے یہاں شکستگی بھی ہے اور مصائب کی چلچلاتی دھوپ بھی مگر اس نے کہیں زیادہ حوصلوں کی بلندی پختگی اور صلابت ہے وہ اس اقدار کش دور میں محرومی اور مایوسی میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ آدم نو کے منتظر ہیں:

شرار سنگ میں ڈھونڈو رموز کوہ کنی
ہر ایک ذرّہ پہ ہے شیشہ کی صدا مصلوب

کاش مفہوم گزیدہ کوئی پتھر ہی ملے
سنگ زاروں میں بھٹکتی ہے نگاہ الفاظ

رئیس اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ خلائے بسیط کی مصروف ترین رقاصہ کیا چاہتی ہے اور یہ اس لئے ہے کہ ان کا سب سے گہرا مستحکم مربوط اور اٹوٹ رشتہ تو زمین سے ہی ہے۔ رئیس کے یہاں واحد متکلم کے صیغے کا خوب استعمال ہوا ہے اس میں ان کے ارادے کو کچھ زیادہ دخل نہیں ہے کیونکہ یہ ایک طرح کا فکری عقیدہ ہے کہ وہ اپنے وجود میں پوری کائنات سانس لیتے ہوئے محسوس کرتے ہیں وہ تمام انسانی نسل کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھتے ہیں اور پھر جو شعر ان کے چاک فکر پر ان کے نظریات کا لمس پاکر متشکل ہوتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

ورق ورق تجھے تحریر کرتا رہتا ہوں
میں زندگی تری تشہیر کرتا رہتا ہوں

بہت عزیز ہے مجھ کو مسافتوں کی تھکن
سفر کو پاؤں کی زنجیر کرتا رہتا ہوں

ایک ہی غزل کے یہ دونوں شعر انسان کی عظمت کو بیان کرتے ہیں اس کے مختلف النوع اعمال کو ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح وہ سرابوں سے خنک پانیوں کے چشمے نکالتا ہے کس طرح زندگی کی تشہیر کر کے اس کے اوصاف محاسن ومعائب کو سامنے لاتا ہے حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ:

دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

میں محسوس کرتا ہوں کہ آسماں حیران ہے ایک شعری نگار خانہ ہے جس میں نا آفریدہ اور آفریدہ تصاویر کا ایک ہجوم ہے اور یہ رئیس کی فکر ضوفشاں کا اعجاز ہے کہ انہوں نے وہ تصویریں کم دکھائی ہیں جو ماضی کی گرد میں دفن ہیں یا دفن ہونے کی تیاری کر رہی ہیں بلکہ ان تصویروں کے خال وخد زیادہ ابھارے ہیں جو ابھی کارگاہ وقت میں تکمیلات کے مراحل سے گزر رہی ہیں چند تصویریں یوں ہیں:

طلوع مہر کا منظر بھی تیری صناعی
غروب شام بھی رنگ شفق بھی تیرا ہے

کہاں رہتے ہیں آخر چاند سورج
نہیں ہوتے ہیں روشن بام میرے

زرد رُت شاخ شاخ سوئی ہوئی
پھول گلدان میں گلابی سب

نظر میں غالباً اس کے ہے زر درت رقصاں
ہے سبز شاخ پہ بیٹھا ہوا پرندہ چپ

ان سطور میں ہر چند کہ میں نے رئیس کی غزلوں کے کچھ اشعار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان میں پوشیدہ مناظر کو دکھانے کی سعی کی ہے مگر ان کی فکر وفن کا جس طرح احاطہ ہونا چاہئے نہیں ہوسکا۔ یہ ایک بڑی شاعری ہے ایک ایسے سمندر کی طرح جس میں سفر کرنے والے کسی بھی ساحل پر نہیں پہونچ پاتے نہ وہاں جہاں کے لئے سفر شروع کرتے ہیں اور نہ وہاں لوٹ پاتے ہیں جہاں سے وہ سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ (تلخیص) OO

تعارفی تبصرے
کتب نما

نصرت ظہیر

آیئے پہلے ان کتابوں کو لیتے ہیں جن پر اس شمارے میں تبصرے کا وعدہ تھا۔ پہلی کتاب ہے:

ظہیر غازی پوری کی تصنیف

اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ

'مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو' کے بعد یہ جناب ظہیر غازی پوری کی دوسری اہم ترین کتاب ہے۔ جس میں دوہے کی، اردو میں نسبتاً کم معروف صنفِ سخن کے مآخذ، ارتقائی ادوار اور اردو کے شعری۔ جمالیاتی مزاج و نظام کے ساتھ اس کے ارتباط وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

درحقیقت یہ اس صنف پر اردو میں پہلی معلوماتی، جامع اور مبسوط کتاب ہے جیسا کہ کتاب میں دعویٰ بھی کیا گیا ہے۔

ہم سب ظہیر صاحب کو ایک منفرد شاعر کے طور پر جانتے ہیں۔ ان کی نظموں غزلوں اور رباعیات کے سات مجموعے اب تک سامنے آچکے ہیں، جن سے اردو شاعروں کے ہجوم میں ان کی ایک الگ پہچان کافی پہلے بن چکی ہے۔ لیکن رواں صدی کی شروعات سے ان کی ادبی شخصیت نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ تنقید و تحقیق پر ان کا کام مضامین کی شکل میں پہلے بھی کبھی کبھار سامنے آتا رہا ہے لیکن کتاب کی صورت میں اب آنا شروع ہوا ہے۔ 'مطالعۂ اقبال کے بعض اہم پہلو' (اشاعت: 2003) تنقید و تحقیق کے میدان میں ان کی پہلی اہم کتاب ہے جس نے اقبالیات کے ذخیرے میں اس لحاظ سے اہم اضافہ کیا ہے کہ اس میں 'اقبال کا سائنسی شعور' اور 'عالمی ادب میں اقبال کا مقام' جیسے موضوعات پر پہلی بار تفصیلی بحث کے ساتھ اس مفروضے کو بھی پاش پاش کیا گیا ہے کہ علامہ رباعی کے فن سے ناواقف تھے۔ کتاب میں انہوں نے اقبال کی چار نئی رباعیوں کا انکشاف کیا اور سب کو چونکا دیا۔

اسی چونکانے کی روش کو برقرار رکھتے ہوئے جناب ظہیر غازی پوری نے اب ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر ہمارے دوسرے باقاعدہ اور سکہ بند نقادانِ فن اور محققینِ ادب نے کچھ تو غالب و میر و اقبال کے دائرے میں ہی بہ عافیت محفوظ رہنے کی روش کے تحت اور کچھ اس بارے میں اپنی عدم معلومات کو چھپانے کے سبب سے طبع آزمائی سے ہمیشہ گریز کیا۔ یہ موضوع ہے اردو دوہا نگاری۔ حالاں کہ اردو میں دوہا کوئی عرصہ سے جاری ہے اور اردو شاعری کے ارتقا کے ابتدائی دور کا دوہے سے غزل کے مقابلے میں کچھ کم تعلق نہیں رہا ہے، پھر بھی یہ موضوع ابھی تک تشنۂ تحقیق و جستجو رہا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہندی میں بھی دوہے کی صنف پر کوئی مبسوط کتاب موجود نہیں ہے جب کہ اردو کے اکثر نقادوں اور محققین کی کم عقلی اور کوتاہی کے سبب جس شئے کو آج ہندی والے ہندی شاعری کہتے ہیں اس کی ابتدا ہی دوہا نگاری سے ہوئی تھی۔ (اردو والوں کی کوتاہی کو میں نے اس لئے انڈر لائن کیا ہے کہ وہ ذرا عقل اور کشادہ ذہنی سے کام لیتے تو رحیم، رس خان اور کبیر جیسے کتنے ہی دوہا گو آج اردو کے ابتدائی شاعر مانے جاتے۔) اردو اور ہندی میں دوہوں پر کوئی کام کی کتاب نہ ملنا اور اس کے باوجود اس صنف پر ایک معلوماتی کتاب لکھنا ظہیر صاحب کے لئے کتنا مشکل رہا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ خاص طور سے اس دور میں جب دوسروں کے کئے ہوئے کام کی بدولت ادب کی ڈاکٹری بلکہ ریڈری اور پروفیسری کر لینا اب بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا ہے اور تحقیقی و تنقیدی کتابیں قلم سے کم قینچی سے زیادہ لکھی جانے لگی ہیں۔

کتاب میں ظہیر غازی پوری کی تعریض کے علاوہ 12 مختلف مضامین دوہا نگاری کے مختلف پہلوؤں اور دوہا نگاروں کے بارے میں ہیں۔ ان میں دوہے کے فنی، لسانی اور تاریخی پس منظر کے علاوہ اس کے ہیئتی اور صنفی پہلوؤں اور دوہے کی عروضی شکل و صورت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ایک مضمون چند متنازعہ فیہ دوہوں کے بارے میں ہے جو مجھے خاصا پسند آیا۔ آخر تنازعے کسے اچھے نہیں لگتے۔ خاص طور سے وہ جو دوسروں کے بارے میں ہوں۔ اس میں 'کاگا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس...' والے دوہے پر غضب کی

بحث کی گئی ہے کہ یہ اصل میں کس شاعر کی تخلیق ہے۔ اس بحث میں میرا، بابا فرید، بلھے شاہ، کبیر اور خسرو سے لے کر تاج بی بی تک کی دوہا نگاری کا ذکر ضمناً آ گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علم میں اضافے کے لئے تنازعات کس قدر فائدے کی چیز ہیں۔

اور یہ بھی کہ ادب کے طالب علم اردو میں دوہا نگاری کے بارے میں اگر کچھ جاننا چاہتے ہیں تو ان کے لئے یہ کتاب پڑھنا لازمی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ کتاب اردو دوہا نگاری پر حرف آخر ہے۔ خود ظہیر صاحب بھی یہ نہیں مانتے۔ لیکن یہ کتاب وہ اساسی اور ضروری مواد یقیناً فراہم کرتی ہے، اوران پہلوؤں کی نشان دہی کرتی ہے جن کی بنیاد پر آگے چل کر اس موضوع پر مزید اور جامع تحقیق ہوگی۔ یعنی یہ حرف آخر نہ سہی حرف آغاز ضرور ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

اردو دوہے: ایک تنقیدی جائزہ، صفحات: 160، قیمت: 150 روپے، ناشر: ظہیر غازی پوری، ملنے کا پتہ: ہاشمیہ کالونی، ہزاری باغ۔ 825301 (جھارکھنڈ)

اس کے بعد وعدہ تھا پروفیسر شکیل الرحمن کے فن تنقید پر دو کتابوں کے بارے میں لکھنے کا۔ ان میں پہلی کتاب ہے:

ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی کی تصنیف

شکیل الرحمن کی غالب شناسی

پروفیسر شکیل الرحمن اردو کے جید و سینئر تنقید نگار ہیں، چنانچہ ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی نے اپنی کتاب کو صرف ان کی غالب شناسی تک محدود رکھ کر نہایت عقل مندی اور ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ خود کو محدود نہ رکھتے تو انہیں اور زیادہ مشکل کتابیں لکھنی پڑتیں۔ جن کے عنوان کچھ یوں ہوتے:

شکیل الرحمن کی تنقید کا تنقیدی جائزہ، شکیل الرحمن کی جمالیات کا جمالیاتی مطالعہ اور شکیل الرحمن کی تنقید کا تخلیقی اسلوب وغیرہ وغیرہ۔ تاہم اب ارشد صاحب کی اس عقل مندی سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں کچھ اور حضرات بھی ہوشیاری کا ثبوت نہ دینے بیٹھ جائیں اور کچھ اس طرح کی کتابیں سامنے نہ آنے لگیں جن کے عنوان ہوں:

شکیل الرحمن کی خسرو شناسی، شکیل الرحمن کی بابا فرید شناسی، شکیل الرحمن کی میر تقی میر شناسی، شکیل الرحمن کی علامہ اقبال شناسی وغیرہ و آخران کی شناسائی بھی تو بہت لوگوں سے ہے۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر بزرگ ہیں۔

ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی کی عمر صرف 38 برس ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اتنی عمر میں محقق اور نقاد کے دودھ کے دانت بھی نہیں نکلتے تھے، جھڑنا تو دور رہا۔ لیکن اب زمانے کی رفتار اور ہے۔ کم وقت میں بہت کچھ کر لینا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود ارشد مسعود ہاشمی کے معاملے میں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اس عمر میں وہ نہ صرف اردو، ہندی اور انگریزی کے بلکہ چینی زبان کے بھی معلم ہیں۔ اور نہ صرف معلم بلکہ چینی ادب پر کئی کتابوں کے مصنف بھی۔ اب تک ان کی سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں، جن میں سے پانچ کا تعلق چینی ادب سے ہے۔ پی ایچ ڈی کے لئے اگرچہ ان کا تحقیقی مقالہ 'نفسی تجربے اور ادبی تخلیق' کے عنوان سے شائع ہوا ہے لیکن ڈی لٹ کے لئے ان کے تحقیقی مطالعے کا عنوان تھا 'پریم چند اور لوشن'! اس مقالے کا تعلق اردو کے اس عظیم افسانہ نگار کی ذاتی استعمال کی اشیا سے نہیں بلکہ لوشن سے ان کے فن کا موازنہ کرنے سے ہے جو چینی زبان کا عظیم فکشن نگار ہے۔

اسی طرح ان کی ایک کتاب 'نغمۂ سخن' میں کلاسیکی چینی شاعر چھو یوآن کا مرزا غالب سے موازنہ کیا گیا ہے، جس کا کوئی شعر تو کیا مرزا نے اپنی زندگی میں نام بھی نہ سنا ہوگا۔ اور اگر یہ سن لیتے کہ ان کے انتقال کے سوا سو سال بعد بہار کا ایک نقاد ان کی شاعری سے چین کے ایک شاعر کی کشتی کرائے گا تو فوراً بدک جاتے اور مرزا تفتہ کو ایک طول طویل خط اس بارے میں لکھ بیٹھتے، جو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اردو شگفتہ نگاری کا ایک اور اعلیٰ نمونہ ہوتا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ارشد مسعود ہاشمی کو شکیل صاحب پر کوئی کتاب لکھنی ہی تھی تو انہوں نے اس کے لئے ان کی 'غالب شناسی' کو ہی کیوں موضوع بنایا۔ اس کا جواب کسی حد تک انہوں نے کتاب کی پہلی تحریر 'طلسم معانی' کے پہلے پیراگراف میں ہی دے دیا ہے:

''غالب سے متعلق پروفیسر شکیل الرحمن کی تحریروں سے دو امور کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ غالب وحشتِ جمال کے شاعر ہیں، اور دوسرے یہ کہ ان کی شاعری ہند ایرانی تہذیب کی روح ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے شکیل الرحمن کی غالب شناسی میں معانی کی تین اہم سطحوں کا حوالہ دیا ہے۔ اور ان حوالوں کا حوالہ دینے کے لئے بھی مجھے کئی صفحے سیاہ کرنے ہوں گے، لہٰذا بات کو یہیں مختصر کرتا ہوں کہ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں یہ کتاب مجھ جیسے لاعلموں کے مقابلے میں طالبان علم کے زیادہ

کام کی چیز ہے۔ اور ان کی معلومات میں تو یقینی اضافہ ہوگا جو عالم ہیں، فاضل ہیں اور پروفیسر و ڈاکٹر کہاتے ہیں۔ یقین نہ ہو تو آزمالیں۔

شکیل الرحمٰن کی غالب شناسی، صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، ناشر: ارشد مسعود ہاشمی، ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی-25؛ انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی-2

اس سلسلے کی جسے شکیل الرحمٰن سیریز بھی کہا جاسکتا ہے دوسری زیر تبصرہ کتاب محمد صدیق نقوی کی مرتب کردہ ہے:

شکیل الرحمٰن: اردو تنقید کا نیا وژن

چھوٹے فونٹ کی تحریر والے تین سو سے زائد صفحوں کی ایک کتاب ترتیب دینے کو میں آج کے معیار سے تخلیق کے درجے میں رکھتا ہوں اور اس کے لئے محمد صدیق نقوی کو بھرپور داد کا مستحق پاتا ہوں۔ اس کے بعد بھی مزید داد میں انہیں اس لئے دوں گا کہ باریک لکھاوٹ کے چالیس صفحات خود ان کے اپنے تحریر کردہ ہیں۔ ورنہ آج کے مرتب، جن میں تحقیق اور تنقید کے کئی بڑے نام شامل ہیں، کتاب کے پہلے صفحے پر اپنا نام بھی خود نہیں لکھتے۔ کمپوزر اور پیج میکر کی بدولت ان کی کتابوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوتا رہتا ہے، اور یہ تعداد، انہیں کون سا ادبی ایوارڈ دینا چاہئے یہ طے کرنے میں کام آتی رہتی ہے۔

اس حساب سے میرے کمپوزر حضرات (جن میں ایک خاتون بھی شامل ہیں) اب تک دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ برائے مجموعی خدمات مبلغ ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کے کبھی کے مستحق قرار پاچکے ہیں۔ یہ اور بات کہ اصل زندگی میں وہ فصیلی دہلی کی تنگ گھٹن بھری گلیوں میں کسی رکشہ والے محنت کش کی اجرت پر اردو مصنفین کی خدمت کے لئے مجبور ہیں۔

نقوی صاحب نے، جو ایک شعری مجموعے کے خالق بھی ہیں، کتاب کے انتساب میں شکیل صاحب کو بابائے جمالیات لکھا ہے، جسے پڑھ کر لطف آ گیا۔ واقعی، ان سے پہلے کس نے جمالیات پر اتنی توجہ دی تھی؟ جمالیات کو صرف برتا گیا تھا، اس کا تنقیدی محاکمہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ یعنی خسرو، میر، نظیر اور غالب سب اپنی اپنی شاعری میں جمالیات کر رہے تھے اور اس سے بے خبر تھے کہ انہوں نے جمالیات کر دی ہے۔ مگر شکیل صاحب کو سب خبر تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ ادھر ان بزرگوں نے پردہ کیا اور ادھر اس نابغۂ روزگار نقاد نے ان کی جمالیات کھول کے رکھ دی۔

شکیل صاحب پر بھی حیرت ہوتی ہے۔ ایسی ایسی چیزوں میں انہوں نے جمالیات ڈھونڈ نکالی ہے کہ رہے نام سائیں کا! خود کو لکھتے بھی ہیں بابا سائیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ جمالیات صرف شعر و شاعری کی صفت ہے۔ مگر شکیل صاحب نے افسانہ نگاروں میں بھی جمالیات پکڑ لی۔ اور شروعات بھی کس سے کی؟ اس سے جو منٹو کہاتا ہے۔ جدید افسانے کا باوا آدم۔ اور تو اور انہیں ملا نصرالدین میں بھی جمالیات نظر آ گئی جس کے وجود کے بارے میں ابھی کچھ طے نہیں ہے کہ وہ واقعی کوئی بزرگ تھے یا محض داستان۔ لیکن کچھ بھی ہو، جمالیات کو اچھے ادب کی شرط اول کے طور پر انڈر لائن کرنے میں جتنا بڑا ہاتھ شکیل صاحب کا ہے اتنا اور کسی کا نہیں ہے۔

صدیق صاحب نے اپنی کتاب میں بشمول خود 35 ادیبوں کے 40 مضامین شامل کئے ہیں۔ ان میں تین ڈاکٹر مجید بیدار کے، دو دو ڈاکٹر ارشد مسعود ہاشمی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی اور ڈاکٹر کوثر مظہری کے ہیں۔ دیگر قلم کاروں میں پروفیسر قمر رئیس، ابراہیم اشک، پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر ریاض صدیقی، پروفیسر شفیقہ فرحت، پروفیسر شہناز پروین، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر قمر اعظم ہاشمی، پروفیسر ماجدہ اسد، پروفیسر محمد علی اثر اور میرے پسندیدہ تخلیقی نثر لکھنے والے نقاد حقانی القاسمی شامل ہیں۔

ان سبھی مضامین میں دربھنگہ کے فرزند ارجمند شکیل الرحمٰن کی شخصیت اور ان کی کتابوں کے تقریباً ہر پہلو کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دراصل اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی مجھے یہی نظر آئی ہے کہ اس میں شکیل صاحب کی بیش تر کتابوں کا تعارف اور اجمالی جائزہ خوب صورتی سے سمو دیا گیا ہے۔

کوثر مظہری نے ایک معرکے کا مضمون تحریر کیا ہے۔ جمالیات غالب کی شکیلیات۔ یعنی شکیل صاحب تو غالب کے یہاں جمالیات ہی ڈھونڈتے رہ گئے۔ مگر کوثر بھائی نے غالب کے یہاں شکیل صاحب کو تلاش کر لیا۔ مجھے شبہ ہے کہ غالب کو بھی اس کا علم نہ رہا ہوگا کہ ان کے یہاں بیسویں صدی کا ایک نقاد اتنی وافر مقدار میں موجود ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ جانتے بھی ہوں اور شکیل صاحب سے متاثر ہو گئے ہوں۔ میرے لئے تو دونوں بزرگ ہیں، اور بزرگوں کی باتیں بزرگ ہی جانیں۔

شکیل الرحمٰن: اردو تنقید کا نیا وژن، صفحات: 320، قیمت: 400 روپے ناشر: محمد صدیق نقوی، ملنے کے پتے: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی-2؛ نرالی دنیا پبلیکیشنز، A-358، بازار دہلی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی-2

پروفیسر فردوس خاں رومی کا مرتب کردہ شخصیت نامہ

مناظر عاشق ہرگانوی: شخصیت

ایک وقت تھا کہ لوگ اپنی شخصیت اور فن پر تبصرہ لکھوا کر خوش ہولیا کرتے تھے۔ مگر اب اس سے ادیب کی تسلی نہیں ہوتی۔ آج کل اپنے اوپر کتاب لکھوانے کا فیشن ہے۔ راقم ایک صاحب سے واقف ہے، جنہوں نے اپنے اوپر اتنی کتابیں لکھوا ڈالی ہیں کہ خود ان کی کتابوں کی تعداد کم پڑ گئی ہے۔ چنانچہ آج کل وہ اپنے نام سے کتابیں لکھوانے میں لگے ہوئے ہیں تا کہ تناسب قابل قبول ہو جائے۔ لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا معاملہ دوسرا، بلکہ تیسرا ہے۔

جتنی کتابیں انہوں نے دوسروں کے فن اور شخصیت پر لکھی ہیں اتنی شائد ہی کسی نے لکھی ہوں اس حساب سے خود پر کتاب لکھوانے کا ان سے زیادہ مستحق کوئی نہیں ہے۔ لیکن یہ الزام ان پر کوئی اذیت کوش اور سنگ دل ادبی دہشت گرد ہی لگائے گا کہ یہ کتاب انہوں نے خود لکھوائی ہے۔

مناظر کافی پہلے سے ہمارے ادبی منظرنامے پر موجود ہیں اور ان کا حلقۂ اثر پوری دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ ادب ان کا صحیح معنوں میں اوڑھنا بچھونا ہے۔ یہ کام الگ تناسب میں دوسرے ادیب بھی کرتے ہیں مگر عاشق صاحب کے برعکس وہ اوڑھتے زیادہ اور بچھاتے کم ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق اب تک تقریباً 140 کتابیں لکھ چکے ہیں ان میں سے تقریباً سبھی چھپ چکی ہیں اور خواہش یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہی 200 کتابوں کا ریکارڈ قائم کر جائیں۔ ادب کا کوئی شعبہ کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر مناظر صاحب نے کوئی کتاب نہ لکھ دی ہو۔ ادب بالغاں سے لے کر ادب نابالغاں یعنی ادب اطفال تک ہر طبقے کے لئے انہوں نے کتابیں لکھی ہیں۔

اب جب کہ انہیں پروفیسر کا درجہ مل چکا ہے، وہ اردو کے معدودے چند پڑھے لکھے پروفیسروں میں گنے جانے لگے ہیں۔ ورنہ تعلیم یافتہ پروفیسروں کا چلن اب اردو میں کافی کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کے کئی پروفیسروں نے زندگی میں اتنا پڑھا نہیں ہوگا جتنا مناظر عاشق اب تک لکھ چکے ہیں۔ ان میں تراجم ہیں، سبھی اصناف سخن کی اینتھالوجیز ہیں، تنقیدی جائزے ہیں، ناول ہیں، سفرنامے ہیں، آپ بیتی اور یادداشتیں ہیں، درسی کتابیں ہیں، غرض کیا ہے جو ان کے یہاں نہیں ہے۔ خود ان کے فن اور اسلوب پر جو سات کتابیں اب تک دوسروں کی چھپی ہیں وہ اس سب کے علاوہ ہیں۔

سچ پوچھئے تو اپنی ذات میں مناظر عاشق ہرگانوی کوئی تنظیم، ادارہ یا انجمن نہیں بلکہ ایک کارخانہ ہیں، جس سے آئے دن اردو ادب ڈھل کر نکلتا رہتا ہے۔

پروفیسر رومی نے ان کی شخصیت کے سبھی گوشوں تک قاری کی رسائی کے لئے خاصی محنت کی ہے۔ کل ملا کر پچاس مضامین شامل کئے گئے ہیں جن میں مصنفین نے اپنی اپنی نظر سے مناظر صاحب کو دیکھا ہے۔ ان کی اہلیہ فرزانہ پروین نے انہیں صرف ایک قلم کار مانا ہے۔ نینا جوگن نے انہیں اپنا ادبی محبوب بنایا ہے اور نہیں جانتیں کہ عاشق کون ہے اور معشوق کون ہے۔ شین مظفر پوری نے انہیں ادب کا جنگل بتایا ہے جس میں سب کچھ اگا ہوا ہے۔ جوگندر پال ان کی تیز رفتاری کے قائل ہیں۔ رضا نقوی واہی نے انہیں سیماب صفت کہا تھا۔ فیاض رفعت کے نزدیک وہ دیو قامت ہمزاد ہیں۔ ڈاکٹر عزیزی کو ان کی ذات میں قوس قزح نظر آتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے انہیں اردو کی ضرورت بتایا ہے۔ ان سب کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگناتھ آزاد، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر حامدی کاشمیری اور شمس الرحمن فاروقی سے لے کر مظہر امام، جیلانی بانو، یوسف ناظم، ندا فاضلی، صلاح الدین پرویز، حقانی القاسمی، علقمہ شبلی اور عشرت ظفر تک متعدد مشاہیر ادب نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی: شخصیت، صفحات: 334، قیمت: 350 روپے
ملنے کے پتے: نرالی دنیا پبلیکیشنز، A-358 بازار دہلی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔2؛ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔2

ڈاکٹر فراز حامدی کا مجموعۂ مضامین

توازن

ڈاکٹر فراز حامدی کی کتاب توازن ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں مختلف موضوعات پر ڈاکٹر صاحب کے 23 مضامین شامل ہیں۔ حمد اور نعت پر اولین دو مضامین ساحر شیوی کے حمدیہ ماہیوں اور ان کی نعتوں کے بارے میں ہیں۔ دیگر مضامین غزل، گیت، دوہا، جدید نظم، ہائیکو، ماہیا، جاپانی شعری صنف سین ریو، تنقید، مختصر افسانہ، سفر نامہ نویسی اور انشائیوں کے تعلق سے مختلف قلم کاروں اور تخلیقات کے بارے میں ہیں۔

فراز حامدی جیسا کہ مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے پیش لفظ میں بھی لکھا ہے، شاعری کے راستے سے تنقید میں آئے ہیں اور سائنٹفک طریقے سے آئے ہیں۔ چنانچہ اس میں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ان کے بیش تر مضامین شاعری سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں بھی جدید اصناف سخن کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہے، جن پر انہوں نے متعلقہ قلم کار کے بارے میں لکھتے ہوئے تکنیکی اور موضوعاتی دونوں پہلوؤں سے جانچ پرکھ کی ہے۔

کالیداس گپتا رضا کے بارے میں ان کا مضمون چونکانے والا ہے۔ عام طور سے رضا صاحب کو ماہر غالبیات، تنقید نگار اور داغ اسکول کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ جانا جاتا ہے۔ لیکن فراز صاحب نے ان کی گیت نگاری کو موضوع بنایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے گیت نگار تھے۔

ہائیکو، دوہا، ماہیا اور سین ریو پر ان کے مضامین خاصے معلوماتی ہیں اور ان شعری اصناف میں دل چسپی رکھنے والوں کو کچھ نہ کچھ کام کی باتیں ان مضامین میں ضرور مل جائیں گی۔

ساحر شیوی سے فراز حامدی خاصے متاثر نظر آتے ہیں کیوں کہ کتاب کے پانچ مضامین صرف ان کے فن پر ہیں۔ تاہم انہوں نے غلام مرتضیٰ راہی، بیکل اتساہی، سید معراج جامی، سوہن راہی، نذیر فتح پوری، آنند ساگر، وسیم بٹ وسیم، ظہیر غازی پوری، نادم بلخی، سلیم عالم اور عطیہ خان کی تخلیقات کو بھی موضوع بنایا ہے۔

توازن، صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، ملنے کا پتہ:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔2

حیدر قریشی کی نثری تحریروں کا مجموعہ

خبر نامہ

حیدر قریشی کا تازہ نثری مجموعہ خبر نامہ اس لحاظ سے خاصا اہم ہے کہ یہ اس کثیر الجہات اردو ادیب کی سیاسی، سماجی سمجھ بوجھ اور رجحانات کو بیان کرنے والی تحریروں کا پہلا مجموعہ ہے جو ہندوستان سے شائع ہوا ہے۔ اس طرح کا پہلا مجموعہ سرور ادبی اکادمی جرمنی اور اردوستان ڈاٹ کام امریکہ کے زیر اہتمام 'منظر اور پس منظر' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

اصل میں امریکی نائن الیون کے بعد پوری دنیا اور اس کے ادیبوں کو کچھ نہ کچھ ہوگیا تھا۔ اور کئی کو تو اب تک ہو رہا ہے۔ حیدر قریشی کو جب نائن الیون ہوا تو ان کے جذبات و خیالات اتنے شدید اور تیز دھار تھے کہ شعر یا افسانے کی صورت میں تو انہیں ڈھل سکتے تھے۔ اور وہ ٹھہرے بلا کے جلد باز۔ عمر میں مجھ سے دو چار مہینے چھوٹے ہی ہوں گے مگر ابھی سے اپنا کلیات شائع فرما چکے ہیں، عمر لاحاصل کا حاصل! میں نے کہا بھی کہ جناب ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے جو یہ حاصل اور لاحاصل کے پھیر میں پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ذرا خود کو اچھی طرح بوڑھا ہو لینے دیجیے، چالیس پچاس یکم جنوریاں اور گزر جائیں پھر چاہیں تو کلیات چھاپ لیجئے گا۔

مگر وہ کہاں سننے والے ہیں۔ ایسی باتیں نہ ایک کان سے سنتے ہیں نہ دوسرے سے نکالتے ہیں۔ اصولاً کلیات شائع کرنے کے بعد ادیب کو چپکا ہو کر ایک طرف بیٹھ جانا چاہئے۔ لیکن حیدر صاحب اب بھی ادب تخلیق کئے جا رہے ہیں۔ اگر چہ رفتار کچھ کم کردی ہے پھر بھی اتنی ضرور ہے کہ دس بارہ برس میں ایک اور کلیات کا مواد جمع ہو جائے گا اور تب شائد انہیں اس کا عنوان بالکلیات رکھنا پڑے گا۔

خیر، تو ہوا یہ کہ انہوں نے جارج بش سے سیدھی ٹکر لینے کی ٹھان کر اردو کی سب سے پرانی اور سب سے مقبول ویب سائٹ اردوستان ڈاٹ کام www.urdustan.com کے لئے 'منظر پس منظر' کے عنوان سے ایک کالم لکھنا شروع کر دیا۔ ویب سائٹ کو کالم نگاری کے لئے انہوں نے اس لئے چنا کہ وہ میرے خیال سے اردو ادب کے سب سے بڑے انٹرنیٹیے ہیں۔ اپنا بیش تر تخلیقی اور مراسلتی کام انٹرنیٹ پر کرتے ہیں۔ پھر وہ جیسا کہ میں نے کہا ہر وقت جلدی میں بھی رہتے ہیں۔ خاص طور سے اپنے ادبی کاموں کے سلسلے میں۔ تو یہ کالم طوفان میل کی طرح شروع ہوگیا۔ جب کالم بند ہوا اور اس کی کتاب چھپی تو پتہ لگا کہ لوگوں کو ان کی سیاسی و سماجی آرا پڑھنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ آخر بے حد اصرار پر انہوں نے ہلکے پھلکے مختصر تبصروں کا ایک کالم 'نہلے پر دہلا' شروع کیا جس کا انتخاب یہ کتاب 'خبر نامہ' ہے۔

ان ہلکے پھلکے تبصروں میں حیدر صاحب کے تیروں سے کوئی نہیں بچ سکا ہے۔ ان کے وطن پاکستان کو اسلامی ویلفیئر اسٹیٹ بنانے کی بات چلتی ہے تو وہ اسے 'دلفریب' سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ افغانستان اور عراق میں فوجی کارروائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کولن پاول جب یہ کہتا ہے کہ امریکہ گزشتہ بارہ برسوں سے مسلمانوں کو ظلم و جبر سے آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہا ہے تو کالم نگار بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

ہم پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا!

عراق میں مہلک ہتھیاروں کی تلاش کا بیش تر کام جب اتحادی

(امریکی، برطانوی) فوجوں کے ہاتھوں کرانے کی بات ہوتی ہے تو کالم نگار کو پاکستان اور ہندوستان کی لائق پولیس یاد آجاتی ہے جو نہتھوں سے بھی ہتھیار برامد کر لینے میں اعلیٰ مہارت رکھتی ہے۔

اس طرح کے دل چسپ تبصروں سے یہ کتاب بھری پڑی ہے اور اس کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ ہر خبر اور اس پر تبصرے کی تاریخ درج کر کے حیدر صاحب نے اسے لائق حوالہ بھی بنادیا ہے۔

خبرنامہ، صفحات: 174، قیمت: 150 روپے، ناشر اور ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔6

مشرف عالم ذوقی کا نیا ناول

پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سنامی

اس ضخیم و کیم شحیم ناول پر بھی تبصرے کا وعدہ تھا مگر ناول پڑھنے کے بعد پایا کہ اسے پڑھنا تو کیا اس پر تبصرہ کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔

پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سنامی، صفحات: 519، قیمت: 400 روپے، ناشر: مشرف عالم ذوقی، ملنے کا پتہ: ڈی۔304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔31

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب

شاہد جمیل: شخص اور شاعر

اب تک علامہ اقبال، عبدالحلیم شرر، سہیل عظیم آبادی، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا اور مظہر امام جیسی اہم شخصیتوں پر کئی کتابیں اردو کو دینے والے مناظر عاشق کو نسبتاً کم عمر اور کم معروف شاعر شاہد جمیل پر کتاب لکھنے کا کیوں خیال آیا اس کی وجہ ان ہی کے لفظوں میں سنیں تو یہ ہے کہ، ''شاہد جمیل کی شاعری میں احساسات اور فیلنگ کا اظہار دوسروں سے بڑی حد تک جداگانہ ہے...''

کتاب کا آغاز شاہد جمیل کے ساتھ ایک طویل مصاحبے سے ہوتا ہے۔ جس میں مناظر صاحب نے شخصیت فن اور ادب سے متعلق سبھی طرح کے سوالات کئے ہیں جن سے ایک سلجھے ہوئے متوازن فکر رکھنے والے ایک دردمند ادیب کی شبیہہ سامنے ابھرتی ہے۔ اس کے علاوہ ستر اور اسی کی دہائی کے شاعروں کے رجحانات و میلانات کا بھی کسی قدر اندازہ اس گفتگو سے ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد کتاب میں شاہد جمیل کی شاعری کے مختلف پہلوؤں، ان کی غزلوں، نظموں، ماہیوں، دوہوں اور کہہ مکرنیوں اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر 27 مضامین ہیں۔ آخر میں مشاہیر ادب کی آرا دی گئی ہیں جن میں وزیر آغا نے ان کے ماہیوں کی تعریف کی ہے۔ گوپی چند نارنگ ان کی تازگی فکر اور تراش کے قائل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے کلام میں وقار، تفکر اور ٹھہراؤ کا ذکر کیا ہے اور ان کی 'متوسط طوالت' کی نظموں کو سراہا ہے۔ البیلے نقاد محمود ہاشمی نے شاہد جمیل کی آواز کو اس بیمار عہد کے المیے کا اظہار بتایا ہے۔ ان کے علاوہ ندا فاضلی، بلراج کومل، کمار پاشی (مرحوم)، دیویندر اسر، آزاد گلاٹی اور غلام مرتضیٰ راہی نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

کتاب میں کمی ہے تو ایک شعری انتخاب کی۔ مضامین میں ان کے کلام کے کچھ حوالے ضرور آئے ہیں لیکن وہ ناکافی ہیں۔

شاہد جمیل: شخص اور شاعر، صفحات: 256، قیمت: 250 روپے، ناشر اور ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 3108 وکیل اسٹریٹ کوچہ پنڈت لال کنواں، دہلی۔6

ایفائے وعدہ کے بعد اب دو کتابیں اور

سید شکیل دسنوی کا شعری مجموعہ

کتنی حقیقت کتنا خواب

'زندگی اے زندگی' اور 'تنہا تنہا' کے بعد 'کتنی حقیقت کتنا خواب' سید شکیل دسنوی کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی فکر کی لو اور لے پہلے سے روشن اور تیز دکھائی دیتی ہے۔

شکیل دسنوی کا تعلق صوبۂ بہار کے مردم خیز قصبہ 'دسنہ' سے ہے۔ والد پروفیسر منظر حسن دسنوی سے ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ تعلیم انہوں نے سائنس کی حاصل کی اور انجینیرنگ کرنے کے بعد محکمۂ صحت عامہ میں سپرنٹنڈنگ انجینیر کے عہدے تک پہونچے مگر شعری ذوق و شوق برقرار رہا۔ شاعری میں رومانیت کا رنگ غالب ہے لیکن اب تیسرے مجموعے تک آتے آتے اس میں عصری رجحانات و مسائل کا رنگ بھی گہرا ہونے لگا ہے۔ اس کے علاوہ رومانی اشعار میں بھی پہلے سے زیادہ چمک اور صفائی نظر آتی ہے۔

'زندگی اے زندگی' کا شکیل بات کو یوں کہتا تھا:

آؤ تم یوں بیٹھے ہو، کیوں یہ چشم نم تنہا
کب کسی سے کٹتا ہے زندگی کا غم تنہا
اک غم کے سوا کس نے یہاں ساتھ دیا ہے
واللہ مجھے آپ سے شکوے نہ گلے ہیں

اب اسی شکیل کا لہجہ کچھ ایسا ہے:

کچھ ڈھونڈتے کھوئے سے نظر آؤ گے تم بھی
گھر آئے گا میرا تو ٹھہر جاؤ گے تم بھی
اک روز مرے پیار کی شبنم میں نہا کر
کلیوں کی طرح کھل کے نکھر جاؤ گے تم بھی

اس کے علاوہ یہ شاعر عصری حسیات کو بھی یوں بیان کرنے لگا ہے:

زباں چپ ہے یہ خنجر بولتے ہیں
لہو آمیز منظر بولتے ہیں
دل بجھا تو دور تک اٹھتا دھواں رہ جائے گا
کیا خبر پھر کون سا منظر کہاں رہ جائے گا

کتنی حقیقت کتنا خواب، صفحات: 176، قیمت: 150 روپے، ناشر اور ملنے کا پتہ: ایڈشاٹ پبلکیشنز، 104 بی اسمتا اسکون III نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ) ممبئی۔ 401107

ثروت خان کے افسانوں کا مجموعہ

ذرّوں کی حرارت

یہ ڈاکٹر ثروت النساخان کی تیسری تصنیف اور ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو شہادت دیتا ہے اس امر کی کہ مستقبل قریب کی ایک بڑی افسانہ نگار طلوع ہو چکی ہے اور اس کی روشنی کو جگمگانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ 18 افسانوں کے اس مجموعے کو پڑھ کر میرا یہ تاثر قوی ہوا ہے کہ اپنے یہاں اردو افسانہ سلام بن رزاق، سید محمد اشرف، شوکت حیات، طارق چھتاری، انجم عثمانی، ترنم ریاض اور اس قبیلے کے دوسرے قلم کاروں کے ساتھ ختم نہیں ہو جائے گا۔ ایک نئی اور شائد پہلے سے بہتر نسل افسانہ نگاروں کی چپکے چپکے تیار ہو رہی ہے۔ اور اس نئی نسل میں ثروت خان کا نام یقیناً کافی اوپر ہوگا۔ جی چاہتا ہے اس مختصر سے تعارفی تبصرے میں ان کے کئی افسانوں کی تعریف کروں، مگر پروفیسر محمد حسن کی ایک تحریر یاد آ رہی ہے۔ برسوں پہلے میری پہلی کتاب کے مختصر پیش لفظ میں انہوں نے لکھا تھا:

''...ان کی ہر کامیابی پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ کہیں ان کے کرتب میں خلل نہ پڑے اور ان کے مستقبل میں تحسین نا آشنا رکاوٹ نہ بن جائے۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر کسی نے غزل کے ایک ہی مصرعے میں وہ سب کچھ سمو لیا ہے جو ہمیں کہنا تھا کہ شاعر کی روشن ضمیری کی یہی دلیل ہے:

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے!''

یہی تحریر میں ثروت خان کی نذر کروں گا جن کا نام ثروت النساخان مجھے اس لئے زیادہ اچھا لگتا ہے کہ اس میں زیادہ ترنم ہے۔ تاہم اتنا پھر بھی کہوں گا کہ افسانے کی کبھی روایات اور ضرورتوں سے نہ صرف وہ اچھی طرح واقف ہیں بلکہ ان کا خیال بھی رکھتی ہیں اور ان کی حدوں سے باہر نکلنا بھی جانتی ہیں۔ کفائت الفاظ، انداز بیان، واقعاتی ترتیب، کردار نگاری، درد مندی، دبے کچلے حقیر بنا دئے گئے انسانوں کے دکھ کا عرفان، یہ سب تو اچھی افسانہ نگاری میں ہونا ہی چاہئے مگر ثروت خان کی محض چھ سالہ افسانہ نگاری میں اس سے بھی کچھ سوا محسوس ہوتا ہے۔ کتاب پڑھ کر دیکھئے۔

ذرّوں کی حرارت، صفحات: 128، قیمت: 100 روپے، ناشر: مصنفہ، ملنے کے پتے: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ 2
نرالی دنیا پبلیکیشنز، A-358 بازار دہلی گیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔ 2

پس نوشت: کتابوں کے مندرجہ بالا تعارف ناموں کو پوری طرح تبصرہ نہ سمجھا جائے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان سے قارئین کو متعلقہ کتاب پڑھنے یا نہ پڑھنے کی ترغیب ملے ان میں راقم نے اپنے ذاتی خیالات اور تصورات درج کئے ہیں جن سے قارئین کو اختلاف اور اصلاح دونوں کا پورا حق ہے۔ راقم کی کوئی رائے ادب ساز کی رائے ہرگز نہیں ہے۔ شخص الگ ہے ادارہ الگ۔ شکریہ

- براہ کرم آئندہ 2006 سے پہلے کی کوئی کتاب تبصرے کے لئے نہ بھیجیں۔ پہلے کی کتاب اسی صورت میں بھیجی جائے جب اس پر کہیں اور تبصرہ نہ شائع ہوا ہو۔
- تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے۔
- مصنفین کی جانب سے بھیجے گئے وہی تبصرے قبول ہو سکیں گے جو غیر مطبوعہ ہوں گے۔ ان کے ساتھ بھی کتاب کی دو جلدیں ارسال فرمائیں۔
- مضمون یا تبصرے فل اسکیپ کے تین صفحات سے زیادہ طویل ہوئے تو انہیں ایڈٹ کر کے شائع کیا جائے گا۔

تبصرہ: اداروں کی صحافت

اردو دنیا، اذکار، جہانِ غالب

شبنم پروین

سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے ادبی مجلّوں نے اردو ادب اور ادبی صحافت کے فروغ میں ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے، لیکن سرکاری اداروں کے ایسے رسالے بہت ہی کم ہیں جنھیں اس زمرے میں شامل کیا جاسکے۔ ہندوستان میں ماہنامہ آج کل اور پاکستان میں ماہنامہ ماہِ نو ایسے ہی کم رسالوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آج کل کا معیار تو خیر اب بھی بڑی حد تک قائم ہے مگر ماہِ نو اپنی آب و تاب کبھی کا کھو چکا ہے اور اب پاکستان کا یہ واحد سرکاری ادبی رسالہ محض خانہ پری کے لئے ہر ماہ اور کبھی کبھی دو تین ماہ میں ایک بار، شائع کیا جاتا ہے۔ صرف اس کی ضخامت (96 صفحات) ہے جو کبھی نہیں بدلتی۔ چاہے ایک ماہ میں نکلے یا دو میں یا تین میں۔ گٹ اپ، طباعت اور ترتیب ایسی کہ اپنے یہاں کے سرکاری گزٹ اس سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اچھی خاصی تخلیقات بھی دیکھنے میں سرکاری ادب معلوم ہوتی ہیں۔ پاکستان کی ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلیکیشنز کے ادارہ مطبوعات پاکستان کی جانب سے شائع ہونے والا یہ ادبی جریدہ پاکستان کا واحد سرکاری ادبی جریدہ ہے۔ وہاں ادبی صحافت کا عمل صرف نقوش، فنون، اوراق اور ان جیسے دوسرے، بہت سے پرائیویٹ جریدوں نے انجام دیا ہے۔

اس کے برعکس ہندوستان میں سرکاری ادبی جرائد کا ایک پورا قافلہ موجود ہے۔ بیش تر ریاستی اردو اکادمیاں اپنے اپنے ادبی مجلّے شائع کرتی ہیں۔ جن میں زیادہ تر یوں ہی سے ہیں لیکن دہلی اردو اکادمی کا ماہنامہ 'ایوانِ اردو' اور کرناٹک اردو اکادمی کا سہ ماہی 'اذکار' اپنا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں بلکہ 'اذکار' تو ترتیب، طباعت اور معیار میں 'ایوانِ اردو' سے بھی ایک دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر بعد میں۔

ریاستی اکادمیوں کے علاوہ کئی مرکزی سرکاری ادارے بھی اردو جریدے شائع کر رہے ہیں جن کا سرخیل تو اب بھی وزارتِ اطلاعات و نشریات کا 'آج کل' ہی ہے، تاہم قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو (NCPUL) کا ماہنامہ 'اردو دنیا' اور سہ ماہی 'فکر و تحقیق' وزارتِ منصوبہ بندی کا 'یوجنا' اور انڈین آرمی کا 'سینک سماچار' بھی قابل ذکر ہیں۔

'اردو دنیا' بہت عرصہ نہیں گزرا کہ یہ ہر لحاظ سے پچھڑا ہوا قابلِ رحم ادبی رسالہ نظر آتا تھا جس میں ملک کے ہر اچھے برے اخبار میں اردو کے بارے میں چھپنے والی خبروں کے تراشے ٹھونس ٹھانس کر بھر دیے جاتے تھے اور سمجھ لیا جاتا تھا کہ رسالے کے نام کا خیال رکھتے ہوئے پوری اردو دنیا کی تصویر پیش کر دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ اردو دنیا کی ایک ایسی بھدی تصویر ہوتی تھی کہ اچھا خاصا اردو نواز بھی اسے دیکھ کر بدک جائے۔ لیکن خدا بھلا کرے اس ادارے کے معتوب، سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کا جنھوں نے NCPUL کی دیگر سرگرمیوں میں ایک معقولیت لاتے ہوئے اس رسالے کی طرف بھی توجہ دی اور اس کو معیاری جریدہ بنانے کا عمل شروع کرایا۔ گزشتہ دو ڈھائی برس میں اس رسالے نے معیار کی کئی منزلیں سر کی ہیں اور جہاں وہ سب سے پچھڑا تھا آج وہاں سب سے آگے ہے۔ صرف 10 روپے میں 80 میگزین سائز صفحات کا یہ رسالہ آج اردو کا سب سے خوب صورت اور خوب سیرت رسالہ بن گیا ہے۔ ادبی مواد میں تنوع، توازن اور ترتیب کا حسن قابلِ دید بھی ہے لائق مطالعہ بھی۔ حمید اللہ بھٹ تو اب ادارے میں نہیں ہیں لیکن محترم شمس الرحمن فاروقی کی عالمانہ نگرانی میں نائب مدیر ڈاکٹر فیروز عالم نے پچھلے کئی شماروں میں رشید حسن خاں، احمد ندیم قاسمی اور خورشید الاسلام کے فن و شخصیت پر جتنے شاندار اور جاندار گوشے تیار کئے ہیں اور اردو زبان و ادب کے علاوہ تعلیم، سائنس، طب، معاشیات اور ادبِ اطفال کے ابواب میں جس قدر معیاری مضامین اور تراجم شامل کئے ہیں اس سے اس ماہنامے میں اردو کی دنیا اب اتنی ہی خوب صورت نظر آنے لگی ہے جتنی یہ دنیا ہونی چاہئے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا'، صفحات: 80، قیمت: 10 روپے، زرِ سالانہ: 100 روپے
ملنے کا پتہ: ویسٹ بلاک۔8، ونگ۔7، آر کے پورم نئی دہلی۔ 110066

'اذکار' یوں تو کرناٹک اردو اکادمی کا کئی سال پرانا رسالہ ہے لیکن اس کی ایک معیاری جریدے کی شکل میں ولادت اسی سال اس کے پانچویں شمارے سے اکادمی کے فعال اور اختراعی ادبی ذہن رکھنے والے چیئرمین

پروفیسر م ن سعید کی نگرانی اور ساجد حمید کی ادارت میں عمل میں آئی ہے۔ قبل ازیں یہ صرف ان مقالوں پر مشتمل اطلاع نامے جیسا رسالہ ہوا کرتا تھا جو اکادمی کی طرف سے منعقد ہونے والے سیمناروں میں پڑھے جاتے تھے (ظاہر ہے ادکادمیوں کا اصل کام سیمنار کرانا ہی تو ہے!)۔ لیکن اب اسے سہ ماہی بنا دیا گیا ہے اور ترتیب و تہذیب کے لحاظ سے اسے اردو کے کسی بھی معیاری مجلہ کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔

'اذکار' (جنوری۔ مارچ 2006) میں نظموں، غزلوں، افسانوں کے روایتی ابواب کے علاوہ ورثہ، بازیافت، مطالعے، میزان اور سمت و رفتار کے عنوان سے الگ باب قائم کئے گئے ہیں۔ 'ورثہ' میں نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے درباری، تاریخ نویس و میر منشی، میر حسین علی کرمانی کی شاعری اور تصنیفات پر ایک مختصر معلوماتی مضمون دیا گیا ہے۔ 'مطالعے' کے تحت انور داغ کا مضمون 'مزاح اور مشتاق یوسفی' اس عہد ساز مزاح نگار کے فن پر بعض اعتراضات سے متعلق ہے جو یوسفی کے فن کے کئی گوشوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اسی باب کے تحت نظیر اکبرآبادی کی شاعری، دوہا نگاری کی روایت اور کرناٹک میں اردو شاعری کی روایت پر بھی خاصے معلوماتی مضمون شامل ہیں۔ دو ادبی گوشے بھی شائع کئے گئے ہیں جن میں سے ایک افسانہ نگار سلام بن رزاق کے فن اور شخصیت پر اور دوسرا ممتاز ادیب و عالم خالد عرفان کی یاد میں ہے جن کا گزشتہ سال (18 اگست 2005) انتقال ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان پر گریش کرناڈ کا ڈرامہ اس شمارے کی خاص پیش کش ہے جس کا ترجمہ پروفیسر م ن سعید نے 'خواب نامہ ٹیپو سلطان' کے نام سے کیا ہے۔

امید کی جانی چاہئے کہ اردو زبان کے مسئلوں پر لکھے گئے جرأت مندانہ و حقیقت افروز اداریے میں اس جریدے کو سال بھر میں چار مرتبہ شائع کرنے کا جو وعدہ کیا گیا ہے اسے پروفیسر سعید باطل نہیں ہونے دیں گے۔

سہ ماہی اذکار: صفحات: 336 ڈیمائی سائز، قیمت: 60 روپے، زرسالانہ :100 روپے، ملنے کا پتہ: 'اذکار' کرناٹک اردو اکادمی، کنڑا بھون، جے سی روڈ، بنگلور 560002، ویب سائٹ: urduacademy.kar.nic.in

'جہانِ غالب' کا اجرا جہان غالبیات کے لئے ایک اہم واقعہ اس لئے بھی ہے کہ اسے غیر سرکاری غالب اکیڈمی نے اپنے بانی، سر سید ثانی حکیم عبدالحمید مرحوم کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے طور پر جاری کیا ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی اس کا نام بھی طے کر دیا تھا۔ نگراں اس کے خواجہ حسن ثانی نظامی اور مدیر ڈاکٹر عقیل احمد ہیں جن کی محنت کی داد اس حقیقت کے باوصف دی جانی چاہئے کہ کتابی سائز کا یہ چھوٹا سا رسالہ ضخامت اور مدت اشاعت کے لحاظ سے نہ تو غالب اکیڈمی کے شایانِ شان ہے نہ 'ہمدرد' جیسے بڑے طبی و تجارتی ادارے کو زیب دیتا ہے جو اس اکیڈمی کا اصل کفیل ہے۔ اور کچھ نہیں تو اس کی ضخامت ہی بڑھادی جائے تاکہ یہ دہلی میں ادبی سرگرمیوں کا اہم ترین مرکز بن جانے والے اس ادارے کی پوری تصویر تو پیش کرسکے۔

اس سب کے باوجود پہلے ہی شمارے میں پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر انور پاشا اور ترنم ریاض کے معلوماتی مقالات نے جہانِ غالب کو اردو اور غالبیات کے طالب علموں کے لئے ایک لازمی جریدہ بنا دیا ہے اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ 'غالب اکیڈمی' اور 'ہمدرد' دونوں اس کے لئے لائق مبارک باد ہیں۔

ششماہی 'جہانِ غالب': صفحات: 120 کتابی سائز، قیمت: 25 روپے، زرسالانہ: 40 روپے، ملنے کا پتہ: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

جلسہ
اردو رسائل: مسائل، وسائل
ادب ساز کے اجرا کی تقریب

مقام: ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم رویندر بھون، فیروز شاہ روڈ نئی دہلی
وقت: 24 مئی 2006 کی شام 6 بجے
صدارت: ڈاکٹر خلیق انجم
مہمانانِ خصوصی: پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مشیر الحسن، سید محمد اشرف۔ نظامت: فرحت احساس
دیگر شرکائے گفتگو: پیغام آفاقی، پروفیسر اختر الواسع، انجم عثمانی، نصرت ظہیر

(چائے وغیرہ کے بعد جلسے کا آغاز)

نصرت ظہیر: حاضرین کرام، ادب ساز کی طرف سے میں آپ سب حضرات کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی ہے اور آپ کی خوش قسمتی کہ مجھے بولنا نہیں آتا۔ صرف لکھ پاتا ہوں۔ بولتا ہوں تو زبان پکڑی جاتی ہے۔ اس لئے یہ کام ہم نے چھوڑ دیا ہے فرحت احساس صاحب کے لئے...

فرحت احساس: مجھے خود بھی بولنا نہیں آتا...

خلیق انجم: اوہ! اب کیا ہوگا؟

(قہقہے)

نصرت:... یہی آج کے پروگرام کی نظامت فرمائیں گے، یہی اس کو ٹھیک سے چلائیں گے۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔

فرحت احساس: شکریہ نصرت ظہیر۔ میں کوشش کروں گا کہ ایک ربط قائم رکھوں تمام سرگرمیوں میں جو آج یہاں ہونے والی ہیں۔ آج کی اس محفل میں صدارت جناب خلیق انجم صاحب کی ہے۔ اور جناب پروفیسر مشیر الحسن صاحب مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ اور اس رسالے کا اجرا پروفیسر نارنگ فرمائیں گے۔ ان ضروری اطلاعات کے بعد میں چند منٹ ادب ساز کے حوالے سے آپ کے سامنے کچھ تعارفی باتیں پیش کروں گا۔ کوئی بھی رسالہ آج کے دور میں، (خاص طور پر) اردو ادب کا رسالہ نکالنا (دراصل) کئی خطروں سے دوچار ہونا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ پوری دنیا میں اور ہمارے ملک میں بھی ادب ایک ناکارہ، بے کار اور غیر ضروری چیز بن کر رہ گئی ہے۔ جو بے توقیری ادب کے حصے میں آئی ہے اس دور میں، اس سے ہم سب واقف ہیں۔ تو یہ ایک خطرہ ہے جو کسی بھی مدیر کے سامنے رہتا ہے اور رہنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ خود (ہم) جس زمانے میں رہتے ہیں اس میں انگریزی زبان کا جو بول بالا ہے، ساری دنیا میں جس طرح سے تہذیبی استعماریت پھیل رہی ہے اور ہماری زبان بھی اس کی زد میں آئی ہے، تو ہمارے اپنے ملک میں جو ہماری اپنی زبانیں ہیں وہ جس طرح سے بے توقیری کا شکار ہوئی ہیں، اس میں اردو بالخصوص...وہ بھی ایک بڑا خطرہ ہے کسی بھی مدیر کے لئے۔ اردو آج سے پچاس سال پہلے تک تہذیبی طور پر حاوی زبان تھی۔ میں ابھی کچھ کام کر رہا تھا جامعہ ملیہ کے لئے ڈاکٹر عابد حسین کے بارے میں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ڈاکٹر عابد حسین جو انگریزی پر بھی اتنے ہی زیادہ حاوی تھے جتنے اردو پر لیکن انہوں نے ایک شعوری فیصلے کے تحت اردو کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا... جس طرح سے اردو اپنے اس منصب سے نیچے آئی ہے اپنے غالب تہذیبی اور دانش ورانہ اظہار کی حیثیت سے، تو اس پورے ماحول میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آج اس رسالے کا اجرا جس تہذیبی سیاسی سماجی ثقافتی ماحول میں ہو رہا ہے اس میں اس رسالے کی کیا اہمیت ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے اور خود اس دور میں اس کی کیا معنویت ہے۔ ابھی ایک رسالہ اپنے اختتام کو پہونچا۔ ہم جانتے ہیں پچھلے پچاس سال میں ایک، بہت بڑے، جسے رجحان بھی کہہ سکتے آپ تحریک بھی کہہ سکتے ہیں، اس نے ادب کے حوالے سے کچھ باتیں ہمارے سامنے پیش کیں کچھ رویئے ظاہر کئے۔ ادب کا ایک نیا اسلوب سامنے آیا۔ لیکن آج کچھ سوال ایسے پیدا ہوئے ہیں جن میں ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ پچھلے پچاس سال کی ہندوستان کی زندگی میں جو دانش کی سطح پر فکر کی سطح پر جذبوں کی سطح پر محسوسات کی سطح پر اور زندگی کے پورے تجربے میں جو تبدیلیاں، جو حشر خیز تبدیلیاں اور جو اتھل پتھل کر دینے والی، انسانی نفس کو اور حالات کو انسان کے وجود کو متزلزل کر دینے والی جو تبدیلیاں آئی ہیں اس کا اظہار اس رسالے

کے ذریعے کہاں تک ہوا ہے۔ اس رسالے کے بارے میں جو لوگ اس کو پڑھیں گے وہ دیکھیں گے کہ اس میں کیا کیا ہے کیا نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ میں سمجھتا ہوں دو باتیں اس میں بہت اہم ہیں۔ ایک تو مدیر کی مداخلت اس میں بہت کم ہے۔ دوسری بات یہ کہ تجارتی مقاصد اور ادبی مقاصد دونوں کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، توازن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو میرے خیال سے اچھی بات ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقریب صرف ایک رسمی تقریب نہ رہے کہ ایک رسالہ نکلا ہے اس کا اجرا ہو رہا ہے اور اس کے بارے میں چند رسمی باتیں کہہ کے یہاں سے اٹھ جایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے تہذیبی اور انسانی وجود کو درپیش جو سوالات ہیں ان پر تھوڑی سی بات ہو۔ میں سمجھتا ہوں مشیر الحسن صاحب یہاں ہیں خلیق صاحب ہیں اور پروفیسر نارنگ ہیں۔ یہ تینوں حضرات آج کے پورے انسانی منظرنامے میں انسانی صورت حال میں جو علم کی صورت حال ہے جو نا علم کی صورت حال ہے اور جو ویرانے پیدا ہوئے ہیں انسانی نفس میں اور انسانی ذہن میں اور جو انسان میں اپنی نفی کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں اس تمام منظرنامے کو سامنے رکھ کر کچھ باتیں یہاں ہوں گی۔ اس سے پہلے کہ گفتگو ہو میں باضابطہ اس رسالے کے اجرا کی رسم کے لئے پروفیسر نارنگ سے گزارش کرتا ہوں۔ نصرت ظہیر صاحب نے جو اعلان کیا تھا اپنے رسالے کے سلسلے میں اس (کے جواب میں) میں سب سے پہلے دو حضرات نے ان کو (زر) تعاون روانہ کیا۔ تو ایک تو جناب اروِن کول صاحب (فلم ساز، ہدایت کار) ہیں اور (فصیلی دہلی کی مشہور شخصیت) حاجی فیاض صاحب۔ یہ دو حضرات ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مالی تعاون (علی الترتیب 300 روپے کے چیک اور منی آرڈر کی شکل میں) پیش کیا۔ نارنگ صاحب رسالے کی پہلی دو جلدیں ان حضرات کو پیش کریں گے اجرا کی شکل میں۔

(پروفیسر نارنگ دونوں صاحبان کو افتتاحی شمارے کی جلدیں پیش کرتے ہیں، تصویر کشی ہوتی ہے)

فرحت احساس: اس رسالے میں نصرت صاحب نے یہ التزام رکھا ہے کہ ہر شمارے میں دو ادیبوں کو ایک مخصوص مطالعے کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ اس شمارے میں حمایت علی شاعر صاحب کا شاعری کے حصے میں خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور سید محمد اشرف کا افسانوی ادب کے سلسلے میں۔ اشرف کے بارے میں آپ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے اردو کہانی کو اس کی تہذیبی حیثیت میں بحال کرنے کا جو عمل آج سے بیس سال پچیس سال پہلے شروع ہوا تھا اور اسے اس کے گھر میں دوبارہ بسانے کا جو عمل شروع ہوا تھا اس میں انہوں نے بہت کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اور ایک نئے سرے سے... بہت سی باتیں ان کے افسانوی ادب کے بارے میں ہوئی ہیں کہی گئی ہیں لکھی گئی ہیں ان کی جو significance ہے اس کو نشان زد کرنے کے لئے، جو بنیادی بات ہے وہ کہ کہانی کو اس کے اپنے گھر میں بسانے کا کام اور اس کے جو تہذیبی رشتے ہیں ان کو دوبارہ استوار کرنے کا کام اور خود اپنے عہد میں جو سماجی اور تہذیبی تبدیلیاں ہیں ان کو افسانے میں منعکس کرنے، ایک خاص زبان جو افسانے کی ہے، اس کو پھر سے ایک اعتبار دلانے کا کام انہوں نے کیا ہے۔ یہاں پر ہم نے سوچا تھا کہ اشرف کے فن کے بارے میں اور ان کی زبان کے بارے میں ان کے افسانوں کے بارے میں کچھ گفتگو بھی ہو۔ تو ایک خیال تھا کہ اس کو open رکھا جائے جو صاحب بھی اظہار خیال کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ کوئی باضابطہ تعارف یہاں پیش نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ اتنے متعارف ہیں اور اتنے زیادہ پہونچ چکے ہیں لوگوں تک ان کے افسانے اور ان کا فن۔ تو میں گزارش کروں گا خود اشرف سے کہ تھوڑا سا اپنے بارے میں اور اس پورے ماحول کے بارے میں جس پس منظر میں انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں اور آج تک جو سفر ان کا رہا ہے ادب اور فن کا اس کے بارے میں کچھ اظہار خیال کریں۔

سید محمد اشرف: صدر محفل ڈاکٹر خلیق انجم صاحب مہمان خصوصی پروفیسر مشیر الحسن صاحب مشفق اور کرم فرما پروفیسر نارنگ صاحب، خواتین و حضرات۔ کسی ایسے جلسے میں شریک ہونا جس میں کسی ایسے رسالے کا اجرا ہو رہا ہو جس میں خصوصی مطالعے کا محور ہمیں بنایا گیا ہو پھر اس کے بعد اس جلسے میں ڈائس کے بیچوں بیچ بیٹھنا اور پھر اس کے بعد اپنے ہی بارے میں تقریر کرنا شرمندگی در شرمندگی در شرمندگی میں غرق ہونے کے مترادف ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے کسی عالمانہ گفتگو کی توقع مت کیجئے گا، میرا خیال ہے آپ کرتے بھی نہیں ہوں گے، میں تو ٹوٹی پھوٹی کہانیاں لکھ پاتا ہوں، کہانیوں کے ہی حوالے سے کچھ باتیں کر سکتا ہوں، لیکن صرف اسی صورت میں جب کوئی سوال سامنے آئے۔ اپنی کہانیوں کے بارے میں بات کرنا بڑا ناموزوں سا لگتا ہے۔ صرف اس صورت میں موزوں لگتا ہے جب کسی کو کسی جگہ کوئی اشتباہ ہو کوئی باریک بات ایسی ہو جو سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں اس جلسے کے format میں اگر فرحت احساس صاحب اجازت دیں تو تھوڑی سی جسارت کرتے ہوئے تبدیلی یہ کرنا چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ مجھ سے تقریر سنی جائے یا باتیں سنی جائیں جو ظاہر ہے اگلے دوسرے منٹ یا تیسرے منٹ میں اکھڑنے لگیں گی، مجھ سے میری کوئی دو یا تین صفحے کی کہانی سن لی جائے۔

فرحت احساس: ہاں بالکل۔

سید محمد اشرف: اگر آپ حضرات اس پر راضی ہیں تو... (سب حاضرین اصرار کرتے ہیں)... حضرات میں یہ رسالہ بھی پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور اس کا جلسے کا جو دعوت نامہ ہے وہ تو میں نے اب تک نہیں دیکھا... یہ نصرت ظہیر

صاحب کی کرامتیں ہیں...

نصرت: مجھے بھی پہلی بار دیکھا ہے آپ نے۔

سید محمد اشرف: ہاں نصرت ظہیر صاحب کو بھی پہلی بار دیکھا ہے... حضرات میں بجائے اس کے کہ کوئی کہانی سناؤں میں آپ کو اپنے ایک ناول (مردار خور) کا جو ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، اس کا ایک بہت مختصر سا حصہ سنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ ناول گدھوں کے extinct ہونے پر ہے۔ گدھ جو غائب ہو گئے ہیں مردار خور، ہمارے علاقے سے، اتر پردیش کے علاقے سے اور میرے خیال میں ناردرن انڈیا کے علاقے سے ان کا غیاب بالکل مستند ہو گیا ہے، تو یہ کیوں غائب ہوئے کیسے غائب ہوئے اس کو ایک ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا یہ ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس کا ذیلی عنوان ہے دلاورانِ نیم شب۔ یہ 1947 کے فوراً بعد لوگوں کی، قصباتی لوگوں کی کیا ذہنیت رہی ہوگی اس سے متعلق ہے۔ عرض ہے:

نذیر چچا دیر تک اکرم کی آنکھوں میں دیکھتے رہے...

(اقتباس پڑھ کر سناتے ہیں جو ادب ساز کے پہلے شمارے میں شائع ہو چکا ہے)

اقتباس کی قرأت اور داد و تحسین کے بعد

فرحت احساس: شکریہ اشرف۔ (پروفیسر مشیر الحسن کسی اچانک مصروفیت کے سبب رخصت ہو جاتے ہیں) یہ رسالہ جو ابھی کچھ لوگوں تک پہونچ گیا ہو گا جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس میں خدمت کا لفظ میرے خیال سے نہیں ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ ایک مدیر نے اردو زبان کی خدمت کے عزم سے رسالہ نہیں نکالا ہے۔ بلکہ کچھ... نصرت ظہیر صاحب ہمارے بہت اہم مزاح نگار ہیں آج کے ہمارے دور کے۔ اور جو رنگ اور آہنگ ہے پورے رسالے کا اس سے لگتا ہے کہ وہ کچھ نئی چیزیں کرنا چاہتے ہیں کچھ نئی بحثیں اٹھانا چاہتے ہیں اور جو آج ادب تخلیق ہو رہا ہے اس کے بہترین جو مظاہر ہیں ان سے ہمیں متعارف کرانا چاہتے ہیں... میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا یہ ایک کھلا ہوا ہاؤس open ہے بالکل... جن لوگوں نے یہ رسالہ دیکھا ہے اور اس سلسلے میں نصرت ظہیر صاحب سے کچھ سوالات اگر کرنا چاہیں وہ اور اپنے خیالات کا بھی اظہار کرنا چاہیں تو ان سے یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ رسالہ کیوں نکالا آپ نے، جب کہ اتنے رسالے نکل رہے ہیں۔ اس میں ایک رسالے کے اضافے کی ضرورت کیا تھی... نصرت ظہیر صاحب کو شائد کچھ کہنا ہے...

نصرت: اصل میں اشرف صاحب کو اس محفل میں بلانے کا بڑا خاص مقصد تھا ہمارا۔ چاہتے ہم یہ تھے کہ یہ کچھ سنائیں اور ان کے فن پر کچھ بات ہو۔ بجائے اس کے کہ صرف رسالے کے بارے میں ہی باتیں ہوں کہ یہ بہت اچھا قدم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ ادب پر ہی focus رہے۔ اشرف صاحب نے بڑی خوب صورتی سے ہمیں format میں جو کمی رہ گئی تھی اس سے بچایا۔ اور بڑا اچھا اقتباس اپنے ناول کا ہمیں سنایا۔ ہماری خواہش تھی کہ اس پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔ میں بہر حال ان سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ نمبردار کا نیلا کے بعد جہاں تک میرا علم ہے یہ ان کا پہلا ناول ہے جواب آ رہا ہے۔ تو کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیں کہ یہ کب آ جائے گا اور کتنا تیار ہو گیا ہے کیا اس کی بیک گراؤنڈ ہے اور کیوں یہ اسے لکھ رہے ہیں۔ تو یہاں سے کچھ بات نکلے گی...

سید محمد اشرف: حضرات گرامی، یہ جو اس قسم کے تقریباتی جلسے ہوتے ہیں اس میں، میں نصرت ظہیر صاحب سے تھوڑا سا عدم اتفاق کرتے ہوئے عرض کر رہا ہوں کہ اس میں اچھا یہی لگتا ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے منعقد کیا گیا ہے اس پر پہلے بات ہو۔ ادب ساز میں نے پہلی مرتبہ اسی وقت دیکھا ہے جب نارنگ صاحب نے اس کا اجرا کیا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ سب لوگوں نے پڑھا نہیں ورنہ اس پر گفتگو ہوتی۔ ہم میں سے کم سے کم فرضِ کفایہ کے طور پر چند لوگوں کو تو صرف اتنا ہی کہہ دینا چاہئے کہ نصرت ظہیر صاحب بہت بہت مبارک ہو۔ اور بہت شاباشی دینا چاہئے۔ ناول کا جہاں تک سوال ہے تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نمبردار کا نیلا کے بعد دو ناول جو ہیں ایک ساتھ چل رہے ہیں ایک 'میر امّن قصہ سنو' اور ایک یہ 'مردار خور' جس میں گدھوں کے غائب ہونے کا ذکر ہے ۔ اور اس کے تھیم کا نچوڑ بتا دوں آپ کو... اس ناول میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ گدھ اس لئے غائب ہو رہے ہیں کہ گدھوں کا اصل کام جو تھا وہ مردار خوری تھی یعنی مردہ چیزوں کو، مردار چیزوں کو کھانا تھا اب چوں کہ ان کے قائم مقام دوسرے بہت سے لوگ پیدا ہو چکے ہیں اس لئے گدھوں کو زندہ رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

فرحت احساس: یہاں ہمارے دوست پیغام آفاقی بیٹھے ہوئے ہیں آپ کچھ کہیں... اس رسالے کی کس طرح سے پذیرائی کی جائے یا نہ کی جائے...

پیغام آفاقی: تقریب کے طور پر کچھ کہنا خواہ مخواہ وقت کو ضائع کرنا ہے۔ یہ جب معلوم ہوا کہ یہ رسالہ نکل رہا ہے، اور مجھ سے نصرت صاحب نے کہا تھا کہ میں اپنی چند کہانیاں ان کو دے دوں۔ کل انہوں نے فون کیا مجھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کی کوئی کہانی اس میں شائع نہیں ہوئی ہے تب مجھے معلوم ہوا کہ رسالہ نکلا ہے۔ کسی وجہ سے میں (کہانیاں) نہیں دے پایا تھا، کافی مشغول تھا۔ انہوں نے گوشہ نکالنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے میرا خیال ہے کہ اگر ایک بات کا یہ لحاظ رکھیں کہ یہ گوشے سنجیدگی سے نکلیں جو رسالے کو خریدے اسے احساس ہو کہ اردو ادب کے اندر کسی ادیب کے اوپر ایک (سنجیدہ) گوشہ نکلا ہے اور اس کو سنجیدگی سے پڑھا جا سکتا ہے سنجیدگی سے اس میں مضامین لکھے گئے ہیں تب تو اس طرح کے گوشے کا فائدہ ہے... گوشہ بازی otherwise بند کریں... ذاتی طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کم سے کم

مجھ سے پندرہ بیس لوگوں نے پچھلے پندرہ بیس سالوں میں کہا ہوگا کہ ایک گوشہ نکالتے ہیں۔ لیکن ان سے جب ہم نے یہ پوچھا کہ آپ کیوں نکال رہے ہیں کیا نکال رہے ہیں کیا لکھیں گے اس کے اوپر کون لکھے گا تو کچھ دنوں کے بعد وہ رخصت ہو گئے کیوں کہ انہیں اس کے لئے پیسہ چاہئے تھا...(اس گوشے کے لئے) اشرف کا انتخاب اپنے آپ میں اچھا ہے، صحیح ہے اس کی میں تائید کرتا ہوں اور گوشہ کیسا ہے یہ پڑھنے کے بعد بتایا جا سکتا ہے۔ اب رہا رسالہ...تو ایک رسالہ چاہے جس مقصد کو بھی لے کر نکلا تھا، شب خون، جس کا ذکر کیا گیا وہ بند ہو گیا۔ بیچ میں کئی رسالے اور بھی آئے... ایک دو میں جو رسالے کو نکال رہے تھے تقریباً ہر صفحے پر یا تو ان کا نام ہوتا تھا یا ان کا ذکر ہوتا تھا۔ ایک اور رسالہ دیکھا اس میں جو رسالہ نکال رہے تھے ان کا ذکر نہیں ہوتا تھا ایک اور صاحب تھے ان کے دوست ان کا ذکر ہوتا تھا۔ لیکن ایک دو رسالے ایسے بھی نکلے جو سنجیدگی سے نکلے۔ تو دھیان یہ رکھنا چاہئے خیال یہ رکھنا چاہئے رسالہ جو آپ شائع کر رہے ہیں تو یہ (لگنا چاہئے کہ) پڑھنے والا جو ہے قاری، اس کے پیسے سے یہ رسالہ نکل رہا ہے، اگر یہ نہیں دکھتا ہے یا ایسا نہیں ہوتا ہے پیسہ کہیں اور سے آتا ہے کمرشل اگر کوئی اشتہار ہے اس میں (تو) وہ ٹھیک ہے لیکن اگر اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ ہے تو...رسالہ آگے نہیں بڑھ سکتا کیوں کہ یہ ensure کرنا بہت ضروری ہے کہ جو لوگ پڑھنا چاہتے ہیں وہ پیسہ دینے پر مجبور ہیں اس لئے کہ اس میں آپ ایسا مواد دے رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ایک رسالے کی ضرورت یا اردو سے دل چسپی کتنی گہری ہے لوگوں کو کتنی بے چینی ہے کہ نصرت ظہیر صاحب نے کہا کہ یہ رسالہ ایک ہم نے نکالا ہے آپ آیئے ہم بھی آئے ہوئے ہیں یہاں پہ مجھے امید ہے کہ اس بات کا یہ لحاظ رکھیں گے جس طرح انہوں نے بلایا ہے اور جس طرح سے لوگ آئے ہیں اس کے لئے اس معیار کو بھی باقی رکھیں گے اور اس میں محنت کریں گے اور محنت کرائیں گے۔ شکریہ۔

فرحت احساس: ...بہت اہم پہلو سامنے رکھے پیغام نے ...خاص طور پہ 'شاعر' (ماہ نامہ شاعر بمبئی) جو ہر مہینے ہمارے سامنے آتا ہے پچھلے ایک سال سے انہوں نے ایک سلسلہ یہ شروع کیا ہے جس میں پہلے صفحے پر ایک تصویر ہوتی ہے بہت بڑی اور ایک گوشہ ہوتا ہے اس آدمی کا اور یہ بات بالکل طے ہے کہ وہ ایک اشتہار ہے۔ مطلب (ایسا) کہا نہیں جاتا ہے۔ (مگر) تقریباً پانچ ہزار یا دس ہزار روپے اس کی شرح ہے اور اس کو دے کر کوئی بھی شخص اپنا گوشہ چھپوا سکتا ہے اور تصویر چھپوا سکتا ہے۔ تعارفی کلمات اپنے لئے چھپوا سکتا ہے۔ تو یہ ایک عجیب سی آلودگی 'شاعر' کے توسط سے پھیل رہی ہے اردو میں کہ آپ بغیر بتائے ہوئے کہ یہ اشتہار چھاپ رہے ہیں آپ اسے سند دے رہے ہیں ادب کی اور لوگوں سے شرکت کرا رہے ہیں اس سند (کی تفویض) میں تو یہ ایک بہت بڑا سلسلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے خلاف ایک باقاعدہ ایک محاذ بنا چاہئے۔ کسی بھی رسالے کو یہ حق نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو (کسی شخصیت کے بارے میں) مبالغے کی کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں آپ آزاد ہیں لیکن تجارتی مقاصد کے تحت درپردہ آپ تجارتی مقاصد حل کر رہے ہیں اپنے، لیکن جو محاذ ہے سامنے...وہ یہ ہے کہ آپ ایک شخص کے ادبی محاسن پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ تو ان دونوں چیزوں کو یا تو واضح کیا جائے یا اس کو ختم کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک سوال بہت اہم ہے جو...اور بھی دوسرے رسالے ہیں جن میں عام طور پہ...اس رسالے (ادب ساز) کے اندر بھی تین چار اشتہار موجود ہیں۔ ادبی اشتہار جو ہیں کسی بھی ادبی رسالے میں وہ بالکل واضح ہونے چاہئیں کہ یا تو یہ اشتہار ہیں۔ اگر اطلاع نامہ ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں جو تعریفی کلمات ہیں وہ مدیر کے اپنے خیالات ہیں یا کوئی ایسا consensus پایا جاتا ہے اس ادیب یا شاعر کے بارے میں جس کا اظہار اس چوکھٹے میں کیا گیا ہے...نصرت ظہیر صاحب کو یا تو واضح کرنا چاہئے کہ وہ اشتہار ہیں جو واضح نہیں کیا گیا۔ تو یہ آلودگی جو آج ہماری ادبی صحافت میں پائی جاتی ہے اس کو ختم ہونا چاہئے۔ (چوکھٹوں میں کہی گئی باتیں ہرگز اشتہار نہیں تھیں۔ بیش تر دوسروں کی کہی گئی باتیں ہیں۔ فرحت صاحب نے توجہ سے ان عبارتوں کو پڑھا ہوتا تو انہیں خود بھی یہ معلوم ہو جاتا۔ مدیر) میں گزارش کرتا ہوں انجم عثمانی صاحب سے جو بہت مشہور افسانہ نگار ہیں اور دوردرشن میں جو ادب کا پروگرام ہے اس کے انچارج ہیں۔ وہ کچھ اظہار خیال فرمائیں گے۔

انجم عثمانی: سب سے پہلے تو میں نصرت ظہیر صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے اتنا اچھا رسالہ نکالا۔ جس کی شکل ابھی دیکھی۔ مبارک باد اس لئے بھی کہ اس میں کئی میری بھی کہانیاں شامل ہیں۔ اور میری بھاگ دوڑ (ٹی وی کیمروں کے ذریعے تقریب کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں) جو یہاں میں کر رہا ہوں اس سے بھی آپ کو یہ اندازہ ہو جانا چاہئے کہ اس میں میری بھی کہانیاں ہوں گی (ہنسی) نصرت ظہیر صاحب ہمارے ایسے دوستوں میں ہیں کہ جب بھی وہ کوئی بات کہتے ہیں تو ہم اسے حکم کے درجے میں رکھتے ہیں، اس کی وجہ اصل میں ان کی مزاح نگاری کا خوف ہے۔ پتہ نہیں کب کس طرح کا خاکہ یہ لکھ ماریں۔ اس لئے ان کی ہر بات کو ماننا پڑتا ہے۔ کچھ دن پہلے انہوں نے حکم کیا تھا کہ آپ کی چند کہانیاں چاہئیں۔ اور مجھ سے کہا کچھ غیر مطبوعہ ہوں تو اچھا ہے۔ میں نے اس وقت گزارش کی تھی کہ میں غیر مطبوعہ لکھتا ہی نہیں ہوں۔ تو میں نے مطبوعہ ہی ان کو روانہ کر دی تھیں۔ انہوں نے ان میں سے کئی کہانیاں چھاپی ہیں جس کے لئے میں شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ چھاپی ہیں، میں نے دیکھا نہیں ہے رسالہ، ہو سکتا ہے یہ بھی مزاح ہی ہو (ہنسی) جتنا اہم یہ جلسہ ہے اس کا اندازہ ان حضرات سے لگایا جا

سکتا ہے جو یہاں تشریف فرما ہیں۔ مجھے اشرف صاحب سے صرف ایک بات پوچھنی ہے، حالاں کہ ان سے کوئی سوال پوچھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ان کی اچھی کہانی میں سے کوئی خراب جملہ نکالنا۔ لیکن پوچھنا اس لئے ضروری ہے کہ ابھی انہوں نے اپنی ناول کی تھیم کے بارے میں جو ہمیں بتایا تو فوراً ذہن میں ہمارے مشہور کہانی 'آنگن واڑی کے گدھ' علی امام نقوی کی آئی۔ تو مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ ان کے ناول کا تھیم اُس کہانی سے کس طرح مختلف ہے۔ شکریہ۔

سید محمد اشرف: انجم عثمانی صاحب نے حسبِ معمول ایسی باتیں کیں جن سے دل خوش ہوا اور جانے کتنوں کا دل خوش کرتے رہتے ہیں وہ... اس وقت انہوں نے جو سوال کیا میں اس سے پہلے فرحت احساس صاحب جو میرے بہت عزیز دوست ہیں، اور میں ان کو ہمدمِ دیرینہ اس لئے نہیں کہہ رہا کہ ہمدمِ دیرینہ کہنے میں ایک شخص کو ابلیس ہونا پڑتا ہے (قہقہے) لیکن وہ ہیں میرے وہی۔ پیغام نے بھی بڑی اچھی بات کہی۔ اور یہ دونوں باتیں جو ہیں وہ تھیوری کے لحاظ سے بہت اچھی ہیں عمدہ ہیں اور قابلِ سماعت بھی ہیں اور قابلِ عمل بھی ہیں۔ سیماب اکبر آبادی کا پوتا، افتخار امام صدیقی، جو رسالہ شاعر نکالتے ہیں جو غالباً نصف صدی سے زیادہ عرصے سے نکل رہا ہے...

خلیق انجم: پچھتّر سال سے...

سید محمد اشرف: نکل رہا ہے۔ مختصر سا ایک رسالہ ہوتا ہے اپنے صفحات کے اعتبار سے۔ لیکن بڑا بسیط ہوتا ہے اور بہت اس کے اندر متن ہوتا ہے اپنی کتابت کے اعتبار سے۔ اور شائد ہی اس میں کبھی کوئی کھانچہ پڑا ہو یا اس کے کچھ شمارے نہ نکل سکے ہوں۔ بڑی پابندی کے ساتھ مستقلاً نکل رہا ہے۔ اس کا مدیر بمبئی میں اس علاقے میں رہتا ہے جہاں پر منٹو کی کہانیوں نے جنم لیا تھا۔ اور تیسری منزل پر ایک 9 بائی 10 کے کمرے میں رہتا ہے۔ اور 7 بائی 8 کے کمرے میں اس کی بوڑھی والدہ رہتی ہیں۔ اور ان دو کمروں سے اگر وہ نکلیں تو سیدھے گھر کے باہر آ جائیں۔ صرف اتنی جگہ ہے۔ ان کے گھر پہ جایئے تو آپ کو کتابوں کا ایک بہت زبردست انبار ملے گا شاعر کے رسالوں کا ایک طرف جمگھٹا ملے گا اور اس میں کہیں دبے ہوئے بیمار مدقوق پریشان حال افتخار امام صدیقی ملیں گے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب اس قسم کی فیصلہ نما باتیں کی جائیں اور مشورے دیئے جائیں تو تھوڑی سی تفریق کرنا ضروری ہے کہ کیا یہ رسالہ نکالنے والا کوئی لکھ پتی یا کروڑ پتی ہے جو اپنے پیسوں کے بل بوتے پر کسی اپنے کو یا کسی دوسرے کو شاعر یا ادیب ثابت کرنا چاہتا ہے، یا وہ ایک ایسا ضرورت مند مدیر ہے جس کو اپنے رسالے کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی شخص کے بارے میں اگر کوئی گوشہ چھاپ دیتا ہے، میں نے بھی اس کے کئی گوشے دیکھے مجھے نہیں لگتا کہ اس میں سے کوئی بالکل ہی نا شاعر یا بالکل ہی نا ادیب قسم کا ہو۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں مبالغہ ہو۔ تو مبالغہ فرحت بھائی آج کل کہاں پہ نہیں ہے؟ مبالغہ جو ہے وہ بڑے بڑے ایوانوں سے لے کر یونی ورسٹیوں کی سلیکشن کمیٹیز تک ... ہمارے جی این پانڈے صاحب (جو یہاں بیٹھے ہیں) مشہور و معروف ہندی کے کہانی کار اور ہندی کے شاعر اور جو اردو سے بھی بہت دل چسپی رکھتے ہیں ان کی جتنی بھی کتابیں ہندی میں شائع ہوتی ہیں سب اردو میں بھی آ جاتی ہیں اور یہ ان کا دوسرا اور کم اہم تعارف ہے کہ یہ غازی آباد علاقے کے کمشنر آف انکم ٹیکس بھی ہیں، تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے دفتروں میں بھی مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ اور سرکاری دفاتر میں بھی مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ مدیروں کے دفتروں میں مبالغہ بہت ہوتا ہے اکادمیوں کی میٹنگوں میں مبالغہ بہت ہوتا ہے تو اگر کسی غریب مدیر نے اپنے رسالے کی بقا کی خاطر اور اس کے پس پردہ خود اپنی زندگی کی بقا کی خاطر کسی کم اہم شاعر کا گوشہ نکال دیا تو اس میں ہم لوگوں کو بہت زیادہ ناراض نہیں ہونا چاہئے۔

خلیق انجم: بہت صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔

سید محمد اشرف: میرے خیال میں فرحت تو خود دل کے اتنے نرم اور ایسے آدمی ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے اور جو خود ہمیشہ سے اس پر عمل کرتے آئے ہیں کہ:

خیالِ خاطرِ احباب چاہئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تو وہ خود بھی اپنی رائے پر شائد ایک دفعہ غور کریں گے۔ اچھا جو وہ کہانی کی تھیم کا جہاں تک سوال تھا تو انجم صاحب سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے 'آنگن واڑی کے گدھ' کو بھی پڑھا ہے اور میں نے بانو قدسیہ کے 'راجہ گدھ' کو بھی پڑھا ہے۔ تو آپ بے فکر رہئے، ان دونوں کہانیوں سے مختلف کہانی ہوگی۔

(ہنسی، تالیاں)

فرحت احساس: میرا صرف یہ عرض کرنا تھا کہ آپ کا انتخاب ہے مدیر کی حیثیت سے کہ آپ کسی بھی ادیب یا کسی بھی شاعر کو جس طرح سے بھی چاہیں پیش کریں لیکن اگر آپ کوئی درپردہ کوئی تجارتی مقصد حل کر رہے ہیں تو اس کا اظہار کر دیں مجھے اس سے کوئی نہ دل چسپی ہے نہ اعتراض ہے کہ آپ اس سے کیا حاصل کر رہے ہیں لیکن یہ کہ ان دونوں چیزوں کو ملانا یہ میرے خیال سے اس پر سوچا جانا چاہئے۔ پروفیسر اختر الواسع ہمارے بیچ موجود ہیں اور میں چاہوں گا کہ وہ اس گفتگو میں شریک ہوں۔

پروفیسر اختر الواسع: جنابِ صدر، جتنی باتیں اب تک کی گئیں وہ سب تخلیق کاروں نے کیں... میں سید محمد اشرف کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اردو کا قاری بنیادی اور محوری حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ

قاری کیا رسالہ خرید کے پڑھتا ہے۔ اگر قاری رسالہ خرید کے پڑھنے لگے گا تو میرا خیال ہے کہ کسی بھی افتخار امام صدیقی کو ان تمام چیزوں کی ضرورت نہیں پڑے گی جن کا کہ فرحت احساس کو شکوہ ہے (صدائے تحسین و تالیاں) تو میں ایک قاری کے طور پہ فرحت احساس کو ایک بات کا یقین دلاتا ہوں کہ آپ کتنے ہی اشتہار چھپوا لیں اگر آپ کا فن طاقت ور ہے تو آپ زندہ رہیں گے اگر آپ کی تخلیق کے اندر وہ سحر کی قوت موجود ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے سکتی ہے تو ہی آپ زندہ رہیں گے اس طرح کے گوشے چھپنے سے میرا خیال یہ ہے کہ لوگ جو ہیں گوشۂ گم نامی میں تو رہتے ہیں وہ central stage پہ کبھی نہیں آتے۔ اس لئے ہمیں اپنے رسالہ نکالنے والوں کی مجبوریوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ تخلیق کار ہونا اور جو فرحت نے کہا میرا خیال ہے letter اور spirit میں کوئی اس سے اتفاق نہیں کرتا لیکن بات یہ ہے کہ آدرش میں اور بیوہار میں زندگی کی زمینی سچائیوں میں اور جو ہمارے ideals ہیں ان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ رسالہ نکلا اور اتفاق یہ ہے کہ نصرت ظہیر صاحب جو ہیں ان کی میں ذہانت کا قائل ہو گیا انہیں شائد پہلے سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ گوشوں کے سلسلے میں یہاں یہ ساری بحث چلے گی اس لئے انہوں نے ایسے لوگوں کو گوشے کے لئے منتخب کیا جو کہ اردو زبان و ادب میں پہلے سے اپنی جگہ اتنی مستحکم بنا چکے ہیں کہ اس سے اس رسالے کو واقعی ادب ساز ہونے کا نہیں بلکہ عہد ساز ہونے کا ایک (موقع) ملتا ہے میں اس کے لئے انہیں مبارک باد دیتا ہوں (تحسین)...ایک بات کا افسوس تھا 'نقد و نظر' بند ہوا، اس سے پہلے 'کتاب' بند ہوا اس سے پہلے 'الفاظ' بند ہوا، 'سوغات' بند ہوا، 'سوغات' نے بھی بڑے اچھے گوشے نکالے، اور ہمیں ان لوگوں سے متعارف کرایا جن سے کہ شائد بظاہر ہماری رسائی اور آشنائی کا رشتہ نہیں ہو سکتا تھا محمود ایاز کا بڑا کارنامہ ہے اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ اس کا افسوس تھا یہ سارے رسالے بند ہوئے لیکن کہیں نہ کہیں ایسا لگتا ہے اردو زبان اور اردو کے چاہنے والے جو ہیں وہ بھی ان تمام پے در پے شکستوں کے باوجود ہمت نہیں ہارتے ہیں اور اگر ایک 'شب خون' جو ہے کہیں تاریکیوں میں ڈوبنے لگتا ہے تو وہ ادب ساز بن کے پھر منظر عام پر آجاتے ہیں۔ اب یہ نصرت ظہیر نے تو کوشش کر لی اور نصرت ظہیر نے اپنا فرض پورا کر دیا لیکن یاد رکھئے کہ یہ فرض عین ہے فرض کفایہ سے اس کا معاملہ حل نہیں ہوتا، کیا اردو قاری اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے، یہ (اصل) سوال ہے۔ اگر وہ پورا کرتے ہیں تو 'ادب ساز' ہی زندہ نہیں رہے گا بلکہ میں سمجھتا ہوں ہمارا زبان و ادب کا جو کارواں ہے وہ آگے چلتا رہے گا اور پھر اس کے بعد کسی شب خون اور کسی نقد و نظر کے ساتھ وہ معاملہ نہیں ہوگا جو کہ دیکھنے میں آیا۔ شب خون کے بند ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی پذیرائی نہیں تھی بلکہ وجہ یہ تھی کہ جو اس کے بانی اور مدیر اور اس کے نظریہ ساز ہیں وہ اپنی زندگی کی اس منزل پہ پہونچ چکے ہیں جہاں انہوں نے سوچا کہ انہیں تھوڑا آرام کرنا چاہئے اور نئی نسل کو آگے آنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ رشتہ جہاں سے ختم ہو رہا تھا اس سے ایک نیا رشتہ شروع ہوا ہے۔ اب اردو کا قاری اگر اپنی ذمہ داری پوری کرے گا تو میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں رونے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور کسی مدیر پہ شائد تبرہ پڑھنے کی بھی نوبت نہیں آئے گی۔ میں نصرت ظہیر کو اس کے لئے مبارک باد دیتا ہوں اشرف نے جو اقتباس سنایا وہ بنیادی طور پہ ہمارے عہد کے اس آشوب کا حوالہ اور اشارہ ہے جس سے کہ ہم گزر رہے ہیں۔ اور ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ گدھ زندہ رہیں اور انسان جو ہیں وہ مردار خور بننے سے بچ جائیں۔ بہت بہت شکریہ۔

(تالیاں)

فرحت احساس: ہاں نصرت صاحب آیئے آپ پھر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

نصرت: کتابوں میں اور خاص طور سے ناولوں میں لکھا ہوتا ہے شروع میں کہ اس میں کہی گئی باتوں سے ناشر وغیرہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے اور قانونی ذمہ داری وغیرہ نہیں ہے تو مجھے ایک بات صرف فرحت صاحب کے معاملے میں کہنی ہے کہ فرحت صاحب نے جو کچھ شب خون کے بارے میں کہا اس سے یا جو کچھ شاعر کے بارے میں کہا اس سے ادب ساز کا متفق ہونا قطعی ضروری نہیں ہے (خلیق انجم صاحب کا نمایاں قہقہہ) اور خاص طور سے اس لئے (تو اور) بھی ضروری نہیں ہے کہ ہم نے پہلا شمارہ منسوب کیا ہے شب خون کے نام اور شاعر کے نام۔ بس یہی مجھے کہنا تھا۔

فرحت احساس: تو یہ اچھی خاصی گفتگو ہو گئی...میرے خیال سے کافی پس منظر تیار ہو گیا ہے نارنگ صاحب کے لئے...

پروفیسر نارنگ: صدر محفل ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، خواتین و حضرات۔ احباب۔ میں نے تو سوچا تھا میں مبارک باد کے چند کلمات کہوں گا اور اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔ نصرت ظہیر صاحب جب میرے پاس آئے ابھی آٹھ دس دن پہلے کہ رسالہ چھپ کے تیار ہے اور اس کی رسم اجرا کرنی ہے آپ کو تو ظاہر ہے میں انکار کیسے کر سکتا تھا۔ میں نے ان سے پروگرام نہیں معلوم کیا میں نے ان سے شرکا کے بارے میں معلوم نہیں کیا۔ ابھی ایک دن پہلے رسالہ میرے پاس آیا اور کارڈ بھی۔ رسالے کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بہت خوشی ہوئی سچی بات ہے۔ لیکن جس طرح کا پروگرام اس رسالے کی رسم اجرا پر ترتیب دیا جانا چاہئے تھا، معاف کیجئے میں بالکل صاف بات کروں گا، اور جس طرح سے جس بہت ہی اہم تخلیق کار کا گوشہ شائع کیا گیا اور اس کو پروجیکٹ کیا جانا تھا اس رسم اجرا کے موقع پر فرحت احساس صاحب معاف کیجئے گا مجھے معلوم نہیں پلاننگ کس نے کی، مجھے بہت

کمی کا احساس ہوا۔ اس طرح کے رسالے کو شائع کرنے میں کچھ نہیں تو چھ مہینے تو نصرت ظہیر صاحب نے، کم از کم، ضرور محنت کی ہوگی اور اس کی رسم اجرا کے موقع پر کم سے کم چھ منٹ تو بیٹھ کے سوچا جاتا۔ کہ کون لوگ اظہار خیال کریں گے۔ گفتگو اب تک جو ہوئی بہت با معنی ہے، بہت عمدہ ہے لیکن رسالے میں کیا ہے سوائے ایک یا دو باتوں کے آپ میں سے بیش تر حضرات نے میرا خیال ہے رسالہ نہیں دیکھا۔ زیادہ تر جو لوگ گفتگو میں شریک ہیں انہوں نے بھی رسالہ ابھی پڑھا نہیں ہے۔ اتفاق سے میں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ نکال لیا، کل، اور شروع سے آخر تک رسالے کو دیکھ گیا۔ فرحت احساس صاحب نے شروع میں یہ کہا کہ اس رسالے میں مدیر نے کم سے کم دخل دیا ہے۔ کیا کسی رسالے کی شان یہ ہے کہ مدیر اس میں اپنی مداخلت نہ کرے؟ یعنی ادب کو اگر وہ اپنے رسالے کا نام، بہت با معنی نام ہے۔ ادب ساز۔ اگر وہ ادب سازی کرنا چاہتا ہے، معاصر ادب کی سمت و رفتار کو طے کرنا چاہتا ہے یا کسی طرح کی حوصلہ افزائی نئی نسل کی یا کسی رجحان کی طرف کوئی اشارہ کرنا چاہتا ہے یا با معنی ادب تخلیق کرنے والوں کی معنویت کو اجاگر کرنا چاہتا ہے تو میری دست بستہ درخواست مدیر سے اور مدیر کے رفقا سے جس میں فرحت احساس صاحب کو بھی شریک کرتا ہوں کیوں کہ جب میں نے رسالے کے صفحات دیکھے تو نہ صرف یہ مجھے لگا کہ قدم بہ قدم فرحت احساس صاحب کا ذہن بھی اور اسما کا بھی کہیں نہ کہیں یہ لوگ ان کے رفقائے کار میں شریک ہیں تو یہ اچھی بات ہے۔ (یہاں نارنگ صاحب کو تسامح ہوا۔ فرحت اور اسما صرف اپنی تخلیقات کی شمولیت کی حد تک رفقائے کار رہے۔ اسما نے ایک خوب صورت گوشہ امرتا پریتم پر خود ترتیب دیا، باقی سبھی غلط یا صحیح فیصلے مدیر کے اپنے تھے، اور رہیں گے۔ مدیر) تو پہلے تو آپ کا یہ کہنا کہ اس میں بڑا اہم نے توازن رکھا ہے ٹھیک ہے اچھی بات ہے لیکن جب آپ بڑے رسالوں کا ذکر کرتے ہیں۔ 'شاعر' اب پچھلے دس پندرہ برسوں میں، مجھے اتفاق ہے کہ، زوال کا شکار ہوا ہے۔ مجبوریاں ہیں، کمرشلائز کرنا پڑ رہا ہے لیکن جن بھی بڑے رسالوں کے نام ہمارے ڈین صاحب اختر الواسع صاحب نے لئے ہیں ان سب میں مدیر نے ہمیشہ یہ طے کیا ہے اس کے رسالے کا مزاج کیا ہو۔ وہ کس سمت کی طرف اشارہ کرے گا کیا رجحان سازی کرے گا کیا ذہن سازی کرے گا یہ بے حد ضروری ہے۔ میں نے ان سے یہ سب سوالات نہیں پوچھے تھے کسی موقع پر ضرور پوچھوں گا... یعنی جب ایک کے بعد ایک رسالے جب اردو کے دم توڑ رہے ہیں کسی کا عمر کی وجہ سے یا کسی کا صحت کی وجہ سے اتنا ہی نہیں بلکہ رجحانات بھی اپنے آپ کو خالی کر لیتے ہیں۔ گوپال متل صاحب نے (تحریک) بند کر دیا تھا عمر کے آخری زمانے میں۔ لیکن شب خون تو دس برس پہلے بند ہو چکا تھا۔ وہ با معنی رسالہ اس اعتبار سے نہیں رہا تھا کہ جس ایجنڈے کو لے کر چلے تھے جدیدیت کا جو نظریہ تھا بنیادی طور پر وہ نظریہ ہی اپنے آپ کو ختم کر کے اس کے بعد بے اثر ہو چکا تھا۔ اور نئی بحثوں کو وہ رسالہ اب جنم نہیں دے سکتا تھا۔ بلکہ بہت سی ایسی باتیں، اس تفصیل میں میں نہیں جاؤں گا جس ایجنڈے کو اور جن رجحانات کو اور جن خاص خوبیوں کو اور ادبی امتیازات کو جن پر اصرار کیا گیا بعد میں ان کا رد خود مدیر کی تحریروں میں سامنے آیا۔ تو یہ ساری چیزیں ہوتی ہیں تضادات کی بہر حال اس کو چھوڑیے، لیکن محمود ایاز صاحب کا رسالہ یا شب خون یا بعض دوسرے رسالے یا وزیر آغا کا رسالہ اوراق، ان سب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ مدیر کی اپنی شخصیت اس کا ذہن، صلاح الدین کا ادبی دنیا یاد آتا ہے، اس کا critical discourse۔ فقط توازن قائم کرنے سے بات نہیں بنتی۔ ایک کے بعد ایک پاکستان میں بھی ادھر اچھے رسالوں نے دم توڑا ہے۔ فنون میں کوئی جان نہیں رہی۔ اوراق بند ہو گیا ہے۔ نقوش مدت ہوئی بند ہو چکا۔ کوئی اچھا کوئی بڑا رسالہ اب سرحد پار سے بھی نہیں آتا۔ ہمارے ہاں تو پھر بھی بہتر رسالے نکل رہے ہیں۔ اُن کے ماؤنو کو آپ سامنے رکھیں ہمارے آج کل کو سامنے رکھیں کتاب نما کو دیکھیں بعض دوسرے رسالوں کو دیکھیں۔ پھر بھی بہت سے پاکستان کے ادیب اس برے وقت میں بھی شاعر میں چھپنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ قمر رئیس صاحب نے نیا رسالہ نکالا ہے۔ تو سب سے پہلا سوال ہم نصرت ظہیر صاحب سے یہ سمجھنا چاہیں گے بعد ہی میں سہی سمجھائیں کہ رسالہ نکالنے کی وجہ کیا ہے۔ جب کہ ان حالات میں رسالہ نکالنا ناکوں چنے چبانا ہے۔ ایک تو یہ کہ اردو کا قاری کوئی کتاب نہیں خریدتا کوئی رسالہ نہیں خریدتا اس میں آپ رسالہ کیسے چلا پائیں گے۔ آپ کے فائننس کیا ہیں۔ اور آپ کے مقاصد کیا ہیں۔ جب کہ کتاب نما موجود ہے شاعر موجود ہے آج کل موجود ہے کچھ اور رسالے موجود ہیں۔ آپ کیا تخصیص قائم کر رہے ہیں اپنے رسالے کے لئے۔ وہ کیا خاص خلا ہے یا خالی جگہ ہے اردو کے ادبی رسائل اور جرائد میں جس کو آپ پُر کرنا چاہتے ہیں جس کے لئے آپ نے عزم باندھا ہے ایسی کوئی نہ کوئی وجوہ ضرور ہوں گی ایسی کوئی نہ کوئی ذہنی اور جذباتی تحریک ضرور ہوگی جس کو ابھی تک مدیر نے اس رسالے میں بھی (بیان نہیں کیا) مدیر کی طرف سے بھی کوئی ایسا ڈکلیریشن یا بڑا اداریہ نہیں ہے جس سے کہ رسالے کی ادبی پالیسی کا کوئی تعین ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت تک جو رسالہ جس طرح سے پیش ہوا ہے اس میں خاص بات یہ ہے، محمود ایاز نے ایک کام شروع کیا تھا، کیوں کہ ادھر، سرحد کے دونوں طرف، میں تو ابھی مارچ میں پاکستان گیا، میں نے اپنے احباب سے یہ بات پوچھی، اور بار بار پوچھی، کہ بھئی ہمارے ہاں تو اردو مشکلات سے دوچار ہے، اردو کی حق تلفی اور اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کا (مسئلہ ہے) باوجود اس

کے کہ تمہارے پاس جو یونی ورسٹیاں ہیں اس سے زیادہ میرے ہاں کی یونی ورسٹیوں میں اردو کی تعلیم کے شعبے ہیں، ایم اے بی ایڈ، پھر کوئی زبان ایم اے بی ایڈ اور ڈاکٹریٹ سے زندہ نہیں رہتی، زبان زندہ رہتی ہے بولنے والوں سے، لکھنے والوں سے، اور تخلیق کرنے والوں سے، تو تمہارے یہاں زوال کے کیوں آثار ہیں؟ تمہارے یہاں تو قومی زبان ہے تم لوگ تو دعویٰ کرتے ہو کہ قومی زبان ہے اردو، حقیقت یہ ہے کہ افسانے میں شاعری میں نئے نام کم سے کم تیس برس سے کم عمر کے نئے نام، آپ بنگالی میں جائیے دیکھئے، آپ ملیالم میں دیکھئے، آپ کنڑ میں دیکھئے، کس طرح نوجوان نسل کے لوگ شریک ہوتے ہیں، ادبی جلسوں میں، دوسری ہندوستان کی زندہ زبانوں میں دیکھئے، اس ہال میں بھی آپ دیکھیں گے کہ آپ کو تیس برس سے کم عمر کے لوگ آپ انگلیوں پر گن سکتے ہیں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو ادھیڑ عمر کے ہیں یا ادھیڑ عمر سے بھی آگے کے ہیں تجاوز کر چکے ہیں۔ ان حالات میں ایک نئے رسالے کی جگہ بنانا اور یہ دیکھنا کہ ہمارا ادب کہاں جا رہا ہے، بے شک ہندوستان میں جڑیں اب بھی ہری ہیں اُس کی وجہ اردو والوں کا اپنا عزم ہے۔ محمود ایاز نے یہ کیا تھا کہ چوں کہ تخلیق کی کساد بازاری کے زمانے میں انہوں نے بعض ادبی شخصیتوں کے گوشے پوری تیاری کے ساتھ شائع کئے۔ نصرت ظہیر صاحب نے بھی خاصی محنت کی ہے، اس میں شک نہیں، دونوں گوشے اچھے ہیں، انہوں نے پچھلے ادب کو بلکہ ادب عالیہ کو اردو کے، ادھر بیسویں صدی کا (ادب) recycle کرنا شروع کیا تھا، جس پر ہمارے بعض دوستوں نے اعتراض بھی کیا کہ بھئی آپ نئی چیزیں چھاپئے، ہم رسالہ خریدتے ہیں نئی تخلیقات کو پڑھنے کے لئے، نئی بحثوں کو پڑھنے کے لئے۔ محمود ایاز نے وہ تناظر بھی ذہنی فراہم کیا نئی بحثوں کو آگے بڑھانے کے لئے، نئی چیزیں بھی چھاپیں، نئے لوگوں کو بھی چھاپا، اور پرانے ادب کو recycle بھی کیا۔ ان دونوں گوشوں میں تین چوتھائی پرانا ادب recycle ہوا ہے۔ میں پڑھنا چاہتا تھا، جب میں نے ان کا (سید محمد اشرف کا) گوشہ نکالا، میں جاننا چاہتا تھا وہ کون لوگ ہیں، یعنی critical discourse کے اعتبار سے جنہوں نے سید محمد اشرف پر نئے مضامین لکھے ہیں۔ مجھے ایک بھی مضمون ایسا نہیں ملا۔ پرانے شائع شدہ مضامین مجتمع کر کے رکھ دئے گئے۔ جب بھی آپ کسی کا گوشہ نکالیں گے، کسی شاعر کا، نظم لکھنے والے کا، کہانی لکھنے والے کا تو ظاہر ہے اس میں اس کی کچھ بہترین چیزیں تو آپ اس میں شامل کریں گے، وہ recycle ہوں گی، تو ان کی تین کہانیاں ایسی ہیں، مجھے خوشی ہوئی اور وہ حصہ انہوں نے پڑھا کہ نیا ناول جو اس وقت لکھ رہے ہیں اس کے چار صفحے بھی اس گوشے میں تھے۔ اچھا ہوتا کہ کچھ اور مضامین بھی ان کے فن کے حوالے سے نئے لکھوائے جاتے، اور ادھر جو کہانیاں آئی ہیں پچھلے پانچ سات برسوں میں ان پر بھی نظر ڈالی جاتی۔ حمایت علی شاعر کا گوشہ اس سے بھی زیادہ recycled ہے۔ ہمارے لئے کم recycled ہے، اس لئے کہ ہندوستان میں پاکستان کی ہر چیز نہیں پہونچتی، اس کے لکھنے والوں میں قمر رئیس کا مضمون نیا ہے، ادا جعفری کا پرانا ہے، فیض احمد فیض کا اقتباس ہے، مرزا ادیب کا بہت ہی بوسیدہ اور بہت ہی پرانا اقتباس ہے، رئیس امروہوی صاحب کا، اس کے علاوہ ان کی غزلیں نظمیں ہیں پرانی، پرانی ثلاثیاں ہیں، ہدیہ جگن ناتھ آزاد ہے، اب اس کی کیا ضرورت تھی، زخمی کانپوری etcetra etcetra۔ بہر حال یہ سلسلہ چلے گا ادب ساز میں اور گوشوں پر خصوصی توجہ کرنا چاہئے۔ مجھے خوشی ہے کہ فرحت احساس صاحب نے اس کا ذکر کیا اور ہمیں ڈاکٹر سید عابد حسین کی اور مجیب صاحب کی یاد دلائی۔ کہ یہ وہ لوگ تھے کہ اردو زبان جن کے طرز اظہار کی شرط تھی۔ میں عابد صاحب کو bilingual سمجھتا ہوں، وہ انگریزی اتنی صاف... اور عابد صاحب تو ان شخصیتوں میں ہیں جن کو میں اپنا ذہنی گرو مانتا ہوں، اور لوگوں کو معلوم ہے میرا ان سے جو ذہنی ربط ضبط رہا ہے، اور کتنا میں ان سے متاثر رہا ہوں۔ وہ انگریزی اتنی سہولت سے لکھ سکتے تھے جتنی سہولت سے وہ اردو لکھتے تھے۔ کبھی کسی کو وہ کچھ لکھ رہے ہوتے یا خط لکھ رہے ہوتے یا کبھی میں کسی رسالے کے لئے، سب سے پہلے میں ان کے پاس پہونچا تھا سن 53-1952 میں، یاد ش بخیر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے وہ رقعہ دے کر مجھے بھیجا تھا، کہ دلّی کالج، مرحوم دلّی کالج نمبر، خاص، جب نکلا تھا اس کے لئے پیغام لینے گیا تھا۔ تو وہ لکھتے تھے اور ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ مجھے کہنے لگے کہ کیا دیکھتے ہیں آپ میری طرف، نہ صرف میری زبان میں لکنت ہے میرے ہاتھ میں بھی لکنت ہے۔ اس کے باوجود وہ شخص ایسی خوب صورت علمی اور فلسفیانہ نثر لکھنے پر قادر تھا۔ بعد میں بہت کھل کے گفتگوئیں ہوتی تھیں، جب ان کی کتاب جس پر ڈاکٹر رادھا کرشنن کا دیباچہ ہے، انڈین کلچر والی کتاب جو اُن کی ہے، بعد میں جب جرمنی گئے اور راک فیلر پر پھر آ کے abridge کیا اس کو، کہتے تھے کہ انگریزی میں لکھ تو سکتا ہوں لیکن وہ روانی اور وہ سہولت نصیب نہیں ہوتی جو اپنی زبان کے محاورے میں ہے۔ تو وہ ہمیشہ پہلے اردو میں لکھتے تھے اور پھر اسی اردو کو سامنے رکھ کے جوں کا توں اس کی انگریزی کر لیتے تھے، یہ کام نا ممکنات میں سے ہے کہ آپ اگر انگریزی اور اردو یا اردو اور ہندی یا کوئی دو زبان اس میں، اگر اس پے قادر ہیں اور مصنف خود لکھنے بیٹھے گا آپ اپنے بعض جملوں کو، جیسے پریم چند کی بعض کہانیوں میں ہے، جہاں جہاں انہوں نے خود قلم لگایا ہوگا، کافی، جو تخلیق کار ہے خود بدل دیتا ہے، لیکن عابد صاحب کے ہاں ایسا نظم و ضبط ہے۔ مجیب صاحب کے ہاں ذرا اس سے معاملہ مختلف تھا، اس لحاظ سے کہ وہ بھی bilingual تھے مگر Indian Muslims

جوائن کی magnum opus ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اس کا ایک لفظ بھی
پہلے انہوں میں اردو میں لکھا ہو۔ وہ انگریزی میں بھی، اصلاً انگریزی میں بھی
لکھتے تھے، اصلاً اردو میں (بھی) جب جی چاہا اردو میں لکھا، جب جی چاہا
انگریزی میں لکھا۔ وہ تھے، سیدین صاحب تھے، ذاکر صاحب تھے، رشید احمد
صدیقی تھے، پھر بعد میں آل احمد سرور تھے، احتشام صاحب تھے، یہ وہ لوگ
تھے جنہوں نے تخلیق کاروں کے پورے قافلے کے ساتھ، ایک critical
discourse پیدا کیا۔ میں گزارش کروں گا نصرت ظہیر صاحب سے کہ اس
پر ضرور توجہ کریں۔ انہوں نے ایک خط ایسا چھاپا، جس میں تقریباً critical
discourse کو ایک ذلیل چیز سمجھ کے رد کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک
عام رویہ ہو گیا ہے جس نے دو مصرعے جوڑ لئے، جس نے معمولی ایک
تیسرے درجے کی نظم لکھ لی یا ایسی کوئی اس طرح کی کہانیاں جیسی، یعنی
چیستان یا صنعتِ اہمال میں، سہلِ ممتنع کہانیاں لکھی جاتی تھیں صنعتِ اہمال
میں، وہ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ critical discourse ایک فضول چیز
ہے۔ دوستو critical discourse، social discourse کا حصہ
ہے۔ critical discourse، philosophical discourse کا
حصہ ہے۔ اگر میں آپ کو سمجھا سکوں اس نسل کے بعد، سرور صاحب کے اٹھ
جانے کے بعد، اردو کا critical discourse کہاں ہے... تنقید میں وہ
عناصر ہی غائب کر دئے گئے تیس برس سے، کہ ادب کا کوئی تعلق کسی طرح
کے سماجی مسئلے سے کسی طرح کے اقلیت کے مسائل سے، دوسرے مسائل
سے (نہیں رہا)، کہا کہ اس بنا پر ادب کی تفہیم اور ادب کی تعینِ قدر ہوگی ہی
نہیں۔ جب تعینِ قدر نہیں ہوگی تو ہم کس لئے اس میں سر ماریں گے؟ نتیجہ
یہ ہوا کہ لوگ چڑنے لگے۔ اس سے نفرت کرنے لگ گئے۔ جہاں ادب کا
قافلہ ادب کی رونق ادب کی گرمیِ بازار اور ہما ہمی، تخلیق سے ہے، یہ ایک
dialectical رشتہ ہے۔ تخلیق کار مہمیز ہوتا ہے، اپنے عہد کے critical
discourse سے۔ اور اپنے عہد کا critical discourse بنتا ہے ادب
کی رفتار سے، یہ لوگ کیا دے رہے ہیں، اور سماج کے مسائل کیا ہیں ان سب
کی آگہی سے۔ جو social discourse ہے اور critical
discourse ہے وہ آگہی کا discourse ہے۔ وہ فکر کا discourse ہے
وہ فلسفے کا discourse ہے۔ اور تخلیق کار جو کچھ خلق کرتا ہے وہ اس کی اپنی
ذات کا موضوعی ردِ عمل ہے۔ جذباتی اور تخیلی۔ گویا جہاں جذباتی دائرے کو
مکمل ہونا چاہئے، جہاں تخیلی دائرے کو مکمل ہونا چاہئے، وہاں اگر فکری دائرہ
سکڑتا ہوا چلا گیا، تو پھر وہ دن دور نہیں جب اردو بہت ہی غریب زبان ہو
جائے گی۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں۔ لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ مجھے یقین
ہے کہ ادب ساز اس راہ میں بھی قدم بڑھائے گا اور critical اور social
discourse پر نظر رکھے گا۔ ایک چھوٹے سے گوشے کا ذکر میں ضرور کرنا
چاہوں گا وہ یہ کہ اسما سلیم صاحبہ نے امرتا پریتم پر شروع کے صفحات میں ایک
بہت خوب صورت اور چھوٹا سا گوشہ مرتب کیا ہے۔ افسوس یہ ہے، میں نے
ہلکا سا ایک اشارہ کیا تھا، پوری فہرست، پہلے صفحے کی ایک فہرست... کبھی جب
ہم صفحات دوسری چیزوں کو دے سکتے ہیں تو فہرست کو فہرست ہونا چاہئے۔
مثال کے طور پر، جب میں پڑھ رہا ہوں کہ تہذیبی مکالمہ ہے، اور آج جو
civilisational conflict دنیا میں ہے اور ایک بہت بڑی بحث ہے،
تہذیبوں کے تصادم اور ٹکراؤ کی تو مجھے معلوم ہونا چاہئے کس کس کے مضامین
ہیں اس میں۔ صرف عنوان ہیں، امرتا پریتم صرف عنوان ہے۔ مجھے نہیں
معلوم کہ اس میں اسما سلیم نے بھی لکھا ہے۔ یا اس میں امروز کا بھی آرٹیکل
ہے۔ مجھے سارے یعنی ان کے (سید محمد اشرف کے) گوشے میں صرف وہ
مضمون دیکھنا چاہتا تھا کہ نیا نام کون سا ہے۔ لیکن اس نئے نام کو ڈھونڈنے
کے لئے مجھے پچاس صفحے پڑھنے پڑے (نصرت: یہی [illegible] بھی تو ہم چاہتے
تھے) بہر حال امرتا پریتم کا گوشہ مجھے بے حد پسند آیا اس کی پیش کش بھی بہت
اچھی ہے، اس کے علاوہ انتظار حسین صاحب کا ایک بہت دل چسپ مضمون
ہے جو انہوں نے سجاد ظہیر پر ساہتیہ اکادمی کے سیمینار میں پڑھا تھا، نصرت
ظہیر صاحب نے اسی وقت اچک لیا تھا، اس کا مطلب ہے مہینوں سے یہ
تیاری کر رہے تھے... ایک اور چھوٹا سا بالکل چند صفحوں کا گوشہ ہے ان دو
بڑے گوشوں کے علاوہ، یہ باتیں میں اس لئے کر رہا ہوں کہ رسالے کا
تعارف ہی نہیں ہوا ابھی تک، اس کے مندرجات کا آپ کو علم ہی نہیں، وہ
گوشہ ہے نشتر خانقاہی پر۔ جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے... میں
تفصیل نہیں جاؤں گا، اردو کا ایک بہت ہی البیلا اور بہت ہی اچھا شاعر، کچھ
مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے، کچھ اپنی بے نیازی کی وجہ سے،
کچھ critical discourse کی کمی کی وجہ سے، اب میں کہنا چاہتا ہوں،
اُس کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ وہ شخص تقریباً unsung رہا
زندگی میں، باوجود نہایت عمدہ شاعر ہونے کے، اور unsung مر گیا۔ میں
آپ کو مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ کم سے کم آپ نے اس کا حق ادا کیا، اس کو
خراجِ عقیدت بھی پیش کیا اور سارے باب غزل کو نصرت ظہیر صاحب نے
نشتر خانقاہی کے نام سے منسوب کیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ
باب افسانہ کو انہوں نے بشریٰ رحمان کے نام سے منسوب کیوں کیا ہے۔ کیا
آپ میں سے معلوم ہے کسی کو؟ رسالہ ہی نہیں دیکھا آپ نے تو معلوم کہاں
ہوگا؟ بشریٰ رحمان سے ایسا کیا رشتہ ہے (ہنسی) کہ آپ پورے باب افسانہ کو
جب یہ (سید محمد اشرف) موجود تھے، جب ہمارے پیغام آفاقی موجود ہیں،
جب کچھ دوسرے لوگ موجود ہیں، بہر حال کوئی تو وجہ ہوگی۔ بات کو مختصر کرتا

ہوں۔ باب نظم کو محمود شام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان کی ایک نظم بھی ہے۔ لیکن وہ شاعر (کے طور پر مشہور) نہیں ہیں۔ وہ تو صحافی ہیں آپ کو معلوم ہے۔ اور آپ نے ان کی صحافت کو خراج تحسین پیش کیا ہے، جو اچھا ہے، لیکن باب نظم کا انتساب کسی بڑے شاعر کے (نام ہونا چاہئے تھا) میں بالکل بے تکلف عرض کر رہا ہوں... بہر حال ایک اور خوبی ہے کہ ایک سوانحی ناول کا ایک حصہ بھی ہے، رضیہ فصیح احمد کا۔ آپ بیتی افتخار گیلانی (کی) hats off to Iftikhar Gilani اور hats off to Penguin کہ پینگوئن نے پہلی... آپ کو معلوم ہے کہ اب پینگوئن... ہم سمجھتے ہیں اردو میں قاری نہیں ملتا ... پینگوئن اب ہندوستانی زبانوں میں آ رہا ہے۔ جو انگریزی کا (اشاعتی) ادارہ ہے۔ انہوں نے ہندی کی دو تین کتابیں چھاپی ہیں، بہت اچھا ان کا رسم اجرا کا جلسہ کیا، ایسا نہیں جیسا ہم کر رہے ہیں، اور (انہوں نے) پہلی اردو کتاب افتخار گیلانی کی آپ بیتی چھاپی ہے اردو میں، یعنی انگریزی میں تو چھاپی ہی ہے، اس کا عنوان ہے 'جیل کے شب و روز' بہت سے اردو والوں نے جب کتاب ہی کوئی نہیں خریدتا، پینگوئن کی کتاب مفت تو ملے گی نہیں کسی کو، خدا کا شکر ہے کہ نصرت ظہیر صاحب نے اس کا بہت اچھا تعارف کرایا ہے۔ طنز و مزاح ان کا خاص میدان ہے، آخری بات یہی کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں علاوہ دو تین نثر کی تحریروں کے دو نظمیں مجھے بے حد پسند آئیں، لیکن آخری حصہ پاکستان میں تھیٹر، مدیحہ گوہر، ہندوستانی سنیما، اور اس کے دس انقلابی سال، ہالی وڈ کو کس طرح سے اس وقت ہندوستانی سنیما نے شکست دی ہے اس کا احوال، ان کے کالم میں پڑھئے، اس کے علاوہ زوبن مہتہ، ہندوستان کی مصوری اور گاؤں، اور کتابوں پر تبصرے آخر میں شامل ہیں جس میں خلیق انجم صاحب کے قلم سے ایک بہت اچھا تبصرہ ہے، غالب کا سفر، ان کی کتاب پر جامع تبصرہ ہے، کشف الالفاظ جو غالب کا غیر متداول کلام ہے اس کی ڈائریکٹری اور اس کی key ہے اس کے علاوہ کلام احمد فراز (مرتبہ) فاروق ارگلی یہ سب ایسی چیزیں ہیں۔ میں جس چیز پر اپنی خاص خوشی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ وہ چیز بھی recycle ہوئی ہے اور مبارک باد دیتے ہوئے، ایک تو یہ نظم ضرور پڑھئے گا... اب وقت نہیں ہے ورنہ میں اس کے کچھ مصرعے ضرور سناتا... غالب خدا کے حضور میں... کہ کس طرح وہ پہونچ جاتے ہیں شراب کا اَدّھا ہاتھ میں لئے ہوئے، اور منکر نکیر ان کے پیچھے پیچھے، اور خدا کے حضور میں جب ان کو پیش کیا جاتا ہے تو حسب معمول مرزا فرماتے ہیں کہ... انہوں نے کہا کہ یہ بہشت میں شراب کہاں سے آ گئی، تو وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں، میرے کچھ شاگردوں کی شرارت تھی، دو اَدّھے (قبر میں) رکھ گئے تھے، ایک منکر نکیر نے چرا لیا ایک میرے حصے میں آ گیا (قہقہے)!... ایک مثنوی جس کے کچھ اشعار ضرب المثل ہو چکے ہیں،

مطلب ہے نصرت ظہیر صاحب نے کچھ اپنا حاصلِ مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اور یہ نظم ہے راجہ مہدی علی خاں کی، مثنوی قہر البیان، افسوس اس کے جتنے شعر میں نے نشان زد کئے ہیں وہ سب نہیں پڑھ سکتا، لیکن کچھ مزے کے شعر (پڑھتا ہوں) جب تکرار ہوتی ہے میاں بیوی میں، تو وہ کہتی ہے:

کیا ہے جعفری نے تجھ کو برباد
جو آ کر دے گیا جھوٹی تجھے داد

اس میں کیریکٹر بھی لوگوں کے جھلکتے ہیں (یہ) مزے کی بات ہے (ان) اشعار میں:

مرے وہ اشترا کی احمد عباس
وہ کر دے گا ترا بھی ستیا ناس
کبھی ہوتا ہے یہ محسوس مجھ کو
بھگا لے جائے گا وہ روس تجھ کو
ندیم قاسمی سو بار آیا
کبھی اس نے بہن مجھ کو بنایا؟

ہمیں معلوم ہی ہے کیا مشہور ہے ان کے بارے میں:

تم آخر کس نشے میں ہو گئے غین
صدا ذکرِ کتاب قراۃ العین
اسے میں آگ کے دریا میں پھینکوں
ستی ہوتے ہوئے میں اس کو دیکھوں

وغیرہ وغیرہ۔ اور اب مزے کا شعر باقر مہدی کے بارے میں جو بہت ہی مشہور ہو گیا ہے:

میں تنگ آئی تری بدعہدیوں سے
یہ آئے دن کی باقر مہدیوں سے
(قہقہے)

اور اس شعر کے دوسرے مصرعے کی داد دیجئے کہ کیسا ٹکڑا لگایا ہے۔ بہت ہی genuine شاعر تھا مزاح کا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے سید محمد اشرف صاحب یو پی کے قصبات کے کلچر کے، علاوہ دوسری خوبیوں کے اور ان امتیازات کے جن کا ذکر آپ کرتے رہتے ہیں اور جو identity ہے خاص، نارتھ انڈین اور متوسط طبقے کے قصباتی یو پی کے مسلمان کی اور اس کلچر کی، اس کا پروجیکشن جس طرح سے سید محمد اشرف کے ہاں ہو رہا ہے، ان کی تحریروں میں مزاح کی پُٹ میں نے بہت کم دیکھی، آج پہلی بار ایسا بھرپور مزاح اور اس کے under current شروع سے لے کر آخر تک... اگر اس کو انہوں نے نبھایا ہے... irony تو ہے ان کے یہاں... ہر جگہ irony ہے، رگ رگ میں بھی irony ہے، اس کو بھی کسی نے ثابت نہیں کیا ابھی تک،

کھنگالا نہیں، لیکن اس میں... مزاح سے یاد آیا مجھے کہ یہ دیکھنے کے لئے بھی کہ characterisation کی constructionمیں، تشکیل میں مزاح کہاں شامل ہے، اور اس کی deconstructionمیں بھی مزاح کہاں شامل ہے، اور کس طرح، چاہے وہ سائیں ہے، چاہے وہ چلم پینے والے ہیں، چاہے وہ دونوں کردار ہیں، چاہے وہ کفاروں کے لئے تعویذ باندھنے والے جو کچھ کرنے والے، سب میں under currentایک طرح کی irony کی، اور ایک طرح کی بہت ہی چھپے ہوئے subtleمزاح کی ہے۔ وہ subtle مزاح ذرا یہاں دیکھئے، دو ایک اور مصرعے پڑھتا ہوں:

جلا دے پھاڑ دے دیوانِ فانی
مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی
(قہقہے)

ایک دو اور۔ شاہد احمد دہلوی:

نہیں یہ شاہد احمد مجھ کو بھاتا
جو سید ہو موا ٹھمری ہے گاتا
(قہقہے)
جو ہوتی کچھ شرافت اس میں باقی
رسالے کا نہ رکھتا نام ساقی
(ہنسی اور واہ واہ)

ادب ساز خدا کرے کہ ادب سازی کرے، مجھے خوشی ہوگی نصرت ظہیر صاحب، رسالہ نکالنا سخت مشکل کام ہے، اور اس دور میں اور ہندوستان میں، اب آپ نے عزم باندھا ہے، تو اب آپ کو نبھانا بھی ہوگا۔ آپ نے دو خریدار پیدا کئے...

خلیق انجم: یہی بہت ہے۔ (ہنسی)

ڈاکٹر نارنگ: مجھے خوشی ہوئی ان کو (ارون کول اور حاجی فیاض کو) رسمِ اجرا کے بعد رسالہ پیش کرنے میں۔ خدا کے واسطے میری یہ درخواست ہے، ان دو کے بعد تیسرا خریدار میں بننے کو تیار ہوں، اگر آپ قبول کریں (تالیاں) اگر رسالہ چلانا ہے، بامعنی رسالہ چلانا ہے، ان تمام خطرات سے بچنا ہے، جن کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے کیوں کہ حالات بہت خراب ہیں، کم سے کم اگلے چھ مہینوں میں، آپ 100 اپنے خریداروں کو enrole کیجئے، اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو پھر کسی یا تو تیز شخص کو پکڑیئے، یا کہیں کسی کے خزانے میں سیندھ لگایئے (ہنسی) یا وہ کیجئے جو آج کل لوگ کرتے ہیں، اسپانسر شپ، یعنی کمرشلائزیشن کا وہ رخ جو محض ایک چھوٹا سا پردہ یا ایک چھوٹا سا اشتہار دینے سے لاکھوں روپے وصول کر لے، اور اپنے اردو ادب کے لئے تو سب کچھ کرنا جائز ہے، لیکن قدروں پر اور اصولوں پر کبھی، خدا کے واسطے سمجھوتہ نہ کیجئے گا اور مجھے یقین ہے آپ کریں گے بھی نہیں۔ بہت بہت شکریہ اور میری طرف سے مبارک باد۔

(پرزور تالیاں)

فرحت احساس: شکریہ نارنگ صاحب۔ میں گزارش کروں گا ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے کہ وہ اپنے صدارتی کلمات سے نوازیں۔

خلیق انجم: (دبے لفظوں میں پوچھتے ہیں "خاتون کوئی ہیں یہاں؟ ہاں ایک ہیں" صرف ایک خاتون نظر آنے کے بعد) خاتون اور حضرات۔ (کوئی بتاتا ہے آخر میں ایک خاتون اور بیٹھی ہیں۔ اس پر ہنستے ہوئے) خواتین و حضرات! اتنی اچھی تقریر ہو چکی ہے کہ اس کے بعد نہ مجھے بولنے کی ضرورت ہے نہ حق ہے۔ اصل میں یہ ہے کہ میرا میدان ہے تحقیق۔ آپ جانتے ہیں۔ اس میں آپ جو چاہیں کہہ لیجئے کوئی کچھ جانتا تو ہے نہیں جو چاہے کہے چلے جاؤ۔ یہاں سب کو سب معلوم ہے اس لئے کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج کے اس جلسے میں میں بہت ہی جھجک رہا تھا آتے ہوئے۔ آپ پوچھئے ان سے۔ کیوں کہ میں سوچ رہا تھا تخلیق کا معاملہ ہے پتہ نہیں کیا بات منھ سے نکل جائے، کیا نہ ہو۔ لیکن یہاں آ کے مجھے پتہ لگا کہ نہیں میں بول بال سکتا ہوں آپ لوگوں کے بیچ میں رہ کر۔ بات کر سکتا ہوں۔ نصرت صاحب یہاں جو باتیں آپ کے بارے میں کہی گئی ہیں یہ کسی بدنیتی سے نہیں کہی گئیں۔ یہ آپ کے رسالے کو بہتر بنانے کے لئے، نارنگ صاحب نے جو کچھ کہا، اختر الواسع صاحب نے جو کچھ کہا، پیغام صاحب نے، یہ اصل میں وہ جذبہ ہے ہم لوگوں کا اردو والوں کا کہ ایک اچھا میگزین نکلے۔ اور وہی چاہتے ہیں ہم کہ جو کچھ آپ کے جلسے میں جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں وہ آئندہ نہ رہیں اور ہم سب یہ چاہتے ہیں کہیں یہ آپ کا اتنا اچھا رسالہ کوتاہیوں کا شکار نہ ہو جائے۔ اور پھر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہم چاہتے ہیں آپ وہ کوتاہیاں دور کریں تاکہ یہ رسالہ آپ کا جاری رہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ آپ نے اتنی باتیں سن لیں اور آپ میں یہ ہمت اور طاقت اور حوصلہ ہے کہ آپ ایسی باتیں... میں دیکھ رہا تھا جب آپ پر ذرا سا اعتراض ہو رہا تھا تو آپ مسکرا رہے تھے، تو جو مسکرا سکتا ہے اپنی تنقید پر تو اس میں جان ہوتی ہے حوصلہ ہوتا ہے وہ کام کر سکتا ہے۔ یہاں بہت ساری باتیں کہی گئیں ایک یہ کہ بعض باتیں جو آئیں ایک رسالے کے بارے میں، تو صاحب رسالے کے بارے میں میرا بھی کچھ تجربہ ہے کیوں کہ دو دو رسالے ہم نکالتے ہیں ہماری زبان اور اردو ادب، اور اس وقت ہندستان سے بھی اور پاکستان سے بھی بہت سے ادبی رسالے نکلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ مرنے کی وجہ وہ رسالہ نہیں ہوتی کچھ اور بھی ہوتی ہے۔ کتاب نما کیوں نہیں مر جاتا، ہماری زبان جو اتنی سو سے سال سے چل رہا ہے کیوں نہیں مر جاتا؟ 'اردو ادب' کیوں نہیں مر جاتا۔ وجہ

یہ ہے کہ ان رسالوں نے اپنے آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ بدلا ہے۔ اردو ادب جو تھا ہمارا سو فی صدی تحقیقی رسالہ تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کی ساکھ ختم ہی ہو رہی ہے اور اب وہ بات نہیں رہی تو میں نے ڈاکٹر اسلم پرویز سے درخواست کی کہ بھائی اس کو سنبھالو، اب یہ کہ ہندوستان پاکستان دنیا میں کہیں چلے جایئے ممکن نہیں کہ کوئی ادبی محفل ہو اور اس میں اردو ادب کا ذکر نہ آئے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں۔ اگر آپ اپنے قارئین کا مزاج نہیں سمجھیں گے اگر آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ آپ کا پڑھنے والا کون ہے، آپ کس کو address کر رہے ہیں۔ یہ تو نہیں نا کہ آپ مجھے ایک لائبریری میں بھیج دیجئے۔ میں باہر آؤں گا اور ایک پرچہ ایڈیٹ کر کے لے آؤں گا۔ بھئی دس بارہ غزلیں، جو پتہ ہی نہیں چلے گا آپ کو کہ کب چھپی تھیں نشتر خانقاہی کی اور فلاں کی فلاں کی، دو چار افسانے، ایک آدھ تنقیدی مضمون لیجئے ہو گیا رسالہ۔ لیکن اگر آپ واقعی رسالہ نکالنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں ہوش نہیں ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات ہے کہ آپ کا قاری کون ہے اور آپ چاہتے کیا ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ایڈورڈ سعید پر ہمارے یہاں دو آرٹیکل چھپے، اس رسالے کی اتنی ڈمانڈ ہوئی کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اس کے بعد ہمیں اس کے دو سو پرچے اور چھپوانے پڑے۔ کیوں کہ لوگ بہت مانگ رہے تھے اور ہندوستان کے باہر سے بہت ڈمانڈ آئی۔ شاعر کا ذکر آیا۔ شاعر کے بارے میں آپ (سید محمد اشرف) نے بہت اچھی باتیں کیں کہ شاعر کو آپ اس طرح سے مت دیکھئے کہ وہ ایک چھوٹا سا پتلا سا رسالہ ہے آپ یہ دیکھئے کہ پچھتر سال سے ایک خاندان ایک رسالے کو نکال رہا ہے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔ یہ تو میں اور آپ سوچتے ہیں کہ یہ پرچہ تو معمولی سا ہے۔ کیا میں اور آپ یہ طے کرتے ہیں کہ کون سی چیز اردو میں مقبول ہوگی کون سی نہیں ہوگی یہ میں اور آپ ہوتے کون ہیں طے کرنے والے؟ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ رسالہ پچھتر سال سے نکل رہا ہے تو میں نے کہا کہ اس کو یہ recognition ملنا چاہئے۔ اور یہ انجمن (ترقی اردو) کی طرف سے اگر ملے گی تو اس کی اہمیت بڑھے گی، میں نے انجمن ترقی اردو کے رسالے ہماری زبان کا شاعر کا پچھتر سالہ نمبر شائع کیا۔ یہ اردو میں میرے خیال سے پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی رسالہ اپنے معاصر رسالے کو اس طرح recognize کرے۔ میں نے کیا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے ان سے کوئی لالچ تھا۔ میں آپ سے واقعی کہہ رہا ہوں کئی کئی دفعہ ان کے خط آئے میرے پاس پہلے سے آرہے ہیں کہ اپنے گوشے کے لئے مضامین بھجوا دیجئے یہ کر دیجئے پہلے میں ٹالتا رہا پھر میں نے کہا کہ دیکھئے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے مرنے کے بعد چھپیں یا اور لوگ اپنے آپ چھاپ دیں لیکن یہ اچھا نہیں لگ رہا، آئندہ یہ مجھے لکھئے نہیں، میں کیوں کہ آپ کا نمبر چھاپ رہا ہوں اس لئے لوگ کہیں گے کہ یہ اس کے جواب میں چھاپ رہا ہے۔.. اس کی وجہ سے مجھے معلوم ہوا کہ شاعر پاپولر کتنا ہے صاحب۔ یعنی ہفتے میں دو تین چیک کناڈا سے اور امریکہ سے اور کہیں سے آتے ہیں کہ ہمیں ہماری زبان کا ممبر بنا دیجئے اور شاعر پر جو آپ کا خاص نمبر ہے وہ ضرور بھیجئے۔ کیوں کہ ہم نے اس کے بارے میں سنا ہے۔ اور ہندوستان سے تو خیر ہیں ہی بہت لوگ۔ مطلب یہ کہ شاعر پاپولر تو ہے ہی نا۔ لوگ اس کو پڑھتے ہیں اس کو دیکھتے ہیں اس کا خاص انداز بھی ہے۔ وہ عام آدمیوں کے لئے بھی ہے شعر کا مذاق رکھنے والوں کے لئے بھی ہے افسانوں کا مذاق رکھنے والوں کے لئے بھی، اور میرے لئے یہ ہے کہ اس کے شروع میں ہر شمارے میں، پانچ چھ خطوط شائع کرتے ہیں اور ایک دو تصویر اور (صاحب تصویر کے) سوانح، اور میں وہ سارے کا سارا پڑھتا ہوں اور بڑی احتیاط سے پڑھتا ہوں اسے زیروکس کرا کے اپنے انجمن کے اردو آرکائیوز میں اس کو داخل کرتا ہوں کیوں کہ وہ ہمارے لئے بڑے اہم ڈاکیومنٹس ہیں۔ تو اب دیکھئے وہ کام کر ہی رہے ہیں نا۔ اور چل ہی رہا ہے پرچہ۔ اب ہم ان سے یہ توقع کریں کہ وہ بہت شاندار پرچہ نکالیں گے تو وہ نہیں ہوگا۔ مجھے آپ کا یہ رسالہ پڑھ کر جو سب سے بڑی خوشی ہوئی وہ یہ ہے کہ آپ نے یہ خیال رکھا، پہلے کیا ہوتا تھا سن سینتالیس سے پہلے کے رسالے اٹھایئے، ادب لطیف، اور نیرنگ خیال خاص طور سے، وہ صرف ادب پر زندہ نہیں رہتے تھے۔ ان کے یہاں اس زمانے کی سیاست پر بھی آرٹیکل ہوتے تھے۔ سماجی موضوعات پر بھی آرٹیکل ہوتے تھے۔ تہذیبی موضوعات پر بھی۔ اب ہمارے یہاں تو صرف یہ ہوتا ہے کہ پانچ غزلیں چھ افسانے اور دو تنقیدی مضامین اور ہو گیا رسالہ۔ تو پھر کون پڑھے گا؟ آپ نے جو تہذیبی مکالمے اور تصادم پر، میں نے چاروں مضامین پڑھے صاحب اور بڑے احتیاط سے پڑھے اور مجھے یہ لگا کہ اس وقت دنیا میں جو تصادم ہو رہا ہے، تہذیبی تصادم ہے، مذہبی تصادم ہے، اور سماجی ہے، یہ سارا کا سارا، یہ بہت عرصے سے چلا آرہا ہے اسی تصادم کی وجہ سے ہماری پہلی جنگِ عظیم ہوئی دوسری جنگِ عظیم ہوئی اور تیسری جنگِ عظیم کے ہم دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں مجھے خوشی ہے کہ ان مضامین میں اس تصادم کا جو ہمارے یہاں کرائسس بحران ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب یہ ممکن ہے یہ مضامین recycle کئے گئے ہوں اور آپ نے کہیں اور سے لئے ہوں، میں نے تو کبھی نہیں پڑھے، میری وہاں تک پہونچ ہی نہیں ہے وقت ہی نہیں ہے میں نہیں پڑھ سکا (چاروں مضامین نئے اور غیر مطبوعہ تھے۔ مدیر) لیکن مجھے یہ خوشی ہے کہ ان چاروں مضامین میں نشان دہی کی گئی ہے کہ تہذیبی سماجی مذہبی تصادم سے کیا کیا نتائج نکل سکتے ہیں اور ہم پہلی جنگِ عظیم اور دوسری جنگِ عظیم میں کیا دیکھ چکے ہیں۔ اب گوشوں پر آیئے صاحب۔ میں گوشوں کے

حق میں ہوں۔اگر چہ ہماری زبان میں ہم بھی کبھی پورا شمارہ بھی شائع کرتے ہیں کسی کے اوپر۔ہم اس لئے کرتے ہیں کہ پچاس سال کے بعد آنے والے قاری کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔کہ میں اس کے لئے کیا دے کے جارہا ہوں۔اب آپ نے اشرف صاحب پر حمایت علی شاعر پر گوشہ شائع کیا۔امرتا پریتم پر چھوٹا سا اور نشتر خانقاہی پر۔آپ یقین جانئے کہ پہلے میں نے یہ چاروں گوشے پڑھے تھے۔سب سے پہلے مکالمے پر جو (سیمینار) ہے۔اچھا یہ سارے (اگر) recycled ہیں (تو) ہوں گے۔مجھے تو پتہ ہی نہیں نا۔بھئی میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں سارے رسالے پڑھتا رہوں۔میرے پاس تو آپ نے مجھے اکٹھا کر کے مجھے دے دیا۔تو میں نے پڑھ لیا۔میرے پاس اتنا وقت ہے ہی نہیں،مصروفیات ہی میری اتنی ہیں۔ہم کچھ بھی کہیں اردو والے،آپ یقین جانئے ہمارے دوست ہیں ہندی والے وہ کہتے ہیں کہ ہندی کی حالت بھی اس سے زیادہ اچھی نہیں ہے جو آپ کے یہاں کی حالت ہے۔اب لوگ نہیں پڑھتے۔عادت ہی نہیں پڑھنے کی۔ہمارے ترپاٹھی دوست ہیں وہ بتا رہے تھے کہ بھائی پہلے میری کتاب دو ہزار چھپتی تھی۔اب پبلشر نے ڈھائی سو پانچ سو کر دی ہے۔تو یہ حال ہمارا بھی ہے۔اس لئے کہ قاری ہی نہیں ہیں۔ان حالات میں رہ کر اگر آپ اتنا اچھا میگزین...مثلاً مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ (سید محمد اشرف) کے بارے میں قرۃ العین حیدر نے یہ کہا کہ آپ دکھوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر کہانیاں لکھتے ہیں اور اگر پنچ تنتر دوبارہ لکھی گئی ہمارے زمانے کی تو اس میں آپ کی کہانی ضرور شامل ہوگی۔یہ قول تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ کہاں ہے کیسے نہیں ہے۔

پروفیسر نارنگ: کتاب نہیں دیکھی آپ نے ان کی۔

خلیق انجم: نہیں۔میں نے پہلے ہی کہہ دیا تحقیق میرا موضوع ہے میں نے نہیں دیکھی تھی۔میں یہ کہتا ہوں کہ صاحب یہ گوشے بھی بڑے اہم ہیں۔

سید محمد اشرف: کتاب چھپے ہوئے بھی اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ اب وہ تحقیق ہی کے موضوع میں آچکی ہے...

(ہنسی)

خلیق انجم: (ہنستے ہوئے) میں انشاءاللہ آپ پر تحقیق کروں گا۔خیر دیکھئے۔یہ نمبر دار کا نیلا،اس کے بارے میں مَیں نے جو کچھ quotations پڑھے، اور جو باتیں دیکھیں،یا شمس الرحمن فاروقی کا یہ اسٹیٹمنٹ،اس شخص کا جو آسانی سے کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہتا،کہ صاحب انگریزی میں بھی ان دنوں فکشن میں اتنا اہم ناول نہیں لکھا گیا جیسا آپ نے لکھا ہے۔تو میں یہ سمجھتا ہوں یہ کوٹیشنز ہی پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ناولٹ تو مجھے پڑھنا چاہئے،اگر ادب سازیہ رول ادا کر رہا ہے تو یہ کچھ کم نہیں ہے۔مگر ایک بات ہے کہ یا تو لوگوں نے بہت کچھ کہا آپ کے بارے میں آپ کی تعریفیں بھی کیں آخر میں مجبوراً کہ آپ برا نہ مان جائیں،کہا گیا،(قہقہے) لیکن ایک بات کہوں آپ سے کہ ہمارے ایک دوست ہیں جب ان سے کہو کہ صحت کیسی ہے آپ کی تو کہتے ہیں کل ملا کے ٹھیک ہے۔کل ملا کے کا فقرہ دیکھئے۔میرا خیال ہے کہ کل ملا کے آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔(قہقہے اور تالیاں) اور آپ جو باتیں یہاں کہی گئی ہیں میں پھر کہوں گا کہ آپ یقین جانیں کہ ان لوگوں سے آپ بھی خوب واقف ہیں اور میں بھی،ان کی نیت میں خرابی نہیں۔اختر الواسع یقیناً یہ چاہتے ہیں،نارنگ صاحب یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا رسالہ بہتر بنے اور انشاءاللہ بنے گا۔لیکن...

نصرت: معاف کیجئے آپ اپنی بات جاری رکھئے گا مگر ایک بات یہ کہنی ہے کہ اس میں کچھ مضمون recycle ہوئے ہیں لیکن مجبوریوں کی وجہ سے یہ ہوا ہے،اور اس وجہ سے بھی کہ یہ پہلا شمارہ ہے۔ہم ہوا میں قلعہ کھڑا کر رہے تھے۔دوسری بات آپ ذہن میں رکھئے کہ اس کی ضخامت بہت ہے۔اور ہم یہ چاہتے تھے کہ اس ضخیم مجلّے میں بہت سی چیزیں اکٹھی ایک جگہ مل جائیں۔

خلیق انجم: وہی میں کہہ رہا ہوں۔بہت ساری چیزیں مجھے ایک ساتھ مل گئیں

نصرت: اور پھر جو اسٹوڈنٹ ہے آج اردو ادب کا اس کو بھی کچھ اچھا پڑھوانا ہے۔

خلیق انجم: وہی بات ہے کہ آج کے قاری کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ الگ الگ ڈھونڈتا پھرے۔اگر آپ اس کو اکٹھا کر کے نہیں دیتے۔ بہر حال میں نارنگ صاحب آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا...ایک بات میں اور کہوں گا۔دیکھئے اتنی بڑی ضخامت کے پرچے کو سنبھالنا ذرا مشکل ہے۔اس کی ضخامت کم کیجئے تاکہ مالی اعتبار سے آپ پر اتنا دباؤ نہ پڑ جائے کہ خدانخواستہ خدانہ کرے آپ سوچیں کہ چلئے اس کو ختم کیجئے۔آپ اس کی مدت بڑھا دیجئے۔اور اس (کے وزن) کو کم کیجئے۔دیکھئے مجھے اردو ادب کا تجربہ ہے اس کی اتنی ڈمانڈ کیوں ہے...بہر حال میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں ایک تو آپ کا شکر گزار ہوں کہ تخلیقی رسالے کی تقریب میں مجھے حکم دیا صدارت کے لئے۔نارنگ صاحب نے اتنی اچھی تقریر کی اور (باقی) سب نے،اور اشرف صاحب نے۔میں ان کا بہت ہی عاشق ہوں ان کو اندازہ نہیں ہے۔یہ سمجھتے ہیں میں خالص تحقیق کا (آدمی ہوں)۔کبھی کبھی میں بھی پڑھتا ہوں انہیں۔میں آپ سب حضرات کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔اور آپ کو واقعی مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اتنا اچھا رسالہ نکالا۔

فرحت احساس: شکریہ۔تو اس یقین کے ساتھ کہ آج یہاں موجود جتنے حضرات ہیں کم از کم وہ اس رسالے کے خریدار بننے کی طرف مائل ہوں گے، اور میں آپ تمام حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے آج کی محفل میں شرکت کی،اور اسے بامعنی بنایا۔اب ہم سب آزاد ہیں۔

خلیق انجم: اللہ تیرا شکر ہے۔(قہقہے) OO

نوازش نامے

آپ کے خط

■ اس رسالے کے بارے میں میری رائے قطعی منفی ہے۔ آپ نے اس کا جس طرح تعارف نامہ بھیجا تھا اس سے یہ شمارہ کہیں سے بھی لگا نہیں کھاتا۔ یہ رسالہ 'شب خون' تو در کنار 'شاعر' جیسے رسالے کے معیار سے بھی فروتر ہے۔ سید محمد اشرف اور حمایت علی شاعر پر گوشہ شائع کر کے آپ نے نہ صرف ان لوگوں کو گوشہ نشین کر دیا بلکہ ان لوگوں کو گوشۂ عافیت کا پتہ بھی دے دیا۔ اس شمارے میں ایک دو ہی تحریریں ایسی ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ میں آپ کی طنز و مزاح نگاری کا قائل ہوں اور برابر آپ کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں۔ میں رسمی یا جھوٹی تعریفیں لکھ کر کسی مدیر کو گمراہ نہیں کرتا۔ سوچا تھا 'ادب ساز' پر تفصیل سے خط لکھوں گا مگر یہ رسالہ کسی بھی طرح کی بحث کا متقاضی نہیں ہے۔

عارف ہندی، وارانسی (بنارس)

■ 'ادب ساز' کا اجرا خوش آیند ہے۔ جب پرانے رسائل اپنی بساط لپیٹ رہے ہیں، ادب ساز کی صورت میں ایک بے حد معیاری اردو رسالے کی اشاعت ہم سب کے لیے تقویت کا باعث ہے۔ اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ کسی مخصوص آئیڈیالوجی کا نمایندہ نہیں ہے۔ آئیڈیالوجی حد بندیاں عائد کرتی ہے اور ادب کی آزادانہ نشو و نما کے راستے میں حائل ہوتی ہے۔ ادب ساز کا مدیر ادب کی اس بنیادی جہت کا رمز شناس ہے۔ اور اس نے پہلے ہی شمارے سے اپنے رسالے کی انفرادیت باور کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایک ضخیم رسالہ مرتب کرنا اور اس میں معیاری مواد شامل کرنا آسان نہیں ہے۔ میں ادب ساز کی صورت میں اردو کے ایک اور اہم رسالے کی اشاعت پر جہاں نصرت ظہیر صاحب کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں، وہاں اس توقع کا اظہار بھی کرتا ہوں کہ وہ اسی لگن اور محنت سے رسالہ شائع کرتے رہیں گے۔ نیک خواہشات کے ساتھ!

ڈاکٹر وزیر آغا، لاہور کینٹ، پاکستان

■ بلند اقبال سے مجھے آپ کے رسالہ 'ادب ساز' کے اس نمبر کی اطلاع تو مل گئی تھی۔ اس نے بہت تعریف کی تھی، اس لئے میں بڑے اشتیاق سے اس کا منتظر تھا۔ آج رسالہ مل گیا۔ دیکھ کر اور اپنی پسندیدہ شخصیات کی تحریریں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ 'تہذیبی مکالمہ' سیمینار سے متعلق جو مضامین ہیں، بحث طلب ہیں۔ کبھی اظہار خیال بھی کروں گا۔ امرتا پریتم کے بارے میں آپ نے جو گوشہ دیا ہے، وہ بہت وقیع ہے کاش یہ گوشہ اور وسیع ہوتا۔ سید محمد اشرف صاحب کا گوشہ بھی خوب ہے۔ میں ان سے واقف نہیں تھا۔ ابھی صرف زندگی کے حالات پڑھے ہیں۔ ماشاءاللہ بڑے کام کئے ہیں۔ بنیادی طور پر افسانے اور ناول کے آدمی ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان پڑوسی ملک ہونے کے باوجود بہت فاصلوں پر آباد ہیں۔ اکثر ایک خاندان کے افراد بلکہ ایک باپ کی اولاد بھی ایک دوسرے کے لئے 'اجنبی' ہو گئی ہے۔ اب کچھ آثار پیدا ہو رہے ہیں کہ دونوں ملک قریب آ جائیں۔ خدا کرے ایسا ہو۔ مجھ سے بھی وہاں کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ 'ادب ساز' کے گوشے سے کتنے ہی لوگ پہلی بار جانیں گے کہ اس نام کا بھی کوئی شخص ان کے درمیان رہتا ہے۔ (شاعر تو تخلص کے اعتبار سے ہوں ہی) آپ نے بلند اقبال کے افسانے بھی چھاپے

'ادب ساز' کی (دو جلدوں کی) وی پی 595 روپے میں وصول کر لی ہے۔ 600 روپے میں صرف پانچ روپے کا منافع میری کاروباری زندگی میں پہلی مرتبہ آیا ہے۔ یہ مسئلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ میں وی پی واپس کر دیتا اور ایسی صورت میں اکثر کر دیتا ہوں، مگر محض آپ کی خاطر یہ نقصان عارضی اٹھانا پسند کیا۔ کیوں؟ وجہ کبھی بعد ملاقات۔ برصغیر کا کون سا ایسا ادبی رسالہ ہے جو ہم نے نہ منگایا ہو۔ ادب خالص نقصان کا سودا ہے۔ مگر یہ نقصان 50 سالوں سے اٹھا رہا ہوں۔ محض ادبی ذوق اور اردو کی خاطر۔ آپ جیسا باخبر شخص اگر ایسا کرے تو حیرت ہوتی ہے۔ میں شاعر ادیب تو ہوں نہیں کہ اپنی تخلیقات کی اشاعت کی خاطر ایسا کروں جو آج کل لوگ عموماً کر رہے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ میں کیا کروں کہ اس نقصان کی کچھ تلافی ہو۔

پرچہ پسند آیا۔ منفرد ہے، بہت کچھ نیا اور معیاری ہے۔ آپ نے محنت کی ہے، اس کا اجر آپ کو ملے گا۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ کچھ نیا مواد پڑھ رہے ہیں۔ اس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ادبا شعرا چاپلوسی بھرے خطوط محض اشاعتِ تخلیق کی خاطر لکھتے ہیں۔ آپ تراجم ضرور شائع کریں۔ خصوصاً عربی اور فارسی ادب کے۔ انگریزی ادب کے تراجم تو آسانی سے مل جاتے ہیں مگر عربی فارسی ادب مشکل سے اردو میں نظر آتا ہے۔ یہ کام آپ کر سکتے ہیں۔ عربی اور فارسی ادب اردو فضا سے ہم آہنگ ہے۔ وہاں کے مسائل بھی کچھ ہم جیسے ہیں یا کچھ ہی الگ۔

پورا رسالہ پڑھنا اور اس پر اپنی رائے دینا وقت طلب تھا اس لئے کاروباری بات پہلے کہہ دی۔ دوسرا شمارہ کب تک آئے گا مطلع فرمائیں۔ آپ کسی کو بھی اعزازی رسالہ نہ بھیجیں۔ جو مالی تعاون کرے رسالہ اس کو ہی جائے۔ ادب گھاٹے کا سودا ہے، مگر اس سودے میں منافع بھی ہے۔ انتخاب میں رعایت نہ کریں۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب ہو جب تک تخلیق معیار پر نہ اترے شائع نہ کریں خواہ کتنا ہی بڑا نام ہو۔ مظفر حنفی کا سفرنامہ، کیا ضرورت تھی اسے شائع کرنے کی۔ بھگوان داس اعجاز کا تعارف تین جگہ دینے کی وجہ؟ تعارفی سلسلہ منفرد ہے، پسند آیا۔ لکھنا تو بہت کچھ تھا مگر پورا پرچہ پڑھا نہیں ہے۔ امید ہے جواب سے نوازیں گے۔ یہ ایک عام قاری کا خط ہے، اور فی الحال ادب کا قاری عنقا ہے۔ جو ہیں غنیمت ہیں۔ ان کی قدر کریں۔ فقط والسلام۔

عبدالستار، آزاد کتاب گھر، ساکچی بازار، جمشید پور

ہیں۔ یہ لڑکا بہت ہونہار ہے۔ اس کے مختصر افسانے پاکستان اور بیرونی دنیا میں بھی پسند کئے جا رہے ہیں بلکہ معرضِ بحث میں بھی ہیں۔ اس سے میں نے کہہ دیا کہ مخالفین سے دل برداشتہ نہ ہونا۔ یہ ہمارے اردو ادب کی "قدیم روایت" ہے۔ وہ بنیادی طور پر ڈاکٹر ہے نا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں کچھ لکھتا تھا۔ میری ہدایت پر چھوڑ دیا اور ان کی خواہش پر ڈاکٹر بن گیا۔ (اس تعلیم کے دوران افسانے کہاں سوجھتے ہیں) پھر وہ کینیڈا چلا گیا۔ ہمارا چھوٹا بیٹا ہے اس لئے لاڈلا بھی رہا۔ ماں کا بہت دیوانہ تھا۔ مگر کچھ ایسا ہوا کہ ماں بیمار پڑ گئی امریکہ میں علاج کروایا۔ وہاں مشورہ دیا گیا کہ ہندوستان لے جاؤ، اس مرض (جگر کا سرطان) کا علاج وہیں ممکن ہے۔ کینیڈا لے آیا اور انڈیا جانے ہی والا تھا کہ قضا آ گئی۔ ماں سے جدا ہو گیا۔ ٹورنٹو میں ہی ان کی تدفین ہوئی۔ اس سانحے کا ایسا اثر ہوا کہ بے اختیار اشعار میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگا۔

میں حیران کہ یہ لڑکا یکایک شاعر کیسے بن گیا۔ (وہ تمام نظمیں اس کی بہن نے اس کتاب میں محفوظ کر دیں ہیں جو اس نے اپنی امی کے مرنے کے بعد مرتب کی۔ معراج تسیم۔ ہماری امی جان' (یہ اس کتاب کا نام ہے)۔ کبھی آپ کو بھیجوں گا۔ ماں پر ایسی کتاب کم بچوں نے مرتب کی ہوگی۔ پھر وہ افسانے لکھنے لگا۔ میں خوش ہوں کہ اس نے افسانے میں ابھی اپنے لئے ایک نئی یا مختلف راہ نکالی۔ خدا اسے کامیاب کرے۔ 'ادب ساز' کئی اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔ اطمینان سے پڑھوں گا ابھی شعری حصہ بھی نہیں پڑھ پایا۔ دو دن ہی تو ہوئے ہیں اسے پا کر۔ بہر حال۔ اپنے انداز کا ایک منفرد رسالہ ہے۔ پاکستان کے اہلِ قلم بھی خاصی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ آپ ہر شمارے میں یہی عمل رکھیں۔ ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی شاعر یا ادیب کا گوشہ۔ اسی طرح مرحومین کا بھی ایسا ہی سلسلہ رکھیے۔ اس بار امرتا پریتم کا گوشہ ہے۔ لیکن کسی پاکستانی مرحوم اہلِ قلم کی طرف آپ نے توجہ نہیں دی۔ انھیں بھی یاد رکھیں بھائی۔ تھیٹر، موسیقی اور مصوری پر بھی مضامین ہیں۔ اسے بھی دونوں ملکوں پر محیط ہونا چاہئے۔ علاقائی انجمن میں آپ نے حیدر قریشی کے 'مکالماتی ماہیئے' شائع کئے ہیں۔ ماہیے کی اصل تکنیک یہی ہے۔ اس کی بحر بھی مخصوص ہوتی ہے۔ پنجابی ادب کے ناقدین تو اسے 'ڈیڑھ مصرعی سخن' کہتے ہیں اور اسے لکھتے بھی ہیں اُسی انداز میں۔ ہماری شاعری میں 'اردو ماہیا' چونکہ 'ہائیکو' کے بعد آیا ہے اس لئے اسے بھی 'سہ مصرعی سخن' سمجھ لیا گیا۔

پہلے تو ماہیا اور ہائیکو، دونوں ہی غلط لکھے جاتے تھے۔ اب کراچی میں جاپان کونسلیٹ کے زیرِ اہتمام 'ہائیکو' مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ ان کی رہنمائی میں 5-7-5 سلے بلز میں لکھے جانے لگے اور ماہیے میں رہنمائی تو حیدر قریشی ہی نے کی ہے۔ انھوں نے اس کی صحیح تکنیک سے آگاہ کیا۔ ہم تو خیر اتنے پنجابی آشنا نہیں ہیں، پنجاب کے 'اردو شاعر' بھی ماہیے کی تکنیک سے واقف نہیں تھے۔ چنانچہ غلط نگارشات کا ایک انبار رسائل اور کتب میں جمع ہوتا رہا (اب بھی کچھ لوگ غلط ہی لکھتے ہیں) اس شمارے میں ڈاکٹر فراز حامدی کا ایک 'دوہا گیت' بھی ہے۔ خدا کا شکر ہے درست ہے۔ ورنہ ہمارے ہاں سرسی چھند یا گیتوں کے 'ٹکڑے' لکھے جا رہے تھے جو دوہے کی بحر میں نہیں ہوتے تھے اور شعرائے کرام 'دوہے' کے عنوان سے انھیں چھپواتے رہتے تھے۔ (لاعلمی میں ایسا بہت سا کام اب بھی ہو رہا ہے) آپ نے 'دوہے' بھی چھاپے ہیں۔ فراز حامدی، تسیم عزیزی اور طارق منظور۔ سب کے دوہے درست ہیں۔ خط خاصہ طویل ہو گیا۔ اس لئے ختم کر رہا ہوں۔

حمایت علی شاعر، کراچی، پاکستان

■ 'ادب ساز' ایک خوب صورت دستاویز ہے جس میں اردو ادب کے سفر کے کئی جدید رجحانات و میلانات اور بہت سی یادیں جمع ہیں۔ یہ ایک تاریخی ڈاکیومنٹ بن گیا ہے جس کی حفاظت یقیناً کی جائے گی۔ ادیبوں فن کاروں کا اتنا بڑا قافلہ ہے کہ جسے بس دیکھتے رہنے اور جمالیاتی انبساط پاتے رہنے کا جی چاہتا رہے گا۔ اس شمارے کو کئی بار دیکھا اور مختلف تخلیقات کو کئی بار پڑھا اور یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ آپ نے ادب ساز کے پہلے شمارے میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات کو جمع کر کے دراصل رسالے کے معیار کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ یقین ہے یہ معیار قائم رہے گا اور ہر بار نئی تخلیقات شامل ہوتی رہیں گی اور 'ادب ساز' مختلف ادبی، فنی اور ثقافتی رجحانات و میلانات کو لئے ایک منفرد دبستان کی صورت ابھرے گا۔ انتساب بہت پسند آیا، شب خون کو میں منفی نام نہیں سمجھتا۔ شمس الرحمن فاروقی کی فکر و نظر کی روشنی میں چھپنے والا یہ رسالہ جدید ادب کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ آپ نے درست لکھا ہے کہ "مثبت سنجیدگی سے جدید نظریات اور عالمانہ انداز فکر و فن کو فروغ دے کر 2005 میں 39 سال کا تاریخ ساز سفر تمام کیا ہے۔" تہذیبی مکالمہ اور تصادم کے سلسلے کے مضامین دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ سید محمد اشرف کا گوشہ قیمتی ہے۔ تمام مضامین پڑھ چکا ہوں۔ بہت اچھا لگا 'سید محمد اشرف کا خصوصی مطالعہ'۔ نشتر خانقاہی کے گزر جانے کا بڑا دکھ ہے۔ آپ کو بتاؤں میں 1952 میں پہلی بار دہلی آیا تھا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں ایم اے اردو سال اول کا طالب علم تھا۔ اردو بازار میں جہاں اور کئی اہم لوگ ملے وہاں نشتر خانقاہی بھی ملے تھے۔ میں غالب کے مزار پر جانا چاہتا تھا، ان سے اپنی خواہش ظاہر کی تو فوراً تیار ہو گئے۔ ان کے ساتھ پہلی بار حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضری دی پھر مزار غالب پر آئے۔ اس وقت تک غالب کا مزار بنا نہ تھا صرف مٹی کی قبر تھی، وہاں انہوں نے میری ایک تصویر کھینچی۔ جب میں پٹنہ واپس آیا تو کچھ دنوں کے بعد ان کی بھجوائی ہوئی تصویر ملی، غالب کی کچی قبر کے پاس ہم دونوں کھڑے ہیں۔ خط و کتابت رہی۔ بڑی محبت سے خط لکھا کرتے تھے۔ کیا خوب کہا ہے۔

دل منعقد کرے ہے جشنِ نشاط پیہوں
غنچہ دہن تصور، دستِ خیال حیرت!

آہستہ آہستہ احباب اٹھے جا رہے ہیں بڑی تنہائی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ نے مجھے جو عزت بخشی ہے اس کا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ دعا ہی کر سکتا ہوں جو کرتا ہوں۔

صفحہ 49 پر میری کتابوں کا اشتہار ہے (مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو) اس میں ہندوستان کا نظامِ جمال کی جگہ ہندوستان کا نظامِ جمالیات لکھا ہوا ہے۔ کتاب کا نام یہ نہیں ہے۔ آئندہ کبھی اس کتاب کی تینوں جلدوں کے تعلق سے کوئی ذکر کیجئے تو 'نظام جمالیات' کی جگہ 'نظامِ جمال' لکھئے۔

آپ کو معلوم ہے ہم پر کیسا وقت آن پڑا ہے۔ پہلے وقت پر گزر جانے کا حوصلہ رکھتے تھے اور اس کے اوپر سے گزر جاتے تھے آج تو یہ حوصلہ ہی ٹوٹا جا رہا ہے۔ عجیب بے بسی ہے دعا فرمائیں میرے لختِ جگر ڈاکٹر روی کے لئے، تین چار مہینے سے ہم اپنے ہوش و حواس میں کب ہیں اس عمر میں کسی قسم کی تکلیف برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ دعا فرمائیں۔

پروفیسر شکیل الرحمن، گوڑگاؤں، ہریانہ

■ 'ادب ساز' کی پہلی اشاعت کی خبر ملی۔ خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے رسالہ شائع کر ہی دیا۔ یہ بے حد پر خار راہ ہے اس پر وہی چلنے کی ہمت رکھتے ہیں جو کہہ سکیں:

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

ادبی دنیا میں رسالے کی پذیرائی کا بہتر طریقہ یہی رہے گا کہ رسالہ بک اسٹالوں پر رکھوا دیجئے۔ قاری کو موقعہ تو دیجئے کہ وہ آپ کے رسالے کی خریداری اور اس کو اپنے مطالعے میں رکھنے کا اسے دیکھ کر فیصلہ کر سکے! اردو رسالوں کو نچ اور عام روش سے ہٹ کر نکالنا ہے تو قاری کو یہ باور کرانا ہو گا کہ رسالہ اس کے مطالعے کی ضرورت اور حصہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تبھی قاری کسی حد تک آپ کے کہے ہوئے پر یقین کر سکے گا۔ میں مکتبہ جامعہ سے اسے خریدلوں گا آپ اسے وہاں بھی اور اردو کے دوسرے بک اسٹالوں پر بھی رکھوائیے! پھر ایک بار تمہارے حوصلے کی داد دیتے ہوئے، رسالے کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار۔

زبیر رضوی، ذاکر نگر، نئی دہلی

رضوی صاحب کا خط ایک جونئیر اور بڑے ادیب کی کشادہ دلی اور اپنے جونئیر کی مدد کے لئے ہمہ وقت کربستہ رہنے کی روشن مثال اور اس عظیم روایت کا حصہ ہے جس کی بدولت ادب کے قافلے نسل در نسل نئی منزلوں سے ہم کنار ہو سکے۔ رضوی صاحب خود ذہن جدید جیسے ذہن ساز مجلے کے مدیر ہیں اور ان کا یہ حسن سلوک میں آج تک نہیں بھولا ہوں کہ کم و بیش تیس برس پہلے جب میرے طنزیہ مزاحیہ مضامین صرف اخبارات تک محدود تھے تو انہوں نے خود مجھے اپنے پرچے کے لئے لکھنے کی دعوت دی اور فرمائش کی، تقاضہ کیا، یہاں تک کہ سر عام یہ کہہ کر مجھے شرمندہ کیا کہ بھائی میں تمہارا فین ہوں اب بتاؤ اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ مجھے تمہارا مضمون مل جائے۔ میں نالائق صرف چار پانچ مضمون 'ذہن جدید' کو دے سکا مگر زبیر صاحب نے آج بھی ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ ان کی فراخ دلی اور وضع داری کو میں سلام کرتا ہوں اور عرض کناں ہوں کہ 'ادب ساز' کو اس مرتبہ ضرور کچھ نہ کچھ عطا فرمائیں۔ ن ظ

■ 'ادب ساز' ملا۔ یقین تھا آپ کے زیر ادارت جو پرچہ شائع ہوگا معیاری ہوگا، سو ہے۔ بہت بہت مبارک باد۔ شاید رسالے کو نظر بد سے بچائے رکھنے کے لئے سرورق کچھ دوسرے طرز کا لگایا گیا ہے۔ دوسرے شمارے کا انتظار ہے۔ اس کیلئے کچھ غزلیں بھیجتا ہوں کیونکہ آئندہ چند ماہ تک برطانیہ میں رہوں گا۔

مظفر حنفی، دہلی

■ کیا خوب صورت، ضخیم، معیاری، قابل مطالعہ، دل کش اور live رسالہ نکالا ہے۔ واللہ طبیعت خوش ہوگئی۔ مضامین میں سب سے پہلے 'تہذیبی مکالمہ اور تصادم' کے عنوانات کے تحت شائع شدہ مضامین نے متوجہ کیا۔ مجھے فرحت احساس کا مضمون زیادہ پسند آیا۔ ایک ادیب کو جتنا غیر جانب دار ہونا چاہئے تھا اتنا وہ ہیں۔ دو باتیں انہوں نے بہت ہی خیال انگیز کہی ہیں، اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

1۔ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع اور دراز تر ہوا اور مسلمان ایک نئی عالمی قوت کے طور پر مستحکم ہو گئے تو پھر انہیں یہ خبر ہی نہیں رہی کہ دنیا میں ان کے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔

2۔ علامہ جمال الدین افغانی کا جذباتی وفور اپنے سرچشمے کے لحاظ سے تو مذہبی تھا مگر اپنے مقاصد اور منصوبے کے لحاظ سے خالص سیاسی اور مادی تھا یعنی وہ اپنے مذہب نژاد خسارے کو غلبے کی بحالی کے زر نقد سے پورا کرنا چاہتا تھا۔

اس مقام پہ ایک سوال سر اٹھاتا ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کو کیوں نکلنا پڑا اور انڈونیشیا، ملایشیا میں کسی فوج کشی کے بغیر اکثریت مسلمان کیوں ہوگئی؟ اس سوال کا جواب اگر ایمان داری سے تلاش کرلیا جائے تو میرے خیال میں تہذیبی تصادم کے غبارے کی ہوا نکل جائے گی۔

نارنگ صاحب سے گفتگو بہت مفید ہے اور ان کی گفتگو بہت عالمانہ ہے۔ ان کے اس خیال سے میں خود کو متفق پاتا ہوں ہو کہ "ہندوستانی اکثریت کی روادارانہ جمہوری تہذیب میں میرا دشواس نہیں ٹوٹا"

ڈاکٹر محمد حسن صاحب کے مقالے 'جدلیاتی تنقید' میں ادب کے بنیادی منصب اس کے تفاعل، لوازمات اور اس کی تفہیم کے سلسلے میں جس عالمانہ غیر جانب داری کو برقرار رکھا گیا آج تنقید میں اس کی کمی بہت کھٹکتی ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمن صاحب اپنے مضامین میں بار بار 'تصوف کی جمالیات' کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں۔ تصوف تو خود مذہب کی جمالیات ہے۔ اب تصوف کی جمالیات کا مطلب تو پہلی نظر میں 'جمالیات کی جمالیات' ہوگا۔ میں نے سمجھنے کی کوشش کی مگر اپنی کم علمی کے سبب سمجھ نہیں پایا۔ بابا سائیں ذرا زحمت اٹھا کر 'جمالیات کی جمالیات' کے عقدے کو حل کر دیں تو میرے لئے شاید کچھ چیزوں کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

پروفیسر قاسمی کا مضمون حسب سابق عالمانہ اور محققانہ ہے۔ پہلے شمارے ہی میں آپ کو کئی اہم علمی اور تنقیدی تحریریں میسر ہو گئیں یہ رسالے کے بہتر مستقبل کا اشاریہ ہیں۔

تخلیقی سطح پر بھی اچھی اور معیاری تخلیقات کی کہکشائیں جگمگا رہی ہیں۔ نشتر خانقاہی کی حمد نے بہت بے چین کیا۔ ہمارے درمیان سے ایک سچا، مخلص، دل دوز، دل کش، جاں سوز، باہوش اور باکمال شاعر اٹھ گیا۔ مظفر حنفی کو اپنی بے سرو سامانی پر ناز ہے مگر اس سے کم ناز و افتخار اردو والوں کو نہیں ہے کہ زبان کے شاعر کی آمد طبع عمر کے آٹھویں عشرے میں بھی طغیانی پر ہے۔

افسانے بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں مگر گلزار نے کیا غضب ناک اور بھیانک افسانہ لکھا... الامان والحفیظ... اتنی سبک روی سے آگے بڑھتے، ملائمیت سے بات کرتے ایک عام اور اتھاہ دردمندی کو برقرار رکھتے ہوئے، اچانک ہی انہوں نے مرکز پر بم باری کردی۔ گلزار کی شاعری تو مدتوں سے من موہک تھی مگر فکشن میں بھی وہ اتنے طاقت ور اور سفاک ہو گئے ہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ مشہور اردو ڈرامہ نگار شاہد انور کی مدیحہ گوہر سے بات چیت، ہم تھیٹر کے فن سے نابلد لوگوں کے لئے خاص فائدہ مند بھی ہے اور مرعوب کن بھی۔ ثقافتی صورت حال کو cover کرتے ہوئے آپ نے تھیٹر، سنیما، سنگیت، موسیقی، مصوری تقریباً ہر پہلو کا احاطہ کیا۔ کاش اردو کے دیگر ادبی رسالے بھی ذہن جدید، نیا ورق اور ادب ساز کے اس طور کو قبول کرلیں۔

اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ خدا کرے نقش ثانی نقش اول سے بھی بہتر ہو۔

حسین الحق، بہار

■ میں کل شام کینیڈا سے لوٹ آیا ہوں۔ مگر مجھے اگلے ماہ کے شروع میں ایک بار پھر جانا پڑے گا۔ نروس بریک ڈاؤن کے بعد ایک اینٹی ڈپریسنٹ دوا ایسی ہے جو مجھے موافق نہیں آرہی ہے فون پر معاملہ طے نہیں ہو پا رہا ہے۔ ٹیسٹ ضروری ہے۔ اس لئے میں پندرہ بیس دنوں کے لئے پھر عازم سفر ہوں گا۔

'ادب ساز' کو اپنا منتظر پایا۔ 'شنیدم کے بود مانند دیدہ' توقعات سے بڑھ کر پایا۔ آپ نے بے حد محنت سے اسے سجایا ہے۔ مبارکباد۔ 'بائی لائن' اردو ادب کا عالمی جریدہ، واقعی اس کو زیب دیتی ہے۔ انتساب بھی پرمعنی ہے۔ 'شب خون' اور 'شاعر' دونوں جریدوں نے اردو کی ادبی صحافت کے روشن ترین باب رقم کئے ہیں۔ پاکستان میں یہی کارنامے 'فنون' اور 'اوراق' نے بھی سرانجام دئے ہیں اور ہمیں ان کی خدمات کا اعتراف کرنا چاہئے۔

رفتہ رفتہ جرعہ جرعہ پڑھ رہا ہوں، محسوس کر رہا ہوں۔ آنے والے کئی ہفتوں میں اس کا مطالعہ ختم ہوگا۔

اس لیے جلد میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ محترم حمایت علی شاعر اور سید محمد اشرف پر خصوصی مطالعہ۔ دونوں حصص پڑھ چکا ہوں۔ شاعر صاحب نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے تک اردو نظم کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔ ان کی طویل سوانحی نظم اردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب بھی وہ بے حد فعال ہیں اور ڈھلتی عمر کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سید محمد اشرف ان سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں لیکن اردو کے شارٹ فکشن پر جگہ جگہ ان کے دستخط ثبت ہیں۔ دونوں حضرات اس کے مستحق تھے۔ میری مبارکباد۔ 'باب تنقید' کو پروفیسر شکیل الرحمٰن کے نام معنون کرکے آپ نے بطور نقاد، محقق اور مدیر ان کی خدمت کا اعتراف کیا ہے۔ ملا نصیر الدین پر ان کا مضمون 'معلومات' کا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ زمان و مکان پر حاوی یہ Phenomological کردار ضرب المثل بھی ہے اور منفرد بھی۔ کل بھی تھا آج بھی ہے اور آنے والے کل میں بھی ہوگا۔ مجھے یہ مضمون بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون یا اس کے کچھ حصص پہلے کہیں اور پڑھ چکا ہوں۔ گفت، شنید اور کرد کے مابین تفاوت کے سلسلے میں سنسکرت کے ماہر شعریات بھوبھوتی کا ایک قول یاد آ گیا۔

"کویتا کا ارتھ سمجھنے میں سننے والے کا حصہ سنانے والے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے"

'خراج عقیدت' میں امرتا پریتم کی صحیح شخصیت ابھر کر آتی ہے۔ امروز اور اسا سلیم، دونوں کے رائٹ اپ دل کو چھوتے ہیں۔ امروز نے سوبھا سنگھ جی کا ذکر کیا ہے۔ 1955 میں اندریتا ضلع کانگڑہ کی پرفضا وادی میں، سردار جیون سنگھ، پنجابی پبلشر اور راقم الحروف ان سے ملنے گئے، جہاں ایک آرٹسٹ کالونی بنانے کی تجویز تھی۔ سوبھا سنگھ جی نے بتایا کہ شاید امرتا بھی وہاں ایک قطعہ اراضی خرید کر ایک کاٹیج تعمیر کرنا چاہتی ہیں۔ نہ معلوم یہ تجویز سرے چڑھی کہ نہیں۔ مضامین پڑھ چکا ہوں۔ نظمیں بے حد پیار سے اور دلار سے باہوں میں لے کر جھلا رہا ہوں۔ ان کے بارے میں پھر لکھوں گا۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند، ورجینیا، امریکہ

■ ادب ساز کا پہلا شمارہ ملا شکریہ۔ آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں۔ جس دن رسالہ ملا، اس سے اگلے دن پروین شیر میرے یہاں آئیں جو کناڈا سے برائے سیاحت اسپین اور فرانس ہوتی ہوئی جرمنی پہنچی تھیں۔ میں نے ادب ساز انہیں دکھایا تو سرورق پر اپنی حمایت علی شاعر والی پینٹنگ دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی ہوئیں۔ رسالے کا انداز عام ادبی رسائل سے کئی لحاظ سے مختلف ہے۔ فلم، تھیٹر اور مصوری کے سیکشن ایک دو اور رسالوں نے بھی شروع کر رکھے ہیں، آپ نے اس روایت کو مستحکم کرنے میں ان کا ساتھ دیا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے آپ نے مکالمہ کی جو راہ نکالی ہے وہ وقت کی ضرورت تھی۔ مابعد جدیدیت جس ڈی کنسٹرکشن کا راگ الاپتی ہے، تہذیبوں کے تصادم والوں سے اسے جوڑ کر دیکھا جائے اور پھر نئی صدی کے آغاز سے اب تک افغانستان، عراق، فلسطین اور لبنان تک اس ڈی کنسٹرکشن کے عملی مظاہرے دیکھے جائیں تو اصل کھیل کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ ابھی ڈی کنسٹرکشن کے کئی اور ہولناک منظر سامنے آنے والے ہیں۔ ہمارے اردو کے مابعد جدید دانشوروں کو اپنا کام جاری رکھنا چاہیے۔

افتخار گیلانی کی آپ بیتی کا ایک باب اور ان کی کتاب پر آپ کے تبصرے کو پڑھ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا خیال ہے انڈیا اور پاکستان دونوں بعض معاملات میں جذباتیت کی اس حد کو فروغ دے چکے ہیں، جو جہالت کی تباہ کن صورت ہے۔ ہماری دونوں طرف کی خفیہ ایجنسیوں، پولیس، اور جیل خانہ جات کا احوال کافی حد تک ایک جیسا ہے، بس جہالت کی زائیدہ جذباتیت کے پیمانے مختلف ہیں۔ افتخار گیلانی کی ہولناک روداد پڑھ کر مجھے احساس ہوا ہے کہ گوانتاناموبے کی جیل میں بھی ایسا شرمناک سلوک نہیں ہوتا ہوگا، جو اُن کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اللہ ہمارے جنوبی ایشیائی ممالک کے حال پر رحم کرے۔

حمایت علی شاعر صاحب کا گوشہ مزے کے ساتھ پڑھا ہے، اچھا لگا۔ ان کا ایک مجموعی ادبی تاثر سامنے آیا۔ ان کے کیسے کیسے سدا بہار گیت یاد آ گئے۔ ان کے انٹرویو سے اندازہ ہوا کہ قدرے پرانا ہے کیوں کہ انہوں نے جس ڈاکٹر بیٹے کے امریکہ یا کناڈا میں جانے کی امید کی ہے وہ کافی عرصہ سے کناڈا پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر بلند اقبال میرے اچھے دوست ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ثلاثی کے ذکر میں ماہیے کا جس طور حوالہ دیا ہے، پرانی بات لگتی ہے۔ تب پنجاب کے ایک نوجوان شاعر نے ماہیے کے سلسلے میں بھی اور حمایت علی شاعر صاحب کے ثلاثی کے سلسلے میں بھی نازیبا زبان استعمال کی تھی۔ غالباً یہ اسی زمانے کے آس پاس کا انٹرویو ہے، ورنہ اس کے بعد انہوں نے ماہیے کے سلسلے میں مجھے کافی حوصلہ دیا ہے۔ 'آئینہ در آئینہ' کو پہلی منظوم خودنوشت قرار دیے جانے کا تاثر محسوس ہوا ہے، یہ کھوج ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی منظوم خودنوشت 'آدھی صدی کے بعد' جدید اردو نظم میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا پہلا کتابی ایڈیشن 1981 میں چھپا تھا۔ ہو سکتا ہے وزیر آغا سے پہلے کسی اور شاعر کی منظوم خودنوشت بھی چھپی ہو۔

جاسوسی ادب کے حوالے سے اظہار اثر صاحب کا مضمون پڑھا۔ انگریزی جاسوسی ادب کے بارے میں تو کچھ نہیں کہوں گا، اردو کے جاسوسی ادب کے حوالے سے بھی صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ابن صفی سے پہلے اکرم الٰہ آبادی کی خان بالے سیریز مزے کی لگتی تھی لیکن ابن صفی کو پڑھنے کے بعد پھر نہ ان سے پہلے کا اور نہ ان کے بعد کا کوئی جاسوسی ناول نگار دل کو بھا سکا۔ اس حوالے سے دل پر صرف ابن صفی کا ہی ڈیرہ ہے۔ کتابوں پر تبصروں میں فاروق ارگلی کا تازہ کارنامہ اور پھر اس پر ڈاکٹر خلیق انجم کے تبصرے نے کتنی یادیں تازہ کر دیں:

کیا کیا ہمیں یاد آیا جب یاد تری آئی

میں نگارشات کو اپنی ذاتی ترجیحی ترتیب سے پڑھتا ہوں۔ جوگندر پال، رشید امجد، گلزار، منشا یاد، انجم عثمانی، سلطان جمیل نسیم، ڈاکٹر بلند اقبال، کے افسانے پڑھ چکا ہوں اور اچھے لگے ہیں۔ شعری حصہ نظم و نثر دونوں میں نشتر خانقاہی، محمود شام، مظفر حنفی، شجاع خاور، شاہد ماہلی، بشریٰ رحمن، گلزار، غلام مرتضیٰ راہی، نعمان شوق، ارشد کمال، کی تخلیقات اچھی لگیں۔ رضیہ فصیح احمد کا زخم تمنا خوب ہے۔ طنز و مزاح کے باب سے گزرتے ہوئے مجھے دلیپ سنگھ کی یاد آئی۔ انڈیا میں بہت کم لوگ ہیں جو طنز میں ڈنک کی بجائے دلیپ سنگھ جیسی چاشنی لا سکیں۔ دلیپ سنگھ کی طنز و مزاح نگاری کے نمونے تبرک کے طور پر چھاپے جا سکتے ہیں۔ رسالہ ابھی پڑھ رہا ہوں اور آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔

حیدر قریشی، فرینکفرٹ، جرمنی

■ 'ادب ساز' کا پہلا شمارہ دیکھ کر مرحوم محمد طفیل کے 'نقوش' کی یاد تازہ ہو گئی۔ واقعی آپ نے کمال کر دیا ہے۔ آغاز کے مضامین بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مغرب کا "تہذیبی جنگ" کا نعرہ محض عالم اسلام کو اپنا دشمن نمبر ایک جتلا کر پوری دنیا میں مسلمانوں کے خاتمے کی راہ صاف کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے یہودی نژاد پروفیسر سموئیل ہنٹنگٹن

نے 1994 میں اپنی کتاب Clash of civilization and remaking of New world order میں اپنے جارحانہ اسلام مخالف نظریات کو پیش کر کے برملا اس بات کا اعلان کر دیا کہ:

''مغرب کے لئے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی نہیں بلکہ اسلام ہے جو ایک مختلف تہذیب ہے اور جس کو ماننے والے اپنی ثقافت کی برتری پر یقین رکھتے ہیں اور اقتدار میں اپنے کمتر حصہ پر پریشان ہیں''(صفحہ نمبر 218-217)

اور یہ کہ:

''ایٹمی اسلحے کے پھیلاؤ کا اصل خطرہ ہمیں اسلام اور اسلامی تحریکوں سے ہے اور ان دونوں کا منبع مسلمان ہیں۔''

اصل میں تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ سراسر مسلم دشمنی پر مبنی ہے اور مغرب اور امریکہ نے اس نظریہ پر عمل شروع کر دیا ہے۔ نائن الیون کے واقعہ نے اس نظریے میں بھرپور جان ڈال دی اب کفر کی دنیا ایک طرف اور مسلم دنیا دوسری جانب، کفر کی دنیا اپنی تمام تر ہلاکت خیز ساز و سامان کے ساتھ اور مسلم دنیا بے یار و مددگار ہلاک ہونے کیلئے تیار؛ مسلمان اور مسلم دنیا اپنی تاریخ کے سب سے بڑے آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں ایسے میں بس اللہ ہی حافظ ہے۔

اردو میں سرّی ادب پر اظہار اثر کا مضمون خاصا دلچسپ ہے۔ اظہار اثر کے ناول ہم بچپن میں پڑھا کرتے تھے۔ 'ناگن' 'گلابی موت' ان کے دلچسپ ناول تھے۔ ان ناولوں کا ایک کردار ڈاکٹر شیمونہ اب بھی یاد ہے۔ مریخی مخلوق پر ان کا ناول 'خلائی درندے' اور چپانزم پر ناول 'درندہ' میری ذاتی لائبریری میں اب بھی موجود ہیں۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سے لوگ جاسوسی ناول لکھتے تھے، جو تھوڑی دیر کے لئے چمکے اور ڈوب گئے۔ حق کی بات تو یہ ہے کہ نہ تو اظہار اثر کا اور نہ کسی اور جاسوسی ادب لکھنے والے کا چراغ ابن صفی کے آگے جل سکا۔ ابن صفی مرحوم جب تک زندہ رہے اپنی پوری قوت کے ساتھ ہر طرف چھائے رہے۔ اپنی بے مثال شگفتہ نویسی سے ہزاروں لاکھوں پڑھنے والوں کے دل جیت لئے اور عمران اور فریدی جیسے نہ بھلا دینے والے کردار جاسوسی ادب کو دے دیئے۔ بیشتر کردار انگریزی ادب سے انہوں نے لے لئے تھے۔ عمران انگریزی کے جاسوسی ادیب سیپر (ہرمن سیرل میکلین) کے بلڈاگ ڈرمنڈ؛ جوزف گوڈا، رائیڈر ہیگرڈ کے اسلوپوگاس کی اور سنگ ہی، ٹیکس روم کے ڈاکٹر فومانچو کی کامیاب نقلیں ہیں۔

برسوں پہلے میں نے اپنی ایک ابتدائی تالیف 'اردو طنز و مزاح: احتساب و انتخاب' (مطبوعہ 1988) میں ابن صفی کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں پر ایک طویل مضمون شائع کیا تھا اور غالباً یہ اردو ادب کی پہلی ایسی کتاب تھی جس میں مرحوم کے فن اور ان کی شخصیت پر بھرپور تبصرہ تھا۔ طغرل فرغان کے فرضی نام سے ابن صفی نے بڑے ہی خوب صورت نثر پارے تخلیق کئے۔ ان کے ناولوں میں کہیں کہیں یکسانیت بری طرح سے محسوس کی جا سکتی ہے لیکن 'تزک دوپیازی' جیسی بے حد شگفتہ تحریر ناقابل فراموش ہے۔ مرحوم کی تمام جاسوسی اور غیر جاسوسی تحریروں کی فضا طلسم ہوشربا سے بے حد ملتی جلتی ہے۔ ابن صفی سرّی ادب کے بادشاہ تھے اور ان کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔

اپنی بے مثل تخلیقی قوت کے بل پر سید محمد اشرف اردو افسانے کی ایک نئی شان دار شناخت بن گئے ہیں۔ ان کے کئی افسانے بلاشبہ شاہ کار کا درجہ رکھتے ہیں۔ 'ادب ساز' کا اشرف پر خصوصی مطالعہ خاصے کی چیز ہے۔ اشرف کے فن پر اور زیادہ لکھنے اور اس پر بحث کی ضرورت ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا بھی فن ایک خصوصی مطالعہ اور توجہ کا حق دار ہے۔ ذوقی کے افسانے اور ناول زوال پذیر سماج اور دور جدید کے انسان کی بے بسی، بے چارگی، مظلومی اور اس کی بے زمینی کی سفاک مگر سچی تصویریں ہیں۔ ذوقی اپنی زود نویسی پر اگر قابو پالیں تو ضرور اردو ادب کو کوئی شاہ کار ناول دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ابن اسماعیل، سوپور، کشمیر

■ ان دنوں کچھ مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ دور فرمائیں گے۔ دعا فرمائیں۔ ایک نئی کہانی لکھ کر رکھی تھی لیکن کسی کو بھی روانہ نہیں کی تھی کہ ذہنی منتشر تھا۔ اب آپ کا خط ملا تو آپ کو بھیج رہا ہوں۔ میرا پتہ تبدیل ہو گیا ہے۔ نیا پتہ کہانی کے اختتام پر لکھا ہوا ہے۔ آپ کا پرچہ نکال رہے ہیں ظاہر ہے کہ وہ انمول ہوگا۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ الجھن ہے خط بھی لکھنا دشوار ہو رہا ہے۔

مظہر الزماں خان، حیدرآباد

■ میں جب ادب ساز کے پہلے شمارے کے لئے مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ شاخ ممبئی پر گیا تو انھوں نے بتایا کہ دو یا تین کاپیاں آئی تھیں وہ فروخت ہو چکیں۔ میں نے ان سے طلب کیا ہے کہ وہ مزید کاپیاں منگوا کر چند روز میں مجھے فراہم کریں گے۔

نوازش نامے اور یادآوری کے لئے ممنون ہوں۔ 'ادب ساز' کی دو تین کاپیوں کا گراں قیمت ہونے کے باوجود یوں تیزی سے فروخت ہو جانا اس کے معیار و وقعت کا مظہر بھی ہے اور کچھ اس بات کا خوش آئند و تیقن بھی کہ عمدہ اور معیاری ادبی رسالے کے لئے طلب و تشنگی رکھنے والے قارئین ابھی ہیں۔

عبدالاحد ساز، بمبئی

■ 'ادب ساز' کے مزاج و معیار اور ضخامت سے نقوش اور ادب لطیف جیسے وقیع و موقر جرائد کی یاد تازہ ہوئی۔ کوئی شک نہیں کہ آپ نے ایک بلند و بالا اور پر شکوہ تعمیر کی بھرپور سے مند بنیاد رکھ دی ہے۔ ادب ساز کا نقش اول صوری و معنوی ہر دو لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس کے مطالعہ سے میری ذوق کا بھرپور لطف ملا۔ مندرجات کی ترتیب و تزئین میں سلیقہ مندی اور شائستگی کا حسن جھلکتا ہے:

ترتیب سے حسن ہے جہاں کا
اک چیز ادھر ادھر نہیں ہے

'ادب ساز' صحیح معنوں میں ایک مکمل جریدہ ہے جو قاری کو مختلف اصناف ادب کے ذائقوں سے آشنا کرتا ہے۔ احتساب کی شکل میں شب خون اور شاعر کو آپ کا خراج تحسین، صحافت کی اعلیٰ قدروں کا پاسدار بھی ہے اور آپ کی اعلیٰ ظرفی کا مظہر بھی۔ اس ضمن میں اطہر فاروقی کی کتاب 'گفتگوان کی' پر آپ کے تبصرے سے بھی آپ کے ایک حساس دل اور صاحب ضمیر قلم کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے ورنہ آج کے برق رفتار عہد میں کسے یاد ہوگا کہ دس سال پہلے سید حامد سے حد درجہ خوش عقیدگی کی بنا پر آپ نے ایک نیک نفس (اطہر فاروقی) کو طنز و تمسخر کا ہدف بنایا تھا۔ طنز و مزاح کے باب میں مجتبیٰ حسین کی 'تخلیق سفر نہیں ہے شرط' آج کے روکھے پھیکے اور بے جان سفرناموں کا انبار لگانے والوں کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ خودنوشتیں بھی اپنے 'منہ میاں مٹھو بننے' کی مثال قائم کر رہی ہیں۔

گفتگو میں آپ نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے سامنے سات سوال رکھے ہیں۔ سوالوں کی تعداد سے معا حاتم طائی کے قصے کا خیال آ گیا۔ بہر نوع موصوف نے آپ کے ہر سوال کا نہایت عالمانہ، استدلالی اور تشفی بخش جواب دیا ہے۔ ساتواں سوال اگر آپ مجھ سے پوچھتے تو میں ثبوت کے ساتھ جواب دیتا کہ فتح پور کے نور الہدیٰ ہائی اسکول میں اردو ایک لازمی مضمون ہے اور شہر نیز اطراف

واکناف کے ہندو مسلمان بچے اشتیاق وانہماک کیساتھ اردو پڑھتے لکھتے ہیں۔ اردو کے متعلق غیر مسلم طلبا کے گارجین (Guardian) کے پس وپیش کو باہمی گفت وشنید سے رفع دفع کردیا جاتا ہے اور وہ خوشی خوشی بچے کا داخلہ کرادیتے ہیں۔ نورالہدیٰ اسکول سے میرا جذباتی لگاؤ ہے۔ اس کی انتظامیہ کا میں اعزازی رکن ہوں۔ راقم نے موقع بموقع اردو کی مختلف کلاسوں کا معائنہ کیا ہے اور غیر مسلم طلبا کو اردو میں آگے پایا ہے۔ اسکول کے پاس کئی ایکڑز مین ہے، خوب صورت اور کشادہ عمارت ہے، بچوں کا ہاسٹل بھی ہے۔ بہت کچھ بن چکا ہے باقی زیر تعمیر ہے اور یہ سارا کارنامہ فتح پور کے ایک عظیم جلیل مولانا محمد شریف مظاہری نے انجام دیا ہے۔ دوسروں کو جانے دیجئے، ڈاکٹر مظفر حنفی جو خیر سے فتح پور ہسوہ کے ہیں وہ بھی نورالہدیٰ اسکول کا نام نہ جانتے ہوں گے۔ راقم نے علی گڑھ میں 19 سال مستقل قیام کیا ہے، دیکھا ہے کہ لوگ دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے موٹے شہروں سے آئے اور پڑھ لکھ کر، لکچرار، ریڈر اور پروفیسر بن گئے لیکن کبھی پلٹ کر اپنی بستی میں اردو کا حال معلوم نہ کیا۔ فتح پور کے محمود الرحمن (I.A.S) کئی برس مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے، فتح پور آتے جاتے رہے، قیام بھی کیا۔ مگر ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز (D.I.O.S.) سے بھی جھوٹے منہ یہ نہ پوچھا کہ بھئی جب ضلع کے بیش تر اسکولوں میں اردو کے مدرس تعینات ہیں تو پھر اردو پڑھائی کیوں نہیں جارہی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ موصوف کے رپورٹ طلب کرلینے سے ہی ضلع کے درجنوں پرائمری اسکولوں میں اردو کی تعلیم شروع ہوسکتی تھی۔ دہلی یا لکھنؤ کے اردو والے کچھ اس بے نیازی سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کالجوں، یونی ورسٹیوں اور اردو سے جڑے دوسرے مستند اداروں کے صاحبان اثر ونفوذ اپنی اپنی بستیوں میں اردو کی ابتدائی تعلیم کے لئے کارگر اقدام کرسکتے ہیں۔ اس کام میں پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔

غلام مرتضیٰ راہی، باٹی، فتح پور

■ مجھے اعتراف کرنے دیں کہ 'ادب ساز' کے پہلے شمارے سے ہی آپ ایک بہت بڑے چیلنج کے سامنے آچکے ہیں اور وہ چیلنج ہے خود ادب ساز۔ یہ معاملہ ہر اس تخلیق کار کے ساتھ پیش آتا ہے جب وہ کوئی شاہ کار تخلیق پیش کرتا ہے کہ اس سے خوب سے خوب تر کی امیدیں قائم ہوجاتی ہیں۔ اب ادب ساز کا مقابلہ خود ادب ساز سے ہے۔ خدا کرے کہ 2005 میں شب خون کے بند ہوجانے سے جو خلا قائم ہوا ہے 2006 میں ادب ساز کے وجود میں آنے سے وہ پُر ہوجائے۔ (صرف اس کے راستے میں ایک چیز رکاوٹ پیدا کرسکتی ہے وہ ہے اس کی قیمت)

سید محمد اشرف پر گوشہ 'سوغات' کی یاد دلاتا ہے سید محمد اشرف کی کہانیاں بظاہر سیدھے ڈھنگ سے بیان ہوتی ہیں جن کا تعلق realist فکشن سے ہے جہاں ہمیں آخر تک یہ پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسے لکھ بھی رہا ہے۔ جیسے کہانی خود بخود زمین سے اگ آئی ہو۔ ان کے ہر افسانے کے مطالعے کے بعد ان کے کھو جانے کا ملال ہوتا ہے جب کہ اردو میں فکشن کے زیادہ تر قلم کار الہ دین کے جن کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔ جو شخص 'نمبردار کا نیلا' جیسا ناول لکھ سکتا ہے 'تلاش رنگ رائیگاں' جیسے ناولٹ کی تخلیق کرسکتا ہے 'لکڑ بھگا' سیریز سے لے کر 'رنگ' تک افسانوں کے قوس قزح بکھیر سکتا ہے اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔ میں انہیں قلم کار کی بجائے ایک ساحر سمجھتا ہوں اور اکثر ان کی تخلیقات پڑھنے کے بعد خوف زدہ رہتا ہوں کہ سید محمد اشرف کہیں صدیق عالم کے لاشعور میں نہ بس جائے۔ میں ان کو اس سے بڑا خراج تحسین نہیں پیش کرسکتا کہ ان سے اپنا فاصلہ قائم رکھوں۔

صدیق عالم، کولکاتہ

■ 'ادب ساز' ملا۔ اعلیٰ درجے کا شاہکار ہے۔ آپ نے واقعی بہت مشکل اور بڑا کام انجام دیا ہے۔ مودود صدیقی جیسی فعال شخصیت 'ادب ساز' کی پذیرائی اور فروغ واستحکام میں یقیناً کارساز ثابت ہوگی۔ 'انشا' کے آئندہ شمارے میں اس کا اشتہار شامل کرلیا جائے گا۔ ایک بار پھر مبارک باد!

ف س اعجاز، کولکاتہ

■ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اردو میں سہ ماہی 'ادب ساز' کا اجرا کررہے ہیں اور آپ اسے جیسا کہ آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے ایک یادگار اور متنوع رسالہ بنانے کا قصد کررہے ہیں۔ آپ کے ارادے تو نیک ہیں ہی لیکن عملی طور پر کن حوصلہ شکن مراحل سے گزرنا ہوگا اس کا اندازہ آپ نے کرلیا ہوگا۔ خدا آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔

پروفیسر حامدی کاشمیری، شالیمار، سری نگر

■ مجھے 'ادب ساز' کے لائق سمجھ کر آپ نے میری عزت افزائی کی ہے۔ شب خون جیسے رسالے کی فی الوقت بہت ضرورت ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ 'ادب ساز' 'شب خون' کا متبادل ثابت ہوجائے اور ان حضرات کو اظہار کا موقعہ اور ذریعہ مل جائے جو شب خون سے وابستہ تھے۔

شفق سوپوری، قمسی باغ، سری نگر

■ گزشتہ ماہ میری طبیعت خراب تھی اور میں AIIMS میں داخل تھا۔ اسی درمیان محترم مودود صاحب نے 'ادب ساز' کا اولین شمارہ لا کر دیا۔ دل خوش ہو گیا۔ فراغت تھی اس لئے سب کچھ پڑھ گیا۔ سارے مشمولات معیاری ہیں۔ رسالہ آپ نے بہت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ دلی مبارک باد۔ گوشے بھی دونوں ہی سیر حاصل ہیں۔ حمایت علی شاعر کی بڑی حیثیت ہے۔ مگر نوجوان افسانہ نگار سید محمد اشرف بھی کمال کے فن کار ہیں۔ میں ان کے افسانوں کا عاشق ہوں۔ زیر تحریر ناول کا حالاں کہ آپ نے ایک ہی باب شائع کیا ہے مگر یہ اپنی جگہ سیر حاصل اور بھرپور ہے۔ اگرچہ مجھے آپ کے رسالے کی اشاعت کا علم نہیں تھا مگر آپ نے میرا ایک مضمون شامل کرکے مجھ حقیر فقیر کو یہ اعزاز دیا اس کے لئے میں بے حد شکر گزار ہوں۔ ایک ڈرافٹ ارسال کررہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے...

ڈاکٹر رضوان احمد، باقی پور، پٹنہ

■ میں ایک ماہ سے لندن میں تھا آج ہی واپس آیا ہوں۔ خالد محمود صاحب سے بھی آپ کا بے حد ذکر رہا۔ میں آپ کے انشائیوں کا شیدا رہا ہوں۔ مجتبیٰ حسین کے بعد اب کوئی اس میدان میں نہیں ہے۔ ادب ساز پر تبصرہ ہماری زبان میں دیکھا یقیناً پرچہ اپنے نام کی طرح ہوگا۔ 'انتساب' کو آپ نے اپنی تخلیقات کے آج تک محروم رکھا۔ میرے لئے جو کام ہو ضرور تحریر فرمائیں۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی، سرونج، مدھیہ پردیش

■ 'ادب ساز' کی عنایت کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں، خدا نظر بد سے بچائے طبیعت خوش ہوگئی۔ نئے پرانے چراغوں سے پوری محفل جگمگا رہی ہے۔ ہر گوشہ ایک سوغات ہے اور ہر باب بصیرت افروز دکھائی دے رہا ہے۔ مبارک ہو۔ خدا آپ کی محنتیں بارآور کرے اور رسالہ ادب سازیوں کی معراج کو پہنچے یہ میری دلی دعا ہے۔

بلقیس ظفیر الحسن، روہنی دہلی

■ آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔ 424 صفحے کا پہلا شمارہ زبردست ہے، بہت ہی معیاری ہے، تخلیقات

میں تنوع ہے اور لفظ لفظ میں آپ کی ادارت کی خوشبو ہے۔ پہلے ہی شمارے سے آپ نے بہتوں کو بونا کر دیا ہے۔ اس شمارہ کو ڈرائنگ روم میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ میں اس شمارہ پر تفصیلی تبصرہ 'رنگ و بو' حیدرآباد میں اپنے کالم 'میرا مطالعہ' میں کروں گا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگل پور یونی ورسٹی، بھاگل پور

■ 'ادب ساز' زیر مطالعہ ہے۔ اس قیمتی شمارے کے لئے آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

شاعر اور شب خون کے نام انتساب کر کے آپ نے ان رسائل کی خدمات کا حق ادا کر دیا ہے۔ دوسرے تخلیق کی بجائے تخلیق کار کو اہمیت دے کر بھی آپ نے ایک نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ میری تخلیق شامل کی، شکریہ، شکریہ!

بانو سرتاج، چندرپور

■ 'ادب ساز' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے سکون مل رہا ہے۔ آپ کی محنت قابل تعریف ہے۔

بانو سرتاج، چندرپور

■ 'ادب ساز' کا پہلا شمارہ اپریل جون 2006 اپنی آب و تاب اور آپ کی محبت کے ساتھ مجھے مل گیا۔ آپ نے جس طرح کا اعلان کیا تھا پرچہ اس سے کہیں بہتر اور معیاری طور پر سامنے آیا ہے۔ اس قدر معیاری دل کش اور صاف ستھرے پرچے کی کامیاب اشاعت پر میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔ میں اسے ابھی پوری طرح پڑھ ہی نہیں پایا ہوں اور آپ کا تحریری خط مجھے ملا ہے کہ میں اپنی کچھ چیزیں جلد ارسال کروں کہ پرچہ جولائی 2006 میں ہی چھپ کر اپنے پڑھنے والوں کو مل جائے گا۔ یہ جوش یہ ولولہ قابل تحسین ہے۔ امرتا پریتم کو خراج عقیدت پیش کر کے آپ نے ایک ادب دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ امرتا پریتم ایک بڑی قد آور شخصیت رہی ہیں۔ ظفر اقبال نے اپنے ایک مضمون میں، جو 'شب خون' کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا، ایک بڑی خوب صورت بات یہ کہی تھی کہ جب تک کوئی ادیب ادب کو اوڑھنا بچھونا نہیں بنا لیتا ادب سے کبھی کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے امروز کا مضمون "عمر بھر ایک ملاقات چلی آتی ہے" پڑھا۔ یہی احساس ہوا کہ امرتا پریتم ادب ہی ادب تھیں۔ ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، ہنسا رونا، لکھنا پڑھنا، بات کرنا، ملنا جلنا سب کچھ بس ادب ہی ادب تھا اور وہی سب باتیں امروز نے اپنے مضمون میں قلم بند کی ہیں۔ اسما سلیم کا مضمون بھی دل کی گہرائیوں کو چھو کر گذرتا ہے۔ میرا خیال ہے جس طرح امروز نے امرتا پریتم کو ٹوٹ کر چاہا ہے وہ عشق کی انتہا ہے۔ اسی کو پیار کہتے ہیں۔ امرتا پریتم نے ساحر کو بھی بہت ٹوٹ کے چاہا مگر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ساحر کے عشق میں امروز کے عشق جیسی شدت نہیں تھی۔ ان کی کہانی 'جنگلی بوٹی' کی انگوری بھی ایسے ہی کسی عشق کی معصوم داستان ہے امرتا پریتم ہمارے ساتھ نہیں ہے مگر وہ ہمیشہ ہر محبت کرنے والے کے ساتھ نظر آئیں گی۔

گوپی چند نارنگ صاحب کے ساتھ آپ کی گفتگو نے بہت متاثر کیا۔ آپ کے پوچھے گئے سات سوالوں نے پچھلے چالیس پینتالیس سالوں سے ہو رہی ادبی گفتگو کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ مضمون پڑھتے وقت مجھے اپنا ایک شعر برابر یاد آتا رہا:

کل کسی اور جزیرے پہ اترنا ہے مجھے
وقت کے ساتوں سمندر سے گزرنا ہے مجھے

اور یہی ساری کیفیت گوپی چند نارنگ صاحب کے جوابوں میں نظر آئی مجھے۔ اس گفتگو نے اتنی کے بعد اور ساٹھ سے پہلے کے لکھنے والوں کے ذہنوں میں رہنے والی پریشانیوں کو بہت حد تک دور کر دیا ہوگا۔ کیوں کہ "پہلے دشمن باہری طاقت تھی اب دشمن ہمارے اندر چھپا ہوا ہے" اور اندر کے دشمن پر قابو پانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنے دشمنوں پر قابو پا لیا ہے۔ کیا خوب صورت بات انہوں نے آپ کے پہلے ہی سوال کے جواب میں کہی ہے۔ "ادب انسانیت کی آواز ہے۔ اس لئے ادب کے بنیادی تقاضے تو وہی رہتے ہیں۔ یعنی زندگی کی بصیرت۔ زندگی کے دکھ درد اور نشاط کے جملہ رنگوں کی قوس قزح جمالیاتی اثر کے ساتھ جو دل و دماغ کو متاثر کرے اور پڑھنے والوں کو داخلی طور پر بدل دے" اسی طرح کی اور بھی بہت پیاری پیاری باتیں انھوں نے کہی ہیں جو دل کو لگتی چلی جاتی ہیں۔ حمایت علی شاعر اور سید محمد اشرف پر خصوصی مطالعہ کے طور پر یک جا کی گئی چیزیں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ یہ گوشے ان حضرات کے ادبی مقام کو متعین کرنے میں بڑا اہم رول ادا کریں گے۔ ابھی بہت کچھ چیزیں پڑھنا باقی ہیں اس لئے ابھی بہت کچھ اور لکھا جانا بھی باقی ہے۔

شاہد عزیز، اودے پور

■ حصہ غزل پڑھا تو اور باتیں آپ کو لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ غزلوں میں کچھ غزلیں تو بہت ہی خوب ہیں اور کچھ کا معیار ایسا نہیں ہے کہ انہیں اس قدر معیاری پرچے میں شامل کیا جانا چاہئے تھا۔ نظموں میں بھی کچھ نظمیں ایسی ہیں کہ وہ نہ ہوتیں تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اکثر اپنے خطوں میں لکھتا رہا ہوں کہ جب تک اپنی تخلیق میں صحیح لفظوں کا استعمال نہیں ہوگا کوئی تخلیق اپنے قاری کو متاثر نہیں کر پائے گی اس لئے لفظوں کا صحیح استعمال بہت ضروری ہے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثر لوگوں سے چوک ہو جاتی ہے۔ یہ احساس مجھے امجد اسلام امجد کی غزل پڑھتے وقت ہوا۔ امجد اسلام امجد کی پہلی غزل میں مطلع:

ہوا ہی لو کو گھٹاتی، وہی بڑھاتی ہے
یہ بکس گمان میں دنیا دیے جلاتی ہے

کا پہلا مصرعہ شاید یوں ہونا چاہئے تھا۔ "ہوا ہی لو کو گھٹاتی ہے اور بڑھاتی ہے" تیسرے شعر:

عجیب خوف کا گنبد ہے میرے چاروں طرف
مری صدا مرے کانوں میں لوٹ آتی ہے

میں اس طرح کی بات ہونی چاہئے تھی کہ "صدا ٹکرا کے لوٹ آتی ہے" مگر اس شعر میں "صدا" کے ٹکرانے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں خوف کا گنبد ایک ہی ہے جو کسی کے چاروں طرف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دوسری غزل کے تیسرے شعر:

عجب نہیں ابھی دار و رسن میں پھول کھلیں
کوئی بہار کا قاصد ادھر جو آنکلے

میں 'دار و رسن' پر پھول کھلنے والی بات سمجھ میں نہیں آتی اگر ان کی مراد سروں سے ہے تو پھر 'قاصد' کے آنے کا کیا جواز ہے۔ ادھر آنے والا تو کوئی 'جلاد' ہونا چاہئے تھا۔

شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ظفر اقبال کو علامہ محمد اقبال کے بعد بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر کہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ فاروقی صاحب نے ایک نظم نگار سے کسی غزل کے شاعر کو بڑا کیوں کہا ہے ہاں مگر مجھے یہ احساس ضرور ہوا ہے کہ غزل کو غالب کے بعد کہیں پناہ ملی ہے تو وہ ظفر اقبال کے یہاں ملی ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہے اس پر کسی قد آور ناقد کے بھرپور مضمون کی ضرورت ہے۔ میں تو یہاں 'ادب ساز' میں اشاعت پذیر غزلوں کے قافیوں پر کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

غزل میں استعمال ہونے والے قافیوں پر میں نے

ایک مختصر مضمون بھی لکھا ہے جو ابھی کہیں چھپ نہیں سکا ہے۔ کیوں کہ جو باتیں میں نے اپنے مضمون میں کہی ہیں وہ ابھی کسی کے گلے نہیں اتری ہیں۔ اس کی کچھ باتیں 'شب خون' کے آخری شمارے 293 تا 299 میں شامل میرے ایک خط میں ہیں جس میں میں نے 'ہم وزن اور ہم صدا' قافیوں پر لکھا ہے کہ غزل میں استعمال ہونے والے قافیے 'ہم وزن اور ہم صدا' ہونے چاہئیں اور اپنی بات کی دلیل میں میں نے فانی بدایونی کی بات کی طرف اشارہ کیا تھا جو انہوں نے میکش اکبرآبادی کی غزل میں استعمال شدہ قافیوں پر اعتراض کرتے ہوئے کہی تھی۔ (میکش اکبرآبادی کی کتاب 'آگرہ اور آگرہ والے') اس پر شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اسی شمارے 293-299 میں تحریر فرمایا ہے: ''قافیے کے جو اصول جناب شاہد عزیز نے بیان فرمائے ہیں وہ دل چسپ تو ہیں لیکن کلاسیکی علم قافیہ پر مبنی نہیں ہیں'' یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی بات کو اس لئے نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے کہ وہ کلاسیکی علم پر مبنی نہیں ہے۔ ظفر اقبال نے بھی ان شائع شدہ غزلوں میں اسی طرح کے قافیے استعمال کئے ہیں جو 'ہم وزن اور ہم صدا' نہیں ہیں۔ یہ قافیے کلاسیکی علم کے اعتبار سے غلط نہیں ہیں مگر میری تھیوری اور فانی صاحب کے خیال کے مطابق ٹھیک نہیں ہے۔ مثلاً 'ہی' اور 'کافی' ٹھیک اسی طرح ہیں جس طرح میکش اکبرآبادی نے 'دیکھنا اور جانا' پر اعتراض کیا تھا۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ غزل میں 'ہم وزن اور ہم صدا' قافیوں کا ہی استعمال ہو جو قاری کی سماعت اور بصارت پہ گراں نہ گزریں۔ جیسے کھڑکی غنیمت ہے، تو دوسرے مصرعے میں لڑکی غنیمت ہے، ہی ہونا چاہئے۔ یہ 'ہم وزن اور ہم صدا' ہے قافیے ہوتے ہیں۔ اب ان کے ساتھ آپ استعمال کر رہے ہیں مستی، پسپائی، کافی، ویسی، معنی، آدھی، دوسری غزل میں لیا، دنیا، صحرا، جانا، بے جا، سارا، جانا، ٹکڑا، چہرا، رستہ، تیسری غزل میں مکان کے ساتھ تھکان ہونا چاہئے مگر قافیے ہیں۔ مکان، آسمان، دھیان، آن بان، سائبان، داستان، مہربان، بیان، بادبان اور دکان۔ میں چاہتا ہوں کہ غزل میں 'ہم وزن اور ہم صدا' قافیے ہی استعمال ہوں۔ مثلاً لینا دینا، چہرہ پہرہ، مکان تھکان، اور یہ کام بھی ظفر اقبال ہی کر سکتے ہیں۔

ابراہیم اشک کی غزل میں جب یہ شعر 'ایک جیسے تھے فرشتے سارے / کوئی اچھا نہ برا تھا پہلے'' تو مجھے اپنی غزل کا یہ شعر ''کوئی اچھا نہ برا تھا پہلے، آدمی کتنا بھلا تھا پہلے' یاد آیا جو دو تین سال پہلے چھپ چکی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ابراہیم اشک نے میری غزل پڑھی ہوگی کیوں کہ اکثر لوگ رسالوں میں چھپنے والی تمام تخلیق نہیں پڑھتے مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فرشتے تو ہمیشہ فرشتے ہی رہتے ہیں ان میں کوئی بھلا، برا نہیں ہوتا۔ مگر آدمی جو آج اتنا خوار ہے وہ اتنا ذلیل شاید پہلے نہیں تھا۔ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کون سا شعر بہتر ہے۔ ابھی بہت کچھ اور پڑھنا باقی ہے۔ آپ کے رسالے میں ایسا بہت کچھ ہے، جس پر بہت کچھ لکھنے کو من کرتا ہے۔

شاہد عزیز، اودے پور

■ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی جانب سے بنگلور میں 20 اگست کو ایک روزہ سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا۔ عنوان تھا 'اردو کے موجودہ ادب کی صورت حال' دہلی سے صلاح الدین پرویز صاحب تشریف لائے تھے بقیہ کرناٹک کے منتخب شعرا و ادبا (دس عدد) تھے، خاکسار بھی اس میں مدعو تھا، سمپوزیم بہت اچھا رہا۔ میں نے اپنی تقریر میں کلاسیکل ادب، رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور بعد از مابعد جدیدیت پر بحث کے بعد موجودہ دور کے اردو رسائل کی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے 'ادب ساز' کا بھی تذکرہ کیا، اور کہا کہ شب خون کے بند ہونے کے بعد اب دوبارہ رسائل کے قارئین کی نظریں شعر و حکمت، استعارہ، اور دہلی کی سرزمین سے ابھرنے والے 'ادب ساز' پر لگی رہیں گی جس نے اپنے پہلے ہی شمارے سے سنجیدہ قارئین کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے۔

سلیمان خمار، بیجاپور

■ 'ادب ساز' کے مشمولات وقیع ہیں۔ حمایت علی شاعر کی شاعری اور سید محمد اشرف کی افسانہ نگاری پر خصوصی گوشے ریسرچ کے طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہوں گے۔ آپ نے یہ اقدام بھی اچھا کیا ہے کہ فنون لطیفہ سے متعلق بھی گفتگو شامل کی ہے۔ تھیٹر، فلم، موسیقی، مصوری کے بارے میں مضامین اردو کے کم ہی ادبی رسالوں میں ملے ہیں۔ چونکہ شعر و ادب بہترین فن ہے، اس لئے اس سے فروتر فنون کی طرف ادب کے متعلقین کی توجہ نہیں جاتی۔ حالانکہ دوسرے فنون کے رویوں کی واقفیت سے ادب کو فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔

'ادب ساز' کی اٹھان میں آپ کی پہلی نظر جس موضوع کی طرف گئی ہے وہ بہت بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اور وہ ہے 'تہذیبی مکالمہ اور تصادم' انیسہ علوی، منظور عالم، ظہور محمد خاں اور فرحت احساس کے مضمونوں کو جو مشرق و مغرب کی تہذیبی کارگزاریوں اور جدید عالمی معاشرتی تقاضوں پر مبنی ہیں، آپ نے اس رسالہ کی ابتدا ہی میں رکھ کر کچھ ایسا تاثر قائم کیا ہے کہ ادب سازی میں حسن تہذیب اساسی اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تہذیبوں میں اس وقت تصادم کی جو کیفیت ہے اس سے ادبی سرگرمیاں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ ہمارا دانش ور طبقہ ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔ مغرب کا آزاد کھلا پن ہو یا مشرق کی مستور معاشرت جب تک ہم اپنے شعور تمدن کو بالیدہ اور خوش گوار نہیں بنائیں گے ہم ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ آپ نے پروفیسر گوپی چند نارنگ سے جو سات سوال پوچھے ہیں ان میں مذکورہ بالا مسئلے کے پیش نظر پہلا، تیسرا اور پانچواں سوال بہت اہم ہے۔

اگر پروفیسر نارنگ ''بین الاقوامی زبانوں کے ادبی رجحانات'' کے پس منظر میں عالمی اور اردو ادبی تہذیب اور ہندوستان کی 'علاقائی زبانوں میں ادبی سطح پر اختلاط' کے امکانات کی روشنی میں اردو کی مشترکہ ادبی تہذیب پر اظہار خیال کرتے تو ادب میں تہذیبی روابط کی نوعیت کچھ ظاہر ہو سکتی تھی۔ لیکن انہوں نے بس سامنے کی کچھ سرسری باتیں بیان کر دی ہیں انہوں نے ''اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب کے نئے تقاضے'' (آپ کے پہلے سوال کا موضوع) پر تہذیبوں کی آویزش کے نقطہ نظر سے کچھ نہیں کہا ہے حالانکہ ان کے پیش نظر جب ترقی پسند تحریک اور جدیدیت ہمیشہ رہتی ہے، تو ضروری تہذیبی مکالمہ بھی ان کا مرکز فکر رہتا ہوگا۔ لیکن وہ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کو جس طرح ''اردو ادب کے قافلے کا گرد راہ'' بتاتے ہیں اس سے قاری مشکوک ہو جاتا ہے۔ خیر میں اس خط میں زیادہ گفتگو نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر منصور عالم، مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

■ 'ادب ساز' جیسے عہد ساز رسالے کی اشاعت پر دلی مبارکباد۔ یہ رسالہ بجا طور پر عالمی جریدہ کہلانے کا مستحق ہے۔ شمارہ نمبر 1 بھائی صاحب (محترم حسین الحق) کے توسط سے نظر نواز ہوا اور جی بھر کر پڑھا۔ ساری مشمولات منتخب اور پسندیدہ ہیں اور ان میں رسالے کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ انتساب دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ 'شب خون' کا بند ہونا ہم سبھوں کے لئے بڑا غم انگیز رہا۔ اس نے جو کام کئے وہ بس اسی کا حصہ ہے۔ شاعر بھی اپنے

انداز میں ایک عرصہ دراز سے ادب کی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہمیں امید ہونی چاہئے کہ اب 'ادب ساز' علم و ادب اور فکر وفن کی راہوں میں نئے چراغ جلائے گا۔

شمارے کا آغاز تہذیبی مکالمہ اور تصادم سے ہوتا ہے جو واقعی آج کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ تمام شرکا نے فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ پوری دنیا میں جیسی بھیانک تہذیبی جنگ جاری ہے اور استعماری طاقتیں جس طرح تمام اصول ونظریات کو بالائے طاق رکھ کر اور جھوٹی دہشت گردی کو جواز بنا کر بڑی دہشت گردی کررہی ہیں اور پوری دنیا میں فاشزم پھیلا رہی ہیں وہ بڑا المیہ/نظریہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب وفن اس عالمی منظرنامے سے الگ نہیں رہ سکتے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک بار پھر ادب کو وسیع تر عالمی تناظر میں سامنے آنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ضرورت اس کی بھی ہے کہ بین المذاہب مکالمے کی صورت نکالتے ہوئے معاملات کو مثبت مذہبی یا اسلامی تناظر میں دیکھا جائے اور گمراہ کن مذہبی رویوں کی بھی تردید اور نفی کی جائے۔ بلکہ اس کو مزید واضح کردوں کہ وہ رویے جو دراصل مذہب کا اصل الاصول نہیں ہیں، بلکہ پیروکاروں نے غلط تشریحات کرکے صحیح وغلط کو خلط ملط کردیا ہے، اصل میں یہ سارا تصادم تہذیبی اور سیاسی ہے جس کا تعلق اقتدار بلکہ غلبہ واستحصال ہے۔

گوپی چند نارنگ صاحب سے آپ کی گفتگو بے حد عالمانہ اور فکرمندانہ ہے۔ آپ کے سوالات اور پروفیسر نارنگ کے جوابات اردو کے تعلق سے نہایت اہم اور دوررس ہیں۔ خصوصی مکالمے بہت محنت سے پیش کئے گئے ہیں۔ شاعر اور فکشن نگار دونوں کے فن وشخصیت کو کھول کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً سید محمد اشرف پر لکھے گئے تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ حمایت علی شاعر پر پروفیسر قمر رئیس صاحب کا مقالہ ان کی مخصوص علمی اور تنقیدی بصیرت کا حامل ہے۔ دیگر شعری اور نثری شمولات کا بھی کیا کہنا۔ آپ نے پوری طرح آج کا نمائندہ ادب پیش کردیا ہے۔ پہلے ہی شمارے میں اس طرح دل خوش کن امکانات کی مہک۔ مبارکباد، بہت بہت مبارکباد۔

ڈاکٹر علیم تابش ،مرزا غالب کالج، گیا

■ اردو ادب کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ آج کا ادیب خود ہی مدیر، خود ہی ڈسٹری بیوٹر بلکہ خود ہی ڈسپیچر بھی ہے۔ اور ہم کربھی کیا سکتے ہیں۔ ایڈ شاٹ کا اپنا رسالہ 'آسمان' ابھی تک جوش کی بجائے ہوش تلے دبا ہوا ہے۔ اب آپ نے ہمت کرہی ڈالی تو ہمیں بھی حوصلہ مل رہا ہے۔

اطہر عزیز، ممبئی

■ آپ ادب سازی میں مصروف ہیں۔ میں بذریعہ 'آسمان' (بہت جلد آپ کو روانہ کیا جارہا ہے) ادب تلاش میں غرق۔ ہم لوگوں کے مسائل، ہم لوگوں کی ادبی میراث مشترک ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے درد کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے سردست یہ مختصر سا تعاون حاضر ہے۔

قلمی تعاون کا تو اس وقت آپ کے پاس ڈھیر لگ چکا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ:

صرف ناشر نہیں ہوں میں اطہر
ایک شاعر بھی مجھ میں رہتا ہے

مگر اس وقت میں آپ کو (رسالہ کو) مالی طور پر مستحکم دیکھنا چاہتا ہوں۔ قلمی تعاون کے لئے ابھی وقت پڑا ہے۔ اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ آپ کا رسالہ جاری وساری رہے بس یہی دعا ہے۔

برادرم مودود صدیقی صاحب آپ کے ساتھ ہیں انشاءاللہ آپ کا صحافتی سفر آسان ہوجائے گا۔ اپنے مشترکہ دوست حیات لکھنوی کے انتقال کی خبر سن کے بے حد افسوس ہوا۔ 1980 میں 'قومی آواز' دہلی سے وابستگی کے دوران ان کا بڑا ساتھ رہا۔ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ آمین!

اطہر عزیز، ممبئی

■ اس دور میں جب کہ رسائل ایک ایک ورق اور ایک ایک سطر کی قیمت قلم کاروں سے وصول رہے ہیں ان میں نام نہاد اور شاعر جیسے رسالے بھی ہیں جو گوشوں اور نمبروں سے خوب خوب کمارہے ہیں حتیٰ کہ معمولی سے اشتہار کی بھی بھرپور قیمت وصول کررہے ہیں۔ آپ نے 'ادب ساز' اشتہارات کی پرواکئے بغیر اور مالی امداد طلب کئے بغیر ہندوستانی قارئین کو عہد ساز رجحان ساز اور تاریخ ساز رسالہ دیا ہے۔ نقوش، اوراق، فنون کی طرز پر ایشیا کا یہ چوتھا رسالہ ہے جو اعلیٰ معیاری تخلیقات سے لبریز ہے انتخاب وترتیب کی داد ہر ذہین قاری آپ کو دے گا۔ سید محمد اشرف اور حمایت علی شاعر کو یہ زبردست خراج تحسین ہے۔ سید محمد اشرف صاحب جتنے بڑے فکشن نگار ہیں اتنے ہی نفیس انسان ہیں۔ ان کے فن وشخصیت پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ تمام ہی نثر ونظم کے مندرجات اہم اور قابل مطالعہ ہیں۔

رئیس الدین رئیس، علی گڑھ

■ پرچہ آپ نے اتنا معیاری نکالا ہے کہ دیکھ کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ ابھی پڑھ رہا ہوں اور ختم کرنے میں وقت تو لگے گا ہی کہ آپ نے مواد ہی اتنا ڈھیر سارا اکٹھا کررکھا ہے۔ حمایت علی شاعر اور سید محمد اشرف پر گوشے خوب ہیں۔ ان دونوں towering personalities کا جو حق ہے وہ آپ نے ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سید محمد اشرف کئی دہائیوں سے لکھ رہے ہیں اور بہت خوب لکھ رہے ہیں میرے پسندیدہ افسانہ نگار بھی ہیں وہ۔ مبارکباد انہیں نہیں بلکہ اس کے مستحق آپ ہیں۔ منظوم حصے میں ابھی غزلیں ہی پڑھی ہے اور نشتر خانقاہی، شجاع خاور، ظفر اقبال، ظہیر غازی پوری، فرحت احساس، رؤف خیر کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ لیکن مظفر حنفی (جن کا میں ہمیشہ مداح رہا ہوں) کی غزلیں تو کمال کی ہیں۔ ان کے کلام کی تازگی ہمیشہ متحیر کرتی ہے۔ لیکن، میرے ناقص خیال میں نشتر خانقاہی مرحوم کی حمد پورے پرچے کی جان ہے۔ واہ صاحب کیا حمد ہے کہ دل میں نشتر کی طرح اتر جاتی ہے۔ خدا کرے یہی حمد ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائے اور وہ جنت الفردوس میں ہی جگہ پائیں۔

شکیل اختر، بھونیشور، اڑیسہ

■ قابل مبارکباد ہے آپ کا ادارہ کہ ان نامساعد حالات میں قارئین کے لئے 'ادب ساز' جیسا رسالہ جاری کیا۔ رسالہ کا نام ہی اس کا تعارف ہے۔ ادب نواز قارئین کے لئے 'ادب ساز' ایک تاریخ ساز رسالہ ہے۔ یہ صرف رسالہ نہیں بلکہ انسائکلو پیڈیا ہے۔ آپ تمام حضرات کی محنت اور کاوشوں کا ثمر ہمارے سامنے ہے۔ اس بہترین اردو کی خدمت کے لئے آپ تمام حضرات کو اللہ جزائے خیر دے۔ (آمین)

آپ نے جس قدر جلد ہماری خواہش کی تکمیل کی اس کے لئے ہمارا ادارہ آپ کا ممنون ہے۔ نہ صرف آپ نے رسالہ روانہ کیا بلکہ لائبریری ایڈیشن دیا، شکریہ۔ انشاءاللہ آگے بھی آپ سے مراسلت رہے گی۔

(آمدہ روپے -/350 اور ڈاک خرچ روپے -/25 اس طرح کل روپے -/375 منی آرڈر کردیا کریں گے)

سیدہ واحدہ
لائبریرین، اینگلو اردو گرلز ہائی اسکول، پونے

اس خط سے رقوم کا حساب کتاب اس لئے حذف نہیں کیا گیا ہے (بلکہ خط بھی اسی لئے شامل کیا ہے) کہ قارئین کو علم ہی اسی سوسائٹی پونے کے اینگلو اردو گرلز ہائی اسکول اور عابدہ انعامدار جونیئر کالج فار گرلز

کے انتظامیہ کی اس سنجیدگی سے متعارف کرایا جائے جس کا مظاہرہ اس نے ایک دانکل نئے اردو جریدے کے سلسلے میں کیا ہے۔ ہم نے ملک کی تقریباً پچاس لائبریریوں کو ادب ساز کا تعارف نامہ بھیجا تھا۔ ان میں سے صرف دو سرکاری لائبریریوں خدا بخش اور نیشنل لائبریری اور رام پور رضا لائبریری نے ہمیں جواب بھیجا اور ایک ایک کاپی منگائی جس کی قیمت بعد میں چیک سے ادا کر دی گئی۔ باقی کسی سرکاری یا غیر سرکاری لائبریری کی طرف سے جواب نہیں آیا۔ اس کے برعکس پونے کے اسکول کے انتظامیہ نے نہ جانے کہاں ادب ساز کے بارے میں پڑھ کر ہمیں سیدھے تین سو روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیا۔ اس جذبے کی قدر کرتے ہوئے پیپر بیک کی بجائے تحفتاً مجلد شمارہ (قیمت 350 روپے) بھیج دیا گیا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا اظہار تشکر تھا لیکن اردو رسائل کے مسائل وناکافی وسائل سے واقف اسکول یہ بوجھ بھی ہم پر ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس محبت کے آگے ہم سر جھکاتے ہیں۔

بات اردو سے محبت کی آ ہی گئی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ ہندوستان کی سب سے بڑے بجٹ والی دہلی اردو اکادمی کی سنجیدگی کا کیا حال ہے۔ ہم نے اردو میڈیم سینئر سیکنڈری اسکولوں اور دہلی کی دوسری لائبریریوں کے لئے اردو رسائل اور کتابیں خریدنے کی اس اکادمی کی اسکیم کے تحت ادب ساز کی خریداری کی درخواست پیش کی تو اکادمی کے لائق سکریٹری جناب سید مرغوب حیدر عابدی کا جواب یہ تھا کہ آپ کا جریدہ بہت معیاری اور یونی ورسٹی کے طلبا کے مطلب کا ہے گیارہویں بارہویں کے بچے بھلا اسے کیا سمجھ پائیں گے۔ ظاہر ہے اکادمی سے ہمیں کیا مدد مل سکتی تھی۔ ایسے لائق سکریٹری کی سمجھ کے آگے بھی ہم سر جھکاتے ہیں۔ ادارہ

■ ویسے تو آپ خود ادب ساز کی زبان پر خاص توجہ دے رہے ہیں پھر بھی نظموں میں استعمال چند الفاظ کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مثلاً: گزر۔ پانو۔ پتا (جو کسی اور طرح لکھے گئے ہیں) براہ مہربانی یہی املا کتابت کرائیں۔

مشرف خطیب، بکاباغ، سہارن پور

■ پہلی بار کوئی جریدہ الٹا پڑھنے پر مجبور ہوا کیوں کہ اداریہ آپ نے بالکل آخری صفحہ پر صفحہ نمبر 424 پر تحریر کیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اداریہ کو شروع میں ہونا چاہئے کیوں کہ اداریہ کے ذریعہ شامل جریدہ مضامین وغیرہ پر اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ قاری اسے پڑھنے کے لئے مچل جائے اور جس طرح آپ نے پہلے شمارے میں اداریہ کو آخری صفحہ میں تحریر کیا ہے اگر آپ چاہیں تو اس صفحہ پر اداریہ کے بجائے اختتامیہ کے عنوان سے مجملاً تمام مشمولات کا نچوڑ پیش کر سکتے ہیں لیکن اداریہ کو شروع ہی میں رہنے دیں کیوں کہ یہ کسی بھی جریدہ یا رسالے کا تاج ہوا کرتا ہے۔

آپ نے صفحہ نمبر 5 صفحہ نمبر 39 اور صفحہ نمبر 243 میں ہائے ہوز کے بجائے نہایت ہی فراخ دلی سے دو چشمی (ھ) ہے کا استعمال کیا ہے۔ دیکھنے میں تو دو چشمی ہے خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس 'تھذیبی' لفظ کو توڑ کر پڑھیں تو کیا ہوگا۔ تھ+ذ+ی+ب+ی۔ اسی طرح پہلے کی جگہ آپ نے ''پھلے'' لکھا ہے اور پہلو کی جگہ ''پھلو'' آئندہ ایسی خوش نما لیکن غلط روایت سے گریز کریں کیونکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو غلط چھپی ہوئی چیز کو صحیح سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میرے ساتھ اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، سن لیجئے۔ اس وقت میں کلکتہ یونی ورسٹی میں ایم اے فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور میرے ہی علاقے کا ایک شخص مجھ سے ایک سال senior تھا۔ اس زمانے میں دہلی سے اسپورٹس کا اردو زبان میں واحد رسالہ 'اخبار نو جواں' کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس نے ایک شمارہ کے پہلے صفحہ پر لفظ 'تمغہ' کو 'تغمہ' پڑھا۔ میں نے ٹوکا کہ تغمہ نہیں بلکہ تمغہ ہے۔ اس پر اس کا کہنا تھا کہ یہ غلط چھپا ہے میں نے کسی اخبار میں تغمہ چھپا ہوا دیکھا ہے اس لئے صحیح تغمہ ہی ہے اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے میں نے لغت اور اخبار نو جوان کے مختلف رسائل سے لفظ تمغہ کو دکھایا پھر بھی وہ ماننے کو تیار نہیں۔ اب اگر کوئی ایسا شخص ہائے ہوز کے بجائے دو چشمی سے تحریر کردہ لفظ کو صحیح سمجھ کر ضد کرنے لگے اور کہے کہ میں نے کتاب میں دیکھا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ کسی ادبی جریدہ یا رسالہ کے ذریعہ غلط لفظ کی تشہیر ہوگی کہ نہیں؟

بہر حال۔ اس جریدہ میں جو نیا پن اور جدت مجھے نظر آئی وہ یہ ہے کہ جو بھی مضمون اور افسانے شامل ہیں ان کے آخر میں مضمون اور افسانہ نگار کی مناسبت سے چند کتابوں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ مزید مطالعہ کے خواہش مند ان کتابوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ دوسری دل خوش کن بات یہ ہے کہ آپ نے 'اس انجمن میں...' کے تحت قلم کاروں کے مختصر سوانحی کوائف اور تصانیف وغیرہ کے ذکر کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے طلبا وطالبات کے علاوہ تحقیق وتنقید کا کام کرنے والوں کے لئے بھی رسالہ اہم ثابت ہوگا۔ پہلے ہی جریدے میں دو دو گوشے اور یہ سلسلہ ہر جریدہ میں دیکھنے کو ملتا رہے گا۔ دیگر تخلیقات کا مطالعہ جاری ہے اسی لئے اس پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا بس سرسری طور پر جو چیزیں نظر میں آئیں میں نے ان پر تحریر کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رسالہ میں دن بدن نکھار اور جدت جاری رہے۔

محمد عمران قریشی، پرولیا، مغربی بنگال

اس سہو کی طرف توجہ دلانے کا شکریہ۔ آئندہ اردو سافٹ ویئر کے دو عربی فونٹ استعمال نہیں کئے جائیں گے جن میں ہائے ہوز نہیں ہے۔ بدقسمتی سے اردو سافٹ ویئرز کے بیشتر عربی فونٹس میں ہائے ہوز کی جگہ دو چشمی ہے (ھ) ٹائپ ہوتی ہے۔ اس خامی کا علم بھی عمران قریشی صاحب کے اس مراسلے کی بدولت ہی ہوا۔ نہ وہ ہمیں لکھتے نہ اس طرف ہمارا خیال جاتا اور نہ ہمیں سافٹ ویئر کے اس نقص کا پتہ چلتا۔ قارئین سے ہم ایسی ہی باریک بینی کے متمنی ہیں کیوں کہ ادب ساز کو اسی طرح بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ادارہ

■ 'نقوش' اور 'فنون' کی پیروی میں 'ادب ساز' کا اولین شمارہ خوب ہے۔ 'شب خون' اور 'شاعر' کے نام 'ادب ساز' کا انتساب لائق ستائش ہے۔ لیکن 'بیسویں صدی' بھی 78 برسوں سے اپنے نہج پر اردو زبان کی آبیاری کرتا آ رہا ہے۔ 'ادب ساز' کے آئندہ کسی شمارے میں اس کا بھی ایماندارانہ اعتراف ہونا چاہئے۔ آپ کی کشادہ دلی سے ایسی توقع بجا طور پر کی جا سکتی ہے۔ امر پریتم، حمایت علی شاعر، سید محمد اشرف پر گوشے سنجیدہ مطالعہ کے طلب گار ہیں۔ دیگر مشمولات سے بھی آپ کے حسن ادارت کی تصدیق ہوتی ہے۔ مبارک باد!

جعفر ساہنی، کلکتہ

■ 'ادب ساز' ملا۔ اتنا ضخیم رسالہ دیکھ کر مجھ پر دہشت طاری ہو گئی ہے۔ عرصہ دراز سے مجھے یہ فکر ستا رہی تھی کہ ہندی اردو ادب کی یلغار کا میں کس طرح مقابلہ کر پاؤں گا۔ ایک طرف میری ناتوانی ہے دوسری طرف ادب کی اس قدر طغیانی ہے۔ کاش! میں صرف قاری ہوتا۔ اپنے رسالے (تمثیل) کا مدیر نہ ہوتا۔

واپسی کے تمام راستے بند ہیں۔ بہر حال خدا جس حال میں رکھے۔ آپ نے کس قدر محنت کی ہوگی اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ واقعی رسالہ بھرپور ہے۔ گو میری ہمت چور ہے۔ یقین ہے اس میں کئی چیزیں میری دلچسپی اور کام کی ہوں گی۔ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ سرورق پر سید محمد اشرف کا رعونت بھرا چہرہ مجھے بھلا نہیں لگا۔ کہانی وہانی کا آپ مجھ سے کیا پوچھو ہو۔ اتنی بھیڑ میں کہیں میں کھو نہ جاؤں ایوں بھی میں مختصر آدمی ہوں۔ جہاں بھی رہتا ہوں

اکتایا ہوا رہتا ہوں۔

حسن جمال، جودھ پور

■ جریدہ واقعی آپ نے بڑی محنت سے اور خوب صورت نکالا ہے۔ خاص طور پر اسے 'شب خون' اور 'شاعر' کے نام کرکے ذی عقلمندی کا جو ثبوت دیا ہے وہ قابل مبارک باد ہے۔ ایک سلسلہ 'اس انجمن میں...' مختصر تعارفی حوالے کا شروع کیا ہے۔۔۔ بے حد پسند آیا۔ آج اس کی سخت ضرورت تھی۔ یہ نہ صرف قارئین کیلئے بلکہ ڈگری حاصل کرنے والے طالب علم کے لئے کافی مفید ثابت ہوگا۔

سعید۔ یاض، درا پور

■ آپ کے حکم کی تعمیل میں پانچ تازہ غزلیں مرسل خدمت ہیں ان کے متعلق اپنے تنقیدی تاثرات ضرور دیں گے۔

میں نے 8-7 سال کی مسلسل خاموشی کے بعد ادب سے دوبارہ اپنا رشتہ استوار کیا ہے افسوس کہ میرے فارم میں آتے ہی میرا محبوب رسالہ شب خون داغ مفارقت دے گیا۔ میری ذہنی تربیت میں شب خون کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مجھے اس نے ہمیشہ تخلیقی تحرک بخشا ہے۔ راشد طراز نے مونگیر سے شب خون کے ہی طرز پر 'آغاز' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا ہے۔ وہ شب خون جیسا تو نہیں مگر اس کی یاد ضرور دلاتا ہے۔ خدا کرے آپ کا جنون برقرار رہے۔ ادب ساز کے لئے نئے وسائل پیدا ہوں میں اس کی بقا کے لئے ہمیشہ دعا گو رہوں گا۔

خورشید طلب، بوکارو

■ 'ادب ساز' کی پہلی اشاعت پر ایک بار پھر مبارک باد۔ اس عہد میں پرچہ نکالنا آسان کام نہیں۔ اب دیکھئے کہ 'طلسمی صدا' کی بیشتر کاپیاں جن میں پاکستان کی 100 کاپیاں بھی شامل ہیں میں نے اعزازی بھجوائی ہیں جو گھر پھونک کر تماشا دیکھنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں ایسی رائے آپ کو ہرگز نہیں دوں گا۔ آئندہ 'ادب ساز' کے خریداروں میں اپنا نام میں بھی درج کراؤں گا۔

امتیاز احمد دانش، بہار

■ اردو ادب میں عالمی جریدہ 'ادب ساز' کا جو مختصر مگر جامع تعارف آپ نے اپنے مکتوب، محریہ 5 جون 2006 میں پیش فرمایا تھا، یہ پہلا شمارہ اپنے گٹ اپ مضامین کی وقعت وافادیت، حسن ترتیب وضخامت کے اعتبار سے اس سے ہزار گنا بڑھ کر نکلا۔ میری پر خلوص مبارک باد یں۔ دعائیں اور شمارہ اولین بطور تحفہ بھیجنے کا دلی شکریہ۔ لیکن نصرت بھائی! اسے خدارا مبالغہ نہ سمجھئے گا کہ پوسٹ مین کے ہاتھ سے پیکٹ پاکر جتنی مسرت ہوئی تھی وہ رسالے کو پڑھ کر کافور ہوگئی۔ آنکھیں اتنی کمزور ہو چکی ہیں کہ بمشکل محض سرخیاں ہی پڑھ سکا۔ اب (اگر کوئی ہم درد باذوق قاری مل سکا) تو انشا اللہ اس کے مشمولات کو پڑھوا کر سنوں گا۔ یہ خط بھی آپ کو بدقت تمام لکھ رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ اپنے دوسرے صاحب حیثیت باذوق احباب کو اس 'شان دار ادبی دستاویز' کی خریداری کی طرف متوجہ کرسکوں۔

پروفیسر سید مجاہد حسین حسینی، تھانے، مہاراشٹر

■ Email پر آپ سے Contact ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے 'ادب ساز' گھر پہنچ گیا۔ ڈیڈی کا گوشہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سید محمد اشرف صاحب غضب کے رائٹر ہیں۔ ان کی لکھی کہانیاں پڑھ کر اپنی حالات پر ترس آرہا تھا۔ خیر میں ابتدائی مراحل میں ہوں، یہ سوچ کر خود کو ڈھارس دیتا رہا۔ Huntington کی Clash of civilisation کے کچھ Chapters میری نظر سے بھی گزرے تھے۔ مضامین پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اپنے یہاں کے نقطہ نظر اپنی تہذیب کی روشنی میں۔ پھر اپنے مذہب کے اثرات تو بہت گہرے ہیں۔ خیر بہت دل چسپ اور بہت کچھ ہے۔ 'ادب ساز' اپنے outlook سے اپنے بہترین مستقبل کی prediction کررہا ہے۔ مجھے شامل کرتے ہوئے آپ کو ہچکچاہٹ تو نہیں ہوئی تھی نا؟ کہاں اس قدر اچھے رائٹرز محمد اشرف صاحب جیسے اور کہاں میں؟ میرے لئے دعا کریں کہ کچھ اچھا لکھنے لگوں۔ آپ کا بھائی

ڈاکٹر بلند اقبال، ٹورنٹو، کناڈا

■ گوپی چند نارنگ سے آپ کے سات سوال اور ان کے جوابات نے عالمی ادبی اردو دنیا کا پورا منظر نامہ ماضی اور مستقبل کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ایسے میں 'ادب ساز' کی اشاعت نے ان کو حال کی جہت سے بھی آشنا کردیا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک most wanted کڑی ہے۔ 'ادب ساز' کو یہ کردار ادا کرنے کے لئے مبارک باد۔ 'گفتگو ان کی' (تبصرے) میں آپ کی تحریر کا ایک دیگر پہلو دیکھنے کو ملا۔ جو سات سوال سے مختلف ہے لیکن ہے خوب اور خوب تر۔ نوازش نامے پڑھ کر دل بھر آیا۔ سب کے سب سراپا محبت۔ آپ واقعی خوش قسمت ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت۔

ڈاکٹر ہربنس سنگھ تصور، ایس اے ایس نگر، پنجاب

■ میں نہ کوئی بہت بڑا افسانہ نگار ہوں نہ نقاد۔ لیکن اگر کوئی شخص اردو ادب کی خدمت اس کے فروغ وبقا کے لئے ذرہ برابر بھی کرہ ارض پر خدمت کرتا ہے تو وہ یقیناً قابل تحسین ہے کہ اس بے پناہ پیشہ ورانہ مصروفیات اور بھاگ دوڑ بھری زندگی میں اپنی زبان وتہذیب کی آبیاری اپنے "خون سے کررہا ہے" کہ بس اردو زبان کی فصل کسی طرح پھلتی پھولتی رہے۔ یہ چند الفاظ میری طرف سے نصرت ظہیر کی نذر ہیں۔ جنھوں نے 'ادب ساز' کو تشکیل دے کر اردو ادب میں ایک سنگ میل کی بنیاد رکھی ہے۔

ڈاکٹر شبیر صدیقی۔ بلیماران دہلی

■ جریدہ پہلی نظر میں ہی اپنی جانب متوجہ کررہا ہے۔ سادہ مگر خوب صورت سرورق، صاف ستھری تحریر اس کے علاوہ سلیقے سے سجائے ہوئے مختلف ابواب، ترتیب، رسالہ کے شرکا کی فہرست اور بکھرے ہوئے اوراق پر قیمتی مضامین کی سرخیوں سے بہ آسانی اندازہ لگالیا کہ کتاب کتنی گراں قدر ہے جس جاں فشانی سے ادب ساز کو آپ نے معیاری ادب کے ساتھ سنوارا ہے اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

گوہر جمالی، رائے پور

■ یہ دور انحطاط اور آپ کا یہ جرأت مندانہ اقدام، واقعی حیرت کا مقام ہے۔ آپ نے جس محنت، کاوش اور شوق کے ساتھ 'ادب ساز' کو شائع کیا ہے وہ یقینی طور پر آگے چل کر آپ کو ادب میں ایک تاریخی مقام عطا کرے گا۔ محمود ایاز مرحوم کے 'سوغات' کے بعد خلا میں مایوسی ہی مایوسی تھی۔ مگر آپ نے ثابت کیا۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہ شمارہ کیسا ہے؟ اس کی مثال بس یوں ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

تمام مشمولات اہم اور وقیع ہیں۔ امرتا پریتم کی نسبت فراج ہو یا انتظار حسین صاحب کا خطاب حمایت علی شاعر کا خصوصی مطالعہ ہو یا نادر زمانہ سید محمد اشرف پر خصوصی گوشہ، سب ہی رسالے کو دستاویزی حیثیت عطا کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وسعت مطالعہ کے لئے دیگر فنون وکمالات کا احاطہ بھی رسالے کو ایک منفرد حیثیت عطا کرتا ہے اور نئے عہد کے نئے تقاضوں کو جاننے اور سیکھنے کا احساس دلاتا ہے۔ کتابی تبصرے بھی تو بہ تو ادبی صورت حال سے متعارف کراتے ہیں۔

قیصر اقبال، مونگیر

■ گذشتہ کئی مہینوں سے ذیابیطس کی گرفت میں ہوں۔ آج کل تو چلنے پھرنے میں تکلیف ہے۔ 'ادب ساز' کی ضخامت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بارہ غیر مطبوعہ غزلیں ارسال خدمت ہیں ان غزلوں بلکہ اشعار کے انتخاب میں بھی آپ سخت گیری سے کام لیں۔ مجھے خوشی ہوگی۔ ادب کے حوالے سے میں کسی طرح کی رعایت پسند ہی نہیں کرتا۔

زبیر شفائی، کانپور

■ اردو کشی کے اس دور میں ضخیم ادبی رسالے کی رونمائی کرنا پل صراط پر چلنا ہے۔ میں آپ کی ہمت کی داد دیتا ہوں۔

ادھر ذاتی مصروفیت کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی ہے۔ ٹرانسفر کو لے کر بھی پریشان ہوں۔ کیوں کہ میں جس جگہ ہوں وہاں سال بھر برف باری ہوتی ہے۔ موسم کا مزاج ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ جگہ سمندری سطح سے قریب 15000 فٹ سے 16000 فٹ کی اونچائی پر ہے۔ سردیوں میں یہاں کا درجہ حرارت 40- تک چلے جاتا ہے۔ ایک مہینہ کے اندر میں کہاں رہوں گا بتانا مشکل ہے۔ اس لئے فی الحال 'ادب ساز' کے لئے مالی تعاون نہیں کر رہا ہوں لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ ٹرانسفر کے بعد دوسرے یا تیسرے شمارے میں 'ادب ساز' کے لئے 'شب خون' کی طرح ہی تعاون جاری رہے گا۔

'بابل کا مینار' اور 'ایک سمپورن انسان کی گاتھا' کے بعد میرے افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'ہم کہاں جائیں؟' ابھی ابھی شائع ہوا ہے۔ جلد آپ تک پہنچیں گے۔

اختر آزاد، لاہول اسپتی، ہماچل پردیش

■ سب سے پہلے تو مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ نے ایک اچھے رسالے کی اشاعت کی ضرورت محسوس کی اور اس کا بیڑہ اٹھایا۔ دو تین ماہ قبل ہی مجھے 'ادب ساز' کی اشاعت کے متعلق شہریار صاحب نے بتایا تھا۔ پٹنہ میں شاید کسی کے پاس کسی بک اسٹال پر آپ کا رسالہ نہیں آیا۔ میں خود آپ سے رجوع کرتا کیوں کہ اچھے رسائل کا مطالعہ میری اور میرے احباب کی ضرورت ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ نے اطلاع دی۔ میں بحیثیت قاری آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ براہ کرم 'ادب ساز' کی ایک کاپی اختر واصف صاحب کے پتہ پر بذریعہ وی پی بھجوانے کا انتظام کردیں۔ واصف صاحب میرے بہت اچھے دوست ہیں اور اچھے افسانہ نگار، مضمون نگار بھی۔ ساتویں، آٹھویں دہائی میں ان کے افسانے تمام اہم رسائل میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں انہوں نے اپنی چپی توڑی ہے اور خوب لکھ رہے ہیں۔ یہاں ایڈمنسٹریٹو سروس میں ہیں۔ ہم دونوں مل کر تمام رسائل منگواتے ہیں۔ ادب ساز ان کے حصے میں آیا ہے۔

امید ہی نہیں مکمل یقین ہے کہ 'ادب ساز' ہر اعتبار سے معیاری رسائل ہوگا۔ دعا گو ہوں کہ اس کی عمر دراز ہو۔ تخلیقات اس لئے نہیں بھجوا رہا ہوں کہ آپ کے خط میں رسالے کی خریداری پر زیادہ زور تھا یعنی آپ خریدار سے زیادہ مخاطب تھے اور فن کار سے کم۔ 'شب خون' کا یہ شعار نہیں رہا ہے۔ یہ خیالات صرف میرے نہیں ہیں ڈھیر سارے فن کاروں کے ہیں۔ بہر کیف اگر آپ واقعی ایسا سمجھتے ہیں کہ میری تخلیقات کی بھی ضرورت ادب ساز کو ہے تو میں ضرور تخلیقات بھجواؤں گا۔

عالم خورشید، پٹنہ

■ 'ادب ساز' اردو ادب کا واقعی عالمی جریدہ ہے۔ یہ سہ ماہی ساگر کو گاگر میں، دریا کو کوزہ میں سمو دینے کی تازہ ترین مثال ہے۔ ممتاز مشہور اور مقبول قلم کاروں کے علاوہ نئی نسل کے نئے قلم کاروں کی تخلیقات کو بھی آپ نے اس شمارے میں شامل کیا ہے۔ 'نوازش نامے' کے عنوان کے تحت 58 ادیبوں اور شاعروں کے خطوط پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کئی اچھے لکھنے والوں سے آپ نے حتی الامکان ربط پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور رسالہ کے لئے قلمی تعاون کے سلسلے میں کئی مرتبہ انھیں یاد دہانی بھی کی ہے۔

'اس انجمن میں' کے زیر عنوان 78 مختصر تعارفی حوالے قاری کی دل چسپی میں اضافہ کا باعث ہیں۔ فہرست مضامین پر نظر پڑتی ہے تو آتش شوق تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بہر حال آپ کی سوچ اور فکر کا کینوس بہت وسیع ہے۔

محمد منظور احمد، حیدر آباد

■ 'ادب ساز' نظر نواز ہوا۔ واقعی اسم بامسمّٰی ہے۔ شروع سے آخر تک پڑھتے چلے جائیے اور نئے نئے افکار و احساسات کے حسین سے حسین تر مناظر سے حظ اٹھایئے۔ نہ کہیں بوریت نہ کسی قسم کا جھول۔ پھر نظم و نثر کی ترتیب و تنظیم ایسی کہ گویا قارئین کی ایک نئے زاویے سے ذہن سازی کی جارہی ہے۔ بے شک یہ آپ کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

سیمینار میں 'تہذیبی مکالمہ اور تصادم' کے تحت جو مکالے لکھے گئے ہیں نہایت فکر انگیز ہیں۔ بے شک یہ اہل الرائے کا مثبت اور تعمیری قدم ہے۔ میں انیس اعلوی، ڈاکٹر منظور عالم، پروفیسر ظہور محمد خاں اور فرحت احساس صاحبان کو ان کی اس فکری عرق ریزی پر آفرین کہتا ہوں کہ ان دانشوروں نے نہایت کھلے ذہن سے اہل مغرب خصوصاً امریکہ اور مسلمانوں کا تاریخی، تہذیبی اور نفسیاتی مطالعہ کرکے اس کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

'امرتا پریتم' کو خراج عقیدت کا گوشہ بھی قابل ستائش ہے۔ اسا سلیم سے بات چیت پر مبنی امروز کی تحریر دل گداز بھی ہے اور جاں سوز بھی۔ اور خود اسا سلیم صاحبہ نے امرتا پریتم کے آخری سفر کی جو روداد لکھی ہے نہ صرف رقت انگیز ہے بلکہ انسانی رشتوں کے احترام کا جیتا جاگتا شہکار بھی ہے۔ محترمہ کا امرتا پریتم کو تلک کرنا اور دیگر رسومات کی ادائیگی ثابت کرتے ہیں کہ محبت اور انسانیت کی راہ میں ذات پات اور نظریات رکاوٹ نہیں بن سکتے۔

گوپی چند نارنگ صاحب سے خود آپ کی گفتگو بڑی لاجواب رہی۔ آپ نے بھی نہایت مرد افگن قسم کے سات سوالات اٹھائے اور نارنگ صاحب نے بھی خود کو 'حاتم فن' ثابت کر دکھایا۔ آپ دونوں صاحبان کی تعریف میں کچھ کہنا میرے لئے سورج کو چراغ دکھانا ہوگا۔

سجاد ظہیر صدی کی تقریبات کے موقع پر افتخار حسین صاحب نے بلند ادبی قامت اور انقلابی شخصیت کے مالک سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کے بارے میں بذریعہ خطاب کافی معلومات فراہم کی اور گویا موجودہ دور کے قلم کاروں سے بھی یہ خطاب کیا کہ سجاد ظہیر جیسے نہ جانے کتنے اہل قلم جو خاک کے پردے میں پنہاں ہوگئے ہیں ہمیں ان آئینہ پیکروں پر جمی 'بے اعتنائی زمانہ' کی گرد صاف کرنے کی ذمہ داری نبھانی ہوگی جس سے ہمارے افکار و تخیل کو جلا اور آنے والی نسلوں کو راستہ ملتا رہے گا۔ ادب ساز میں باب تنقید کا کھلنا نہ صرف ضرورت بلکہ عین فطرت بھی ہے۔ پروفیسر محمد حسن صاحب سے لے کر ڈاکٹر بانو سرتاج صاحبہ تک تمام ہی قلم کار قابل مبارک باد ہیں۔

خصوصی مطالعہ 'حمایت علی شاعر' اور 'سید محمد اشرف' دونوں ہی اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب ہیں۔ افسانوں اور غزلوں کا انتخاب بھی خوب سے خوب تر ہے۔

اتنی گزارش ہے کہ 'ادب ساز' کسی ایک گروپ کا نہ

تخصوص فن کاروں کا رسالہ نہ بن جائے۔ ملک کے کچھ رسالے ایسے ہیں جہاں کسی کی سفارش کے بنا کسی کی بھی تخلیق کو چھاپا نہیں جاتا۔ 'ادب ساز' کا امپریشن ایسا نہ بنے اس کا خاص خیال رکھیں گے تو میں سمجھتا ہوں ادب ساز پوری ادبی دنیا میں اپنی ایک الگ پہچان بنا سکے گا۔

وسیم ملک، راندیر، سورت، گجرات

■ 'ادب ساز' دیکھ کر دلی مسرت ہوئی۔ گوشۂ نشتر خانقاہی دے کر ایک فرض کی ادائیگی کی ہے۔ نشتر صاحب کی حیات میں تشکیل بمبئی نے بھی ایک شمارہ ان کے لئے مختص کیا تھا۔

محترمہ امرتا پریتم کی شخصیت بھی واقعی ایسی تھی جس پر جتنا لکھا جائے کم ہے انہوں نے افسانے ناول جم کر لکھے ہیں۔ ان کے ناول 'پیروت کا زندگی نامہ' کا تاثر میرے ذہن پر اب تک ہے اور ان کی شاعری کا جادو تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نارنگ صاحب سے سات سوال خوب ہیں جن کے انہوں نے تجزیاتی جواب دیئے ہیں۔

خصوصی مطالعے میں سید محمد اشرف صاحب کو شامل کر کے آپ نے نئی نسل کو حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ حصہ قابل تقلید ہے۔ باب نظم اور باب غزل میں آپ نے خاص ادبی معیار قائم کیا ہے، کہانیوں کا انتخاب بھی متاثر کرتا ہے۔ سلام بن رزاق کی کہانی تصویریں خوب ہے۔ کہانیوں میں شوکت حیات ہوں یا دیگر افسانہ نگار سبھی کہانیاں فن اور معیار کے لحاظ سے خوب ہیں۔ دیگر مشمولات بھی قابل مطالعہ ہیں۔ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پرچہ ضخیم ہے معیاری ہے وہ سارا میٹر ہے جو ایک خاص ادبی پرچے میں ہونا چاہئے۔ مگر اس کی قیمت ایک عام قاری کی دسترس سے باہر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ لوگ اپنی فضول خرچی پر غور نہ کرتے ہوں۔

حفیظ آتش، امروہہ

■ واقعی آپ نے کمال کر دیا۔ اس قدر خوب صورت، خوب ترتیب، لے آؤٹ سے پہلا شمارہ شائع کرنا آپ کی شب و روز کی محنت اور مزاج کا عکاس ہے۔ اس قدر خوب ادب کو جمع کرنا اور اسی خوبی سے اسے پیش کرنا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ پہلے شمارے سے ہی امید نظر آتی ہے کہ یہ رسالہ اردو ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگا۔ اور آپ کا حسن معیار بھی آگے اور ترقی کرے گا۔ 'ادب ساز' ان معنوں میں بھی ادب ساز ہے کہ یہ ادبی سیاست کا شکار نہیں ہے۔

ڈاکٹر مظہر مہدی، جے این یو، نئی دہلی

■ سنجیدہ ادب پڑھنے والوں کے لئے 'ادب ساز' کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ بھائی، آپ نے اس مجلے میں اتنا سب کچھ اکٹھا کر دیا ہے کہ فوری ان کے بارے میں رائے دینا ممکن نہیں۔ بڑی محنت اور عرق ریزی کا کام کیا ہے آپ نے۔ شمارے کی دو جلدیں اور بل کرناٹک اردو اکادمی کے دفتر میں مل گئے ہیں، شکریہ! ادائیگی بذریعہ ڈی ڈی ہو گی اطمینان رکھیں۔ پروفیسر م ن سعید صاحب (صدر، کرناٹک اردو اکادمی) سے میں نے گزارش کی ہے کہ یہاں کی لائبریریوں میں بھی 'ادب ساز' بھجوانے کا بندوبست کریں، اس سلسلے میں آپ کو اکادمی کی جانب سے منی آرڈر اور ڈی ڈی مل جائے گی۔

یوسف عارفی، بنگلور، کرناٹک

■ مشمولات کے لحاظ سے واقعی یہ ایک عہد ساز رسالہ ہے، جسے دیکھ کر وزیر آغا صاحب کے اوراق کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تفصیلی تاثرات پھر کبھی لکھوں گا۔

سعید رحمانی، مدیر، اخبار اڑیسہ، کٹک

■ پہلا شمارہ مل گیا۔ کچھ حصے دیکھے ہیں۔ زیادہ نہیں دیکھ سکا ہوں۔ مگر آپ کی محنت صاف جھلک رہی ہے۔ عرصہ ہوا نیا کچھ نہیں لکھا۔ ویسے بھی فی الحال مجھ ایسے شاعروں کا کلام چھاپنے سے گریز کیجئے۔ پرچے کے لئے اس وقت یہ بہت ضروری ہے۔

رعنا سحری، ممبئی

■ آپ نے لکھا ہے کہ میرا پتہ آپ کو 'شب خون' کے عالی ذوق قارئین کی فہرست سے حاصل ہوا ہے۔ افسوس کہ اب 'شب خون' نہیں رہا۔ جہاں 'شب خون' کے نہ رہنے کا افسوس اور از حد دکھ ہوتا ہے وہیں حیرت ناک مسرت بھی ہوتی ہے کہ آپ جیسے جیالے نئے عزم و حوصلے لئے اردو ادب کے افق پر نمودار ہوتے ہیں۔ رسالہ نکالنا اور فروخت کرنا ایسا ہی جیسے کہ اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے اور وہ بھی ایسے ماحول میں جب کہ سارے ملک میں لاچار و بے بس زبان کا پورے شد و مد کے ساتھ جنازہ تو نکالا ہی جا رہا ہے لیکن اپنے بھی اس کا گلا گھونٹنے میں کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔

احمد اشفاق، جن پٹن، بنگلور

■ شمارے کی ترتیب آپ کے تجربے اور خوش سلیقگی کی مظہر ہے۔ 'ادب ساز' یقیناً دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔

وقار مانوی، نئی دہلی

■ جناب سلیمان خمار کے توسط سے 'ادب ساز' ملا۔ جس آن بان اور شان سے آپ نے رسالے کا اجرا کیا ہے قابل تحسین ہے۔ مجھے امید ہے یہ شب خون کی کمی کو پورا کرے گا۔ ساتھ ہی آپ نے جو کوتاہیاں بیان کی ہیں امید ہے آئندہ شماروں میں انہیں دور کر دیں گے۔ کیا ہر شمارے میں گوشے ضروری ہیں۔ اس پر توجہ دیں۔ تاکہ رسالے کی اشاعت مشکوک نہ ہو۔

احمد عارف، بیجاپور

■ 'ادب ساز' مل گیا۔ بے حد شکریہ۔ اتنا اعلیٰ رسالہ ہے کہ جتنی تعریفیں کی جائیں کم ہیں۔ مبارک باد!

پروین شیر، وِنی پیگ، کناڈا

■ آپ نے ایک ساتھ پڑھنے کے لئے اتنی ساری چیزیں فراہم کر دی ہیں کہ پرچہ ہنوز زیر مطالعہ ہے۔ حالاں کہ ضخامت کسی ادبی رسالے کے معیار کی ضمانت نہیں ہوا کرتی، مگر آپ نے مقدار کے ساتھ معیار کا بھی خیال رکھا ہے، ہر چند کی بعض بھرتی کی تحریریں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

حمایت علی شاعر اور سید محمد اشرف پر گوشہ اچھا اور بھر پور لگا۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے تاکہ 'ادب ساز' ایک عہد ساز رسالہ بھی ثابت ہو۔ ادب کے عصری تناظر میں آپ کے سات سوال اور گوپی چند نارنگ کا جواب دونوں کی دستاویزی حیثیت ہو گئی ہے۔ فرحت احساس کا مضمون 'تہذیبوں کی کشمکش' خاصے کی چیز ہے اور فکر انگیز بھی۔ امرتا پریتم کی 'جنگلی بوٹی' ایک زبردست کہانی ہے۔ ان کے تعلق سے اسا سلیم اور امروز کے تاثرات دل پذیر ہیں۔ امرتا کی نظموں کے کیا کہنے!

پروفیسر شکیل الرحمن نے ملا نصر الدین کو تصوف کی روحانیت کے تناظر میں ایک ایسا کردار قرار دیا ہے، جو زمان و مکان کی حدود سے بہت آگے ہے۔ ان کی تنقید میں تخلیقی جمالیات کی چاشنی کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

پروفیسر ابو الکلام قاسمی نے بجا طور پر حالی کو شارح غالب کی حیثیت سے ایک منفرد مقام عطا کرتے ہوئے ان کی پیش کردہ تشریحات و تعبیرات میں ایک مکمل تنقیدی نظام کا سراغ لگایا ہے۔ یہ مضمون مدلل ہے۔ شبنم عشائی کی شاعری پر حقانی القاسمی کی تحریر توصیفی زیادہ ہے، تنقیدی کم۔

خورشید اکبر، پٹنہ، بہار

OO

اس انجمن میں...

مختصر تعارفی حوالے

ابن اسماعیل (ڈاکٹر غلام نبی ڈار) :پ: 23 فروری 1961 • بی اے • ناول / افسانہ نگار، نقاد، صحافی • تصانیف: چناروں کی راکھ، دشت پنہاں (ناول) کیڑے (افسانے) دستِ قضا / رائٹر ہنگرڈ، اسیرِ حیات / نور دو دستوودگی (تراجم) اردو میں سرّی ادب، اردو میں طنز و مزاح (تنقید و تالیف) • انتخاب، پنڈت بلڈنگ، مین چوک، سوپور کشمیر۔

ارشد کمال: پ: 25 جنوری 1955، لکھنیا، ضلع بیگو سرائے، بہار • بی اے آنرز انگریزی ادب، آئی سی ایس، وزارت دفاع میں ملازمت • شاعر، کالم نگار، شعری مجموعہ ذکرِ رنگ و بو زیرِ ترتیب • ایچ۔7C، ابو الفضل اینکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 فون: 65639506 موبائل: 9818119273

اسد محمد خان: پیدائش 1936 انڈیا • شاعر، افسانہ نگار • تصانیف: کھڑکی بھر آسمان (افسانے اور نظمیں) برجِ خموشاں، نربدا، تیسرے پہر کی کہانیاں اور ٹی وی پر نشر ہونے والے قومی نغموں گیتوں کا مجموعہ • A 8/F سیکٹر 6 گلشن معمار کراچی۔ 75340 فون: 92-21-6350326

اسلم سراج الدین: پیدائش 5 جنوری 1947 سنگرور، انڈیا • ایم اے اُردو پنجاب یونی ورسٹی • افسانہ نگار، مترجم، نقاد، صحافی، معلم • تصنیفات: سمر سامر (افسانوں کا مجموعہ) • مکان نمبر 5 گلی نمبر 10 بلاک ایکس پیلپلز کالونی گوجرانوالہ، پاکستان۔

اشفاق احمد: پ: 22 اگست 1925 مکتسر، ضلع فیروز پور • وفات: 7 ستمبر 2004 • ایم اے اردو گورنمنٹ کالج لاہور، ڈپلوما اطالوی، فرانسیسی • افسانہ / ناول / ڈرامہ نگار (اردو و پنجابی) صحافی، براڈ کاسٹر • خاص تصانیف: ایک محبت سو افسانے، اجلے پھول (افسانے) طوطا کہانی، دلی دے تھلے (ڈرامے) شہر کنارے، اچے برج لاہور دے، کاروان سرائے، حیرت کدہ، قلعہ کہانی (ناول) گڈریا، مشہور ترین افسانہ • مشہور سلسلہ وار ریڈیو فیچر تلقین شاہ • صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی (1979)

ڈاکٹر اطہر فاروقی • پ: 15 اگست 1964 سکندر آباد، ضلع بلند شہر، یوپی • ایم اے، پی ایچ ڈی جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی • صحافی، تجزیہ کار، نقاد • تصانیف: مخمور سعیدی ایک مطالعہ • Redefining Urdu Politics In India آکسفورڈ پریس • رابطہ: 80 سکھ دیو وہار، نئی دہلی۔ 110025 فون: 26331010 موبائل: 9313579545

اکبر حمیدی: پ: 1936: گوجرانوالہ • ایم اے اُردو و پنجابی • شاعر، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، معلم • تصانیف: لہو کی آگ، آشوبِ صدا، تلوار اس کے ہاتھ، شہر بدر، دشت بام و در، ہر اک طرف سے، شورِ بادبان، پکی غزل پنجاب (شعری مجموعے) جزیرے کا سفر، جگنی کے تعاقب میں، جھاڑیاں اور جگنو، پہاڑ مجھے بلاتا ہے (انشائیوں کے مجموعے) قدِ آدم، چھوٹی دنیا بڑے لوگ (خاکوں کے مجموعے) اس کتاب میں، مضامینِ غیب (تنقید) متفرق کتابیں: ریڈیو کالم، وزیر آغا کے خطوط، جست بھر زندگی (سوانح) اور بچوں کی متعدد کہانیاں • مکان 2029 گلی نمبر 32 آئی ٹن / 10 اسلام آباد، پاکستان • فون: 92-51-4431115

امجد اسلام امجد: پ: 4 اگست 1944، لاہور • ایم اے اردو پنجاب یونی ورسٹی • شاعر، ڈرامہ نگار، ٹی وی سیریل نویس • خاص تصانیف: برزخ، ساتواں در، ذرا پھر سے کہنا، فشار، خزاں کے آخری دن، اس پار، اتنے خواب کہاں رکھوں گا (شاعری) وارث، دہلیز، وقت، دن، رات، سمندر (ٹی وی سیریل) شہر در شہر (سفرنامہ) • صدرِ پاکستان سے حسنِ کارکردگی ایوارڈ 1987، مجموعہ کلام 'فشار' پر ہجری ایوارڈ 1493ھ • DHA-275-N لاہور، پاکستان • فون: 5734096-5897313 ای میل: amjadislamamjad@hotmail.com

بشیشر پردیپ (بشیشر لال دھون) :پ: 6 جولائی 1925 چنیوٹ، پاکستان • ایم ایس سی (ٹیکنیکل) پی ایچ ڈی • تصانیف: کاجل اور دھواں 1964، سوغات 2002 افسانوی مجموعوں سمیت 16 کتابیں • اتر پردیش اردو اکادمی کا مجموعی خدمات ایوارڈ بدست وزیر اعظم ہند 1997، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ 1995، افسانوی مجموعوں، پیاس 1958 پر اتر پردیش سرکار کا پجر سے اجنبی 1975، پہلی بار 1977، ٹکڑے ٹکڑے آئینہ 1981، وہ سب باتیں 1983، تم صرف تم 1987، ابھی تو صدیاں ہے 1994 پر اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، پنجاب یونی ورسٹی کے انعامات۔ آل انڈیا میر اکادمی سے امتیاز میر، نوائے میر اور میر ایوارڈ 1981، 1993 اور 1985 میں لکھنؤ یونی ورسٹی کی ایک طالبہ نے بشیشر پردیپ کی افسانہ نگاری: تحقیقی مقالہ لکھ کر ایم اے اردو میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی • اردو کہانیوں جب ہم نہ ہوں گے کو رنجنا کی قیمت پر ٹیلی فلمیں بنیں • رابطہ: اے 555 اندرا نگر لکھنؤ۔ 226016 اتر پردیش • فون: 2380055,2347809 موبائل: 9335907646

بلقیس ظفیر الحسن (بلقیس پروین، شادی سے قبل بلقیس رحمانی) :پ: یکم ستمبر 1938 • از خود تحصیلِ علم، کوئی تعلیمی سند نہیں • شاعر، ڈرامہ نگار، مترجم • تصانیف (اردو، ہندی، انگریزی) گیلا ایندھن، شعلوں کے درمیاں (شعری) بھارتیہ کویتائیں (ترجمہ) اترا (ساہتیہ اکادمی) کوی بھارتی 3 (دا کیر تھ بھارت بھون) اردو لائیو، اپنی زبان، برونز میموریز (سی گل پبلیکیشنز) شیشے کے کھلونے (ڈراما) • اعزاز: یوپی اردو اکادمی سے شعلوں کے درمیاں پر انعام • رابطہ: F-3 اپسرا اپارٹمنٹ، سیکٹر 15 دہلی۔ 110085 فون: 27858937 موبائل: 9818167098

بلند اقبال، ڈاکٹر: پ: پاکستان • ایم بی بی ایس اے بی آئی

قلم کاروں کے تعارفی حوالے دینے کا مقصد طلبائے علم کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں استطاعت بھر احتیاط برتی گئی ہے۔ پھر بھی غلطیوں کا امکان ہے۔ براہِ کرم اہلِ علم حضرات تصحیح کے لیے ہماری رہنمائی فرماتے رہیں تا کہ ہر شمارے کے ساتھ اردو ادیبوں کے بارے میں ایک مفید اور درست ڈاٹا بیس data base تیار ہوتا جائے۔ جن حضرات کا تعارف شامل نہیں ہو پایا ہے یا تعارف میں اہم باتیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں وہ خود یا واقفین بلا تکلف و توقف متعلقہ حوالے روانہ فرما دیں تا کہ آئندہ شماروں میں وہ اضافے شامل کر دیے جائیں

ایم (امریکن بورڈ۔ انٹرنل میڈیسن)، کناڈا میں فزیشین۔ افسانہ نگار۔ تصنیف: فرشتے کے آنسو (افسانوی مجموعہ)۔ ای میل:
balandiqbalmd@yahoo.ca

پرتپال سنگھ بیتاب: پ: 26 جولائی 1949، ککڑی دھرم سال، پونچھ (جموں و کشمیر)۔ ایم اے، ایل ایل۔ بی۔ شاعر، ایڈمنسٹریٹر (آئی اے ایس آفیسر)۔ سات شعری مجموعے: پیش خیمہ، سراب در سراب، خود رنگ (نظم و غزل)، کیکٹس اور گلاب (غزل، دیوناگری خط) دی تھرڈ اسٹرینڈ The Third Strand (اردو نظموں کا انگریزی ترجمہ)، موجِ ریگ (غزل)، ہاتھ اکیسویں صدی (تخمیس زیر ترتیب)۔ جموں کشمیر کلچرل اکادمی، جموں کشمیر ایکو فرینڈز، جیمنی اکیڈمی پانی پت، وغیرہ کے ادبی انعام، سمدرا کماری چوہان جنم شتابدی سمان (جیمنی اکادمی) اور دیگر اعزاز۔ جموں یونی ورسٹی کے تحت ایم فل مقالہ از ناہید جان بہ عنوان: پرتپال سنگھ بیتاب کی شاعری کا اجمالی جائزہ۔ 188 سیکٹر I، جیمنی جنت ہاؤسنگ سوسائٹی جموں توی۔ 180011

پروین شیر: پ: عظیم آباد، پٹنہ کے علمی گھرانے میں جس نے اختر اورینوی جیسا افسانہ نگار اردو ادب کو دیا۔ شاعرہ، مصورہ، ستار نواز۔ تصنیف: کرچیاں (شاعری و مصوری)، یو میصوف کے لئے اپنی شاعری و مصوری پر مشتمل سی ڈی تیار کی۔ ہندوستان و کناڈا میں مصوری کے متعدد اعزاز۔ 126 واٹن لینڈ کریسنٹ، ونی پیگ آر 3 وائی، 1 ای 6، منی ٹوبا، کناڈا
فون: (204) 896 0124

پی پی سریواستو رند ساغری: پ: 12 اکتوبر 1931 (ذاتی) 15 جون 1933 (سرکاری ریکارڈ)۔ شاعر، تخلص: ساغر اجمیری۔ آٹھ شعری مجموعے: ریگ زار، رگِ سنگ، شہرِ احساس، شجر شجر چھاؤں، آسمان کے بغیر، خلاؤں میں دھوپ کی، جاگتی تنہائیاں۔ امتیاز میر، شرک سنگھ ایوارڈ، نرالا سپاہی ایوارڈ، اتر پردیش، دہلی اردو اکادمیوں کے انعامات۔ آر۔16 سیکٹر۔ XI، نوئیڈا۔ 201301 فون: 120-2555937

ثروت خان (ثروت النسا): پ: 23 جنوری 1960 جھالا واڑ۔ ایم۔ اے ایم فل پی ایچ ڈی اردو۔ تصانیف: ذروں کی حرارت (افسانے) اندھیرا پگ (ناول)، 3 کتابیں زیر طبع: میرا۔ شخصیت اور فن، اردو کے منظوم ڈراموں کا تاریخی و تنقیدی جائزہ، راجستھان میں اردو اخبارات و رسائل کا جائزہ۔ 76 اوٹی سی اسکیم، سینٹرل اکیڈمی روڈ، چترک ہاسٹل، ملا تلائی، اودے پور۔ 313001 راجستھان۔ فون: 0294-2431121
موبائل: 9414161121

جعفر ساہنی: ایم اے (ڈبل) بی ایڈ۔ شاعر۔ رابطہ: معرفت ہندوستان میڈیکوز، 85/1 ٹوپسیا روڈ، کولکاتا۔ 700039

جگدیش پرکاش: پ: 4 فروری 1935 لاہور۔ ایم کام، آگرہ یونی ورسٹی، IIPA سے مینیجمنٹ کا کورس۔ مالک و منتظم تعلیمی کمپیوٹر کمپنی ایڈومیٹکس۔ شاعر۔ تصانیف: دھوپ کی خوشبو، زرد کے لئے، آسماں در آسماں (شعری مجموعے)۔ اعزازات: دہلی اردو اکادمی اور دیگر اداروں کے ایوارڈ۔ یوروپ، امریکہ، جنوب مشرقی ایشیا کے بیش تر ممالک کے دورے۔ C11/1 ڈی ایل ایف سٹی فیز I، گوڑگاؤں 122002 ہریانہ۔ فون: 2565644 (گوڑگاؤں) 2582654 (دہلی) موبائل: 9313304704 ای میل:
jagdish.prakash@edumatics.com

جمشید علی: پ: یکم جولائی 1956 سہارنپور۔ شاعر / افسانہ نگار۔ گلی نمبر 6 نئی شاہ ولی باغ، سہارنپور۔ 247001 یوپی
موبائل: 9897812468

جمیل عثمان: پ: 27 مئی 1953۔ ایم اے انگلش، ایل ایل بی، کراچی یونی ورسٹی، کولمبیا یونی ورسٹی نیو یارک میں ملازمت۔ افسانہ / مزاح نگار، شاعر۔ تصانیف: جلاوطن کہانیاں 1997 (افسانے) پری خانے کا مسافر (طنز و مزاح)۔ 5 پارک ڈرائیو، اپارٹمنٹ A-4 ایڈیسن نیو جرسی 08817 فون: 1-212-854-2926، 1-732-985-7707 ای میل:
ju72@columbia.edu

جوگندر پال: پ: 5 ستمبر 1925۔ بی اے مرے کالج سیالکوٹ 1945، ایم اے دوران ملازمت 1955۔ افسانہ / ناول نگار۔ تصانیف: دھرتی کا لال 1961، میں کیوں سوچوں، بے محاورہ، بے ارادہ، کھلا، سلوٹیں (افسانوی مجموعے) آمد و رفت بیانات، (ناولٹ) ایک بوند لہو کی، نادید (ناول)۔ اعزازات: مجموعی خدمات پر دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، یوپی اردو اکادمی، میر اکادمی لکھنؤ وغیرہ کے کئی انعامات اور ایوارڈ۔ نیروبی (ایسٹ افریقہ) پاکستان وغیرہ کے دورے۔ 204 منداکنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی۔ 110019 فون: 26414036

حامد سراج (محمد حامد): پ: خانقاہ سراجیہ ضلع میاں والی، پاکستان۔ ایم اے اردو۔ تصانیف: وقت کی فصیل، برائے فروخت (افسانے) میا ماں کے موضوع پر تقریباً 150 صفحات کا طویل ترین خاکہ۔ پیش رفت انٹرنیشنل کا رشید احمد صدیقی ایوارڈ 2005۔ ڈاک خانہ چشمہ بیراج ضلع میاں والی (پاکستان) فون: 0459 242221 : 0092 92459
موبائل: 0333 6833852 ای میل:
hamid42221@yahoo.com

حسین الحق (ادبی بخت رسا): پ: 2 نومبر 1949، سہسرام، بہار۔ ایم اے اردو و فارسی، پی ایچ ڈی۔ اردو افسانوں میں علامت نگاری۔ مولوی (ادخلہ خانقاہ کبیریہ (سہسرام)۔ افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد۔ تصانیف: سوئی کی نوک پر رکا لمحہ، فرات (ناول)

حیات لکھنوی (میرزا محمد جعفر): استاد جوش ملیح آبادی میرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے فرزند۔ پ: 27 فروری 1931 لکھنؤ، وفات: 3 مارچ 2006۔ اردو آنرز، پنجاب یونی ورسٹی۔ ممتاز شاعر، مضمون نگار۔ تصانیف: حصارِ آب، ندی کے پار کا منظر (غزلیات) قصائد و منظومات اور مضامین کے مجموعے۔ اعزازات: دہلی اردو اکادمی اور یوپی اردو اکادمی کے اعزازات۔

حیدر قریشی (قریشی غلام حیدر ارشد): پ: 13 جنوری 1952 چناب نگر (سابق ربوہ) پاکستان۔ ایم اے اردو۔ شاعر، افسانہ نگار، خاکہ نگار، نقاد۔ تصانیف: عمر لاحاصل کا حاصل (شعری مجموعوں سلگتے خواب، عمر گریزاں، محبت کے پھول، دعائے دل، درد سمندر، افسانوی مجموعوں روشنی کی بشارت، قصے کہانیاں، خاکوں، انشائیوں، سفرناموں وغیرہ پر مشتمل تخلیقی کلیات) خبر نامہ، کھٹے پہ دہلا (ماہیے وتبصرے) ماہیے کے فروغ کے لئے لکھے گئے متعدد مضامین، تنقیدی و تحقیقی کلیات کی اشاعت زیرِ غور۔ اعترافات: شخصیت اور فن پر تحقیق و تنقید اور مختلف ادیبوں کی تحریر کردہ متعدد کتب۔ ویب سائٹ:
www.haiderqureshi.com، اور
www.jadeedadab.com رابطہ: Rossertstr.6,
Okriftel, 65795 Hattersheim, Germany
فون: 0049-6190-930078
ای میل: hqg786@arcor.de

ڈاکٹر خلیق انجم: پ: 22 جنوری 1933 دہلی۔ ایم اے اردو، پی ایچ ڈی، ڈپلوما لسانیات، ڈپلوما لائبریری سائنس۔ سیکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کے سیکریٹری، نقاد، محقق، صحافی۔ تصانیف: متنی تنقید، غالب کے خطوط (چار جلدیں) معراج العاشقین،

غالب کی نادر تحریریں،مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، غالب اور شاہان تیموریہ،مرزا محمد رفیع سودا،مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ، کل ملا کر تقریباً پچاس کتابیں۔برطانیہ،امریکہ،سوویت یونین، پاکستان وغیرہ کے دورے۔اعزازات :مجموعی خدمات اور کتابوں کے لئے دہلی،یوپی،بہار،مغربی بنگال وغیرہ کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ۔رابطہ:212۔اردو گھر روڈ،راؤز ایونیو،نئی دہلی۔110002فون:23236299-23237210
فیکس:011-23239547۔ای میل:
urduadabndl@bol.net.in
ویب سائٹ:
www.anjuman-taraqqi-urdu-hind.com

پروفیسر رشید امجد:پ:1940 سرینگر۔ایم اے اُردو،پی ایچ ڈی،پنجاب یونی ورسٹی۔افسانہ نگار،صحافی،نقاد،محقق،معلم۔ تصانیف:افسانوں کے مجموعے،خودنوشت،تمنا بے تاب،نقد ونظر کی بہت سی کتابیں،مدیر تخلیقی ادب نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز۔اسلام آباد،پاکستان۔مکان نمبر 52سی اسٹریٹ A-7 گلستان کالونی راولپنڈی(فون:5513565)

رضا امروہوی۔پ:18جون 1939 امروہہ۔معروف شاعر۔تصانیف:پربت کے پاسباں،رقص نوا،رنگ وروشنی، ایمان وایقان،سفینۂ نجات،شہر غزالاں،قندیل،صورت تیری درپن میرا(ہندی)۔اعزازات:دہلی،یوپی اردو اکادمیوں اور فخر الدین علی احمد سوسائٹی کے ایوارڈ،وطنیہ شاعری کے لئے صدر جمہوریہ ایوارڈ۔رابطہ:C-4گلی نمبر 12 ششی گارڈن دہلی۔ 110091فون:22795297

رئیس الدین رئیس:شاعر،صحافی۔تصانیف:آسمان حیران ہے1995،بزم میں خاموش ہے2001(شعری مجموعے)سمندر سوچتا ہے(کلیات)۔ 10/1725 دہلی گیٹ علی گڑھ 202001یوپی فون:0571-2525620موبائل: 9719570345

ساگر سرحدی (گنگا ساگر تلوار)۔پ:1934بفہ ضلع ہزارہ،صوبۂ سرحد(اب پاکستان)بی اے۔ڈرامہ/افسانہ نگار،فلم ساز،ہدایت کار،مکالمہ نویس،اسکرپٹ رائٹر۔تصانیف: تنہائی،خیال کی دستک،بھگت سنگھ کی واپسی(ڈراموں کے مجموعے)آوازوں کا میوزیم(افسانے)۔مشہور فلمیں بطور فلم ساز و ہدایت کار:بازار،لوری،تیرے شہر میں،بطور کہانی/ اسکرپٹ/مکالمہ نویس:کبھی کبھی،نوری، دوسرا آدمی،سلسلہ، چاندنی،کہو نہ پیار ہے۔ان دنوں بڑے پیمانے کی فلم آخری مغل کی تیاری،سیاسی فلم چوسر مکمل۔30/1363سردار نگر-3، ممبئی۔400022فون:022-24072701

سعید رحمانی۔شاعر،صحافی۔رابطہ:مدیر اخبار اڑیسہ،دیوان بازار،کٹک۔753001فون:2624501

سلمان خورشید:پ:یکم جنوری 1953۔ایم اے آکسفرڈ یونی ورسٹی۔ماہر قانون،سیاست داں۔خاص تصنیف:ایٹ ہوم ان انڈیا۔سابق وزیر مملکت امور خارجہ حکومت ہند،صدر اتر پردیش کانگریس کمیٹی۔80سکھ دیو وہار،نئی دہلی۔110025 فون:26331010۔ای میل:sk_tipu@yahoo.com

سلیمان خمار:پ:یکم مارچ 1944،باگلکوٹ ضلع بیجاپور، کرناٹک۔ایم اے اردو فارسی۔شاعر۔تیسرا سفر(شعری مجموعہ 1981)،غزل،نظم،حمد و نعت کے مجموعے زیر ترتیب۔تیسرا سفر پر کرناٹک اردو اکادمی ایوارڈ(1982)اسی اکادمی کا ایوارڈ برائے شاعری(2006)۔ایل آئی جی۔83،جل نگر،بیجاپور۔ 586101کرناٹک۔موبائل:9341722005

سہیل اختر(ابو سہیل اختر):10نومبر 1962 ضلع غازی پور،یوپی۔بی ٹیک سول انجینئرنگ آئی آئی ٹی کانپور۔شاعر، مترجم،اسٹرکچرل انجینئر۔ غزلیات کا پہلا مجموعہ زیر ترتیب۔ انگریزی نظمیں ویب سائٹ پر موجود ہے۔ایم(ڈی)،آئی ڈی سی او آئی ڈی سی او ڈو،جن پتھ بھوبنیشور۔751022 اڑیسہ۔موبائل:9437044651۔ویب سائٹ:
www.sohailakhtar.blogpost.com

شاذ رحمانی(محمد مجیب الرحمن)۔شاعر۔تصنیف:شعور کی رو(شعری مجموعہ)۔رابطہ:شاہین پے فون،بڑی گنج چوک، کٹیہار۔854105بہار

شاہد عزیز:شاعر،نقاد۔رابطہ:179ملا حلائی،ادوے پور۔ 313001راجستھان۔

شجاع خاور(شجاع الدین ساجد)۔پ:24دسمبر 1948 فراش خانہ،دہلی۔ایم اے انگریزی،ایل ایل بی دہلی یونی ورسٹی۔ آئی پی ایس آفیسر کے طور پر ڈی آئی جی کے عہدے سے رضا کارانہ طور پر ریٹائر۔شاعر۔تصانیف: وادین،تیسرا شجر، مصرع ثانی،رنگ فارسی،اللہ ہو،غزل پارے،بات(شعری مجموعے)اردو شاعری میں تاج محل(مضامین اور نظموں کا انتخاب)۔دہلی اردو اکادمی کا شاعری ایوارڈ اور دیگر اعزازات۔ فون:55146314

ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی:پ:30ستمبر 1935پرتاپ گڑھ،اودھ۔ایم اے انگریزی الہ آباد یونی ورسٹی۔انڈین پوسٹل سروس میں اعلیٰ تر عہدے سے سبک دوش۔قومی کونسل برائے ترقی اردو زبان کے موجودہ وائس چیئرمین۔شاعر،نقاد،محقق،افسانہ /ناول نگار،صحافی۔خاص تصانیف:نقد ومعنی،شعر غیر شعر اور نثر، عروض آہنگ اور بیان،تفہیم غالب،افسانے کی حمایت میں،اردو کا ابتدائی زمانہ،شعر شور انگیز(تین جلدوں میں)گنج سوختہ،سبز اندر سبز(شعری مجموعے)چار سمت کا دریا(رباعیات)آسماں محراب،سوار(اردو۔فارسی ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرنے والے افسانے)کئی چاند تھے سر آسماں(ناول)عرشی مرزا،بینی مادھو رسوا،جاوید جمیل کے فرضی ناموں سے بھی متعدد مضامین، افسانوں وغیرہ کی تصنیف اور عالمی ادب کے تراجم۔شعر شور انگیز کے لئے سرسوتی سمان،دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ،ساہتیہ اکادمی اور کئی ریاستی اردو اکادمیوں کے متعدد ادبی اعزازات۔پاکستان،انگلینڈ،کناڈا،امریکہ،روس،تھائی لینڈ وغیرہ کے کئی سفر۔29Cہیسٹنگز روڈ الہ آباد۔211001یوپی فون:91-532-2622693

شہاب کاظمی(سجادات حسین احمد شہاب کاظمی)۔ایم اے، اردو شاعر،مرثیہ گو۔تصانیف:ترے تیر نیم کش کو،یہ خلش کہاں سے ہوتی،مہر کے پرتو سے۔90،فرسٹ ایونیو،پورٹ ریڈنگ۔NJ -07064 USA فون:6343577

شین کاف نظام:پ:26نومبر 1947،جودھپور۔شاعر، نقاد،مترجم،صحافی۔شعری مجموعے:لفظوں کی صلیب 1971،ناد 1980،دشت میں دریا 1984،سایہ کوئی لمبا نہ تھا 1988، بیاضیں کھو گئی ہیں 1997،سایوں کے سائے میں 2003،صحرا کے شجر(پریس میں)۔تنقید:تذکرہ معاصر شعرائے جودھپور 1991،منشور احتجاج اور افسانہ 1992،لفظ در لفظ 2000،ایضاً 2001معنی کے معمار(زیر طبع)۔اعزازات:بھاشا بھارتی سمان،میسور،راجستھان اردو اکادمی کا اعلیٰ ترین اعزاز محمود شیرانی ایوارڈ۔سفر:پاکستان،امریکہ،انگلستان،نیپال،قطر وغیرہ۔ Callasاسٹریٹ،جودھپور۔340001

ظفر عدیم: پ:26 مئی 1950 مظفر پور بہار • بی ایس سی • شاعر، ناول نگار، صحافی، مترجم • تصانیف: بھینی بھینی مہک (شعری) رات کے آنچل میں، انجو، شوفر، اڑان، پہاڑیاں بول اٹھیں، یاسمین (ناول) • اعزازات: شعری مجموعے پر دہلی اردو اکادمی ایوارڈ اور دیگر اداروں کے توصیفی نامے • گلی نمبر 35، ذاکر نگر، نئی دہلی 110025 فون: 26982733 موبائل: 9891462603

عاطف علیم: پ: 10 مئی 1964 گوجرانوالہ • ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی • افسانہ نگار، ڈراما نویس، مترجم، نقاد • تصانیف: شمشان گھاٹ (افسانوں کا مجموعہ) • فون پاکستان: 0321-5395928

عطاالحق قاسمی: پ: یکم فروری 1943 امرتسر • ایم اے اردو اسلامیہ کالج لاہور • شاعر، مزاحیہ کالم نویس، معلم، صحافی • 1997 میں ناروے، سنگاپور میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے • تصانیف: ملاقاتیں ادھوری ہیں (شاعری) سرگوشیاں، دھول دھپا، روزن دیوار سے، جرم ظریفی، مطایبے، تمام (کالم مجموعے) خند مکرر، بازیچۂ اعمال (طنز و مزاح) شوق آوارگی، گوروں کے دیس میں، دنیا خوب صورت ہے (سفرنامے) خواجہ اینڈ سنز، شب دیگ، اپنے پرائے، حویلی، شیدا ٹلی، علی بابا چالیس چور • جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، پاکستان

غلام مرتضیٰ راہی: پ: 1937 فتح پوری یوپی • بی اے • شاعر، صحافی • تلمیذ: مرحوم نواب علی گوہر، خواہر زادہ علامہ اثر لکھنوی • تصانیف: لامکاں، لاریب، حرف مکرر، لاکلام، سدا بہار غزل (ہندی) لاشعور (غزلیہ مجموعے) خود نوشت سوانح "سماہی رنگ" دھنباد میں سلسلہ وار زیر اشاعت • اعزازات: اتر پردیش اردو اکادمی کے ایوارڈ، مجموعی خدمات کے لیے میر اکادمی لکھنؤ کا امتیاز میر ایوارڈ اور دیگر ریاستوں کے ایوارڈ، حیات اور کارنامے پر پی ایچ ڈی مقالہ از حسن نظامی زیر تکمیل، شخصیت اور فن پر عشرت ظفر کی کتاب "حرف باریاب" زیر طبع • راہی منزل، بچی فتح پور، یوپی • فون: 05180-222323 موبائل: 9236108157

ایم قمرالدین (محمد قمرالدین): پ: 18 اکتوبر 1932 • بی اے علی گڑھ یونی ورسٹی، ایم اے (محنت اور معاشرتی بہبود)، ایل ایل۔ بی پٹنہ یونی ورسٹی • شاعر، قانون داں، اصلاح ساز، سپریم کورٹ کے سینیئر ایڈووکیٹ • تصانیف (زیر طبع): لے، شمع سے شمع، پرزے، نظموں اور گیتوں میں • 120 لائرس چیمبرز، سپریم کورٹ آف انڈیا، نئی دہلی۔ 110001 فون: 23389465 دفتر، 22755833 رہائش

گلشن کھنہ (گوردام کھنہ): 12 فروری 1934، حافظ آباد (پاکستان) • ایم اے انگریزی ادب آگرہ یونی ورسٹی، پی جی سرٹیفکیٹ ان ایجوکیشن وائٹ لینڈ کالج لندن، ڈپلومہ ان دی ٹیچنگ آف انگلش رائل سوسائٹی آف آرٹس لندن • شاعر، افسانہ نگار، شعری مجموعے: بکھرے بکھے خواب، چراغ آرزو، سوچ کی خوش بو • افسانوں کے مجموعے: بارش میں ایک آدمی، درد جو آنکھوں سے بہا، کھوئی ہوئی جنت • انگریزی میں تنقید کے جائزے، ثقافت اور اردو تدریس پر 6 کتابیں • 92 گرو و روڈ، Hounslow، ٹی ڈبلیو 3، 3 ڈی ٹی (یو۔کے) موبائل: 07780772603

پروفیسر گوپی چند نارنگ: پ: 11 فروری 1931 ڈگی، بلوچستان، پاکستان • ایم اے اردو، پی ایچ ڈی، دہلی یونی ورسٹی • چیئرمین ساہتیہ اکادمی • عالمی شہرت یافتہ دانش ور، نقاد، محقق، مرتب • کل کتابیں تقریباً 60 • خاص تصانیف: اردو افسانہ روایت اور مسائل، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، اسلوبیات میر، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ، اردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو، پرانوں کی کہانیاں، امیر خسرو کا ہندوی کلام، املا نامہ، کرخنداری اردو کا لسانی مطالعہ (انگریزی) سفر آشنا (سفرنامہ) اور متعدد مرتب کی ہوئی کتابیں • غیر ممالک میں ایشیا، یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا کے متعدد ملکوں کے دورے • صدر پاکستان کا اقبال صدی طلائی تمغہ امتیاز 1977، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مختلف اردو اکادمیوں کے ایوارڈ، کئی عالمی ایوارڈ، ماہنامہ "انشا" کی جانب سے ضخیم کتابی ایڈیشن "گوپی چند نارنگ نمبر" کی اشاعت 2004 • پدم بھوشن 2004 پدم شری 1991 • D-252 سروودیا انکلیو نئی دہلی 110017 فون: 26511460، 26568956 موبائل: 9810112543

گوہر جمالی (سید محمد سجاد علی): پ: 20 اگست 1943 • شاعر • تلمذ: علامہ شارق جمال ناگپوری • منزل راجپوت ہوپال ایف سی آئی روڈ (تیل گھانی ناکہ)، رائے پور۔ 492009 چھتیس گڑھ • فون: 0771-2592064, 2593248، موبائل: 9826157104

متین امروہی (متین الدین صدیقی): پ: 7 دسمبر 1937 امروہہ، یوپی • آٹو موبائل ڈپلومہ • شاعر، آٹو انجینئر • روزنامہ عوام نئی دہلی کے یومیہ قطعہ نگار • غالب کی زمینوں میں غزلیات کا مجموعہ زیر اشاعت • 72 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی۔ 110013 فون: 24359771، 65128683

پروفیسر محمد حسن: پ: 5 اگست 1926 مراداباد • ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی لکھنؤ یونی ورسٹی • نقاد، شاعر، ڈرامہ نگار، مولف، مرتب، مترجم • پروفیسر ایمریٹس جواہر لال یونی ورسٹی نئی دہلی • تصانیف: ہندی ادب کی تاریخ 1955، جدید اردو ادب 1976، شناسا چہرے 1980، ادبی تنقید، اردو ادب میں رومانوی تحریک، عصری تنقید، ادبی سماجیات، قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، مور پنکھی (ڈرامہ) کل ملا کر پچاس سے زائد کتابیں • غیر ممالک میں پاکستان، انگلینڈ، جرمنی، فرانس، سوئٹزر لینڈ، اٹلی، امریکہ، کناڈا، لبنان وغیرہ کے دورے • اعزازات: مجموعی خدمات کے لئے دہلی اردو اکادمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ "ہم سب غالب" ایوارڈ برائے ڈرامہ، اتر پردیش اردو اکادمی کا مجموعی خدمات ایوارڈ، آندھرا پردیش کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور متعدد دیگر ایوارڈ • رابطہ: ڈی-7 ماڈل ٹاؤن دہلی۔ 110009 فون: 27234474، 27234474

محمد حمید شاہد: پ: 23 مارچ 1957 ضلع اٹک، پاکستان • بی ایس سی آنرز (ایگری ہارٹی کلچر) ڈپلوما ان بینکنگ • افسانہ نگار، ناقد، مترجم • تصانیف: بند آنکھوں سے پرے، جنم جہنم، مرگ زار (افسانوں کے مجموعے) ادبی تنازعات، اردو افسانہ صورت و معنی (تنقید) اشفاق احمد شخصیت اور فن (شریک مصنف) لمحوں کا لمس (نظمیں) الف سے اٹھکیلیاں (انشائیے) سمندر اور سمندر (تراجم) پیکر جمیل (سیرت) • 822 گلی نمبر 104 جی 9/4 اسلام آباد • فون: 92-51-28507799

محمد بشیر مالیر کوٹلوی: افسانہ نگار • افسانوں کے مجموعے: قدم قدم دوزخ، سلگتے لمحے، چنگاریاں • اسٹیٹ آفیسر پنجاب وقف بورڈ دہلی گیٹ نزد ایم پی اسکول مالیر کوٹلہ۔ 148023، پنجاب • فون: 01675-250529 موبائل: 9888857829

ڈاکٹر مظفر حنفی (ابو مظفر): پ: یکم اپریل 1936، کھنڈوہ مدھیہ پردیش • ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی (اردو) • شاعر، نقاد، محقق • سابق پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونی ورسٹی • تصانیف: صریر خامہ، دیپک راگ، طلسم حرف، یم بہ یم، کھل جا سم سم، پردہ سخن کا (شعری مجموعے) شاد عارفی۔ شخصیت اور

فن تنقیدی ابعاد، نقد ریزے (تحقیق و تنقید) ایک تھا شاعر، جدیدیت: تجزیہ و تفہیم کل ملا کر 60 سے زائد کتابیں متعدد کتابوں پر مختلف ریاستی اردو اکادمیوں سے اٹھارہ انعامات، میر اکادمی لکھنؤ کا میر ایوارڈ اور دیگر متعدد اعزاز • ڈی۔ 40 حلقہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی۔110025 فون: 011-26987470

مظفر علی سید (مرحوم): پ: 18 ستمبر 1929 • ایم اے انگریزی • شاعر، نقاد، مترجم، مدون، تصانیف: دیوان غالب (مقدمہ و ترتیب) احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے اور خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے کالموں کے تین مجموعے (مرتبہ) پاک فضائیہ کی تاریخ، معاشرہ شناسی (تراجم) تنقید کی آزادی، ڈی ایچ لارنس، فکشن، فن اور فلسفہ (تنقید)

مخمور سعیدی (سلطان محمد خاں): پ: 31 دسمبر 1938، ٹونک راجپوتانہ • ایم اے اردو • شاعر، نقاد، صحافی، مترجم، تصانیف: گفتنی، سیہ بر سفید، آواز کا جسم، سب رنگ، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا (شعری مجموعے) 1857 کی کہانی غالب کی زبانی (دستنبو کا ترجمہ) اور دیگر تراجم و ترتیب • اعزازات: مجموعی خدمات پر راجستھان و دہلی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ، کتابوں پر مختلف اکادمیوں کے ایوارڈ، پاکستان، دبئی، ابوظہبی، کناڈا، ناروے، سعودی عرب، امریکہ کے سفر • رابطہ: J-3/141-C کرشن کنج لکشمی نگر دہلی۔110092

مستنصر حسین تارڑ: پ: یکم مارچ 1939 لاہور • ناول/ افسانہ/ مزاح/ کالم نگار، اسکرپٹ رائٹر، صحافی، براڈکاسٹر • ناول: پیار کا پہلا شہر، جپسی، دیس ہوئے پردیس، فاختہ، بہاؤ، راکھ، قربت مرگ میں محبت، قلعہ جنگی • افسانے: سیاہ آنکھ میں رات • سفرنامے: نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، خانہ بدوش، نیپال نگری، ہنزہ داستان، شمالی پاکستان کے علاقوں کے متعدد سفرنامے • ٹی وی پلے و سیریل: ہزاروں راستے، سورج کے ساتھ ساتھ، مورت، پرواز، شہپر، گلش، صاحب سرکار • مزاح و کالم: گزارا نہیں ہوتا، چک چک، الو ہمارے بھائی ہیں، ہزاروں ہیں شکوے، شتر مرغ ریاست، کاروان سرائے، بے عزتی خراب • ادبی و میڈیا کی خدمات کے لئے صدر پاکستان کا پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ، راکھ کے لئے وزیر اعظم کا ایوارڈ برائے بہترین ناول، پاکستان اکادمی آف لیٹرز ایوارڈ، سفرنامہ ہنگل پربت، بلتستان داستان کے لئے صدر پاکستان سے ایوارڈ، اور متعدد دیگر اعزازات • 22 بے گل برگ III لاہور،

پاکستان • فون: 092-42-5834544 موبائل:
0300-9407225 فیکس: 092-42-7245101
ای میل: sumairtarar@hotmail.com

مشرف خطیب: پ سہارنپور • ایم اے • شاعر، معلم • پرنسپل اندرا گاندھی اوپن یونی ورسٹی سینٹر، گلی نمبر 6، نئی شاہ چھٹا باغ، سہارنپور۔247001 یوپی • موبائل: 9837277442

ممتاز مفتی (ممتاز حسین): پ: 11 ستمبر 1905 ضلع گورداس پور • وفات: 27 اکتوبر 1995 اسلام آباد • بی اے اسلامیہ کالج لاہور • افسانہ نگار، صحافی، بیوروکریٹ • خاص تصانیف: ان کہی، گہما گہمی، چپ، اسمارائیں، گڑیا گھر، روغنی پتلے، سے کا بندھن، چھلکے، افسانوں کے 7 مجموعوں کی کلیات 'مفتیانے' دو خود نوشت ناول 'علی پور کا ایلی' اور 'الکھ نگری' ہندوستان کا سفرنامہ 'ہند یاترا'

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی: پ: یکم جولائی 1947، چترا ضلع ہزاری باغ، بہار • ایم اے، پی ایچ ڈی • شاعر، افسانہ نگار، نقاد، محقق، صحافی • تصانیف: میوۂ تلخ، کلام نرم و نازک، آنچ، ترسیل، ارتقا، امتزاج، حرف سخن، فن تنقید اور تنقیدی مضامین، مختلف موضوعات پر کل ملا کر 100 کتابیں • میر اکادمی لکھنؤ، یوپی، بہار، مہاراشٹر وغیرہ کی اردو اکادمیوں، غیر ملکی اداروں کے ایوارڈ • فن اور شخصیت پر مشاہیر ادب کے 400 سے زائد مضامین، کئی کتابیں • کوہسار، بھیکن پور، 3، بھاگل پور، بہار 812001

ناصر عباس نیر: پ: 1965 ضلع جھنگ، پنجاب، پاکستان • ایم فل اردو • انشائیہ نگار، نقاد، مرتب • تصنیفات: چراغ آفریدم (انشائیے) دن ڈھل چکا تھا، جدیدیت سے پس جدیدیت تک، معاصر ادب، نظیر صدیقی، جدید اور مابعد جدید تنقید (تنقید)، ساختیات: ایک تعارف، مابعد جدیدیت، نظری مباحث، مابعد جدیدیت: اطلاقی جہات (مرتبہ) جدید تنقیدی اصطلاحات زیر ترتیب • لیکچرر، شعبہ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، پاکستان۔

نصرت ظہیر (ظہیر احمد): پ: 9 مارچ 1951 سکندرآباد، ضلع بلند شہر یوپی • بی اے • طنز و مزاح نگار، شاعر، صحافی، مترجم • تصانیف: تحت اللفظ، بقلم خود، خرانٹوں کا مشاعرہ، گول مول (مزاحیہ مضامین کے مجموعے) ابن بطوطہ کا دوسرا سفر (مزاحیہ

ناول) پکوئنس انڈیا کی پہلی اردو کتاب، یونیسکو اور ساہتیہ اکادمی کی کتابوں کے تراجم • اعزازات: دہلی، یوپی کی اردو اکادمیوں کے ایوارڈ اور سبھی مجموعوں پر انعامات، دہلی اردو اکادمی کا کالم نگار ایوارڈ 1996 • رابطہ: 4/15 ہجوری پور دہلی۔110091 فون: 011-2272031 موبائل: 9312033695

نقشبند (قمر نقوی): شاعر، صحافی • 6207 سا ؤتھ انڈیانا پولس پلیس، ہنتسا او کلا ہوما 74136 یو ایس اے۔

نند کشور وکرم: پ: 17 ستمبر 1929 راولپنڈی، پاکستان، ناول / افسانہ نگار، صحافی، اردو و ہندی میں ساٹھ سے اوپر کتابیں • خاص تصانیف: آوارہ گرد (افسانے)، انیسواں ادھیائے، یادوں کے کھنڈر (ناول) • اردو اکادمی دہلی اور انوواد پریشد کے ایوارڈ • ایف 14/21 کرشن نگر دہلی۔110051 فون: 22094419 موبائل: 9810298665

ڈاکٹر وزیر آغا: پ: 18 مئی 1922 وزیر کوٹ ضلع سرگودھا، ایم اے معاشیات گورنمنٹ کالج لاہور، اردو ادب میں طنز و مزاح کے موضوع پر پی ایچ ڈی مقالہ • شاعر، انشائیہ نگار، نقاد، صحافی • خاص تصانیف: شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، غزلیں، نرد بان (شاعری) خیال پارے، چوری سے یاری تک، دوسرا کنارہ (انشائیوں کے مجموعے) اردو شاعری کا مزاج، تنقید جدید کی کروٹیں، تنقید اور احتساب، تخلیقی عمل، نئے مقالات، تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں، نئے تناظر (تنقید) مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی شخصیت اور فن • 1966 سے سہ ماہی 'اوراق' کا آغاز کیا • مریلی روڈ سرگودھا پاکستان۔

وفا سکندر پوری (شاہ غلام احمد): پ: 3 مارچ 1945 قصبہ سکندر پور ضلع بلیا، یوپی • ایم اے اردو کلکتہ یونی ورسٹی • شاعر • کاکی نارہ ہاؤسنگ کمپلیکس، فلیٹ نمبر B/3 پی او کاکی نارہ، ضلع 24 پرگنہ (N)۔743126 • موبائل: 9331062192، 9331913584

ہربنس سنگھ تصور: پ: 15 اپریل 1938، حسن ابدال (پنجہ صاحب/ پاکستان) • ایم اے اردو/ پنجابی، پی ایچ ڈی اردو • شاعر • معد اسد انتظر (شعری مجموعہ) غزل عروض ڈیجیٹل (پنجابی) • 429 فیز 2 سیکٹر 55، ایس اے ایس نگر، موہالی۔160055

قلم کاروں سے گزارش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسی طرز پر اپنے تعارفی کوائف ارسال فرمائیں۔ لیکن ارسال ضرور کریں۔ ادارہ

پس نوشت

ادب ساز کی قیمت کے بارے میں ہمیں ڈھیروں خط ملے ہیں۔ بیش تر میں اسے مواد اور حجم کے لحاظ سے مناسب بتایا گیا ہے۔ لیکن ایسے خط بھی اچھی خاصی تعداد میں آئے ہیں جن میں قیمت کو عام قاری، بالخصوص طالب علموں کے بس سے باہر کہا گیا ہے۔ عام قاری کی تعریف ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ اس لئے صرف ادب کے سنجیدہ قاری اور طلبا کی بات کریں گے۔

ادب کے قاری نے کیبل ٹی وی، ویڈیو پلیئر اور روزانہ اخبار کی طرح ادب کو بھی اپنی روزمرہ ضرورت مانتے ہوئے دوسرے جریدوں کے ساتھ ادب ساز بخوشی خرید کر پڑھا۔ کئی نے دوستوں کو تحفتاً دینے کے لئے ایک سے زیادہ کاپیاں منگوائیں۔ یہاں تک کہ جن ادبا کی تخلیقات رسالے میں شامل تھیں اور جنہیں اصولاً رسالہ اعزازی طور پر بھیجا جانا چاہئے تھا انہوں نے بھی زر تعاون روانہ فرمادیا۔

طلبا کا معاملہ یہ ہے کہ انہیں رسالے کا علم ہی نہیں تھا۔ چنانچہ ادب ساز کو ان تک لے جانے کے لئے ہم نے یونی ورسٹی کی سطح کے اردو طلبا کو رسالہ مفت تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا۔ دہلی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر جناب شعیب اقبال نے 50 کاپیاں پوری قیمت پر خرید کر ایک تقریب میں یہ رسالہ مفت تقسیم کیا جس کا عنوان تھا 'ایک صبح اردو کے نام'! یہاں سے ہمیں ایک الگ ہی خیال سوجھا ہے۔ کیوں نہ ادب کے ان سنجیدہ قارئین کے لئے ادب ساز کو اسپانسر کرانے کی اسکیم شروع کی جائے جو کسی وجہ سے اسے afford نہیں کر سکتے۔ ایسے دو چار قاری ہر شہر میں ہوں گے جو ادب ساز کی ایک سے زائد کاپیاں afford کر سکتے ہیں۔ یہ حضرات اگر ہمیں ان دوستوں یا طالب علموں کے نام اور پتے بھیج دیں جنہیں وہ ادب ساز اپنی طرف سے تحفہ میں دینا چاہتے ہوں اور ساتھ ہی شماروں کی مجموعی قیمت بھی منی آرڈر یا ڈرافٹ سے بھجوادیں تو ہم یہ شمارہ اپنے ڈاک خرچ پر رجسٹرڈ پوسٹ سے ان کے بتائے ہوئے پتوں پر روانہ کر دیں گے اور ڈاک خانے کی رسیدیں اسپانسر کرنے والے صاحب کو ان کے اطمینان کے لئے روانہ کر دی جائیں گی۔

یا پھر شعیب اقبال صاحب والا طریقہ دوسرے شہروں میں دوہرانے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح ادب ساز کو مالی استقامت ملے گی اور اوسط ضخامت کی چھ کتابوں کے بقدر ادبی مواد کا حامل یہ رسالہ اپنے genuine قاری تک پہنچتا رہے گا۔

اس کے علاوہ ہم ادبا کی کتابیں اوروں سے کم اجرت پر مکمل صحت و معیار کے ساتھ چھاپنے کا سلسلہ شروع کرنے کے بارے میں بھی سوچ رہے ہیں تاکہ ادب ساز کے استحکام کی ایک اور صورت نکل آئے۔

ان سبھی تجاویز کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیے اور اگر آپ کی اپنی کوئی تجویز ہے تو وہ بھی لکھ بھیجئے۔

ادب ساز کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ پہلے سے بہتر؟ پہلے سے بدتر؟ یا پھر پہلے جیسا ہی بہتر/بدتر؟ یہ بھی ضرور لکھئے گا۔ مگر خوبیوں/خامیوں کی نشان دہی کے ساتھ۔

Quarterly **ADABSAAZ**, Delhi Oct.-Dec. 2006 Vol: 1 Issue: 2

4/15, Khichripur, Delhi-110091

انٹرنیٹ کی اُردو دُنیا کا ایک اہم نام

www.urdustan.com

اُردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ، جو اُردو سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔
اُردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

www.urducorner.com

آن لائن اُردو کتابوں کی فروخت میں ایک نمایاں نام۔ جس میں پاکستان، انڈیا، امریکہ سے، اردو، ہندی اور انگریزی کتب کی فروخت وترسیل کی جاتی ہے۔

www.kitaabghar.com

مفت اُردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی سب سے بڑی ویب سائٹ، جس میں مختلف موضوعات پر 100 سے زائد کتب مطالعہ کے لیے آن لائن دیکھی جاسکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی ہیں۔

www.urdustan.net

اُردو سے متعلق، انگلش بلاگ۔ اُردوستان نیٹ ورک کی ایک اور اہم سائٹ، جہاں اچھوتے موضوعات پر مضامین انگلش میں دستیاب ہیں۔

www.urdustan.net/u-hoo

۲۱ مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار لنکس پر مشتمل ایک منفرد سرچ انجن/ ویب ڈائریکٹری، جس میں صرف اُردو سے متعلقہ لنکس موجود ہیں۔

www.indianmuslims.info

انڈیا کے مسلمانوں سے متعلق ایک معلوماتی ویب سائٹ، جہاں صرف ہندوستانی مسلمانوں کی بات کی جاتی ہے۔